آئینہ

اسلامی تہذیب و تمدن

انٹرمیڈیٹ

اختیاری



خالد بک ڈپو اردو بازار لاہور

انٹرمیڈیٹ کلاسز کیلئے شاہکار کتاب

پائیلٹ سپرون

آئینہ اسلامی تہذیب و تمدن

(پرچہ الف)

برائے

انٹرمیڈیٹ

مصنفین:
پروفیسر محمد مزمل احسن شیخ
ابوطاہر صدیقی ایم اے، ایم ایڈ
ابوخالد صدیقی ایم اے، ایم ایڈ

فون:- ۷۲۲۳۸۸۱
۳۲۲۹۷۳

خالد بک ڈپو۔ ۴۰۔ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

پیش لفظ

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے، جس کی بنیاد اسلام ہے۔ تشکیلِ پاکستان کا مقصد نظامِ اسلام کا قیام اور مسلمانوں کے ملی تشخص کا تحفظ تھا۔ نوجوان طبقہ ہی کسی قوم کا اصل سرمایہ ہوتا ہے کیونکہ مستقبل میں انہی نوجوانوں نے ملک و قوم کی گرانبار ذمہ داریاں سنبھالنی ہوتی ہیں اس لیے طلبہ و طالبات کی صحیح خطوط پر تعلیم و تربیت اشد ضروری ہے۔ ان نوجوانوں کو حقیقی مسلمان، مثالی انسان اور محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے پروان چڑھنا ہے اور اس کے ساتھ ہی جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے تقاضوں سے بہرہ ور ہونا ہے۔ بلاشبہ اس ضمن میں نظریاتی و اخلاقی اصلاح و تہذیب کا اساسی اہمیت ہے جس کے بغیر تمام تصورات باطل قرار پاتے ہیں۔

یہ بات نہایت مستحسن ہے کہ حکومت پاکستان نے قوم کے دیرینہ مطالبے کو پذیرائی بخشتے ہوئے نہ صرف اسلامیات کو ہر سطح پر لازمی قرار دیا ہے بلکہ اسے اختیاری مضمون کی حیثیت سے بھی شاملِ نصاب کیا ہے تاکہ اس مضمون کے عمومی مطالعہ کے ساتھ خصوصی مطالعہ کا اہتمام بھی ہو سکے۔ یہاں یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور تاریخ اسلام سے واقفیت حاصل کرنا صرف امتحانی نقطۂ نظر ہی سے ضروری نہیں ہے، بلکہ مسلمان ہونے کے ناطے سے ان بنیادی باتوں کا جاننا ویسے بھی ہمارے لیے لازمی ہے۔ گویا اسلامیات کے مطالعہ کا دوہرا فائدہ ہے۔ امتحان میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کریں اور ثواب بھی کمائیں، یعنی ہم خرما و ہم ثواب!

زیر نظر کتاب دو حصوں یعنی اسلامی تہذیب و تمدن اور تاریخ اسلام (سیرۃ النبی ﷺ و خلافت راشدہ) پر مشتمل ہے جو انٹرمیڈیٹ اسلامیات (اختیاری) پرچہ الف کے مجوزہ نصاب کے مطابق لکھی گئی ہے اس کتاب کی ترتیب میں بنیادی ماخذ تو قرآن و سنت اور آثارِ صحابہؓ ہیں، لیکن متعدد دیگر مستند کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور جہاں کہیں بھی مناسب و مستند مواد پایا بلاتعصب کتاب میں سمو دیا گیا ہے تاکہ طلبہ و طالبات کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم ہو سکیں۔ ہم ان تمام قابلِ احترام مصنفین کے ممنون ہیں، جن کی قیمتی کاوشوں اور تحقیقات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ گو موجودہ کتاب بنیادی طور پر طلبہ و طالبات کی نصابی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔ تاہم اس سے ایک عام قاری بھی مستفید ہو سکتا ہے۔ یہی کوشش کی گئی ہے کہ ایمان و جذبہ کی صحیح حلاوت اور سوز و دروں کا جذبہ پروان چڑھ سکے۔ ہر موضوع کو سوال و جواب کے انداز میں ذیلی سرخیوں میں مرتب کیا گیا ہے تاکہ طلبہ نفسِ مضمون کو بآسانی ذہن نشین کر سکیں۔

انشاء اللہ یہ کتاب طلبہ و طالبات کو بہت سی ضخیم کتب کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی اور وہ کسی قسم کی تشنگی محسوس نہیں کریں گے۔ کتاب کے آخر میں کچھ امتحانی پرچہ جات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

اس بات کا فیصلہ عزیز طلبہ اور اساتذہ کرام ہی کریں گے کہ ہم اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم آپ کے قیمتی مشوروں کی بدل و جان قدر کریں گے۔

؎ گر قبول افتد زہے عز و شرف

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہ

(مؤلف)

خوشنویس: افضل محمود چٹھہ

283
م ز م آ

فہرست

تاریخِ اسلام

قیمت: ۹۵/۵۹ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب نمبر ا

تہذیب و تمدّن

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (البقرۃ: ۱۴۸)

ترجمہ: "اور ہر ایک (فرقے) کے لیے ایک قبلہ (مقرر) ہے، جدھر وہ (عبادت کے وقت) منہ کیا کرتے ہیں۔"

تہذیب و تمدّن کا مفہوم

سوال: تہذیب و تمدن کا مفہوم واضح کیجئے۔ اس کے عوامل و عناصر کیا ہیں؟ اور اس کی بقاء و ارتقاء کا انحصار کن باتوں پر ہے؟

جواب:

تہذیب و تمدّن کا مفہوم

۱۔ تہذیب کا مفہوم

تہذیب کے لغوی معنی ہیں پودے یا درخت کی کانٹ چھانٹ کرنا، اخلاق کی اِصلاح کرنا اور سنوارنا۔ تہذیب کے معنی شاخ تراشی کرنا ہے۔ آپ نے مالی کو دیکھا ہوگا۔ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ پودوں کو پانی دیتا ہے۔ زمین میں کھاد ڈالتا ہے۔ پودوں کے گلے سڑے اور سوکھے پتوں کو الگ کر دیتا ہے۔ جو شاخیں اِدھر اُدھر پھیل جاتی ہیں، انہیں کاٹ دیتا ہے۔ ان شاخوں کے کٹنے سے پودے کی نشوونما بہت اچھی ہوتی ہے۔ اسی کو تہذیب کہتے ہیں۔

ڈاکٹر برھان احمد فاروقی کے قول کے مطابق

"تہذیب میں جوتنے، بونے اور اگانے کا استعارہ پایا جاتا ہے، مگر جو کچھ جوتا جایا جاتا ہے، وہ زمین نہیں، انفرادی اور اجتماعی ذہن ہے۔ جو کچھ بویا جاتا ہے، بیج نہیں، تصورات ہیں اور جو کچھ اگایا جاتا ہے، وہ اناج کی فصل نہیں بلکہ یکسانی کردار کا وہ نمونہ ہے جس کی بدولت کسی گروہ میں وحدت کا شعور راسخ ہوتا ہے۔"

گویا تہذیب سے مراد وہ نظریات و تصورات ہیں، جن کے مطابق کوئی جماعت یا قوم زندگی گزارے جس نصب العین کو اپنا مقصد بنائے، فرد و جماعت کے تعلقات کو جن اصولوں پر قائم کرے اور جو اخلاقی نقطہ نظر اختیار کرے، ان سب کے مجموعے پر "تہذیب" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ اساسی عقائد اور بنیادی نظریات اتنے واضح ہوتے ہیں کہ ہر قوم دوسری قوم سے مختلف و منفرد نظر آتی ہے۔ چنانچہ تہذیب کسی قوم کی پہچان اور شناخت ہے۔

ب۔ تمدّن کا مفہوم

اس لفظ کا مادہ "مدن" ہے۔ اس سے مدنیت، مدینہ اور تمدن وغیرہ کئی الفاظ نکلتے ہیں۔ لفظ تمدن کا اصل معنی "رہن سہن" ہے۔ لیکن وسیع تر معنوں میں یہ لفظ کسی قوم کے علوم و فنون، آرٹ، ادب اور لٹریچر، باہمی معاشرت، عمارات اور فن تعمیر حتیٰ کہ اس قوم کی سیاست اور تاریخ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ تمدن کسی علاقے یا قوم کی طرز معاشرت کا نام ہے۔ اس میں وہ تمام امور شامل ہیں جو ہماری معاشرت اور مادی زندگی کے متعلق ہوں۔ قدیم گاڑی کے معمولی پہیے سے لے کر جدید بھاری مشینری تک ہر چیز تمدن کا مظہر ہے۔

ج۔ تہذیب و تمدّن کا فرق

عام طور پر تہذیب و تمدن کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے اور دونوں میں فرق نہیں کیا جاتا حالانکہ دونوں میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے، ہمارا ہر عمل اور فعل کسی نظریے اور عقیدے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلے ہم کسی کام کے بارے میں سوچتے ہیں اور پھر اس سوچ کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ مثلاً انجینئر پہلے کسی عمارت کا خاکہ اور نقشہ تیار کرتا ہے۔ پھر اس خاکے اور نقشے کے مطابق عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ اس طرح تہذیب نام ہے خیالات، تصورات اور افکار و عقائد کا۔ اور ان تصورات و افکار کے تحت جو افعال و اعمال ظاہر

ہوتے ہیں اور جو سیرت و کردار تشکیل پاتے ہیں، انہیں تمدن کا نام دیا جاتا ہے۔

اس طرح تہذیب و تمدن لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں روح اور جسم کا رشتہ ہے۔ تہذیب روح ہے اور تمدن جسم، تہذیب اصل ہے اور تمدن اس کا مظہر، تہذیب انسان کا دل ہے جو تصورات و خیالات کا مرکز ہے اور تمدن انسانی جسم کے اعضاء ہیں جو وفادار اور فرمانبردار ملازموں کی طرح دل کے احکامات بجالاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں تہذیب جڑ ہے اور تمدن اس کے برگ و بار۔

(د) **تہذیب و کلچر** تہذیب کو انگریزی میں کلچر کہتے ہیں۔ اس طرح تہذیب اور کلچر دونوں ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں۔ کلچر میں کم و بیش وہ تمام باتیں شامل ہیں جو تہذیب میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے آئندہ سطور میں کلچر اور تہذیب کا مفہوم یکساں انداز میں کیا جائے گا۔

مختلف علماء کے نظریات

۱۔ **حضرت شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ** حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنی مشہور کتاب "حجۃ البالغہ" میں فرماتے ہیں کہ: "کھانے پینے، بقائے نسل، سردی گرمی سے بچاؤ اور دھوپ اور بارش سے بچنے کی فطری ضروریات میں انسان دوسری جاندار چیزوں کی مانند ہے، لیکن اللہ تعالےٰ نے اسے تین زائد چیزیں بھی بخشی ہیں یعنی رفاہِ عام کا تخیل، حبِ جمال اور مادۂ ایجاد و تقلید۔"

۲۔ **علّامہ ابنِ خلدون کا نظریّہ** علامہ ابنِ خلدون کے مطابق "اجتماعِ انسانی ایک ضروری اور ناگزیر شے ہے۔ حکماء اپنی اصطلاح میں انسان کو "مدنی الطبع" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی انسان فطرۃً شہریت پسند اور متمدن ہے۔ یہ اجتماعِ انسانی مدنیت یا تمدن کہلاتا ہے اور ہم اس کو "عمران" (آبادی، تعمیر) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے مذہبی و اخلاقی قواعد و ضوابط اور حکومت کے قوانین کی ضرورت ہے جو اسے راہِ راست پر رکھ سکیں اور فتنہ و فساد سے محفوظ رکھیں۔"

(مقدمۂ تاریخ)

۳۔ ٹائیلر کا نظریہ "کلچر (تہذیب) میں علم، عقیدہ، فن، اخلاق، مذہب، زبان قانون، رسم اور وہ تمام صلاحیتیں، عادتیں اور طور طریقے شامل ہیں، جو انسان معاشرے کے رکن کی حیثیت سے اختیار کرتا ہے۔"

۴۔ ہیری شپرو کا نظریہ "کلچر اکتسابی طرزِ عمل کا نام ہے اور اکتسابی طرزِ عمل میں ہماری وہ تمام عادات، اعمال، خیالات اور اقدار شامل ہیں، جنہیں ہم ایک منظم معاشرے یا گروہ یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔"

۵۔ مذاہب و اخلاقیات کی انسائیکلوپیڈیا میں کلچر کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

"کلچر کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف مظاہر مثلاً ذہنی، اخلاقی اور مذہبی امور سب اس میں شامل ہیں۔"

۶۔ مؤرخین کلچر کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

"کسی خاص دور میں کوئی قوم مجموعی لحاظ سے آرٹ، موسیقی، ادب، فلسفہ اور مذہب و سائنس میں جو کچھ حاصل کر لیتی ہے، وہ اس قوم کا کلچر کہلاتا ہے۔"

تہذیب کے عناصر ترکیبی

۱۔ دنیوی زندگی کا تصوّر سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کا تصور کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی کیا حیثیت قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ اور انسان اس دنیا کو برتے تو کیا سمجھ کر برتے؟ یہ تصورِ حیات کا سوال ایسا اہم سوال ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے اور اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بنیادی

طور پر بدل جاتی ہے۔

۲۔ زندگی کا نصب العین

دوسرا سوال جو تصورِ حیات کے سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے، زندگی کے نصب العین کا سوال ہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ساری جدوجہد، یہ تمام کش مکش اور محنت و مشقت آخر کس لیے ہے؟ وہ کیا چیز مطلوب ہے، جس کی طرف آدمی کو دوڑنا چاہیئے؟ یہی مقصود و مطلوب کا سوال انسان کی عملی زندگی کا رُخ اور اس کی رفتار متعین کرتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کے طریقے اور کامیابی کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔

۳۔ اساسی عقائد و افکار

تیسرا سوال یہ ہے کہ زیرِ بحث تہذیب میں انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر کی گئی ہے؟ انسان کی ذہنیت کو وہ کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟ انسان کے دل و دماغ میں کس قسم کے خیالات جاگزیں کرتی ہے؟ اور اس میں وہ کون سے محرکات ہیں جو اس کے نصب العین کے مطابق انسان کو ایک مخصوص قسم کی عملی زندگی کے لیے اُبھارتے ہیں ظاہر ہے، انسان کے قوائے عمل اس کے قوائے فکر کے تابع ہیں۔ دل و دماغ پر جو عقیدہ، جو تخیل اور جو اندازِ فکر حاوی ہوگا، عملی قوتیں اسی کے زیر اثر حرکت کریں گی۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس کی سوچ عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

۴۔ تربیت افراد

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت ایک انسان کے کس طرح کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت ہے جس سے وہ انسان کو اپنے نظریہ کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کرتی ہے؟ وہ کون سے اوصاف ہیں، جنہیں وہ انسان میں پیدا کرنے اور نشو و نما دینے کی کوشش کرتی ہے؟ اور اس کی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا انسان بنتا ہے؟ افراد ہی وہ مسالہ ہوتے ہیں جن سے جماعت کا قصر بنتا ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا (اقبال)

۵۔ نظامِ اجتماعی

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے کس طرح قائم کیا

گیا ہے ؟ اس کے تعلقات اس کے خاندان سے، اس کے ہمسایوں سے، اس کے دوستوں سے، اس کے ساتھ رہنے اور بسنے والوں سے، اس کے ماتحتوں سے، اس کے بالادستوں سے خود اس کی اپنی تہذیب کے پیروؤں سے اور اس کی تہذیب کی پیروی نہ کرنے والوں سے کس قسم کے رکھے گئے ہیں ؟ اس کے حقوق دوسروں پر اور دوسروں کے حقوق اس پر کیا قرار دیئے گئے ہیں ؟ اس سوال کے ضمن میں اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں، اور اسی سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ زیر بحث تہذیب، خاندان، سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے ؟

(اسلامی تہذیب
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

تہذیب و تمدن کی بقاء وارتقاء کا انحصار انہی باتوں پر ہے ۔

پیامِ اقبالؒ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں، جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

تہذیبِ اسلامی

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ .... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۷۷)

ترجمہ: "بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خُدا پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور (خدا کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں .... یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو (خدا سے) ڈرنے والے ہیں۔"

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

(اقبالؒ)

اسلامی تہذیب کے عوامل و عناصر

سوال: اسلامی تہذیب کے عوامل و عناصر تفصیل سے بیان کیجیے؟

جواب: ۱۔ اسلامی تہذیب اسلامی تہذیب کی اپنی منفرد حیثیت ہے۔ یہ تہذیب اسلام کے عقائد اور اصول و نظریات اور روایات کی نمائندہ و ترجمان ہے۔ اسلام کا ایک منفرد اور جداگانہ ضابطہ حیات ہے۔ چنانچہ اسلامی تہذیب اسی ضابطۂ حیات کی عکاسی کرتی ہے۔ اسلامی تہذیب کا سنگِ بنیاد حیاتِ دنیا کا یہ تصور ہے کہ انسان کی حیثیت اس کرۂ خاکی میں عام موجودات کی سی نہیں ہے بلکہ وہ خالقِ کائنات کی طرف سے یہاں خلیفہ بنا کر اتارا گیا ہے۔ لہٰذا انسان کا اصل نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنے خالق اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرلے اس نصب العین کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے، حیاتِ دُنیا کو اس کی تعلیمات کے مطابق بسر کرے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے آنے والی زندگی کی کامیابی اس دنیوی زندگی کی کامیابی اور اس کے بناؤ سنوار پر منحصر ہے۔ انسان کی اصل کامیابی

کامرانی پیغمبروں کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرنے میں مضمر ہے۔

اسلامی تہذیب ۔ ایک سلطنت

بقول مولانا مودودیؒ اسلامی تہذیب کا نظام ایک سلطنت کا سا نظام ہے۔ اس میں خدا کی حیثیت عام مذہبی تصور کے لحاظ سے محض ایک "معبود" کی سی نہیں ہے، بلکہ دنیوی تصور کے لحاظ سے وہی حاکم مطلق بھی ہے۔ وہ دراصل اس سلطنت کا شہنشاہ ہے، رسولؐ اس کا نمائندہ ہے۔ قرآن اس کی کتاب آئین ہے۔ اور ہر وہ شخص جو اس کی شہنشاہی کو تسلیم کر کے اس کے نمائندے کی اطاعت اور اس کی کتاب آئین کا اتباع کرنا قبول کرے، اس سلطنت کی رعیت ہے، مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شہنشاہ نے اپنے نمائندے اور اسی کتاب آئین کے ذریعے سے قوانین مقرر کر دیئے ہیں، ان کو بے چون وچرا تسلیم کیا جائے، خواہ ان کی علت ومصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جو شخص خدا کا یہ اختیار مطلق اور اس کے قانون کا شخصی واجتماعی آراء سے بالاتر ہونا تسلیم نہیں کرتا، اور اس کے فرمان کو ماننے یا نہ ماننے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھتا ہے، اس کے لیے اس سلطنت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ج اسلامی تہذیب کا قصر (محل)

جہاں تک اصل واساس کا تعلق ہے اسلامی تہذیب کا قصر یعنی محل تمام تر اسلام کی اپنی تعمیر کا نتیجہ ہے۔ اس کا نقشہ اس کا اپنا ہے، کسی دوسرے نقشے کی مدد اس میں نہیں لی گئی ہے۔ اس کا طرز تعمیر خود اسی کا ایجاد کردہ ہے۔ کسی دوسرے نمونہ کی نقل اس میں نہیں کی گئی ہے۔ اس کا مقصد تعمیر نرالا ہے۔ کوئی دوسری عمارت اس مقصد کے لیے نہ اس سے پہلے تعمیر کی گئی اور نہ اس کے بعد۔ باقی رہے جزئیات وفروع تو اسلام نے ان میں بھی دوسروں سے بہت کم استفادہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی بیشتر اسلام کے اپنے ہیں۔ البتہ مسلمانوں نے دوسروں سے رنگ روغن، نقش ونگار اور زینت وآرائش کے سامان لے کر اس میں اضافے کر دیئے اور وہی دیکھنے والوں کو اتنے نمایاں نظر آئے کہ انہوں نے پوری عمارت پر نقل کا حکم لگا دیا۔ (اسلامی تہذیب)

(د) تہذیب اسلامی کے عوامل (عقائد اسلام)

تہذیب اسلامی کے عوامل سے مراد اسلام کے وہ بنیاد

عقائد ہیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں اجزائے ایمان کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

بنیادی عقائد

قرآن مجید کی رو سے اسلام کے بنیادی عقائد یہ ہیں:۔

۱۔ توحید ۲۔ رسالت

۳۔ ملائکہ ۴۔ آسمانی کتب اور

۵۔ آخرت پر ایمان لانا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۷)

یعنی: "بلکہ بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں اور پیغمبروں پر۔"

حدیث کی رو سے ایمان نام ہے سات چیزوں پر اعتماد رکھنے کا جو ایمان مفصل میں بیان کی گئی ہیں:

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ ۝

یعنی "میں ایمان لایا اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور اس بات پر کہ ہر چیز و شر اس کی قدرت اور علم سے ہے اور موت کے بعد زندہ کئے جانے پر۔"

ذیل میں ان بنیادی عقائد کی وضاحت کی جاتی ہے:

اللہ تعالیٰ پر ایمان

۱۔ توحید

اس کے معنی ایک اللہ پر یقین رکھنا اور اس کا سچے دل سے احترام کرنا ہے اور اس کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کو ڈھالنا ہے۔ توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ یہ وہ شمع ہے جس کی روشنی سے سیرت و کردار کے تمام

گوشے جگمگا اٹھتے ہیں۔ اس میں پورا دین سمٹا ہوا ہے۔ توحید ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور ہر طرح کے شرک سے دامن بچاتے رکھیں۔ یعنی اس کی ذات اس کی صفات اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔ توحید سے انسان کے دل میں یہ احساس ابھرتا ہے کہ اللہ نے اسے تمام کائنات میں سب سے افضل ٹھہرایا ہے۔ چاند ستارے، سورج اور تمام کائنات اسی کے لیے بنی ہے تاکہ یہ اس سے کام لے اور اس کو مسخر کرے۔ اسلام نے شرک سے روکا ہے اور اس کو بہت بڑا ظلم قرار دیا ہے۔ شرک سے ذلت اور پستی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ ۝ (الحج: ۳۱)

یعنی: "جس نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا وہ گویا آسمان کی بلندیوں سے گرا اور پستیوں میں آرہا۔"

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ (النساء: ۴۸)

یعنی: "اللہ اس کو ہرگز معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جس کے جو گناہ چاہے گا بخش دے گا۔"

بقولِ علامہ اقبال رحمہ اللہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

عقیدہ توحید کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جتنے پیغمبر آئے ان سب نے اس کی تلقین کی اور اپنے اپنے زمانے میں بت پرستی اور شرک کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی تھیں ان سے انسانوں کو روکا اور کوشش کی کہ وہ اپنا رشتہ صرف اللہ تعالیٰ سے جوڑیں۔ اسی سے لو لگائیں اور اسی کو اپنی تمام مشکلات میں اپنا سہارا، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھیں۔ اس پر دل کی گہرائیوں سے ایمان لائیں اور اسی پر بھروسہ کریں۔ اس طرح اللہ کو ماننے سے زندگی کو نئی روشنی ملتی ہے اور انسان نئے ولولے، نئے جوش اور نئے جذبے سے آشنا ہوتا ہے۔ ہر نبی کی یہی تعلیم

تھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں بار بار ارشاد ہوتا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (ہود: ۵۰)

یعنی: "اس نے کہا کہ بھائیو! خدا ہی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔"

۲۔ سابقہ نبیوں پر ایمان لانا

دوسری بات جس کو حضورؐ نے بار بار بیان کیا وہ یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں اور ہر قوم میں اپنے پیغمبر اور رسول بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو ہدایت کا پیغام پہنچائیں اور ان کو دین کی سیدھی راہ دکھائیں۔ مکے کے عرب اکثر نبوت و رسالت کے تصور کو بالکل بھول چکے تھے وہ زیادہ تر ان کاہنوں پر اعتماد کرتے تھے جنہوں نے ہبل، لات، منات اور عزیٰ جیسے بڑے بڑے بتوں کے متعلق عجیب و غریب افسانے تراش رکھے تھے۔ لوگ زیادہ تر انہی کی باتوں کو مانتے اور حضورؐ کی نبوت اور رسالت کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہودی صرف حضرت موسیٰؑ اور ان پیغمبروں کو مانتے تھے جو ان سے پہلے گذرے ہیں۔ وہ نہ حضرت عیسیٰؑ کو مانتے تھے اور نہ حضورؐ پر ایمان لانے کو تیار تھے۔ وہ اس غرور میں مبتلا تھے کہ ہم دنیا کی بہترین مخلوق ہیں عیسائیوں میں یہ گمراہی پھیل گئی تھی کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ غرض یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و بخشش نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے خود ان میں سے ان حضرات کو دنیا میں بھیجا ہے جو ان کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کریں انہیں نیکی کا درس دیں اور برائیوں سے روکیں۔ یہ سب بزرگ ہستیاں یکساں احترام کے لائق ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار سب کے انکار کے برابر ہے۔ نبوت کے بارے میں حضورؐ نے تین باتوں کی خصوصیت سے وضاحت فرمائی:۔

۱۔ یہ کہ ہدایت و راہنمائی کا سرچشمہ خدا کے پیغمبر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے جس طرح انسانوں کے لیے زندگی کی تمام تر ضروریات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح اس کی روحانی تربیت کا بھی اہتمام کیا ہے۔

۲۔ انبیائے کرامؑ اگرچہ اپنی دینی اور علمی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام بنی نوع انسان سے افضل و برتر تھے۔ تاہم وہ انسان ہی تھے یعنی ان میں کوئی خدا کا بیٹا نہ تھا۔ سب اللہ کے پیارے بندے تھے اور اس بندگی پر ان کو ناز تھا۔

۳۔ بلا کسی تفریق کے انبیاء پر ایمان لانا اور سب کا احترام کرنا ضروری ہے۔ اس لیے

کہ ان سب کو اللہ تعالیٰ ہی نے رسول بنا کر بھیجا اور مبعوث فرمایا۔
قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:
لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ (البقرۃ: ۲۸۵)
یعنی: "(اور وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔"
تعلیم اور تربیت کے اس انداز سے حضورؐ نے ایک طرف تو نبوت کے تصور کو نکھارا اور اچھی طرح واضح کیا اور دوسری طرف تمام انبیاء پر ایمان لانے کی ہدایت کی اور تعصبات کے ان تمام پردوں کو ہٹا دیا جن کی وجہ سے انسانیت کئی خانوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔

۳۔ آخرت

حضورؐ کی مکی زندگی کا تیسرا تبلیغی نکتہ جس کی قرآن مجید میں بھی بار بار تاکید آئی ہے۔ آخرت پر ایمان لانا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:
وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (البقرۃ: ۴)
یعنی: "اور وہ آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔"
بات یہ ہے کہ ایک تو تمام مذاہب سابقہ کا آخرت کے بارے میں تصور ناقص تھا دوسرے عربوں میں ایسے لوگوں کی کثرت تھی جو سرے سے آخرت کے قائل ہی نہیں تھے چنانچہ جب بھی حضورؐ آخرت کی بات کرتے اور ان سے کہتے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا اور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے تو وہ چونک جاتے اور تعجب سے پوچھنے لگتے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ گلی سڑی ہڈیاں پھر سے زندہ ہو جائیں۔ تیسری اہم وجہ جس سے آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔ یہ تھی کہ اس کو جانے بغیر نہ تو زندگی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے اور نہ ذمہ داری کا احساس ہی دلوں میں ابھرتا ہے۔ آخرت کے متعلق جن جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ ایک دن اللہ تعالیٰ تمام عالم اور اس کی مخلوقات کو مٹا دے گا۔ اس دن کا نام قیامت ہے۔
۲۔ پھر وہ سب کو ایک دوسری زندگی بخشے گا اور سب اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔ اس کو حشر کہتے ہیں۔
۳۔ تمام لوگوں نے اپنی دنیوی زندگی میں جو کچھ کیا ہے اس کا پورا نامۂ اعمال خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اچھے اور بُرے اعمال وزن فرمائے گا جس کی بھلائی خدا کی میزان میں برائی سے زیادہ وزنی ہو گی اس کو بخشش دے گا اور جس کی بُرائی کا پلہ بھاری رہے گا۔ اسے سزا دے گا۔

۵۔ جن لوگوں کی بخشش ہو جائے گی وہ جنت میں جائیں گے اور جن کو سزا دی جائے گی وہ دوزخ میں جائیں گے۔ آخرت پر ایمان لانے سے ایک تو یہ فائدہ ہے کہ زندگی میں ذمہ داری اور پاکیزگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے اس مایوسی کا خاتمہ ہوتا ہے کہ زندگی بس اتنی سی ہی ہے کہ موت آئی اور سب کیا دھرا خاک میں مل گیا۔

موت زندگی کا ایک وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

علامہ اقبال اس نکتہ کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

موت کو سمجھتے ہیں غافل اختتامِ زندگی　　ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

۴۔ فرشتوں پر ایمان

ایمان باللہ کے بعد ایک اہم چیز جس پر حضورؐ نے ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہے وہ فرشتوں کی ہستی ہے اور بڑا فائدہ اس تعلیم کا یہ ہے کہ اس سے توحید کا اعتقاد شرک کے تمام خطروں سے پاک ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ پوشیدہ نورانی ہستیاں جن کو تم دیوتا اور خدا اور اولادِ خدا سمجھتے ہو، دراصل یہ خدا کے فرشتے ہیں۔ ان کا خدائی میں کوئی دخل نہیں، یہ سب خدا کے تابع فرمان ہیں اور اس قدر مطیع ہیں کہ حکم الٰہی سے بال برابر بھی سرتابی نہیں کر سکتے۔ خدا ان کے ذریعے اپنی سلطنت کی تدبیر کرتا ہے اور یہ ٹھیک ٹھیک اس کے فرمان بجا لاتے ہیں، ان کو خود اپنے اختیار سے کچھ کرنے کی قدرت نہیں۔ یہ اپنی طرف سے خدا کے حضور میں کوئی تجویز پیش نہیں کر سکتے۔ ان کی اتنی مجال بھی نہیں کہ اس کے سامنے کسی کی سفارش کر سکیں۔ ان کی عبادت کرنا اور ان سے مدد مانگنا انسان کے لیے ذلت ہے۔ کیونکہ روزِ اوّل میں اللہ تعالیٰ نے ان سے آدمؑ کو سجدہ کرایا تھا اور ان سے بڑھ کر آدمؑ کو علم عطا کیا تھا اور ان کو چھوڑ کر آدمؑ کو زمین کی خلافت عطا کی تھی پس جو انسان خود ان فرشتوں کا مسجود ہے اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہو سکتی ہے کہ وہ الٹا ان کے آگے سجدہ کرے اور ان سے بھیک مانگے۔

حضورؐ نے ایک طرف تو ہمیں فرشتوں کی پرستش کرنے اور خدائی میں ان کو شریک

ٹھہرانے سے روک دیا۔ دوسری طرف آپؐ نے بتایا کہ فرشتے خدا کی برگزیدہ مخلوق ہیں، گناہوں سے پاک ہیں، ان کی فطرت ایسی ہے کہ وہ خدا کے احکام کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتے۔ وہ ہمیشہ خدا کی بندگی اور عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ ان میں سے چار فرشتے سب سے زیادہ خدا کے مقرب ہیں، ایک حضرت جبرائیلؑ جو نبیوں پر وحی لاتے تھے، دوسرے حضرت میکائیلؑ جو روزی اور بارش کے نگران ہیں، تیسرے حضرت عزرائیلؑ جو مخلوقات کی روح قبض کرتے ہیں اور چوتھے حضرت اسرافیلؑ جو قیامت کو صور پھونکیں گے۔

خدا کی کتابوں پر ایمان

ایک اہم تعلیم یہ ہے کہ اللہ کی ان تمام کتابوں پر ایمان لانا فرض ہے جو اس نے اپنے نبیوں پر نازل کیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح رسولِ اکرمؐ پر قرآن مجید نازل فرمایا ہے اسی طرح حضورؐ سے پہلے جو رسول ہو گزرے ہیں ان کے پاس بھی اپنی کتابیں بھیجی تھیں، ان میں سے بعض کتابوں کے نام ہمیں بتائے گئے ہیں مثلاً صحف ابراہیمؑ، جو حضرت ابراہیمؑ پر اترے تورات جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ زبور جو حضرت داؤد کے پاس بھیجی گئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کو دی گئی۔ ان کے سوا دوسری کتابیں جو رسولوں کے پاس آئیں تھیں ان کے نام ہمیں نہیں بتائے گئے اس لیے کسی اور مذہبی کتاب کے متعلق ہم یقین کے ساتھ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے ہیں اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں۔ البتہ ہم ایمان لاتے ہیں کہ جو کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں وہ سب برحق تھیں۔ جن کتابوں کے نام ہمیں بتائے گئے ان میں صحف ابراہیمؑ تو اب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ رہیں تورات، زبور اور انجیل تو وہ البتہ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس موجود ہیں مگر قرآن مجید میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان سب کتابوں میں لوگوں نے خدا کے کلام کو بدل ڈالا ہے اور اپنی طرف سے بہت سی باتیں ان کے اندر ملا دی ہیں۔

پچھلی کتابوں پر ایمان کا جو حکم ہمیں دیا گیا ہے وہ صرف اس حیثیت سے ہے کہ خدا نے قرآن مجید سے پہلے بھی دنیا کی ہر قوم کے پاس اپنے احکام اپنے نبیوں کے ذریعے بھیجے تھے اور وہ سب اسی ایک خدا کے احکام تھے جس کی طرف سے قرآن مجید آیا ہے۔ اور قرآن مجید کوئی نئی اور انوکھی کتاب نہیں ہے بلکہ اسی تعلیم کو زندہ کرنے کے لیے بھیجی گئی ہے جس کو پہلے زمانہ کے لوگوں نے پایا اور کھو دیا یا بدل ڈالا یا انسانی کلاموں میں غلط ملط کر دیا۔

تقدیر پر ایمان

چھٹی چیز جس پر ہم کو ایمان لانے کی ہدایت کی گئی ہے وہ تقدیر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک اور قادرِ مطلق ہے۔ سب کچھ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس نے کائنات پیدا کر کے اس کا ایک اندازہ مقرر کر دیا۔ اسی چیز کا نام تقدیر ہے۔ ایک مسلمان اور مومن کے لیے تقدیر پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اصل میں تقدیر پر ایمان، خدا پر ایمان ہی کا ایک حصہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایمان تقدیر اور تدبیر کے درمیان ہے یعنی ایک مومن کو چاہیئے کہ وہ تقدیر پر بھی ایمان رکھے اور اس کے ساتھ عمل اور تدبیر بھی کرے۔ انسان تقدیر کا پابند ہے۔ لیکن خدا تقدیر کا پابند نہیں۔ وہ چاہے تو تقدیر کو بدل سکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ:

"مومن کی دعا تقدیر کو بدل سکتی ہے۔"

کلمۂ طیبہ

یہ پانچ عقیدے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے ان پانچوں عقیدوں کا خلاصہ صرف ایک کلمہ میں آجاتا ہے۔

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰـهِ

جب تم لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ کہتے ہو تو تمام باطل معبودوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی بندگی کا اقرار کرتے ہو اور جب مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰـهِ کہتے ہو تو اس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ رسالت کی تصدیق کے ساتھ خود بخود یہ بات تم پر لازم ہو جاتی ہے کہ خدا کی ذات و صفات اور ملائکہ اور کتب آسمانی اور انبیاءؑ اور آخرت کے متعلق جو کچھ اور جیسا کچھ آنحضرتﷺ نے تعلیم فرمایا ہے، اس پر ایمان لاؤ اور خدا کی عبادت اور فرمانبرداری کا جو طریقہ آپؐ نے بتایا ہے اس کی پیروی کرو۔

(ر) تہذیب اسلامی کے عناصر

ارکانِ اسلام

عناصر کسی چیز کے اجزائے ترکیبی کا نام ہے۔ عناصر جمع ہے عنصر کی، جس کے معنی بنیاد، بیج اور جڑ کے ہیں۔ اسلام میں جو کام بطور فرائض ادا کیے جاتے ہیں اور باقاعدہ ایک نظم کے تحت آسکتے ہیں۔ وہ سب اسلامی تہذیب کے عناصر ہیں، جن سے مراد وہ بنیادیں ہیں، جن پر اسلام کا عظیم الشان

قصر یعنی محل استوار اور تعمیر کیا گیا ہے اور جنہیں اصطلاحی طور پر ارکان اسلام کہا جاتا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ارکان اسلام کی اہمیت

ارکان اسلام ارکان اسلام سے مراد وہ بنیادی احکامات ہیں جو فرائض کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور ان کی حیثیت عمارت کے ستونوں کی سی ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک ستون کو نظر انداز کر دیا جائے تو دین کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی ان ارکان و فرائض کی نشاندہی فرمادی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ

ترجمہ: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

مفہوم ان پانچ چیزوں کے اسلام کے ستون ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی عمارت کے ستون کو بنا لینے سے پہلے آپ مزید کوئی تعمیر نہیں کرتے، ٹھیک اسی طرح اعمال کو انجام دیئے بغیر دین کی دوسری تعلیمات پر عمل نہیں کیا جا سکتا، اور اگر کوئی عمل کیا جائے گا تو وہ دراصل عمل کا صرف نام ہوگا۔ حقیقت میں عمل نہ ہوگا اگر یہ عمل ٹھیک طور پر انجام پا جائیں تو باقی اعمال کا انجام پا جانا قطعی ممکن ہے بلکہ لازمی اور ضروری ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسری حدیث میں صرف انہی چیزوں کو "اسلام" قرار دیا گیا ہے:۔ اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِیْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِیَ الزَّکٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا

ترجمہ: "اسلام یہ ہے کہ تم شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور استطاعت کی صورت میں خانہ کعبہ کا حج کرو۔"

۱۔ **کلمہ طیبہ** اسلام کا پہلا رکن کلمہ طیبہ ہے :۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اللہ کے رسول ہیں۔"

کلمے کے پہلے حصے کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی نہیں جو عبادت کے لائق ہو۔ اس کے سوا کوئی اس کا مستحق نہیں کہ عبادت اور بندگی و اطاعت میں اس کے آگے سر جھکایا جائے۔ صرف وہی ایک ذات ہے جو تمام جہان کی مالک اور حاکم ہے۔ تمام چیزیں اس کی محتاج ہیں۔ سب اسی سے مدد مانگنے پر مجبور ہیں۔ وہی خالق و مالک ہے۔ رزاق، مشکل کشا، حاجت روا اور کارسازِ حقیقی ہے۔ وہ جو اس سے پوشیدہ ہے اور اس کی ہستی کو سمجھنے کے لیے عقل قاصر ہے۔

دوسرے حصے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے رسول ہیں رسالت کی تصدیق کے ساتھ خود بخود یہ بات ہم پر لازم ہو جاتی ہے کہ خدا کی ذات و صفات اور ملائکہ اور کتب آسمانی اور انبیاءؑ اور آخرت کے متعلق جو کچھ اور جیسا کچھ آنحضرتؐ نے تعلیم فرمایا ہے اس پر ایمان لائیں اور خدا کی عبادت اور فرمانبرداری کا جو طریقہ حضورؐ نے بتایا ہے اس کی پیروی کریں۔ خدا کے رسول کی حیثیت سے جو دین اور شریعت حضورؐ لاتے ہیں اس پر عمل کریں۔

۲۔ **نماز** اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے۔ نماز کیا ہے؟ دن میں پانچ وقت زبان اور عمل سے انہی چیزوں کا اعادہ جن پر ہم ایمان لاتے ہیں۔ پانچ نمازیں فرض ہیں۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ نماز وہ چیز ہے جو دن میں پانچ مرتبہ ہمارے اسلام کی بنیاد کو مضبوط کرتی رہتی ہے۔ یہ بار بار ہمیں اسلام کی بڑی عبادت اور خدمت کے لیے تیار کرتی ہے۔ یہ ان تمام عقیدوں کو تازہ کرتی رہتی ہے۔ جن پر ہمارے نفس کی پاکیزگی، روح کی ترقی، اخلاق کی درستی اور عمل کی اصلاح موقوف ہے۔ نماز سے بہتر اور کوئی ٹریننگ نہیں ہو سکتی جو ہمیں پورا اور سچا مسلمان بنانے والی ہو۔ یہ خدا کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اس سے اطاعت امیر، مساوات، برابری یگانگت، اخوت و محبت، نظم و ضبط

پاکیزگی و طہارت اور اصلاحِ نفس کا درس ملتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: "بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔"

احادیث میں نماز کی بڑی اہمیت اور فضیلت بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے: "نماز مومن کی معراج ہے۔" ایک اور حدیث میں ہے: "نماز دین کا ستون ہے۔" نیز: "کافر اور مومن کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز ہے۔" پھر ارشاد ہوتا ہے: "جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کر دی، اس نے کفر کیا۔" ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "نماز جنت کی کنجی ہے۔" نیز حضورؐ نے فرمایا: "نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔" الغرض نماز روحانی و اخلاقی اصلاح، جسمانی پاکیزگی و طہارت اور دینی تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔

۳۔ زکوٰۃ

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر مالدار مسلمان پر فرض کیا ہے۔ امیروں کی دولت میں غریبوں کے لیے ڈھائی فیصد حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ نماز اللہ کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے۔ قرآن مجید میں حکم ہوتا ہے کہ: "امراء کے مال و دولت میں محتاجوں اور مسکینوں کا حق رکھ دیا گیا ہے۔" یہ حق انہیں لازمی ادا کرنا ہو گا۔ ورنہ یہی مال قیامت کے روز ان کے لیے عذاب کا باعث ہو گا۔ یہ رکن مسلمانوں میں خدا کی خاطر قربانی اور ایثار کرنے کی صفت پیدا کرتا ہے۔ اور خود غرضی، تنگ دلی، اور زر پرستی کی بری صفات کو دور کرتا ہے۔ زکوٰۃ مسلمان کو اس قربانی کی مشق کراتی ہے اور اس قابل بناتی ہے کہ خدا کی راہ میں جب مال صرف کرنے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی دولت کو سینے سے چمٹائے نہ بیٹھا رہے۔ بلکہ دل کھول کر خرچ کرے۔ زکوٰۃ کا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں کوئی مسلمان ننگا بھوکا اور ذلیل و خوار نہ ہو، جو امیر ہیں، وہ غریبوں کو سنبھال لیں اور جو غریب ہیں وہ بھیک مانگتے نہ پھریں، کوئی شخص اپنی دولت کو صرف اپنے عیش و آرام اور شان و شوکت ہی پر نہ اُڑا دے بلکہ یہ بھی یاد رکھے کہ اس میں اس کی قوم کے یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں کا بھی حق ہے۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر خدا ہمیں اس قدر رزق دے جو ہماری ضرورت سے زیادہ ہو، تو اس کو سمیٹ کر نہ رکھیں بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کو دیں تاکہ ان کی ضرورتیں پوری ہوں اور وہ بھی کچھ کمانے اور کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔ زکوٰۃ کے ذریعے معاشی مسئلہ بہترین طریقے سے حل ہو سکتا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ: "زکوٰۃ اسلام کا خزانہ ہے۔" حضرت صدیق اکبرؓ

نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا تھا۔

۴۔ حج

حج اسلام کا چوتھا رکن ہے۔ یہ عمر میں صرف ایک مرتبہ ادا کرنا فرض ہے اور وہ بھی صرف ان کے لیے جو مکہ معظمہ تک جانے کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔ حج اصل میں حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی سُنّت ہے، جسے رسولِ اکرمؐ نے مستقل صورت دے دی۔ ایک لحاظ سے دیکھیں تو حج سب سے بڑی عبادت ہے۔ انسان خدا کی محبت میں سرشار ہو کر اپنا کاروبار چھوڑ دیتا ہے۔ اپنے عزیزوں سے جدا ہو کر طویل سفر کی زحمت برداشت کرتا ہے۔ پھر جب انسان اس سفر پر نکلتا ہے تو اس کی کیفیت عام سفروں جیسی نہیں ہوتی۔ اس سفر میں زیادہ تر اس کی توجہ خدا کی طرف رہتی ہے۔ اس کے دل میں شوق اور ولولہ بڑھتا چلا جاتا ہے، جوں جوں کعبہ قریب آتا جاتا ہے۔

محبتِ الٰہی کی آگ اور زیادہ بھڑکتی ہے۔ گناہوں سے دل خود بخود نفرت کرتا ہے عبادت اور ذکرِ الٰہی میں مزہ آنے لگتا ہے۔ قرآن پڑھتا ہے تو اس میں کچھ اور ہی لطف آتا ہے۔ روزہ رکھتا ہے تو اس کی حلاوت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ پھر وہ سرزمین حجاز کے چپے چپے پر خدا کی مقدس نشانیاں دیکھتا ہے۔ اس طرح مسلمان کا دل خدا کے عشق اور اسلام کی محبت سے بھر جاتا ہے اور وہاں سے وہ ایسا گہرا اثر لے کر آتا ہے جو مرتے دم تک دل سے محو نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں حج کی وجہ سے مکہ دنیا کے مسلمانوں کا مرکز بنا دیا گیا ہے دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان وہاں جمع ہوتے ہیں۔ ان میں اخوت و محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس بنا پر حج ایک طرف خدا کی عبادت ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی کانفرنس بھی ہے اور مسلمانوں کی عالمگیر برادری میں اتحاد پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ پھر مسلمانوں کو روضۂ رسولؐ پر حاضری کا شرف حاصل ہوتا ہے اور اس طرح دل میں حضورؐ کی محبت موجزن ہوتی ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "مقبول حج کا بدلہ جنت کے سوا اور کچھ نہیں۔" ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "جس نے خلوصِ نیت سے حج کیا اور اس میں فسق اور برائیوں سے بچا رہا تو وہ ایسا پاک و صاف ہو کر لوٹے گا جیسے اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا۔" ایک اور حدیث کے مطابق "جسے کسی بیماری نے یا کسی واقعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمران نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی مرے اور چاہے نصرانی (عیسائی)۔"

۵ روزہ

روزہ اسلام کا پانچواں رکن ہے جس سبق کو نماز روزانہ پانچ مرتبہ یاد دلاتی ہے اسے روزہ سال میں ایک مرتبہ پورے ایک مہینہ تک ہر وقت یاد دلاتا رہتا ہے۔ روزے میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ اس کی تہ میں خدا کا خوف ہے اس کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین ہے۔ آخرت کی زندگی اور خدا کی عدالت پر ایمان ہے قرآن اور رسولؐ کی سخت اطاعت ہے۔ فرض کا زبردست احساس ہے۔ صبر اور مصائب کا مقابلہ کی مشق ہے۔ خدا کی خوشنودی کے مقابلہ میں خواہشات نفس کو روکنے اور دبانے کی طاقت ہے۔ ہر سال رمضان کا مہینہ آتا ہے تاکہ پورے تیس دن تک روزے ہماری تربیت کریں اور ہمارے اندر یہ تمام اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہم پورے اور پکے مسلمان بنیں اور یہ اوصاف ہمیں اس عبادت کے قابل بنائیں جو ایک مسلمان کو اپنی زندگی میں ہر وقت بجالانی چاہیئے۔ روزہ ہمدردی و ایثار کا سبق دیتا ہے۔ یہ امیروں میں غریبوں کی امداد کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہ ان میں احساس پیدا کرتا ہے کہ بھوک اور پیاس کی شدت کیسی ہوتی ہے۔ ہمیں بھوکا رکھنے سے خدا کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ وہ ہمارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوتا ہے "روزہ (دنیا میں گناہوں سے اور آخرت میں دوزخ سے بچانے والی) ڈھال ہے" ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "جس شخص نے رمضان کے روزے محض اللہ تعالیٰ کے لیے ثواب سمجھ کر رکھے اس کے سب پہلے گناہ بخش دیئے گئے" پھر ارشاد ہوتا ہے "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کا ہر عمل اس کا ہوتا ہے، مگر روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا"

(س) حاصل کلام

ارکان اسلام کے اس مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عبادات کے اس نظام کا اصل مقصد اسلام کا انسان مطلوب تیار کرنا ہے۔ یہ عبادات انسان کی بہترین روحانی و اخلاقی تربیت کرتی ہیں اور اس میں تقویٰ و پرہیزگاری کے اوصاف پیدا کرتی ہیں۔ یہ انسان کو اس ذمہ داری کے لیے تیار کرتی ہیں جو خدا نے اور اس کے رسولؐ نے ہمارے سپرد کی ہے۔ یہ عبادات انسان میں انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی صفات پیدا کرتی ہیں۔ سیرت و کردار کی تعمیر کرتی ہیں ان عبادات کا مقصد یہ ہے کہ تزکیہ نفس ہو یعنی نفس کی پاکیزگی ہو۔ انسان میں صحیح تقویٰ کی روح پیدا ہو۔ خدا سے تعلق استوار ہو اور خدا کی اطاعت، اس کی بندگی اور اس کی

محبت ہر چیز پر غالب آجائے۔ نفس کی اصلاح و پاکیزگی کے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں اور نفس کی اصلاح کے لیے ارکان اسلام کی پابندی بہترین نسخہ ہے۔ یہ نسخہ بطریق احسن استعمال کیا گیا تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت کے نتیجہ میں صحابہ کرام کی بہترین جماعت معرضِ وجود میں آئی اور پھر اسی جماعت کے ہاتھوں اسلام پورے کرۂ ارضی پر غالب آگیا اور دنیا عظیم ترین اسلامی انقلاب سے روشناس ہوئی۔ ؎

اسلام کا زمانے میں سکہ بٹھا دیا — اپنی مثال آپ ہیں یارانِ مصطفٰےؐ

(مولانا ظفر علی خانؒ)

برس جائے پھر تیری رحمت کا بادل — پھر اسلام کا باغ یارب ہرا ہو
ہے اس وقت کا منتظر گوشِ ملت — کہ نقارۂ اسلام کا بج رہا ہو

(مولانا ظفر علی خانؒ)

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

(اقبالؒ)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(اقبالؒ)

اسلامی تہذیب وتمدّن کی خصوصیات

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۰)

ترجمہ: اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں، ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔"

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری ؎
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں (اقبالؒ)

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (اقبالؒ)

سوال: اسلامی تہذیب و تمدن کی نمایاں خصوصیات بیان کیجئے؟

جواب: **اسلامی تہذیب و تمدن کی انفرادیت** اسلامی تہذیب و تمدن کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ یہ تہذیب دنیا کی دیگر اقوام کی تہذیب و تمدن سے ممتاز و منفرد نظر آتی ہے۔ اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس نے زندگی کے ہر معاملے سے بحث کی ہے، اس لیے ہماری دنیوی زندگی کے متعلق اس نے ایک مخصوص قسم کا تصور پیش کیا ہے۔ اس کے ہاں زندگی بامقصد ہے اور مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ایک واضح نصب العین ہے اس نے فرد اور معاشرے کے باہمی تعلقات کی حدود بتاتی ہیں، اخلاق اور سیرت و کردار کی نہایت اعلیٰ اور کامل تعلیم پیش کی ہے۔ یہ چیزیں جب جمع ہو جائیں تو اسلامی تہذیب کہلاتی ہیں۔ اسی طرح اسلامی تمدن سے مراد انفرادی و اجتماعی زندگی کا وہ عملی نقشہ ہے، جو اسلام کے بتائے ہوئے قواعد و ضوابط پر قائم ہے۔ اسلامی تہذیب کسی جماعت میں جس انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جنم دیتی ہے اسے اسلامی تمدن کا نام دیا جائے گا۔ مثلاً گھریلو زندگی، خاندانی زندگی معاشرتی زندگی، شہری زندگی، قومی زندگی اور اس سے گزر کر بین الاقوامی زندگی کیلئے اسلام نے جو احکام دیئے ہیں، ان پر عمل پیرا ہونے کا نام "اسلامی تمدن" ہے۔

دوسرے الفاظ میں اسلامی تمدن وہ نظام زندگی ہے جو خدا کے پیغمبروں نے وحی الٰہی کے ذریعہ سے پیش کیا۔ اس کی بنیاد خدا کی ذات و صفات پر صحیح ایمان، عقیدۂ توحید، انسان کے اس دنیا میں خلیفۃ اللہ (نائب خدا) ہونے، آخرت کی زندگی پر ایمان، انسانی مساوات کے نظریئے، اجتماعی عدل و انصاف، خدمت خلق اور احساس ذمہ داری پر رکھی گئی ہے۔ یہ تمدن علمی اور عقلی حیثیت سے بھی دنیا کا بہترین تمدن ہے اور عملی لحاظ سے بھی، جب کبھی قائم ہوا ہے تو انسانی معاشرہ جنت کا نمونہ بن گیا ہے۔

ذیل میں اسلامی تہذیب و تمدن کی نمایاں خصوصیات بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ تصورِ توحید

اسلامی تہذیب و تمدن کا سنگِ بنیاد تصورِ توحید ہے۔ عقیدہ توحید سے مراد اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک تسلیم کرنا ہے۔ وہ اپنی ذات، صفات اور اس کے تقاضوں میں بے مثل اور یکتا ہے۔ کوئی اس کا شریک و ساجھی اور ہمسر نہیں ہے۔ وہی کائنات کا خالق و مالک ہے۔ حیّ و قیوم ہے، حاضر و ناظر ہے۔ عالم الغیب ہے۔ تمام اختیارات کا سرچشمہ و منبع اسی کی ذات ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، تمام مخلوق اس کی محتاج ہے۔ وہ ازل سے ابد تک رہے گا۔ وہ ہر عیب اور خامی سے پاک ہے۔ انسان کو صرف اسی کی عبادت و اطاعت کرنی چاہیئے صرف اسی کے قوانین کی پیروی کرنی چاہیئے۔ شرک تمام برائیوں، خرابیوں اور گمراہیوں کی جڑ ہے۔ توحید کی بدولت انسان میں اعلیٰ اوصاف پیدا ہوتے ہیں مثلاً وسعت نظری خودداری و عزتِ نفس، عاجزی و انکساری، پاکیزگیٔ نفس و حسنِ کردار، رجائیت اور اطمینانِ قلب، صبر و توکل، قوت و شجاعت، قناعت و بے نیازی، پرہیزگاری و قانونِ الٰہی کی پابندی، شرفِ انسانیت، خلقِ خدا کی غمخواری، صفاتِ الٰہیہ کا پرتو وغیرہ۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؒ)

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

(مولانا ظفر علی خان)

۲۔ اخوت اسلامی

اسلام اونچ نیچ کے امتیاز کی نفی کرتا ہے۔ اسلامی تمدن کی ایک بڑی خصوصیت اسلامی اخوت یعنی بھائی چارے کا نظریہ ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ

(الحجرات۔ ۱۰)

ترجمہ: "بلاشبہ اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں سو تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح صفائی کرا دیا کرو۔"

اسلامی معاشرہ اخوت کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کے افراد آپس میں ہمدردی خلوص و محبت اور یگانگت کے ساتھ رہتے ہیں۔ ارشاداتِ نبویؐ ہیں:

"تمام مسلمان ایک دیوار کی مانند ہیں، جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کی تقویت کا باعث ہوتی ہے۔"

"مسلمان ایک جسم واحد کی طرح ہیں، اگر جسم کے ایک حصے کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔"

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور وہ اس سے خیانت نہیں کرتا، اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور مصیبت کے وقت اس سے کنارہ کش نہیں ہوتا۔"

"آپس میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، اور سب بھائی بھائی بن جاؤ۔"

اسلام کی تاریخ میں اخوت کی بہترین مثال ہجرت مدینہ کے موقع پر انصار و مہاجرین کی مواخات کی صورت میں دیکھنے میں آئی۔ اسلامی بھائی چارے کا یہ دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ خونی رشتوں سے بالا ہے۔ یہ بھائی چارہ ایک نئے قسم کا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جو عقیدے اور اصول پر مبنی ہے۔ ہر وہ شخص جو اس عقیدے کو مان لے، وہ اس معاشرے کا ضروری حصہ اور معزز فرد قرار پاتا ہے۔

اخوت اس کو کہتے ہیں، چبھے کانٹا جو کابل میں
تو ہندوستاں کا ہر پیر و جواں بے تاب ہو جائے
(مولانا ظفر علی خاں)

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
(اقبالؒ)

۳۔ مساوات انسانی

اسلام مساوات کا درس دیتا ہے اور تمام انسانوں کو ہر لحاظ سے مساوی قرار دیتا ہے اور ذات پات، رنگ و نسل، زبان و تہذیب اور امیری و غریبی کے فرق کو مٹاتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کے علاوہ انسانی فضیلت کا اور کوئی معیار نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ

اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (الحجرات : ۱۳)

ترجمہ: "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان اور برادریاں بنایا، تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔"

خطبہ حجتہ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

"عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر۔ گورے کو کالے پر، کالے کو گورے پر کوئی بڑائی حاصل نہیں ہے۔ بڑائی کا معیار نیکی اور خوفِ خدا ہے۔ تم سب آدم ؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔"

مساوات دو طرح کی ہے۔ قانونی مساوات اور معاشرتی مساوات۔ قانونی مساوات کے مطابق قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کچھ افراد کو قانون سے بالاتر قرار دیا جائے۔ تمام افراد کو قانون کا یکساں تحفظ حاصل ہونا چاہیئے۔ اور انہیں اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق معاشرتی، اقتصادی اور علمی ترقی کے یکساں مواقع میسر ہوں۔ معاشرتی مساوات سے مراد یہ ہے کہ معاشرے میں کسی فرد کو اولیت اور برتری حاصل نہیں ہے۔ معاشرتی لحاظ سے تمام لوگ برابر ہیں۔ ہر شخص کو اپنی ذات کی تکمیل، علم کے حصول اور رزق کی فراہمی کے یکساں مواقع مہیا کئے جائیں گے۔ معاشرتی زندگی میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ کسی کو سماجی تقریبات میں، عبادت کے موقع پر، یا اجتماعی زندگی میں برتری حاصل نہیں۔ امیر ہو یا غریب، مسجد میں سب ایک ساتھ کھڑے ہوں گے۔

بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے — تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

۴۔ عالمگیر تہذیب

یہ تہذیب کوئی قومی یا ملکی یا نسلی تہذیب نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کی بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہے۔ اور ہر اس شخص کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے جو توحید، رسالت، کتاب اور یومِ آخر پر ایمان لاتے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی قومیت یا ملت بنائی ہے جس میں بلا امتیاز رنگ و نسل و زبان ہر انسان داخل ہو سکتا ہے، جس

کے اندر تمام روئے زمین پر پھیل جانے کی صلاحیت ہے اور جو تمام بنی آدم کو ایک نظمِ ملت میں پیوستہ کر دینے کی استعداد رکھتی ہے۔ یوں یہ حقیقی معنوں میں عالمگیر اور آفاقی تہذیب ہے۔ اسلامی تہذیب ایک الہامی تہذیب ہے جس کا رب، رب العالمین ہے، جس کا لانے والا رسول رحمۃ للعالمینؐ ہے اور جس کا ہدایت نامہ (یعنی قرآن مجید) ذکری للعالمین یعنی تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

۵۔ ہمہ گیر تہذیب

اسلامی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ہمہ گیر اور جامع تہذیب ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، قومی ہو یا بین الاقوامی، معاشی ہو یا قانونی، تدبیر منزل ہو یا سیاستِ مدن، دینِ اسلام سے خارج نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۚ (البقرۃ: ۲۰۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔"

اسلام ایک مکمل، جامع اور ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے۔ ایک طرف تو یہ انسان کی روحانی اخلاقی اصلاح کرتا ہے۔ اس میں ایمان کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ انسان کا رشتہ خدا سے استوار کرتا ہے اور پھر زندگی کے جملہ شعبوں اور پہلوؤں میں اس کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام انسان سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس حیاتِ دنیوی کو اس طرح بسر کرے کہ اس کی آخرت سنور جائے اور اسے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام انسان کی شخصی و انفرادی زندگی، خانگی زندگی، معاشرتی زندگی، تجارت و کاروبار سیاست و حکومت، عدالت، جنگ و صلح، جہاد و قتال، قومی و اجتماعی زندگی، غیر مسلموں سے معاملات، بین الاقوامی تعلقات غرض ہر شعبۂ زندگی میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ فقہ کی کتابوں میں طہارت و پاکیزگی سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک ہر عنوان و موضوع سے بحث کی جاتی ہے۔ ہمہ گیری کسی اور

مذہب و ملت اور تہذیب میں نظر نہیں آتی ۔ بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

۶۔ دین و دنیا میں مطابقت

اسلامی تمدن کے سوا دنیا کا ہر تمدن دین اور دنیا میں تفریق کرتا ہے اور دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیتا ہے ۔ مذہب کو عبادت گاہوں میں بند کر دیتا ہے ۔ اور اس کی ہدایت و تعلیمات کو صرف چند رسوم و رواج تک محدود رکھتا ہے ۔ دنیوی زندگی کو بالعموم مذہب سے خالی رکھتا ہے ، بلکہ بعض تمدن مثلاً جوگیانہ تمدن تو شہریت اور دنیوی زندگی کو مذہب کی عین ضد سمجھتے ہیں ۔ مادی تمدن چاہے جدید مادیت کا ہو یا قدیم مادیت کا ۔ وہ مذہب سے یا تو بالکل بیزار ہے اور اس کی ضرورت کا قائل نہیں یا اسے صرف ایک چھوٹے سے دائرے میں قید کر کے باقی ساری زندگی کو اس سے بے نیاز کر دینے کا قائل ہے ۔ اہلِ مغرب کا تو یہ نظریہ ہے کہ "مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے " یعنی اگر وہ چاہے تو خدا پر ایمان رکھے ، ورنہ ضروری نہیں ــــــ لیکن اسلامی تمدن میں دین و دنیا کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے ۔ اس کے نزدیک دین اس چیز کا نام ہے کہ دنیوی معاملات کو رسول اللہؐ کی ہدایات و تعلیمات کے مطابق سرانجام دیا جائے ، جو شخص ایسا کرے گا ، اس کی دنیا بھی دین بن جائے گی اور اس کا ہر لمحہ عبادت کہلائے گا ۔ دین کا راستہ دنیا سے الگ نہیں ، بلکہ ایک شخص پکا دنیادار ہوتے ہوئے بھی صحیح دیندار ہو سکتا ہے ۔ دنیا کو خدائی احکام کے مطابق برتنا ہی دین ہے ، جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے :

"اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ ۔

یعنی : " دنیا آخرت کی کھیتی ہے "

پھر فرمایا :

" لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ ۔

یعنی : " اسلام میں ترکِ دنیا کا کوئی مقام نہیں "

ارشادِ ربانی ہے :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ٥ (الذاریات)

ترجمہ : " میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے "

اسلام میں عبادت کا مفہوم پوری زندگی پر محیط ہے، خواہ روحانی پہلو ہو یا مادی پہلو، تدبیر منزل ہو یا امورِ سلطنت، سب کچھ تہذیب میں شامل ہے۔

بقول علامہ اقبالؒ ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

۷۔ طہارت و پاکیزگی

اسلام دینِ فطرت ہے اور طہارت و پاکیزگی پر خاص زور دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طہارت و پاکیزگی کے بغیر عبادت قبول نہیں ہو سکتی۔ جب تک انسان کا جسم اور لباس پاکیزہ اور صاف نہ ہو، نماز ادا نہیں ہو سکتی، بلکہ کوئی عبادت بھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے جسم و لباس کی طہارت و پاکیزگی پر جس قدر زور دیا ہے، اس کی مثال کسی مذہب و ملت میں نہیں ملتی۔

ارشادِ ربانی ہے؛

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ۝ (البقرۃ: ۲۲۲)

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنیوالوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طہارت کو جزوِ ایمان قرار دیا ہے؛

اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ ۝

پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔ (مسلم شریف)

درحقیقت اسلامی تہذیب طہارت و پاکیزگی اور نظافت کا دین ہے۔ وہ ظاہری طہارت و پاکیزگی پر بھی زور دیتا ہے، اور باطنی طہارت و پاکیزگی پر بھی۔ ظاہر ہے جسم و لباس کی صفائی روح پر خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔ اسلام میں اخلاقی طہارت یعنی جھوٹ، غیبت، خیانت، بدعہدی، منافقت، ریاکاری وغیرہ سے اجتناب بھی مطلوب ہے۔ اور روحانی پاکیزگی، کفر، الحاد سے بچاؤ بھی۔ نیز غسل، مسواک اور وضو اسلامی عبادات کے لوازمات ہیں، خوشبو اور نظافت مستحسن ہے۔ سب اسے پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ بودار اشیاء مثلاً لہسن، پیاز، مولی کھا کر مسجد میں جانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اجتماعی تقریبات مثلاً نماز جمعہ اور عیدین میں صاف ستھرا لباس پہننا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے۔ پھر زکوٰۃ کے معنی بھی پاکیزگی اور طہارت کے ہیں۔ زکوٰۃ سے مال پاکیزہ اور صاف ہو جاتا ہے اس طرح عقیدہ کی صفائی اور پاکیزگی کے لیے شرک و نفاق اور فسق و فجور کی نجاستوں سے

پاکیزگی ضروری ہے۔

۸۔ سادگی اسلامی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی ہے۔ سادگی اسلام کی روح ہے۔ اسلام ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں سادگی کی تلقین کرتا ہے فضول خرچی، اسراف، تعیش، تصنع و بناوٹ اور نمود و نمائش اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہیں۔ کھانے کے لیے سونے چاندی کے برتن، مردوں کے لیے ریشمی لباس اور سونے کا استعمال حرام ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر اسراف، ڈھول باجے اور رقص و سرود کی محفلیں بھی حرام ہیں۔ بلاضرورت بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر روح اسلام کے منافی ہیں۔ اس کے برعکس دینِ اسلام بود و باش، خوراک و غذا اور لباس و رہائش میں سادگی کا علمبردار ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے خود کبھی پُرتکلف امیرانہ اور عیش و آرام کی خواہش نہیں کی بلکہ اپنے لیے سادہ زندگی بسر کرنا پسند فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے مال و دولت کی کثرت اور اس کی ہوس کو امت کے زوال کا سبب شمار کیا ہے۔ درحقیقت تعیش اور بلند معیارِ زندگی کی طلب ناجائز ذرائع دولت کا سبب بنتی ہے اور پھر معاشرے میں رشوت، بدعنوانی، کرپشن، چور بازاری اور دوسروں کا حق مارنے کی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ لہٰذا جدید معاشرتی برائیوں کے سدِباب کے لیے سادگی کا نسخہ اکسیر ہے۔ بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

۹۔ عدل و احسان اسلامی تہذیب و تمدن میں باہمی معاملات کی بنیاد عدل و احسان پر ہے۔ عدل کا لغوی معنی ہے برابر برابر تقسیم کرنا۔ اس کا ہم معنی دوسرا لفظ انصاف ہے جس کا معنی ہے نصف نصف بانٹنا اور صحیح تقسیم کرنا اسلامی اخلاق میں عدل و احسان کا معنی ہے، ہر شخص کے ساتھ بلا رورعایت وہ معاملہ کرنا جس کا وہ اصل حقدار ہے۔ احسان حسن سے نکلا ہے اس کا لفظی معنی ہے خوبصورت کرنا اور حسین بنانا۔ اسلامی اخلاق میں احسان کا معنی ہے، دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا جو اس کے لیے فائدہ مند ہو۔ بشرطیکہ وہ سلوک عقل و شرع کے نزدیک صحیح ہو۔ یوں احسان کا مقام بہت بلند ہے اور عفو و درگذر، رواداری، نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ ہمدردانہ رویہ اور باہمی رعایت و ایثار و قربانی وغیرہ سب اس میں داخل ہیں۔ دراصل

احسان عدل و انصاف سے زائد اور بلند تر چیز ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ۝ (النحل: ۹۰)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کے افراد میں ایک دوسرے سے احسان کرنے کا جذبہ ہونا چاہیئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم ایک دوسرے سے عدل و انصاف تو ضرور ہی کیا جائے۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ (المائدہ: ۸)

ترجمہ: "اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔"

پھر ارشاد ہوا:

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ (الانعام: ۱۵۲)

ترجمہ: "اور جب بات کہو تو خدا لگتی (عدل کی) کہو، اگرچہ وہ کسی رشتہ دار کے خلاف ہی پڑ جاتے۔"

ارشادِ نبوی ہے:

"عادل سلطان زمین پر اللہ کا سایہ ہے۔"

"جو لوگ اپنے اہل و عیال اور ماتحتوں سے عدل و انصاف کرتے ہیں، وہ خدا کے ہاں نور کے منبروں پر جلوہ گر ہوں گے۔"

اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں اسی عدل و احسان کی روح کو سمو دیا ہے۔ اور معاشی، معاشرتی اور قانونی ہر لحاظ سے عدل و انصاف کی ضرورت و برتری پر زور دیا ہے۔

۱۰۔ انسانی شرف و اکرام

اسلامی تمدن انسان کو خلیفۃ اللہ (نائب خدا) قرار دیتا ہے، یہ وہ بلند ترین مقام ہے جو انسان کو اسلام کے سوا کسی نے نہیں دیا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۰)

ترجمہ: اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں، ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔"

اسلام کی رو سے یہ ساری کائنات انسان کی خاطر ہی پیدا کی گئی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۝ (البقرۃ: ۲۹)

ترجمہ: وہی خدا ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے، تمہارے لیے پیدا کیا۔"

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ ۝ (الحج: ۶۵)

ترجمہ: کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے زمین کی ساری چیزوں کو تمہارا مطیع و تابع فرمان بنا دیا ہے؟"

اس کے مقابلہ میں دوسرے تمدنی نظریات یا تو انسان کو حیوان کی سطح پر لے آتے ہیں جس کا مقصد محض کھانا پینا اور زندگی گزارنا ہے۔ یا انسانوں میں سے بعض کو خدائی کا مقام دے کر دوسروں کو ان کی عبادت کی ذلت کا مزا چکھاتے ہیں صرف اسلامی نظریہ تمدن ہی انسان صحیح حیثیت میں پیش کرتا ہے کہ نہ وہ خدا ہے نہ خدا کا بیٹا ہے اور نہ حیوانیت کے درجے تک گرا ہوا ہے بلکہ نائب خدا ہے اور یہ ساری کائنات اس کی خدمت میں لگا دی گئی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ دنیا کی سب چیزوں کو خدا کے احکام کے مطابق استعمال کرے۔ بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کیلئے

۱۱۔ اصلاحی و انقلابی تہذیب

اسلامی تہذیب محض ایک نظریاتی تہذیب ہی نہیں، جو لوگوں کے ذہنوں میں رہے، بلکہ یہ ایک اصلاحی اور انقلابی تہذیب بھی ہے، جس کا نصب العین یہ ہے کہ اسے دنیا میں عملی طور پہ نافذ و رائج کیا جائے اور خدا کی زمین پر خدا کا قانون نافذ کر دیا جائے اور غلبہ

اقتدار خدا کے دین کو حاصل ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝

(التوبہ : ۳۳)

ترجمہ: "وہی ذات ہے، جس نے اپنا رسولؐ ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ تمام ادیان پر غالب ہو، خواہ مشرکین اسے ناپسند ہی کریں۔"

قرآن مجید میں امتِ مسلمہ کو خیر الامم یعنی بہترین اُمت قرار دیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۝ (آل عمران : ۱۱۰)

ترجمہ: "(مومنو!) جتنی اُمتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں، تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو۔"

پھر فرمایا گیا :

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۝ (المائدہ : ۲)

ترجمہ: "نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

اخلاق میں متعدی تاثیر پائی جاتی ہے۔ اچھے اخلاق کو دیکھ کر دل میں نیکی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بُرے اخلاق سے لوگوں کو بُرائی کی ترغیب ہوتی ہے۔ اس لیے ہر شخص کا فریضہ ہے کہ وہ نہ صرف خود نیکی کی راہ اختیار کرے، بلکہ دوسروں کو بھی نیکی کی ترغیب دے اور انہیں بُرائی سے منع کرے۔

ارشاداتِ نبویؐ ہیں :

"تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو چاہیئے کہ اسے ہاتھ یعنی طاقت سے روک دے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو اسے زبان سے روک دے اور اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو دل میں اسے بُرا سمجھے۔ لیکن یہ کمزور ترین درجۂ ایمان ہے۔" (مسلم)

"اگر کسی قوم میں کوئی گناہ کرتا ہے اور وہ قوم باوجود قدرت کے اس شخص کو گناہ سے نہیں روکتی تو ان پر مرنے سے پہلے دنیا میں عذاب الٰہی مسلط ہو جاتا ہے۔"
(مشکوٰۃ شریف)

اس طرح اسلامی تہذیب محض ایک فطری تہذیب ہی نہیں بلکہ ایک اصلاحی اور انقلابی تہذیب و تحریک ہے، جس کا مقصد نیکیوں کی اشاعت و فروغ اور برائیوں کا سدِّباب کرنا ہے۔ اسلامی تہذیب خدا کی زمین پر ظلم و ستم، استحصال، ناجائز نفع اندوزی، جبر و تشدد، فحاشی و بے حیائی اور گمراہی و بے راہ روی کو مٹا کر دنیا کو جنت کا نمونہ بنانا چاہتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں حدیث کی روشنی میں "زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے اور آسمان اپنی برکتیں برسانے لگتا ہے۔"

۱۲۔ فرد اور جماعت میں توازن

اسلامی تمدن نے فرد اور معاشرے کے درمیان ایک حسین توازن قائم کیا ہے۔ وہ نہ تو فرد کی قانون سے بے نیازی آزادی کا قائل ہے، جس سے دوسروں کی حق تلفی ہو اور نہ جماعت کے فرد کے بنیادی حقوق پر دست درازی کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر شخص فرداً فرداً ذمہ دار ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

یعنی "تم میں سے ہر ایک نگہبان (ذمہ دار) ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔"

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال، ۷، ۸)

ترجمہ: تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔"

اس کے ساتھ اس نے افراد پر اجتماعی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال کر انہیں باہمی تعاون خیر سگالی، ہمدردی اور خدمت خلق کا حکم دیا ہے۔ الغرض اسلامی تمدن نہ تو فرد کو نظر انداز کرتا ہے نہ معاشرے کو۔ اس کے برعکس دوسرے تمدنوں میں یہ توازن و اعتدال موجود نہیں کسی تمدن میں فرد کو بے قید آزادی دے دی گئی ہے اور کسی میں معاشرے کو فرد کے

حقوق میں دست اندوزی کا حق دے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط پر مبنی ہیں اور ان کے مقابلے میں اسلام کی راہ اعتدال کی راہ ہے۔

۱۳۔ دائمی و ابدی تہذیب

زندگی مسلسل بدلنے والی چیز ہے۔ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی سکون و قرار حاصل نہیں ہے زمانے کے ساتھ ساتھ زندگی کے حالات و کوائف اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کا خالق رب العالمین ہے جو ازل سے ابد تک رہے گا۔ پہلے حضرات انبیائے کرامؑ خاص علاقوں میں خاص زمانوں کے لیے مبعوث ہوتے رہے۔ لیکن خدا کے آخری محبوب رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت قیامت تک کے لیے تمام لوگوں اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اس لیے اسلام کے اصول و ضوابط بھی دائمی اور ابدی ہیں اور اسلامی معاشرے کی نت نئی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ہیں، جو انسان کے لیے محض اپنی فکر اور تجربے کی بنا پر ایسے اصول وضع کرنا ممکن نہیں۔ زمان و مکان کی جو مجبوریاں انسان کو لاحق ہیں ان کی بنا پر اس کے لیے اہل نہیں ہے۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کی خصوصیت ہے کہ جہاں وہ ایک طرف زندگی کی ابدی صداقتوں کو پیش کرتا ہے، وہی انسانی معاشرے میں جو فطری تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، ان کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ لہٰذا اجتہاد اور قیاس اسلامی فقہ کے اہم اصول ہیں، جن کے ذریعے نت نئے مسائل کا حل نکالا جاتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ "ہر صدی کے آخر میں ایک مجدّد پیدا ہوگا جو دینِ حق کی تجدید کرے گا۔" پھر فرمایا "میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیائے کرامؑ کی مانند ہیں۔" اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے ابدی اصول ہر دور کے تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرتے ہیں۔

۱۴۔ زبردست ڈسپلن و نظم و ضبط

اسلامی تہذیب کی نمایاں خصوصیت اس کا زبردست ڈسپلن، نظم و ضبط اور اس کی طاقتور گرفت ہے، جس سے وہ اپنے پیرو کاروں کو شخصی و اجتماعی حیثیت سے اپنے آئین کا پابند بناتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین بنانے اور حدود مقرر کرنے سے پہلے قوانین کی پیروی اور حدود کی پابندی کرانے کا بندوبست کرتی ہے۔ سب سے پہلے وہ انسان سے خدا کی فرمانروائی تسلیم کراتی ہے۔ پھر اس کو یقین دلاتی ہے کہ رسولؐ اور کتاب (قرآن مجید) کے ذریعے جو احکام دیئے گئے ہیں، وہ خدا کے احکام ہیں۔

اور ان کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔ پھر ضمیر کی بیداری، فکرِ آخرت اور خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس اسے راہِ راست اور راستبازی پر قائم رکھتا ہے۔ اس کے بعد اسلامی تہذیب انسان کے لیے زندگی بسر کرنے کے طور طریقے وضع کرتی ہے اور اپنے مصالح کے لیے اس سے سخت سے سخت قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ ایسا طریقہ ہے جس سے زیادہ حکیمانہ طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس طریقہ سے اسلامی تہذیب کو جو زبردست اثر و نفوذ حاصل ہوا ہے، وہ کسی دوسری تہذیب کو نصیب نہیں ہوا۔

بقولِ علامہ اقبال ؒ

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

۱۵۔ اخلاقِ حسنہ

دینوی نقطۂ نظر سے اسلامی تہذیب ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کرنا اور ایک صالح اور پاکیزہ سوسائٹی وجود میں لانا چاہتی ہے۔ مگر ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے افراد اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ سے متصف نہ ہوں۔ اس غرض کے لیے افراد کا تزکیۂ نفس کیا جاتا ہے اور ان میں ایمان کو راسخ کیا جاتا ہے جو ایک اعلیٰ درجے کی مضبوط سیرت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی ایمان ہے جس کے ذریعے افراد میں صداقت، امانت، نیک نفسی، احتساب حق پسندی، ضبطِ نفس، تنظیم، فیاضی، وسعت نظر، خودداری، صبر و استقامت، شجاعت قناعت و استغنا، اطاعتِ امر اور اتباعِ قانون کے عمدہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ ان اوصاف کے نتیجہ میں ایک بہترین سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاشرہ اس کی بہترین مثال اور نمونہ ہے۔

بقولِ علامہ اقبال ؒ

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اخلاق

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم ، ۴)

ترجمہ: "اور بے شک آپؐ بلند اخلاق پر فائز ہیں۔"

"میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔"

(ارشادِ نبویؐ)

"تم میں سب سے اچھا وہ ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"

(ارشادِ نبویؐ)

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے — نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

(مولانا حالیؒ)

سوال: اخلاق کا مفہوم کیا ہے؟ نیز بتایئے کہ اسلام میں اخلاق کی اہمیت کیا ہے؟

جواب: **اخلاق کا مفہوم** "اخلاق" "خلق" کی جمع ہے اور خلق کے لغوی معنی عادت، فطری اور طبیعت کے ہیں۔ انسان کی پختہ عادتوں کو اور اس میں رچی بسی ہوئی باتوں کو جو بے تکلف اس سے سرزد ہوں، "اخلاق" کہتے ہیں۔ اگر یہ عادتیں اچھی ہوں تو اخلاقِ حسنہ کہلائیں گے اور اگر بُری ہوں تو اخلاقِ سیئہ۔ اخلاق کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو انسان کی نیت اور اختیار و ارادے کے ماتحت ہوں۔ وہ کام جو غیر ارادی طور پر انسان سے سرزد ہوتے ہیں، مثلاً دل کا دھڑکنا، نبض کا چلنا، بھوک پیاس اور سانس لینا۔ وہ "علم الاخلاق" کے دائرے سے باہر ہیں۔

امام غزالیؒ کا نظریہ امام غزالیؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب "احیاء العلوم" میں اخلاق کے بارے میں فرماتے ہیں:

"انسان حقیقت میں دو چیزوں کا نام ہے۔ جسم اور روح۔ اور جس طرح جسم کی ایک خاص صورت اور شکل ہے، روح کی بھی ہے۔ پھر جس طرح جسم کی صورت اچھی یا بُری ہوتی ہے، روح کی بھی ہوتی ہے اور جس طرح ظاہری صورت

کے لحاظ سے انسان کو خوبصورت یا بدصورت کہتے ہیں، روحانی صورت کے لحاظ سے اس کو خوش اخلاق یا بداخلاق کہا جاتا ہے۔"

"خلق کی اقسام بہت سی ہیں، لیکن اصلی ارکان جس سے اور تمام شاخیں نکلتی ہیں، چار ہیں، قوتِ علم، قوتِ غضب، قوتِ خواہش، قوتِ عدل۔ انہی چاروں قوتوں کے اعتدال کا نام حسنِ خلق ہے۔ کسی شخص میں اگر یہ چاروں قوتیں معتدل ہوں، تو وہ پورا خوش اخلاق ہو گا۔ اگر ایک یا دو ہوں تو ناتمام۔ جس طرح کسی کے تمام اعضاء خوبصورت ہوں تو کامل الحسن ہو گا ورنہ ناقص۔"

سید سلیمان ندویؒ کا نظریہ

سید سلیمان ندویؒ اپنی شہرِ آفاق کتاب "سیرۃ النبیؐ" میں فرماتے ہیں:

"اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کا ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے۔ اس کے اپنے ماں باپ، اہل وعیال، عزیز رشتہ دار، دوست واحباب، سب سے تعلقات ہیں، بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے، جس سے وہ محلہ، وطن، قومیت، علاقائیت، لسانیت یا کسی اور نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں، دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن وایمان اسی اخلاق کی دولت سے ہے۔ بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستہ سے بہکنے نہ دے۔"

اسلامی نظریہ اخلاق

اسلام کا نظریۂ اخلاق دین سے الگ کسی اور چیز کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ دین ہی کا ایک حصہ ہے اس کی بنیاد بالکل وہی ہے جو خود دین کی ہے۔ یہ کائنات ایک مقصد کے تحت بنائی گئی ہے۔ انسان خدا کا نائب ہے اور اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اس دنیا کی چیزوں کو احکامِ الٰہی کے مطابق استعمال کرے۔ وہ اپنی ہر نیکی اور بدی کے لیے خدا کے سامنے

جوابدہ ہے۔ یہ دنیا عمل کا گھر ہے۔ جزا و سزا اور بدلے کے لیے دوسرا جہان مقرر ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ خدا کے مقرر کردہ نمائندوں (یعنی رسولوں) نے نیکی اور بدی کا جو تصور پیش کیا ہے، اس کے مطابق نیکی کو اختیار کرے اور برائی سے بچے۔ فطرتِ انسانی ہمیشہ سے جن صفات کو پسندیدہ اور مستحسن سمجھتی آئی ہے مثلاً انصاف، صداقت، شجاعت، وعدہ وفائی اور ہمدردی، خدا کے پیغمبروں نے انہی صفات کو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک خاص قرینے سے چن دیا ہے اور وہ صفات، جنہیں ہمیشہ انسان نے برا سمجھا ہے مثلاً جھوٹ، دغابازی، ظلم و ستم، بدعہدی، تنگ دلی، بزدلی، بددیانتی وغیرہ۔ اسلام نے ایسی بری صفات سے نفرت دلائی ہے اور ان سے بچنے کے طریقے بتائے ہیں۔ نیکی کو معروف (یعنی جانی پہچانی ہوئی چیز) اور برائی کو منکر (یعنی بیگانہ چیز) کہا جاتا ہے۔

اخلاق کی اہمیت

سید سلیمان ندوی ''سیرۃ النبیؐ'' میں لکھتے ہیں:۔

''ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم محمدیؐ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اخلاق حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے۔ شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوق العباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے، جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہوسکتی جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ''جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس (ظالم بھائی) کو چاہیئے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرا لے، ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے۔ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی، اور

نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔"

(صحیح و بخاری)

اسلامی نظریۂ اخلاق کی خصوصیات

اسلام کے پیش کردہ تصورِ اخلاق میں تین نمایاں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ رضائے الٰہی کا حصول

اسلامی نظامِ اخلاق میں انسان کا بلند ترین مقصد رضائے الٰہی حاصل کرنا ہے۔ نیکیوں کو اختیار کرنے، باہمی معاملات کو درست کرنے، دوسروں کے حقوق ادا کرنے اور برائیوں سے باز رہنے میں انسان کی ذاتی غرض شامل نہ ہو، بلکہ یہ سب کچھ اس لیے کرے کہ اس کا خدا راضی ہو جائے۔ اسلام انسان کو ذاتی نفع و نقصان کے تصور سے بالاتر کر دیتا ہے۔ اس سے اس کا کردار بلند ہو جاتا ہے۔ اس کے معاملات کی بنیاد اس امر پر ہوتی ہے کہ میں خدا کے بندوں سے برابری کی سطح پر لین دین کرتا ہوں۔ اس سے باہمی ہمدردی اور مفادات کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ غرض اسلام کا تصورِ اخلاق انسان کے اخلاق کو پختگی اور پائیداری بخشتا ہے۔

سوداگری نہیں، یہ عبادتِ خدا ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے (اقبالؒ)

۲۔ سادگی

اسلامی تصورِ اخلاق میں سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ بناوٹ، ریاکاری اور تصنع سے پاک ہے۔ فطرتِ انسانی جن چیزوں کی اچھائی کی گواہی دیتی ہے وہ انہیں اپنا لینے اور تمدن میں ایک خاص حسنِ ترتیب سے سجا لینے کا حکم دیتا ہے اور جن چیزوں کو انسانی فطرت برا جانتی ہے، وہ ان سے نفرت پیدا کرتا اور انفرادی و اجتماعی زندگی سے انہیں نکال پھینکنے کا حکم دیتا اور اس کے طریقے بتاتا ہے یہ اخلاق انسانوں کے لیے ہے۔ دیوتاؤں اور فرشتوں کے لیے نہیں۔ یہ نظامِ اخلاق، زندگی کے سارے اجزا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ یہ ساری زندگی کے لیے ہے اور ہر مرتبے اور ہر درجے کا انسان ——— امیر و غریب، شہری و دیہاتی، شاہ و گدا ——— اس پر عمل کر سکتا ہے۔

اے ذوقِ تکلف میں تکلیف سراسر ہے
اچھے ہیں وہ لوگ جو تکلف نہیں کرتے

پورے عالم اسلام کا جسم متاثر ہوتا ہے۔ ہم سب کا نفع و نقصان ایک ہے۔ ہمارا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، قبلہ ایک ہے۔ قرآن ایک ہے۔ ہمارا دین ایمان ایک ہے اس لیے لامحالہ ہمیں بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

فرد کی اہمیت

ایمان (اسلام) کا روشن آفتاب پورے عالم کو منور کر رہا ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے
(اقبال)

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
(مولانا ظفر علی خاں)

فرد معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ چنانچہ معاشرے کی کامیابی و ناکامی کا انحصار افراد پر ہے اس لیے اصلاحِ افراد اصلاحِ معاشرہ کا پہلا مرحلہ ہے کیونکہ افراد کے وجود ہی سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ گویا معاشرہ ایک عمارت ہے اور افراد اس عمارت کا مسالہ، اینٹ اور پتھر ہیں۔ عمارت کی مضبوطی اس بات پر منحصر ہے کہ اس کا ہر پتھر خوب ترشا ہوا ہو۔ ہر اینٹ اچھی طرح پکی ہوئی ہو۔ ہر شہتیر مضبوط اور پائیدار ہو۔ چنانچہ اسلام کا مطلوبہ انسان اور مردِ مومن جن عناصر سے ترکیب پاتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

تقویٰ، ذکر، صبر، شکر، عفو، عدل، احسان، خدمتِ خلق، انہی اخلاقِ حسنہ پر ایک مسلمان کی شخصیت استوار کی جاتی ہے اور انہی اوصافِ حمیدہ سے متصف ہو کر وہ معاشرے

۳۔ نیکیوں کا فروغ

اس نظامِ اخلاق میں انسانی تمدن کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہو۔ اچھائیاں نشوونما اور ترقی پائیں اور برائیوں کا قلع قمع کیا جائے۔ خود غرضی، نفس پرستی اور لذت پسندی کو مٹا دیا جائے، اور یہ دنیا صحیح معنوں میں انسانوں کی جنت بن جائے۔ جس تمدن کی بنیاد اس پاکیزہ اور بلند تصور پر ہو، اس میں انتشار اور فساد پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس میں کسی حق تلفی اور بے انصافی کا خدشہ نہیں ہوتا۔ اس میں بسنے والا انسانی معاشرہ صحیح معنوں میں انسانی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ اور تاریخ میں اسے زندۂ جاوید مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہمیں بیشتر مثالیں ملتی ہیں۔ بقول حفیظ جالندھری ؎

بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمانہ منتظر ہے پھر نئی شیرازہ بندی کا

اخلاقِ نبوی ﷺ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ و اشاعتِ دین میں ایمان کے بعد جن چیزوں پر زیادہ زور دیا ہے، ان میں اخلاقِ حسنہ کو نمایاں مقام حاصل ہے جس طرح دینِ اسلام اپنے کامل اور دائمی اور آفاقی و عالمگیر ہونے میں آخری دین ہے، اسی طرح جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس اخلاق پر کمال اور دوام کے لحاظ سے آخری اور امتیازی سند ہے جن کا اظہار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمایا:

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ (موطا امام مالکؒ)

ترجمہ: "میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔"

قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد یوں بیان کئے گئے ہیں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ
رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا
مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (آل عمران، ۱۶۴)

ترجمہ: بے شک خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجے، جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے

اور خدا کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے"

اس آیت مبارکہ میں بعثتِ نبویؐ کے چار مقاصد بیان کئے گئے ہیں یعنی :

۱۔ تلاوتِ آیات ۲۔ تزکیۂ نفس
۳۔ کتاب کی تعلیم ۴۔ حکمت کی تعلیم

تزکیہ سے مراد انسان کے باطن کو کفر و شرک کی آلائشوں سے پاک کرنا اور کتاب و حکمت کی تعلیم سے مراد نبوت کے وہ علوم ہیں، جن کا بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔

قرآن مجید اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم ۴)

ترجمہ: "اور بے شک آپ بلند اخلاق پر فائز ہیں"

ایک صحابی نے جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سوال کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق کیسا تھا؟ تو آپؓ نے صحابی سے فرمایا "کیا تم قرآن مجید نہیں پڑھتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "پڑھتا ہوں" حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن۔ یعنی "آپؐ کا خلق قرآن ہی تھا" گویا حضورؐ کا اخلاق تعلیمات قرآنی کا عملی نمونہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں حضورؐ کی سیرت طیبہ میں عملی قرآن جلوہ فرما تھا۔ اسی لیے ارشادِ ربانی ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

یعنی: "(اے مسلمانو!) بے شک تمہارے لیے رسول اللہؐ کی ہستی میں بہترین نمونہ ہے"

ارکانِ اسلام اور اخلاق

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارکان اسلام کی اصل حسنِ اخلاق کی تکمیل ہے چنانچہ ارکانِ اسلام فرد کی اصلاح و تربیتِ اخلاق کا نسخہ کیمیا ہیں۔ بقول سید سلیمان ندوی؟

" دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے۔ قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقے سے واضح کیا گیا ہے۔۔۔۔

ان عبادات کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے۔ اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت

کے جوہرِ معنی سے یکسر خالی اور معرّا ہیں۔ وہ درخت ہیں، جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں، جن میں روح نہیں۔"

ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ توحید توحید سے شرک کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ غیر اللہ کا خوف انسان کے دل سے ختم ہو جاتا ہے اور اس میں احساسِ ذمہ داری، تقویٰ و پرہیزگاری، نیکی سے رغبت اور بدی سے نفرت، بہادری و سرفروشی، صبر و تحمل، مال خرچ کرنے کا جذبہ، بامقصد زندگی کا شعور، بازپرس کا خوف، ہمہ وقتی فکر، اللہ کی مخلوق سے ہمدردی و شفقت، دنیا پر آخرت کو ترجیح دینا، اللہ کی طرف رجوع، خالص عبادت و اطاعت جیسے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(اقبال)

۲۔ نماز قرآن مجید میں نماز کا مقصد یوں بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۝

یعنی "بے شک نماز انسان کو بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔"

علاوہ ازیں نماز انسان میں یہ اوصاف پیدا کرتی ہے۔ قربِ الٰہی، روحانی پاکیزگی، یادِ الٰہی، خوفِ خدا، اخوت و محبت، اطاعتِ امیر، نظم و ضبط، تنظیم، مساوات، پابندیٔ وقت، جسمانی پاکیزگی و صفائی، فرض شناسی، اجتماعیت، عشق، اطاعت وغیرہ۔

۳۔ زکوٰۃ زکوٰۃ دراصل بندوں کا حق ہے۔ یعنی اسلامی معاشرہ میں جو لوگ نادار و مفلس اور محتاج ہیں، ان کی مدد اور سرپرستی کی جائے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: "زکوٰۃ دولت مندوں سے لی جائے اور فقراء میں تقسیم کی جائے۔" پھر فرمایا: "زکوٰۃ اسلام کا خزانہ ہے۔" ایک اور حدیث کے مطابق "وہ شخص مومن نہیں جو خود تو سیر ہو کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔" زکوٰۃ سے یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں: اصلاحِ اخلاق، دولت کی گردش، غریب پروری، اقتصادی تعاون، معاشی مسئلہ کا حل، انفرادی نفرت و بد اخلاقی کا خاتمہ، مال کی پاکیزگی، جذبۂ سخاوت، تزکیۂ نفس، دولت مندی کا

کی بیماریوں کا علاج، اشتراکیت کا علاج، اقتصادی و تجارتی فائدے وغیرہ۔

۴. روزہ قرآن مجید میں روزہ کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان متقی و پرہیزگار بن جائیں۔ تقویٰ جامع صفت ہے اس سے مراد نفس اور دل کی وہ کیفیت ہے جس سے انسان ہر برائی سے نفرت اور ہر بھلائی سے محبت کرنے لگتا ہے اور وہ حسنات کا پیکر بن جاتا ہے۔ اسی لیے اسلامی معاشرہ میں سب سے معزز و مکرم شخص وہ ہے جو متقی و پرہیزگار ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: "جو شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر عمل کرنے سے باز نہ رہا تو خدا کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی حاجت نہیں۔" (مشکوٰۃ)

علاوہ ازیں روزے سے یہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں، خدا کی بندگی و رضا، ضبطِ نفس، صبر و تحمل، جفاکشی، ثابت قدمی، یکسوئی، بہتر کارکردگی، جذبۂ ہمدردی و ایثار، اتحاد و مساوات، اللہ پر پختہ ایمان و خوفِ خدا، آزمائش و تربیت، پیروی شریعت کی لگاتار مشق، سادہ زندگی، طبی فوائد، پابندیٔ وقت، سازگار روحانی ماحول، وقت کی کفایت، دیگر اخلاقِ حسنہ وغیرہ۔

۵. حج حج ملتِ اسلامیہ کی ایک عالمگیر اور اجتماعی عبادت ہے۔ پوری ملت ایک مرکز پر جمع ہو کر عظیم الشان اتحاد و یک جہتی اور یگانگت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس مرکز پر پہنچ کر تمام علاقائی، لسانی اور رنگ و نسل اور حسب نسب کے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں اور پوری امتِ مسلمہ ایک رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں حج کے بے شمار فوائد ہیں جیسے اتحاد عالمِ اسلام، اسلام کی عظمت کے آثار، ملی نظم و ضبط، اخلاقِ حسنہ کا فروغ، بین الاقوامی تعلقات، جغرافیائی معلومات کا ذریعہ، عربی زبان سے واقفیت، مساوات کا بے مثال منظر، اقتصادی ثمرات، احساس ذمہ داری، اصلاح کا ذریعہ، کسب حلال کی ترغیب، روحانی پاکیزگی، شوکت اسلام، عالم اسلام میں حرکت، عالم اسلام کی بیداری کا موسم، قیامِ امن کی سب سے بڑی تحریک، پرہیزگاری اور تقویٰ کی افزائش وغیرہ۔

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا
(اقبال)

حاصل کلام الغرض ارکانِ اسلام انسان کی انفرادی و اجتماعی اصلاح و تربیت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ یہ دراصل اس مثالی اجتماعی نظام

کی تشکیل کرتے ہیں جو اسلامی تہذیب کا اصل مقصود و مدعا ہے۔ ان کے ذریعے افرادِ معاشرہ کے کردار کی بھرپور اصلاح ہوتی ہے۔ یہ منظم عادات و خصائل کا وہ مستحکم و پائیدار سانچہ ہوتا ہے جس سے پورا معاشرہ امن و سکون، سلامتی، خوشحالی و فارغ البالی اور حسنات کا گہوارہ بن جاتا ہے اور پورے معاشرے میں اخوت، اتحاد و یک جہتی، مساوات، ہمدردی، ایثار و قربانی اور حقیقی شادمانی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اس کا بہترین نمونہ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس معاشرے میں نظر آتا ہے، جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تشکیل کردہ تھا۔

ارشاداتِ نبویؐ

حسنِ خلق کی اہمیت اور فضیلت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بے شمار ہیں۔ احادیث مبارکہ کی کتب میں اس سلسلے میں ہزاروں احادیث بیان کئے گئی ہیں۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں اخلاق کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے ذیل میں مشکوٰۃ شریف سے کچھ احادیث پیش کی جاتی ہیں :-

۱۔ کامل ایمان اور حسنِ اخلاق لازم و ملزوم ہیں :

"ایمان کے کامل وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں۔" (ابوداؤد۔ دارمی)

۲۔ حسنِ اخلاق اصل نیکی ہے :

"نیکی حسنِ اخلاق کا نام ہے۔" (مسلم)

۳۔ نبی کا پیارا شخص کون ہے ؟

"تم میں سے مجھ کو وہ شخص بہت پیارا ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔" (بخاری و مسلم)

۴۔ نیک ترین شخص کون ہے ؟

"تم میں نیک ترین وہ شخص ہے جس کا اخلاق اچھا ہو۔" (بخاری و مسلم)

۵۔ بہتر چیز کون سی ہے ؟

"انسان کو جو چیزیں دی گئی ہیں، ان میں بہتر چیز خوش خلقی ہے۔" (بیہقی)

۶۔ میزان میں سب سے وزنی چیز کون سی ہے ؟

"جو چیز قیامت کے دن مومن کے اعمال کی ترازو میں رکھی جائیں گی، ان میں سب سے وزنی چیز حسنِ خلق ہے۔" (ترمذی)

۷۔ نمازی اور روزہ دار کا درجہ :

— "مومن اپنی خوش خلقی کے ذریعہ رات کو عبادت (قیام) کرنے والے اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھنے والے شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے" (ابوداؤد)

۸۔ حبِ الٰہی کا ذریعہ حسنِ اخلاق ہے:

"اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں"

۹۔ "خوش خلقی ہی دین ہے"

۱۰۔ "اعمال میں افضل چیز حسن خلق ہے"

۱۱۔ "اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو حسن خلق میں بڑھ جاؤ"

۱۲۔ "خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے، جس طرح دھوپ برف کو"

۱۳۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا:

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِیْ فَاَحْسِنْ خُلُقِیْ

یعنی: "اے اللہ! تو نے میری پیدائش کو اچھا کیا، میرے خلق کو بھی اچھا بنا۔" (احمد)

پیامِ اقبالؒ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی!
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

(ضربِ کلیم)

باب ۲

اسلامی معاشرے میں زندگی کے دائرہ ہائے کار

شخصی زندگی (فرد)

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر — ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
(اقبالؒ)

سوال:۔ اسلامی معاشرے میں زندگی کے دائرہ ہائے کار کی وضاحت کیجئے۔

(یا)

انسانی زندگی کے ارتقائی مدارج پر بحث کیجئے۔

جواب: **انسانی زندگی کے ارتقائی مدارج**

انسان کی زندگی کا آغاز انفرادیت یعنی شخصی زندگی سے ہوتا ہے۔ گویا فرد ایک اکائی ہے۔ پھر یہ دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ایک مرحلہ دوسرے مرحلے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور آخر کار عالمِ اسلام کا دائرہ تمام اکائیوں اور دائروں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم انسانی زندگی کے ارتقائی مدارج کو مندرجہ ذیل شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ فرد ۲۔ گھر ۳۔ مکتب و مسجد
۴۔ معاشرہ ۵۔ عالمِ اسلام

ذیل میں ان کی تفصیل بیان کی جاتی ہے :۔

۱۔ فرد

انسانی زندگی کا ابتدائی دائرہ یا اکائی فرد کی زندگی ہے۔ اس کی اپنی ایک مستقل شخصیت اور انفرادیت ہے۔ ابتداء میں فرد ایک بے بس اور کمزور و ناتواں بچے کی حیثیت سے جنم لیتا ہے، جس کی بقاء، پرورش اور نشوونما کا تمام تر

انحصار دوسروں پر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کا محتاج اور دست نگر ہوتا ہے۔ فرد کی ذات میں قدرت نے بے پناہ صلاحیتیں ودیعت کی ہوتی ہیں۔ آگے چل کر جب یہ صلاحیتیں نشوونما پاکر اجاگر ہوتی ہیں تو فرد کے ہاتھوں بڑے بڑے کارنامے سرانجام پاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں ہر فرد کی نشوونما کے مناسب مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ کیونکہ معاشرہ افراد ہی کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشرے میں فرد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ کسی کل کا ایک بے جان پرزہ نہیں بلکہ زندہ و پائیدار نظامِ تمدن کا جیتا جاگتا حصہ ہے اس کی کچھ اپنی خواہشات، ضروریات اور تقاضے ہیں۔ اپنی ایک مستقل شخصیت ہے، جو معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لہٰذا اسلام کے نظامِ تمدن میں افراد کو اپنی شخصیت کی نشوونما اور اسے مکمل کرنے کے پورے مواقع حاصل ہیں۔ وہ انفرادی طور پر خدا کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہیں۔ ان کی ذاتی و شخصی آزادی میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اخلاق و تہذیب کا مخاطب معاشرے سے پہلے فرد ہے۔ جب تک فرد درست نہ ہو جائے، جماعت اور معاشرہ کیونکر درست ہو سکتے ہیں کیونکہ جماعت اور معاشرہ کی درستی اور ان کا بگاڑ دراصل افراد کی درستی اور بگاڑ پر منحصر ہے۔

۲۔ گھر گھر یا خاندان انسانی تمدن کا سب سے پہلا اور بنیادی دائرہ ہے انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد رشتوں اور تعلقات کا ایک وسیع جال دیکھتا ہے۔ سب سے پہلے پرورش کے لیے اسے ماں باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی بچے کی اولین درسگاہ اس کا گھر ہے۔ جہاں اس کے والدین، بہن بھائی اور دیگر رشتہ دار اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بچے کی اولین تربیت گھر پر ہوتی ہے۔ وہ افرادِ خانہ سے خصائل و عادات سیکھتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق بچے میں نقل کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ افرادِ خانہ کے ہر فعل، قول اور حرکت کی نقل کرتا ہے۔ بالخصوص والدہ بچے کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ماں کی گود بچہ کی سب سے پہلی درسگاہ ہے۔ ماں کی محبت و شفقت اور حکمت بچے کی پوری زندگی کا رُخ متعین کر دیتی ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا کی عظیم الشان شخصیات کی عظمت کا راز ماں کی ابتدائی تربیت پر مضمر ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ "جو ہاتھ جھولا جھلاتا ہے، وہ دنیا پر حکومت کرتا ہے۔" ارشادِ نبویؐ ہے "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔" اس کے علاوہ

گھر کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے میاں بیوی میں محبت و رحمت کے گہرے جذبات کی ضرورت ہے۔ بڑے بوڑھوں کی زندگی کو آرام دہ بنانے کے لیے فرمانبردار اولاد کی ضرورت ہے اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے۔ اس لیے اس نے خاندانی یا گھریلو زندگی کے تمام ارکان کے لیے حد بندیاں قائم کر دی ہیں۔ ہر ایک کے حقوق و فرائض بتا دیتے ہیں اور زندگی کو پُر مسرت اور کامیاب بنانے کے لیے قوانین مقرر کر دیتے ہیں۔

۳۔ مکتب و مسجد

جب بچہ تعلیم و تدریس کے قابل ہوتا ہے تو اسے مکتب اور مدرسہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ مکتب کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس سے مراد ہے ہر وہ ادارہ جو ہمارے معاشرے میں تعلیم و تربیت اور اصلاح و اخلاق کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس تعریف کی رو سے جدید و قدیم ہر قسم کے مدرسے، دارالعلوم، جامعے، سکول، کالج اور یونیورسٹیاں مکتب کے دائرے میں داخل ہیں۔ مکتب ہماری زندگی کی سب سے اہم ضرورت یعنی تعلیم و تربیت کا مرکز ہے۔ ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ ہے۔ اس سے نکل کر بچہ سیدھا مکتب میں پہنچتا ہے جہاں اسے گھر کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ماحول میسر آتا ہے۔ جہاں اسے لائق و شفیق اساتذہ سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ اپنے ہم مکتب ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور وہ انسان سے محبت، ہمدردی، تعاون و اشتراک کا درس لیتا ہے۔ ہر قوم و ملت نے ہر زمانے میں تعلیم گاہ کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا مناسب انتظام کیا ہے۔

اسی طرح اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت مسلم ہے۔ مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے اب تک اسلامی تعلیم کا مرکز رہی ہے۔ مسجد اسلامی عقائد و اعمال اور احکام کو لوگوں تک پہنچانے کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ وعظ و ارشاد اور خطبہ مسجد میں دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا مرکز یہی ہے۔ اس طرح اسلامی معاشرہ میں مسجد بھی ایک مستقل دائرہ کار ہے جو ایک مسلمان کی زندگی پر بڑا مفید اور گہرا اثر ڈالتی ہے۔ وہ اسے اجتماعی زندگی کی راہ پر ڈالتی ہے۔ بچے کو مسجد میں روحانی اور دینی ماحول میسر آتا ہے۔ یہاں پر ہی وہ مساوات اخوت، ہمدردی، تنظیم، نظم و ضبط اور احساسِ فرض کا درس لیتا ہے۔ مسجد میں اسلامی عبادات بجالانے سے انسان میں امانت، اطاعتِ امیر، پابندیٔ وقت اور یقین محکم کا جذبہ نشو و نما پاتا ہے۔ گویا مسجد معاشرہ کی سیاسی، مجلسی اور اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اگر اس مرکز سے بھرپور اور صحیح معنوں میں فائدہ اٹھایا جائے تو اسلامی معاشرے کی کایا پلٹ سکتی ہے۔

۴۔ معاشرہ

گھر اور مکتب و مسجد کی منازل طے کر کے بچہ معاشرے کی وسیع دنیا میں داخل ہوتا ہے اور اپنی تعلیم و تربیت سے خود بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ معاشرہ کا لفظ معاشرت سے ہے جس کے معنی ہیں "باہم زندگی گزارنا یا مل جل کر رہنا"۔ آج کل لفظ معاشرہ بالعموم سوسائٹی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد انسانوں کا وہ گروہ ہے جو چند مشترک اصولوں کے ماتحت زندگی گزار رہا ہو۔

اسلامی معاشرے سے مراد وہ جماعت یا گروہ ہے جو اسلام کے بتائے ہوئے نظریات تہذیب پر دل سے یقین رکھتا ہو اور اس کے افراد کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں تمدن و شہریت کے اسلامی اصول عملی طور پر رائج ہوں۔ معاشرے کی وسیع دنیا میں انسان کو چند ناگوار امور سے بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حقوق کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کے عائد کردہ فرائض بھی اسے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ تاکہ وہ معاشرہ کی صحیح طور پر خدمت کر سکے۔ اور اپنی زندگی خوش و خرم گزار سکے۔ ساتھ ہی معاشرہ کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے اسے ازدواجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے کہ انسان زندگی کی اس منزل پر اپنے ابنائے جنس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اسے رشتہ داریوں، پڑوسیوں اور معاشرے کے دیگر طبقوں سے تعلقات استوار کرنے ہوتے ہیں۔ اگر یہ تعلقات اور حقوق و فرائض بطریق احسن ادا کیے جائیں تو ایک مثالی معاشرہ معرضِ وجود میں آسکتا ہے۔

۵۔ عالم اسلام

ان تمام مدارج میں ملت و امت کا دائرہ سب سے زیادہ وسیع ہے۔ امت کا لفظ اُمّ سے نکلا ہے۔ اُمّ کے معنی ہیں مرکز۔ یہیں سے اُمت کے معنی میں مرکزیت کا مفہوم پیدا ہوا۔ لغوی معنی کی رو سے اس لفظ کا معنی "بڑا گروہ" "جماعت اور "طریقہ" ہے۔ اصطلاح میں اُمت کا معنی ہے کسی پیغمبر کی جماعت اور اس پر ایمان لانے والا گروہ۔ چنانچہ امتِ اسلامیہ سے مراد وہ بڑی جماعت ہے جو خدا کے آخری محبوب رسُول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش کردہ دین میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ ایک عالمگیر اُمت ہے۔ جو رنگ و نسل، قومی، لسانی اور جغرافیائی رشتوں سے بالاتر ہے۔ ہر شخص خواہ اس کا تعلق کسی خطہ سے ہو، اس عالمگیر ملت یا امت کا رکن ہے اور اس کے سنوارنے اور بگاڑنے میں برابر کا شریک ہے۔ اس طرح پورا عالم اسلام ایک جسم واحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر جسم کے کسی حصے کو نقصان پہنچے تو اس سے

کا مفید اور کار آمد رُکن بنتا ہے۔ آئندہ صفحات میں انہی کی تفصیل دی جا رہی ہے۔

تقویٰ

وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۝ (البقرۃ: ۲۲۴)

ترجمہ: اور تقویٰ کرو اور لوگوں کے درمیان مُصلح کراؤ۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۝ (النبا: ۳۱)

ترجمہ: بلاشبہ متقیوں کے لیے کامیابی ہے۔

سوال: تقویٰ کا مفہوم کیا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت و فضیلت بیان کیجئے؟

جواب: **تقویٰ کا مفہوم** تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے۔ عربی میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں۔ گویا تقویٰ کا لفظی معنی ہے ڈرنا، بچنا اور رک جانا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے خدا کی نافرمانی سے ڈرنا، اس کے احکام کی مخالفت سے بچنا اور جو کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہیں۔ ان سے رُک جانا۔

سید سلیمان ندویؒ اپنی مشہور تصنیف "سیرۃ النبیؐ" میں لکھتے ہیں:

"وحی محمدیؐ کی اصطلاح میں تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے، جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔"

مولانا مودودیؒ نے تقویٰ کی حقیقت یوں بیان کی ہے کہ:

"تقویٰ نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساسِ ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، بندہ ہونے کا شعور ہو خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس ہو۔ یہ ضمیر کی بیداری کا نام ہے۔"

حضرت کعب الاحبارؒ کی وضاحت

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت کعبؒ سے پوچھا: "تقویٰ کسے کہتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "کیا آپ نے کبھی خاردار جھاڑیوں والے راستے سے سفر کیا ہے؟" حضرت عمرؓ نے کہا: "ہاں" حضرت کعبؒ نے پوچھا: "آپ جھاڑیوں میں سے کیسے گزرتے ہیں؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "میں اپنے کپڑے سمیٹ کر اور جسم سکیڑ کر گزرتا ہوں تاکہ کوئی کانٹا مجھے نہ لگ جائے" حضرت کعبؒ نے کہا: "اسی کا نام تقویٰ ہے" یعنی یہ دنیا ایک خاردار جنگل ہے جس میں گناہوں کے کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اس جنگل میں سے انسان کا اس طرح گزرنا کہ اس کا دامن گناہوں سے آلودہ نہ ہو، تقویٰ کہلاتا ہے۔

تقویٰ کے درجے

امام بیضاویؒ نے تقویٰ کے چار درجے بیان کئے ہیں:

ا۔ شرک سے بچنا ب۔ حرام چیزوں اور ممنوع کاموں سے بچنا۔

ج۔ مشکوک چیزوں سے بچنا۔ د۔ اپنے ہر کام میں رضائے الٰہی کو پیش نظر رکھنا اور اس سے غافل کرنے والی ہر چیز کو چھوڑ دینا۔

تقویٰ کا یہ آخری مقام وہی ہے جسے ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "احسان" کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔

تقویٰ کی حقیقت

"تقویٰ نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، بندہ ہونے کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس ہو اور اس بات کا ادراک ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے، جہاں خدا نے کچھ عمر دے کر مجھے بھیجا ہے۔ آخرت میں میری نجات کا فیصلہ اس چیز پر منحصر ہے کہ میں اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اور انسانوں کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہوں، جن سے میری زندگی متعلق ہے۔ یہ احساس و شعور جس شخص میں پیدا ہو جاتے اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کی دینی حس تیز ہو جاتی ہے۔ اس کو ہر وہ چیز کھٹکنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔ اس کا احساسِ فرض اسے مجبور کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے تمام حکموں کو پوری فرمانبرداری کے ساتھ بجا لاتے۔ اس کی خدا ترسی اس موقع پر اس کے قدموں میں

لغزش پیدا کر دیتی ہے، جہاں حدود اللہ سے تجاوز کا اندیشہ ہو۔ اس خیال سے بھی اس کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔"

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

تقویٰ ہی تمام نیکیوں کی جڑ ہے

سید سلیمان ندویؒ کے مطابق:

"اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔"

اگر غور کیا جائے تو تمام نیکیوں کی بنیاد تقویٰ ہی ہے اور انسان برائی سے باز نہیں رہ سکتا، جب تک اس کے دل میں تقویٰ موجود نہ ہو۔ اسی لیے قرآن مجید میں بار بار تقویٰ پر زور دیا گیا ہے اور کئی مقامات پر اِتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرو) کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے بارے میں فرمایا ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی "یہ کتاب خدا سے ڈرنے والوں کی رہنمائی کرتی ہے"۔ گویا تقویٰ تمام اسلامی عبادات و اعمال کی روح ہے اور انسانی نیکیوں کا سنگِ بنیاد ہے۔

قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں تقویٰ کی صفت پر بہت زور دیا گیا ہے کیونکہ ہر نیکی، خیر اور بھلائی کی بنیاد اسی پر ہے ذیل میں کچھ آیات پیش کی جاتی ہیں:۔

۱ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرۃ: ۲۱)

ترجمہ: اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

۲ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (النساء: ۱۲۸)

ترجمہ: اور اگر تم نیکوکاری اور پرہیزگاری کرو گے تو خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے"

۳۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (آل عمران: ۱۸۶)

ترجمہ: اور اگر تم صبر اور پرہیزگاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

۴۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۝ (المائدہ : ۸)

ترجمہ: انصاف کیا کرو کہ وہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔

۵۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران : ۱۰۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

حدیث کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں بھی صفتِ تقویٰ کی بہت تاکید کی گئی ہے اور اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث سے واضح ہے:۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا (مسلم) یعنی: "تقویٰ یہاں ہے"

۲۔ تقویٰ سے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے۔ (مسلم)

۳۔ جن چیزوں کا حلال یا حرام ہونا شریعت سے معلوم نہیں، صاحبِ تقویٰ ایسی مشکوک چیزوں سے بھی کنارہ کش رہتا ہے۔ (متفق علیہ)

۴۔ تقویٰ سے انسان حقوق و فرائض سے آگاہ ہوتا ہے اور حلال و حرام کی تمیز پیدا ہوتی ہے (متفق علیہ)

۵۔ تقویٰ، آبرو، خدا کی خوشنودی اور بلند درجات کا موجب ہے۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چار چیزوں کی دعا مانگا کرتے تھے: ہدایت، تقویٰ، پاک بازی اور حسبِ ضرورت مالداری۔

تقویٰ کے حدود و مظاہر

تقویٰ دراصل دل کی کیفیت کا نام ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ (الحج : ۳۲)

ترجمہ: اور جس نے شعائرِ الٰہی کی تعظیم کی تو بے شک یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔

فرمانِ نبویؐ کی رو سے بھی تقویٰ کا تعلق دل سے ہے اس لیے تقویٰ صرف یہی نہیں کہ حرام چیزوں سے دور رہا جائے بلکہ اصل تقویٰ یہ ہے کہ مشتبہ اور مشکوک چیزوں سے بھی بچا جائے۔ اسی لیے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ (مسلم)

یعنی: گناہ وہ ہے جو تیرے دِل میں کھٹکے۔

ایک اور حدیث میں حضور اکرمؐ نے فرمایا:

حدود اللہ

بے شک حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور کچھ باتیں ان دونوں کے درمیان مشتبہ ہیں۔ اکثر لوگ جنہیں نہیں جانتے پس جو ان مشکوک چیزوں سے بچا، اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لیا۔ اور جو ان مشتبہ چیزوں کے پیچھے لگ گیا وہ حرام میں پڑ گیا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی چرواہا اپنے ریوڑ کو کسی کھیت کے پاس چرائے تو قریب ہے کہ ریوڑ اس کھیت میں چلا جائے۔ خبردار! ہر بادشاہ کی کچھ حدود ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حدود اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔"

جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۔

یعنی، اللہ کی حدود ہیں۔ پس ان کے قریب بھی مت جاؤ۔

وضاحت

اس سے مراد یہ ہے کہ حرام اور ناپسندیدہ چیزوں کے قریب جانے سے ان کے استعمال کا بھی قوی امکان ہوتا ہے۔ جس طرح چرواہا اگر کسی کھیت کے قریب اپنے مویشی کو چلنے دے گا تو پھر مویشی کھیت کے اندر بھی داخل ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے مویشی کو کھیت کی حدود سے دور رکھے گا یا اسے کھونٹے سے باندھ دے گا تو پھر وہ پوری طرح قابو میں رہے گا اور کھیت میں نہیں گھسے گا۔ مثلاً حدیث رسولؐ کی رو سے اگر کسی نامحرم عورت پر اچانک اور سہواً نظر پڑ جائے تو یہ قابلِ معافی ہے لیکن اگر یہ نظر بار بار ارادے کے ساتھ ڈالی جائے تو کسی فتنے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی مضمون کو شاعر نے کیا خوب بیان کیا ہے ؎

جلوؤں کے اس ہجوم میں لازم ہے احتیاط
سہوِ نظر معاف ہے قصدِ نظر حرام (نعیم صدیقی)

اسی لیے صدیقین اور صالحین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ حرام اور مکروہ چیزوں کے ساتھ ان مباح چیزوں کو بھی ترک کر دیتے ہیں، جن میں کراہت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ہو مثلاً وہ کسی ایسے شخص کی ضیافت میں شریک نہیں ہوتے جس کی کمائی مشکوک ہو۔ گویا فتویٰ اور چیز ہے اور تقویٰ اور چیز ہے۔

تقویٰ کے چند مظاہر

۱۔ تمام عبادات کی اصل روح تقویٰ ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن عبادت کی اصل حقیقت اور روح تقویٰ ہے۔ اگر عبادت میں خلوص و تقویٰ نہ ہو تو وہ محض ایک بے مقصد رسم بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر ان عبادات کے باوجود انسان کی روحانی، اخلاقی اور باطنی اصلاح نہ ہو تو سمجھ لیں کہ ان عبادات کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوا اور یہ صرف ظاہری اور رسمی قسم کی عبادات ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک جسم بغیر روح کے۔ بقولِ علامہ اقبالؒ

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی

قرآن مجید میں بار بار عبادات کی اصل غرض و غایت یہی بتائی گئی ہے کہ یہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ (البقرۃ: ۲۱)

ترجمہ: "اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

پھر فرداً فرداً ہر عبادت کا بھی یہی فلسفہ بتایا۔ مثلاً نماز کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ اس کے دل میں خدا کا خوف جاگزیں ہو۔ وہ اپنے معاملات میں راست روی اختیار کرے اور اس کا اخلاق و کردار سنور جائے اس لیے ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط (عنکبوت: ۴۵)

ترجمہ: بے شک نماز بے حیائی اور برائیوں سے روکتی ہے۔

روزے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ انسان کے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ زکوٰۃ کا مقصد بھی یہی ہے۔ انسان کے دل میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گئی تو وہ اپنا مال خدا کی راہ میں اور غریبوں اور مسکینوں کی مدد کے لیے خرچ کرے گا۔ قربانی کا مقصد بھی تقویٰ ہے ورنہ خدا کو گوشت اور خون کی کیا ضرورت ہے۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کا پورا عرصہ تقویٰ کے

اظہار و تربیت کا بہترین ذریعہ ہے اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

۲۔ تقویٰ بہترین زادِ راہ ہے

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؕ (البقرۃ: ۱۹۷)

ترجمہ: اور زادِ راہ لے کر چلو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔

یہ آیت حج کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حج کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ارادہ کرنے والے اپنی زبان کو گالی گلوچ اور بدگوئی سے بچائیں۔ اپنے آپ کو جنگ و جدل سے روکیں۔ اور ہر ممکن حد تک نیکیاں کریں۔ ایسا کرنا تقویٰ ہے اور سفرِ حج کرنے والوں کے لیے یہی بہترین زادِ راہ ہے۔ اسی طرح آخرت کے سفر کے لیے بھی مناسب زادِ راہ پاس ہونا چاہیئے اور وہ زادِ راہ تقویٰ اور حسنات ہیں۔

۳۔ بہترین لباس تقویٰ ہے

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ (الاعراف: ۲۶)

ترجمہ: اے بنی آدم! ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے اور تمہارے بدن کو زینت دے اور جو پرہیزگاری کا لباس ہے وہ سب سے اچھا ہے۔

اس آیت میں دو لباسوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک ظاہری لباس جو جسم کو چھپانے اور سردی گرمی سے محفوظ رکھنے کے علاوہ زینت و زیبائش کا کام بھی دیتا ہے اور دوسرا لباس باطنی اور حقیقی ہے، یعنی تقویٰ کا لباس۔ پھر دونوں کا مقابلہ کر کے اس دوسرے لباس کو بہترین قرار دیا گیا ہے۔ پھر لباس علاقے وقت اور موسم کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کچھ اصول پیش نظر رکھے جائیں، خواہ مخواہ راہبانہ اور جوگیانہ وضع قطع اختیار کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اصل چیز تقویٰ ہے۔

۴۔ دشمن سے عدل و انصاف تقویٰ ہے

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؕ (المائدہ: ۸)

ترجمہ: اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کرو وہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔

۵۔ عہد کی پابندی تقویٰ ہے: قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ○ (آل عمران آیت: ۷۶)

ترجمہ: ہاں جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور خدا سے ڈرے تو خدا ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں ایفائے عہد، عہد کی پابندی اور بد عہدی و خیانت سے پرہیز کرنے کو تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ بد عہد شخص ہرگز تقویٰ کی صفت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا بلکہ بد عہدی منافقت کی نشانی ہے اور اسے ہر معاشرے میں سخت ناپسند کیا جاتا ہے۔

۶۔ قربانی کی اصل روح تقویٰ ہے: قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰکِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ ؕ (الحج: ۳۷)

ترجمہ: اللہ کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اسے تو تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ جذبہ اور خلوص مقبول ہے جس کے تحت تم قربانی دیتے ہو کیونکہ ظاہر کہ گوشت تو تم کھا جاتے ہو یا رشتہ داروں اور محتاجوں میں بانٹ دیتے ہو۔ ارشادِ نبویؐ کی رو سے اگر خلوص اور تقویٰ کے تحت قربانی دی جائے تو جانور کے ہر بال کے بدلے ایک نیکی ملتی ہے۔

۷۔ عبادت گاہ کی اصل بنیاد تقویٰ ہے: قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ (التوبہ: ۱۰۸)

ترجمہ: البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس قابل ہے کہ اس میں جایا اور نماز پڑھایا کرو۔

اس آیت مبارکہ میں دو مسجدوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک تو منافقین کی تعمیر کردہ مسجد تھی جو "مسجد ضرار" کے نام سے مشہور ہوئی۔ جسے اسلام کے خلاف سازشوں کا گڑھ بنانا مقصود تھا اور جسے بعد میں گرا دیا گیا۔ دوسری مسجد یعنی قبا، (یا مسجد نبوی) کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت گاہ یا مسجد کی اصل بنیاد تقویٰ ہے۔ مسجد خدا کی حقیقی عبادت، ذکر اور فلاح و خیر کا مرکز ہے۔ اس سے یہی مقاصد حاصل ہونے چاہئیں۔ لیکن اگر تقویٰ کی روح مفقود ہو اور فلاح و خیر حاصل نہ ہو تو عبادت گاہ یا مسجد کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

متّقین کی صفات

إِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ؕ (النبا: ۳۱)

ترجمہ: بلاشبہ متقیوں کے لیے کامیابی ہے۔

سوال: متقین کی جملہ صفات بیان کرتے ہوئے تقویٰ کے فوائد و ثمرات لکھیے؟

جواب:

متقین کی صفات

سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات کی روشنی میں

یوں تو قرآن مجید میں متقین کی بے شمار صفات گنوائی گئی ہیں اور مختلف مقامات پر مختلف انداز میں ان صفات کا تذکرہ ہوا ہے تاہم چند ایک یہاں بیان کی جاتی ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں ارشاد ہوتا ہے:۔

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۖ فِيْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۗ اُولٰٓئِكَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: الم۔ یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں (کہ کلام خدا ہے۔ خدا سے) ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب (اے محمدؐ) آپ پر نازل ہوئی اور جو کتابیں آپ سے پہلے (پیغمبروں پر) نازل ہوئیں، سب پر ایمان لاتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار (کی طرف سے) ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح (نجات) پانے والے ہیں۔

وضاحت چنانچہ ان آیات کی روشنی میں متقیوں کی حسب ذیل صفات بیان کی گئی ہیں:۔

۱۔ **غائبانہ ایمان** وہ اللہ تعالےٰ پر غائبانہ ایمان رکھتے ہیں، عقل کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کی ہستی کو پہچان نہیں سکتا۔ اس کے لیے غائبانہ ایمان رکھنا ضروری ہے، جس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔

۲۔ **قیام نماز** وہ نماز کو قائم کرتے ہیں۔ یعنی اسے پورے آداب کے ساتھ ادا کرتے ہیں، وہ نماز کو بطور ایک ادارے کے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صحیح روح کے ساتھ نافذ کرتے ہیں۔

۳۔ **خدا کی راہ میں خرچ کرنا** وہ اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے اس کی راہ میں، غریبوں کے لیے اور اپنے اوپر خدا کے بتلائے ہوئے طریقوں کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ اس میں زکوٰۃ اور دیگر صدقات وغیرہ شامل ہیں۔

۴۔ **قرآن پر ایمان** وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل شدہ کتاب (قرآن مجید) پر ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ قرآن مجید اللہ تعالےٰ

کا آخری کلام ہے اور انسان کی رہنمائی و ہدایت کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار (اقبال)

۵۔ آسمانی کتب پر ایمان

وہ ان آسمانی کتابوں (تورات، زبور، انجیل وغیرہ) پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو قرآن مجید سے پہلے مختلف رسولوں پر نازل ہوئیں۔ وہ یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کتابیں بھی کلام الٰہی ہیں۔ اگرچہ اب وہ اصل صورت میں نہیں ہیں اور ان میں بہت کچھ رد و بدل ہو چکا ہے۔

۶۔ آخرت پر ایمان

وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، یعنی اس دنیا اور زندگی کے بعد ایک اور دنیا ہے جو دارالبقاء اور دارالجزا ہے۔ وہ ہمیشہ کی زندگی ہے جس کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ اعمال کی بنیاد پر ہو گا۔

اہلِ تقویٰ کا مکمل حلیہ

سید سلیمان ندویؒ اپنی مشہور کتاب "سیرۃ النبیؐ" میں لکھتے ہیں کہ سورۃ البقرۃ کی اس آیت مبارکہ میں اہلِ تقویٰ کا مکمل حلیہ پیش کر دیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہیں:۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۷۷)

ترجمہ: بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور (خدا کی) کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں (غلامی وغیرہ کی قید سے آزاد کرانا) (خرچ کریں) اور نماز قائم

کریں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکۂ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو متقی ہیں (یعنی خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

وضاحت اس آیت البر (یعنی نیکی والی آیت) میں مندرجہ بالا خوبیوں کے علاوہ یہ خوبیاں بھی گنوائی گئی ہیں:۔

۷۔ اللہ پر ایمان یعنی متقی لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس طرح کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ وہی خالق و مالک ہے۔ وہی دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔ وہی مشکل کشا ہے۔ وہی رزاق ہے۔ سب کچھ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان انسان کے اندر صحیح معنوں میں تقویٰ کی صفت پیدا کر دیتا ہے۔

۸۔ فرشتوں پر ایمان متقی لوگ فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں، اس طرح کہ یہ پوشیدہ نورانی ہستیاں ہیں، جن کا خدائی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ سب خدا کے تابع فرمان ہیں اور اس کے حکم سے بال برابر بھی سرتابی نہیں کر سکتے۔ خدا ان کے ذریعے اپنی سلطنت کی تدبیر کرتا ہے۔ اس تعلیم کے نتیجہ میں توحید کا اعتقاد شرک کے تمام خطروں سے پاک ہو جاتا ہے۔

۹۔ انبیائے کرامؑ پر ایمان متقی لوگ خدا کے تمام رسولوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اس طرح کہ خدا کے رسول دنیا کی تمام قوموں کے پاس آتے تھے اور ان سب نے اسی اسلام کی تعلیم دی تھی، جس کی تعلیم دینے کے لیے آخر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ ان میں سے کسی ایک کے انکار سے کفر لازم آتا ہے۔ ان کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ اگرچہ غیر اقوام نے ان میں سے اکثر انبیائے کرامؑ کی تعلیمات کو بگاڑ دیا ہے، لیکن قرآن مجید نے ان سب کا صحیح اور مکمل منصب و کردار پیش کیا ہے۔

۱۰۔ ایفائے عہد متقی لوگ عہد اور وعدے کے پابند ہوتے ہیں اور جب وہ کوئی عہد یا وعدہ کر لیتے ہیں تو اسے ہر حالت میں پورا

کرتے ہیں۔ بدعہدی کو ہر مذہب وملت میں سخت ناپسند کیا جاتا ہے۔ منافق کی ایک علامت وعدہ خلافی بھی ہے۔

۱۱۔ صبر واستقامت

متقی لوگ سختی، تکلیف اور آزمائش کے وقت صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ کسی مشکل سے ہراساں نہیں ہوتے بلکہ خدا پر کامل بھروسہ رکھتے ہوئے حق وصداقت پر مضبوطی سے ڈٹے رہتے ہیں۔

۱۲۔ صداقت وسچائی کی صفت

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (الزمر: ۳۳)

ترجمہ، اور جو شخص سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی، وہی لوگ متقی ہیں۔

سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ "یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے۔ وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ فوری ثمرہ۔ مال ودولت اور جاہ وعزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو، مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ (راستہ) سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا"

آل عمران کی آیت کی روشنی میں

قرآن مجید میں متقیوں کی مزید صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۴)

ترجمہ، جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو ضبط کرنے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور خدا احسان کرنے والوں (نیکوکاروں) کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں متقی لوگوں کی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔

۱۳۔ انفاق فی سبیل اللہ

یعنی متقی لوگ خوش حالی اور تنگی میں اپنا مال خدا کی راہ میں اپنی استطاعت کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ یہ مالی ایثار و قربانی تقویٰ کی ایک اہم صفت ہے۔

۱۴۔ عفو و درگزر

عفو و درگزر سے مراد یہ ہے کہ بدلہ لینے یا سزا دینے کی طاقت رکھنے کے باوجود معاف کیا جائے۔ ہم میں سے کون ہے جو غلطی نہ کرتا ہو؟ اگر ایک دوسرے کی غلطیوں اور خطاؤں کو معاف نہ کیا جائے تو نظام تمدن درہم برہم ہو سکتا ہے۔ لہٰذا متقی لوگ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔

۱۵۔ احسان کی روش

متقی لوگوں کی یہ صفت ہے کہ وہ احسان کی روش اختیار کرتے ہیں اس لیے اللہ انہیں پسند کرتا ہے۔ عفو و درگزر کا پہلا درجہ یہ ہے کہ دوسروں کی غلطی اور خطا پر جو غصہ آئے اسے ضبط کیا جائے اور اس کے تقاضے پورے نہ کیے جائیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ خطا کاروں کو معاف کر دیا جائے اور ان کے خلاف دل میں کسی قسم کا مخالفانہ جذبہ نہ رکھا جائے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ غلط کار اور گنہگار پر کچھ احسان کر کے اسے بندۂ بے دام بنا لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ تیسرا درجہ بلند ترین درجہ ہے۔ متقی لوگ ایسے ہی نیکوکار ہوتے ہیں۔

عباد الرحمٰن کی صفات

قرآن مجید میں عباد الرحمٰن کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں۔ عباد الرحمٰن (یعنی رحمٰن کے بندے) اور متقی لوگ دراصل ایک ہی چیز ہیں کیونکہ عبادت کی اصل روح تقویٰ ہی ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ٥ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ٥ ....

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ٥ الفرقان ۶۳، ۷۲

ترجمہ: اور رحمٰن کے بندے تو وہ ہیں زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔ اور وہ جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے اور (عجز و ادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں اور جب ان کو بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔

وضاحت

ان آیات مبارکہ میں عباد الرحمٰن کی بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں۔ جن میں سے چند صفات یہ ہیں :۔

۱۶۔ عجز و انکساری

خدا کے بندوں یا متقی لوگوں کی یہ صفت ہے کہ وہ عجز و انکساری کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں فخر و غرور یا تکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ان کی گفتگو، نشست و برخاست اور چال ڈھال سے عجز و انکساری کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۷۔ جاہلوں سے کنارہ کشی

متقی لوگوں کی ایک صفت یہ ہے کہ جب کوئی جاہل شخص ان کے منہ آتا ہے اور ان سے الجھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس سے الجھنے اور جھگڑنے کی بجائے سلام کہہ کر کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔

۱۸۔ قیام و سجود

متقی لوگ قیام و سجود کی صفت سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان کی راتیں خدا کی عبادت میں گزرتی ہیں۔ اور وہ اس کی بارگاہ میں سربسجود رہتے ہیں اور اس کی رضا و مغفرت کے طلب گار رہتے ہیں۔

۱۹۔ لغویات سے اجتناب

متقی لوگوں کی یہ صفت ہے کہ وہ لغو کاموں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ وہ بے ہودہ اور بے حیائی کے کاموں سے دور رہتے ہیں اور ان میں ملوث نہیں ہوتے۔ تقویٰ کا تقاضا یہی ہے۔

کلامِ حالیؒ

مولانا الطاف حسین حالیؒ نے اپنی مشہور کتاب "مسدسِ حالی" میں خدا کے بندوں کی صفات بیان کی ہیں۔ مثلاً وہ ایک بند میں فرماتے ہیں :۔

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے — نشاں جن سے قائم ہیں صدق و صفا کے
نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے — نمائش سے بیزار، دشمن ریا کے
ریاضت سب ان کی خدا کے لیے ہے
مشقت سب ان کی رضا کے لیے ہے

تقویٰ کے فوائد و ثمرات

۱۔ تقویٰ معیارِ فضیلت ہے

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات: ۱۳)

ترجمہ: بے شک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

دنیا میں عزت و فضیلت کے لیے مختلف پیمانے اور معیار قائم کیے جاتے ہیں۔ کوئی شخص حسب و نسب اور خاندانی وجاہت اور جاہ و حشمت کو عزت کا معیار گردانتا ہے۔ کوئی دولت و حکومت کو، لیکن اللہ تعالےٰ کے نزدیک ان میں سے کوئی ذریعہ بھی عزت و فضیلت کا معیار نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے معزز شخص وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا، پرہیزگار اور نیکوکار ہے۔

۲۔ متقی اللہ کا دوست اور محبوب ہے

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ۝ (الانفال: ۳۴)

ترجمہ: اللہ کے اولیاء (دوست) تو صرف متقی ہیں۔

پھر فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝ (التوبۃ: ۷)

ترجمہ: بلا شُبہ اللہ متقیوں کو محبوب رکھتا ہے۔

ان آیات مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف انہی لوگوں کو دوست اور محبوب رکھتا ہے جو تقویٰ کی صفت سے بہرہ ور ہوں۔ ان کے دلوں میں خدا کا خوف جاگزیں ہو۔ انہیں برائیوں سے نفرت اور حسنات سے انس اور پیار ہو۔ وہ نیکی کی راہ پر گامزن رہیں اور ہر طرح کی گمراہی و ضلالت سے بچ کر رہیں اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہیں۔

۳۔ متقی کو امتیازی نشان عطا کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال : ۲۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم خوفِ خدا کو اپنا لو تو وہ تمہیں ایک امتیاز بخش دے گا۔

یہ امتیازی نشان حق و باطل کی شناخت بھی ہو سکتا ہے اور عام لوگوں کی نسبت ایمان و عمل کی برتری اور معاشرے میں نیکی کے لحاظ سے سرفرازی بھی ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں آخرت میں امتیازی سرخروئی بھی مراد ہو سکتی ہے اور جنت کے اعلیٰ مدارج بھی۔

رزق کی فراوانی اور رنج و غم سے نجات

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط (الطلاق : ۲)

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا، وہ اس کے لیے رنج و محن سے مخلصی کی صورت پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے وہم و گمان بھی نہ ہو۔

دنیا میں انسان کو طرح طرح کی پریشانیوں، الجھنوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک دنیادار اور مادہ پرست انسان ان سے گھبرا کر مایوسی و بددلی کا شکار ہو جاتا ہے لیکن وہ بندۂ مومن جو تقویٰ کی صفت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ ان پریشانیوں اور مصیبتوں سے ہراساں نہیں ہوتا، وہ خدا پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ان پریشانیوں سے آزاد کر کے اسے سکون و راحت سے ہمکنار کرتا ہے۔ اسی طرح اس پر رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ذریعہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

۵۔ متقی سے اللہ کی مدد کا وعدہ ہے:۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ٥ (التوبہ : ۳۶)

ترجمہ: اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ (کی مدد) متقیوں کے ساتھ ہے۔

پھر فرمایا :-

وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (الزخرف : ۳۵)

ترجمہ : اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

دنیا کے مقابلے میں آخرت کی کامیابی بہت بڑی کامیابی بلکہ اصل کامیابی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی ؐ ہے کہ : آخرت کے مقابلے میں دنیا ایسی ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں قطرہ۔ لہٰذا متقی لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں بہت بڑی کامیابی اور سرخروئی کا وعدہ کر رکھا ہے۔

۷۔ قبولیت اہلِ تقویٰ ہی کو حاصل ہے :- قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (المائدۃ : ۲۷)

ترجمہ : بلاشبہ اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ صرف انہی کے کاموں اور اعمال کی پیش کش کو قبول فرماتا ہے جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ جس کام میں خلوصِ نیت کی بجائے ریاکاری پائی جائے وہ اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔

۸۔ اجرِ اُخروی کا باعث :- قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (الاعراف : ۳۵)

ترجمہ : پس جو لوگ پرہیزگار اور نیک بنے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی کوئی غم۔

آخرت کے اجر کے مقابلے میں دنیاوی اجر کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں ہے جو لوگ تقویٰ کی صفت رکھتے ہیں۔ انہیں آخرت میں اللہ کے ہاں بے پناہ اجر حاصل ہوگا اور انہیں وہاں کسی قسم کا خوف اور غم لاحق نہ ہوگا بلکہ وہ اللہ کی رحمت کے سائے میں ہوں گے۔

۹۔ گناہوں کا ازالہ :- قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :-

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ (الطلاق: ۵)

ترجمہ: اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔
یعنی تقویٰ اختیار کرنے سے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اگر انسان بھول چوک سے کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے اور پھر اس پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے توبہ کا طلب گار ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور اسے اپنے انعامات سے نوازتا ہے۔

۱۰۔ دشمن کے ضرر سے حفاظت

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا۔
(سورۃ آل عمران آیت نمبر ۲۰)

ترجمہ: "اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کیے رکھو تو ان کی خفیہ تدبیریں تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔"

یعنی صبر کے ساتھ تقویٰ اختیار کر لینا دشمن کی چالوں اور خفیہ مکاریوں کا کامیاب توڑ ہے۔ اگر دشمن قوی ہے تو اللہ تعالیٰ قوی تر ہے۔ اس کی تائید حاصل ہو تو دشمن کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ذِکر

ذِکرِ الٰہی

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرۃ: ۱۵۲)

ترجمہ: "تم مجھے یاد کیا کرو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔"

سوال:۔ ذکر سے کیا مراد ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت و فضیلت بیان کیجیے۔

جواب:۔ **۱۔ ذکر کا مفہوم** ذکر کے لغوی معنی ہیں یاد کرنا، ذہن میں کسی چیز کو دہرانا، بار بار یاد رکھنا اور بھولی ہوئی چیزوں کو یاد کرنا۔ اسلامی اصطلاح میں ذکر سے مراد خدا کی یاد، اس سے دعا کرنا، محبت و شفقت سے اس کا نام لینا، قرآن مجید میں یہ لفظ نصیحت، اللہ کی یاد، نماز اور دعا اور تلاوتِ قرآن کے معنی میں استعمال

ہوا ہے۔ ان سب میں یادِ الٰہی اور ذکرِ خدا مشترک ہے۔ قرآن مجید میں ذکر کے مقابلے میں غفلت اور نسیان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے معنی خدا فراموشی کے ہیں یعنی خدا کو بھول جانا۔ لہٰذا ذکرِ الٰہی کا حقیقی مفہوم یہ نکلا کہ بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی غافل نہ ہو بلکہ ہر وقت اور ہر حالت میں اپنے خالقِ حقیقی کو یاد رکھے ؂

الٰہی! حمد سے عاجز ہے یہ سارا جہاں تیرا ؞ جہاں والوں سے کیونکر ہو سکے ذکر و بیاں تیرا

(ب) ذکر کی اہمیت و فضیلت

اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور اس کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہی ایک ذات ایسی ہے جو اس کائنات کی خالق، مالک اور مختارِ مطلق ہے۔ عبادت اور پرستش کے لائق صرف اسی کی ذات ہے اور وہی ہستی اس قابل ہے کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے۔ جب انسان اللہ کے ذکر میں مصروف ہوتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ گویا وہ سرگوشی میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اسی کے قبضۂ قدرت میں تمام اختیارات ہیں۔ وہ نفع و نقصان کا مالک ہے اور وہی ہماری دعائیں اور فریادیں سننے والا ہے اور وہی مصیبتیں اور پریشانیاں دور کرنے والا ہے۔

ذکر کا مقصد یہ ہے کہ زبان میں پاکیزگی پیدا ہو، دل میں سکون اور تسلی جاگزیں ہو، دماغ کو اطمینان ملے اور انسانی روح کو خدا کی بندگی، عاجزی، انکساری اور نیازمندی کا صحیح اور پورا شعور حاصل ہو جائے۔ ذکر روحانی غذا بھی ہے۔ زبان کی عبادت بھی ہے اور ... کا علاج بھی ہے۔ ذکر کو اخلاق کی صفائی اور نفس کی پاکیزگی میں بڑا دخل ہے۔

جب انسان خدا کی یاد میں محو ہو گا تو تمام پریشانیاں خود بخود دور ہو جائیں گی اور یہ تمام مشاہدے اور تجربے کی بات ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو تو وہ اس حالت میں ظلم، گناہ اور برائی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ ظلم اور گناہ میں وہی شخص مبتلا ہو سکتا ہے جو خدا اور اس کے ذکر کو فراموش کر دے۔ گویا اس طرح بندے کا تعلق اپنے خالق سے ٹوٹ جاتا ہے اور پھر وہ مختلف برائیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور پریشانیاں اور مصیبتیں اسے گھیر لیتی ہیں ؂

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے ؞ تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے (اقبال)

عطار ہو رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو ؞ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

۱۔ جو دم غافل، سو دم کافر اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کا یہ نظریہ رہا ہے کہ: "جو دم غافل، سو دم کافر" یعنی جو لمحہ اللہ کی یاد سے غفلت میں گزر جائے وہ ضائع ہو گیا بلکہ اسے وہ کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ کفر کے معنی انکار کے علاوہ ناشکری کے بھی ہیں۔ یہ بات بلاشبہ حقائق کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی ہم پر اس قدر نعمتیں ہیں کہ ہم ان کا شمار بھی نہیں کر سکتے۔ یہ زندگی، صحت، جوانی و توانائی، مال و متاع، اسباب دنیا، خوراک و ثمرات، پانی، ہوا اور ایسی بے شمار نعمتوں سے ہم ہر وقت مستفید ہو رہے ہیں اور ان کے سہارے جی رہے ہیں۔ ذرا ہوا کو لیجیے اس کے بغیر ہم چند لمحے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ان بے انتہا نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا ہر دم شکر بجا لائیں اور ذکر دراصل اظہار شکر ہی ہے۔ جب ہم ہر لمحہ اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں تو اس کا شکر اور ذکر بھی ہر لمحہ ہونا چاہیے۔ اور پھر سب سے بڑی نعمت ایمان و ہدایت کی ہے جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہمیں عنایت فرمائی ہے۔ اس لیے ہمیں مسلسل اس کا شکر و ذکر کرتے رہنا چاہیے۔

۲۔ ایک سبق آموز حکایت ایک بزرگ کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ اپنے کسی دوسرے بزرگ دوست سے ملاقات کرنے کے لئے گھر سے روانہ ہوئے۔ راستے میں انہوں نے کچھ جانور دیکھے، جو اس بزرگ کا ماتم کر رہے تھے جن سے ملنے کے لئے وہ جا رہے تھے۔ گویا ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ جانے والے بزرگ کو بہت افسوس ہوا کہ عزیز دوست کی زیارت نہ ہو سکی۔ اب وہ اس خیال سے اس منزل کی طرف روانہ ہوئے کہ مرحوم دوست کے جنازے میں شمولیت ہو جائے گی یا ان کے لئے ایصال ثواب تو کر سکیں گے۔ جب وہ بزرگ وہاں پہنچے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے مذکورہ بزرگ دوست زندہ سلامت موجود ہیں۔ انہوں نے اس کا سبب پوچھا تو ان کے دوست نے بتایا کہ میں اس وقت خدا کی یاد سے غافل تھا۔ اس لئے میری موت کا اعلان کر دیا گیا اور جانور ماتم کرنے لگے۔

۳۔ قرآن کی روشنی میں قرآن مجید میں ذکر کرنے کی بہت ترغیب دی گئی ہے اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

جیسا کہ ان آیات کریمہ سے واضح ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ (الاحزاب:۴۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کو بہت کثرت سے یاد کرو۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا

لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ (البقرہ: ۱۵۲)

ترجمہ: تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میرے شکر کرتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرعد: ۲۸)

ترجمہ: سنو: دلوں کا اطمینان اللہ کے ذکر ہی سے ہوتا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: ۳۷)

ترجمہ: (یہ) ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۝ (البقرہ: ۲۰۰)

ترجمہ: اللہ کو یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران: ۱۹۱)

ترجمہ: جو لوگ اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہو کر، بیٹھ کر اور لیٹ کر۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (الاعراف: ۲۰۵)

ترجمہ: (اے نبیؐ) اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الاحزاب: ۳۵)

ترجمہ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں۔ اللہ نے

ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے ۔

۴۔ حدیث کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں بھی ذکر کی بہت تلقین کی گئی ہے اور اس کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے. جیسا کہ ان احادیث سے ظاہر ہے :

۱۔ بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں. اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے برملا (یعنی مجلس میں) یاد کرے تو میں اسے فرشتوں کی جماعت کے سامنے یاد کرتا ہوں"

۲۔ سب سے بہتر ذکر لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ ہے ۔

۳۔ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اسلام کے فرائض تو بہت سے ہیں، مجھے عمل کے لئے کوئی مختصر سی چیز بتلایئے. آپؐ نے فرمایا کہ تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیئے ۔

۴۔ جو شخص ذکر الٰہی کرتا ہے اور جو ذکر الٰہی نہیں کرتا، وہ زندہ اور مردہ کے مانند ہیں ۔

(بخاری و مسلم)

۵۔ نہیں بیٹھتی کوئی قوم ذکر الٰہی کے لئے مگر یہ کہ اس کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور اس پر رحمت چھا جاتی ہے اور اس پر سکون و اطمینان قلب نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ذکر اپنے مقرب فرشتوں میں کرتا ہے ۔

(مسلم)

۶۔ حضورؐ نے فرمایا ، سبقت لے گئے مفردون ۔ صحابہؓ نے پوچھا ، یا رسول اللہؐ مفردون کون لوگ ہیں ؟ آپؐ نے فرمایا : کثرت سے خدا کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں ۔

(مسلم)

۷۔ جو کوئی مجلس میں بیٹھا اور اس نے وہاں اللہ کا ذکر نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر افسوس اور خسارہ ہوگا اور جو شخص اپنے بستر پر لیٹا اور اس نے اللہ کا ذکر نہ کیا تو اس پر بھی اللہ کی طرف سے افسوس اور خسارہ ہوگا ۔ (ابو داؤد)

۸۔ بہترین مال خدا کا ذکر کرنے والی زبان ہے اور خدا کا شکر کرنے والا دل ہے ۔

(احمد ، ترمذی ، ابن ماجہ)

۵۔ اسوۂ رسولؐ

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے. ایک

صحابیؓ رات کو حضورؐ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ کی تسبیح و تہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی۔ آپؐ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، وضو کرتے، کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس گھر آتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں دل و جان سے ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ چنانچہ اسی بنا پر احادیث میں مختلف اوقات حالات کے لئے کثرت سے دعائیں منقول ہیں۔ اخیر زندگی میں جب سورہ النصر نازل ہوئی جس میں تحمید و تسبیح کا حکم ہے تو امہات المومنینؓ کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْر

نیز فرماتے ہیں کہ ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپؐ کی زبان سے ادا ہوئے۔ سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپؐ یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے۔ خواہ سواری کا رخ قبلہ کی طرف ہے یا نہیں بلکہ سواری کا جانور جدھر چل رہا ہوتا، آپؐ ادھر ہی منہ کر کے نماز کی نیت کر لیتے۔

۶۔ نماز۔ ذکر کی بہترین شکل

نماز ذکر الٰہی کی بہترین شکل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي (طٰہٰ: ۱۴)

یعنی۔ میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

ایک حدیث مبارک میں نماز کو مومن کی معراج کہا گیا ہے۔

ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپؐ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا۔ نماز کا وقت آیا تو آپؐ نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ پہلے دو رکعتیں معمول کے مطابق ادا کیں، پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں۔ پھر دو دو رکعتیں کر کے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی پڑھیں اور سب کے آخر میں وتر ادا کی۔

حضرت خبابؓ کی روایت ہے کہ ایک شب آپؐ نماز کے لئے کھڑے تو صبح تک مصروف رہے۔

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے نماز میں یہ آیت پڑھی:

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (المائدہ: ۱۱۸)

ترجمہ: اگر تو ان کو عذاب دے تو تیرے بندے ہیں، اور اگر انہیں معاف کر دے تو تُو غالب اور حکمت والا ہے۔

تو یہ اثر ہوا کہ صبح تک آپؐ یہی آیت پڑھتے رہ گئے۔

امت کو تو پانچ نمازوں کا حکم دیا۔ لیکن خود آپؐ آٹھ وقت کی نماز پڑھتے تھے پانچ نمازوں کے علاوہ اشراق، چاشت اور تہجد کی نماز بھی ادا کرتے تھے اور نماز بھی کیسی کہ رات رات بھر اللہ تعالےٰ کے حضور میں کھڑے رہتے یہاں تک کہ پاؤں تک سُوج جاتے حضرت عائشہ صدیقہؓ عرض کرتیں: اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو ہر طرح معاف کر دیا پھر آپؐ اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ ارشاد ہوا:

یَا عَائِشَۃُ! اَوَ لَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا ۝

یعنی "اے عائشہؓ! کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں"

حضورؐ کی عبادت کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے؛

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ
نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ (المزمل: ۱تا۲)

ترجمہ اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو، مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو۔

دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا ۝ (الدھر: ۲۶)

ترجمہ: اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ قے
عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (بنی اسرائیل: ۹)

ترجمہ، اور رات کو تہجد پڑھو۔ یہ تمہارے لئے نفل ہے۔ بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے۔

ذکر الٰہی میدان جنگ میں

عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسرِپیکار ہوتیں، تیر وسناں اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں اور ہر طرف سے شور و ہنگامہ برپا ہوتا، آپؐ نہایت خضوع و خشوع و اطمینانِ قلب کے ساتھ دعا و زاری اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے

سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے ہیں لیکن خود سپہ سالارِ اعظم ﷺ کی پیشانی زمینِ نیاز پر ہوتی۔ بدر، احد، خندق، خیبر، تبوک، حنین تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ ﷺ کی یہی کیفیت تھی۔

بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے اور حضور ﷺ خشوع و خضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں: "خدایا اپنا وعدۂ نصرت پورا کر"

محویت اور بے خودی میں چادر مبارک کندھے سے گر پڑتی ہے اور آپ ﷺ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں، حضور ﷺ! بس کیجئے، اللہ ضرور آپ ﷺ کی مدد فرمائے گا۔ کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں:

"خدایا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تیری پرستش نہ ہوگی۔"

اسی اثناء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تین مرتبہ میدانِ جنگ سے حاضرِ خدمت ہوتے ہیں اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔

ایک غزوہ کے موقع پر دشمن سامنے پڑاؤ ڈالے پڑا ہے اور غفلت کا منتظر ہے کہ اچانک نماز کا وقت آجاتا ہے اور آپ ﷺ امام بن کر آگے کھڑے ہو جاتے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت مقتدی ہو کر نماز میں مصروف ہو جاتی ہے اور دوسری دشمنوں کا سامنا روک لیتی ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس حکم الٰہی کی کہاں تک تکمیل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿الانفال: ۴۵﴾

ترجمہ: ۔اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔

ذکرِ الٰہی کی اقسام اور فوائد

سوال ۔۔ ذکرِ الٰہی کی مختلف اقسام بتائیے اور کلماتِ ذکر تفصیلاً تحریر کیجیے نیز ذکر کے ثمرات و فوائد بیان کیجیے۔

اقسامِ ذکر

جواب ۔ (ا) ذکرِ الٰہی کی دو بڑی اقسام خفی اور جلی ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَ

خِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ
(الاعراف : ۲۰۵)

ترجمہ:۔ اور اپنے پروردگار کو یاد کیا کر، اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت دھیمی آواز سے۔

ا۔ ذکرِ خفی

ذکرِ خفی سے مراد وہ ذکر ہے جو مخفی، پوشیدہ اور چھپا ہوا ہو، یعنی صرف دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے۔ اس میں زبان خاموش رہتی ہے اور دل بیدار و متحرک ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے قلبی ذکر بھی کہتے ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے "قلب جاری رہنا" کہتے ہیں۔ صوفیائے کرامؒ کے نزدیک تو ذکرِ قلبی کے وقت درمیان سے کائنات کا واسطہ بھی ہٹا دیا جاتا ہے اور براہِ راست یادِ الٰہی کے تصور کو اپنے دِل میں جگہ دے دیتے ہیں اور اس کیفیت میں دوام، ان کے نزدیک ضروری ہے۔ یعنی یہ کیفیت مستقل رہتی ہے۔ اس لیے ان کا قول ہے کہ:

"جو دم غافل، سو دم کافر"

یعنی جو سانس خدا کے ذکر سے خالی یعنی غافل گزری وہ کفر کی حالت میں گزری ہے

دِل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار .:. جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی

۲۔ ذکرِ جلی

ذکرِ جلی سے مراد وہ ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو بالجہر (بلند آواز میں) یاد کیا جائے تاکہ سامعین بھی شریک ہوں۔ اسے لِسانی یا زبانی ذکر بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ ذکر اس قدر بلند آواز میں بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس پر شور و غل یا ہنگامے کا گمان ہو، بلکہ یہ مناسب دھیمی اور پست آواز میں ہونا چاہیے۔

ب۔ انفرادی اور اجتماعی ذکر

انفرادی ذکر کے مقابلہ میں اجتماعی ذکر زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں

جذبات وخیالات میں یک جہتی اور اجتماعیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے ذکر میں ایک خاص ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے دوسروں میں بھی ذکر الٰہی کا اشتیاق اور رجحان پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جماعتی ذکر کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"جب کوئی گروہ ذکر اللہ کے لیے جمع ہوتا ہے تو ملائکہ اُن کو ڈھانپ لیتے ہیں اور ان پر رحمت الٰہی چھا جاتی ہے، سکینت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی محفل میں یاد کرتا ہے۔"

ج) ذکر کے مراتب:-

صوفیائے کرامؒ نے ذکر کے چار مراتب بیان کیئے ہیں:-

۱۔ صرف زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر ـــــ یہ ذکر کا ادنیٰ درجہ ہے۔

۲۔ دل میں ذکر الٰہی تو ہو مگر اسے جبر اور مشقت سے اس سے خوگر بنایا گیا ہو۔

۳۔ دل میں یادِ الٰہی پختہ ہو اور بغیر کسی تکلیف کے زبان پر جاری ہو ـــــ یہ ذکر کا اعلیٰ درجہ ہے۔

۴۔ دل یاد الٰہی میں اس قدر مشغول ومستغرق ہو جائے کہ زبان سے ذکر کی حاجت نہ رہے ـــــ یہ ذکر کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں اسے "فنافی اللہ" کا نام دیا جاتا ہے۔

د) ذکر کے درجے

کتاب وسنت پر غور کرنے سے ذکر کے تین درجے معلوم ہوتے ہیں:-

۱۔ زبانی ذِکر

یعنی ذکر کے الفاظ کو زبان سے ادا کرنا۔ اس ذکر کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً":-

ا۔ تلاوتِ قرآن مجید قرآن میں سے ایک حرف پڑھنے پر ایک نیکی ملتی ہے اور ہر نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے الٓمٓ تین حروف ہیں (ارشادِ نبویؐ)

ب۔ نمازوں کے اندر اور ان کے پہلے یا پیچھے آیتہ الکرسی، سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کا ذکر۔ سجدے، رکوع اور قومہ وجلسہ میں ذکر اللہ۔ درود شریف کا ورد کرنا، نماز کے بعد کی مختلف دعائیں، تہجد، تراویح، اشراق اور چاشت کی نفلی

نمازیں، نمازِ وتر میں دعائے قنوت، بیمار اور میّت کے لیے دعائیں۔
ج۔ صبح و شام، دن رات کے مختلف اوقات، سونے سے پہلے اور سو کر اٹھنے کی دعائیں کھانا کھا کر دعا کرنا، قرض کی دعا، مصیبت کے وقت کی دعا، گھر سے نکلنے اور گھر میں جانے کی دُعا وغیرہ۔
د۔ سفر کے اذکار۔
ر۔ متفرق اذکار۔

۲۔ عملی ذکر اس ذکر سے مُراد یہ ہے کہ وہ اعمال کیے جائیں جن کا خُدا و رسُولؐ نے حکم یا اجازت دی ہے اور ان کے منع کردہ کاموں سے باز رہا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح زبان کا ذکر یہ ہے کہ اس سے کلماتِ ذکر ادا کیے جائیں، اسی طرح دیگر اعضاء کا ذکر یہ ہے کہ انہیں خدا کے احکام کی اطاعت میں لگایا جائے اور مخالفت سے روکا جائے۔

۳۔ دل کا ذکر دل کا ذکر خدا کی ذات و صفات میں غور و فکر اور اسلام اور اہلِ اسلام کی بھلائی سوچنے میں، نیت کو پاک کرنا، خلوص پیدا کرنا، ریاکاری، تکبر اور حسد وغیرہ سے دل کو بچانا۔ یہ سب دل کے ذکر میں شامل ہے۔
قرآن مجید میں اہلِ ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔

يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ (البقرۃ:)

ترجمہ: وہ زمین و آسمان (کائنات) کی پیدائش (اس کے مقصد اور ابتداء و انتہا) پر گہرا غور و خوض کرتے ہیں۔"

ارشادِ نبویؐ ہے: "اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اسے سمجھ کی گہرائی عطا کر دیتا ہے۔"

یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الّا اللہ (اقبالؔ)

کلماتِ ذکر

مسنون دُعائیں و ذکر

بہترین ذکر

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے عرض کیا:

"اے میرے پروردگار! تو مجھ کو کوئی ایسی چیز بتا دے کہ میں اس کے ذریعہ تجھ کو یاد کیا کروں اور اس کے ذریعے تجھ سے دعا مانگا کروں۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "موسیٰ! تو یہ کہا کر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ موسیٰؑ نے عرض کیا، اے پروردگار! تیرا ہر بندہ یہی کہتا ہے، میں تو کوئی خاص چیز چاہتا ہوں جو میرے لئے مخصوص ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے موسیٰؑ! اگر ساتوں آسمانوں اور ان کی ساری آبادی سوائے میرے اور ساتوں زمینیں ایک پلڑا میں رکھی جائیں اور ایک پلڑے میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو رکھا جائے تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا پلڑا ان تمام چیزوں سے بھاری رہے گا اور جھک جائے گا۔ (شرح السنۃ، مشکوٰۃ شریف جلد اول)

جنت کے درخت

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج میں ابراہیم علیہ السلام سے میں نے ساتویں آسمان پر ملاقات کی تو انہوں نے فرمایا: اے محمدؐ! اپنی امت کو میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے (یعنی خوشبودار ہے) اور جنت کا پانی شیریں ہے اور اس کا میدان درختوں سے بالکل خالی ہے اور اس کے درخت یہ ہیں:۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ۔ (ترمذی، مشکوٰۃ شریف۔ اول)

خدا کی خوشنودی

جو مسلمان صبح و شام ان کلمات کو تین مرتبہ کہے تو اللہ تعالیٰ لازمی طور پر اس مسلمان کو قیامت کے دن راضی کرے گا (یعنی اس کو خوش کر دے گا) اور وہ کلمات یہ ہیں:۔

رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا (صلی اللہ علیہ وسلم) (احمد، ترمذی)

اللہ کے محبوب کلمات

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دو کلمے ہیں، زبان پر ہلکے میزانِ عمل پر بھاری اور بخشنے والے اور اللہ کے نزدیک بہت پیارے ہیں۔

(وہ یہ ہیں):۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ ، سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۔
(بخاری شریف)

بہشتی خزانہ :۔ بہشت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ یہ کلمات ہیں :۔
لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ (بخاری و مسلم)

افضل ترین چیز حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا :
سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ ہ کہنا میرے نزدیک دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے ۔ (مسلم)

ہزار نیکیاں جو شخص سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ پڑھے ، اس کے حساب میں ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی ۔ اس کے ہزار گناہ دور کیے جائیں گے ۔
(مسلم)

گھر سے نکلنے کی دعا جو شخص گھر سے نکلتے وقت یہ کلمات پڑھے ، اسے خدا اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور وہ شیطان کے شر وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے :۔
بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ۔ (ابوداؤد)

استغفار استغفار کثرت سے پڑھنا چاہیے ۔ اس کی بڑی فضیلت ہے ۔
اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ ۔

فرشتوں کا انتخاب حضرت ابو ذرؓ کہتے ہیں ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے پوچھا گیا ، کون سا کلام بہتر ہے ؟ آپ نے فرمایا : وہ کلام جس کو خدا نے اپنے فرشتوں کے لیے چن لیا ہے یعنی :۔
سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ (مسلم)

حضرت معاذؓ کے لئے وصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے حضرت معاذؓ سے فرمایا : "اے معاذؓ ! مجھے تم سے محبت ہے ۔ میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ تم کسی نماز کے بعد ان کلمات کو ترک نہ کرنا :۔

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ ۝ (ریاض الصالحین)

شب قدر کی دعا (بروایت حضرت عائشہ صدیقہؓ)

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ (ابن ماجہ)

دیگر مسنون دعائیں

بے پناہ اجر و ثواب :-

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ ۝ (بخاری و مسلم)

حج و عمرے کا ثواب

جس شخص نے صبح کی نماز با جماعت پڑھی اور وہ سورج نکلنے تک بیٹھا ہوا خدا کا ذکر کرتا رہا اور سورج نکلنے پر اس نے دو رکعت نماز پڑھی تو اس کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملے گا۔ (ترمذی بروایت حضرت انسؓ)

تسبیح فاطمہؓ :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے بعد اس تسبیح کی تلقین فرمائی:

سُبْحَانَ اللّٰهِ (۳۳ بار) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (۳۳ بار) اَللّٰهُ اَكْبَرُ (۳۴ بار)

درود شریف

درود شریف کے بغیر دعا اور ذکر مقبول نہیں ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے رحمت کا ایک دروازہ کھول دیتا ہے اور اس کے دس درجے بلند فرمائے گا۔ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ میرے قریب وہ شخص ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھنے والا ہے۔

ذِکر کے ثمرات و فوائد

ذکر الٰہی سے بہت سے فوائد و ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ فوائد و ثمرات حسب ذیل ہیں:

۱. اسلامی عبادت کی روح

اللہ تعالیٰ کا ذکر تمام اسلامی عبادات کی روح ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ساری عبادت بے روح اور بے کیف ہو کر رہ جائیں۔ ذکر الٰہی سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ یعنی "دعا عبادت کا مغز ہے"۔

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ "کون سے بندے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے روز افضل ہوں گے؟" فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے"۔ میں نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! جہاد کے غازی سے بھی؟" فرمایا: "اگرچہ وہ کفار اور مشرکین میں تلوار چلائے اور وہ ٹوٹ جائے اور خون میں رنگی جائے، ذکر کرنے والے کا درجہ اس سے بھی بلند ہے"۔ (ترمذی شریف)

اس حدیث میں ذکر کو جہاد سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی اطاعت الٰہی کی اصل اور بنیاد ہے اور جہاد اس کی فرع (یعنی شاخ) ہے۔

۲. قلب کی صفائی

ذکر الٰہی سے قلب کی صفائی ہوتی ہے۔ ارشادِ نبویؐ کے مطابق جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے اور پھر اسے مختلف طریقوں سے صاف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کا دل بھی گناہوں سے زنگ آلود ہو جاتا ہے اور اس زنگ کو دور کرنے والی چیز ذکر الٰہی ہے۔

پس ذکر الٰہی اپنے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے دعا، نماز، تلاوت قرآن وغیرہ سب کو شامل ہے اور یہ سب ذکر کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس، توحید و تمجید، اس کی عظمت و جلالت اور اس کی صفات کمال کے بیان اور دھیان کو ذکرِ الٰہی کہا جاتا ہے اور اس کا بہترین نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ

اقدس ہے۔ جنہوں نے انسان کو عملاً بتایا کہ ذکر الٰہی ہی وہ راستہ اور دروازہ ہے جو اللہ رب العزت اور اس کے بندے کے درمیان کھلا ہوا ہے اور بندہ اس سے خالق کائنات کی بارگاہ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور جب بندہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوتا ہے تو یہ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ذکر الٰہی کے ذریعے قلب انسانی پاکیزہ رہتا ہے اور اس میں شیطانی وسوسوں اور گناہ آلود تصورات کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اب ظاہر ہے، جب انسان کا دل پاکیزہ اور صاف ستھرا رہے گا تو اس سے گناہ سرزد نہیں ہو سکتے، وہ گناہوں کی آلائش سے پاک رہے گا۔

۳۔ اطمینان قلب

آج کے مادہ پرستانہ دور میں ہر شخص پریشان حال نظر آتا ہے۔ وہ بے شمار پریشانیوں اور الجھنوں میں گرفتار نظر آتا ہے۔ وہ سکونِ قلب سے محروم ہے۔ وہ حقیقی مسرت سے کوسوں دور ہے۔ وہ امن و سکون اور طمانیت کا متلاشی ہے لیکن دنیاوی آسائشوں کی فراوانی اسے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان نہیں دے سکتی۔ سینما ہالوں اور کلبوں میں انسان کو سکون قلب میسر نہیں آ سکتی۔ دین اسلام نے ایک ہی جملہ میں اس سکون و طمانیت کا نسخہ بتا دیا ہے اور وہ یہ ہے:۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرعد: ۲۸)

ترجمہ "سنو! دلوں کا اطمینان اللہ کے ذکر ہی سے حاصل ہوتا ہے"۔

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

ارشادِ نبوی ہے: "اللہ کا ذکر دلوں کو شفا دیتا ہے"۔

موجودہ دور میں ڈاکٹر اور ماہر نفسیات بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ ذکر اور نماز کے ذریعے انسان کو سکون ملتا ہے اور وہ ذہنی کھچاؤ اور دباؤ سے نجات حاصل کر سکتا ہے ظاہر ہے جب دل مطمئن ہو گا اور روح کو سکون حاصل ہو گا تو دل و دماغ اور جسم صحت مند متوازن اور توانا رہیں گے۔

۴۔ صدقات کا بدل

ذکرِ الٰہی خیرات اور صدقات کا بدل ہے۔ ایک مرتبہ نادار صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی کہ اہلِ دولت اپنی مالی قربانیوں کے باعث ہم سے سبقت لے جاتے ہیں

حالانکہ باقی عبادات میں ہم ان کے برابر ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: "کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں، جس پر عمل کر کے تمہیں ان کے برابر اجر و ثواب مل جائے اور تم بعد میں آنے والوں پر سبقت لے جاؤ اور تم سے کوئی شخص افضل نہ رہے"۔ صحابہؓ نے عرض کیا: "ہاں"۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: "ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو"۔

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں ابراہیم علیہ السلام سے میں نے ساتویں آسمان پر ملاقات کی تو انہوں نے فرمایا: "اے محمدؐ! اپنی امت کو میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے۔ (یعنی خوشبودار ہے) اور جنت کا پانی شیریں ہے اور اس کا میدان درختوں سے بالکل خالی ہے اور اس کے درخت یہ ہیں:۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ۔

(ترمذی، مشکوٰۃ شریف اوّل)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کی آبادی اللہ کی یاد میں مشغول لوگوں سے ہوگی۔

ایک حدیث کے مطابق جب انسان صبح کو بیدار ہوتا ہے تو اس کے ہر عضو پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔ پس ہر مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ کہنا صدقہ ہے۔ ہر بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ادا کرنا صدقہ ہے اور ہر مرتبہ اللّٰہُ اَکْبَر کہنا صدقہ ہے"۔ بعض احادیث میں انفاق فی سبیل اللّٰہ کو ذکر سے کمتر بتایا گیا ہے"۔ اگر ایک شخص کے پاس بہت سا مال ہو اور اسے راہِ خدا میں خرچ کر رہا ہو اور دوسرا شخص ذکر میں مشغول ہو تو ذکر کرنے والا افضل ہے"۔

۵۔ عذابِ قبر سے نجات

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر کسی آدمی کا عمل عذابِ قبر سے نجات دلانے والا نہیں ہے"۔

۶۔ جنت کا حصول

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ان میں سے ایک صرف ذاکرین کے لیے ہے"۔

۷۔ **قبولیتِ دعا** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تین اشخاص کی دعا رد نہیں ہوتی اور ضرور قبول ہوتی ہے۔ ایک کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا، دوسرا مظلوم اور تیسرا عادل حکمران۔"

۸۔ **قربِ خداوندی** ذکرِ الٰہی کی کثرت سے بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ وہ گویا اس سے ہم کلام ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ہمہ وقت اسی کے تصور میں محو رہتا ہے۔ یہ قربِ الٰہی بہت بڑا شرف و اعزاز ہے۔

اس صورت میں اس کا ہر فعل اللہ رب العزت کے حکم، منشا اور رضا کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے:۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب بندہ نوافل کے ذریعے قرب حاصل کر لیتا ہے تو میں اس کو دوست رکھتا ہوں، پھر میں اس کی سماعت بن کر ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔" (بخاری شریف)

۹۔ **گناہوں سے اجتناب** جب انسان ذکرِ الٰہی میں مصروف و مشغول ہوتا ہے تو وہ ہر قسم کے گناہ اور برائی سے بچ کر رہتا ہے۔ گناہ اور برائی میں وہی شخص مبتلا ہوتا ہے جو خدا کی یاد سے غافل ہو جائے، اس کے خوف سے بے نیاز ہو جائے اور اسے یکسر بھلا دے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ کو یاد کرتا ہے، اس کا خوف اپنے دل میں جاگزیں کرتا ہے تو وہ گناہوں سے دور رہتا ہے اور اس کا لگاؤ نیکیوں کی طرف رہتا ہے۔ چنانچہ آج کل جرائم اسی لیے بڑھ گئے ہیں کہ انسان خدا کے ذکر اور یاد سے غافل ہو گیا ہے۔ یہ غفلت کا پردہ اسے جرائم پر آمادہ کرتا ہے۔

شکر

وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ ۝ (زمر: ٦٦)

ترجمہ:۔ اور شکر گزاروں میں سے ہو۔

سوال: شکر سے کیا مراد ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

جواب:

شکر کا مفہوم

بقول سید سلیمان ندویؒ "لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ" جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی ترو تازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے"۔ اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے۔ یہ قدرشناسی تین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے۔ یعنی دل میں اس کی قدرشناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں (یعنی ظاہر ہوں) جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے ہماری زبان میں "کفرانِ نعمت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں"۔ (سیرۃ النبیؐ)

امام غزالیؒ کا نقطۂ نظر

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی نعمتوں کی پہچان اور ان پر خوشی پا کر زبان و دل اور اعضاء و جوارح کو اس کی رضا میں لگا دینے کا نام شکر ہے۔ پس شکر تین چیزوں سے ترکیب پاتا ہے۔ علم، حال اور عمل۔ یعنی اس حقیقت کا علم کہ سب نعمتیں خدا کی طرف سے ہیں، پھر اس علم سے خدا کے انعام پر خوشی کا حاصل ہونا اور آخر میں خدا کی نعمتوں سے جو مقصود ہے اسے ادا کرنا۔

شکر کی ادائیگی کے تین طریقے ہیں۔ اول زبان سے اس کی نعمتوں کا اعتراف کرنا اور اس کی حمد و ثنا بیان کرنا، دوم، اپنے اعضاء کو اس کے پسندیدہ کاموں میں لگانا، سوم، دل کی گہرائیوں میں اس کی عظمت و نعمت کو جاگزیں کر کے اس کے حضور میں خلوص نیت سے جھک جانا اور اس کی مخلوق سے بھلائی کرنا۔

شکر کی فضیلت و اہمیت

۱۔ شکر فطری تقاضا ہے

اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات اور منعمِ حقیقی ہے اس نے انسان کو بے شمار نعمتوں اور انعامات سے نوازا ہے۔ انسان اگر اپنی ہستی اور کائنات پر غور و فکر کرے تو وہ لامحالہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس کا اپنا کوئی ذاتی کمال نہیں بلکہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کا انعام و اکرام ہے جو بغیر استحقاق کے بن مانگے اسے حاصل ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس خالقِ حقیقی کا شکر ادا کرنا عین انسانی فطرت کا تقاضا ہے گویا یہ بندے کی طرف سے خالق کی بندہ پروری کا اظہارِ تشکر ہے۔ اگر کوئی دوست ہماری ضرورت پوری کر دے یا کسی انداز سے مدد کر دے تو ہم فوراً اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ زبان سے بھی اور دل میں بھی اس کے احسان مند رہتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ اس کے احسان کا بدلہ ضرور دیں۔ اب اندازہ کیجیے کہ خالقِ کائنات کے تو ہم پر اس قدر احسانات اور انعامات ہیں کہ ہم ان کا شمار بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر اس بات کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ ہم جس قدر ہو سکے اس کا شکر ادا کریں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط (النحل: ۱۸)

ترجمہ:۔ اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہ سکو۔

پھر فرمایا:۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (النحل: ۷۸)

ترجمہ:۔ اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور اس نے تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیا (اور ان کے علاوہ اور اعضا) بخشے تاکہ تم شکر کرو۔

۲۔ پورا دین شکر میں شامل ہے

مسلمان کی پوری زندگی شکر سے عبارت ہے۔ شریعت کے تمام احکامات اور عبادات کا اصل مقصد خدا کے تشکر کا اظہار ہے۔ دین اسلام کی ہر بات

شکر کے دائرے میں آجاتی ہے۔ جذبہ شکر کے بغیر تمام اعمال اور عبادات بے معنی اور لاحاصل ہو جاتی ہے۔ ایک دولت مند شخص جب اپنی دولت خدا کی راہ میں صرف کرتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے۔ مثلاً حضرت عثمان غنیؓ اپنی دولت بے دریغ راہِ خدا میں صرف کرتے تھے اور یہ بہترین شکر تھا۔ ایک صاحب علم شخص جب اپنے علم سے خدا کے بندوں کو فیض پہنچاتا ہے تو یہ علم کا شکرانہ ہے۔ مثلاً امام غزالیؒ کی اشاعتِ علم، شکر کا بہترین اظہار ہے۔ اسی طرح جب ایک حکمران کمزور اور ضرورت مند لوگوں کی خدمت اور مدد کرتا ہے تو یہ قوت کا شکر ہے۔ جیسا کہ خلفائے راشدینؓ کا مثالی نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ الغرض ہر وہ کام اور عمل جو انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں کرتا ہے، جس کا مقصد اس کی رضا اور خوشنودی ہے، سب شکر کی تعریف میں آتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (زمر: ۶۶)

ترجمہ: بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گزاروں میں سے ہو۔

پھر فرمایا:

وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ (النحل: ۱۱۴)

ترجمہ: اور اللہ کی نعمتوں کا شکر کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

۳۔ نعمتوں میں اضافہ

روزمرہ کی زندگی میں یہ عام مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے محسن اور منعم کے انعامات اور احسانات کی قدر کرے گا اور اظہارِ تشکر کرے گا تو منعم پہلے سے بڑھ کر اسے اپنے احسان اور انعام واکرام سے نوازے گا۔ جب مخلوق کا یہ حال ہے تو اللہ تعالیٰ تو خالق ہے وہ تو تمام انسانوں سے بڑھ کر اپنے بندوں کے اعمال کی قدردانی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی حقیقی معنوں میں شاکر ہے۔ جب اللہ کا بندہ اس کی نعمتوں کا شکر بجا لاتا ہے تو اس پر خالق کائنات کی طرف سے انعام واکرام کی بے پناہ بارش ہوتی ہے۔ گویا جس قدر شکر بڑھتا جائے گا، اسی قدر اللہ رب العزت کے لطف وکرم میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: ۷)

ترجمہ: اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔

۴۔ شکر و کفر کا اختیار

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ یا نائب بنا کر بھیجا اور اس کی تمام مادی، جسمانی اور روحانی ضرورتوں اور تقاضوں کی تکمیل کر دی۔ اس نے اپنے رسول بھیج کر انسان کو سیدھی راہ بھی دکھا دی اور اس طرح اس کی ہدایت کا سامان کر دیا۔ اب یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ چاہے تو اپنے خالق کا شکر بجا لائے اور چاہے تو کفر کی راہ اختیار کرے۔ خوش قسمت ہیں وہ انسان جو شکر گزاری کا راستہ اختیار کریں اور بدبخت ہیں وہ انسان جو کفر کے بھنور میں پھنس کر رہ جائیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (دہر: ۳)

ترجمہ: (اور) اسے راستہ بھی دکھا دیا (اب) خواہ شکر گزار ہو، خواہ ناشکرا۔

۵۔ خدمت خلق اور لوگوں سے بھلائی خدا کا شکر ادا کرنا ہے۔

دنیا میں شکریہ ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بجائے خدا کا شکر ادا کرنے کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں۔ اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰؑ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے

وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص: ۷۷)

ترجمہ: اور جیسی خدا نے تم سے بھلائی کی ہے ویسی تم بھی (لوگوں سے) بھلائی کرو۔

۶۔ خدا کو قرض حسنہ دینا

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرۃ: ۲۴۵)

ترجمہ: کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے۔

ظاہر ہے، خدا معاذ اللہ محتاج نہیں کہ اس کو کوئی قرضہ دے۔ خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورت مند بندوں کی مدد کی جائے۔ اس حقیقت کی وضاحت اس

حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز خدا فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہیں کھلایا۔ میں نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ کہے گا، اے میرے پروردگار! تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے، تجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟ خدا کہے گا: میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی بیمار پرسی نہ کی، میرا فلاں بندہ بھوکا تھا، تو نے کھانا نہ کھلایا، میرا فلاں بندہ پیاسا تھا تو نے پانی نہ پلایا۔ اگر تو یہ کام کرتا تو آج اس کا بدلہ میرے پاس پاتا۔

بقول مرزا غالب ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ ٭ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۷۔ خدا کی حمد جذبۂ شکر کا اظہار ہے

بقول سید سلیمان ندویؒ "شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں، کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں۔ کبھی اس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اتارتے ہیں۔ زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے، جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہُوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمدِ الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے ان تمام صفاتِ کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں اور اسی لیے یہ کہنا چاہیئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے۔ اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمدُ سے ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (فاتحہ: ۱)

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کے لائق ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے۔

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ۔ یعنی "اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر"۔

۸۔ قرآن مجید میں شکر کی تاکید

خالق کائنات نے بار بار انسان کو شکر کی ادائیگی کی تاکید کی ہے

تاکہ وہ اللہ رب العزت کے انعامات کا معترف ہو، اس کا صحیح معنوں میں اطاعت گزار اور فرمانبردار بن جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

◉ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (البقرہ : ۱۰۲)

ترجمہ : اور میرا شکر کرو اور میری نعمتوں کا کفر نہ کرو۔

◉ فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ (النحل : ۱۱۴)

ترجمہ : پس اللہ تعالیٰ نے جائز اور پاک چیزیں جو تمہیں دے رکھی ہیں، ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

◉ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (حج : ۳۶)

ترجمہ : اسی طرح ان جانوروں کو ہم نے تمہارے بس میں کر دیا، تاکہ تم شکر کرو۔

۹۔ شکر حضرات انبیائے کرامؑ کا شیوہ

حضرات انبیائے کرامؑ کی زندگیاں شکر خداوندی کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ تمام انبیائے کرامؑ اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ شکر گزار اور ممنون احسان رہے۔ ان کی زبان سے کبھی ناشکری کا ادنیٰ سا اظہار بھی نہ ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا :

اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل : ۳)

یعنی "بے شک وہ شکر گزار بندے تھے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا :

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (النحل : ۱۲۱)

ترجمہ : "(ابراہیمؑ) اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے۔ خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا۔"

آل داؤدؑ کو ارشاد ہوا :

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ (سبا : ۳)

ترجمہ : "اے داؤدؑ کی اولاد! شکر گزاری کا ہر عمل کرو۔"

۱۰۔ اسوۂ رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر دین اور اخلاق حسنہ کے لحاظ سے سید المرسلین ہیں تو شکر کے لحاظ سے بھی تمام انبیائے کرامؑ میں نمایاں ہیں۔ حضورؐ کی پوری حیاتِ طیبہ شکر خداوندی کا مجسم نمونہ تھی۔ آپ ہمہ وقت ذکر و شکر میں مشغول رہتے اور اس مقصد کے لیے راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت کرتے، حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ کو حیرت ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ کی حالت یہ تھی کہ رات کو کثرتِ قیام سے آپؐ کے پاؤں مبارک سوج جاتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ عرض کی، "یا رسول اللہؐ! آپؐ کے تو خداوند تعالیٰ نے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ پھر آپؐ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟" آپؐ نے یہ بلیغ جملہ ارشاد فرمایا:

اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا۔

یعنی "کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں، مثلاً کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، گھر میں داخل ہونے کی، سفر پر جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی وغیرہ، ان سب کا منشاء اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہیئے۔

۱۱۔ ارشاداتِ نبویؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف خود سراپا شکر تھے، بلکہ حضورؐ اپنے صحابہ کرامؓ کو بھی جذبۂ شکر کی بکثرت تلقین فرمایا کرتے تھے، چند ارشادات نبویؐ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: "کھانا کھا کر شکر کرنیوالا صابر روزہ دار کی طرح ہے۔"

۲۔ حضرت عمر فاروقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ حضورؐ! ہم کون سامال جمع کریں؟ آپؐ نے فرمایا: "ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل۔"

۳۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "قیامت کے روز بلند آواز سے پکارا جائے گا: حمادون اٹھ کھڑے ہوں گے۔" ایک جماعت

اٹھ کھڑی ہوگی۔ ان کے لیے ایک جھنڈا گاڑ دیا جائے گا۔ پس وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہؐ! حمادون کون ہوں گے؟" آپؐ نے فرمایا جو ہر حالت میں خدا کا شکر کرتے رہتے ہیں۔"

آپ صحابہ کرامؓ کو حکم دیتے تھے کہ: "مال و دولت کی بجائے شکر گزار دل کو غنیمت سمجھو۔" (مسلم)

علاوہ ازیں حضورؐ نے مختلف موقع و محل کے لیے جن دعاؤں کی تاکید فرمائی ہے، ان کا مقصود بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اور نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے۔

؎ جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا (غالب)

۴۔ رسُول اکرمؐ کا ارشادِ گرامی ہے،

مَنْ لَّا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ

یعنی: "جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا شکر نہیں کرتا۔"

۵۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا:

"اے معاذؓ! مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تم کسی نماز کے بعد ان کلمات کو ترک نہ کرنا:

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ ○ (ریاض الصالحین)

ترجمہ: اے اللہ! میں تیری مدد چاہتا ہُوں تیرے ذکر اور شکر پر اور تیری عبادت کی خُوبی پر۔

شکر کی اقسام اور ثمرات و فوائد

وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۴۵)

ترجمہ: اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب (بہت اچھا) صلہ دیں گے۔

سوال: شکر کی مختلف اقسام بتائیے اور اس کے ثمرات و فوائد بیان کیجیے؟

جواب: (۱) **اظہارِ شکر کے طریقے یا قسمیں**

اظہارِ شکر کے مندرجہ ذیل تین طریقے ہیں:-

۱۔ **قولی شکر** قولی شکر سے مراد یہ ہے کہ زبان سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور انعامات کا اعتراف کیا جائے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿ (الضحیٰ: ۱۱)

ترجمہ: اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا۔

چنانچہ قولی شکر کا ایک طریق حمدِ باری تعالیٰ کا زبان سے بیان کرنا ہے حمد کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک کا آغاز سورہ فاتحہ یعنی اپنی حمد سے کیا ہے جو پورے قرآن مجید کا خلاصہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بار بار یہ مطالبہ کیا ہے کہ انسان ہر لمحے خدا کی حمد و ثنا میں مشغول رہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر)

اس کی تاکید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمائی کہ:

اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ یعنی حمد شکر کا سرچشمہ ہے۔

نیز فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کی حمد سے عمل کا ترازو بھر جاتا ہے اور الحمد للہ سبحان اللہ اور اللہ اکبر زمین کے خلاء کو بھر دیتے ہیں۔"

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

۲۔ **قلبی شکر** انسانی دل کو بڑی اہمیت حاصل ہے یہ جملہ جذبات و احساسات اور خواہشات کا مرکز ہوتا ہے۔ تمام برے بھلے خیالات اسی منبع سے پھوٹتے ہیں۔ لہٰذا انسان کے قول و فعل میں اصلاح کے لیے دل میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا اعتراف اور احسان مندی کا جذبہ لازمی ہے۔ اگر دل کی اصلاح ہو جائے تو تمام افعال و اعمال بھی سدھر سکتے ہیں ورنہ دل میں فساد کی صورت میں اعمال و افعال بھی فساد کی زد میں آجاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝

(الشمس: ۹، ۱۰)

ترجمہ "جس نے اپنے نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا، اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا، وہ خسارے میں رہا"

ارشادِ نبوی ہے:

"انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے اور اگر یہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ رہو، وہ دل ہے۔"

چنانچہ ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن مجید، عبادت اور بھلائی کے کاموں سے دل کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ جب صحیح معنوں میں رجوع الی اللہ ہو گا اور دل میں خدا کی یاد اور ذکر کو جاگزیں کیا جائے گا تو پھر یہ سراپا شکر بن جائے گا۔ جب دل شکر کا منبع اور سرچشمہ بن جائے گا تو انسان کا ہر قول و فعل شکر کا ترجمان ہو جائے گا۔

۳۔ عملی شکر

قولی اور قلبی شکر کا اصل مقصد عملی شکر کی تربیت ہے ظاہر ہے جب زبان سے اظہارِ شکر ہو گا اور قلب سراپا شکر ہو گا تو عمل کے ذریعے لازماً اس کا اظہار ہو گا۔ عملی شکر گزاری کا طریقہ یہ ہے کہ انسان، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں اور قوتوں کو صحیح طور پر اس کی منشاء کے مطابق خرچ کرے انہیں ضائع نہ کرے اور نہ ہی غلط مصرف میں لائے۔ عملی شکر کا دائرہ بہت وسیع ہے دراصل یہ پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) جسمانی شکر

اللہ تعالیٰ نے ہمیں کس قدر خوبصورت اور متناسب جسم عطا کیا ہے۔ لہٰذا اس کی صحت و حفاظت کا خیال رکھنا اور اسے ہر طرح کی بیماریوں سے بچانا اور اس سے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے کام لینا جسمانی شکر ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: "ایک طاقتور اور توانا مومن، کمزور مومن سے بہتر ہے۔" ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا جو بہت کمزور ہو چکا تھا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا، تم توانا اور تندرست تھے اب یہ کمزوری کیسے ہوئی؟ جواب دیا، روزوں نے یہ حال کر دیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: تم پر اپنی جان کا بھی حق ہے۔ اسے صحیح طور پر ادا کرو۔"

قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کی فضیلت کو یوں بیان کیا گیا ہے:۔

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرۃ: ۲۴۷)

ترجمہ: اُس نے اُسے علم بھی بہت بخشا ہے اور تن و توش بھی (بڑا) عطا کیا ہے۔

اسی طرح ایک مالدار شخص پھٹے پرانے کپڑے پہنے حاضر ہوا تو حضور اکرمؐ نے فرمایا:
"اپنے مال کا اظہار کرو، کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔"

جسمانی قوتوں کو خدمتِ خلق اور عبادات میں خرچ کرنا، نیز دماغی صلاحیتوں کو خدا کے بندوں کو صراطِ مستقیم کی دعوت میں صرف کرنا بھی شکر میں شامل ہے۔ گویا تمام جسمانی اعضاء کو اللہ رب العزت کے بتائے ہوئے طریقے پر کام میں لانا، ان کا شکر ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شعور حاصل کرے اور اس میں خدا کی یاد بسائے زبان کا شکر یہ ہے کہ ان نعمتوں کا اظہارِ تشکر زبان سے کرے، اس کی حمد وثنا بیان کرے اور زبان سے کوئی غیر شرعی بات نہ نکالے۔ آنکھ کا شکر یہ ہے کہ اسے غلط جگہ پر نہ ڈالے، امورِ فطرت پر غور و فکر کرے، ہاتھ پاؤں کا شکر یہ ہے کہ ان سے اچھے کام بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچائے۔ الغرض ان تمام بدنی قوتوں، ذہنی صلاحیتوں اور قلب و نظر کی جملہ توانائیوں کو خدا کی راہ میں صرف کرنا، جس سے خدا کی رضامندی اور خوشنودی حاصل ہو شکر کے مفہوم میں شامل ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں اسی نکتہ کی یوں وضاحت کی گئی ہے:

"جب میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کر لیتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں، جس سے کہ وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ اس سے دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ اس سے پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں کہ وہ اس سے چلتا ہے۔" (بخاری شریف)

مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر بندہ مومن کا ہر فعل حکم الٰہی کے تابع ہو جاتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن ؛ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان (اقبال)

(ب) مالی شکر

مالی شکر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو مال و دولت عطا کیا ہے، اسے خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق خرچ کریں۔ اس کی زکوٰۃ ادا کریں۔ اسے غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کریں۔ اسے جہاد میں صرف کریں۔ دولت بذاتِ خود بری شے نہیں ہے۔ بس اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ قارون دولت کا پجاری بن گیا۔ اس نے اس دولت کو خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق خرچ نہ کیا۔ یہ مال کی ناشکری تھی۔ اس کے نتیجہ میں اسے اپنے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا۔ اس کے برعکس حضرت

عثمان غنیؓ بے دریغ اپنی دولت کو خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق صرف کرتے تھے۔ یہ مال کے شکر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ چنانچہ یہ دولت حضرت عثمان غنیؓ کے لیے باعث رحمت بن گئی۔

دراصل دولت خدا کی دین ہے وہ جسے چاہے غنی کر دے اور جسے چاہے محتاج بنا دے۔ اللہ تعالیٰ امیروں کو جو عطا کرتا ہے، اس میں غریبوں اور مسکینوں کا حق لازماً رکھ دیا گیا ہے۔ اگر یہ حق ادا نہ کیا جائے تو پرلے درجے کا ظلم ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:-

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ۙ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ۙ (المعارج: ۲۴-۲۵)

ترجمہ: اور وہ یہ لوگ ہیں جن کے مالوں میں حاجت مندوں اور ناداروں کے لیے معلوم و مقرر حق ہے۔

ب) شکر کے ثمرات وفوائد

شکر کے بے شمار فوائد و ثمرات ہیں، جو ایک شاکر بندے کو دنیا و آخرت میں حاصل ہوتے ہیں۔ وہ یہاں بھی سکون و راحت کی زندگی بسر کرتا ہے اور آخرت میں بھی اسے دائمی راحت وسکون کا اعزاز حاصل ہو گا۔ ذیل میں کچھ ثمرات و فوائد کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:-

ا۔ رضائے الٰہی ایک بندہ مومن کی زندگی کا اصل مقصود و مدعا اور معراج اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہے۔ اگر یہ نعمت حاصل ہو جائے تو اس کے مقابلے میں تمام نعمتیں ہیچ ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے تو پھر دنیا و آخرت کی تمام کامیابیاں اور کامرانیاں خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں شکر رضائے الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (زمر: ۷)

ترجمہ: اور اگر تم شکر کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو گا۔

۲۔ نعمتوں اور انعامات میں اضافہ

جو بندہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے مزید دنیاوی، روحانی اور آخروی برکات، نعمتوں اور انعامات سے نوازتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراہیم: ۷)

ترجمہ: اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔

۳۔ آخرت میں درجات کی بلندی

شکر گزار بندہ ایک طرف تو دنیا میں سکون و راحت کی زندگی بسر کرتا ہے اور دوسری طرف اسے آخرت میں دائمی سکون و راحت کا شرف حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو بلند اور اعلیٰ و ارفع درجات سے ہمکنار فرمائے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (آل عمران: ۱۴۵)

ترجمہ: اور عنقریب ہم شکر ادا کرنے والوں کو جزا دیں گے۔

۴۔ گناہوں کا کفارہ

شکر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ احسان مندی اور سپاس گزاری سے انسان کے سابقہ گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے:

"جو شخص کھانا کھائے اور پھر یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، جس نے مجھے یہ کھانا دیا، بغیر میری تدبیر اور قوت کے، تو اس سے جو گناہ پہلے ہو چکے ہیں معاف ہو جاتے ہیں۔" (ابوداؤد)

۵۔ شیطان کے مکر و فریب سے بچنے کا ذریعہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ابلیس کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ جب اس کی نافرمانی اور تکبر کے باعث اسے ملعون قرار دے دیا گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی تاکہ انسانوں کو گمراہ کر سکے۔ اسے مہلت دے دی گئی تو وہ کہنے لگا کہ میں آگے، پیچھے دائیں بائیں سے تیرے بندوں پر اپنے پیدل اور سوار لشکروں سمیت حملہ آور ہوں گا اور

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (الاعراف : ۱۷)

ترجمہ: اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: تو جو چاہتا ہے کر لے، اپنی سی کوشش کر دیکھ، لیکن:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ۝ (الحجر: ۴۲)

ترجمہ: بے شک جو میرے بندے ہوں گے، ان پر تیرا غلبہ نہ ہو سکے گا۔

اس سارے قصے سے معلوم ہوا کہ ناشکری شیطان کی جماعت میں داخل کر دیتی ہے اور شکر گزاری اس کے مکر و فریب سے بچانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

۶۔ عذاب الٰہی سے بچاؤ

شکر ایمان کی جڑ ہے، دین کی اصل اور اطاعت الٰہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہوتی ہے اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے۔ شکر عذاب الٰہی سے بچاؤ کا بہترین ذریعہ ہے، جبکہ کفر خدا کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا ۝ (النساء:)

ترجمہ: اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

۷۔ شکر۔ نصف ایمان

صحابئ رسولؐ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ شکر آدھا ایمان ہے۔ ان کے اس قول کی شرح یہ ہے کہ انسان دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی تکلیف میں ہے تو اسے صبر کرنا چاہیئے، جسے حدیث میں "نصف ایمان" فرمایا گیا ہے اور اگر راحت میں ہے تو اس کا فرض ہے کہ شکر کرے۔ پس شکر صبر کے مقابلے میں ہے، اس لحاظ سے اسے آدھا ایمان قرار دیا گیا ہے۔

(احیاء العلوم ـــــ امام غزالیؒ)

۸۔ شکر گزار ہر حال میں خوش رہتا ہے

اس مادی اور پُر آشوب دور میں بالعموم ہر شخص پریشان حال نظر آتا ہے۔ ہر طرف سکونِ قلب کا فقدان نظر آتا ہے۔ انسان مادی لذّات و فوائد کے حصول میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ شکر گزاری اور قناعت پسندی سے محروم نظر آتا ہے وہ مال و دولت، اقتدار و جاہ و پرستی اور حسن و جمال کے ایوانوں میں سکون و راحت کا متلاشی ہے، لیکن یہ محض خام خیالی ہے۔ اس کے برعکس صحیح معنوں میں وہی شخص پُرسکون و خوشحال قرار دیا جاسکتا ہے جو ہر حالت میں خدا کی رضا پر راضی اور اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کوئی تو تمنائے زر و مال میں خوش ہے ٭ اور کوئی تماشائے خد و خال میں خوش ہے
پر ہم سے جو پوچھو تو نہیں کوئی بھی خوش حال ٭ خوش حال وہی ہے جو ہر حال میں خوش ہے

صبر

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (انفال: ۴۶)

ترجمہ: "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"

سوال: صبر کا مفہوم واضح کیجیے اور قرآن و سُنّت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجیے۔

جواب: **صبر کا مفہوم** سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "صبر" کے لغوی معنی "روکنے" اور "سہارنے" کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت ہے یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثابت قدمی کے ہیں۔" (سیرۃ النبیؐ)

قرآن کی رو سے صبر کی تعریف یہ ہے کہ راہِ حق پر چلتے ہوئے صدموں، تکلیفوں، رکاوٹوں مخالفتوں اور ناگواریوں کو برداشت کرنا اور ہر قسم کے ناموافق حالات کے باوجود نیکی اور سچائی کی راہ پر ڈٹے رہنا صبر ہے۔

گویا اصطلاحِ شریعت میں صبر کا مفہوم یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کو عقل پر غالب

نہ آنے دیا جائے اور شرعی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ نفس کو گھبراہٹ کا شکار نہ ہونے دیا جائے اور تمام حالات میں استقلال اور استقامت کا مظاہرہ کیا جائے۔

امام غزالیؒ کا نقطۂ نظر

امام غزالیؒ اپنی مشہور کتاب "احیاء العلوم" میں صبر کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

"دین پر ابھارنے اور قائم رکھنے والے تصورات و اعمال پر جمے رہنا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرنا صبر ہے۔ جو شخص ہوائے نفس پر غالب آجائے اور شیطانی وسوسوں کو زیر کرلے، وہ صابر ہے اور جو نفس و شیطان کے مقابل ہتھیار ڈال دے، وہ بے صبر اور شیطانی گروہ کا فرد ہے۔"

صبر کی فضیلت و اہمیت

کسی بھی بڑے مقصد اور نصب العین کی تکمیل کے لیے صبر کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے صبر و استقلال لازمی اسباب ہیں اور پھر اشاعت و قیامِ حق کے لیے تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں صبر کا ذکر تقریباً ۵۰ مرتبہ آیا ہے۔ صبر کرنے والوں کی خوبیاں اور اوصاف بار بار بیان کئے گئے ہیں اور صبر کے نتائج و ثمرات بیان کرتے ہوئے اسے ایمان کے اعلیٰ ترین درجوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح ارشاداتِ نبویؐ میں بھی صبر کی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔ عملی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ صبر کا اعلیٰ و ارفع اور روشن نمونہ تھی۔

کتاب و سُنت پر غور کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہیں کہ ہر مسلمان اللہ کی فوج کا سپاہی ہے۔ یہ دنیا ایک معرکۂ کارزار ہے۔ ایک طرف اللہ کی فوج اور صبر کے ہتھیاروں سے مسلح کھڑی ہے اور دوسری طرف ساری شیطانی قوتیں انہیں مٹا دینے، ہڑپ کر جانے اور اسلام کو ملیامیٹ کر ڈالنے کا عزم کئے کھڑی ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خدائی فوج کے سپہ سالار ہیں اور حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ صبر و استقامت اور عزم و استقلال کا منہ بولتا نمونہ ہے، تاکہ اس مقدس فوج کا ہر سپاہی اپنے آپ کو اس پاکباز سپہ سالار کے سانچے میں ڈھال لے اور شیطانی فوج کو شکست دینے کی جدوجہد میں اپنے حصے کا کردار ادا کرے۔

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تُو امتحاں ہمارا
(اقبالؔ)

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
(مولانا ظفر علی خاں)

بہادر شیروں کی شریعت

یہ شریعت بزدلوں اور ناداروں کے لیے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اُتری ہے۔ ہوا کے رخ پر اڑنے والے خس وخاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ بلکہ ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے، جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں، جو صبر و استقلال کا پیکر ہوں، مشکلات و مصائب کے سامنے ڈٹ جانیوالے ہوں، جو صبغۃ اللہ (یعنی اللہ کے رنگ) کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں، مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی تخلیق کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے، جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہِ راست ہے، صراطِ مستقیم ہے۔ ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان (اقبالؔ)

صبر کے مواقع و مظاہر

قرآن مجید میں صبر کا مفہوم مختلف مواقع کی مناسبت سے مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ذیل میں ان مختلف مواقع و مظاہرہ کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ (بقول سید سلیمان ندوی ؒ)

۱۔ مناسب وقت کا انتظار کرنا

پہلا موقع یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی

کے لیے مناسب اور موزوں وقت کا انتظار کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپؐ کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہو گیا۔ ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں، تو اس وقت بشری تقاضے کے تحت آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی۔ اُس موقع پر تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ○

(یونس، ۱۰۹)

ترجمہ: اور (تکلیفوں پر) صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (ہود: ۴۹)

ترجمہ: تو صبر کرو کہ انجام پرہیزگاروں ہی کا (بھلا) ہے۔

۲۔ بیقرار نہ ہونا صبر کا دوسرا مفہوم و موقع یہ ہے کہ مصائب اور مشکلات میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو، بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کیا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ ○ (حج: ۳۵)

ترجمہ: اور (جب) ان پر مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتے ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ انہوں نے جسمانی اور مالی مصائب کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ○ (ص: ۴۴)

ترجمہ: بے شک ہم نے ان کو ثابت قدم پایا۔ بہت خوب بندے تھے۔
بے شک وہ رجوع کرنے والے تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اشارے پر اللہ کی راہ میں قربان ہونے کے لیے بلا تامل تیار ہو گئے:

قَالَ يَٰٓأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيٓ إِنْ شَآءَ اللَّهُ مِنَ الصَّٰبِرِينَ ۝ (الصّٰفّٰت)

ترجمہ: انہوں نے کہا کہ ابا جان! جو آپ کو حکم ہوا ہے، وہی کیجئے، خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائیے گا۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آداب فرزندی (اقبال)

۳۔ مشکلات کو خاطر میں نہ لانا

صبر کا تیسرا مفہوم اور موقع یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلات اور خطرات پیش آئیں، دشمن جو تکالیف پہنچائیں اور مخالفین جو طعن وطنز کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کی بجائے اور زیادہ استقلال اور ثابت قدمی پیدا ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ عظیم لوگوں کی راہ میں بڑے روڑے اٹکائے گئے، لیکن انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (احقاف: ۳۵)

ترجمہ: پس (اے محمدؐ) جس طرح اور عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں، اسی طرح تم بھی صبر کرو اور ان کیلئے (عذاب) جلدی نہ مانگو۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝ (مزمل: ۱۰)

ترجمہ: اور جو جو (دل آزار) باتیں یہ لوگ کہتے ہیں، ان کو سہتے رہو اور اچھے طریق سے ان سے کنارہ کش رہو۔

۴۔ درگزر کرنا صبر کا چوتھا مفہوم اور موقع یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز کیا جائے اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے، یعنی درگزر، تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝ (شوریٰ: ۴۳)

ترجمہ: اور جو صبر کرے اور قصور معاف کر دے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝ (نحل: ۱۲۶)

ترجمہ: اور اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو اتنی ہی دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کیلئے بہت اچھا ہے۔

۵۔ ثابت قدمی صبر کا پانچواں اہم مفہوم اور موقع یہ ہے کہ لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی دکھائی جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (انفال: ۴۵)

ترجمہ: تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ مراد حاصل کرو۔

وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (آل عمران: ۱۴۷)

ترجمہ: اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافروں پر فتح عنایت فرما۔

۶۔ ضبطِ نفس اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا بہت مشکل ہوتا ہے، مگر یہی ضبطِ نفس کا اصل موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار اور کیریکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ط اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ه (ہود: ۱۱)

ترجمہ: ہاں جنہوں نے صبر کیا اور نیک عمل کئے، یہی ہیں جن کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔

۷۔ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا:۔

صبر کا ایک مفہوم اور موقع یہ ہے کہ کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کیا جائے۔ ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری اور بندگی پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ه (ہود: ۱۱۵)

ترجمہ: اور صبر کیے رہو کہ اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

حدیث کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں بھی صبر و استقلال کی بہت تاکید کی گئی ہے اور اس کے بڑے فضائل بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ ان احادیث سے ظاہر ہے:۔

۱۔ صبر ایمان کی چمک دمک ہے۔ (مسلم)

۲۔ صبر نصف ایمان ہے۔ (ابو نعیم)

۳۔ ایمان صبر اور سخاوت کا نام ہے۔ (طبرانی)

۴۔ صبر کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا جسم کے ساتھ ہے۔ (مسند الفردوس)

۵۔ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔ (بخاری)

۶۔ صبر میری چادر ہے، صبر جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، صبر کشائش کی چابی ہے۔ فتح و نصرت صبر سے مشروط ہے۔

۷۔ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔
کہو میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر ثابت قدم رہ۔

۸۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا، صبر جمیل کسے کہتے ہیں؟ فرمایا: وہ ایسا صبر ہے جس میں حرفِ شکایت نہ ہو۔ جس نے غم کا اظہار کیا اس نے صبر نہ کیا۔

۹۔ مومن پر جب بھی سختی یا بیماری، رنج یا تکلیف آئے، یہاں تک کہ اسے کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کی کچھ خطائیں معاف کر دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

۱۰۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں پر گاہے گاہے آزمائش آتی رہتی ہے۔ کبھی اس کی ذات پر مصیبت آتی ہے۔ کبھی اس کا لڑکا فوت ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کا مال برباد ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جب اپنے پروردگار سے ملاقات کرتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ (ترمذی شریف)

اسوۂ رسولؐ

۱۔ کوہِ صبر و استقلال

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اولوالعزم من الرسل کہہ کر انبیائے کرامؑ کی تعریف فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ خاتم الرسل ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ آپؐ کی ذات میں یہ وصف ودیعت فرمایا ہے۔ ابتداء سے انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صبر و استقلال اور عزم و استقامت کا شاہکار ہے۔ ذرا تصور کیجئے، عرب کے کفرستان میں ایک شخص تنہا حق کا پیغام لے کر کھڑا ہوتا ہے بے یار و مددگار دعوت حق کی صدائیں بلند کرتا ہے۔ ریگستان کا ذرہ ذرہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بن کر سامنے آتا ہے۔ لیکن وقارِ نبوت اور عزمِ ربانی سے ٹھوکر کھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور مخالفتوں کی تمام قوت اس کے سامنے چور چور ہو جاتی ہے۔

۲۔ کفارِ مکہ کے مظالم

مکہ معظمہ میں تیرہ برس کی مسلسل جانگداز کشمکش اور شدید ترین مخالفت کے باوجود ذاتِ اقدس یاس و ناامیدی سے آشنا نہیں تھی۔ اور بالآخر وہ روزِ سعید آتا ہے جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ سے زائد جانثار صحابہ کرامؓ کو چھوڑ کر دنیائے فانی کو الوداع کہتا ہے۔ ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہ کرامؓ نے کفار کی متواتر ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ آپؐ ہمارے لیے کیوں دعا نہیں فرماتے۔ آپؐ کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا:

"تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں، ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا

جاتا تھا۔ ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس سے گوشت پوست الگ ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ آزمائشیں بھی ان کو دین سے برگشتہ نہ کر سکتی تھیں۔ خدا کی قسم! دین اسلام اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ کر رہے گا۔ یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت تک ایک سوار اس طرح بے خطر چلا آئے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔"

۳۔ آخری حربہ

مکہ معظمہ میں جب رؤسائے قریش ہر قسم کی تدابیر سے تھک گئے تو انہوں نے آپؐ کے سامنے تخت زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی۔ ان میں سے ہر چیز بہادر سے بہادر انسان کے قدم کو ڈگمگانے کے لیے کافی تھی، لیکن حضور اکرمؐ نے ان کی درخواست کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور بالآخر وہ وقت آ گیا جب آخری ہمدم اور معاون، دمساز و سرپرست شفیق و مہربان چچا ابوطالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا تو یہ غور و فکر کا آخری لمحہ اور عزم و استقلال کا آخری امتحان تھا اس وقت حضور اکرمؐ نے جواب میں جو کلمات زبان مبارک سے ادا فرمائے عالم کائنات میں ثبات و استقلال کے اظہار کا سب سے آخری طریقہ تعبیر ہے آپؐ نے فرمایا:۔

"چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند کو رکھ دیں، کہ میں اس کام کو اس حد تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں کہ یا تو اللہ اسے غالب کر دے یا میں اسی راہ میں جان دے دوں۔ تو نہیں چھوڑ سکتا۔"

حضورؐ کے ان الفاظ میں جو عزم و استقلال تھا، ابوطالب اس سے بہت متاثر ہوئے اور کہا: "بھتیجے! جاؤ! جو جی میں آئے کرو، میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

۴۔ حالت نماز میں کفار کی زیادتی

ایک دن رسول اکرمؐ خانہ کعبہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے۔ حرم شریف میں اس وقت کفار کی ایک جماعت موجود تھی۔ عقبہ بن ابی معیط نے ابوجہل کے اکسانے پر اونٹ کی اوجھڑی سجدہ کی حالت میں حضورؐ کی پشت مبارک پر ڈال دی اور مشرکین زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ کسی نے حضورؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی وہ فوراً دوڑی ہوئی آئیں۔ اور غلاظت آپؐ کی پشت سے دور کی اور ان کافروں کو بد دعا

دی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "بیٹی! صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے۔ یہ نہیں جانتے کہ ان کی بہتری کس بات میں ہے۔"

۵۔ ابولہب اور اس کی بیوی کی مخالفت

ابولہب حضورؐ کا حقیقی چچا تھا لیکن حضورؐ کا بدترین دشمن تھا اس کی بیوی اُمّ جمیل بھی حضورؐ کی سخت دشمن تھی۔ جب حضورؐ لوگوں کے سامنے اسلام کی تبلیغ کرتے تو ابولہب کہتا "لوگو! یہ دیوانہ ہے (معاذ اللہ)۔ اس کی باتوں پر کان نہ دھرو"۔ اُمّ جمیل حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی۔ کئی مرتبہ حضورؐ کے تلوے لہولہان ہو گئے۔ مگر آپؐ نے صبر و استقلال کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کی۔ کبھی بددعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی اس گستاخی کی مذمت میں سورۂ لہب نازل فرمائی، جس میں انہیں جہنم کی وعید سنائی گئی۔

۶۔ شعب ابی طالب کی آزمائش

کفارِ مکّہ نے جب یہ دیکھا کہ ان کی تمام مخالفتوں کے باوجود حق کا نور پھیل رہا ہے تو انہوں نے نبوّت کے ساتویں برس خاندانِ بنی ہاشم سے بائیکاٹ کر لیا جس کی رو سے تمام قبائل عرب کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ بنو ہاشم سے کسی طرح کا لین دین نہ کریں۔ ابولہب کے سوا پورا خاندان بنو ہاشم تین سال تک رسولِ اکرمؐ کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہا۔ اس دوران انہوں نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر اس موقع پر رحمۃ للعالمینؐ نے نہایت صبر و ضبط اور نہایت استقلال سے ان حالات کا مقابلہ کیا۔

۷۔ غزوۂ بدر

غزوہ بدر میں جب تین سو تیرہ بے سروسامان مسلم، ایک ہزار سازوسامان سے لیس فوج سے معرکہ آراء تھے، کفارِ قریش اپنے زور و کثرت سے بپھرے ہوئے آئے تھے۔ اس وقت مسلمان سمٹ سمٹ کر حضورِ اکرمؐ کے پہلو میں آجاتے تھے اور یہاں ہمہ نبوت کا کوہِ وقار اپنی جگہ قائم تھا۔

۸۔ غزوۂ احد

غزوۂ احد میں آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو سب نے حملہ کی رائے دی۔ لیکن جب آپؐ زرہ پہن کر تیار ہو گئے تو صحابہؓ نے رک جانے کا مشورہ دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"پیغمبر زرہ پہن کر اتار نہیں سکتا۔"

۹۔ غزوۂ حنین

غزوہ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کے تیراندازوں نے لگاتار تیروں کی بوچھاڑ کی تو اکثر صحابہؓ کے قدم اکھڑ گئے۔ لیکن آپ نہایت سکون و اطمینان سے چند جانثار کے ساتھ میدان میں جمے رہے۔ اس وقت زبانِ مبارک پر یہ رجز جاری تھا۔

انا النبی لا کذب	میں پیغمبر صادق ہوں
انا ابن عبدالمطلب	میں فرزندِ عبدالمطلب ہوں

۱۰۔ پیغمبرانہ سکون و اطمینان

ایک بار حضور اکرمؐ کسی غزوہ میں درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے۔ ایک کافر آیا تو حالت خواب میں تلوار کھینچ کر آپؐ کے سرہانے کھڑا ہو گیا حضورؐ کی آنکھ کھلی تو دشمن کو شمشیر بکف پایا۔ اس نے کہا: "محمدؐ! اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ حضور اکرمؐ نے کمال اطمینان و سکون سے جواب دیا: "اللہ" اس پیغمبرانہ عزم و استقلال سے دشمن اس قدر مرعوب ہوا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اب حضورؐ نے تلوار اٹھائی اور اس سے پوچھا: "تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟" وہ منت سماجت کرنے لگا۔ فرمایا: جاؤ، میں بدلہ نہیں لیا کرتا۔

اُسوہ صحابہ کرامؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلیٰ دینی و اخلاقی تربیت اور فیض صحبت کا اثر تھا کہ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں بھی صبر و استقلال کا جیتا جاگتا پیکر تھیں۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کا چچا انہیں کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر نیچے سے دھواں دیتا

حضرت مصعب بن عمیرؓ کی ماں کو ان کے اسلام لانے کا علم ہوا تو ان کا دانہ پانی بند کر دیا اور انہیں گھر سے نکال دیا۔

حضرت بلالؓ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ امیہ ان کی گردن میں رسی ڈال کر لڑکوں کو دے دیتا اور وہ انہیں مکے کے پہاڑوں میں گھماتے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ گردن پر رسی کا نشان پڑ جاتا تھا۔ خود امیہ انھیں باندھ کر ڈنڈے مارتا تھا اور چلچلاتی دھوپ میں جبراً بٹھائے رکھتا تھا کھانا پانی بھی نہ دیتا تھا بلکہ بھوکا پیاسا رکھتا تھا اور اس سے کہیں

بڑھ کر یہ ظلم کرتا تھا کہ جب دوپہر کی گرمی شباب پر ہوتی تو مکہ کے پتھریلے کنکروں پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھوا دیتا۔ پھر کہتا: خدا کی قسم! تو اسی طرح پڑا رہے گا۔ یہاں تک کہ مر جائے یا محمدؐ کے ساتھ کفر کرے۔" حضرت بلالؓ اس حالت میں فرماتے:

"اَحَدٌ، اَحَدٌ"

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھُوَاللہُ اَحَدٌ کہتے تھے (اقبال)

حضرت خبابؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا کر ان کے سینے پر پتھر رکھ دیا جاتا، یہاں تک کہ آگ ان کے خون اور چربی سے ٹھنڈی ہو جاتی۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کے خاندان پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے۔ حضرت سمیہؓ جو حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں، ابوجہل نے ان کے پیٹ میں نیزہ مارا اور وہ دم توڑ گئیں۔ یہ اسلام کی پہلی شہیدہ تھیں۔ مشرکین نے سزا کی ایک شکل یہ بھی اختیار کی تھی کہ بعض صحابہؓ کو اونٹ اور گائے کی کچی کھال میں لپیٹ کر دھوپ میں ڈال دیتے تھے اور بعض کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلتے ہوئے پتھر پر لٹا دیتے تھے۔

یہ سختیاں اور مظالم صحابہ کرامؓ کے پائے استقلال میں ذرہ لغزش پیدا نہ کر سکے، بلکہ وہ اس بھٹی سے کندن بن کر نکلے۔

اپنی مثال آپ ہیں یارانِ مصطفٰیؐ ✻ اسلام کا زمانے میں سکہ بٹھا دیا
مولانا ظفر علی خاں

صبر اور عملی زندگی

سوال: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں صبر کا مفہوم بیان کیجیے اور عملی زندگی میں اس کی اہمیت بیان کیجیے نیز اس کے فوائد و ثمرات پر تبصرہ کیجیے۔

جواب: **ا۔ صبر کا مفہوم** پہلے سوال میں بیان ہو چکا ہے۔

ب۔ صبر اور عملی زندگی دیکھیے پہلا سوال، صبر کے مواقع و مظاہر:

نوٹ: صبر کے مواقع و مظاہر عملی زندگی میں صبر کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

انسانی زندگی صبر سے عبارت ہے

انسانی زندگی خوشی غمی اور رنج و راحت، کا مرقع ہے۔

خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں (داغ)

انسان پر حالات و کوائف یکساں نہیں رہتے۔ کبھی تنگی ہے تو کبھی فراخی۔ کبھی مسرت و شادمانی ہے تو کبھی آہ و بکا۔ اس گردشِ زمانہ کا مقصد انسان کے صبر کا امتحان لینا ہے تاکہ دیکھا جائے کہ کون تنگی و درماندگی اور رنج و الم میں اللہ رب العزت کو یاد رکھتا ہے اور اس کی اطاعت، تسلیم و رضا پر قائم رہتا ہے اور کون اس سے منہ موڑ کر کفر و ناشکری کی راہ اختیار کرتا ہے۔ نیز فراغت و خوشحالی اور مسرت و شادمانی کے موقع پر کون آپے سے باہر ہو کر سرکشی کا مظاہرہ کرتا ہے اور کون خدا کی نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہوئے صبر کی راہ پر ثابت قدم رہتا ہے۔

زندگی کے یہ دونوں پہلو ایک بندۂ مومن کی آزمائش ہیں۔

ظفر آدمی نہ اس کو جانیے گا، خواہ کیسا ہی ہو صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝

(البقرة: ۱۵۵)

ترجمہ:۔ اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میوؤں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔

خدا کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر و استقامت کا بہترین نمونہ پیش کیا کہ خوشحالی و ابتلا دونوں مواقع پر صبر اور شکر کا مظاہرہ کیا۔

صبرِ ایوبؑ کیا، گریۂ یعقوبؑ کیا ∴ ہم نے اے عشق ترے واسطے کیا کیا نہ کیا؛

سُورۃ العصر کا پیغام

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ؏

ترجمہ: زمانے کی (یا نماز عصر کے وقت کی) قسم ہے ۔ بے شک انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے ۔

وضاحت

اللہ تعالیٰ نے گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان خسارے اور گھاٹے میں ہے، لیکن وہ لوگ اس خسارے سے بچ سکتے ہیں، جن میں یہ چار اوصاف ہوں :-

۱۔ ایمان (توحید باری اور رسالتِ محمدیؐ پر ایمان)

۲۔ نیک اعمال (قرآن و سنت کی روشنی میں)

۳۔ حق کی نصیحت (اشاعت و تبلیغ اسلام)

۴۔ صبر و استقامت

پہلی تین خصوصیات کے ساتھ چوتھی خصوصیت جو اہل ایمان اور ان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرط لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مشقتوں سے، جن مصائب سے اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ ان کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے ۔ (تفہیم القرآن)

سورۃ العصر کی اہمیت

صحابہ کرامؓ کی نگاہ میں اس سورۃ کی اہمیت کیا تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حصن الدارمی ابو مدینہ کی روایت کے مطابق اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۂ عصر نہ سنا لیتے ۔ (طبرانی)

بقول امام شافعیؒ: "اگر لوگ اس سورۃ پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کیلئے کافی ہے۔"

صبر کے فوائد و ثمرات

۱۔ بے حساب اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں صبر کرنے والوں کے لیے بے حد و شمار اجر و ثواب ہے۔ جن محاسن اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دُنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر: ۱۰)

ترجمہ: بے شک جو صبر کرنے والے ہیں، ان کو بے شمار ثواب ملے گا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ: ہر نیکی کے اجر و ثواب کا خدا کے ہاں ایک اندازہ اور حساب مقرر ہے، لیکن صبر اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کا اجر و ثواب بے حساب ہے۔

۲۔ فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دُعا دعا اور صبر کو بہترین اوصاف قرار دیا گیا ہے یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں۔ یہود جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے اس کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثیر نہیں رہا تھا اور دوسرے یہ کہ پیغامِ حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں آئیں، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبّ روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا:

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ (البقرہ: ۴۵)

ترجمہ: اور (رنج و تکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا قرب اور معیّت صبر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ صبر کرنے والا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت قدر و منزلت پا لیتا ہے۔ اللہ رب العزت ایسے بندے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسے باری تعالیٰ کی محبت، قرب اور معیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝

یعنی: بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

یعنی، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ظاہر ہے، جس بندۂ مومن کو خدا کی محبت اور قرب و معیت حاصل ہو جائے تو پھر اسے کوئی غم اور خوف نہیں ہو سکتا۔ دنیا جہان کی تمام نعمتیں اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

ارشاد نبویؐ ہے:

"اللہ تعالیٰ جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جو شخص اس ابتلاء و آزمائش پر راضی رہا، اللہ تعالیٰ اس سے راضی رہا اور جو شخص نے ناراضگی کی اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو گیا۔" اور جس سے اللہ رب العزت ناراض ہو جائے دنیا میں اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جس قدر عظیم لوگ ہو گزرے ہیں، انہیں اسی قدر آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اور پھر جب وہ ان آزمائشوں میں پورے اترے اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا تو انہیں قربِ خداوندی کا اعزاز حاصل ہوا۔ ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

۴۔ قوتِ برداشت

صبر سے انسان تکالیف و خطرات کا خوگر ہو جاتا ہے اور تکلیف کا احساس نہیں رہتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں آدمی نامساعد اور کٹھن حالات کا دل جمی سے سامنا کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان میں مصائب کے لیے قوتِ برداشت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کے کٹھن سے کٹھن مراحل بھی بآسانی کامرانی حاصل کر لیتا ہے۔ بقولِ مرزا غالب ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ:

"صبر کی عادت ڈالو، کیونکہ اس سے دنیا کے آلام برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے صبر نہ ہو تو افلاس اور بیماری عذاب ہے اور صبر ہو تو انعام و اکرام ہے۔"

۵۔ گناہوں کا کفارہ

صبر آدمی کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ صبر اختیار کرنے سے انسان کے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ

اس کی خطائیں معاف فرما دیتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے۔

"مومن پر جب بھی سختی یا بیماری، رنج یا تکلیف آئے، یہاں تک کہ اسے کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس کی کچھ خطائیں معاف کر دیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

اس طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ:

"مومن مردوں اور عورتوں پر گاہے گاہے آزمائشیں آتی رہتی ہیں، کبھی اس کی ذات پر مصیبت آتی ہے، کبھی اس کا لڑکا فوت ہو جاتا ہے، کبھی اس کا مال برباد ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔" (ترمذی)

حاصل کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ مسلمان کا شیوہ یہ ہے کہ جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے، اس کو صبر، ضبط نفس اور ثابت قدمی سے برداشت کرے اور یہ سمجھے کہ میں خدا کا محکوم بندہ ہوں، آخر بازگشت اسی کی طرف ہوگی، اس لیے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر اس راہ میں موت بھی آجائے تو وہ حیاتِ جاوید کی بشارت ہی ہے۔

عفو و درگذر

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (الاعراف: ۱۹۹)

ترجمہ:۔ عفو اختیار کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو۔

سوال: عفو و درگذر سے کیا مراد ہے؟ اس سے انسانی معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کیجیے۔ نیز رسول پاکؐ کے عفو و درگذر کے چند واقعات تحریر کیجیے؟

جواب: **عفو و درگزر**

۱۔ مفہوم و اہمیت عفو کے معنی ہیں معاف کرنا اور کسی کی غلطی کو بھلا دینا یا اس سے درگذر کرنا نظر انداز کرنا اور انتقام نہ لینا۔ اسلامی اخلاق میں عفو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو غلطی نہ کرتا ہو؟ اگر ایک دوسرے کی غلطیوں اور خطاؤں کو معاف نہ کیا جائے تو نظام تمدن و معاشرت درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ عفو کی حد یہ ہے کہ بدلہ لینے یا سزا دینے کی طاقت رکھنے کے باوجود معاف کیا جائے۔ اگر ایک شخص انتقام لینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تو اس کی خاموشی مجبوری کی خاموشی ہو گی، اسے معافی یا درگذر نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ طاقت ہوتے ہوئے بھی اندھا دھند ہر ایک کو معاف کر دیا جائے اور ایک گال پر تھپڑ مارنے والے کو دوسرا گال بھی پیش کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ تو یہ ہو گا کہ فسادی اور شر پسند لوگوں کے حوصلے بڑھیں گے اور وہ معاشرے کے امن و سکون کو غارت کریں گے۔

عفو صرف اس صورت میں مناسب ہے جبکہ گناہگار اپنی غلطی پر شرمندہ ہو۔ عفو سے بہتر نتائج نکلنے اور شر پسندوں کی اصلاح کی امید ہو۔ اسلامی تصور اخلاق نے بتایا ہے کہ معاف کرنے سے ایسا کرنے والے کی عزت یا رعب و داب میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اس کی عزت و عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔

۲۔ عفو صفت رحمانی عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لئے بھی آباد نہ ہو اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی اجڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عَفُوٌّ (درگذر کرنے والا) غَافِرٌ، غَفُوْرٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنے

والا) ہیں۔ اس کی شانِ کریمی یہ ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّاٰتِ (الشوریٰ: ۲۵)

ترجمہ: اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

؎ موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے — قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے (اقبال)

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا — پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر — لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

پا کر مجھے بے کس تری رحمت یہ پکاری — یہ بندۂ بے برگ و نوا میرے لئے ہے (حسرتؔ)

۳۔ **قرآن کی روشنی میں** قرآن مجید میں عفو و درگذر کی بہت ترغیب دی گئی ہے اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے جیسا کہ ان آیاتِ کریمہ سے ظاہر ہے:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ج (آلعمران: ۱۳۴)

ترجمہ: اور غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں کے قصور معاف کر دینے والے اور اللہ احسان کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔ (البقرہ: ۱۰۹)

ترجمہ: تو معاف کرو اور درگذر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۞ (شوریٰ: ۴۳)

ترجمہ: اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا) بخش دے تو بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۞ (الاعراف: ۱۹۹)

ترجمہ: (اے نبیؐ!) نرمی و درگذر کا طریقہ اختیار کرو، اور نیک کام کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے کنارہ کرو۔

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ط (البقرہ: ۲۳۷)

ترجمہ: اور تم معاف کردو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۴۔ حدیث کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں بھی عفو و درگذر کی بہت تلقین کی گئی اور اس کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔

جیسا کہ ان احادیث سے واضح ہے۔

۱۔ جو شخص طاقت ہوتے ہوئے محض اللہ کی رضا کے لئے کسی کی زیادتی کو معاف کر دے تو اللہ قیامت کے روز اس کی عزت بڑھا دے گا۔

۲۔ اے عقبہؓ! کیا میں تجھے دونوں جہان والوں کے بہترین اخلاق نہ بتاؤں؛ وہ اخلاق یہ ہیں کہ جو شخص تجھ سے قطع تعلق کرے تو اس سے تعلق قائم کرے۔ جو تجھے محروم رکھے تو اسے عطا کرے اور جو تجھ پر زیادتی کرے تو اسے معاف کر دے۔

۳۔ حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالٰی سے دریافت کیا کہ تیرے بندوں میں تجھے عزیز ترین کون ہے؟ اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ وہ شخص جو قدرت کے باوجود معاف کر دے۔

۴۔ پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔ (مسلم)

۵۔ ایک شخص نے حضور اکرمؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں اپنے غلام کا قصور کتنا معاف کروں؟ آپؐ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے۔ اس نے پھر یہی پوچھا تب آپؐ نے فرمایا: ہر روز ستر بار۔ (اس سے مقصد عفو و درگذر کی کثرت ہے) (ترمذی)

۶۔ اچھی سیرت کے مسلمان سے اگر کبھی لغزش ہو جائے تو اسے معاف کر دو۔ سوائے حدود اللہ کے۔ (بخاری)

۵۔ اسوۂ رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سراپا عفو و کرم تھے۔ اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ عفو و درگذر کا بہترین نمونہ ہے۔

حضور اکرمؐ نے اخلاق کی تلوار اور عفو و درگذر کی ڈھال سے لوگوں کے دلوں کو فتح کیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ارشاد ہے کہ حضور اکرمؐ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ ہاں حدود اللہ کے معاملے میں رعایت نہ فرماتے تھے۔

خطا کار سے درگذر کرنے والا — بداندیش کے دلوں میں گھر کرنیوالا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

(مسدس حالی)

حضور اکرمؐ کی حیات مقدس عفو و درگذر کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ذیل میں کچھ واقعات پیش کئے جاتے ہیں :۔

۱۔ سفرِ طائف

جب قریش مکہ نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں رسول اکرمؐ کی سخت مخالفت کی تو حضورؐ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے سرداروں کو اسلام کی دعوت دی۔ لیکن ان سرداروں نے نہ صرف آپؐ کی دعوت کو رد کر دیا، بلکہ غیر مہذب اور ناشائستہ برتاؤ کیا۔ ان کے اکسانے پر اوباشوں نے حضورؐ پر اتنے پتھر برسائے کہ آپؐ کا جسم مبارک لہولہان ہو گیا، یہاں تک کہ آپؐ کے جوتے خون سے بھر گئے۔ اس موقع پر پہاڑوں کا فرشتہ حاضر خدمت ہوا اور عرض کی کہ اگر آپؐ حکم دیں تو طائف کے دونوں جانب کے پہاڑوں کو ملا دوں تاکہ سرکش لوگ نیست و نابود ہو جائیں۔ مگر حضورؐ نے نہ صرف یہ کہ ان کو معاف کر دیا بلکہ ان کے حق میں دعا فرمائی "اے اللہ! ان کو ہدایت عطا فرما" چنانچہ یہ لوگ بعد میں ایمان لے آئے۔ اور خدا کی شان دیکھئے کہ محمد بن قاسم فاتح سندھ اسی خاندان میں پیدا ہوا۔

فتح مکہ

فتح مکہ کے موقع پر صحن کعبہ میں قریش مکہ کا اجتماع تھا۔ یہ لوگ سر جھکائے اپنے انجام کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے حضورؐ کے قتل کے منصوبے بنائے تھے۔ اور آپؐ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے کتنے ہی مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا، اور ہر طرح کا ظلم و ستم روا رکھا تھا۔ اب یہ لوگ خوفزدہ تھے کہ نہ جانے اب ان سے کتنا شدید انتقام لیا جائے گا۔ حضورؐ نے انہیں مخاطب ہو کر فرمایا :

"اے گروہ قریش! تم جانتے ہو، میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟" انہوں نے کہا: "آپؐ نیکی کا برتاؤ کریں گے، کیونکہ آپ خود مہربان ہیں اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں۔" آپؐ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی :

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ (یوسف، ۹۲)

ترجمہ: آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (و ملامت) نہیں ہے۔ خدا تم کو معاف کرے اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے۔

۲۔ عثمان کلید بردار کعبہ کا واقعہ

مکی زندگی میں مخالفت کے انتہائی دور کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ خانہ کعبہ تشریف لے گئے، عثمان

کے پاس خانہ کعبہ کی چابی تھی۔ حضورؐ نے اس سے چابی طلب کی تاکہ خانہ کعبہ میں نماز ادا کر سکیں لیکن عثمان نے چابی دینے سے انکار کر دیا کہ قریش کے ہوتے ہوئے یہ چابی آپؐ کو نہیں مل سکتی: حضورؐ نے فرمایا کہ "عثمان! ایک وقت آئے گا کہ یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور پھر میں جسے چاہوں گا، دوں گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فتح مکہ کے موقع پر وہی عثمان چابی لئے حضورؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ لیکن حضورؐ نے اس سے بدلہ نہ لیا اور فرمایا: "عثمان! اب یہ چابی میں تمہارے حوالے کرتا ہوں، اور یہ تمہارے ہی خاندان میں رہے گی۔" یہ بے مثال رویہ اور برتاؤ دیکھ کر عثمان مسلمان ہو گیا۔ اور آج تک خانہ کعبہ کی چابی اسی کے خاندان میں چلی آ رہی ہے۔

۴۔ ارادۂ قتل پر معافی

ایک بار آپؐ ایک درخت کے نیچے سو گئے اور اپنی تلوار اس کی ایک شاخ سے لٹکا دی۔ ایک کافر آیا اور تلوار نکال کر آپؐ سے کہنے لگا: "بتاؤ، تم کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "اللہ" یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی، آپؐ نے تلوار اٹھا کر فرمایا: "اب کہو تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" وہ حیران اور خوفزدہ ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"جاؤ، میں کسی سے بدلہ نہیں لیا کرتا۔"

اسی طرح فتح خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت نے آپؐ کی دعوت کی اور عمداً زہریلا گوشت پیش کیا۔ آپؐ گوشت کا ٹکڑا اٹھاتے ہیں کہ بذریعہ وحی اطلاع ملتی ہے کہ اس میں زہر کی آمیزش ہے۔ آپؐ کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہودیہ اعتراف جرم کرتی ہے مگر رحمتِ عالمؐ اسے معاف کر دیتے ہیں۔

۵۔ کفارِ مکہ کی زیادتیوں پر عفو و درگذر

قریش نے آپؐ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکیاں دیں، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسم اقدس پر نجاستیں ڈالیں، گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا۔ آپؐ کی شان میں گستاخیاں کیں، (معاذ اللہ) کبھی جادوگر، کبھی پاگل، کبھی شاعر کہا۔ لیکن آپؐ نے کبھی ان باتوں پر برہمی ظاہر نہ فرمائی۔ غریب سے غریب آدمی بھی جب کسی مجمع میں جھٹلایا جاتا تو وہ غصہ سے کانپ اٹھتا تھا۔ ایک مرتبہ حضورؐ تبلیغ کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ:

لوگو! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہو تو نجات پاؤ گے۔ پیچھے پیچھے ابوجہل تھا۔ وہ آپؐ پر خاک اڑا اڑا کر کہہ رہا تھا۔ "لوگو! اس شخص کی باتیں تم کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کر دیں۔ یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں لات و عزیٰ کو چھوڑ دو۔" راوی کا بیان ہے کہ آپؐ اس

حالت میں اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے۔

قریش ضد سے آپؐ کو محمدؐ (تعریف کیا گیا) نہیں کہتے تھے بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) (معاذاللہ) کہتے تھے لیکن آپؐ اس کے جواب میں صحابہؓ سے صرف اتنا فرماتے کہ تمہیں تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے۔ وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمدؐ ہوں۔

۶۔ بدترین دشمنوں کو معافی وحشی جو اسلام کے قوتِ بازو اور حضور اکرمؐ کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا۔ وہ جان چھپاتا پھرتا تھا۔ لیکن فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کا عفو عام دیکھ کر حاضر خدمت ہوا۔ حضورؐ نے اسے بھی معاف کر دیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ حضورؐ نے صرف اس قدر فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے۔

ہندہ ابوسفیان کی بیوی جس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کیا اور دل و جگر کے ٹکڑے کر کے کلیجہ چبایا، فتح مکہ کے دن نقاب پوش آئی کہ حضورؐ پہچان نہ سکیں اور بے خبری میں بیعتِ اسلام کر کے امان حاصل کر لے۔ پھر اس موقع پر بھی گستاخی سے باز نہ آئی۔ حضورؐ نے ہندہ کو پہچان لیا۔ لیکن اس واقعہ کا ذکر تک نہ فرمایا۔ وہ اس عالی ظرفی پر بے اختیار بول اٹھی: "یارسول اللہؐ! آپ کے خیمہ سے بڑھ کر کوئی خیمہ میرے لئے قابلِ نفرت نہ تھا۔ لیکن آج آپؐ کے خیمہ سے کوئی محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں۔ چنانچہ وہ مسلمان ہوگئیں۔

عکرمہ دشمن اسلام ابوجہل کے فرزند تھے۔ اور اسلام سے پہلے باپ کی طرح حضورؐ کے سخت ترین دشمن تھے۔ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر یمن چلے گئے۔ ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو مسلمان کیا اور خدمت اقدس میں لے کر حاضر ہوئیں۔ حضورؐ نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

مرحبا بالراکب المہاجر

یعنی: اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو!

۷۔ متفرق مثالیں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک بدو مسجد نبویؐ میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہؓ اسے پکڑنے اور مارنے کے لئے دوڑے تو حضورؐ نے فرمایا "اس بدو کو چھوڑ دو اور اسے پیشاب کرنے دو۔" جب وہ پیشاب کر چکا تو حضورؐ نے پانی منگوا کر پیشاب کا اثر زائل فرما دیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ

نے تم لوگوں کو دشواری کے لئے نہیں آسانی کے لئے بھیجا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک بدو آیا اور اس نے آپؐ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپؐ کی گردن سرخ ہو گئی۔ آپؐ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، وہ بولا، "میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دو۔ تمہارے پاس جو مال ہے وہ نہ تمہارا ہے نہ تمہارے باپ کا۔" آپؐ نے فرمایا: "مال تو اللہ کا ہے۔ اور میں اس کا بندہ ہوں۔" پھر پوچھا: "جو برتاؤ تم نے مجھ سے کیا ہے، کیا تم اس سے ڈرتے نہیں؟" اعرابی بولا: "نہیں"۔ آپ نے پوچھا "کیوں؟" اعرابی نے جواب دیا: "مجھے معلوم ہے کہ تم برائی کے بدلے برائی نہیں کیا کرتے۔" نبی اکرمؐ مسکرا دیئے۔ اور آپؐ نے اس کے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوا دیں اور کچھ باز پرس نہ کی۔ (ابوداؤد)

۶۔ اسوۂ صحابہ کرامؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلیٰ تربیت اور فیض کا اثر تھا کہ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں بھی عفو و درگذر کا بہترین نمونہ تھیں۔ حضرت عثمان غنیؓ مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ جب آپؓ کے آخر عہد خلافت میں باغیوں اور شرپسندوں کی سرگرمیاں حد سے بڑھ گئیں اور خود آپ کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تو آپ کے ساتھیوں نے اس بات کی اجازت چاہی کہ باغیوں کے خلاف سخت کارروائی کر کے ان کا خاتمہ کر دیا جائے تو آپؓ نے مکمل اختیارات اور قدرت رکھتے ہوئے اس بات کی اجازت نہ دی تاکہ نبیؐ کے شہر میں خون خرابہ کی ابتداء نہ ہو اس موقع پر آپ نے کمال درجے کے عفو و درگذر کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ باغیوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔

ایک جنگ میں حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنے مدمقابل یہودی دشمن کو زمین پر گرا لیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ قریب تھا کہ آپ اس کا سر قلم کر دیں کہ اس نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا۔ اس کی اس حرکت پر آپ نے اسے چھوڑ دیا اور تلوار نیام میں کر لی وہ بہت حیران ہوا اور اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: "پہلے میں تم سے اللہ کی خاطر لڑ رہا تھا لیکن جب تم نے میرے چہرہ پر تھوکا تو میرے دل میں ذاتی انتقام کا جذبہ پیدا ہوا، اس لئے میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔" دشمن اس عفو و درگذر سے اس قدر متاثر ہوا کہ کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ دستر خوان پر کھانا تناول کرنے بیٹھے۔ کنیز کے ہاتھ سے شوربے کا پیالہ گر گیا اور آپ کے تمام کپڑے لت پت ہو گئے۔ کنیز خوف سے کانپنے لگی لیکن اس نے اپنے حواس بجا رکھے اور قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کر دی:

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ ۝

یعنی: (اللہ تعالیٰ غصہ ضبط کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

حضرت حسنؓ نے فرمایا: "میں نے غصہ ضبط کر لیا" اس کنیز نے ایک اور آیت پڑھ دی:

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں کو معاف کر دینے والوں کو پسند کرتا ہے) حضرت حسنؓ نے فرمایا: "میں نے تمہیں معاف کر دیا" اس کنیز نے تیسری مرتبہ ایک اور آیت پڑھی: وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (یعنی اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) حضرت حسنؓ نے فرمایا: "جاؤ، میں نے تمہیں آزاد کیا۔"

۷۔ اصلاح معاشرہ

موجودہ دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ طرح طرح کی خرابیوں، بدعنوانیوں اور فتنہ وفساد میں گھر کر رہ گیا ہے۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہیں ہے۔ احترام آدمیت دلوں سے اٹھ چکا ہے اور اس کی جگہ بغض وحسد، نفرت، دشمنی اور جذبۂ انتقام جیسے رذائل اخلاق نے لے لی ہے اس تشویشناک صورت حال کی اصلاح کا یہی راستہ ہے کہ ہم اپنے اندر رواداری اور عفو و درگذر کی اعلیٰ صفات پیدا کریں اور جذبۂ ایثار سے کام لیں۔ نفرت وانتقام کی بجائے محبت و شفقت اور عفو و کرم کے جذبات پروان چڑھائیں۔ جب ایک مرتبہ جذبۂ انتقام دلوں میں جڑ پکڑ جائے تو پھر اس کا سلسلہ کہیں سے روکے سے نہیں رکتا، یہاں تک کہ اس کے نتیجہ میں معاشرے کا امن وسکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ دنیا جہنم زار بن کر رہ جاتی ہے۔

ذرا قبل اسلام کے جاہلانہ معاشرے پر نظر ڈالئے، ہر طرف قتل و غارت، فتنہ و فساد اور وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی صورت میں نور ہدایت لے کر مبعوث ہوئے۔ اور دنیا کو رحمت اور امن وسلامتی کا پیغام دیا اور پھر وہی معاشرہ تاریخ عالم کا بہترین معاشرہ بن گیا یہ عہد نبویؐ کا معاشرہ تھا۔ یہ دور صحابہ کرامؓ کا معاشرہ تھا۔ یہ اعلیٰ ترین اور مثالی معاشرہ آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ اس معاشرے کی زریں روایات کی پیروی کر کے ہم اپنے دکھوں کا مداوا کر سکتے ہیں اور اپنے موجودہ معاشرے کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔

ہمارے پاس قرآن مجید اور سنت رسولؐ کی صورت میں نسخہ کیمیا موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس بیش قیمت نسخے کو عملاً آزمائیں۔ اسی صورت میں اس کے فوائد و ثمرات منظر عام پر آ سکتے ہیں۔

دست ہر نا اہل بیمارت کند سوئے مادر آکہ تیمارت کند

(مولانا روم)

عفو کے حدود و ثمرات

سوال: عفو و درگذر کی حدود کیا ہیں؟ نیز اس کے فوائد و ثمرات بیان کیجیے۔

جواب: **عفو کے حدود** اسلامی اخلاق میں عفو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو غلطی نہ کرتا ہو؟ اگر ایک دوسرے کی غلطیوں اور خطاؤں کو معاف نہ کیا جائے تو تہذیب و تمدن کا نظام درہم برہم ہو جانے کا خدشہ ہے۔ عفو کی حد یہ ہے کہ بدلہ لینے یا سزا دینے کی طاقت رکھنے کے باوجود معاف کیا جائے۔ اگر ایک شخص انتقام لینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تو اس کی خاموشی مجبوری کی خاموشی ہو گی، اسے معافی یا درگذر نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طاقت ہوتے ہوئے بھی اندھا دھند ہر ایک کو معاف کر دیا جائے اور ایک گال پر تھپڑ مارنے والے کو دوسرا گال بھی پیش کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ تو یہ ہو گا کہ شر پسند اور فسادی لوگوں کے حوصلے بڑھیں گے اور وہ معاشرے کے امن و امان کو تباہ کر دیں گے۔ عفو صرف اس صورت میں مناسب ہے، جبکہ گناہ گار اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہو اور عفو سے بہتر نتائج نکلنے اور شر پسندوں کی اصلاح کی امید ہو۔ اسلامی تصور اخلاق نے بتایا ہے کہ معاف کرنے سے ایسا کرنے والے کی عزت و توقیر یا رعب و داب میں کوئی فرق نہیں آتا، بلکہ اس کی عزت و عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت

جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ذیل میں عفو کی کچھ حدود بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ **حدود اللہ میں عفو نہیں** اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑنے والوں کے لیے عفو و معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ ان پر ترس کھانے کی بھی ممانعت ہے۔ جب دین اور معاشرے میں فساد اور انتشار کا امکان ہو، اس وقت کسی کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً قتل، ڈاکہ، زنا اور چوری وغیرہ کے مرتکب افراد کو معاف نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس پر حد شرعی جاری ہو گی۔ عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ ایسے افراد کو قرار واقعی سزا دی جائے تاکہ معاشرہ امن و سلامتی کا گہوارہ بن سکے۔

چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے :

" اچھی سیرت اور خصلت کے مسلمان سے اگر کبھی کوئی لغزش ہو جائے تو اس کو معاف کر دو، سوائے حدود اللہ کے "۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کسی سے انتقام لیا ہو، لیکن جب لوگ حدود اللہ میں دست درازی کرتے تو حضور اکرمؐ انتہائی غضب ناک ہو جاتے "۔

اسی لیے قرآن مجید میں قصاص کو سرچشمۂ حیات قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے،

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرہ، ۱۷۹)

ترجمہ: اور اے اہلِ عقل! (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگانی ہے۔

۲۔ اعتدال و میانہ روی

بقول سید سلیمان ندویؒ: اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے، جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے۔ اعتدال و میانہ روی کی راہ مناسب ہے۔ اگر بدلہ لینے کا جذبہ حد سے بڑھ جاتے تو یہ غرور و تکبر کی علامت بن جاتا ہے اور اگر موقع و محل کی پروا کیے بغیر بس معافی کا راستہ کھول دیا جائے تو یہ پست ہمتی اور بزدلی ہے۔ ایسا تو نہ ہو کہ اگر کوئی شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ دے مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال بھی کر دے۔ اس روش سے انفرادی اور اجتماعی و ملی خودداری کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس لیے اس قوت کو بالکل ختم نہیں ہونا چاہیئے بلکہ راہِ اعتدال پر رہنا چاہیئے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○

(الشوریٰ، ۴۰)

ترجمہ: اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔ مگر جو درگذر کرے اور (معاملے کو) درست کر دے تو اس کا اجر خدا کے ذمے ہے۔ بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۳۔ انتقام لینے کی اجازت ہے

مندرجہ بالا آیت مبارکہ کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر معاف کرنے پر ہر وہ شخص جسے تکلیف پہنچی ہے، آمادہ نہیں ہے یا معاف کرنا مصلحت کے خلاف

ہے تو انتقام یا بدلہ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ قصوروار کو اس سے زیادہ تکلیف نہ پہنچائی جائے جتنی اس کی طرف سے پہنچی ہے، بلکہ اس قدر بدلہ لیا جائے، جس قدر برائی یا قصور ہے۔

۴۔ اصلاح کا یقین ہو تو معاف کیا جائے

عفو و درگذر کا اصل مقصد یہ ہے کہ مجرم اور قصوروار کے دل میں ندامت اور شرمندگی کا احساس پیدا ہو اور آئندہ کے لیے وہ اصلاح پر آمادہ ہو۔ اگر یہ مقصد پورا ہوتا دکھائی دے تو معاف کیا جائے، ورنہ معاف کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ بعض بدفطرت لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر نرمی کے سلوک کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ پہلے سے زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ وہ معاف کرنے کو کمزوری اور بزدلی خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو معاف کرنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے اور معاشرے کے لیے بھی ایسا کرنا نقصان دہ ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے؛

"متکبر کے ساتھ تکبر سے پیش آنا صدقہ ہے۔"

۵۔ معاف کرنے کی اجازت انفرادی معاملات میں ہے۔

عفو و درگذر سے کام لینا یا معاف کر دینا ایک انفرادی فعل ہے۔ اس کا تعلق ذاتی معاملات سے ہے اور ان امور میں اس کا حکم ہے جن میں معاف کرنے کا حق بندوں کو حاصل ہے۔ اس کی تائید اسوۂ رسولؐ سے ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی ذاتی معاملہ میں کسی سے انتقام نہیں لیا۔ لہٰذا ایک شخص اپنی ذات کی مناسبت سے عفو سے کام لے سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک حدود اللہ اور اجتماعی معاملات میں تعلق ہے، عفو مناسب حال نہیں ہے۔

عفو کے فوائد و ثمرات

اللہ تعالیٰ کی رضا و مغفرت کا ذریعہ

اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا۔ اس طرح عفو و درگزر اللہ تعالیٰ کی رضا و مغفرت کا

ذریعہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے ۔ اس کے اس ابرِ کرم کی کچھ چھینٹیں ہم پر بھی پڑنی چاہئیں عفو و بخشش اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ صفت ہے اس لیے وہ صفت کے اپنانے والوں کو بھی محبوب رکھتا ہے اور ان کے گناہوں کو مٹا کر عفو و مغفرت سے ہمکنار کرتا ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النور : ۲۲)

ترجمہ : ان کو چاہیئے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں ۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تم کو بخش دے ۔ اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے ۔

۲۔ دشمن دوست بن جاتے ہیں

عفو و درگزر سے محبت و الفت کے سوتے پھوٹتے ہیں ، دلوں سے بغض و کدورت اور ملال کا خاتمہ ہوتا ہے اور دشمنی دوستی سے بدل جاتی ہے ، بیگانے اپنے بن جاتے ہیں اور مخالف موافق ہو جاتے ہیں ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ (حٰمٓ السجدہ : ۳۴)

ترجمہ : تو سخت کلامی کا ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی ، گویا وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے ۔

اگرچہ غصہ کا دبانا زہر کے گھونٹ پینے کے برابر ہے لیکن اس زہر کے گھونٹ کے بعد اتنا شیریں اثر ہوتا ہے کہ عمر بھر اس کی حلاوت کا مزہ نہیں جاتا ۔ حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے :

" دودھ یا شہد کے ہر گھونٹ سے غصّہ کا گھونٹ بہتر ہے ۔ "

بنتے ہیں غیر اپنے ، ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں حکمرانیاں ہیں (حالی)

۳۔ معاشرے کا امن و سکون

عفو و درگزر کے نتیجہ میں معاشرے کو امن و سکون میسر آتا ہے اور معاشرہ کی سالمیت اور استحکام برقرار رہتا ہے ۔ باہمی حسد و عناد اور بغض و عداوت کی فضا ختم ہو جاتی ہے ۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب معاشرہ ، انتقام در انتقام کی وجہ سے عداوت و دشمنی کا جہنم زار بنا

ہوا تھا لیکن ظہورِ اسلام کے نتیجہ میں جب عفو و درگزر کا ماحول پیدا ہوا تو یہی معاشرہ جنت کا نمونہ بن گیا۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

"آپس میں ایک دوسرے کو معاف کر دیا کرو، تمہارے باہمی کینے دور ہو جائیں گے۔"

۴۔ اشاعت اسلام کا ذریعہ

مخالفین اسلام یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلا۔ یہ بات خلاف واقعہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام اخلاق کے زور سے پھیلا ہے اور اشاعتِ اسلام میں عفو کو امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ دشمنانِ اسلام جس قدر اس صفت سے متاثر ہوتے ہیں، کسی اور چیز سے نہیں ہوتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تمام غزواتِ نبویؐ سے اتنے لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے، جتنے صرف فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرمؐ کے عفو عام کی بدولت ہوئے۔ مکہ جو سالہا سال سے اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، صرف ایک دن میں جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ عفو کے ہتھیار سے بڑے جابر اور سرکش مطیع و فرماں بردار ہو جاتے ہیں اور اس کا اثر براہِ راست انسانوں کے دلوں پر ہوتا ہے۔ خود برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی اشاعت صوفیائے کرامؒ کی اسی صفت کی مرہونِ منت ہے۔

۵۔ عفو، غصہ کا علاج

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں، جتنا غصہ کی حالت میں، جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ لیکن ایمانِ کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں عفو کا جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ غصہ سے مغلوب ہونا ایک اعصابی مرض ہے۔ آج کل بلڈ پریشر کی بیماری عام ہے۔ یہ بھی غصہ اور غضب کی ایک صورت ہے۔ ماہر نفسیات اس کا علاج یہ بتاتے ہیں کہ سکون اور نرمی اختیار کی جائے۔ ڈاکٹر حضرات اس ضمن میں روحانی سکون حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں، جس کا اہم ذریعہ نماز ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۚ (الشوریٰ: ۳۷)

ترجمہ: اور جب غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔

ارشادِ نبویؐ ہے: "غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا

ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ اس لیے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کر لے۔"

پھر فرمایا: "اصل پہلوان وہ ہے جو غصہ کو پچھاڑ لے۔"

۶۔ جاہلوں سے بچنے کا مؤثر ذریعہ

مذہبی اختلافات کے موقع پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ احمق لوگوں کو اچھی بات بتائی جائے تو وہ نہیں مانتے، بلکہ وہ اپنی جہالت پر اڑے رہتے ہیں اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝

(الاعراف: ۱۹۹)

ترجمہ: عفو اختیار کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کر لو۔

مقصد یہ ہے کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیک کا حکم دیتے رہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ (المومنون: ۹۶)

ترجمہ: اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو، جو نہایت اچھی ہو اور یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں ہمیں خوب معلوم ہے۔

۷۔ بے پناہ اجر و ثواب

عفو کا وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہائی درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(آل عمران: ۴-۱۳۳)

ترجمہ: اور اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو (خدا سے) ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو ضبط کرتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔

۸۔ ایثار و قربانی

عفو کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ افراد معاشرہ کے دل میں ایثار و قربانی کے احساسات پیدا ہوں گے، کیونکہ عفو کی بدولت ایثار کا جذبہ قوی ہوتا ہے اور ایثار ہی وہ جذبہ ہے، جس کے ہوتے ہوئے کوئی معاشرہ سنگدلی اور ظلم وستم کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

۹۔ عزت و وقار میں اضافہ

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ بہادر اور عالی حوصلہ لوگ ہی عفو سے کام لیتے ہیں اور ان کے اس طرزِ عمل سے ان کی عزت و وقار میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

"اللہ تعالیٰ عفو و درگزر کرنے والے کی عزت میں اضافہ کرتا ہے۔"

۱۰۔ دیگر فضائل اخلاق

عفو اور بخشش سے انسان میں عزم و حوصلہ، شرف و کمال، تحمل و بردباری، خودداری جیسے دیگر فضائل اخلاق تربیت پاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿﴾ (الشوریٰ: ۴۳)

ترجمہ: "اور جو صبر کرے اور قصور معاف کر دے تو بیشک یہ ہمت کے کام ہیں۔"

عدل

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ: ۸)

ترجمہ: عدل کرو، یہ تقویٰ (خدا ترسی) سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

سوال: عدل کا مفہوم واضح کیجیے اور اس کی اہمیت و افادیت قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کیجیے۔

جواب ۱

عدل کا مفہوم

عدل کا لغوی معنی ہے برابر برابر تقسیم کرنا۔ بار برداری کے جانور پر دائیں بائیں دونوں طرف جو بوجھ ہوتا ہے ان میں سے ہر ایک کو عدل کہا جاتا ہے۔ اس کا ہم معنی دوسرا لفظ انصاف ہے، جس کا معنی ہے نصفا نصف بانٹنا اور صحیح تقسیم کرنا۔ اسلامی اخلاق میں عدل و انصاف کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ بلا رو رعایت وہ معاملہ کرنا جس کا وہ دراصل حقدار ہے۔

سید سلیمان ندوی رح کا قول

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں "عدل" کہتے ہیں اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں، جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں، اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے۔ اس تشریح سے معلوم ہو گا کہ اخلاق کے ترازو میں عدل و انصاف کا پلہ کچھ کم بھاری نہیں۔

(سیرۃ النبی ؐ)

حضرت علی ہجویری، داتا گنج بخش رح کا قول

کسی چیز کو اس کے صحیح موقع و محل میں رکھنا عدل ہے اور اس کی ضد ظلم ہے، جس کے معنی کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا ہے جو اس کے لائق نہ ہو۔

(کشف المحجوب)

مولانا مودودی رح کا قول

عدل کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو، دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے۔

اہمیت

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہوا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بل بوتے پر قائم ہے۔ وہ قادر مطلق اپنی تمام مخلوقات پر اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے اور نظام عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے۔

عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا جائز حق بہ آسانی مل جائے نظامِ عدل کی موجودگی میں معاشرے کے تمام امور و معاملات خوش اسلوبی سے سرانجام پاتے ہیں اور بے انصافی کی وجہ سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعثتِ نبوی ؐ سے پہلے دنیا عدل وانصاف کے تصور سے خالی ہو چکی تھی، طاقتور ظلم وستم کو اپنا حق سمجھتے تھے اور کمزور اپنی مظلومیت اور بے بسی کو تقدیر اور قسمت سمجھ کر برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

دین اسلام کے طفیل ظلم وستم کا یہ تاریک دور اپنے انجام کو پہنچا اور دنیا عدل وانصاف کے اس اعلیٰ معیار سے روشناس ہوئی، جس نے رنگ ونسل اور قوم ووطن کے امتیازات کو مٹا کر رکھ دیا، اس کے نتیجہ میں طبقاتی اور گروہی نفرت کا خاتمہ ہوا اور لوگوں کے درمیان انس ومحبت کا وہ لازوال رشتہ قائم ہوا، جو انسانیت کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (اقبال)

اسلام ہی میں عدالت اجتماعیہ ہے

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ "اسلام میں بھی عدالت اجتماعیہ ہے"، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ "اسلام ہی میں عدالت اجتماعیہ ہے"۔ اسلام وہ دین حق ہے جو خالقِ کائنات نے انسان کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے اور انسانوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور یہ طے کرنا کہ ان کے لیے کیا چیز عدل ہے اور کیا عدل نہیں ہے، انسانوں کے خالق ورب ہی کا کام ہے۔ دوسرا کوئی نہ اس کا مجاز ہے کہ عدل وظلم کا معیار تجویز کرلے اور نہ دوسرے کسی میں یہ اہلیت پائی جاتی ہے کہ حقیقی عدل قائم کرسکے۔ انسان اپنا آپ مالک اور حاکم نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے معیارِ عدل خود تجویز کرلینے کا مجاز ہو، کائنات میں، اس کی حیثیت خدا کے مملوک اور رعیت کی ہے، اس لیے معیارِ عدل تجویز کرنا اس کا اپنا نہیں بلکہ اس کے مالک اور فرمانروا کا کام ہے۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ عدل اللہ اور اس کے رسول ؐ کے سوا کسی کے پاس نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور عدل قائم کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اسلام، پورا کا پورا اسلام، بلکہ کم وکاست اسلام، قائم کر دیا جائے۔ عدل، اسلام سے الگ کسی چیز کا نام نہیں ہے، اسلام خود عدل ہے۔ اس کا قائم ہونا اور عدل کا قائم ہو جانا ایک ہی چیز ہے۔ (اسلامی ریاست ـــ مولانا مودودیؒ)

عدل کی اقسام

عدل کی دو بڑی اقسام کی جا سکتی ہیں :

ا۔ انفرادی عدل　　ب۔ اجتماعی عدل

ا۔ انفرادی عدل

انفرادی عدل میں مندرجہ ذیل شعبے شامل ہیں :۔

۱۔ اپنی ذات سے انصاف

اپنی ذات سے انصاف کرنا اور اس کا حق اسے دینا۔ اپنے وجود اور ساری قابلیتوں کو خداداد جان کر انہیں صحیح استعمال کرنا اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو بلاوجہ تکلیف نہ دینا۔ انفرادی عدل کہلاتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں خودکشی حرام ہے اور اپنے جسم کو دکھ دینا ترک دنیا، خدا کی نعمتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور جسم و جان پر بے پناہ اور بلاوجہ بوجھ ڈالنا ناجائز ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے :

"تم پر اپنی ذات کا بھی حق ہے۔"

۲۔ رشتہ داروں سے عدل و انصاف کرنا

اسلام اپنے دور و نزدیک کے رشتہ داروں سے عدل و انصاف کرتے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ان رشتہ داروں میں بیوی بچے، والدین، بہن بھائی اور دوسرے دور و نزدیک کے رشتہ دار شامل ہیں۔

۳۔ ہر مسلمان کے ساتھ عدل و انصاف کرنا

اسلام کا نظامِ عدل یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کیا جائے، تاکہ معاشرے میں استحکام پیدا ہو اور اسلامی اخوت کے تقاضے پورے ہوں۔

۴۔ غیر مسلموں سے عدل و انصاف

اسلام کے ضابطہ عدل کی رو سے غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(ب) اجتماعی عدل

دوسری قسم اجتماعی عدل ہے جس کے حسبِ ذیل شعبے ہیں :

۱۔ معاشرتی عدل معاشرتی عدل یہ ہے کہ انسانی تمدن کو اسلام کے قانونِ حقوق و فرائض کے مطابق ڈھالا جائے اور ان حقوق و فرائض میں اعلیٰ توازن پیدا کیا جائے۔ ظاہر ہے فساد و بگاڑ اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ جب حقوق و فرائض کو صحیح طور پر ادا نہ کیا جائے اور ان میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔

۲۔ معاشی عدل معاشی عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد امیر و غریب اور بڑے چھوٹے کی بنیاد پر نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی عوام کی فلاح و بہبود پر رکھی جائے۔ ہر شخص کو اس کی لازمی ابتدائی ضروریات، کھانا، کپڑا، مکان، تعلیم، علاج وغیرہ مہیا کرنا اور اسلامی معاشرے کو صحیح معنوں میں فلاحی معاشرہ بنانا عدل کا بنیادی اور فطری تقاضا ہے۔

۳۔ قانونی عدل اسلام کی نگاہ میں قانونی طور پر ساری رعایا برابر ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کا فرق بھی نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میری محبوب بیٹی بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ اس لیے قانونی عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ہر شخص تک عام کیا جائے اور اس کی راہ میں سفارش یا رشوت وغیرہ کو حائل نہ ہونے دیا جائے۔ رسولِ اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں اس کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔

۴۔ سیاسی عدل اسلامی ریاست کی بنیاد شوریٰ (باہمی مشورے) پر ہے اور اس میں صحیح جمہوری روح کارفرما ہے۔ حقوق و فرائض میں سب لوگ حتیٰ کہ صدر مملکت بھی برابر ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ خلافت الٰہی کا نظام قائم ہو اور زندگی کے تمام معاملات خدا کے قانون کے مطابق طے ہوں۔

اسلام کا نظامِ عدالت اسلام کے نظامِ عدالت میں اس کے اوّلیں جج خود حضرات انبیائے کرامؑ ہوتے ہیں اور ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ قانونِ الٰہی کے مطابق کریں۔ پھر جو لوگ حضرات انبیائے کرام کے بعد عدالت کی کرسی پر بیٹھیں، ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ اپنے فیصلوں کی بنیاد اس قانون پر رکھیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے ان کو ملا ہے۔ قرآن مجید کی رو سے جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق

فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں، وہ ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ .... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ .... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (المائدۃ: ۴۴ - ۴۷)

ترجمہ: اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔ ظالم ہیں۔ فاسق ہیں۔

۳۔ **قرآن کی روشنی میں** قرآن مجید میں عدل و انصاف پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے۔ جیسا کہ ان آیات کریمہ سے واضح ہے۔

۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (المائدہ: ۸)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۝ (النحل: ۹۰)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الحجرات: ۹)

ترجمہ: اور تم عدل کرو بے شک اللہ عدل و انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ ۝ (الانعام، ۱۵۲)

ترجمہ: اور جب بات کہو تو خدا لگتی (عدل کی) کہو، اگرچہ وہ کسی رشتہ دار کے خلاف ہی پڑ جائے۔

۴۔ **حدیث کی روشنی میں** احادیث مبارکہ میں بھی عدل و انصاف پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ان احادیث سے ظاہر ہے:

۱۔ سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ میدانِ قیامت میں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا اور اس میدان میں اس سائے کے سوا کوئی سایہ بھی نہ ہو گا۔ ان میں سے پہلا عادل حاکم ہے۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ جو لوگ اپنے اہل و عیال اور ماتحتوں سے عدل و انصاف کرتے ہیں۔ وہ خدا کے ہاں نور کے منبروں پر جلوہ گر ہوں گے۔

۳۔ عادل سلطان زمین پر اللہ کا سایہ ہے۔

۴۔ تین شخص جنتی ہیں :۔ پہلا وہ شخص اختیار جو عدل کرے اور اسے نیکی کی توفیق ملے دوسرا وہ شخص جو ہر شخص اور رشتہ دار کیلیے نرم دل اور رحیم ہو۔ تیسرا وہ پاکباز شخص جو عیال دار ہونے کے باوجود حرام خوری اور سوال سے بچتا رہے۔ (مسلم)

۵ اسوۂ رسول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ہمیں عدل و انصاف کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ جنگ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مجاہدین کی صفوں کو درست فرما رہے تھے تو ایک شخص کے پیٹ پر اس تیر سے معمولی سی خراش آگئی جس سے حضورؐ صفیں درست فرما رہے تھے وہ صحابیؓ کہنے لگے کہ حضورؐ میں اس کا بدلہ لوں گا۔ حضورؐ نے خوشی کے ساتھ اپنے آپ کو بدلے کے لیے پیش فرما دیا۔ وہ صحابیؓ حضورؐ کے جسم مبارک سے لپٹ گئے اور اس کے بوسے لینے لگے اور عرض کیا: "حضورؐ! یہ تو محض ایک بہانہ تھا۔ میرا اصل مقصد یہ تھا کہ میرا جسم آپؐ کے جسم اطہر سے چھو جائے تاکہ اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جائے۔

اسی طرح جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قریش کے ایک معزز خاندان کی عورت نے چوری کی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سفارش کی، جن سے حضورؐ کو بہت انس تھا۔ لیکن حضورؐ نے یہ سفارش نہ مانی اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "پہلی امتیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے امیروں اور غریبوں کے لئے الگ الگ قانون بنا رکھے تھے۔ اگر کوئی امیر آدمی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا اور اگر غریب پکڑا جاتا تو اسے سزا دی جاتی۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا۔"

۶۔ اسوۂ صحابہؓ

خلافت راشدہ کے دور میں بھی ہمیں عدل و انصاف کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں جبلہ غسانی اپنے علاقے کا بادشاہ تھا جس نے اسلام قبول کر لیا۔ حج کے موقع پر بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی عبا پر ایک غریب بدو (دیہاتی عرب) کا پاؤں آگیا۔ جبلہ نے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ بدو حضرت عمرؓ کے پاس فریاد لے کر آیا۔ فاروقِ اعظمؓ نے جبلہ کو بلایا اور اس سے کہا کہ یا تو بدو کو راضی کر کے اس سے معافی مانگ لو، ورنہ یہ بدو بھی تمہیں تھپڑ رسید کرے گا۔"

جبلہ نے مہلت مانگی اور وہ چوری چھپے راتوں رات اپنے علاقے کی طرف بھاگ گیا اور اسلام سے پھر گیا۔ وہ کہنے لگا کہ "یہ کیسا مذہب ہے جس میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں"۔ فاروقِ اعظمؓ کو اس کے مرتد ہونے کا افسوس ہوا، لیکن آپ نے اس کی خاطر اسلام کے اصولِ عدل وانصاف کو پامال نہ ہونے دیا۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تو آپ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"تم میں سے جو شخص طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے، کیونکہ مجھے اس سے کمزور کا حق واپس دلانا ہے۔ اور جو شخص تم میں سے کمزور ہے وہ میرے نزدیک طاقتور ہے۔ کیونکہ مجھے اس کا حق واپس دلانا ہے۔"

حضرت علی المرتضیٰؓ کے زمانے میں آپ کی زرہ (لوہے کا جنگی لباس) گم ہو گئی۔ آپ کو وہ زرہ ایک یہودی کے پاس مل گئی۔ اگر حضرت علیؓ چاہتے تو خلیفہ ہوتے ہوئے جبراً یہودی سے زرہ چھین لیتے لیکن آپ نے ایسا نہ کیا بلکہ یہودی کے ہمراہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے گواہ پیش کرنے کے لئے کہا۔

حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے حسنؓ اور غلام قنبر کو بطور گواہ پیش کیا۔ لیکن قاضی نے کہا کہ اسلام میں بیٹے کی گواہی اپنے باپ کے حق میں اور غلام کی گواہی اپنے آقا کے حق میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ کوئی اور گواہ لائیے۔ لیکن حضرت علیؓ کوئی اور گواہ پیش نہ کر سکے، چنانچہ قاضی نے فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔ یہودی پکار اٹھا:

"جس مذہب میں اس قدر عدل وانصاف ہے، یقیناً وہ سچا مذہب ہے۔" چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا اور وہ زرہ حضرت علیؓ کو واپس کر دی۔ لیکن حضرت علیؓ نے اب وہ زرہ اسے بطور تحفہ دے دی۔

عدل کا اجتماعی و عالمگیر تصوّر

سوال: "عدل انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے"۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی وضاحت کیجئے نیز عدل کے فوائد و ثمرات بیان کیجئے۔

جواب:

(۱) عدل کا اجتماعی و عالمگیر تصوّر

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہوا ہے صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے۔ وہ اپنی تمام مخلوق پر اپنی شہنشاہی

پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ (آل عمران: ۱۸)

ترجمہ: (اللہ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں وہ بھی گواہی دیتے ہیں)

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے اور نظام عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل: ۹۰)

ترجمہ: تحقیق اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

گویا عدل انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ انفرادی عدل یا اپنے نفس کے ساتھ عدل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، انفرادی عدل یہ ہے کہ اپنی ذات سے پورا انصاف کیا جائے اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو بلاوجہ تکلیف میں نہ ڈالا جائے۔ اسی لیے اسلام نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے۔ اپنے جسم کو دکھ دینا، ترک دنیا خدا کی نعمتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور جسم و جان پر بے پناہ اور بلاوجہ بوجھ ڈالنا ناجائز ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

"تم پر اپنی ذات کا بھی حق ہے۔"

اس کے علاوہ اپنے نفس سے اعتدال کے ساتھ کام لینا اور اسے غیر معمولی سہولت یا تکلیف میں مبتلا نہ کرنا، انفرادی عدل کہلاتا ہے۔ روزمرہ کے امور، عبادات اور معاملات میں اعتدال قائم رکھنا زندگی میں حصول کامیابی کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو جسمانی صحت برقرار رہ سکتی ہے اور نہ روحانی ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسلام دین فطرت ہے وہ اعتدال اور دین و دنیا میں مکمل توازن و تناسب قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"اچھی سیرت، وقار اور میانہ روی، نبوت کے چوبیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔"

میانہ روی کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام اور ہر حال میں افراط و تفریط سے بچا جائے اور اعتدال کی روش اختیار کی جائے۔ بعض صحابہؓ نے بہت زیادہ عبادت گذاری کا ارادہ کیا، یعنی دن کو ہمیشہ روزہ رکھنے اور پوری رات جاگ کر نمازیں پڑھنے کا منصوبہ بنایا تو حضورؐ نے سخت تنبیہ فرمائی اور اس سے منع فرمایا۔ پھر فرمایا:

"فقر اور غنا میں میانہ روی اختیار کرو۔"

انفرادی زندگی میں مادہ اور روح کے درمیان اعتدال ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔

۲۔ عائلی زندگی میں عدل

عائلی زندگی پورے معاشرے کی بنیاد ہے۔ وہ گھرانہ جنت کا نمونہ ہوتا ہے، جس میں میاں بیوی والدین اور اولاد ایک دوسرے کے باہمی حقوق عدل و انصاف سے ادا کرتے ہیں۔ ازدواجی زندگی میں عدل کی سب سے زیادہ ضرورت اس شخص کو ہوتی ہے، جس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں کیونکہ وہ ایک بیوی اور اس کی اولاد کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ دے گا تو لازماً دوسری بیوی اور اس کے بچوں کے حقوق کی نگہداشت نہ ہو سکے گی۔ اس طرح خاندان میں عدم توازن اور انتشار پیدا ہو گا اور پورا گھرانہ جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ اسی لیے جب بعض خصوصی حالات کے پیشِ نظر ایک سے زائد شادیاں کی اجازت دی تو عدل کی شرط عائد کر دی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء: ۳)

ترجمہ: پس اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک بیوی کافی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازدواج میں عدل کا بہترین نمونہ پیش فرمایا۔ اسی طرح عائلی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے اولاد میں عدل و انصاف قائم رکھنا بھی ضروری ہے، ورنہ ان میں حسد و بغض پیدا ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار اس امر کی تاکید فرمائی کہ لڑکے لڑکیوں میں فرق نہ کرو اور ہر معاملے میں ان سے یکساں سلوک کیا کرو۔

۳۔ معاشرتی زندگی میں عدل

عائلی زندگی کے بعد معاشرہ آتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں بھی عدل بہت ضروری ہے۔ اگر

باہمی تعلقات اور دیگر مختلف معاملات میں عدل کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو معاشرہ بے انصافی اور عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام معاشرتی عدل و انصاف کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام اولادِ آدم انسانی شرف میں برابر ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ کسی کے حق میں ادب و احترام کا پہلو زیادہ ہے اور کسی کے حق میں شفقت و محبت کا۔ عمر میں بڑے احترام کے زیادہ مستحق ہیں اور کم عمر والے محبت و شفقت کے لائق ہیں۔

معاشرتی حقوق میں سب سے اہم اور نازک پہلو یتیموں کے حقوق کا ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ یتیموں کی کفالت و پرورش کے بہانے ان کا مال غصب کر جاتے ہیں۔ جو اسلام کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (النساء: ۱۲۷)

ترجمہ: اور (خاص کر) یہ کہ تم یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔

۴۔ ناپ تول میں عدل

قرآن مجید میں بار بار اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے۔ کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایسا ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ نہایت عام اور وسیع ہے۔ یہ عیب انتہائی اخلاقی گراوٹ کا مظہر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ (الرحمٰن: ۹)

ترجمہ: اور وزن انصاف کے ساتھ پورا کرو اور تولنے میں کمی نہ کرو (یعنی ڈنڈی نہ مارو)

پھر فرمایا:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۝ (الانعام: ۹)

ترجمہ: اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو۔

حضرت شعیب علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ ان کے زمانے میں قوم مدین ایک سخت عذاب سے اس لیے دو چار ہوگئی کہ وہ معاملات، لین دین اور تجارت میں بددیانتی کرتی تھی۔

۵۔ دو گروہوں میں عدل

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا

بھی ایک عدالتی معاملہ ہے۔ اس لیے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ جب دونوں گروہ مرنے مارنے پر تیار ہو جائیں تو اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الحجرات : ۹)

ترجمہ: اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائے۔ پس جب وہ رجوع لائے تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۶۔ عدالتی معاملات میں عدل

عدل و انصاف کی خاص طور پر ضرورت عدالتی معاملات میں پیش آتی ہے، کیونکہ یہیں حق و باطل اور صحیح و غلط میں فرق کیا جاتا ہے، اس لیے اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور قرآن مجید میں ہر ضابطہ سے متعلق ہدایات موجود ہیں تحریری دستاویز کے بارے میں حکم ہے۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ (البقرۃ: ۲۸۲)

ترجمہ: اور لکھنے والا تم میں (کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ) انصاف سے لکھے۔

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حکم کو عداوت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل و انصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ (الانعام: ۱۵۲)

ترجمہ: اور جب بات کہو تو عدالتی (عدل کی) کہو، اگرچہ وہ کسی رشتہ دار کے خلاف ہی پڑ جائے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (المائدہ: ۸)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

شہادت اور گواہی پر معاملات کے فیصلوں کا دارو مدار ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلام میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ (البقرہ: ۲۸۳)

ترجمہ: اور تم گواہی مت چھپاؤ۔ جو اس کو چھپائے گا، اس کا دل یقیناً گنہگار ہے۔

ارشادِ نبوی ہے: "جھوٹی گواہی دینا گناہ کبیرہ ہے" (بخاری)

اسلام حاکم یا قاضی کے لیے عادل ہونے کی شرط عائد کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ (النساء: ۵۸)

ترجمہ: بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کرو اور جب تم لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل کرنے میں اس حد تک احتیاط کی تاکید فرمائی کہ کوئی حکم دو اشخاص کے درمیان اس وقت تک فیصلہ نہ کرے جب تک کہ وہ غصہ کی حالت میں ہو۔"

۷۔ غیر مسلموں سے عدل اسلام صرف اپنوں ہی کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کی تلقین نہیں کرتا، بلکہ غیر مسلموں اور دشمنوں کے ساتھ

بھی عدل ہی کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ نیز عدل و انصاف کے موقع پر ہر قسم کے تعصب اور دشمنی کو نظر انداز کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر آیت گزر چکی ہے کہ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ (المائدہ : ۸)

یہود و نصاریٰ اسلام کے کھلے دشمن تھے۔ اس پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے وحیِ الٰہی یہ کہلواتی ہے۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ط (شوریٰ ، ۱۵)

ترجمہ : اور کہہ دو کہ جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے، میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تم میں انصاف کروں۔

۷۔ رشوت ستانی کی ممانعت

رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا شریعت میں سخت گناہ ہے۔

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے :

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ع

ترجمہ، اور نہ مال ما (رشوۃً) حاکموں کے پاس پہنچاؤ تاکہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ۔ اور (اسے) تم جانتے بھی ہو۔

رشوت کسی منصف یا گواہ کو متاثر کرنے میں بڑا کام کرتی ہے اور اس سے انصاف کی جڑ کٹتی ہے۔ یہ ایک ناسور ہے جو معاشرے کے لیے تباہ کن ہے۔ اس لیے اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے اور اس کی سزا جہنم بتاتی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے :

اَلرَّاشِىْ وَالْمُرْتَشِىْ كِلَاهُمَا فِى النَّارِ

ترجمہ : رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں دوزخی ہیں۔

۹۔ دولت مند و محتاج کا لحاظ کئے بغیر عدل

جس طرح اسلام اپنے نفس کا خیال بیچ میں لائے بغیر اور قرابت داروں کا لحاظ کئے بغیر عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اسی طرح وہ اس بات کی بھی تلقین کرتا ہے کہ عدل کرتے وقت نہ تو دولت مندی کی

طرف داری کا خیال رکھا جائے اور نہ محتاج پر رحم اور ترس کا لحاظ رکھا جائے۔ یعنی فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو۔ اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور قرابت کو بھی نہ دیکھو۔ کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں رد و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے۔ فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ میں کوئی اچھا سا یا بُرا جذبہ حاکم و منصف کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بننے پائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ (النساء: ۳۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو۔ اور اللہ کے لیے سچی گواہی دو۔ خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو اللہ ان کا خیر خواہ ہے۔

(ب) عدل کے فوائد ثمرات

عدل و انصاف کے نتیجہ میں متعدد انفرادی و اجتماعی فوائد و ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔

ا۔ استحکام معاشرہ

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے پورے نظام عالم کو قائم کر رکھا ہے۔ اگر دنیا سے عدل و انصاف اٹھ جائے تو نظم عالم درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ یہاں پر افراتفری، انتشار، بدامنی، لاقانونیت، اور فتنہ و فساد کا دور دورہ ہو جائے اور کسی شخص کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ رہے۔ یہ فتنہ و فساد اور بدامنی و لاقانونیت اور فتنہ و فساد کا دور دورہ ہو جائے۔ اور کسی شخص کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ رہے۔ یہ فتنہ فساد اور بدامنی و لاقانونیت اتنی بری چیز ہے کہ

قرآن مجید میں اسے قتل سے بھی سنگین جرم قرار دیا ہے۔ اس بدامنی اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ قانونِ عدل کا نفاذ اور اس پر عمل ہے۔ گویا کسی معاشرے کے امن و سکون اور استحکام کا ضامن صرف عدل ہے۔ سعودی عرب میں اگرچہ مکمل اسلامی نظام رائج نہیں البتہ تعزیراتِ اسلام کے نفاذ کے باعث وہاں جو عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں، اس کی بدولت کافی معاشرتی استحکام پایا جاتا ہے اور وہاں باقی دنیا کے مقابلے میں نسبتاً بہت کم جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔

۲۔ معاشرتی مساوات

اسلامی عدل کی نظر میں مال و دولت، رنگ و ملت مذہب و عقیدہ کی کوئی قید نہیں۔ بلکہ تمام کو یکساں نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ میں مساوات قائم ہوتی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں جبلہ غسانی اپنے علاقے کا بادشاہ تھا، جس نے اسلام قبول کر لیا۔ حج کے موقع پر بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی عبا پر ایک غریب بدو کا پاؤں آ گیا۔ جبلہ نے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ بدو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس فریاد لے آیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جبلہ کو بلایا اور اس سے کہا کہ "یا تو بدو کو راضی کر کے اس سے معافی مانگ لو، ورنہ یہ بدو بھی تمہیں تھپڑ رسید کرے گا"۔ جبلہ نے مہلت مانگی اور وہ چوری چھپے رات کو اپنے علاقے کی طرف بھاگ گیا اور اسلام سے پھر گیا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ کیسا مذہب ہے، جس میں بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کے مرتد ہونے کا افسوس ہوا، لیکن آپ نے اس کی خاطر اسلام کے اصولِ عدل و انصاف کو پامال نہ ہونے دیا۔

۳۔ عادل حکمران زمین پر خدا کا سایہ

:- ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

سُلْطَانُ الْعَادِلِ ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرْضِ

یعنی عادل سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عدل و انصاف کرنے والا حکمران دنیا والوں کے لیے باعث رحمت ہوتا ہے۔ تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں بادشاہ کو "ظلِ الٰہی" (خدا کا سایہ) کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ خطاب صرف عادل و منصف بادشاہ کے لیے مخصوص ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر ظالم بادشاہ بھی اپنے لیے یہ خطاب بلا تکلف استعمال کرتے تھے۔

۴۔ اجرِ آخرت

عدل و انصاف ایک عظیم اخلاقی فضیلت ہے، جس کا آخرت میں اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور عادل و منصف شخص کو اللہ رب العزت کے ہاں خاص مقام حاصل ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جو لوگ اپنے گھر والوں میں جن کی حکومت ان کے ذمہ کی گئی ہے، انصاف کرتے ہیں وہ اللہ کے پاس نور کے میناروں پر ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "قیامت کے روز امام عادل پر اللہ کا سایہ ہوگا۔" (بخاری)
نیز: "حاکم عادل کی دعا قبول ہوتی ہے اور وہ جنتی ہے۔" (ترمذی)

۵۔ حبِ الٰہی

عدل و انصاف کرنے والوں کو حبِ الٰہی کا عظیم اعزاز و شرف حاصل ہوتا ہے اور ظاہر ہے، جس کے حصہ میں اللہ کی محبت آجائے اسے پھر کسی چیز کی کمی رہتی ہے؟ یہی حبِ الٰہی دنیا و آخرت کی ہر بھلائی اور فلاح و کامرانی کی ضامن ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ (الحجرات: ۹)

ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

۶۔ تقویٰ سے قریب تر

تقویٰ یعنی خوفِ خدا یا خدا ترسی تمام نیکیوں کی بنیاد ہے اور عدل تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اس طرح یہ نیکیوں کی طرف لے جانے والا وصف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۝ (المائدہ: ۸)

ترجمہ: عدل کرو۔ یہ تقویٰ کے قریب تر ہے۔

۷۔ دنیا کی کامیابی

عدل یعنی اعتدال اختیار کرنے سے انسان افراط و تفریط سے بچ جاتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اعتدال و میانہ روی کی راہ ہی زندگی میں کامیابی و کامرانی کی ضامن ہے۔ ارشاد نبوی ؐ ہے:

خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا۔

یعنی: "اعتدال (میانہ روی) بہترین حکمتِ عملی ہے۔"

احسان

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ (الرحمٰن: ۶۰)

ترجمہ: احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

احسان کا مفہوم و اہمیّت

سوال: احسان کا مفہوم کیا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

احسان کا مفہوم

احسان کا مادہ حسن ہے۔ اس کا لغوی مفہوم ہے خوبصورت کرنا اور حسین بنانا نیز نیکی اور بھلائی کرنا اور کسی کام کو ذوق و شوق سے انجام دینا کہ اس میں حسن پیدا ہو جائے۔ بقول سید سلیمان ندوی ؒ:

"عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہیں۔"

کسی چیز میں حُسن تین وجوہ سے پیدا ہوتا ہے:

i۔ وہ چیز جو عقل کے لحاظ سے مستحسن ہو۔

ii۔ جو چیز خواہش کی رو سے پسندیدہ ہو۔

iii۔ جو چیز نگاہ میں بھلی معلوم ہو۔ (مفردات القرآن)

بقول سید سلیمان ندوی ؒ: "احسان یا بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے۔ اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔"

اخلاقِ اسلامی میں احسان کا درجہ

اسلامی اخلاق میں احسان کا مقام بہت بلند مقام ہے اور عفو و درگزر، رواداری نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ اور باہمی رعایت وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔

دراصل احسان، عدل و انصاف سے زائد اور بلند تر چیز ہے۔ دوسروں کو ان کے حق سے کچھ

زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم قبول کر لینا احسان ہے۔ اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں احسان کی اہمیت عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل و انصاف اگر تمدنی و اخلاقی زندگی کی بنیاد ہے تو احسان اس کا حسن و جمال اور کمال ہے۔ عدل معاشرے میں ناگواریوں کو پھیلنے سے روکتا ہے تو احسان اس میں خوشگواری اور شیرینی بھر دیتا ہے۔ الغرض باہمی معاملات میں عدل کا درجہ احسان سے کم ہے۔ اگر معاشرے میں صرف عدل ہی عدل ہو تو باہمی محبت شکر گزاری ہمدردی اور خیر خواہی کے وہ جذبات پیدا نہیں ہو سکتے جو احسان پیدا کرتا ہے اس لیے معاشرے میں لطف و شیرینی اور اخلاق میں مٹھاس پیدا کرنے کے لیے احسان کی شدید ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں عدل کے ساتھ احسان کا حکم بھی دیا گیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (نحل: ۹۰)

ترجمہ: تحقیق اللہ تم کو عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

حدیث جبرائیلؑ کی رو سے احسان

احسان کے معنی کو جب وسیع کر دیا جائے تو حقوق اللہ بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے، خدا کے حق کو حسین انداز میں پورا کرنا چنانچہ حدیث جبرائیلؑ میں بھی احسان کی یہی تعریف بیان کی گئی ہے:

اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (بخاری و مسلم)

ترجمہ: احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کی جائے گویا تو اسے خود دیکھ رہا ہے، پس اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تجھے دیکھتا ہی ہے۔

احسان کی اہمیت قرآن کی روشنی میں

۱۔ احسان اللہ تعالیٰ کی صفت ہے

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا؟ جس کے احسانات کی حد و بے پایاں ہیں۔ عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ؑ (ابراہیم: ۳۴)

ترجمہ: اور اگر تم اللہ کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔ کچھ شک نہیں کہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔ احسان کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی احسان کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص: ۷۷)

ترجمہ: اور جیسی اللہ نے تم سے بھلائی کی ہے، (ویسی) تم بھی (لوگوں) سے بھلائی کرو۔

۲۔ احسان کرنے والے اللہ کے محبوب بندے ہیں

قصورواروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اپنے اندر یہ صفت پیدا کر لے وہ اللہ کے محبوب بندوں میں سے ہو گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ (آل عمران: ۱۳۴)

ترجمہ: اور وہ غصے کو ضبط کرتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

۳۔ احسان کا بدلہ احسان

نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دار و مدار ہے جو نیک کام کریں گے، ان کو خدا کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ (الرحمٰن: ۶۰)

ترجمہ: احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۴۔ نیکی کر دریا میں ڈال

احسان کر کے بعد میں اسے جتایا جائے تو اس کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔ وہ احسان نہیں رہتا بلکہ خرید و فروخت کا سودا بن جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال، یعنی نیکی کر کے بھول جاؤ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرۃ:)

ترجمہ: اے ایمان والو! احسان جتا کر اور ایذا دے کر اپنے صدقوں کو ضائع مت کرو۔

~ جو احسان کرکے جتلانے لگے ۞ وہ نیکی کو اپنے گنوانے لگے (حالی)

۵۔ **بھلائی کی بات کہنا احسان ہے** دوسروں کے لیے بھلائی کی بات کہنا اور ان سے خوش اسلوبی اور خوش اخلاقی سے بات کرنا احسان ہے۔ قرآن مجید میں اسی کی تلقین کی گئی ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرۃ: ۸۳)

ترجمہ: اور لوگوں کے لیے بھلائی کی بات کہو

احسان کی اہمیت حدیث کی روشنی میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف خود احسان پر عمل فرماتے تھے بلکہ صحابہ کرامؓ کو بھی ہمیشہ احسان کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ ذیل میں کچھ ارشادات نبویؐ درج کئے جاتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ (صحیح مسلم)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان فرض کیا۔

۲۔ ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور مخلوق میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے۔

۳۔ یہ نہ کہو کہ لوگ ہمارے ساتھ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور وہ زیادتی کریں گے تو ہم بھی زیادتی کریں گے۔ بلکہ اس بات پر پختہ ہو جاؤ کہ احسان کرنے والوں کے ساتھ احسان کرو گے اور برائی کرنے والوں کا جواب بھی احسان سے ہی دو گے۔ (ترمذی)

۴۔ تم اہل زمین پر رحم کرو، اللہ تم پر رحم کرے گا۔

~ کرو مہربانی تم اہل زمیں پر ۞ خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر (حالی)

۵۔ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا اسے قیامت کی تکلیف سے نجات دے، وہ تنگدست کو مہلت دے اور مقروض کو معاف کر دے۔ ایسا شخص قیامت کے روز خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔

۶۔ حضورؐ نے حضرت ابو ذرؓ سے فرمایا: جو روزی خدا نے دی ہے اس میں سے دوسروں کو دو۔ اپنی زبان سے نیک کام کرو، مغلوب کی مدد کرو۔ جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو، اس کا کام

کردو۔ اپنی ایذارسانی سے لوگوں کو بچائے رکھو۔ (کتاب المکاتب)

۷۔ حضرت براء بن عازبؓ کی روایت کے مطابق، حضورؐ نے ایک بدوی سے فرمایا: تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ۔ (یعنی کسی کو آزاد کرنا اور آزادی کی قیمت میں مالی امداد دینا)۔ ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو، بھوکے کو کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو اور اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔ (مستدرک حاکم)

اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ احسان کا کامل اور بہترین نمونہ تھی۔ آپ نے نہ صرف اپنوں سے بلکہ دشمنوں سے بھی ہمیشہ احسان کا سلوک فرمایا۔ ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ مکہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا تو باوجود یکہ کفارِ مکہ نے آپ پر بے پناہ مظالم ڈھائے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے احسان کا رویہ اختیار فرمایا۔ ان کے لیے کھجور بھیجی اور مالی امداد فرمائی۔ نیز یہ قحط آپ ہی کی دعا سے ختم ہوا۔

۲۔ غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ کے قیدی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ آئے۔ ان سے بڑھ کر آپ کا کوئی دشمن نہ تھا اور باوجود یکہ صحابہ کرامؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا، آپؐ نے نہ صرف انہیں رہا کر دیا، بلکہ جتنی دیر یہ لوگ حضورؐ کی قید میں رہے، آپؐ نے ان سے مہمانوں کی طرح سلوک کیا اور ان کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھا۔

۳۔ فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے احسان و مروت کا بہترین مظاہرہ فرمایا۔ کفار مکہ اسلام اور حضورؐ کے بدترین دشمن تھے اور انہوں نے ظلم و ستم کی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اگر حضورؐ چاہتے تو ان سے انتقام اور بدلہ لے سکتے تھے، لیکن حضورؐ نے کمال رحمت و شفقت سے انہیں معاف کر دیا اور اس احسان و مروت کے نتیجہ میں وہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

۴۔ ابوسفیانؓ جو قبولِ اسلام سے پہلے اسلام کے بدترین دشمن تھے، فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے نہ صرف انہیں معاف کر دیا بلکہ یہ بھی اعلان کیا کہ جو شخص ابوسفیانؓ کے گھر میں پناہ لے گا وہ بھی امن میں ہو گا۔ اس کے علاوہ ابوسفیانؓ اور ان کے بیٹوں کو ہوازن کے مالِ غنیمت میں سے زیادہ حصہ دیا۔

۵۔ غزوۂ حنین میں چھ ہزار مرد و عورت قیدی ہاتھ لگے۔ حضور اکرمؐ نے نہ صرف انہیں

رہا کر دیا۔ کہ بعض کے ساتھ اس قدر احسان کا سلوک فرمایا کہ ان کا فدیہ اپنے پاس سے ادا کیا اور اکثر کو مزید انعام و اکرام بھی دیا۔ مثلاً مالک بن عوف جو دشمن فوج کا سپہ سالار تھا، اس کے اہل و عیال اور اونٹ واپس کر دینے کے علاوہ اسے ایک سو اونٹنیاں اپنے پاس سے عطا فرمائیں۔

۶۔ ایک دفعہ ایک بدو حضور اکرمؐ کے پاس آیا اور اس نے آپ کی چادر کو اتنے زور سے کھینچا کہ آپؐ کی گردن پر نشان پڑ گیا۔ پھر بولا "اے محمدؐ! خدا کا یہ مال جو آپ کے پاس ہے، اس میں سے ایک بار شتر مجھے بھی دیجئے۔" آپؐ نے کچھ دیر تامل کیا پھر فرمایا "مال بے شک اللہ کا ہے۔" پھر فرمایا کہ اسے ایک اونٹ پر کھجوریں اور ایک پر جو دیئے جائیں۔

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو احسان کرنا اس قدر محبوب تھا کہ آپ ہمیشہ بارگاہِ خداوندی میں دعا فرمایا کرتے تھے:

"اللہ مجھے ان میں شریک رکھ، جنہیں احسان کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے۔"

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا — مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

(مولانا حالی)

احسان کی اقسام و فوائد

سوال: احسان کی مختلف صورتیں یا قسمیں بیان کیجئے۔ نیز اس کے فوائد و ثمرات واضح کیجئے۔

جواب: ۱۔ **احسان کی اقسام**

احسان کی دو بڑی قسمیں ہیں:

۱۔ حقوق اللہ میں احسان ۲۔ حقوق العباد میں احسان

۱۔ حقوق اللہ میں احسان

اللہ تعالیٰ کے ہم پر بے حد حساب احسانات ہیں۔ اس نے ہمیں یہ زندگی دی اشرف المخلوق

بنایا اور اپنے آخری محبوب رسولؐ کی اُمّت میں پیدا کیا۔ ہمیں زندگی کی تمام ضروریات فراہم کیں۔ ہمیں ہدایت کا راستہ بتایا۔ ان احسانات کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو عبادات ہم پر لازم آتی ہیں، انہیں حقوق اللہ کہا جاتا ہے۔ عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح خالق کائنات نے ہم پر انعامات و احسانات کئے ہیں، ہم عبادات کے ذریعہ اس کا شکر بجا لائیں۔ نماز شکر ادا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر ہم انتہائی خلوص، اور ذوق و شوق کے ساتھ اسی کی عبادت کریں تو یہ احسان کا درجہ رکھے گی۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"احسان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے دیکھتا ہی ہے۔" (اربعین نووی)

؎ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ✧ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا (غالب)

ب) حقوق العباد میں احسان

بندوں پر آپس میں ایک دوسرے کے لیے کچھ حقوق لازم آتے ہیں جنہیں حقوق العباد کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو وہ اپنے حقوق معاف کر سکتا ہے، لیکن بندوں کے حقوق ایسے ہیں، جنہیں خدا بھی اس وقت تک معاف نہیں کرے گا، جب تک بندے خود اپنے حقوق معاف نہ کر دیں۔ اگرچہ دوسروں کی نیکیوں کا برابر بدلہ دینے سے حقوق العباد ادا ہو جاتے ہیں، لیکن حقوق العباد میں احسان کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی اور بھلائی سے پیش آیا جائے اور ہر شخص کی بھلائی کا اس سے بڑھ کر بدلہ دیا جائے۔

حقوق العباد میں احسان کی حسب ذیل مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ اہل خانہ سے حُسنِ سلوک

احسان کی اولین صورت یہ ہے کہ گھر والوں کے ساتھ احسان کیا جائے تاکہ گھریلو زندگی خوشگوار رہے اور گھر جنت کا نمونہ بن جائے۔ گھر میں سب سے اہم مقام والدین کو حاصل ہے چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر والدین کے ساتھ احسان کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ج (الانعام: ۱۵۱)

ترجمہ: اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔

خانگی زندگی میں میاں بیوی کے تعلقات بہت اہمیت رکھتے ہیں یہ معاشرے کی ایک اکائی ہے۔ اگر یہ اکائیاں درست اور مستحکم ہوں گی تو معاشرہ بھی درست اور مستحکم ہوگا ورنہ معاشرہ فساد اور بگاڑ کا شکار ہو جائے گا۔ یہاں ایک طرف عورت کے بارے میں ارشادِ نبویؐ ہے کہ "اگر خدا کے کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے" وہاں مرد کے لیے یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ عورت کے ساتھ احسان کرے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (النساء: ۱۹)

ترجمہ: اور عورتوں کے ساتھ بھلائی سے زندگی گزارو۔

عورتوں کو قانونی حیلے بہانے نکال کر تنگ کرنا بُرا کام تھا، جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ کسی عورت کو اپنے نکاح میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو۔

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ط
(البقرة: ۲۲۹)

ترجمہ: (یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حُسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا

۲۔ حاجت مندوں کی مالی امداد

احسان کی ایک نہایت پسندیدہ اور مستحسن صورت یہ ہے کہ حاجت مندوں کی مالی امداد کی جائے۔ اسلام اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ معاشرے میں جو افراد ضرورت مند اور محتاج ہوں، ان کو قرضِ حسنہ دیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور وہ اسے کئی گناہ بڑھا دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا
فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ (حدید: ۱۱)

ترجمہ: کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تو وہ اُس کو اُس سے دگنا ادا کرے اور اس کے لیے عزت کا صلہ (یعنی جنت) ہے

۳۔ مقروض کے ساتھ احسان

مقروض کے ساتھ بھی اسلام نے احسان کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اگر مقروض تنگدست

ہو تو عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے قرضے کی واپسی کا انتظار کیا جائے اور اسے مہلت دی جائے اور اگر وہ بہت ہی تنگ دست ہو تو قرض معاف کر دینا نیکی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے

وَإِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ ط وَأَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرة : ۲۸۰)

ترجمہ: اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو اسے آسودگی حاصل تک مہلت دو اور اگر (زرِ قرض) بخش ہی دو تو تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ تم سمجھو۔

۴۔ فی سبیل اللہ مالی امداد

اسلام نہ صرف حاجت مندوں کو قرض حسنہ دینے کی تلقین کرتا ہے، بلکہ اس بات کی تلقین بھی کرتا ہے کہ رشتہ داروں، مسافروں اور معاشرے کے دیگر ضرورت مند افراد کی فی سبیل اللہ مالی امداد کی جائے اور غربت کو دور کیا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى. (النحل : ۹۰)

ترجمہ: بے شک اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔

محتاج مسافروں کو بھی مدد کرنی چاہیئے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ حاضر ہوئے جو بہت خستہ حال تھے۔ حضورؐ انہیں اس حالت میں دیکھ کر بہت فکرمند ہوئے۔ آپؐ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ اذان دو۔ اذان کا سن کر جب لوگ جمع ہوئے تو آپؐ نے ان مسافروں کی امداد کرنے کے لیے کہا۔

۵۔ مصیبت سے نجات دلانا

احسان کی اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی۔ اس کو آپ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان سمجھتے تھے۔

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ (یوسف: ۱۰۰)

ترجمہ: اور اس نے مجھ پر (بہت سے) احسان کئے ہیں کہ مجھ کو جیل خانہ سے نکالا۔

۶۔ قصور وار سے درگزر کرنا

احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کی غلطی یا قصور سے درگزر کرتے ہوئے اس سے حسن سلوک سے پیش آیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں محسنین کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہوتے ہیں:

وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ
وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۚ (آل عمران: ۱۳۴)

ترجمہ: اور وہ غصے کو ضبط کرتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

۷۔ دشمنوں اور غیر مسلموں سے حسن سلوک

احسان کا دائرہ صرف اپنوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دشمنوں اور غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا بھی احسان میں شمار ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ
هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ
كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ (حٰمٓ السجدة: ۳۴)

ترجمہ: اور بھلائی برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تو (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی، گویا وہ تمہارے گرم جوش دوست ہے۔

اسی طرح اگر کسی کے ساتھ بحث و مناظرہ پیش آجائے اور حریف پستی کردار کا مظاہرہ کرے تو اس کا جواب حسن کلام سے دیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ (النحل: ۱۲۵)

ترجمہ: اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔

۸۔ موت میں بھی احسان و بھلائی

اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص دائرے میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے۔ زندگی تو زندگی، موت بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کو نافرض کیا ہے۔ تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو۔ کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو۔ چھری کو خوب تیز کر لیا کرو اور ذبیحہ کو راحت دو۔ (صحیح مسلم)

"جانور کو ذبح کرتے وقت اسے کم سے کم دکھ دیا جائے۔ پیاسا ہو تو پانی پلایا جائے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چھری کو تیز نہ کیا جائے۔ جانور کو گھسیٹا نہ جائے۔ ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ قریش کے فلاں دو کافر ملیں تو انہیں جلا دینا، پھر فرمایا: نہیں بلکہ صرف قتل کر دینا، کیونکہ آگ کا عذاب فقط اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

اسلام نے قتل و سزا کے قدیم جاہلانہ بے رحمانہ طریقوں کو ممنوع قرار دے دیا۔

(ب) احسان کے فوائد و ثمرات

احسان کے نتیجہ میں بہت سے فوائد و ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ ذیل میں کچھ فوائد بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ حسنِ معاشرت

احسان میں حسنِ معاشرت کا ظہور عمل میں آتا ہے جو ایک پرسکون زندگی اور خوشحال معاشرے کی روح ہے۔ احسان سے افرادِ معاشرہ میں باہمی خلوص و محبت اور اخوت و بھائی چارہ کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ آپس کے کینے اور تنازعے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ دل ایک دوسرے کے لیے مسخر ہو جاتے ہیں اور معاشرہ ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، کیونکہ احسان کرنے سے احسان کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ غلام اور شیر والی کہانی میں اسی جذبۂ احسان کا اظہار ملتا

ہے کہ غلام نے ایک زخمی شیر کے پنجے سے کانٹا نکالا تھا اور جب اسی بھوکے شیر کے آگے اس غلام کو پھینکا گیا تو شیر اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔ جب ایک درندہ احسان کا بدلہ احسان سے دیتا ہے تو انسان کا مقام تو اس سے بہت بلند ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے اس لیے اسے زیادہ احسان شناسی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ (الرحمٰن: ۶۰)

ترجمہ: احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت اور محبّت

اللہ تعالیٰ خود محسنِ حقیقی ہے اس کے اسمائے حسنیٰ میں ایک نام محسن بھی ہے۔ اس لیے وہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ ان پر اپنی رحمتِ خاص کرتا ہے۔ انہیں مزید نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے اور انہیں اپنی رضا و خوشنودی سے ہمکنار کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۹۵)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۵۸)

ترجمہ: اور احسان کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے۔

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۵۶)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت احسان کرنے والوں سے قریب ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

ترجمہ: ــــــــــــــــ (التوبۃ: ۱۰۰)

اور جنہوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔

۳۔ بے پناہ اجرِ آخرت

احسان کرنے والوں کو آخرت میں بہت بڑا اجر و ثواب ملے گا، جو حقیقی فلاح و کامرانی ہے:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ

ــــــــــــــــ (آل عمران: ۱۷۲)

ترجمہ: جن لوگوں نے احسان کیا اور تقویٰ اختیار کیا، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

۴۔ خوشگواری اور شیرینی کا ذریعہ اگر معاشرے میں صرف عدل ہی عدل ہو تو باہمی محبت، شکر گزاری، ہمدردی و خیر خواہی کے وہ جذبات پیدا نہیں ہو سکتے جو احسان پیدا کرتا ہے۔ اس سے معاشرے میں خوشگواری، شیرینی، لطف اور مٹھاس جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں، جس کے نتیجہ میں معاشرہ جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

۵۔ خانگی زندگی میں سکون و راحت احسان کے نتیجہ میں خانگی اور گھریلو زندگی میں پرسکون اور خوشگوار فضا پیدا ہوتی ہے جو کامیاب زندگی کی اصل بنیاد ہے۔ "میرا گھر میری جنت" اسی جذبۂ احسان کا مظہر ہے۔

۶۔ تبلیغ میں آسانی احسان یعنی دوسروں سے حسن سلوک، پیہم خیر خواہی، بھلائی اور خیر اندیشی کے جذبات کے بغیر تبلیغ ممکن نہیں، جو ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ اگر انسان اپنے اندر یہ صفت پیدا کر لے تو اشاعت و تبلیغ اسلام کے کام میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی ہدایت و تبلیغ کے لیے بھیجا تو تلقین فرمائی کہ اس سے نرم لہجے میں بات کرنا۔

خدمت خلق

وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (الحج: ۷۷)

ترجمہ: اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم کامیاب رہو۔

مفہوم و اہمیت

سوال: خدمت خلق کا مفہوم کیا ہے؟ اور اس کی مختلف صورتیں کیا ہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی اہمیت و فضیلت بیان کیجیے۔

جواب: **۱۔ خدمت خلق کا مفہوم** خلق کے معنی ہیں مخلوق۔ خدمت خلق کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے کام آنا۔ یعنی اہل حق کے حقوق

کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سرانجام دینے کا نام خدمت خلق ہے۔ اسلام میں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے بلا کسی اجرت، صلہ یا معاوضہ کے مخلوق خدا کے کام آنا اور خدمت، مدد اور اعانت پر کمربستہ رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں صرف بنی نوع انسان ہی شامل نہیں بلکہ اس میں تو حیوانات اور پرند و چرند تک شامل ہیں۔ پس ان سب کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشار کے مطابق ہو اور جس میں ان کی ہمدردی و خیر خواہی کا پہلو پایا جاتا ہو، خدمتِ خلق ہے۔

خدمت خلق، اخلاق کی وہ قسم ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے فیض رسانی سے متعلق ہے حقیقت میں یہ احسان ہی کی ایک صورت ہے۔ اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ خدمت محض خدمت کے جذبہ سے ہو۔ خدا کی خوشنودی مطلوب ہو۔ کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ ہو۔ شہرت، دکھلاوا نام و نمود، داد و تحسین یا کوئی اور ادنیٰ مقصد مدِنظر نہ ہو۔

خدمت خلق اگرچہ بلا معاوضہ خدمت کا نام ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے فرائض اس طور پر ادا کرے جس سے عام انسانوں کو فائدہ پہنچے اور ملک و قوم کی بہتری ہو تو یہ بھی خدمتِ خلق میں شامل ہے۔ مثلاً ایک ملازم اپنے فرائض کو دیانت و محنت سے ادا کرے اور اپنے برتاؤ سے عوام کو فائدہ پہنچائے اور ایک تاجر اپنی تجارت میں ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، ملاوٹ وغیرہ سے پرہیز کرے اور امانت و دیانت کے اصول پر کاروبار کرے تو یہ بھی خدمت خلق ہے۔

(ب) خدمتِ خلق کی صورتیں

خدمت خلق کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں سے چند ایک کی وضاحت کی جاتی ہے۔

۱۔ حقوق العباد کی ادائیگی

اسلام میں دو طرح کے حقوق ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ بندوں کے حقوق کی ادائیگی خدمتِ خلق ہے۔ اگرچہ حقوق العباد کی ادائیگی ہر انسان پر لازم ہے، لیکن اگر اس فرض کو بطریق احسن ادا کیا جائے تو یہ بہت بڑی سماجی خدمت ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں خدمتِ خلق اور حقوق العباد لازم و ملزوم ہیں۔ حقوق العباد میں سرِفہرست والدین کے حقوق ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں توحید باری تعالیٰ کے بعد والدین کی اطاعت و خدمت کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ط (بنی اسرائیل: ۲۳)

ترجمہ: اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔

اسی طرح ماں باپ پر لازم ہے کہ اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت کریں۔ انہیں عمدہ اخلاق سے آراستہ کریں۔ یہ سب کچھ خدمتِ خلق میں شامل ہے۔ اس کے بعد قریبی رشتہ دار خدمت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا ہے کہ "وہ اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں میں خرچ کرتے رہو" رشتہ داروں سے اچھا برتاؤ کرنے کا نام صلۂ رحمی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلۂ رحمی کی بہت تاکید فرمائی ہے۔

ہمسایہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، ضرورت کے وقت اس کی مدد کرنا بھی خدمتِ خلق میں شامل ہے، چنانچہ قرآن و حدیث میں ہمسایوں کے حقوق پر بہت زور دیا گیا ہے۔ الغرض حقوق العباد کا دائرہ جس قدر وسیع ہے، اسی قدر خدمتِ خلق کا دائرہ بھی وسیع ہے۔

۲۔ محتاجوں اور حاجت مندوں کی امداد

خدمتِ خلق کی دوسری صورت معاشرے کے محتاج اور حاجت مند لوگوں کی امداد کرنا ہے۔ معاشرہ کے محروم طبقے مثلاً یتیم، بیوہ، محتاج، مسکین، مسافر، بیمار، قیدی سائل حتیٰ کہ مہمان وغیرہ سبھی خدمت کے مستحق ہیں اور اسلام نے ان سب کی امداد، اعانت اور سرپرستی کی تلقین کی ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑا پہنانا، ضرورت مند کی مالی امداد کرنا، دکھی کے دکھ میں شریک ہونا، بیمار کی دیکھ بھال اور علاج معالجہ کرنا، غریب طالب علم کی مالی امداد کرنا اور مصیبت سے نجات دلانا خدمتِ خلق میں شامل ہے اور یہی عبادت کی روح ہے۔ ؎

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں   کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں (حالی)

۳۔ رفاہِ عامہ کے کام

خدمتِ خلق کی ایک اہم صورت رفاہِ عامہ کے کام ہیں اسلام نے رفاہِ عامہ کے کام کو صدقہ جاریہ کہا ہے یعنی یہ وہ نیکیاں ہیں جن کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ ایسے کام ہیں جن کا فائدہ اور نفع مدتوں اٹھایا جاتا ہے۔ ان کا اجر و ثواب ان کے قائم کرنے والوں کو ہمیشہ ملتا رہتا ہے رفاہِ عامہ کے بڑے بڑے کام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ شفاخانے یا ہسپتال قائم کرنا۔   ۲۔ مساجد کی تعمیر   ۳۔ مکتب اور مدرسے قائم کرنا۔
۴۔ کتب خانے قائم کرنا   ۵۔ یتیم خانے اور محتاج خانے قائم کرنا   ۶۔ پل بنانا۔

۷۔ سڑکوں کی تعمیر ۸۔ سرائیں تعمیر کرنا۔ وغیرہ۔

استاد ابراہیم ذوق نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

۴۔ معاشرے سے برائیوں کا سدِّ باب

اسلام اپنے پیروکاروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ لوگوں کو برائی کے راستے سے روکیں اور اچھائی کی تلقین کریں۔ چنانچہ دین کے لیے خدمت خلق ضروری ہے۔ خدمت خلق انسان کے دل پر نوری اثر کرتی ہے۔ اگر آپ کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ بوقت ضرورت ان کی مدد کرتے ہیں تو آپ جو بات بھی ان سے کہیں گے وہ فوراً اور بآسانی مان جائیں گے۔ درحقیقت بنی نوع انسان کی اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہو سکتی ہے کہ ان کو تباہی و بربادی اور ہلاکت سے بچایا جائے اور فلاح و کامرانی کے راستے پر لگایا جائے۔ چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا حقیقت میں خدمتِ خلق ہی ہے معاشرے سے فحاشی و بے حیائی، بے راہروی، ظلم و زیادتی اور منشیات وغیرہ کا خاتمہ کرنا بہترین خدمتِ خلق ہے۔

۵۔ حیوانات پر رحم و شفقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت للعالمین بن کر تشریف لائے تھے۔ حضورؐ کی یہ رحمت و شفقت صرف انسانوں تک محدود نہ تھی بلکہ آپ حیوانات کے بھی سچے ہمدرد اور محسن تھے۔ آپ نے لوگوں کے دلوں میں یہ شعور و احساس بیدار کیا کہ حیوانات بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ دورِ جدید میں "انسداد بے رحمی حیوانات" کے ادارے اب قائم کئے گئے ہیں لیکن رسولِ رحمتؐ نے چودہ سو برس قبل دنیا کو یہ تعلیم دی تھی۔

ج) اہمیّت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں امت مسلمہ کو خیرالامم (یعنی بہترین امت) قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس امت کے لوگ بھلائی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں یہی خدمتِ خلق ہے۔ انسان فطرۃً مدنی الطبع ہے یعنی وہ ایک معاشرتی حیوان ہے۔ وہ اپنی نوع کے دوسرے افراد کے ساتھ مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ تنہائی کی زندگی گزارنا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ باہم مل جل کر رہنے کی صورت میں ایک دوسرے کی ضروریات کے پیش نظر باہمی اشتراک و تعاون اور معاونت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح ہر انسان پر

دوسرے کے لیے کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور ہر ایک کو دوسرے کی طرف سے کچھ حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ان حقوق و فرائض کی ادائیگی خدمتِ خلق کی صورت اختیار کر لیتی ہے یوں خدمت خلق کا جذبہ بہترین نیکی ہونے کے علاوہ معاشرے کی اہم ترین ضرورت بھی ہے۔ ہر شخص نفسا نفسی کے عالم میں ہو تو معاشرہ کے محروم، کمزور، حاجت مند اور غریب لوگ سسکتے رہیں گے اور پوری قوم اور انسانیت تباہی و بربادی کی طرف گامزن ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا مقصد خدمت خلق ہے تاکہ صاحبِ حیثیت لوگ محروم اور حاجت طبقے کی سرپرستی کر سکیں اور یوں ایک مثالی معاشرہ وجود میں آ سکے۔ ایک مشہور عالم دین نے قرآنی تعلیمات کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اللہ کو عبادت سے، رسول کو اطاعت سے اور مخلوق کو خدمت سے راضی کرو۔"

خدمت خلق قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے خدمت خلق کی تلقین کی گئی ہے۔ ذیل میں کچھ آیاتِ قرآنی پیش کی جاتی ہیں۔

۱ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الحج: ۷۷)

ترجمہ: اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم کامیاب رہو۔

۲ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلَىٰٓ اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۛ (الحشر: ۹)

ترجمہ: اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود ضرورت ہو۔

۳۔ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (الدھر: ۸)

ترجمہ: اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

۴۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (الذّٰریٰت: ۱۹)

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں سائلوں اور ناداروں کا بھی حق ہے۔

۵۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۚ (الحدید: ۱۱)

ترجمہ: کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو (نیت) نیک (اور خلوص سے) قرض دے تو وہ اس کو اس سے دگنا ادا کرے اور اس کے لیے عزت کا صلہ (یعنی جنت) ہے۔

۶۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ (البقرۃ: ۲۶۱)

ترجمہ: جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں اور اللہ جس (کے مال) کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔

۷۔ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ؕ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ؕ

(الضحیٰ، ۹، ۱۰)

ترجمہ: تو تم بھی یتیم پر سختی نہ کرنا اور سائل کو مت جھڑکنا۔

خدمت خلق حدیث کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں بھی خدمت خلق کی بڑی تاکید کی گئی ہے، ذیل میں کچھ احادیث پیش کی جاتی ہیں:-

۱۔ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

کرد مہربانی تم اہل زمیں پر   خدا مہرباں ہوگا عرش بریں (حالی)

۲۔ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ   یعنی   مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

پس بہتر شخص مخلوق میں وہ ہے جو خود خدا کے کنبے کے ساتھ احسان کی روش اختیار کرے۔ (مسلم)

۳۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی مشکل کے وقت بے یار و مددگار چھوڑتا ہے نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (مسلم)

۴۔ جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرے گا۔ اور جو کوئی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا۔ (ابو داؤد)

۵۔ جو شخص کسی مسلمان کی دنیاوی تکالیف میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا اور جو کوئی کسی تنگدست پر آسانی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک کہ وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ (ابوداؤد)

۶۔ مجھے رمضان بھر کے روزے رکھنے اور اس مہینے میں مسجد حرام میں اعتکاف پر بیٹھنے سے یہ زیادہ عزیز ہے کہ میں اپنے بھائی کی بوقت ضرورت مدد کروں۔

۷۔ بھولے بھٹکے یا اندھے کو راستہ بتانا بھی کار ثواب ہے۔ (مسلم)

۸۔ راستے سے کانٹے یا دوسری ایذاء رساں چیز کو ہٹا دینا کارِ خیر ہے۔ (مسلم)

۹۔ سب مومن فرد واحد کی طرح ہیں، اگر اس کی آنکھ بیمار ہو تو سارا جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا سر بیمار ہو تو سارا جسم بیمار ہو جاتا ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

۱۰۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صرف تمہارے ضعیف لوگوں کی مدد کے عوض رزق دیتا ہے اور مدد کرتا ہے۔

۱۱۔ اگر کسی شخص کے پاس چٹیل میدان میں فالتو پانی ہو اور مسافر کو نہ دے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس سے کلام نہ کرے گا، نہ اس پر رحمت کی نظر ڈالے گا اور نہ اسے گناہوں سے پاک کرے گا۔

۱۲۔ دو آدمیوں میں صلح کرانا صدقہ ہے، کسی کو سواری پر چڑھانا یا اس کا سامان اٹھوا دینا صدقہ ہے۔ اچھی بات بھی صدقہ ہے۔ نماز کے لیے چل کر جانے میں ہر قدم پر صدقہ ہے اور راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ (بخاری و مسلم)

۱۳۔ خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ

یعنی لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔

۱۴۔ جتنی دیر کوئی شخص بیمار کی عیادت کرتا ہے، گویا وہ جنت میں ہے۔

۱۵۔ بھوکے کو کھانا کھلانا صدقہ ہے۔

۱۶۔ ایک عورت کو اس وجہ سے دوزخ میں ڈالا گیا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر بھوکا مار دیا تھا، نہ اسے خود کچھ کھلایا اور نہ اسے آزاد کیا کہ خود کہیں جا کر کھا پی لے۔

۱۷۔ سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ (بخاری) یعنی "قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے"

خدمت خلق کا عملی نمونہ

سوال: آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین خدمت خلق کا مجسمہ تھے" کی تشریح کیجیے نیز خدمت خلق کے فوائد بیان کیجیے۔

جواب:

خدمت خلق اور اسوۂ رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ خدمت، شفقت، ہمدردی، لطف وکرم اور رحمت کا بہترین عملی نمونہ تھی۔ بنی نوع انسان کی ہمدردی وخیرخواہی آپؐ کی فطرت تھی۔ اپنے اور بیگانے کی خدمت آپؐ کا شعار تھا۔ آپؐ اپنے گھر کا کام کاج خود کرتے تھے۔ پھٹا ہوا کپڑا سی لیتے، جوتا مرمت کر لیتے۔ گھر کی صفائی کر دیتے اور اونٹ بکری پالتو جانوروں کو خود کھول کر باندھ لیتے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے، اپنے کام تو در کنار، آپ نے کبھی دوسروں کے کام کرنے کو بھی عار نہ سمجھا، بلکہ خوشی محسوس کی، آپ ہمیشہ دوسروں کی تکالیف دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کرتے، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے، بھوکوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے، یتیموں کی سرپرستی فرماتے، غلاموں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرتے اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت ونگہداشت کرتے، ناداروں کی حاجت روائی کرتے، خود قرض لے کے مصیبت زدوں کی مدد فرماتے۔ آفت زدوں کو تسلی دینے اور ان کا غم بٹانے کے لیے تشریف لے جاتے۔ مہمانوں کی خدمت وتواضع فرماتے، بوڑھوں پر شفقت فرماتے، بچوں سے محبت سے پیش آتے، بیواؤں کے دکھڑے سنتے اور یتیموں کے سر پہ دست شفقت پھیرتے، بارہا ایسا ہوا کہ کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر آنکھوں سے آنسو بہہ گئے اور لوگوں کو اس کی خدمت پر ابھارا۔ آپؐ اپنے صحابہ کے ساتھ مل جل کر کام کرنا پسند فرماتے تھے۔ الغرض آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو خدمتِ خلق کا بہترین مظہر ہے۔ چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ ایک دفعہ ایک مہمان آیا۔ رات کو گھر میں صرف بکری کا دودھ تھا۔ آپؐ نے وہ مہمان کو دے دیا۔ آپؐ نے اور آپؐ کے اہل خانہ نے رات فاقہ سے بسر کی۔ اس سے پہلی شب بھی فاقے سے ہی گزری تھی۔

۲۔ مشہور صحابی حضرت خبابؓ کے گھر میں دودھ دوہنے والا کوئی مرد نہ تھا اور عورتیں بھی دودھ دوہنا نہ جانتی تھیں۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزانہ ان کے گھر دودھ

دوہنے جایا کرتے تھے۔
۳۔ ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن عبادہ بیمار ہوئے۔ آپؐ عیادت کو تشریف لے گئے۔ ان کو دیکھ کر آپؐ پر رقت طاری ہوتی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ آپؐ کو روتا دیکھ کر سب رو پڑے۔
۴۔ مدینہ منورہ کی لونڈیاں آپؐ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں: یارسول اللہؐ! ہمارا یہ کام ہے آپؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔ مدینہ منورہ میں ایک پاگل لونڈی تھی وہ ایک دن حاضر ہوتی، اور آپؐ کا دستِ مبارک پکڑ لیا۔ آپؐ نے فرمایا: اے عورت! مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے بیٹھ، میں تیرا کام کر دوں گا۔" چنانچہ آپؐ اسکے ساتھ مدینہ کی ایک گلی میں جا کر بیٹھے اور اس کی ضرورت پوری کر دی۔
۵۔ ایک دفعہ آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے کہ ایک بدو آیا اور آپؐ کا دامن پکڑ کر بولا: میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں، پہلے اس کو کر دو۔ آپؐ اس کے ساتھ فوراً مسجد سے باہر نکل آئے اور اس کا کام انجام دے کر نماز ادا کی۔
۶۔ کفارِ ثقیف جنہوں نے طائف میں آپؐ کے پائے مبارک زخمی کر دیئے تھے، ۹ھ میں وفد لے کر آئے تو آپؐ نے ان کو مسجد نبوی میں اتارا اور بہ نفسِ نفیس ان کی مہمان نوازی فرمائی۔
۷۔ عوالی میں ایک عورت بیمار پڑی۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ وہ مر جائے تو میں اس کی نماز جنازہ خود پڑھاؤں گا۔ اتفاق سے وہ مر گئی اور صحابہؓ نے آپؐ کے آرام کی خاطر آپؐ کو اطلاع نہ دی اور خود نمازِ جنازہ پڑھا کر دفن کر دیا۔ صبح کو آپؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ صحابہؓ کو ساتھ لے کر دوبارہ اس کی قبر پر جا کر نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔
۸۔ ایک دفعہ ابو مسعود انصاریؓ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی: ابو مسعود! تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے، خدا کو اس سے زیادہ تم پر اختیار ہے۔" انہوں نے مڑ کر دیکھا تو رسولِ اکرمؐ تھے۔ عرض کی، یارسول اللہؐ! میں نے رضائے الٰہی کی خاطر اس غلام کو آزاد کیا۔ فرمایا: "اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تم کو چھو لیتی۔"
۹۔ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ایک بڑھیا سر پر بوجھ اٹھائے ہوئے ہے مگر اس سے چلا نہیں جاتا۔ آپؐ نے بڑھ کر اس کی گٹھڑی اپنے سر پر اٹھا لی اور اسے منزلِ مقصود تک چھوڑ آئے۔

۱۰۔ ایک دفعہ ایک اونٹ آپ کو دیکھ کر بلبلایا۔ آپ نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا اور اس کے مالک سے فرمایا کہ "اس جانور کے معاملہ میں تم خدا سے نہیں ڈرتے۔"

۱۱۔ ایک صحابیؓ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں چادر سے چھپے ہوئے کسی پرندے کے بچے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا تو عرض کی ایک جھاڑی سے آواز آرہی تھی جاکر دیکھا تو یہ بچے تھے۔ میں نے ان کو نکال لیا۔ ان کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی۔" آپؐ نے فرمایا: "جاؤ اور بچوں کو وہیں پھر رکھ آؤ۔"

الغرض حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ میں خدمت خلق کی ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ ہمیں اس کی پیروی کرنی چاہیئے۔

ب:۔ خدمتِ خلق اور صحابہ کرامؓ

"تاریخ اسلام کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ کرام اور بالخصوص خلفائے راشدینؓ خدمتِ خلق کا مثالی نمونہ تھے۔ یہ حضور اکرمؐ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ نے خدمت خلق کو اپنا شعار اور طریق زندگی بنا لیا۔ ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ خلافت سے پہلے اپنے محلہ کے لوگوں کی بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے۔ چنانچہ جب آپ خلیفہ ہوئے تو ایک بچی فکر مند ہوئی کہ ان کی بکریاں کون دوہے گا؟ آپ کو جب یہ اطلاع ملی تو فرمایا کہ خلافت مجھے مخلوق خدا کی خدمت سے نہیں روک سکتی۔ خلافت سنبھالنے کے بعد آپ نے یہ خدمت جاری رکھی۔ اس کے علاوہ اہلِ محلہ کے دیگر کام بھی کرتے اور بیماروں کی تیمار داری اور ضعیفوں کی خدمت کرنے میں خوشی محسوس کرتے۔

مدینہ منورہ میں ایک معذور نابینا بڑھیا رہتی تھی۔ اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ روزانہ اس کے گھر جاتے، صفائی کرتے اور اس کی تمام ضروریات پوری کرتے تھے۔

۲۔ حضرت عمر فاروقؓ

حضرت عمر فاروقؓ نے خدمتِ خلق کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا۔ آپ بالعموم رات کے وقت مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت فرمایا کرتے تھے اور حاجت مندوں کی حاجت پوری فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کو گشت کرتے ہوئے ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ ایک بیوہ عورت

اور اس کے بچے فاقے سے ہیں۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں اور عورت نے محض بچوں کے بہلا دے کے لیے ہنڈیا چولہے پر چڑھا رکھی ہے۔ حضرت عمر فاروق یہ جان کر لرز گئے اور بیت المال سے کھانے کی چیزیں اٹھائیں اور چل دیئے۔ غلام نے عرض کیا کہ میں اٹھا لیتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: قیامت کے روز تم میرا بوجھ نہیں اٹھا سکو گے۔" چنانچہ خود سامان اٹھا کر بڑھیا کے گھر پہنچے اور کھانا تیار کر کے بچوں کو کھلایا اور پھر اس بڑھیا کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اسی طرح ایک رات مدینہ سے ذرا باہر جا نکلے تو ایک خیمہ سے عورت کے کراہنے کی آواز سنی۔ معلوم ہوا کہ ایک مسافر ہے جس کی بیوی درد زہ میں مبتلا ہے۔ حضرت عمرؓ گھر گئے اور اپنی بیوی کو ساتھ لائے، جنہوں نے دایہ کا کام کیا اور اس عورت نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ آپ مجاہدین کے خطوط ان کے گھروں میں تقسیم کرتے اور ان کے دروازوں پر بیٹھ کر جواب لکھ دیتے۔ ایک مرتبہ بیت المال کے کچھ اونٹوں کو تیل مل رہے تھے۔ کسی نے عرض کیا: "اے امیر المومنین! یہ کام کسی غلام سے لیا ہوتا۔" فرمایا: "مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟" آپ اپنے آپ کو اجیر المسلمین (مسلمانوں کا مزدور) کہا کرتے تھے۔

۳۔ حضرت عثمان غنیؓ

حضرت عثمان غنیؓ نے ہر موقع پر اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کسی قسم کی قربانی سے کبھی دریغ نہ کیا اور خاص طور پر جنگ کے موقعوں پر تو ان کا مالی ایثار مسلمانوں کی بہت سی پریشانیاں دور کرتے میں کام آتا رہا۔ وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے میں اس قدر فیاض اور دریا دل تھے کہ انہیں غنی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی تمام دولت خدمت خلق کے کاموں میں صرف کر دی تھی۔ مدینہ منورہ میں میٹھے پانی کا کنواں خرید کر اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔ ایک دفعہ قحط پڑا تو اپنا سارا غلہ غریبوں میں مفت بانٹ دیا۔ آپ نے بے شمار غلام خرید کر آزاد کیے اور ہمیشہ یتیموں، بیواؤں اور حاجت مندوں کی دستگیری کی۔

۴۔ حضرت علی المرتضیٰؓ

حضرت علی المرتضیٰؓ کی زندگی خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار تھی۔ آپ کبھی کسی سائل کو دروازے سے خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ تین روزوں کی افطاری کے وقت سائل آتے رہے اور آپ اپنا کھانا انہیں دیتے رہے اور خود بھوکے رہ کر پھر روزہ رکھ لیتے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے اس آیت کا شانِ نزول اسی واقعہ کو قرار دیا ہے:

"اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔" (الدھر: ۸)

ہیں کرتیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ

ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

اس میں بوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا ہوں عثمانؓ و علیؓ

سب کی خوشبو سے مہکتا ہے خلافت کا چمن

ج) خدمتِ خلق کے فوائد و ثمرات

خدمتِ خلق کے نتیجہ میں بہت سے فوائد و ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان فوائد کا جائزہ لیا جاتا ہے :-

۱۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت

ارشادِ نبویؐ ہے کہ جب تک کوئی بندہ اپنے بھائی کی مدد میں مصروف رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس بندے کا مددگار رہتا ہے۔ اس طرح خدمت خلق اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا ذریعہ ہے۔

۲۔ گناہوں کا کفارہ

خدمت خلق خدا کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اس سے آدمی کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ روزہ نہ رکھنے کا فدیہ بھوکے کو دو وقت کا کھانا کھلانا ہے نیز بلا عذر روزہ توڑنے پر جرمانہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ کھانا کھلانا خدمتِ خلق ہی تو ہے، جس سے گناہوں کی معافی ہو جاتی ہے۔

۳۔ خدمت مخدوم و سردار بناتی ہے

بنی نوع انسان کی خدمت سے انسان معاشرے میں عزت و احترام کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بڑے لوگوں کا شیوہ یہی رہا ہے کہ وہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ ارشادِ نبویؐ ہے :

سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ

یعنی : قوم کا سردار قوم کا خادم ہے۔

اس کو مولانا روم نے فارسی میں یوں بیان کیا ہے

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شُد ۔۔۔ واں کہ خود را دید او محروم شُد

یعنی جو دوسروں کی خدمت کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ عزت سے نوازتا ہے۔ وہ

بھی مخدوم بنتا ہے اور جو اپنے آپ کو فخریہ انداز میں دیکھتا ہے وہ عزت سے محروم رہتا ہے

۴۔ بخشش و مغفرت خدمت خلق انسان کی بخشش و مغفرت کا موجب بنتی ہے۔ کسی ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا اور کسی کے زخموں پر مرہم رکھنا بلاشبہ رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے، جس کے نتیجہ میں انسان کی بخشش ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو، کتے کو پانی پلانے پر بخش دیا۔ اور دوسرے شخص کو راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے پر بخش دیا گیا۔

۵۔ سماجی برائیوں کا خاتمہ ہر معاشرے میں ایسے معذور، محتاج اور محروم افراد ہوتے ہیں جو اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر صاحب حیثیت لوگ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہوں تو ان محتاجوں کی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں اور معاشرہ بھکاریوں اور گداگروں کی لعنت سے پاک ہو سکتا ہے غربت و افلاس سے اور بھی کئی سماجی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ مثلاً عصمت فروشی، چوری چکاری منشیات کا استعمال وغیرہ خدمت خلق کے ذریعے ان برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے سنگین معاشی مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور معاشرے کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

۶۔ خوشگوار اثرات خدمت خلق کے نتیجہ میں خوشگوار اور صحت مند ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ایثار و قربانی، محبت و رواداری اور اخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی روح اور حسن معاشرت کی جان ہیں۔ اگر حکمران خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہو تو نظام حکومت کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور یہ جذبہ عام ہونے سے بہت سی محرومیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے اور خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

عائلی یا خاندانی زندگی

(فیملی لائف)

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (الفرقان: ۷۴)

ترجمہ : اور رحمٰن کے بندے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں ہماری
بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر "

سوال : عائلی (خاندانی) زندگی سے کیا مراد ہے قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت اور اغراض و مقاصد بیان کیجیے۔

جواب : ا

عائلی (خاندانی) زندگی کا مفہوم

عائلی زندگی سے مراد خاندانی، گھریلو یا خانگی زندگی ہے۔ جسے انگریزی میں فیملی لائف (FAMILY LIFE) کہا جاتا ہے۔ اردو میں اس کے لیے موزوں لفظ خاندان کنبہ یا گھرانہ ہے۔ عائلہ کا لفظ عربی میں بیوی اور گھر کے دیگر افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے اس کی جمع عیال ہے۔ عیال کا کلمہ صرف بیوی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ پورے کنبہ اور خاندان پر ہوتا ہے اور کنبہ اور خاندان میں والدین، اولاد اور دیگر اعزہ و اقربا بھی شامل ہیں۔ اس لیے عائلی زندگی کا مفہوم گھریلو یا خانگی زندگی زیادہ مناسب ہے۔

ب اہمیت

خاندان یا کنبہ انسانی تمدن کا سب سے پہلا اور بنیادی دائرہ ہے۔ انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اپنے ارد گرد رشتوں اور تعلقات کا ایک وسیع جال دیکھتا ہے۔ وہ کوئی جنگل کا درخت نہیں ہے، جو زمین سے غذا حاصل کر کے یا سورج کی کرنوں کی روشنی اور ہوا پانی کے بل پر زندہ رہ سکے، بلکہ زندگی میں اسے قدم قدم پر دوسروں کی ضرورت ہوتی ہے سب سے پہلے پرورش کے لیے اسے ماں باپ کی ضرورت ہے۔ پھر تعاون اور مل جل کر زندگی گزارنے کے لیے قدم قدم پر اسے دوسرے رشتہ داروں اور ہمدردوں کی ضرورت ہے۔ گھر کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے میاں بیوی میں محبت و رحمت کے گہرے جذبات کی ضرورت ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے :

" وہ گھر روئے زمین پر بہشت و خلد کی تجلیاں اور بہاریں لیے ہوتا ہے جس میں
شوہر اور بیوی صورت اور سیرت کی میزان میں پورے اترتے ہیں "

بڑے بوڑھوں کی زندگی کو آرام دہ بنانے کے لیے فرمانبردار اور سعادت مند اولاد کی ضرورت ہے۔ بقولِ علامہ اقبالؒ

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے۔ اس لیے اس نے خاندانی زندگی کے تمام ارکان و افراد کے لیے حد بندیاں قائم کر دی ہیں۔ ہر ایک کے حقوق و فرائض بتا دیئے ہیں اور زندگی کو پر مسرت اور کامیاب و کامران بنانے کے قوانین اور قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے ہیں۔ ہمیشہ سے دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب و ملت میں خاندانی زندگی کے کچھ نہ کچھ قواعد و ضوابط مقرر رہے ہیں۔ انہی کی پابندی سے انسانی جماعتوں میں شہریت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ حقوق و فرائض کا یہی وہ شعور و ادراک ہے، جو انسان کو دوسرے حیوانات سے امتیاز بخشتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

ج) توازن و اعتدال

اسلام نے عائلی یا خاندانی زندگی کی حد بندی میں توازن و اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے اور میاں بیوی، اولاد، اور والدین کے حقوق و فرائض کی منصفانہ، عادلانہ اور واضح تقسیم کر دی ہے، تاکہ ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی نہ ہو اور باہمی تعلقات کی خوشگواری سے ایک صالح معاشرہ اور جاندار تمدن وجود میں آئے۔ عائلی زندگی کی حیثیت ایک اسلحہ ساز کارخانے کی سی ہے، جو تمدنی زندگی کے لیے قسم قسم کے مناسب، موزوں اور مضبوط ہتھیار ڈھالنے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ جیسے افراد ہوں گے، اسی قسم کا معاشرہ وجود میں آئے گا ظاہر ہے، افراد کی تربیت عائلی یا خاندانی زندگی کے سوا کسی اور ادارے میں مناسب اور مکمل طور پر نہیں ہو سکتی۔ ہمدردی، ایثار، خیر خواہی، تحمل اور صبر و ثبات کی اعلیٰ صفات پیدا کرنے کے لیے اس بنیادی ادارے کا وجود لازم بلکہ ناگزیر ہے

د) قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں عائلی یا خاندانی زندگی کے بارے میں واضح احکامات اور ہدایات دی گئی ہیں۔ ذیل میں کچھ آیات پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی وضاحت کر دی ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَ

لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝

(النسآء : ۱)

ترجمہ: لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا۔ (یعنی اوّل) اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیئے اور تم اللہ سے ڈرو جس کا نام لے کر تم ایک دوسرے سے (حق) مانگتے ہو اور رشتہ داریوں کے معاملہ میں بے انصافی سے ڈرو۔"

۲۔ قرآن مجید میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس (پوشاک) قرار دیا گیا ہے۔ لباس ستر پوشی، زینت، خوبصورتی، تکمیل، راحت و سکون اور قربت وغیرہ کا ذریعہ ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ (البقرۃ : ۱۸۷)

ترجمہ: وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

۳۔ اسلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے اگرچہ میاں بیوی اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے برابر ہیں، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال، کفالت اور خبر گیری کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ

(النسآء : ۳۴)

ترجمہ: مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس لیے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں، تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔

۴) اسلام نے عورتوں کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی:

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۖ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ (البقرۃ: ۲۲۸)

ترجمہ: اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے، جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔"

۵۔ اسلام عورتوں سے حسنِ سلوک کی تلقین کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ (النسآء: ۱۹)

ترجمہ: اور عورتوں کے ساتھ پسندیدہ طریقے سے زندگی گزارو۔

۶۔ عائلی زندگی حضرات انبیائے کرامؑ کی سنت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۗ (الرعد: ۳۸)

ترجمہ: اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے اور انہیں بیویاں اور اولاد بھی دی۔

۷۔ قرآن مجید میں رحمٰن کے بندوں کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (الفرقان: ۷۴)

ترجمہ: اور رحمٰن کے بندے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر۔"

حدیث کی روشنی میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ نہ صرف بذاتِ خود عائلی زندگی کا بہترین نمونہ ہے بلکہ حضور اکرمؐ نے اس سلسلے میں بہت کچھ تاکید فرمائی ہے۔ ذیل میں کچھ احادیث مبارکہ پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ نکاح کرنا میری سنت ہے، جس نے میری سنت سے منہ موڑا، اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ (مشکوٰۃ شریف)

۲۔ تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے ہیں اور میں اپنی بیویوں کے ساتھ بہترین حسنِ سلوک کرنے والا ہوں۔ (ترمذی شریف)

۳۔ تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔ (ابن ماجہ)

۴۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

۵۔ ایک شخص نے دریافت کیا، یا رسول اللہؐ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟ فرمایا: جب خود کھائے تو اس کو کھلائے۔ جب خود پہنے تو اس کو پہنائے۔ نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ نہ اس کو بُرا بھلا کہے اور نہ گھر کے علاوہ اُس کی سزا کے لیے اس کو علیحدہ کرے۔ (ابن ماجہ)

۶۔ ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ حضور اکرمؐ نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا: اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔ (بخاری شریف)

۷۔ نکاح کے لیے دیندار عورت کا انتخاب کرو۔ دنیا کی عزیز ترین متاع نیک عورت ہے۔ (کنز العمال)

۸۔ حضور اکرمؐ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا:

"جس طرح تمہارے حقوق عورتوں پر ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے حقوق تم پر ہیں ان کے ساتھ نرمی کرو۔ مہربانی سے پیش آؤ، اور خدا سے ڈر کر ان کے حقوق کا لحاظ کرو۔"

۹۔ جب آدمی اخلاص کے ساتھ اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر خرچ کرے تو یہ بھی اس کے حق میں صدقہ ہے۔ (بخاری و مسلم)

۱۰۔ عورت پسلی کی ہڈی کی مانند ٹیڑھی ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرو گے تو توڑ ڈالو گے اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو گے تو اس کجی کے باوجود اٹھا لو گے۔ (بخاری شریف)

(س) عائلی زندگی کے اغراض و مقاصد

قرآن و سنت کی رو سے عائلی زندگی کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد ہیں:۔

۱۔ بقائے نسل انسانی

عائلی زندگی کا اولین مقصد نسل انسانی کی بقاء ہے تاکہ انسانوں کا نسل در نسل سلسلہ چلتا رہے اور دنیا انسان کی جنس سے خالی نہ ہو جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ (البقرۃ: ۲۲۳)

ترجمہ: تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں۔ جیسے چاہو اپنی کھیتی میں آؤ، اور اپنے لیے (کچھ) آگے بھیجو۔

اس آیت میں حَرْثٌ (کھیتی) کے لفظ سے یہ اشارہ ہے کہ نکاح سے اصل مراد پھل یعنی اولاد کا حصول ہے، نہ کہ محض لذت کا حصول اور تفریح۔ کیونکہ کسان کھیت میں جو محنت کرتا ہے، وہ پیداوار کے لیے کرتا ہے۔ سورۂ کوثر میں ہے:

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ○

یعنی: اے نبیؐ! ہم نے تمہیں کوثر عطا کی۔

اس آیت کی تفسیر میں علماء نے لکھا ہے کہ کوثر سے مراد امت کی کثرت بھی ہے چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے:

"قیامت کے روز میں اپنی امت کی کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔"

امام غزالی اپنی مشہور کتاب "احیاء علوم" میں فرماتے ہیں:۔

اسلام نے چار وجوہات کی بناء پر اولاد کی پیدائش اور پرورش کی ترغیب دی ہے:

و۔ اصل خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ والدین صرف اولاد کی پیدائش کا ظاہری سبب ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایک خاص مقصد یعنی بقائے نسل انسانی کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا ان کا مقام بہت بلند ہے۔

ب۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں اپنی امّت کی کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا اس لیے والدین حضورؐ کے اس فخر کا باعث بنتے اور آپؐ کی محبت حاصل کرتے ہیں۔

ج۔ آدمی کے مر جانے کے بعد نیک اولاد صدقۂ جاریہ ہے اور وہ اپنے والدین کے حق میں دعائے مغفرت کرتی ہے۔

د۔ اگر اولاد بچپن میں مر جائے تو والدین کی شفاعت کرے گی۔

۲۔ اخلاق کی پاکیزگی

عائلی زندگی کا دوسرا مقصد انسانی اخلاق کی پاکیزگی و طہارت ہے۔ قرآن پاک نے اسی لیے نکاح کے لیے احصان کا لفظ بولا ہے۔ حصن کا معنی ہے قلعہ۔ احصان کا معنی ہوا قلعہ بند کرنا، بچانا، محفوظ کر لینا، گویا جو شخص نکاح کے قلعے میں آجاتے وہ اپنے اخلاق کو بچا سکتا ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی راہ سے شیطان اس پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

"جس شخص نے نکاح کر لیا، اس نے اپنا آدھا دین بچا لیا"

پھر فرمایا:

"جب کوئی مسلمان نکاح کرتا ہے تو شیطان چیخ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا بُرا ہو، اس نے مجھ سے دو تہائی دین چھین (بچا) لیا۔"

شہوت ایک فطری تقاضا ہے۔ لیکن جس طرح انسان کی اور جبلتوں کو آزاد چھوڑ دینے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح اگر شہوت بھی غلط راہ اختیار کر لے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جن ممالک میں مادر پدر آزادی ہے وہاں کے معاشرہ میں کئی قسم کی خطرناک خرابیاں جنم لے چکی ہیں۔ اس لیے نکاح عصمت و حیاء کی حفاظت کرتا ہے۔

۳ محبت ورحمت

ارشادِ ربانی ہے:

"وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً"

یعنی: اور اس نے تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کر دی۔

تمدن کی بنیاد باہمی ہمدردی اور شفقت و رحمت کے لطیف جذبات پر ہے۔ عائلی زندگی ان جذبات کو ابھارتی اور پرورش کرتی ہے پہلے میاں بیوی کے درمیان یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں، پھر اولاد کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، قدرت ماں باپ کے دل میں اولاد کے لیے محبت و رحمت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ باپ کی نسبت ماں میں یہ جذبات زیادہ شدید ہوتے ہیں جوانی میں میاں بیوی میں محبت ہوتی ہے اور بڑھاپے میں یہ رحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان جذباتِ محبت و رحمت کی مکمل تسکین انسان کو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے تیار کرتی ہے۔

۴۔ تدبیر منزل

خاندانی زندگی کا چوتھا مقصد تدبیر منزل یعنی گھریلو زندگی کی تنظیم اور باہمی فرائض کی تقسیم ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتے تو تمدن میں

خلل پیدا ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اسلام نے خاندانی زندگی کا ناظم مرد کو ٹھہرایا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ

یعنی: مرد عورتوں پر حاکم و منتظم ہیں "۔

اسلام نے عورت کو بھی مساوی قانونی حقوق دیتے ہیں۔ گھر ایک چھوٹی سی سلطنت ہے جس کے بیرونی معاملات کا مختار مرد اور اندرونی معاملات عورت کے سپرد ہیں۔ عائلی زندگی کا مقصد یہ بھی ہے کہ گھر کے سب اندرونی و بیرونی معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوں روزی کمانے کی ذمہ داری اصلاً مرد کے سپرد ہے اور گھر کا انتظام، اولاد کی پرورش اور گھریلو زندگی کی آسائشیں مہیا کرنا عورت کے ذمہ ہے۔ یہ مقاصد خاندانی زندگی ہی سے پورے ہو سکتے ہیں۔

۵ تربیتِ اولاد

اولاد اپنی پرورش کے لیے والدین کی دستِ نگر ہوتی ہے۔ گھر بچے کی اولیں درسگاہ ہے۔ پیدائش سے بچپن تک جو کچھ عادات و اطوار اپنے والدین سے سیکھے گا وہ تمام عمر اس کے ذہن میں پختہ رہیں گے۔ اگر میاں بیوی دیندار سمجھدار، نیک و بااخلاق ہوں گے تو یقیناً ان کی اولاد بھی اعلیٰ اوصاف کی حامل ہو گی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم: ٦)

ترجمہ: اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

تم میں سے ہر شخص راعی (نگہبان) ہے اور وہ اپنی رعیت کے لیے جوابدہ ہے"۔

پھر فرمایا:

"اپنی اولاد کی عزت و تکریم کرو اور ان کی بہترین تربیت کرو"۔

چنانچہ عائلی زندگی کا نظام تربیت اولاد کا بہترین ادارہ ہے۔

۶۔ احساسِ ذمہ داری اور ادائیگی فرض

عائلی زندگی گزارنے سے انسان پر اہل و عیال اور رشتہ داروں کی طرف سے بہت سی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں، جنہیں ادا کرنا ضروری ہے۔ بیوی بچوں کے لیے رزق حلال کمانا پڑتا ہے۔ گھر کے ہر فرد کو اپنے فرائض ادا کرکے اپنے آپ کو اسلامی

معاشرہ کا مفید رکن بنانا ہوتا ہے۔ خاندانی زندگی احساسِ ذمہ داری پیدا کرتی ہے اور اس میں رہ کر اپنے فرائض کی ادائیگی کی عادت پڑتی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے۔

"تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اپنی ذمہ داری کے لیے اسے جواب دینا پڑے گا مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور اس ذمہ داری کے لیے جوابدہ ہے۔ عورت اپنے خاوند کے گھر اور بچوں کی ذمہ دار ہے اور اپنی اس ذمہ داری کے لیے اسے جواب دینا پڑے گا۔

(بخاری و مسلم)

پھر فرمایا:

"جس شخص نے تین بیٹیوں کی پرورش کی، ان کی اچھی طرح تربیت کی، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، اسے جنت ملے گی۔" (ترمذی، ابوداؤد)

۷۔ زندگی کا سکون واطمینان

:۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ط (الروم: ۲۱)

ترجمہ: اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ ان کی طرف (مائل ہو کر) سکون و اطمینان حاصل کرو اور تم میں محبت و رحمت پیدا کر دی۔

چنانچہ عائلی زندگی کا ایک بڑا مقصد سکون واطمینان کا حصول ہے۔ گھریلو زندگی کا اطمینان و سکون نکاح میں پوشیدہ ہے۔ دن بھر کا تھکا ماندہ آدمی گھر میں داخل ہو اور گھر میں اس کا استقبال ایک ہمدرد ساتھی کی طرف سے ہو جو مسکرا کر اس کا خیر مقدم کرے تو زندگی کے رنج والم بھول جاتے ہیں۔ انسان اپنے بیوی بچوں کے درمیان بیٹھ کر زندگی کی تمام کلفتیں فراموش کر دیتا ہے اور وہ اگلی صبح تازہ دم ہو کر زندگی کی تگ و دو میں شریک ہو جاتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

"چار باتیں ہیں، جن کی وجہ سے عورت کو نکاح کے لیے پسند کیا جاتا ہے۔ مال، حسب و نسب، حسن و جمال اور دینداری۔ اے پیارے! دیندار عورت کو غنیمت جان۔"

پھر فرمایا:

"دنیا کا بہترین سازو سامان نیک بیوی ہے۔" (مسلم)

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
(اقبال)

والدینؑ کے حقوق

سوال: قرآن و سنت کی روشنی میں والدین کے حقوق بیان کیجئے؟

جواب: **والدین کے حقوق** معاشرے میں انسان کو جن ہستیوں سے سب سے زیادہ مدد، سرپرستی اور سہارا ملتا ہے، وہ والدین ہیں۔ والدین صرف اپنی اولاد کی پیدائش ہی کا ذریعہ نہیں ہیں، بلکہ اس کی پرورش اور تربیت کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔

تجربہ شاہد ہے کہ انسانی بچے کی پرورش سب سے مشکل کام ہے۔ اسے مسلسل کئی سال تک نگہداشت اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا میں صرف والدین ہی کی ذات ہے جو اپنی اولاد کی اس قدر بے لوث اور لگن کے ساتھ خدمت و پرورش کرتی ہے۔ والدین اپنے راحت و آرام کو اولاد کے راحت و آرام پر قربان کردیتے ہیں۔ ان کی محبت و شفقت

اولاد کے لئے رحمت باری کا وہ سائبان ہے جو انہیں مشکلات و مصائبِ زمانہ کی کڑی دھوپ سے بچا کر پروان چڑھاتی ہے۔ دراصل انسانیت کا وجود خدا کے بعد والدین ہی کا مرہون منت ہے۔ اسی لئے قرآن و سنت میں توحید و رسالت کے بعد والدین کے حقوق پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ذیل میں ان حقوق کا مختصراً جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ **حسنِ سلوک** اسلام والدین کے ساتھ بہترین حسنِ سلوک کی تاکید کرتا ہے۔ ان کی خدمت کرنے اور نرمی و شائستگی کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝

(بنی اسرائیل ۲۳، ۲۴)

ترجمہ: اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا۔ اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے پروردگار! جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پرورش کیا، تو بھی ان (کے حال) پر رحمت فرما۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ (الاحقاف: ۱۵)

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا۔

احادیث مبارکہ میں بھی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی بہت تاکید کی گئی ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے پوچھا: پھر کون سا عمل؟ تو فرمایا: ماں باپ سے نیکی کرنا۔ (بخاری و مسلم)

حضورؐ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا، یارسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا، تیری ماں۔ اس نے پوچھا۔ پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا، تیری ماں۔ اس نے پوچھا، پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا، تیری ماں۔ پھر اس نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپؐ نے فرمایا: تیرا باپ"! (بخاری و مسلم)

۲۔ شکر گزاری

اللہ تعالیٰ کے بعد انسان پر والدین کا احسان سب سے زیادہ ہے۔ انہوں نے اس کی پیدائش، پرورش اور تربیت میں بڑی تکالیف اٹھائی ہیں۔ جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے اپنی شکر گزاری کے ساتھ والدین کی شکر گزاری کا بھی حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ط (لقمان: ۱۴)

ترجمہ: میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"جو شخص اپنے والدین سے بے رُخی کرتا ہے، وہ ناشکرا ہے۔"

ادب واحترام

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں بیان ہو چکا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کرو۔ انہیں اُف (ہُوں ہاں) تک نہ کہو، انہیں ڈانٹو مت۔ ان کے ساتھ عزت و اکرام سے گفتگو کرو اور ان کے سامنے عاجزی کا اظہار کرو۔

ارشاد نبویؐ ہے کہ جو شخص کے ماں باپ اس سے خوش ہوں، اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک زندہ ہو اور اسے خوش کر لیا جائے تو ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر تین مرتبہ فرمایا: اگرچہ وہ تمھاری حق تلفی بھی کریں تو تمھارا فرض یہی ہے کہ ان کا احترام ملحوظ رکھو۔ اور جس کے والدین اس سے ناراض ہوں، اس کے لئے دوزخ کے دو دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر ایک بھی زندہ ہے تو ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ (بیہقی)

۴۔ اطاعت

خلاف شرع کاموں کے سوا ہر بات میں والدین کی اطاعت فرض ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (لقمٰن: ۱۵)

ترجمہ: "اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کر تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا۔ ہاں دنیا کے کاموں میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا۔"

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا باپ آذر بت تراش اور بت فروش تھا۔ جب آپؑ نے اپنے باپ کو توحید کی تعلیم دی اور بت پرستی ترک کرنے کو کہا تو اس نے آپؑ کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی اور آپؑ کو اپنے گھر سے نکال دیا لیکن حضرت ابراہیمؑ پھر بھی اپنے باپ کا ادب و احترام کرتے رہے اور اس کے لئے ہدایت و بخشش کی دعا مانگتے رہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو بتایا کہ میں نے خواب میں تمہیں خدا کی راہ میں قربان کرنے کا اشارہ پایا ہے تو سعادت مند بیٹے نے عرض کیا کہ ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کر گزریئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابر و شاکر پائیں گے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يَٰٓأَبَتِ ٱفۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُۖ سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝ (الصّٰفّٰت : ۱۰۲)

ترجمہ: انہوں نے کہا کہ ابا جان! جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجئے، خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائیں گے۔

؎ یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی (اقبال)

ارشاد نبویؐ کے مطابق:

والدین کی رضا اور ناخوشی میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور ناخوشی ہے۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میری ایک بیوی تھی جو مجھے بہت پسند تھی لیکن ابا جان کو ناپسند تھی۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا اسے چھوڑ دو۔ لیکن میں نے نہ مانا۔ تو وہ حضورؐ کی خدمت میں گئے اور واقعہ بیان کیا۔ حضورؐ نے مجھے حکم دیا کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ (ابوداؤد۔ ترمذی)

امام غزالیؒ کا قول

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ والدین کی اطاعت اٹل ہے اور اگر کسی چیز کے جائز و ناجائز ہونے میں شبہ ہو تو اس چیز کا حکم مشتبہ ہے۔ لہٰذا ایسی چیزوں میں والدین کی اطاعت فرض ہے۔ یعنی والدین اگر کسی مشتبہ چیز کا حکم دیں تو اس کا ماننا واجب ہوگا، کیونکہ صرف شبے کی وجہ سے والدین

کی اطاعت کا حتمی حکم ٹل نہیں سکتا۔ (احیاء علوم)

۵۔ خدمتِ والدین

والدین جو کچھ اپنی اولاد کے لیے کرتے ہیں۔ اس کے صلے اور بدلے کی صورت یہی ہے کہ ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی جائے۔ ارشاد نبوی ہے کہ وہ شخص ذلیل ہوا، ذلیل ہوا، ذلیل ہوا جس نے والدین کا بڑھاپا پایا اور دونوں (یا ان میں سے جو بھی زندہ ہو) کی خدمت کر کے جنت میں نہ پہنچ جائے۔ (مسلم)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں ہجرت اور جہاد پر آپؐ کی بیعت کرتا ہوں اور اس کا اجر خدا سے چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے۔ اس نے کہا: جی ہاں! بلکہ دونوں زندہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم اللہ سے جزا لینا چاہتے ہو؟ کہنے لگا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: اپنے ماں باپ کے پاس جاؤ اور ان کی اچھی طرح خدمت کرو۔ (بخاری ومسلم)

ایک شخص نے حضورؐ سے اپنے باپ کی شکایت کی کہ اس نے میرا مال چھین لیا ہے۔ حضورؐ نے اسے گدی سے پکڑ کر اس کے باپ کے حوالے کیا اور فرمایا: "تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔" (ابوداؤد)

والدین کی نافرمانی گناہ کبیرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی احادیث میں ماں باپ کی خدمت نہ کرنے اور ان کی نافرمانی اور بدسلوکی کرنے کو کبیرہ گناہ قرار دیا ہے اور اس برائی کو شرک کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"بڑے بڑے گناہ یہ ہیں: خدا کا شریک بنانا، والدین سے بدسلوکی کرنا، ناحق قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔" (بخاری)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

"والدین کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے۔ لوگوں نے عرض کیا: کیا کوئی بدقسمت ایسا بھی کر سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں! یہ اسے ماں باپ کو گالی دے اور وہ اسے دے۔" (بخاری ومسلم)

۷۔ والدین کے رشتوں کا لحاظ رکھنا

ارشادِ نبویؐ کے مطابق چچا باپ کی مانند اور خالہ ماں کی مانند ہے۔ (ترمذی ومسلم)

ایک حدیث میں ارشاد ہوا کہ بہترین نیکی یہ ہے کہ باپ کے تعلق داروں اور

محبت والوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ (ریاض الصالحین)

اسید ساعدیؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں تھے کہ بنی سلمہ کا ایک شخص آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہؐ! والدین کی موت کے بعد بھی ان کے ساتھ کوئی نیکی کر سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! ان کی نماز جنازہ پڑھو، ان کی بخشش کی دعا مانگو، ان کے کئے ہوئے وعدے پورے کرو، ان کے رشتہ داروں سے نیک سلوک کرو اور ان کے دوستوں اور سہیلیوں کی عزت و تکریم کرو۔ (ابو داؤد)

۸۔ والدین کے لئے دعائے مغفرت

قرآن مجید میں والدین کے حق میں یہ دعا سکھائی گئی ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ ۔

ترجمہ: "اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے والدین کو بھی۔"

والدین کے حق میں دعا کرنے والی اولاد کو حضورؐ نے صدقہ جاریہ کی مانند قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ جس شخص کی موت کے بعد نیک اولاد موجود ہے، جو اس کے لئے دعا کرتی ہے تو اس شخص کی نیکیاں ابھی ختم نہیں ہوئیں۔

اوپر ایک حدیث بیان ہو چکی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ والدین کی وفات کے بعد بھی ان کا حق اولاد کے ذمہ باقی رہتا ہے اور اس کے ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے اور ان کے لئے بخشش کی دعا مانگی جائے۔ (ابو داؤد)

ایک شخص اپنی والدہ کو ایصالِ ثواب کرنا چاہتا تھا۔ حضورؐ نے اسے حکم دیا کہ مسلمانوں کے فلاں محلے میں پانی کی تکلیف ہے، اپنی والدہ کو ثواب پہنچانے کی نیت سے وہاں کنواں لگوا دو۔ جب تک کنواں باقی رہے گا، تیری والدہ کو ثواب پہنچتا رہے گا۔ نماز میں بھی یہی دعا پڑھی جاتی ہے۔

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۝ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

ترجمہ: اے میرے پروردگار! مجھ کو نماز کا پابند بنا دے اور میری اولاد کو بھی۔ اے ہمارے پروردگار! دعا قبول فرما۔ اے ہمارے پروردگار مجھ کو بخش دے اور میرے والدین کو اور تمام مسلمانوں کو، اس روز جبکہ اعمال کا حساب ہونے لگے۔

۹۔ مالی امداد

اولاد اپنے بوڑھے والدین کا سہارا ہوتی ہے۔ لہٰذا خود کفیل اولاد کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی مالی ضروریات کا پورا خیال رکھے، بالخصوص جب وہ ضرورت مند ہوں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ ۝ (البقرہ : ۲۱۵)

ترجمہ: (اے نبیؐ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں، کہہ دو کہ (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا ہو وہ (درجہ بدرجہ) (حقداروں کو یعنی) ماں باپ کو دو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی والدین کی مالی امداد پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

"تمہاری اولاد تمہاری پاک اور حلال کمائی ہے تم اپنی اولاد کی کمائی سے بلا جھجک کھاؤ پیو۔" (ابن ماجہ)

اسی طرح حضورؐ نے ایک بوڑھے والد کی شکایت پر اس کے بیٹے سے فرمایا:

اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ ۝

یعنی: تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ (ابوداؤد)

۱۰۔ ایک عبرتناک واقعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص کی وفات کا وقت آیا تو اس کی زبان پر کلمہ جاری نہ ہوتا تھا۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع کی گئی تو حضورؐ نے پوچھا کیا اس کی ماں زندہ ہے؟ عرض کیا گیا: "ہاں"۔ چنانچہ حضورؐ نے اس کی والدہ کو طلب فرمایا۔ جب وہ حاضر ہوئی تو حضورؐ کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ اپنے بیٹے سے ناراض ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو معاف کرنے پر رضامند نہ ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا کہ لکڑیاں جمع کی جائیں اور ان میں آگ لگائی جائے اور پھر اس کے بیٹے کو آگ میں ڈال دیا جائے۔ اس پر ماں تڑپ اٹھی اور کہنے لگی کہ اسے آگ میں نہ ڈالا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم اپنے بیٹے کو معاف نہیں کرو گی تو خدا اسے آگ ہی میں ڈالے گا۔ اس پر اس عورت نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا اور اس کے بعد اس کی زبان پر کلمہ جاری ہوا اور وہ خدا کو پیارا ہو گیا۔

(نوٹ: والدین کے ان حقوق کو ہم اولاد کے فرائض بھی کہہ سکتے ہیں۔)

اولاد کے حقوق و فرائض

سوال: اولاد کے حقوق و فرائض قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کیجیئے؟

جواب: **اولاد کے حقوق** اولاد کے حقوق کو ہم والدین کے فرائض بھی شمار کر سکتے ہیں اسلام نے والدین کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے حقوق کا خیال رکھیں۔ اس کی مناسب پرورش و تربیت کریں اور ان کی جملہ ضروریات پوری کریں ذیل میں اولاد کے حقوق مختصر طور پر بیان کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ **حفاظت جان** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے انسان کی جہالت و سنگدلی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر ڈالتا۔ عرب میں بعض لوگ مفلسی کے خوف سے اور بعض اس جھوٹے غرور سے کہ کوئی ہمارا داماد نہ بن سکے، اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اسلام نے نہایت شدت کے ساتھ اس سے منع فرمایا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس قتل ناحق کا سخت محاسبہ کرے گا۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۙ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۚ (التکویر: ۹، ۸)

ترجمہ: "اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہو، پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی۔"

قرآن مجید میں معاشرے کی دیگر برائیوں کے ساتھ قتل اولاد سے بھی ان الفاظ میں منع فرمایا گیا:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۱)

ترجمہ: "اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا۔ (کیونکہ) ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت گناہ ہے۔"

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "شرک"۔ انہوں نے دریافت کیا اس کے بعد۔ آپؐ نے فرمایا: "والدین کی نافرمانی"۔ عرض کیا: اس کے بعد۔ ارشاد ہوا: "تم اپنی اولاد کو اس خوف سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے کھانے میں حصہ بٹائے گی"۔

۲۔ عقیقہ و ختنہ

بچے کی پیدائش پر سب سے پہلا کام یہ کرنا چاہیئے کہ اسے نہلا دھلا کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے پھر اسے گھٹی دی جائے اور برکت کی دعا مانگی جائے۔

بخاری شریف میں حضرت ابوموسیٰؓ سے ایک حدیث بیان کی گئی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو میں اسے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کا نام ابراہیمؑ رکھا۔ ایک کھجور کی اسے گھٹی دی۔ اس کے لئے برکت کی دعا مانگی اور بچہ مجھے واپس دے دیا۔

مسنون طریقہ یہ ہے کہ ساتویں روز خوشی کے اظہار کے لئے بطور خیرات بچے کی طرف سے جانور ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جائے۔ اس کا نام رکھا جائے اور سر کے بال اتار کر ان کے برابر کی مقدار میں چاندی صدقہ کی جائے۔

سنت یہ ہے کہ ساتویں دن جانور ذبح کر کے بچے کی طرف سے عقیقہ کیا جائے۔ اس کا نام رکھا جائے۔ سر مونڈا جائے اور ختنہ کرایا جائے۔ آپؐ نے ختنے کی سنت ابراہیمیؑ قرار دیا ہے۔ لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔ نام اچھے سے اچھا رکھنا چاہیئے۔ کئی لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپؐ ان کا نام پوچھتے اور ناپسندیدہ نام بدل کر اور نام رکھ دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن خدا کے پیارے نام ہیں۔ حضرت حسنؓ کی پیدائش پر حضرت علی المرتضیٰؓ نے ان کا نام حرب رکھا تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدل کر حسن کر دیا۔ آپؐ نے خود اپنے صاحبزادوں کے نام عبداللہ، قاسم، طیب و طاہر اور ابراھیم رکھے تھے۔

۳۔ رضاعت

رضاعت کے معنی ہیں دودھ پلانا۔ اللہ تعالیٰ نے بچے کو دودھ پلانے کی مدت دو سال مقرر فرمائی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ

كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ط
وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَ
تُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط (البقرة : ۲۳۳)

ترجمہ :" اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں ۔ یہ (حکم) اس شخص کے لئے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہوگا ۔"

اگر خدانخواستہ بچے کی ماں مرجائے تو دوسری عورتوں سے اجرت پر دودھ پلوانے کی اجازت ہے ۔ یہ اجازت اس صورت میں بھی ہے جب عورت کسی وجہ سے دودھ نہ پلا سکے یا پلانا نہ چاہتی ہو ۔ ان حالات میں مالی ذمہ داری خاوند پر ہوگی ۔ کسی مصلحت سے دودھ پلانے کی مدت میں کمی بھی ہوسکتی ہے ۔ اور جب بچے کی زندگی اور صحت کا معاملہ درپیش ہو تو دو سال سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے ۔

۴۔ **تعلیم و تربیت** اسلام نے اولاد کی جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ اس کی بہتر تعلیم و تربیت پر بھی بہت زور دیا ہے ۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ اولاد کا ماں باپ پر حق ہے کہ اس کی اچھی تربیت کریں اور اس کا اچھا نام رکھیں ۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا :

أَكْرِمُوا أَوْلَادَكُمْ وَأَحْسِنُوا أَدَبَهُمْ

ترجمہ :" اپنی اولاد کی عزت و توقیر کرو اور ان کی اچھی تربیت کرو ۔"

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم : ۶)

ترجمہ :" اے ایمان والو ! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ ۔"

اس سے مقصود ان تمام برائیوں ، خرابیوں اور بلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے جو آخر کار انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں :۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا

وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ (الفرقان : ۷۴)

ترجمہ: "اور جو (خدا سے) دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔"

ارشادِ نبویؐ ہے:۔

"جب بچے سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز کی تلقین کرو۔ اگر دس سال کے ہو کر بھی نماز کی پابندی نہ کریں تو مار کر پڑھاؤ اور اس عمر میں ان کے بستر الگ الگ کر دو۔" (ابوداؤد)

پھر فرمایا:۔

"تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے۔ مرد ذمہ دار ہے اور اس سے اس کے اہل و عیال کے متعلق پوچھا جائے گا۔ عورت ذمہ دار ہے اور اپنے خاوند کے گھر اور اولاد کے متعلق جوابدہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

اولاد کی تعلیم کی اہمیت اس حدیث نبویؐ سے واضح ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ ۝

ترجمہ: "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا کہ اولاد کے لئے والدین کا بہترین تحفہ اور عطیہ اچھی تعلیم ہے۔ (ترمذی)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن تین عمل جاری رہتے ہیں۔ ایک صدقہ جاریہ، دوسرا اس کا پھیلایا ہوا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور تیسرے نیک اولاد جس اس کے حق میں دعائیں کرے۔" (مسلم)

۵۔ بچیوں کی پرورش و تربیت

لڑکی کو بوجھ، مصیبت یا کمتر سمجھنے کی غلط ذہنیت کو ختم کرنے کے لئے اسلام نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑکی کو خدا کی رحمت قرار دیا ہے۔ فرمایا:

"جس آدمی کے گھر دو لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ ان کی اچھی طرح پرورش کرے حتیٰ کہ وہ جوان ہو جائیں تو ایسا آدمی بالکل اسی طرح میرے ہمراہ جنت میں داخل ہو گا جس طرح شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی ساتھ ساتھ ہیں۔" (ترمذی)

پھر فرمایا :

"اگر والدین لڑکی کی پرورش صحیح طور پر اور شفقت سے کریں تو ان کا یہ عمل ان کے اور دوزخ کے درمیان پردہ کی طرح حائل ہو جائے "

بعض لوگ اپنی جائیداد میں سے بیٹیوں کو ان کے حق سے محروم کر دیتے ہیں ، یہ ناجائز ہے ۔

ارشادِ نبویؐ ہے :

"جس کے ہاں لڑکی پیدا ہو اور وہ اس کو زندہ رہنے دے ، اس کو حقارت سے نہ دیکھے نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دی تو خدا اس کو جنت میں داخل کرے گا " (ابوداؤد)

۶۔ عدل و مساوات

اولاد کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ ہونا چاہیئے ان کے درمیان برابری رکھنی چاہیئے ۔ ایک کو دوسرے پر بلا سبب ترجیح نہ دی جائے ، بالخصوص لڑکوں کو لڑکیوں سے برتر اور لڑکیوں کو کم تر نہیں جاننا چاہیئے ۔ اگر اولاد میں سے ایک کو کوئی تحفہ یا عطیہ دیا جائے تو دوسروں کو بھی ویسا ہی دینا چاہیئے ۔ اولاد میں فرق و امتیاز کرنا ظلم ہے ۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام تحفے میں دیا اور چاہا کہ حضورؐ کی اس پر شہادت ہو ۔ حضورؐ نے پوچھا کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے ؟ عرض کی : "نہیں" ۔ فرمایا : "تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا "

اسی طرح باپ کے ترکے میں لڑکے کے ساتھ لڑکی بھی اپنے حصے کی حقدار ہے ۔

۷۔ شفقت و رحمت

اولاد کے ساتھ نہایت شفقت و رحمت کا سلوک کرنا چاہیئے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے نواسوں اور نواسیوں کو اٹھائے پھرتے تھے ۔ وہ حالت نماز میں آپؐ کی پشت مبارک پر چڑھ جاتے کبھی گردن پر بیٹھ جاتے اور آپؐ بالکل برا نہ مانتے ۔ آپؐ کی نواسی امامہؓ جو آپؐ کی بڑی صاحبزادی زینبؓ کی بیٹی تھیں ۔ انہیں آپؐ گھر میں اور کبھی مسجد میں اٹھائے پھرتے تھے وہ نماز کی حالت میں آپؐ کی ٹانگوں میں سے گزر جاتی ، کبھی کندھوں پر چڑھ جاتی اور آپؐ نہایت اطمینان سے نماز پڑھتے رہتے

بخاری شریف میں ہے کہ اقرع بن حابس ایک سخت مزاج عرب سردار تھا ۔ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر تھا ۔ آپؐ اپنے نواسے حسنؓ سے پیار کر رہے تھے ۔ وہ دیکھ کر بولا میرے دس بچے ہیں ۔ میں نے کبھی ان میں سے کسی کو نہیں چوما ۔ آپؐ نے فرمایا : جو دوسروں پر رحم

نہ کورے، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ حاضرِ خدمت ہوتیں تو آپؐ کھڑے ہو کر ان کا سر چومتے اور پیار کرتے۔

ترمذی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے کہ حسنؓ و حسینؓ گرتے پڑتے آئے۔ حضورؐ نے انہیں اٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

ترمذی میں ہے کہ جب آپؐ مسجد سے باہر نکلتے تو اکثر بچے آپؐ سے چمٹ جاتے اور آپؐ کے ہاتھوں، ٹانگوں اور کپڑوں کو کھینچتے۔ حضورؐ مسکراتے رہتے اور کئی مرتبہ انہیں باری باری اٹھا لیا کرتے تھے۔ اپنے بیٹے ابراہیمؑ سے آپ کو بہت پیار تھا۔

جب وہ سخت بیمار ہوئے تو حضورؐ بعض صحابہؓ سمیت گھر تشریف لے گئے۔ ابراہیمؑ اس وقت حالت نزع میں تھے۔ آپؐ نے انہیں اٹھا لیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ لوگوں کے پوچھنے پر ارشاد فرمایا: کہ یہ رحمت کے آنسو ہیں۔

ایک اور حدیث کے مطابق؛ آپ نے فرمایا: آنکھیں روتی ہیں اور دل غمگین ہے لیکن زبان سے کلمۂ شکایت و بے صبری نہیں نکل سکتا۔ یہی کہتا ہوں کہ اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی سے بہت غمگین ہیں۔

۸۔ نکاح پرورش اور تعلیم و تربیت کے بعد جوان اولاد کے لئے اچھا رشتہ تلاش کرنا اور ان کا نکاح کرنا بھی والدین کے ذمہ ایک اہم فریضہ ہے۔

ارشاد نبویؐ ہے:

"تین چیزوں میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ نماز میں جب اس کا وقت آجائے۔

جنازے میں جب کہ وہ حاضر ہو۔

اور لڑکی کی شادی میں جب اس کا مناسب بَر مل جائے۔" (مسند احمد)

رشتہ تلاش کرنے میں لڑکے کے جذبات و احساسات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے بلکہ اس کی رضامندی یا کسی کے ذریعے دریافت کر و الینی چاہیئے۔ نکاح میں جوان لڑکی کو اگر رشتہ اس کی مرضی کے خلاف ہو تو انکار کر دینے کی اجازت ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر نکاح ہرگز نہیں ہوتا اس سلسلے میں اسلامی احکام بڑے فطری اور متوازن ہیں معاشرے کی بہت سی خرابیاں ان احکام اور تعلیمات کو پس پشت ڈال دینے کے نتیجہ میں جنم لیتی ہیں۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق

سوال: اسلام نے عورت کو معاشرہ میں کیا مقام دیا ہے؟ اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں بیان کریں؟ (یا)

قرآن وسنت کی روشنی میں میاں بیوی کے باہمی حقوق بیان کیجئے؟

جواب: **اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام** اسلام سے پہلے کے معاشرے میں عورت کو کوئی حیثیت اور قدر و منزلت نہ تھی اس کے ساتھ ذلت آمیز سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اسے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت ایک کنیز اور لونڈی سے زیادہ نہ تھی۔ اسے کوئی قانونی حق اور تحفظ حاصل نہ تھا۔ ایک مرد جتنی عورتوں سے چاہتا شادی کر لیتا اور ذرا ذرا سی بات پر جس عورت کو چاہتا گھر سے نکال دیتا تھا۔ عرب میں یہ ظالمانہ رواج تھا کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔

اسلام دین حق اور دین فطرت ہے اس نے انسانیت کو اس کا اصل مقام اور شرف و اعزاز بخشا۔ اسلام کے بے شمار احسانات میں سے ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ اس نے عورت عورت کو اس کا صحیح مقام دلایا۔ اسلام نے جو حقوق عورت کو عطا کیے ہیں اس کی مثال کسی مذہب و ملت میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی اسلامی معاشرے میں عورت کا بڑا احترام ہے اسلام نے عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی اور ہر حیثیت سے عزت اور عظمت بخشی اور اس کا مقام اتنا بلند کر دیا کہ اسلام سے پہلے اور بعد میں کسی مذہب اور معاشرے میں عورت کو ایسا شرف اور مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔

ماں کا درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: "جنت ماں کے قدموں تلے ہے" یعنی ماں کی خدمت کر کے انسان جنت کا حقدار بن سکتا ہے۔ ایک بار ایک صحابیؓ نے حضورؐ سے پوچھا: "یا رسول اللہؐ! مجھ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "تیری ماں کا۔" تین مرتبہ حضورؐ نے یہی فرمایا اور چوتھی بار باپ کا نام لیا۔

بہن کا درجہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی یعنی دودھ شریک بہن، حلیمہ سعدیہ کی بیٹی، آپ سے ملنے آئیں تو آپ نے ان کا اتنا احترام کیا کہ ان کے لئے اپنی چادر بچھا دی اور جب وہ واپس جانے لگیں تو ان کو بہت سے تحفے اور ہدیے دے کر رخصت کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب رضاعی بہن کا یہ مقام اور حق ہے تو حقیقی بہن کا حق تو اس سے فائق تر ہے۔

بیٹی کا درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹی کو خدا کی رحمت قرار دیا ہے۔ اسلام سے پہلے عورتوں کو وراثت کے حق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اسلام نے وراثت میں عورتوں کا باقاعدہ حصہ رکھا اور اس بات کی بھی تاکید کی کہ ان کو اچھی تعلیم و تربیت دیں۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"جس شخص نے دو لڑکیوں کی پرورش کی۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو وہ قیامت کے روز میرے ساتھ اس طرح ہو گا جس طرح انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی۔"

حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے رسول اکرمؐ کو اتنی محبت تھی کہ انہیں اپنے جگر کا ٹکڑا فرماتے جب وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آپؐ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ان کے لئے کبھی اپنی عبا اور کبھی اپنی چادر بچھا دیتے۔ ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے اور پیار کرتے۔ ان کی حضرت علیؓ سے شادی کے بعد ان سے ملنے کے لئے حضورؐ خود ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور ان کے گھر تحفے بھیجتے تھے۔

میاں بیوی کے رشتے کی نزاکت و اہمیّت خاندان معاشرتی زندگی کی پہلی کڑی ہے۔ اس کے اہم ارکان میاں بیوی ہیں، دونوں کے دلی تعاون پر شہریت کے امن و امان اور آئندہ نسلوں کی فلاح و بہبود کا دار و مدار ہے۔ اسلام نے اسی اہمیت کے پیشِ نظر اس رشتے کے احکام و قوانین تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے لباس ٹھہرایا ہے۔ اس مثال میں بڑی جامعیت ہے۔ جس طرح لباس بیک وقت زینت، پردے، سردی گرمی سے بچاؤ اور انسان کے لئے باعثِ افتخار ہوتا ہے۔ اس طرح رشتے کا معاملہ بھی ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے زینت ہیں۔ پردہ ہیں، راحت و آرام کا ذریعہ ہیں، بداخلاقی سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں اور معاشرتی زندگی کا پہلا گہوارہ ہونے

کی وجہ سے باعث فخر ہے۔ پھر ایک اور پہلو سے بھی دیکھئے جس طرح لباس بدن کے ساتھ لگا رہتا ہے اور دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ اسی طرح میاں بیوی کا حال بھی ہے دونوں کا قریب ترین تعلق ہے۔ مکمل اپنائیت اور لگاؤ ہے ایسا تعلق کہ دنیا میں اور کسی رشتہ دار سے بھی ایسا تعلق نہیں ہوتا۔ اسلامی قانون کی نگاہ میں دونوں مساوی ہیں دونوں ذمہ دار ہیں دونوں خدا کے حضور میں جوابدہ ہیں۔ دونوں کی جان کی قیمت ایک سی ہے۔ البتہ انتظام قائم رکھنے کے لئے مرد کو فوقیت حاصل ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ (البقرہ: ۲۲۸)

ترجمہ: "اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔"

ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۚ (النساء: ۳۴)

ترجمہ: "مرد عورتوں پر حاکم (نگران) ہیں۔ اس لئے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔"

ذیل میں دونوں میاں بیوی کے حقوق و فرائض بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ خاوند کے حقوق یا بیوی کے فرائض

۱۔ **اطاعت شعاری** بیوی کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے خاوند کی اطاعت شعار اور فرمانبردار ہو۔ وہ اپنے خاوند کا ہر جائز حکم بجا لائے اور اس کی نافرمانی اور سرکشی نہ کرے۔ قرآن مجید میں اطاعت شعار اور نیک بیویوں کی تعریف کی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ (النساء: ۳۴)

ترجمہ: "تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہے۔"

احادیث مبارکہ میں بھی بیوی کو اپنے خاوند کے احکامات اور مطالبات کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے چنانچہ حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کون سی عورت افضل ہے، فرمایا: جو مرد کے حکم کی تعمیل کرے اور اس کی ایسی بات میں مخالفت نہ کرے جو خاوند پر گراں گزرے۔ (النسائی)

عورت مرد کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے باہر نہ جائے، وہ مرد کے بغیر اس کے گھر سے کسی چیز کو صدقہ کے طور پر بھی خرچ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اس صدقہ کا ثواب تو مرد کو ہوگا اور گناہ عورت کو ہوگا۔ بخاری و مسلم کے مطابق رمضان کے فرض روزوں کے سوا عورت شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر ایک روزہ بھی نہیں رکھ سکتی۔

لیکن جب شوہر کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت سے ٹکرا جائے تو پھر اس کی اطاعت چھوڑ دی جائے گی۔ ارشاد نبویؐ ہے:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ (مسلم)

ترجمہ: "خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔"

پس اگر شوہر خدانخواستہ بیوی کو بدکاری، شراب نوشی، فحاشی و بے حیائی کا حکم دے یا فرض نماز روزے سے منع کرے تو اس کا فرض ہے کہ اس کے حکم اور مطالبے کو ٹھکرا دے۔ ہاں باقی جائز معاملات میں اس پر شوہر کی اطاعت لازم ہے۔

۲۔ مال و عزت کی حفاظت

عورت کے لئے لازم ہے کہ خاوند کی عدم موجودگی میں اس کے مال و عزت کی حفاظت کرے۔ اوپر کی آیت میں۔ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط یعنی اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی رہے۔" کا مفہوم یہی ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"جب کسی عورت کا خاوند باہر چلا جائے تو اس کے پیچھے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کے مال و اسباب کی نگرانی میں اس کی خیر خواہ اور وفادار رہے۔" (ابن ماجہ)

حضورؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:

"عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ تمہارے بچھونے میں کسی کو شریک نہ کریں اور فحش کام نہ کریں۔"

عورتوں کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے خاوند کی پوری طرح امانتدار ہو۔ اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جو شوہر کی ہو اور اس کی غیر موجودگی میں عورت کے پاس امانت کے طور پر

رہے۔ مثلاً مرد کے نسب کی حفاظت، اس کے بچے کی حفاظت (خواہ وہ پیٹ ہی میں ہو یا نہ ہو) اس کے مال کی حفاظت، اس کے بھید کی حفاظت اور اس کی عزت و آبرو (یعنی اپنی عصمت) کی حفاظت۔ عورت اگر ان چیزوں میں سے کسی کی حفاظت میں کوتاہی کرے گی تو سمجھا جائے گا کہ اس نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔

۳۔ شوہر کی خوشنودی

بلاشبہ وہ گھر روئے زمین پر بہشت و خلا کی تجلیاں اور بہاریں لئے ہوتا ہے جس میں شوہر اور بیوی صورت اور سیرت کی میزان میں پورے اترتے ہیں۔ عورت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کو راضی اور خوش رکھے۔ اسے ناراض نہ کرے اور اس کی خوشنودی کا خیال رکھے۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"تین آدمیوں کی نہ نماز قبول ہوتی ہے نہ قربانی۔ ان میں سے ایک وہ عورت ہے جس کا شوہر اس سے ناخوش ہو۔" (بیہقی)

نیز فرمایا: اگر میں خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدے کا حکم دیتا تو بیوی سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔" (ترمذی)

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

"تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ شوہر اس کو جو کہے، وہ مانے۔ جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کہ یہ کچھ کیے تو وہ اس کی قسم پوری کرے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کو اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔" (ابن ماجہ)

۴۔ شکر گزاری

عورت کے ذمہ یہ فریضہ بھی عائد کیا گیا ہے کہ وہ مرد کے احسان کی شکر گزاری کرے اور اگر مرد کسی مجبوری کی وجہ سے اس کے کسی ایک مطالبے کو پورا نہ کر سکے تو اس کی تمام خدمات اور احسانات پر پانی نہ پھیر دے۔

بخاری شریف میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبۂ عید میں عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے عورتوں کی جماعت! صدقہ کیا کرو، کیونکہ میں نے تمہیں دوزخ میں مردوں کی نسبت زیادہ تعداد میں دیکھا ہے۔" ایک ہوشیار اور تیز طرار عورت بول اٹھی کہ یا رسول اللہؐ! ایسا کیوں ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

"تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔"

ایک اور حدیث میں اس کی تشریح بھی حضورؐ نے فرمائی ہے کہ خاوند اگر عمر بھر تمہاری خدمت کرتا ہے۔ لیکن کسی وجہ سے تمہارا صرف ایک ہی مطالبہ پورا نہ کر سکے تو عمر بھر کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہو اور کہتی ہو کہ میں نے تم سے کبھی کوئی آرام پایا ہی نہیں !"

غرضیکہ میاں بیوی انسانی گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔ اگر یہ دونوں پہیئے اپنے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کریں تو انسانی زندگی کی گاڑی کامیابی سے رواں دواں رہتی ہے اور گھر کا ماحول جنت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

۵۔ مناسب بناؤ سنگھار

عورت کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے جسم اور لباس کو صاف ستھرا رکھے تاکہ اس کا شوہر اس سے خوش اور مطمئن رہے۔ بعض عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اور بلاوجہ اپنے جسم اور لباس کو گندا رکھتی ہیں اور صفائی ستھرائی کی طرف مناسب توجہ نہیں دیتیں جس کے نتیجے میں ان کے شوہروں کے دل ان سے بیزار اور اچاٹ ہو جاتے ہیں ۔ حدیث نبویؐ کے مطابق عورت کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لئے مناسب بناؤ سنگھار کرے تاکہ اس کے شوہر کی توجہ کسی اور طرف بھٹکنے نہ پائے۔

۶۔ طلاق کا حق

اگرچہ ارشاد نبویؐ کے مطابق حلال اور جائز کاموں میں سے طلاق اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ فعل ہے لیکن یہ ایک آخری چارہ کار ہے۔ جب ایسی نوبت آجائے تو بحالت مجبوری شوہر بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔

ب ۱۔ بیوی کے حقوق یا شوہر کے فرائض

۱۔ حسن سلوک

بیوی کا پہلا حق یہ ہے کہ خاوند اس سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ○ (النساء : ۱۹)

ترجمہ : اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔"

اس بات کی وضاحت نبی اکرمؐ کی ایک حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے:

"اپنی بیویوں میں کوئی برائی دیکھ کر ان سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤ، اگر تم غور کرو گے تو تمہیں ان میں کوئی اچھائی بھی ضرور نظر آئے گی"

ارشادِ نبویؐ ہے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيْ (ترمذی)

یعنی: "تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لئے بہتر ہو۔ اور میں اپنے اہل خانہ کے حق میں بہتر ہوں"

نیز فرمایا:

"تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں" (النسائی)

حضورؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا:

"لوگو! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو۔ وہ ایک شریک زندگی کی حیثیت سے تمہارے ساتھ ہیں اور اپنی ذات سے تمہارے گھر کی چیز کی مالک نہیں۔ تم نے کلماتِ الٰہی کے ذریعے سے انہیں اپنے اوپر حلال کیا ہے۔

۲۔ **حق مہر** مرد کا فرض کہ وہ خوشی سے عورت کا حق مہر ادا کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ○ (النساء: ۴)

ترجمہ: اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں تو اسے ذوق شوق سے کھا لو"

مرد اگر مہر کی ادائیگی میں لیں و پیش کرے تو عورت اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کر سکتی ہے اور اپنے نفس کو اس سے روک بھی سکتی ہے۔ عورت کو اختیار ہے کہ خوشی سے پورا مہر یا اس کا کوئی حصہ مرد کو معاف کر دے۔ لیکن اگر اس سے زبردستی ایسا کرایا گیا ہو تو وہ جب چاہے اس کا مطالبہ از سر نو کر سکتی ہے حق مہر کی ادائیگی کے احکام قرآن مجید کی کئی آیات میں دیئے گئے ہیں اس میں بڑی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں۔ سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ مرد عورتوں کے متعلق یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت نہیں ہے اور

یہ مفت میں ہمارے ہاتھ آگئی ہیں۔ مہر میں نکاح کے بعد جس طرح عورت کی رضا سے کمی یا معافی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح مرد کی رضامندی سے زیادتی بھی ہوسکتی ہے۔

۳۔ **نان ونفقہ** اسلامی قانونِ معاشرت میں مرد کی حیثیت نگران کی ہے، مال خرچ کرنا، گھر کی ضروریات مہیا کرنا اور بیوی کی تمام جائز حاجات کا پورا کرنا اس کا فرض ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۝ (البقرۃ : ۲۳۶)

ترجمہ: ہاں، ان کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق۔ نیک لوگوں پر یہ ایک طرح کا حق ہے۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

بِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۝ (النساء : ۳۴)

ترجمہ: (مرد اس لئے حاکم و نگران بنائے گئے ہیں) کیونکہ وہ اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

اس سلسلے میں ارشاد نبویؐ ہے:

"انسانی اعمال کے پلڑے میں جو چیز سب سے پہلے رکھی جائے گی، وہ اس کا اپنے کنبے پر کیا ہوا خرچ ہے۔" (مسلم)

اگر مرد اس فرض کو ادا کرنے سے کوتاہی کرے عورت اپنا حق قانون کے ذریعے حاصل کرسکتی ہے۔ جس کے واضح احکام اسلامی فقہ میں موجود ہیں۔ عورت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ مرد اس کا حق ادا نہیں کرتا تو اپنا حق مہر چھوڑ کر یا کچھ اس سے کم دبیش پر معاملہ کرکے مرد سے خلع یعنی علیٰحدگی حاصل کرلے لیکن اس میں قاضیٔ شرع کے فیصلے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر مرد نہ نان ونفقہ دے نہ خلع پر راضی ہو تو قاضی کو اختیار حاصل ہے کہ اپنی طرف سے نکاح منسوخ کردے۔

۴ **عدل ومساوات** اگر ایک ہی بیوی ہو تو اس کے ساتھ عدل وانصاف کرنا مرد کا فرض ہے۔ اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو، ان سب کے درمیان پورا پورا انصاف قائم رکھنا فرض ہے۔ اگر کسی شخص کو عدل نہ کرسکنے کا خطرہ ہے تو وہ دوسری شادی ہرگز نہ کرے۔ کیونکہ شادی محض عیش وعشرت کا نام نہیں۔ یہ ایک بہت بڑی معاشرتی ذمہ داری ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ نکاح کرتا ہے اور کسی ایک ہی

بیوی کا ہو رہتا ہے اور دوسری کے حقوق ادا نہیں کرتا، قرآن اسے ظالم قرار دیتا ہے:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا۟ أَن تَعْدِلُوا۟ بَيْنَ ٱلنِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۖ فَلَا تَمِيلُوا۟ كُلَّ ٱلْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَٱلْمُعَلَّقَةِ ۚ (النساء: ۱۲۹)

ترجمہ: اور تم خواہ کتنا ہی چاہو، عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کر سکو گے، تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی کی طرف ڈھل جاؤ اور دوسری کو (ایسی حالت میں) چھوڑ دو کہ گویا ادھر میں لٹک رہی ہے (یعنی نہ آسمان پہ ہے نہ زمین پر)

دوسرے نکاح کے لئے عدل کی شرط عائد کی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ فَوَٰحِدَةً (النساء: ۳)

ترجمہ: اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے)

ارشاد نبوی ہے کہ:

• ایسا شخص جس کی ایک سے زائد بیویاں تھیں اور اس نے ایک کی طرف جھک کر دوسری کی حق تلفی کی تھی، میدانِ محشر میں فالج زدہ اٹھایا جائے گا کہ جسم کا آدھا حصہ بے کار ہوگا۔

واضح رہے کہ یہاں عدل و مساوات سے مراد ظاہری اور معاشرتی عدل ہے۔ قلبی عدل نہیں۔ کیونکہ دل پر انسان کا اختیار نہیں۔ ہاں۔ باقی امور خوراک، لباس، رہائش اور ظاہری سلوک میں عدل ضروری ہے۔ ایک بزرگ کے بارے میں روایت ہے کہ ان کی ایک سے زائد بیویاں تھیں۔ انہوں نے گھر میں ایک ترازو اور ایک گز رکھا ہوا تھا۔ اگر کوئی پھل یا کھانے پینے کی چیز ہوتی تو ترازو میں تول کر برابر برابر بیویوں میں بانٹتے اور اگر کپڑا ہوتا تو گز سے برابر ناپ کر تقسیم کرتے تھے۔

۵۔ ظلم و زیادتی سے پرہیز

مرد کو چاہیئے کہ وہ بیوی سے محبت و شفقت کا برتاؤ کرے۔ مرد کا فرض ہے کہ حاکم و نگران ہونے کی حیثیت سے اسے جو اختیارات حاصل ہیں مثلاً طلاق اور تادیب ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ ان کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ بعض عورت کو ستانے کی خاطر اسے لٹکائے نہ رکھے بلکہ اگر شریفانہ طور پر بسانا نہیں چاہتا تو اسے احسان کے ساتھ طلاق دے کر فارغ کر دے۔ اور اس کا حق مہر اس کے حوالے کر دے۔ اگر ایک دفعہ طلاق دے کر پھر جب عدت گزرنے پر آئے تو رجوع کر لے اور پھر طلاق دے دے تو یہ صورت حرام ہوگی لیکن وہ دو مرتبہ ہی ایسا

کر سکے گا۔ اگر تیسری مرتبہ کرے گا تو خود بخود عورت ہمیشہ کے لئے فارغ ہو جائے گی۔
شریعت کی رو سے اگر عورت ناحق ضد کرے یا کوئی بڑی غلطی کرے اسے ہلکی مار مارنے کی اجازت ہے۔ پھر انسان اس پر الزام لگانے کے لئے بہانے نہ ڈھونڈے اور نہ اس کے چہرے پر مارے۔ ارشاد نبویؐ ہے۔
"عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھاپن کے ساتھ تم کام لے سکتے ہو۔ اگر اس کو سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے"۔

عورتوں کو جسمانی یا روحانی تکلیف پہنچانا، مارنا پیٹنا، گالیاں بکنا یا ذہنی اذیت پہنچانے کے کوئی اور طریقے اختیار کرنا ناجائز ہیں۔ اگر کبھی جائز نصیحت یا تادیب کی غرض سے کوئی سخت کلمہ زبان سے نکل جائے تو خیر ہے۔ لیکن اس سے آگے بڑھنا اور صنف نازک پر زور آزمائی کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ اسی طرح عورت کو ہر وقت ذلیل کرنے کی کوشش میں رہنا اسے جہالت کے نتیجہ میں پاؤں کی جوتی سمجھنا، اسے نیچا دکھانے اور رعب جمانے کے لئے ناجائز حربے اختیار کرنا، اس کے والدین کی توہین کرنا اور اس کے رشتہ داروں سے بدسلوکی کرنا یہ سب صورتیں اسلام نے حرام قرار دی ہیں۔ اس سے خانگی زندگی دوزخ کا نمونہ بن کر رہ جاتی ہے اور خاندانی و معاشرتی زندگی کے عظیم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔ آدمی کے حسنِ تدبر اور خوش تدبیری سے گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:
"تم میں سے بہترین لوگ وہی ہیں جو اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کریں اور میں اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کرتا ہوں"۔

۶۔ دینی و اخلاقی تربیت

شوہر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی اور دیگر اہلِ خانہ کی دینی و اخلاقی تربیت کا بھی اہتمام کرے۔ اسے خدا کے سامنے اس بات کے لئے جوابدہ ہونا پڑے گا کہ اس نے کہاں تک اپنے بیوی بچوں کو دین و اخلاق کی راہ پر لگایا۔ ارشادِ ربانی ہے:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ۝ (التحریم: ۶)

ترجمہ: اپنے آپ کو اور اپنے اہلِ خانہ کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ"۔
پھر قرآن نے ہمیں دعا سکھائی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ۝ (الفرقان: ۷۴)

ترجمہ: اور جو (خدا سے) دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

اسلامی نظام تعلیم

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

ترجمہ: فرما دیجئے! اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما

سوال: اسلامی معاشرہ میں تعلیم کی نوعیت واہمیت پر روشنی ڈالیے، نیز مقاصد تعلیم واضح کیجئے۔

جواب:

علم کی فضیلت

(۱)

قرآن کی روشنی میں

علم کی بڑائی، فضیلت اور عظمت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت "علیم" بھی ہے اور وہ عالم الغیب والشہادۃ" ہے اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر جو فضیلت دی تھی وہ علم ہی کی بدولت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے علم میں اضافے کی دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

یعنی: کہو، اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔

۲۔ اللہ کے نزدیک عالم اور جاہل برابر نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ (الزمر: ۹)

ترجمہ: کہہ دیجئے! کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں لوگوں کا مرتبہ ایمان اور علم سے بلند ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ (المجادلۃ: ۱۱)

ترجمہ: اللہ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے درجات بلند فرماتا ہے۔

۴۔ اللہ کا خوف اور تقویٰ صحیح علم سے پیدا ہوتا ہے، فرمایا:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر: ۲۸)

ترجمہ: بے شک اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحبِ علم ہیں۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم والوں کی گواہی کا تیسرا نمبر ہے، فرمایا:

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ

ترجمہ: اس بات پر کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، خود اللہ گواہ ہے، اس کے فرشتے گواہ ہیں اور اہل علم گواہ ہیں۔

۶۔ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتیازی وصف ہی تعلیم و تربیت بتایا گیا ہے۔

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (البقرۃ: ۱۵۱)

ترجمہ: اور وہ تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور اس بات کی تعلیم دیتے ہیں، جسے تم نہیں جانتے۔

علم کی فضیلت، حدیث کی روشنی میں

جناب رسالت مآب ﷺ نے علم کی فضیلت میں بہت کچھ فرمایا ہے۔ ذیل میں چند احادیث مبارکہ پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ (ابن ماجہ)

ترجمہ: علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

۲۔ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: علماء نبیوں کے وارث ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی چاہتا ہے، اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

۴۔ جو شخص علم حاصل کرنے کی راہ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کو جانے کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

۵۔ جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے نکلے، وہ اپنے گھر میں واپسی تک جہاد میں رہتا ہے۔ (ترمذی)

۶۔ مہد (پنگوڑے) سے لحد (قبر) تک علم حاصل کرو۔

۷۔ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

یعنی بے شک مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

۸۔ آدمی جب مر جائے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے لیکن تین عمل جاری رہتے ہیں۔ ایک صدقۂ جاریہ۔ دوسرے کوئی علم جس سے لوگوں کو فائدہ ہو اور تیسرے نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔ (مسلم)

۹۔ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی چاند کی فضیلت باقی ستاروں پر ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی)

۱۰۔ میرے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہو گا، جو علم کو سیکھے اور پھیلائے گا۔

علم کا مفہوم و اہمیت

انسان کو حواس خمسہ کے ذریعے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ علم کہلاتی ہیں۔ علم ایک معاشرتی اور تاریخی عمل ہے جس کے ذریعے ہر فرد اپنی معاشرتی، تہذیبی، تمدنی اقدار و روایات، علوم و فنون، افکار و نظریات اور اعتقادات سے آگاہ ہو کر معاشرہ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتا ہے اور اسے آنے والی نسل کو منتقل کرتا ہے۔

یہ شرف و افتخار صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو علم کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ نیز اس نے علم و تعلم کے دروازے ہر امیر و غریب مرد و عورت اور چھوٹے بڑے پر یکساں کھول دیئے۔ بلکہ حصولِ علم ہر مسلمان کے لیے لازم قرار دیا اور اسلامی ریاست کے فرائض میں مفت لازمی اور عوامی تعلیم کی سہولیات لازمی ٹھہرائیں۔ اوپر قرآن و حدیث کی روشنی میں علم کی فضیلت بیان کی جا چکی ہے۔

علم کی ضرورت و افادیت

غور سے دیکھا جائے تو دنیا کا سارا نظام علم پر قائم ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اور قوم دنیا و آخرت کی ترقی و سربلندی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ دنیا کی تمام معاشی، معاشرتی تہذیبی اور سیاسی فتوحات علم کے بل پر ہیں۔ زندہ قومیں علوم و فنون کے ذریعے دنیا کی رہنمائی و حکمرانی کرتی ہیں اور باقی سب لوگ ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ ہر قسم کی سربلندیاں اور رفعتیں علم ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ علم سے بحر و بر پر قبضہ ہوتا ہے۔ علم سے بجلی اور فضا

پر تسلط قائم ہوتا ہے۔ آج دنیا کی ساری مادی ترقیاں علم ہی کی بدولت ہیں۔ علم چاہے کوئی ہو، بذاتِ خود بُرا نہیں۔ ہاں اس کا استعمال اسے غلط بنا سکتا ہے۔ علم ایک ہتھیار ہے۔ اگر یہ شریف آدمی کے پاس ہوگا تو وہ اس سے اپنی، اپنے اہل وعیال معاشرے اور انسانیت کی جان ومال اور عزت کی حفاظت وخدمت بجالائے گا۔ اگر شریر کے قبضے میں ہوگا تو وہ لوگوں کی زندگی اجیرن کردے گا اور دنیا میں فتنہ وفساد برپا کر دے گا۔

جو پایہ علم سے پایا بشر نے — فرشتوں نے بھی وہ پایہ نہ پایا

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جاتے (اقبالؔ)

اسلامی احکام وہدایات

اسلام نے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق واضح احکام دیئے ہیں۔ ہر مسلمان کو بقدرِ ضرورت یہ احکام معلوم ہونے چاہئیں۔ پھر ہر فن اور پیشہ والے کو اپنے فن اور پیشہ کے گہرے علم کے ساتھ ساتھ اس پیشہ کے متعلق اسلامی احکام وہدایات کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ تاجروں اور صنعتکاروں کو حلال وحرام کا وسیع علم ہونا ضروری ہے تاکہ وہ حلال کو حاصل کرسکیں اور حرام سے بچ سکیں۔ ایک قانون دان کو اسلامی قوانین سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ ایک کامیاب حکمران وہ ہے جو علم وحکمت سے بہرہ ور ہے۔

امام غزالیؒ کا نظریہ

امام غزالیؒ کے نظریے کے مطابق سب مسلمانوں کیلئے ضروری ابتدائی فرائض کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے۔ لیکن ہر بستی میں کم از کم ایک ایسا عالم دین ہونا چاہیئے جو اسلامی علوم وفنون کا ماہر ہو، تاکہ لوگ مشکلات میں اس سے رہنمائی حاصل کرسکیں اور یہ ضرورت بالکل ایسی ہے، جیسی ڈاکٹر اور طبیب کی ضرورت ہے، بڑھئی اور لوہار کی ضرورت، معمار اور مزدور کی ضرورت اور اس طرح زندگی کی سب ضروریات کے ماہرین کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ اگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو تو سب گنہگار رہوں گے۔

مسلمان علوم وفنون کے بانی وامام

اسلام ایک علمی ضابطۂ زندگی ہے اس میں قدم قدم پر علم کی ضرورت پڑتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو سب سے پہلی وحی اتری تھی۔ اس

کا سب سے پہلا لفظ ہی اِقْرَأْ تھا یعنی پڑھو۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اسلام دنیا کو علم سکھانے اور پڑھنے لکھنے کا پیغام دینے آیا تھا، حضور اکرم ﷺ نے اپنے مبارک دور میں صحابہ کرامؓ کی تعلیم و تربیت کا بہترین عملی نظام قائم فرمایا، جس کے نتیجہ میں یہ حضرات علم و حکمت کے شیدائی و علمبردار بن گئے، ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"حکمت و دانائی کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے، وہ اسے جہاں بھی پالے، اس کا زیادہ حق دار ہے۔"

اسلام کے اسی حیات افروز پیغام کے نتیجہ میں عرب جیسی ان پڑھ اور جاہل قوم دیکھتے ہی دیکھتے علم و فضل میں ساری دنیا کی سردار بن گئی۔ انہوں نے علوم و فنون میں فتوحات کے نئے نئے گوشے نکالے اور نئی نئی راہیں نکالیں۔ خالص شرعی و دینی علوم کے علاوہ یونانیوں کے نیم مردہ علوم میں ازسرِ نو جان ڈالی۔ تاریخ، جغرافیہ، ہئیت، منطق و فلسفہ، ادب و شعر، علم طلب، علمِ نجوم، ریاضی اور سائنس غرض سبھی علوم کو ازسرِ نو مرتب کیا۔ نئی نئی تحقیقات کیں۔ کئی علوم ایسے تھے جن کی ایجاد انہوں نے کی۔ مثلاً جبر و مقابلہ والجبرا، خطاطی وغیرہ اہلِ یورپ نے یہ علوم و فنون مسلمانوں سے سیکھے، ان پر تحقیق کی اور انہیں فروغ دیا۔

بقول مولانا الطاف حسین حالیؒ ؎

ارسطو کے مُردہ فنوں کو جِلا دیا ❊ فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یُونان بنایا ❊ مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا بر طرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانے کو خوابِ گراں سے

(مسدس حالیؒ)

مقاصد تعلیم

۱۔ نظریہ حیات کا فروغ

اسلامی نظام تعلیم کا اولیں مقصد صحیح نظریہ حیات کو اپنانا اور اسے فروغ دینا ہے۔ اسلام سب سے پہلے نظریۂ عقیدہ اور ایمان پر زور دیتا ہے۔ یعنی انسان کو اس بات کا شعور و ادراک ہونا چاہیئے کہ کائنات میں اس کی حیثیت و مقام کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے

یہ کائنات کس مقصد کی تکمیل کی خاطر پیدا کی ہے۔ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ و نائب ہے۔ اس کی نجات اور فلاح و کامرانی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرے جو حضرات انبیائے کرام ؑ کے ذریعے وضع کیا گیا ہے اور بالخصوص نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بتاتے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرے۔ ہماری دنیا و آخرت کی کامیابی اسی حقیقت میں مضمر ہے۔ ہمارے نظریات و عقائد اسی فکر اور سوچ کے مطابق ہوتے چاہئیں جس کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ اس زندگی اور آخرت کے بارے میں اسلام نے واضح الفاظ میں ہدایت و رہنمائی کے اصول و نظریات پیش کئے ہیں۔ ہمارے افکار اور اعمال انہی اصول و نظریات کے سانچے میں ڈھلنے چاہئیں۔

؎ زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (اقبال)

۲۔ سیرت و اخلاق کی تعمیر

اسلامی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ افراد کے اخلاق و سیرت کو بلند کیا جائے۔ ان میں اچھائیوں کو ابھارا جائے اور برائیوں کو مٹایا جائے۔ ہر شخص میں نیکی اور برائی میں امتیاز پیدا کر کے سیدھے راستے کو منتخب کرنے کا احساس پیدا کیا جائے۔ افراد کی اخلاقی کمزوریوں کو دور کیا جائے۔ زیر تعلیم طلبہ میں یہ احساس زندہ کر دیا جائے کہ وہ ہر اچھی چیز کو اپنا سکیں اور برائی سے نفرت کریں۔ صرف کتابوں کا پڑھنا پڑھانا ہی مقصد نہیں ہے، بلکہ اصل اہمیت اخلاق و کردار کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرائض رسالت میں سے ایک یہ بتایا ہے:

وَيُزَكِّيهِمْ

یعنی "اور پیغمبر ان کا تزکیۂ نفس کرتے یعنی انہیں اخلاقی لحاظ سے پاک و صاف کر دیتے ہیں۔"

۳۔ جذبہ عمل پیدا کرنا

علم پر جب تک عمل نہ کیا جائے، وہ بیکار ہے اور جس علم کو برے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے وہ وبالِ جان ہے۔ ارشادِ نبوی ؐ ہے:

"جو علم فائدہ نہ دے اس سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔"

"قیامت کے روز سخت ترین عذاب اس عالم کو ہو گا، جو اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور جس کے علم سے دوسرے فائدہ نہیں اٹھاتے۔"

ایک اور حدیث کے مطابق:

"آدمی اس وقت تک عالم نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے علم پر عمل نہ کرے۔" (بیہقی)

بے عمل عالم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس گدھے سے تشبیہ دی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ (الجمعہ: ۵)

ترجمہ: جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی، پھر انہوں نے اس (کے بار تعمیل) کو نہ اٹھایا، ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔

۴۔ معاشرے کیلئے بہترین افراد تیار کرنا

تمدنی زندگی میں گونا گوں قابلیتوں اور صلاحیتوں کے افراد درکار ہوتے ہیں۔ تاجر، صنعت کار، ادیب، قانون دان، ڈاکٹر، سائنس دان، مفسر، محدث، فقیہہ، سیاستدان، حکمران وغیرہ۔ اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ان سب قسم کے افراد کو ایک ہی لگن لگا دی جائے اور اجتماعی فلاح و بہبود کا ایک ہی جذبہ ان میں پیدا کر دیا جائے۔ یہ سب اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اجتماعی سربلندی و سرفرازی کے لیے مل کر کام کریں۔ ان سب میں اسلامی کردار کی عظمت پائی جائے۔ اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی ذہنیت اجاگر ہو۔ وہ بلند ترین مقاصد کے لیے جینا اور مرنا سیکھیں ان کا کردار ٹھوس اور سیرت قابلِ اعتماد ہو۔ ان میں باہمی تعاون کا جذبہ ہو تاکہ سب مل کر اسلامی معاشرے میں ایک عالمگیر اصلاحی انقلاب لا سکیں۔ بقول علامہ اقبالؒ

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

۵۔ حقیقت کی تلاش و جستجو

اسلامی نظام تعلیم اپنے طلبہ میں حقیقت کی پیاس اور اس کی تلاش و جستجو کا جذبہ پیدا کرتا ہے اوپرے اور سطحی علم کا قائل نہیں۔ بلکہ وہ گہرائی میں جا کر حقیقت کو آشکار کرتا

چاہتا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار غور و فکر، تدبر و تفکر اور عقل و شعور سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ ایک طالب علم سے یہ توقع رکھتا ہے کہ جو کچھ پڑھے، اس کی گہرائی میں اترے اور جو کچھ سیکھے، اس پر پوری آمادگی سے عمل بھی کرے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں   اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

۶ اپنی پہچان

اسلامی نظام تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اپنی معرفت حاصل کریں، اپنی خودی کو پالیں، اپنی قابلیتوں، نااہلیوں، بلندیوں اور پستیوں غرض ہر قسم کی اہلیت سے آشنا ہو جائیں تاکہ کارزارِ حیات میں پوری بصیرت اور ضروری اسلحہ سے لیس ہو کر اتریں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو فطری جوہر رکھے ہیں، تعلیم و تربیت ان کو اجاگر کر دیتی ہے۔ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انسان عظیم کارنامے سرانجام دیتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم یہی فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ ورنہ معاشرے کے کئی جوہر قابل مناسب ماحول اور تعلیم و تربیت نہ ملنے کے باعث ضائع ہو جاتے ہیں۔

ارشاد نبویؐ ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

یعنی: "جو اپنے آپ کو پہچان لے، وہ اپنے رب کو بھی پہچان لے گا۔"

بقول علامہ اقبالؒ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

۷۔ علم کی نشر و اشاعت

اسلامی نظام تعلیم کا یہ بھی ایک مقصد ہے کہ علم کو عام کیا جائے۔ گھر گھر میں اسے پھیلایا جائے اور اس کے نفع سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفید کیا جائے۔ قرآن و حدیث میں پڑھنے پڑھانے، سیکھنے اور سکھانے دونوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جہالت کے خلاف جہاد کرنا اور خلق خدا کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ ہر پڑھا لکھا شخص ایک حد تک معلم ہے۔ لیکن ایک طبقہ خاص طور پر صرف اس غرض کے لیے تیار کیا جانا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد ہی علم کی نشر و اشاعت کو قرار دے لیں اور اس کے لیے زندگی بھر جدو جہد کرتے رہیں۔ جدید زبان و اصطلاح میں اسلام لازمی، مفت اور عمومی تعلیم کا حامی و علمبردار

ہے۔ نیز اسلامی نظامِ تعلیم میں امیر و غریب، گورے کالے اور عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے

۸۔ تعلیم نسواں

اسلام نے عورت کو زندگی میں اہم مرتبہ و مقام عطا کیا ہے۔ دنیا کے کسی مذہب و ملت میں عورت کی اتنی عزت افزائی نہیں کی گئی جتنی اسلام میں۔ اسے مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ البتہ ایک لحاظ سے مردوں کو برتری حاصل ہے۔ مرد و عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں اور ظاہر ہے گاڑی اسی صورت میں صحیح طور پر رواں دواں ہو گی جبکہ اس کے دونوں پہیے ٹھیک کام کریں گے عورت اپنی قابلیت و صلاحیت کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ البتہ اس کے لیے تربیت دیا گیا نصاب تعلیم اور نظامِ تعلیم مردوں سے مختلف ہو گا، کیونکہ زندگی میں اسکی ذمہ داریاں مرد سے مختلف ہیں۔ ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت (اقبال)

۹۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی تعلیم

اسلام اور سائنس کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ سائنسی تحقیق اسلام کی حقانیت کو اجاگر و واضح کرتی ہے۔ اسلام قوتِ مشاہدہ سے کام لیکر تسخیر کائنات کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں واضح بیان ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسے انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اسے چاہیئے کہ ان پر غور کرے۔ تحقیق و تفتیش کرے اور نئی نئی ایجادات سے انسانیت کی بھلائی کا سامان فراہم کرے۔ آج دنیا میں وہی قومیں سرخرو اور حکمران ہیں، جنہوں نے سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش قدمی کی ہے۔ مسلمان مختلف سائنسی علوم و فنون کے بانی و امام رہے ہیں لیکن آج یہ اعزاز اہلِ مغرب کو حاصل ہے۔ ہمیں نہ صرف جدید سائنس و ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کرنا ہے بلکہ اسے مزید فروغ دے کر امامت کا منصب پھر سے حاصل کرنا ہے۔ ؎

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے (اقبالؒ)

مکتب کی اہمیّت

يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (البقرة: ۱۵۱)

ترجمہ: پیغمبر تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

سوال: مکتب سے کیا مراد ہے؟ نیز اسلامی معاشرہ میں اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالیے؟

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روحِ انسانی (اقبالؒ)

جواب: (ا) **مکتب کا مفہوم** مکتب کے لفظی معنی لکھنے کی جگہ ہے۔ محاورے میں یہ لفظ مدرسے پر بولا جاتا ہے، جو پڑھنے لکھنے کی جگہ ہے۔ عوامی محاورے میں مکتب بالکل ابتدائی تعلیم گاہ کو کہتے ہیں، مثلاً وہ درس گاہیں جن کا رواج اسلام نے مسجدوں میں ڈالا تھا کہ ہر مسجد ایک درس گاہ ہوتی ہے۔ لیکن مکتب کا مفہوم اس سے وسیع ہے اور اس سے مراد ہے ہر وہ ادارہ جو ہمارے معاشرے میں تعلیم وتربیت اور اصلاح واخلاق کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس تعریف کی رو سے قدیم وجدید ہر قسم کے مدرسے، دارالعلوم، جامعے، سکول، کالج اور یونیورسٹیاں مکتب کے دائرے میں داخل ہیں۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی (اقبالؒ)

ب۔ **مکتب کی اہمیت** مکتب ہماری زندگی کی سب سے اہم ضرورت یعنی تعلیم وتربیت کا مرکز ہے۔ ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ ہے اس سے نکل کر بچہ سیدھا مکتب میں پہنچتا ہے۔ ہر قوم وملت نے ہر زمانے میں تعلیم گاہ کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا مناسب انتظام کیا ہے۔ تعلیم انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہے اور اس کا انتظام کرنا ریاست وحکومت کے ذمہ ایک ضروری فرض ہے۔ زندگی کی دوڑ میں کوئی فرد یا قوم درسگاہ کے بغیر اپنے مقاصد پورا نہیں کرسکتی۔ بالخصوص آج کل کی شہریت وسیاست میں تو ریاست ایک ہمہ گیر ادارہ ہے، جو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے اور شہریوں کی ہر ضرورت اس کے ذمہ ہے۔ کوئی حکومت اس فرض

سے غافل ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جو قوم تعلیم کے میدان میں پیچھے ہو گی، وہ دنیوی زندگی کی دوڑ میں قدم قدم پر ناکامیوں سے دوچار ہو گی۔ جو فرد تعلیم میں پیچھے رہ جائے گا، وہ معاشرے میں تیسرے درجے کا شہری بن کر رہ جائے گا۔

اسلام چونکہ اپنے پیروکاروں کو دنیا کے ہر میدان میں اعلیٰ و برتر بن کر رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی نگاہ میں علم و فن کی درس گاہوں کی شدید ضرورت ہے۔ اس پیہم بدلتی ہوئی دنیا میں مسلمانوں کو ان کا مقام اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ وہ تعلیم کے ہر شعبے میں دوسروں سے آگے بڑھ جائیں اور بہترین امت ہونے کی ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ کائنات میں نیکی اور صداقت، اخلاق و کردار اور تقویٰ و طہارت کا بول بالا کریں۔ انہیں سائنس کے ہر شعبے میں اعلیٰ درس گاہیں قائم کرنی چاہئیں۔ زراعت، تجارت، سیاست، فلسفہ، ادب، آرٹ، عمرانی علوم اور خالص شرعی علوم مثلاً قرآن و حدیث عربی زبان اور فقہ و عقائد کے لیے جدید ترین طرز پر درس گاہیں کھولنا ان کے دینی فرائض میں شامل ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو دوسرے یہ کام کرلیں گے اور ہر میدان میں ہمیں دھکیل کر آخر کار ہماری آزادی پر بھی چھاپہ ماریں گے۔

اٹھو، وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی ۔۔۔ دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مکتب تاریخ کے آئینہ میں

۱۔ عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعلیم اور تعلیمی درس گاہ کا اتنا شدید احساس تھا کہ ہجرت کے بعد جو کام سب سے پہلے حضورؐ نے سرانجام دیئے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مسلم طلبہ کی تعلیم کے لیے اپنے مدرسے قائم کیے اور ان میں اپنی تہذیب و تمدن اور عقائد و نظریات کے مطابق مسلم استاد رکھے۔ حضورؐ نے مسجد نبویؐ اور اپنے حجرہ کے متصل ہی ایک مکتب بنایا جو "درس گاہِ صفہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ صفہ صحابہ کرامؓ کی تعلیم و تربیت کا اولین مرکز تھا اس مدرسہ اور درس گاہ کی نگرانی آنحضورؐ بہ نفسِ نفیس فرماتے تھے۔ وہ تمام صحابہ جنہوں نے احادیث روایت کی ہیں، وہ سب کے سب اسی درسگاہِ نبویؐ کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھے۔ اس مدرسۂ نبویؐ کا آغاز قرآن مجید، حکمتِ نبویؐ، دینی معلومات اور کتابت و قرآت سکھانے سے ہوتا تھا۔ اس مکتب نبویؐ میں جلیل القدر صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد حصولِ علم کے لیے موجود

رہتی اور وہ جو کچھ یہاں سیکھتے، اس کی عملی تربیت بھی حاصل کرتے، یہی تربیت یافتہ حضرات ملک کے مختلف علاقوں میں تبلیغ واشاعت اسلام کے لیے بھیجے جاتے۔ ان مدرسوں کی عظمت کا کیا ٹھکانہ ہے، جن سے تعلیم پاکر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ جیسے بلند پایہ حضرات نکلے۔ حضورؐ نے درسگاہوں کا یہ سلسلہ مدینہ منورہ سے شروع کر کے اسلامی سلطنت کی حدود کے آخری کونوں تک پھیلا دیا تھا۔ جب کوئی علاقہ اسلام لے آتا تو پہلا کام یہی ہوتا تھا کہ وہاں عبادت گاہوں اور تعلیم گاہوں کا انتظام کیا جائے۔ اس نظام کی نگرانی خود حضورؐ براہِ راست فرماتے تھے۔ بڑے بڑے فاضل لوگ انہی درس گاہوں سے تعلیم پاکر دنیا میں امام کہلائے۔

۲۔ خلافتِ راشدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ کے مبارک دور میں اسلامی ریاست کی حدود کے ساتھ ساتھ درس گاہوں کے نظام کا سلسلہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ مکہ، مدینہ، طائف اور یمن کے علاوہ کوفہ، بصرہ، واسط، اسکندریہ، دمشق، خراسان وغیرہ اسلامی تعلیم کے مراکز تھے پہلے تین خلفائے راشدینؓ نے بالعموم اور فاروقِ اعظمؓ نے بالخصوص اپنی توجہ ملت کی تعلیمی ترقی اور دینی تربیت پر مرکوز رکھی۔ ہر بڑے شہر میں اسلامی ریاست کی طرف سے مکاتب کھولے گئے۔ ہر جگہ دینی مدارس کی بنیاد رکھی گئی اور ان مکاتب میں تنخواہ پر لائق استاد مقرر کیے گئے۔

۳۔ بنو امیہ

خاندان بنو امیہ کے دور کے متعدد خلفاء و حکمران خود عالم اور علماء کے قدردان تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتبِ وحی تھے اور علم و فضل میں بلند مقام رکھتے تھے۔ انہی کے زمانہ میں تاریخ نویسی کا فن ایجاد ہوا۔ ان کے پوتے خالد کو علمِ کیمیا اور طب کا شوق تھا۔ اس زمانے میں کئی نامور فقیہ امام، محدث اور مفسرین پیدا ہوئے جن میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ صرف علوم کی حد تک ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے فاتح، سپہ سالار، سیاستدان، ادیب، مصنف اور نئے نئے علوم و فنون کے موجد بھی انہی درسگاہوں نے پیدا کیے۔

بنو عباس

بنو عباس کے بیشتر خلفاء و حکمران خود علماء اور علماء کے مربی و سرپرست تھے۔ اس عہد میں نہ صرف علم و فن نے قابلِ قدر ترقی کی بلکہ اس

دور کو علم وعرفان کا سنہری زمانہ کہا جاتا ہے۔ گو بنو عباس کے ہر خلیفہ نے علم دوستی اور علم پروری کا ثبوت دیا مگر ہارون الرشید اور مامون الرشید نے اسے اوجِ کمال تک پہنچایا۔ یونانی، فارسی اور سنسکرت زبان کی کتب کے ترجمے ہوئے۔ جس کتاب کا ترجمہ کیا جاتا، اس کے مترجم کو اس کتاب کے برابر سونا دیا جاتا۔ یوں مروجہ علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ برامکہ جو عباسی خلفاء کے مشہور وزراء تھے علم دوستی میں بے مثل تھے۔ انہوں نے مکاتب اور دیگر تعلیمی درس گاہوں کے فروغ میں کافی سرگرمی دکھائی۔ اس طرح اسلامی سلطنت میں بکثرت مکاتب قائم ہو گئے، جن کی بدولت تعلیم عام ہو گئی۔ تفسیر، حدیث فقہ، منطق، صرف نحو اور سائنسی علوم پر کثیر کتب تحریر کی گئیں اور عوام الناس کو علم کی روشنی سے روشناس کرایا گیا اور ہر جگہ علم وعرفان کے چشمے جاری ہو گئے۔ سائنس اور ریاضی کے ہر شاخ میں امامت کا درجہ رکھنے والے لوگ انہی درس گاہوں نے پیدا کئے۔ فارابی، ابن سینا، الکندی، عمر خیام، ابن رشد اور دوسرے بے شمار ایسے لوگ منظرِ عام پر آئے، جنہوں نے اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ دیتے اور مشرق ومغرب نے ان کو امام اور پیشوا تسلیم کیا۔ امام غزالیؒ نے علوم وفنون کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا، احیائے علوم اور کیمیا سعادت ان کی شہرہ آفاق کتب ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ جیسے بالغ نظر امام خود سرزمین پاک وہند کے ایسے ہی مکاتب کی پیداوار تھے۔

۵۔ سلجوقی دور

سلجوقیوں کے عہد میں نظام الملک طوسی جیسے نامور عالم فاضل نے باقاعدہ اور منظم مدارس کی بنیاد ڈالی، انہیں مدارس نظامیہ کہا جاتا ہے اور درس نظامی کو آج بھی مستند گردانا جاتا ہے۔ ان مدارس نے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی۔ ان مدارس کے ساتھ کتب خانے بھی ہوتے تھے اور ان مدارسوں کے تعلیمی وملی اخراجات کے لیے باقاعدہ جاگیریں وقف کی تھیں تاکہ وہ بآسانی اشاعتِ تعلیم کا کام کر سکیں۔ الغرض تاریخ اسلامی نظامِ تعلیم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے ہر دور میں مکتب و مدرسہ کو ایک اہم مقام اور ممتاز درجہ حاصل رہا ہے۔ ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ (اقبالؒ)

کلامِ حالی

ابوبکر رازی علی ابنِ عیسیٰ	حکیم گرامی حسین ابنِ سینا
حنین ابنِ اسحٰق قسبیس دانا	ضیا ابنِ بیطار راس الاطبّا

انہیں کے ہیں مشرق میں سب نام لیوا
انہیں سے ہوا پار مغرب کا کھیوا (مسدس حالیؔ)

مکتب کی افادیت

مکتب ہماری تمدنی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ ذیل میں ان اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ان اثرات سے اس کی افادیت ظاہر ہے۔

۱۔ انفرادی اصلاح

مکتب افراد میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کا مادہ اور شوق ہر شخص میں موجود ہے اس کے لیے استاد کا وجود لازمی ہے۔ استاد کی رہنمائی میں نظامِ تعلیم رفتہ رفتہ طالب علم کو آگے بڑھاتا ہے اور اسے نت نئی علمی ترقیوں کے لیے تیار کرتا ہے۔ کتابی علم کے ساتھ ساتھ انسانی ذہنی، قلبی اور روحانی اصلاح بھی ہوتی ہے۔ اس کے اخلاق سنورتے ہیں، اس کے سیرت و کردار کی اصلاح ہوتی ہے۔ مکتب میں وہ اپنے اساتذہ کی عادات و اطوار کا مطالعہ کرتا ہے۔ اچھی عادات کو اختیار کرتا اور بری عادات کو ترک کر دیتا ہے۔ استاد کے علاوہ وہ اپنے ہم مکتب ساتھیوں سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ اسے نہایت قریب سے ان کے اخلاق و کردار کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر مناسب نگرانی کی جائے تو وہ دوسروں کی اچھی عادتوں کو اختیار کر لیتا ہے اور اپنے اندر اعلیٰ اوصاف کا خوبصورت مرقع جمع کر لیتا ہے۔

۲۔ اجتماعی اصلاح

تعلیم گاہیں بچوں کو تمدنی زندگی کی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل بناتی ہیں۔ ان میں محبت و شفقت، مساوات، ایثار و قربانی اور اجتماعی احساس پیدا ہوتا ہے۔ مختلف حیثیتوں کے طلبہ ایک ہی جگہ بیٹھ کر استاد سے پڑھتے ہیں انہیں ایک دوسرے کے قریب آنے اور باہمی مشکلات و مسائل کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ یوں ان میں مل جل کر رہنے، اکٹھے اٹھنے بیٹھنے ایک ہی میدان میں کھیلنے اور ایک ہی قسم کے ماحول میں تربیت پانے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تعلیمی زندگی کی دوستیاں دائمی بن جاتی ہیں۔ مکتب بچوں میں اخوت اور قومیت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ انہیں اجتماعی زندگی کے سانچے میں ڈھالتا ہے ان میں برادرانہ زندگی بسر کرنے کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔

۳۔ پابندی وقت اور نظم و ضبط

مکتب پابندیٔ اوقات سکھاتا ہے۔ وقت پر حاضر ہونا، ہر کام اپنے وقت پر کرنا اور ایک ضابطے کے مطابق تمام مضامین کا درس حاصل کرنا، یہ سب پابندیاں طالب علم میں

احساس ذمہ داری پیدا کرتی ہیں اور اسے وقت کی قدر و قیمت کا احساس دلاتی ہیں۔ سکول اور کالج میں طلبہ کو ایک نظام کے تحت رہنا پڑتا ہے۔ اس سے ان کی زندگی میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے۔ ان میں اخلاق و آداب اور قواعد و ضوابط کی پابندی کی عادت استوار ہوتی ہے۔ سکاؤٹنگ جیسی مفید تحریکیں زندگی کی اعلیٰ قدریں سکھاتی ہیں۔ ہوسٹل کی زندگی نظم و ضبط کا موثر ذریعہ ہے کھیل کے میدان میں ایک ٹیم بن کر اجتماعی کاموں کے لیے جدوجہد کرنے کی مشق ہوتی ہے۔ الغرض تعلیمی زندگی کے یہ تمام قواعد و ضوابط مستقبل کے قومی و اجتماعی کاموں کے لیے بہتر افراد تیار کرتے ہیں۔

۴۔ صحت اور جسمانی نشوونما

مکتب اس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ صحت کیسے برقرار رکھی جا سکتی ہے؟ صفائی کی کیا اہمیت ہے؟ ورزش اور جسمانی ریاضت کس قدر ضروری ہے؟ مفید کھیل ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔ فوجی ڈرل اور فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ پیشہ ورانہ رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ مختلف ممالک میں ہوائی حملے سے بچاؤ، شہری دفاع، زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ کے ساتھ ساتھ ابتدائی ضروری فوجی تربیت بھی نصابِ تعلیم کا حصہ بن چکی ہے۔ اس تربیت سے ہنگامی حالات میں ملت اور ملک و قوم کے بچاؤ کے لیے آدمی بے پناہ خدمات سرانجام دے سکتا ہے اور میدانِ جنگ میں لڑنے والوں کا ہاتھ بھی بٹا سکتا ہے، بلکہ وقت آنے پر شہری انتظام بھی سنبھال سکتا ہے۔

۵۔ شرعی علوم کی تعلیم

ہر مسلم ملک میں قرآن مجید، سنتِ رسولؐ، تاریخ اسلام اور فقہ کو تعلیم کا جزو بنایا جاتا ہے۔ ایسی تعلیم پا کر ہر شہری ضروری دینی تعلیم سے آراستہ ہو کر اپنی انفرادی و اجتماعی اصلاح کر سکتا ہے۔ پاکستان میں اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں مفید اصلاحات نافذ کی جا رہی ہیں۔ ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ یہاں صحیح معنوں میں اسلامی نظامِ تعلیم کا نفاذ کیا جائے۔ یہ بات قابلِ قدر ہے کہ بی اے تک اسلامیات کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ شرعی علوم کی تعلیم عام ہونے کے نتیجہ میں ہم تشکیلِ پاکستان کے بنیادی مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔

۶۔ معلم کے علم و عمل کے اثرات

استاد اور شاگرد کا رشتہ بڑا مقدس ہے۔ اگر دونوں اپنے مقام کو پہچان لیں تو یہ رشتہ زندگی میں دوررس نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ استاد اگر اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح معنوں میں استاد ہو تو وہ اپنے شاگردوں کی زندگیاں بدل سکتا ہے۔ ان میں تقویٰ و طہارت، ہمدردی و اخوت، خیرخواہی اور

شفقت کے جذبات پیدا کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آئندہ نسلوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی استاد کے ہاتھ میں ہے۔ وہ زندگی کو جس رُخ پر چاہے موڑ سکتا ہے۔ اس کی تاثیر دیرپا ہے۔ اس کی ذمہ داری والدین سے بھی زیادہ نازک اور اہم ہے کیونکہ والدین صرف جسمانی پرورش کرتے ہیں اور استاد روحانی پرورش کا اعلیٰ ترین فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے امت کے سب سے پہلے اور سب سے عظیم معلم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشن مثال موجود ہے کہ کس طرح آپ نے ایک وحشی اجڈ اور جاہل قوم کو متمدن و مہذب اور ساری دنیا کا امام بنا دیا۔ ارشادِ نبویؐ ہے،

إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

یعنی بے شک مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

۷۔ صحت مند ماحول

مکتب تعلیم و تربیت کے ذریعے صحت مند ماحول پیدا کرتا ہے۔ تعلیم کے لیے جو ماحول درس گاہ میں میسر آتا ہے وہ اس سے باہر نہیں مل سکتا، کیونکہ درس گاہ کا مقصد وجود ہی تعلیم ہے۔ وہاں تعلیم و تربیت کے تمام ضروری اسباب و وسائل جمع ہوتے ہیں۔ اساتذہ موجود ہوتے ہیں۔ لائبریریاں ہوتی ہیں تجربہ گاہیں ہوتی ہیں، کھیل کے میدان ہوتے ہیں۔ بزم ادب کا اہتمام ہوتا ہے۔ زندگی کی گاڑی میں فٹ ہونے والے پرزے یہیں ڈھلتے ہیں۔ زنانہ سکولوں اور کالجوں میں خانہ داری اور بچوں کی پرورش کی جو تعلیم و تربیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ وہ کسی گھر میں یا کسی ادارے میں حاصل ہونی ناممکن ہے۔ خاص خاص پیشوں کے لیے خاص خاص درس گاہیں بھی ہیں، جہاں انہیں خاص پیشوں کے نقطہ نظر سے تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً زراعت، صنعت و حرفت، قانون، ڈاکٹری اور اس کی مختلف شاخیں وغیرہ

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں   آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے   وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں (اکبر الٰہ آبادی)

اساتذہ کے حقوق یا شاگرد کے فرائض

سوال، قرآن و سنت کی روشنی میں اساتذہ کے حقوق بیان کیجئے۔

اساتذہ کے حقوق

حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو استاد کی حیثیت، اہمیت اور مقام مسلم ہے۔ کیونکہ استاد معمارِ قوم ہے۔ استاد ہی نونہالانِ قوم کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ استاد ہی قوم کے نوجوانوں کو علوم و فنون

ہے آراستہ و پیراستہ کرتا اور اس قابل بناتا ہے کہ وہ ملک و قوم کی گرانبار ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ استاد جہاں نوجوانوں کی اخلاقی، روحانی و دینی تربیت کرتا ہے، وہاں وہ ان کی مختلف علمی، سائنسی، فنی اور پیشہ ورانہ مہارتوں کا سامان بھی کرتا ہے۔ والدین بچے کی جسمانی پرورش کرتے ہیں جبکہ استاد کے ذمے بچے کی روحانی تربیت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے استاد کی حیثیت اور اہمیت والدین سے کسی طرح کم نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ان سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ روح کو جسم پر فوقیت حاصل ہے۔

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روحِ انسانی (اقبال)

۱۔ **قرآن کی روشنی میں** قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو معلم قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۗ (الرحمٰن: ۱، ۲)

ترجمہ: "(اللہ جو) نہایت مہربان ہے، اسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔"

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ (العلق: ۴)

ترجمہ: وہی ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔

وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ؕ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا ۝ (النساء: ۱۱۳)

اور اللہ نے وہ سب کچھ تمہیں سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا فضل تم پر بہت بڑا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم استاد اور صحابہ کرامؓ آپؐ کے شاگرد ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۵۱)

ترجمہ: "پیغمبر تمہیں تعلیم دیتا ہے کتاب و حکمت کی اور تمہیں وہ سب کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔"

۲۔ **حدیث کی روشنی میں** استاد کا یہ اعزاز کیا کم ہے کہ اسے اس پیشے کی وجہ سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔

جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے:

إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ۔

یعنی: مجھے تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے:

صحابہ کرامؓ نے جو کچھ اللہ کے رسولؐ سے سیکھا اسے بے کم و کاست دیانتداری سے اگلی نسل کے حوالے کر دیا، اور یوں قدم بہ قدم یہ امانت ہم تک پہنچی۔ وہ باقی امت کے استاد ہیں۔ اسی طرح پہلی ہر نسل آنے والی نسل کی استاد ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے:

"تیرے تین باپ ہیں۔ ایک وہ جو تجھے عدم سے وجود میں لایا، دوسرا وہ جس نے تجھے بیٹی دی اور تیسرا وہ جس نے تجھے علم کی دولت سے مالا مال کیا۔"

ابن عدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

"چاپلوسی اور خوشامد طالب علم کے لئے استاد کے سامنے تو جائز ہے اور کہیں جائز نہیں۔"

۳۔ صحابہ کرامؓ کا نمونہ

ایک مرتبہ کاتب وحی رسول حضرت زیدؓ بن ثابت کسی جنازے میں شامل ہوئے نماز ہو چکنے کے بعد سواری پر سوار ہونے لگے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے رکاب تھام لی حضرت زیدؓ نے فرمایا "اے رسول اللہؐ کے چچازاد بھائی رکاب چھوڑ دیجئے۔" حضرت ابن عباسؓ بولے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ عالموں اور بڑوں کی تعظیم اس طرح کریں۔" یہ سن کر حضرت زید نے حضرت ابن عباسؓ کا ہاتھ چوم لیا اور فرمایا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر والوں کا احترام اس طرح کریں۔" باقی صحابہ کرامؓ بھی اسی طرح ایک دوسرے کی عزت و تکریم کرتے تھے۔

۴۔ ادب واحترام

علم عاجزی وانکساری کو پسند کرتا ہے۔ وہ ایسے دل میں ہرگز گھر نہیں کر سکتا جس میں غرور اور تکبر ہو۔ پس طالب علم کا فرض ہے کہ علم کی قدر پہچانے اور اس کی خاطر عاجزی کا اظہار کرے، اپنے استاد سے تکبر و غرور سے پیش نہ آئے بلکہ اس کا ادب واحترام ملحوظ خاطر رکھے۔ اگر کوئی سوال بھی کرنا ہو۔ اس سے بحث و مباحثہ بھی درکار ہو تو بھی عزت واحترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور نہ وہ علم کی دولت سے محروم رہے گا۔ مشہور مقولہ ہے:

"با ادب بانصیب مبے ادب بے نصیب"

۵۔ علم کا فرض ہے کہ علم جہاں سے اور جس سے بھی ملے، اسے حاصل کرے۔ صرف مشہور اساتذہ سے پڑھنے کی خواہش کرنا اور دوسروں سے منہ پھیر لینا نادانی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی بات ہی سمجھ میں آجائے جس شخص کو شدید پیاس لگی ہو، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اسے پانی چاندی کے گلاس میں پیش کیا جا رہا ہے یا مٹی کے پیالے میں۔ علم تو اضع اور محنت د

سنت کے بغیر نہیں آسکتا۔ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ ﴿ق: ۳۷﴾

ترجمہ: "بے شک جو شخص دل (آگاہ) رکھتا ہے یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے اس کے لئے اس میں نصیحت ہے۔"

امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں:

"میرے استاد حماد جب تک زندہ رہے، میں نے ان کے مکان کی طرف کبھی پاؤں بھی نہ پھیلائے۔"

پس حصولِ علم کے لئے دلِ بیدار، حاضر دماغی، توجہ اور غور سے سننا لازم ہے۔ماہر استاد کی رائے پر اپنی رائے کو ہرگز ترجیح نہیں دینی چاہیئے۔ورنہ خسارے اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

۵۔ استاد کی رہنمائی میں چلنا

جب تک طالب علم کی اپنی استعداد پختہ نہ ہو جائے اور مطالعہ وسیع نہ ہو جائے۔اسے دینوی و اُخروی علوم میں صرف استاد کی رہنمائی پر اعتماد کرنا لازم ہے تاکہ اس کا ذہن پریشان خیالی کا شکار نہ ہو جائے۔ایک وقت آئے گا جب ہر مسئلے میں اس کی اپنی ایک تحقیق ہو گی اور وہ اسے اختیار کرے گا۔لیکن اس وقت تک ہر استاد کی رائے پر چلنا اور اسے فوقیت دینا ضروری ہے، ورنہ علم کی نعمت حاصل نہیں ہو سکتی۔

۶۔ اطاعت و خدمت گزاری

استاد کا طلبہ پر حق ہے کہ وہ اس کے اطاعت گزار ہوں، فرمانبرداری کے بغیر صحیح تعلیم کا عمل ممکن نہیں۔حضرت علی المرتضیٰؓ سے مروی ہے:

مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفًا فَاَنَا عَبْدُہٗ ؁

یعنی: جس سے میں نے ایک حرف بھی سیکھا، میں اس کا غلام ہوں۔

اطاعت و خدمت گزاری ہی شرف و سعادت کا ذریعہ ہے۔استاد کی خدمت کا شرف، طالب علم کے لئے باعث فخر ہے۔

قاضی فخر الدین کا قول ہے:

"میں نے جو عزت و مرتبہ پایا، اس کی وجہ اپنے محترم استاد قاضی ابو زید کی خدمت ہے، ان کے لئے کھانا پکایا کرتا تھا، حالانکہ خود شریک طعام نہیں ہوتا تھا۔"

۷۔ معاشی تحفظ معاش ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر وہ یکسوئی سے کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا استاد کا یہ بنیادی حق ہے کہ معاشرہ و حکومت اسے خاطر خواہ معاشی تحفظ فراہم کرے تاکہ وہ بے فکری کے ساتھ تعلیم و تدریس کے فرائض سر انجام دے سکے۔ اس کی بنیادی ضروریات رہائش، لباس، خوراک اور علاج معالجہ وغیرہ معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ علاوہ ازیں اس کی تنخواہ معقول ہو، تحقیق کے وسائل میسر ہوں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ علم کو فروغ دے سکے۔ قدیم دور میں سلاطین و رؤسا اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جو اتالیق مقرر کرتے تھے، ان کی وہ بڑھ چڑھ کر مالی و مادی سرپرستی کرتے تھے۔ اب بھی ترقی یافتہ ممالک میں استاد کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی ہے اور انہیں بھرپور معاشی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔

۸۔ معاشی وقار معاشرہ کی تمام تر ترقی اور فلاح تعلیمی ترقی کا مرکز و محور استاد کی ذات ہے۔ لہٰذا معاشرہ کی اصلاح و فلاح اور تعمیر و ترقی میں استاد کا کردار بڑا اہم ہے۔ اس لحاظ سے معاشرے کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ استاد کے معاشرتی وقار کو بلند کرنے کی کوشش کرے اور پھر وہی قومیں سربلند و سرفراز ہوتی ہیں جو استاد کو صحیح اور بلند معاشرتی مقام دیتی ہیں۔ بلاشبہ معلمی کا فریضہ ایک پیغمبرانہ مشن ہے جیسا کہ احادیث مبارکہ سے ظاہر ہے کہ "بے شک مجھے معلم بنا کر ہی بھیجا گیا ہے"۔ نیز "علما نبیوں کے وارث ہیں"۔

۹۔ امام غزالیؒ کی نظر میں امام غزالیؒ نے فرمایا "جب تک تم اپنا سب کچھ علم کو نہ دے ڈالو۔ علم تمہیں اپنا کوئی حصہ بھی نہیں دے گا۔"

"تمام علوم یا براہ راست خدا تک پہنچا دینے والے ہیں یا ان کی راہ پر چلنے میں مددگار ہیں، صرف نیت کی صفائی اور عقل کی گہرائی کی ضرورت ہے۔ دیکھنے والے کو پھول کی ہر پتی اور گھاس کے ہر تنکے میں خدا کا جلوہ نظر آ سکتا ہے۔ ہاں علوم کو حاصل کرنے میں مناسب ترتیب کا قائم کرنا لازم ہے اور یہ استاد کی رہنمائی سے حاصل ہوتا ہے۔"

۱۰۔ معزز ترین شخص کون؟ ایک دن مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے دیکھا کہ اس کے بیٹے مامون اور امین اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ استاد کے جوتے کون اٹھائے، آخر استاد کے کہنے پر وہ ایک ایک جوتا اٹھا لائے اور استاد کے سامنے رکھ دیئے۔ استاد نے خوش ہو کر دعا دی۔ اگلے روز خلیفہ نے دربار میں یہ سوال کیا کہ "آج سب سے زیادہ عزت کس کی ہے؟" سب نے کہا: خلیفہ کی عزت سب

سے زیادہ ہے" لیکن ہارون الرشید نے بتایا کہ "سب سے زیادہ عزت اس استاد کی ہے، جس کے جوتے اٹھانے میں شہزادے فخر محسوس کرتے ہیں"۔

۱۱۔ **معلم کی منفرد حیثیت** معلم کی حیثیت علم کی بارش کی سی ہوتی ہے اور طلبہ کی زمین کی۔ جو زمین بارش کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ بارش کے فیض سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور پھر استاد کا یہ حوصلہ اور ظرف دیکھئے کہ والدین کے علاوہ استاد ہی وہ ہستی ہے کہ وہ اپنے شاگرد کو خود سے آگے بڑھتے دیکھ کر حسد کی بجائے خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں طلبہ کی کامیابی اس کی اپنی کامیابی ہے۔

۱۲۔ **دعائے خیر** استاد ایک ایسی ہستی ہے جس کے اپنے شاگردوں پر بے پناہ احسانات ہوتے ہیں۔ وہ اچھی تعلیم و تربیت کے ذریعے انہیں حیوان سے انسان بناتا ہے۔ اس کی زندگی کو اخلاقی و روحانی لحاظ سے سنوارتا اور نکھارتا ہے لہٰذا شاگرد کا فرض ہے کہ استاد کی زندگی میں اس کے لئے دعائے خیر کرتا رہے اور جب وہ وفات پا جائے تو دعائے مغفرت کرے۔ ارشاد نبوی ؐ ہے:

"جو شخص تم پر احسان کرے تم اس کا صلہ دو، ورنہ کم از کم اپنے محسن کیلئے دعائے خیر ضرور کرو"۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے (اقبال)

شاگرد کے حقوق (استاد کے فرائض)

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر ۔ جس کی صنعت ہے روح انسانی (اقبال)

سوال: اسلامی نقطہ نظر سے شاگرد کے حقوق یا استاد کے فرائض بیان کیجئے

(یا)

اسلامی نقطۂ نظر سے ایک اچھے استاد کے اوصاف بیان کیجئے۔

جواب: **شاگرد کے حقوق یا استاد کے فرائض**:۔ اسلامی نقطۂ نظر سے شاگرد کے مندرجہ ذیل حقوق ہیں۔ یہی اساتذہ کے فرائض ہیں:۔

۱۔ شفقت و دلسوزی

یہ استاد کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا فریضہ ہے۔ جب تک اس کے دل میں اپنے شاگردوں کے لیے اپنی اولاد جیسی شفقت و رحمت اور دلسوزی نہ ہو، وہ صحیح استاد نہیں ہو سکتا اور اس کے شاگردوں کو اس سے پورا فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اسے اپنے شاگرد کا راہنما، دلی دوست، خیر خواہ اور صحیح ہمدرد ہونا چاہیئے۔ شاگرد کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے اس کی اصلاح کی دلی کوشش کرنا اس کا فرض ہے ارشادِ نبوی ہے:

"میں تو تمہارے لیے اس طرح ہوں جیسے باپ اپنی اولاد کے لیے ہوتا ہے۔"

(ابو داؤد، نسائی)

یہیں سے استاد اور والدین کے مقام الگ الگ نظر آسکتے ہیں۔ والدین بچے کے جسمانی مربی اور استاد روحانی مربی ہے۔ اسے اپنے مقام کی عظمت کا خیال ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے۔ استاد میں اگر واقعی شفقت پائی جاتی ہے تو شاگرد کی نگاہ ہمیشہ اس کی عظمت کے سامنے جھکی رہے گی۔ بصورت دیگر اگر استاد خود غرض ہے، محض دنیوی فوائد کا طالب ہے اور محنت نہیں کرتا تو اسے شاگرد سے وہ توقعات وابستہ نہیں رکھنی چاہئیں جو اصل اور حقیقی استاد کو اپنے شاگرد سے ہوتی ہیں۔

۲۔ اعلیٰ اخلاقی نمونہ

استاد کا فریضہ شاگردوں کو محض چند فقرے رٹا دینا ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ان کی روحانی و اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔ یہ تربیت اس وقت تک ممکن ہی نہیں، جب تک استاد خود عمل و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش نہ کرے۔ اگر وہ خود اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہے تو اس کے شاگردوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اعلیٰ اوصاف کے حامل ہوں گے۔ ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور سیرت و کردار کا عکس دوسروں پر پڑتا ہے۔ استاد اپنے آپ کو جس مسند (گدی) پر بٹھاتا ہے، وہ بڑی مقدس مسند ہے۔ اس پر پیغمبر اور بزرگانِ دین بیٹھتے رہے ہیں۔ پس اسے اس مقام کا احترام مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اسے ایک پیشہ ور معلم کی بجائے ایک مثالی معلم ہونا چاہیئے۔ بقولِ علامہ اقبالؒ ہے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

۳۔ دلی خیر خواہی

استاد کو شاگرد کی خیر خواہی اور دلی ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنی چاہیئے۔ اسے شاگرد کے سامنے علم کا مقصد

اس کے حصول کا طریقہ اور مطالعہ و تحقیق کی نئی نئی راہیں پیش کرنی چاہئیں۔ شاگردوں کی اچھائیوں پر خوش ہونا، انہیں داد دے کر حوصلہ افزائی کرنا، ان کی غلطیوں پر انہیں محبت سے ٹوکنا اور اصلاح کی کوشش میں لگے رہنا ایک اچھے استاد کا شیوہ ہونا چاہیے۔ شاگرد اگر وقت بے وقت سوال کریں تو ان کی مشکلات کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ استاد اس باپ کی مانند ہے جو اپنے چھوٹے بچے کو انگلی پکڑ کر آہستہ آہستہ چلنا سکھاتا ہے۔ اگر بچہ ٹھوکر کھا کر گر پڑے تو شفقت سے اٹھا لیتا ہے اگر غلطی کرے تو اصلاح کر دیتا ہے۔ وہ استاد جس کے دل میں شاگرد کے لیے اس قسم کا پاکیزہ جذبہ ہوگا۔ وہی صحیح معنوں میں معمارِ قوم کا حقدار ہے۔

۴۔ علم و فن میں مہارت

جو شخص تعلیم کا اہم منصب سنبھالتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ دوسروں کے سامنے معلم کی حیثیت سے پیش ہونے سے پہلے خود اپنے مضامین میں پوری مہارت پیدا کرلے۔ مطالعہ و تحقیق جاری رکھے اسباق کو آسان سے آسان تر بنا کر شاگردوں کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کرے متعلم کے مقابلے میں معلم کا علم دس گنا زیادہ ہونا چاہیے۔ اسے چاہیئے کہ اپنے دوسرے ساتھیوں اور ہم پیشہ لوگوں سے ربط و تعلق رکھے۔ ان سے مشورے کرتا رہے۔ اپنی مشکلات و تجربات ان کے سامنے پیش کرے اور ان سے رہنمائی حاصل کرے۔ اسے ریفریشر کورسز کے ذریعے اپنے علم کو جدید ترین رکھنا چاہیئے جس بات کی اسے پوری تحقیق نہ ہو، اسے شاگردوں کے سامنے غلط انداز میں پیش نہ کرے بلکہ صاف کہہ دے کہ میں نہیں جانتا۔ اور پھر تحقیق کر کے اس بات کی وضاحت کرے۔ بزرگوں کا قول ہے:

"جس چیز کو ہم نہیں جانتے اسے کہہ دینا کہ نہیں جانتے، یہ آدھا علم ہے۔"

۵۔ تہذیب و اخلاق

علم کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان تہذیب و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ بن جائے۔ اس میں اخلاقِ حسنہ پیدا ہوں اور رذائل اخلاق یعنی برے اخلاق سے پاک ہو۔ جو علم یہ مقصد پورا نہیں کرتا، وہ علم کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اپنے شاگردوں پر کڑی نظر رکھے اور موقع و محل کی مناسبت سے انہیں ٹوکتا بھی رہے تاکہ وہ مہذب و با اخلاق بن سکے۔ لیکن اگر دوسروں کی موجودگی میں کسی کو ٹوکنا ہو، تو اس کا بہتر طریقہ اشارہ اور کنایہ ہے۔ شاگردوں کی اخلاقی اصلاح و تہذیب کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ استاد خود بہتر اخلاقی نمونہ پیش کرے۔ کبھی جھوٹ نہ بولے۔ شاگردوں کے سامنے بدکلامی، فحش گوئی اور تہذیب و اخلاق سے گری ہوئی گفتگو نہ

کرے۔ اس کا دامن حسد، تکبر، غیبت، ریاکاری اور جھوٹ فریب سے پاک ہو۔ اگر استاد کا اپنا عملی نمونہ عمدہ ہوگا تو اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ شاگرد دل پر اثر کرے گا اور خود بخود ان کی اصلاح ہوتی جائے گی۔

۶۔ حکمت تعلیم: تعلیم و تدریس کے لیے مناسب و موزوں حکمت و تدبیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ استاد کو اپنے شاگردوں کی قابلیت کے مطابق بات کرنی چاہیئے اسے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ وہ جن لوگوں سے مخاطب ہے، عقل و فہم میں وہ اس کی سطح پر نہیں۔ اس لیے استاد کو چاہیئے کہ وہ شاگردوں کے ذہنی معیار اور سوجھ بوجھ کے مطابق تعلیم دے۔ اسے شاگردوں کی نفسیات سے باخبر ہونا چاہیئے۔ ارشادِ نبوی ہے:

"لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق بات چیت کرو۔"

استاد اعلیٰ و ارفع عالمانہ اور خطیبانہ انداز اختیار کر کے شاگردوں کو اپنے علم و فضل سے مرعوب تو کر سکتا ہے۔ لیکن ان پر نفسِ مضمون واضح نہیں ہو سکتا۔ اس سے شاگردوں کو کوئی نفع نہیں ہو سکتا اور تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح استاد کا فرض ہے کہ تعلیم میں تدریج و ارتقاء کو مدنظر رکھے اور آسان سے مشکل کی طرف پیش قدمی کرے۔ استاد کے لیے یہ بات بھی لازم ہے کہ شاگردوں کے سوالات کے جوابات خندہ پیشانی سے دے اور علم کو چھپانے کا مجرم نہ بنے۔ علم کا زیادہ سے زیادہ فروغ ہونا چاہیئے۔

۷۔ جسمانی سزا سے اجتناب: استاد اگر اپنے مرتبہ و مقام کو پہچانتا ہو اور اس کے دل میں فرائض کا صحیح احساس پایا جاتا ہے تو شاگرد کو جسمانی سزا دینے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ وہ اپنے شاگردوں میں اتنی خود اعتمادی پیدا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کا احساس کرنے لگے۔ حسب ضرورت معمولی ڈانٹ ڈپٹ غصیلی نگاہ اور اظہار افسوس ہی کافی ہوتا ہے۔ آج کل ابتدائی مدارس میں جسمانی سزا کا رواج ہے اور شاگردوں کو مرغا بنا دیا جاتا ہے۔ ہمیں تاریخ اسلام کے بہترین دور میں اس کی مثال نہیں ملتی اس کے نتائج کبھی اچھے نہیں ہوتے۔ شاگرد ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ ان میں جھوٹ، فریب اور ریاکاری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ استاد سے دلی نفرت کرنے لگتے ہیں۔ مار پیٹ سے طلبہ کی خودداری کچل جاتی ہے۔ ان کی روح مرجھا جاتی ہے ان میں عزتِ نفس کا احساس مردہ ہو جاتا ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ محض وقتی طور پر نظم و ضبط کی خاطر اتنی قیمتی چیز کی قربانی کوئی اچھا سودا نہیں ہے۔ طریقہ تعلیم اتنا صاف ستھرا اور صحت مند ہونا چاہیئے کہ جسمانی سزا کی نوبت ہی نہ آئے۔

اس کی بجائے اصلاح کی دوسری مناسب صورتیں بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔ والدین کا بھرپور تعاون اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ سکولوں سے مار پیٹ کے عادی طلبہ جب کالج میں آتے ہیں تو اکثر آوارہ مزاج، بے راہرو اور نکمے ہو جاتے ہیں۔ یہ اس مار پیٹ اور بدسلوکی کا ردِ عمل ہوتا ہے، جس سے وہ کئی سال تک گزر کر یہاں پہنچے ہوتے ہیں۔

۸۔ مساوات اسلام مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ تعلیمی عمل میں بھی اسے جاری و ساری ہونا چاہیئے معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام طلبہ کو یکساں نظر سے دیکھے، اس کی نگاہ میں تمام طلبہ برابر حیثیت رکھتے ہیں، خواہ کوئی امیر ہو یا غریب، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، خوبصورت ہو یا بدصورت، کسی کے ساتھ امتیازی سلوک معلم کے منصب کے خلاف ہے۔ یہاں تک کہ اگر شاگرد غیر مذہب سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے ساتھ بھی رواداری کا برتاؤ ہونا چاہیئے عقائد و نظریات پر مہذب و شائستہ انداز میں بحث اور تبادلۂ خیالات تو ہو سکتا ہے، لیکن اس اختلاف کو نفرت و عداوت کی بنیاد نہیں بننا چاہیئے۔

انہیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت — انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت — انہیں کی ہے سب ربع مسکوں میں برکت

دم اُن کا ہے دنیا میں رحمت خُدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

(مسدس حالی)

مسجد کی اہمیت

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبہ : ۱۸)

ترجمہ۔ بے شک اللہ کی مسجدوں کو تو صرف وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔

سوال: اسلامی معاشرے میں مسجد کی نوعیت و اہمیت اور فوائد و مقاصد کی وضاحت کیجیے

جواب: **مسجد کا مفہوم** مسجد کے لغوی معنی "سجدہ کرنے کی جگہ" یا "سجدہ گاہ" کے ہیں اسلامی اصطلاح میں مسجد اس جگہ یا مکان کو کہتے ہیں، جہاں

روزانہ نماز پنجگانہ باجماعت ادا ہوتی ہو اور وہ جگہ عبادت اور نماز کے لیے مستقل طور پر وقف کردی گئی ہو۔ مسجد کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ اسے اللہ کے گھر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اس میں تمام کلمہ گو مسلمان نماز ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ مسجد کا انتظام چلانے کے لیے کسی ذمہ دار انتظامیہ کا ہونا ضروری ہے۔

مسجد کی نوعیت و اہمیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت فی الارض کے عظیم منصب پر فائز کیا ہے اور اس پر یہ پابندی عائد کردی کہ وہ ان احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے گا جو حضرات انبیائے کرامؑ کے ذریعے جاری کئے گئے۔ اس لحاظ سے انسان کی تخلیق کا اولین مقصد عبادتِ الٰہی ہے۔ اگر انسان اپنے تمام کاموں کو حضرات انبیائے کرام کے طریقے پر رضائے الٰہی کے لیے کرے تو تمام اعمالِ انسانی عبادت ہیں۔ عبادتوں میں سب سے اعلیٰ عبادت نماز ہے۔ جو ہر مسلمان پر شب و روز میں پانچ مرتبہ ادا کرنی فرض ہے۔ لیکن نماز کی ادائیگی کی صحیح صورت یہ ہے کہ اسے پورے اہتمام کے ساتھ قائم کیا جائے یعنی باجماعت نماز ادا کی جائے۔ سوائے شرعی مجبوری کے انفرادی طور پر نماز ادا نہیں ہو سکتی چنانچہ اگر کسی بستی میں تمام مسلمان انفرادی طور پر نماز ادا کریں، لیکن نماز باجماعت کا اہتمام نہ ہو تو تمام بستی گناہ گار سمجھی جائے گی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی جب توبہ قبول ہوئی اور پھر حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ اکٹھے ہوئے تو حضرت آدمؑ نے سب سے پہلے عبادت خداوندی کے لیے مسجد ہی تعمیر فرمائی۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ○ (آل عمران: ۹۶)

ترجمہ: یقیناً سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا، وہی ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے، وہ مبارک ہے اور تمام جہانوں کے لیے ذریعۂ ہدایت ہے۔

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
(اقبالؒ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جو سب سے پہلی تعمیر کی وہ مسجد نبویؐ تھی جو چودہ سو سال سے قائم ہے اور قیامت تک رشد و ہدایت کا ذریعہ رہے گی۔

جب مسجدِ نبوی کے مینار نظر آئے ۔۔۔ اللہ کی رحمت کے آثار نظر آئے

تاریخ شاہد ہے کہ جہاں کہیں مسلمانوں نے نئے شہر یا بستیاں آباد کیں یا چھاؤنیاں قائم کیں، وہاں پر سب سے پہلے اللہ کا گھر یعنی مسجد تعمیر کی۔ کیونکہ مسجد شعارِ ملی ہے اور فرزندانِ توحید مسجدوں کو تمام عمارتوں سے زیادہ خوبصورت اور عالیشان بناتے تھے۔ آج تک قدیم دور کی ہزارہا مساجد اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ مثلاً اسپین کی مسجدِ قرطبہ آج بھی فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ بقول علامہ اقبال رحمہ اللہ

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل ۔۔۔ وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار ۔۔۔ شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور ۔۔۔ تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرائیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے ۔۔۔ اس کی اذانوں سے فاش سِرِّ کلیم و خلیل

اصل حقیقت یہ ہے کہ مسجد وہ مقام ہے جہاں اسلامی معاشرت نشوونما پاتی ہے۔ علمِ دین کی اشاعت ہوتی ہے۔ عبادت کے علاوہ مسلمان مساجد میں اخوت، مساوات، ایثار و قربانی اور ہمدردی جیسے اعلیٰ اوصاف سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ آدابِ مجلس اور آدابِ معاشرت کے اصولوں کی عملی تربیت بھی مساجد میں سرانجام پاتی ہیں۔ اس لیے اسلامی معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے مساجد کا وجود نہایت ضروری ہے۔

قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مسجد کی فضیلت و عظمت بیان کی گئی ہے۔ ذیل میں کچھ آیات پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ٥ (التوبۃ : ۱۸)

ترجمہ: یقیناً اللہ کی مسجدیں صرف وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور نماز کو قائم کیا، زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ کیا۔ اُمید ہے، یہی لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں گے۔

۲۔ وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ۙ (الجن: ۱۸)

ترجمہ: "بیشک مسجدیں اللہ کے لیے ہیں۔ پس اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔"

۳۔ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (النور: ۳۶)

ترجمہ: (اللہ کا نور) ان گھروں میں ہے، جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ اس کا نام بلند کیا جائے اور اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور ان میں صبح و شام اسکی تسبیح کرتے ہیں۔

۴۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

ترجمہ: اے بنی آدم! ہر مسجد میں (نماز کے وقت) اپنے آپ کو مزین کیا کرو (یعنی خوشنما لباس میں جایا کرو)۔

حدیث کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں بھی بکثرت مسجد کی فضیلت و عظمت بیان کی گئی ہے۔ ذیل میں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنائے، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنا دے گا۔ (بخاری شریف)

۲۔ جو شخص مسجد کی آبادی کی کوشش کرے، اللہ اسے آباد کرے گا۔ (طبرانی)

۳۔ جب تم کسی شخص کو مسجد میں آنے کا عادی پاؤ تو اس کے ایمان پر گواہ بن جاؤ۔ (ترمذی)

۴۔ جو شخص صبح کو یا شام کو مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی روانگی کے ساتھ ہی اللہ جنت میں اس کا گھر تیار کر دے گا۔ (بخاری و مسلم)

۵۔ جو شخص اپنے گھر سے پاک صاف ہو کر اللہ کے گھر کی طرف اس کا فرض ادا کرنے کے لیے روانہ ہوا، اس کا ہر قدم باعثِ ثواب ہے۔ ایک قدم سے گناہ معاف ہوتے ہیں، اور دوسرے سے درجہ بلند ہوتا ہے۔ (مسلم)

۶۔ اندھیروں میں مسجدوں کی طرف پیدل آنے والوں کو قیامت کے روز روشنی کی خبر دے دو۔ (ابوداؤد۔ ترمذی)

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں مسجد نبوی کے قریب کچھ خالی جگہ تھی۔ قبیلہ بنو سلمہ کے لوگ مسجد کے قریب اس جگہ منتقل ہونا چاہتے تھے۔ حضورؐ کو پتہ چلا تو آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا: ہاں! یا رسول اللہؐ! ہم مسجد کے قریب آنا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا: "اے بنی سلمہ کے لوگو! اپنے محلے ہی میں رہو۔ کیونکہ مسجد کی طرف آنے جانے میں تمہارے قدموں کی تعداد کے برابر نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔" آپ

نے یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے۔ اس پر بنو سلمہ نے کہا: "حضورؐ کے ارشاد سے ہمیں اس قدر خوشی ہوئی کہ مسجد کے قریب آباد ہونے سے بھی نہ ہوتی۔" (بخاری و مسلم)

مسجد کے مقاصد و فوائد

اسلامی معاشرے میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ذیل میں اس کے مقاصد و فوائد بیان کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ عبادت گاہ

جیسا کہ لفظ مسجد ہی سے ظاہر ہے۔ اصولی طور پر یہ "سجدہ گاہ" اور مرکز عبادت ہے۔ نماز پنجگانہ، تلاوت و درس قرآن نماز جمعہ، نماز تراویح، اعتکاف اور وعظ و تبلیغ کی مجالس وہیں منعقد ہوتی ہیں۔ قرآن و حدیث کی تعلیم کا اہتمام اسی میں ہوتا ہے اور کئی دینی امور سر انجام پاتے ہیں۔ یہ سب امور عبادت میں شامل ہیں۔ مسجدوں ہی سے اذانیں بلند ہوتی ہیں اور انہی میں ذکر الٰہی ہوتا ہے۔

۲۔ مرکز تعلیم

مسجد نبویؐ سے اب تک اسلامی تعلیم کا مرکز رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد ہی سے تعلیم و تربیت کی شمع روشن کی تھی ہجرت کے موقع پر پہلی مسجد قبا کے مقام پر بنوائی اور پھر مدینہ منورہ کی اصل آبادی میں مسجد نبویؐ تعمیر کرائی آپؐ کے عظیم شاگرد جو ساری کائنات کے امام اور استاد بنے یعنی صحابہ کرامؓ ــــ وہ سب اسی اسلامی درس گاہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ حضورؐ مسجد ہی میں نماز فجر اور نماز عصر کے بعد درس دیا کرتے تھے۔ بچوں کو قرآن پڑھانے کا انتظام مسجدوں ہی [illegible] خلافت راشدہ میں مسجد کتاب و سنت کی تعلیم کی روشنی کا سب سے اونچا مینار ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، طائف، یمن اور نجد وغیرہ سب مقامات کی مساجد اسلامی تعلیم کے بڑے بڑے مراکز تھے اور ان میں نماز باجماعت، جمعہ، درس و تدریس اور وعظ و تلقین کا اہتمام ہوتا تھا۔

۳۔ مرکز تبلیغ اسلام

مسجد تبلیغ اسلام کا اہم ترین مرکز ہے۔ اسلامی عقائد و اعمال اور احکام یہیں سے لوگوں تک پہنچائے جاتے ہیں۔ وعظ و ارشاد اور خطبہ مسجد میں دیا جاتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور سے یہ رواج چلا آتا ہے کہ جب کہیں شہر آباد کرنا ہوتا تو سب سے پہلے مسجد تعمیر کی جاتی۔ کوفہ، مصر، واسط وغیرہ کی آبادی و تعمیر کی ابتدا مسجد سے ہوئی تھی۔ سب سے پہلے اس مرکز اسلام کی تعمیر کی جاتی اور پھر اس کے ارد گرد محلے، بازار، سرکاری عمارتیں اور رہائشی مکانات بنائے جاتے تھے۔ سب

سے بڑی مسجد کے علاوہ اردگرد کے محلوں میں چھوٹی مسجدیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ خود حضورؐ کے زمانے میں مدینہ منورہ میں مختلف محلوں میں چھوٹی مساجد بھی موجود تھیں، جن میں تعلیم و تبلیغ کے امور کی نگرانی خود حضورؐ فرماتے تھے۔ سوائے کسی اہم ضرورت کے ہر جلسہ، وعظ اور تبلیغی مجالس مسجدیں منعقد ہوتی تھیں۔ تبلیغی وفد، مبلغینِ اسلام کی جماعتیں، مدرس و معلم قرآن مسجد ہی سے روانہ کیے جاتے تھے۔

۴۔ دارالامارت

عہدِ نبویؐ اور خلفائے راشدین کے مبارک اور مثالی دور میں مسجد کی اہمیت دارالامارۃ (گورنمنٹ ہاؤس) کی بھی تھی۔ اہم سیاسی مشورے مسجد ہی میں ہوتے تھے۔ اسلامی مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا اجلاس مسجد ہی میں ہوتا تھا حضورؐ کو جب کوئی مشورہ کرنا ہوتا یا کوئی اہم اعلان فرمانا ہوتا تو منادی کرادی جاتی تھی کہ:

اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ

(سب لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں)

چنانچہ نماز کے بعد مجمع سے خطاب فرمایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں باہر سے آنے والے وفود کی ملاقات مسجد ہی میں ہوتی تھی۔ یہیں معاہدے منعقد ہوئے تھے۔ مہمانوں کو اسی میں ٹھہرایا جاتا تھا حضورؐ نے نجران کے عیسائیوں کے وفد کو مسجد میں ٹھہرایا تھا اور ان کی خواہش پر انہیں اپنے طریقے پر عبادت کر لینے کی بھی اجازت فرمائی تھی۔ الغرض ہر ضروری اجتماعی کے لیے مسجد ہی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔

۵۔ عدالت گاہ

عہدِ رسالتؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں مقدمات کے فیصلے بھی مسجد ہی میں ہوتے تھے۔ ہر مظلوم کے لیے ہر وقت اس فطرتی اور سادہ عدالت کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ لوگ جب چاہتے بے خطر مسجد میں حاضر ہو کر اپنی شکایات، مشکلات و مصائب اور مقدمات پیش کر دیتے تھے اور ان کا فیصلہ پورے عدل و انصاف کے ساتھ برسرِ عام کم سے کم مدت میں سنا دیا جاتا تھا۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق جمعہ اور عیدین کی امامت و خطابت حاکم اعلیٰ یا اس کے نائب کے ذمہ ہے۔ خلفاء خود نماز پڑھایا کرتے، خود خطبہ دیتے اور لوگوں سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے۔ بعد کے ادوار میں گو عدالتیں تعمیر ہو گئی تھیں تاہم مسجد کی مرکزیت پھر بھی بحال رہی۔

۶۔ جہاد کی تیاریوں کا مرکز

عہدِ نبویؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں مجاہدین کے لشکر مسجد ہی سے روانہ کیے جاتے تھے حضورؐ

نے جتنے لشکر مختلف مہموں پر بھیجے، وہ مسجد ہی سے روانہ کئے گئے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں مشہور لشکرِ اُسامہؓ مسجد ہی سے نکلا تھا۔ مرتدین کی سرکوبی اور منکرین زکوٰۃ کو براہ راست پر لانے کے لیے دورِ صدیقی میں جتنے لشکر بھیجے گئے، وہ سب مسجد نبویؐ ہی سے بھیجے گئے تھے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں جنگی مشورے، لشکروں کی ترتیب و تقسیم، سپہ سالاروں کا تقرر وغیرہ سب کام مسجد ہی میں سرانجام پاتے تھے۔ مسجد سے ان حضرات کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ خلفاء کی بیعت مسجد میں ہوتی تھی اور وہ عمر بھر مسجد ہی کو مرکز اسلام کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

۷۔ اخلاقی تربیت گاہ

مسجد ظاہری و باطنی طہارت و پاکیزگی کا مرکز ہے۔ شریعت میں مسجد کے ایسے آداب مقرر کئے گئے ہیں کہ کوئی شخص جب تک صاف و پاکیزہ نہ ہو، مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ان آداب کا تقاضا ہے کہ جسم اور لباس ظاہری اور باطنی پلیدیوں سے پاک ہو۔ اگر غسل کی حاجت ہو تو مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔ بلاوجہ بے وضو داخل ہونا بھی پسندیدہ فعل نہیں۔ جب تک کوئی شخص مسجد میں رہے، اسے عاجزی اور خوفِ الٰہی کا اظہار لازم ہے۔ بلاضرورت مسجد میں سونا جائز نہیں۔ مسجد کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک رکھنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسمٰعیلؑ کو حکم دیا تھا۔

أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ (البقرۃ : ۱۲۵)

ترجمہ: یہ کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھو۔

مسجد میں شور مچانا، خرید و فروخت کرنا، سوال کرنا، حلقے بنا کر دنیاوی باتیں کرنا یا گپیں ہانکنا وغیرہ سب ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ مسجد ایک عظیم اخلاقی تربیت گاہ ہے۔

۸۔ اسلامی اتحاد و تنظیم کا مرکز

مسجد مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق اور نظم و ضبط کا سبق سکھاتی ہے۔ ایک امام کے پیچھے کندھے سے کندھا ملا کر پانچ وقت کھڑے ہونا اور اس کے ماتحت نمازوں میں حرکت و سکون کا مظاہرہ کرنا اسلامی جماعت بندی اور اطاعتِ امیر کا سبق سکھاتا ہے۔ نماز باجماعت کی تاکید کی گئی ہے اور بلا عذر شرعی جماعت کو ترک کرنا جائز نہیں۔ اس سے اسلامی اجتماعیت اور تنظیم کی اہمیت واضح ہوتی ہے نماز کو وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کیا گیا ہے اور اذان کی آواز سنتے ہی اہلِ اسلام کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے پابندیٔ وقت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ جب ہزارہا

مسلمان ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ امام کی اقتداء میں نماز ادا کرتے ہیں اور اس کی آواز پر اکٹھے حرکت کرتے ہیں تو اس سے اسلامی شان وشوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب وہ خاموشی سے خطیب کا وعظ سنتے ہیں تو اس سے ان کی شانِ یکجائی اور وحدت امت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

۹ اسلامی مساوات کا مظاہرہ

مسجد کا وجود اسلامی مساوات کا جیتا جاگتا مظاہرہ ہے۔ مسجد اونچ نیچ کو برابر کرتی ہے رنگ وخون اور حسب ونسب اور نسل وقوم کے امتیاز کو مٹاتی ہے۔ سب مسلمان صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی کے لیے کوئی مخصوص جگہ نہیں۔ مسجد پر سب کے حقوق برابر ہیں۔ کسی کو اس کی جگہ سے اٹھایا نہیں جاسکتا۔ جو پہلے آئے وہ اگلی صف میں اور جو بعد میں آئے وہ پچھلی صف میں بیٹھے۔ چاہے وہ کوئی ہو۔ اسلام نے اخوت اسلامی اور مساواتِ انسانی کے جو سنہری اصول پیش کئے ہیں، مسجد میں ان کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ مسجد میں داخل ہونے اور عبادت کرنے سے کسی کو روکا نہیں جاسکتا۔ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

(شکوہ۔ علامہ اقبالؒ)

۱۰۔ عظمت اسلام کی علامت

مسجد اسلامی عظمت وشوکت کا شعار ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبویؐ کی تعمیر وتوسیع کی اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ اور بعد کے حکمران آج تک اس پاک ومقدس مسجد کی توسیع وتعمیر اور مرمت کو سعادت سمجھتے رہے ہیں۔ ہر زمانے میں مسلم سربراہوں نے کعبۃ اللہ اور مسجد نبویؐ پر بے پناہ روپیہ خرچ کرنا اور ان کی شان وشوکت کو چار چاند لگانا اپنے فرائض دینی میں شامل سمجھا ہے۔ مسلم حکمران نے دمشق، بغداد، قاہرہ، کوفہ، بصرہ اور سپین وغیرہ میں عظیم الشان مساجد تعمیر کیں مغلوں نے دہلی، لاہور، فتح پور سیکری اور دیگر متعدد مقامات پر عالیشان مسجدیں بنوائیں اور ان کے ساتھ بڑی بڑی جائیدادیں وقف کیں۔ ان میں دینی تعلیم وتدریس کا انتظام کیا۔ دہلی میں شاہجہانی مسجد اور لاہور میں عالمگیری مسجد اب بھی دنیا بھر کے سیاحوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہیں اسلام آباد کی فیصل مسجد جسے سعودی حکومت نے تعمیر کیا ہے، فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ الغرض

مسجد کے اونچے مینار اور مؤذن کی سریلی آواز ہر شخص کو عظمت اسلام کے اعتراف پر مجبور کرتے ہیں
حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ہے :

"جس اللہ کی ذاتِ اقدس، کعبۃ اللہ، قرآن مجید، قربانی اور اذانِ اسلام کے بڑے بڑے شعائر ہیں، جن کی عزت و حرمت کو قائم کرنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں داخل ہے"

مسجد آج کے دور میں

اسلام کے دشمن شروع سے مسلمانوں کو زک پہنچانے کے درپے رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں کا اصل مرکز، مسجد مضبوط رہا، دشمن ناکام رہے، لیکن جونہی یہ مرکز کمزور ہوا، مسلمان اپنی حیثیت کھو بیٹھے۔ یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ ہماری اکثر و بیشتر مساجد (الا ماشاء اللہ، سوائے چند ایک کے) ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کرنے سے قاصر ہیں، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس یہ مسجدیں بالعموم فرقہ بندی، تعصب، تنگ نظری اور انتشار کے اکھاڑے بن کر رہ گئی ہیں اور اس کے نتیجہ میں نئی پود اسلام کے اس عظیم الشان مرکز سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں شدید ضرورت ہے کہ مساجد کی از سرِ نو تنظیم و تطہیر کی جائے تاکہ یہ پھر سے صحیح معنوں میں مرکزِ اسلام بن سکیں۔ علامہ اقبال نے اس المیہ کا کس دردمندی سے اظہار کیا ہے۔

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی — برقِ طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی — فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے

(جوابِ شکوہ)

مسجد کی عظمت رفتہ کی بحالی کے اقدامات

۱۔ مسجد کی امامت کے لیے موزوں افراد کا انتخاب کیا جائے۔ خطبہ دینے والوں کا کسی معتبر دینی ادارے یا یونیورسٹی سے سند یافتہ ہونا ضروری قرار دیا جائے تاکہ غلط قسم کے نااہل اور غیر ذمہ دار لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے مقام پر مسلط نہ ہو سکیں۔ اس ضمن میں ہر فرقے اور مسلک کے لیے ان کا مسلمہ معیار مقرر کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ فرقہ وارانہ فروعی مسائل کا برسرِ عام بیان کرنا اور ان پر زیادہ زور دینا قانوناً جرم قرار دیا جائے۔ خطیب صرف اصولی، بنیادی اور اتفاقی مسائل ہی بیان کریں اور اختلافی مسائل کو

چھیڑنے سے گریز کریں۔

۳۔ رواداری کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ فقہی اختلاف کو علمی حدود میں رکھیں اور اسے عداوت، نفرت اور انتشار کا موجب نہ بننے دیا جائے۔

۴۔ قرآن وسنت کی تعلیمات کو ان کے اصل رنگ اور انداز میں پیش کیا جائے۔

۵۔ مساجد کی انجمنوں اور انتظامی کمیٹیوں میں ایسے لوگ رکھے جائیں، جو دیندار، پڑھے لکھے اور ذمہ دار ہوں۔ وہ خالص دینی مقاصد کے لیے کام کریں۔

۶۔ مساجد کی تنظیم اور ان کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے یا تو محکمہ اوقاف کی توسیع کی جائے اور ملک کی تمام مساجد کو اس کے زیر اہتمام منظم کیا جائے یا اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ایک نیا محکمہ "تنظیم واصلاحِ مساجد" کے نام سے قائم کیا جائے۔ یہ محکمہ ہر مسجد کے انتظام واہتمام کی چھان بین کرے اور جہاں خرابی نظر آئے اسے دور کرے۔

۷۔ ہمارے حکام کو اپنے اسلاف کی پیروی کرتے ہوئے خود مسجدوں میں حاضر ہونا چاہیئے ان کے انتظامات میں دلچسپی لینی چاہیئے اور ان کی سرپرستی و نگرانی کرنی چاہیئے بلکہ خود جمعہ اور عیدین کے موقع پر خطبہ دینا چاہیئے۔

۸۔ ہر مسجد کو مکتب کی حیثیت دی جائے اور وہاں دینی تعلیم کا مناسب بندوبست کیا جائے۔

۹۔ ہر جامع مسجد کے ساتھ ایک عمدہ مثالی کتب خانہ (لائبریری) قائم کیا جائے۔

۱۰۔ ہر مرکزی مسجد کے ساتھ مہمان خانے تعمیر کئے جائیں۔

۱۱۔ مساجد کے ساتھ شفاخانے قائم کئے جائیں۔

۱۲۔ ہر مسجد کے ساتھ بیت المال قائم کیا جائے اور مسجد کو اہلِ محلہ یا بستی کی جملہ تعمیری واصلاحی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے۔

۱۳۔ جید علمائے کرام سے گاہ بگاہ استفادہ کیا جائے۔

آداب مسجد

۱۔ مسجد کو پاک وصاف رکھنا اور گرد وغبار جھاڑنا مسلمانوں کا فریضہ ہے۔

۲ مسجدوں میں بدبودار چیزوں کا لے جانا منع ہے۔ اگر کوئی ناگوار بو والی چیز کھائی ہو مثلاً لہسن یا پیاز تو منہ کو صاف کر لینا چاہیئے۔

۳ مسجد میں تھوکنا یا ناک صاف کرکے فضلہ پھینکنا منع ہے۔

۴۔ مسجد میں خرید وفروخت کرنا اور سوال کرنا منع ہے

۵۔ مسجد میں فضول اور دنیاوی باتوں سے پرہیز کیا جائے۔
۶۔ مسجد میں بلا وجہ سونا منع ہے۔
۷۔ جب لوگ نماز پڑھ رہے ہوں تو ان کے سامنے سے گزرنا منع ہے۔
۸۔ مسجد میں دیر سے آنے والوں کا اگلی صف میں جانے کے لیے لوگوں کے کندھے پھلانگ کر جانا منع ہے۔
۹۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھنا سنت ہے اسے تحیۃ المسجد کہتے ہیں۔
۱۰۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے اندر رکھنا چاہیئے اور یہ دعا پڑھنی چاہیئے:

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ

یعنی: یا اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

اسی طرح مسجد سے باہر نکلتے وقت بایاں پاؤں پہلے باہر رکھنا چاہیئے اور یہ دعا پڑھنی چاہیئے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ

یعنی: "اے اللہ! میں تیرے فضل کا طلب گار ہوں۔

۱۱۔ مسجد میں خاموشی سے جائے اور بات کرنی ہو تو آہستہ کی جائے۔ زیادہ وقت ذکر اذکار نوافل اور تلاوتِ قرآن پر خرچ کیا جائے۔
۱۲۔ مسجد میں کسی پر ظلم و زیادتی نہ کی جائے کسی کی تحقیر نہ کی جائے۔ کسی کو اذیت نہ دی جائے بلکہ اخوت و محبت، مساوات اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا جائے۔

اسلامی معاشرہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

ترجمہ: بے شک سب اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں۔

سوال: اسلامی معاشرے کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟ معاشرے کی برائیوں کو دور کرنے کے لیے اسلام کیا تدابیر اختیار کرتا ہے؟

جواب: **معاشرہ کا مفہوم و اہمیت**

علمائے شہریت نے معاشرے کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ اس سے مراد افراد کا

وہ گھر ہے، جو کسی مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے منظم ہوا ہو۔ جو گروہ کسی خاص مقصد کے لیے وجود میں نہ لایا جائے، اسے انبوہ یا ہجوم کہا جائے گا۔ معاشرے کی تشکیل میں مقصد اور اس کے حصول کے لیے اجتماع دونوں چیزیں پائی جانی ضروری ہیں۔

بقول ارسطو انسان فطری طور پر مدنی الطبع (Social Animal) ہے، وہ مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ انسان ویسے بھی اپنی ضروریات میں ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ لوہار، ترکھان، جولاہا موچی، کمہار، کسان، تاجر، ڈاکٹر، معلم، افسر، ماتحت وغیرہ سب ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ معاشرے کے اجزائے ترکیبی چار ہیں، افراد، خاندان، رشتہ دار اور ہمسائے ان اکائیوں کے صحیح طور پر مربوط ہونے ہی سے مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

اسلامی معاشرہ

افراد کا وہ مجموعہ جو اسلام کو اپنا مقصد حیات قرار دے لے اور اپنی تمدنی، تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق گزارنے کا تہیہ کر لے، اسے اسلامی معاشرہ کہا جاتا ہے اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جس کے احکام و قوانین زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اس نے گھریلو زندگی اور سیاسی زندگی کے واضح اصول و ضوابط اپنائے تو اسے مسلم معاشرہ تو کہا جا سکتا ہے مگر اسلامی معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی معاشرے سے مراد افراد کا وہ مجموعہ ہے جو ایک خدا، اس کے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آخری کتاب قرآن مجید، آخرت، جزا و سزا اور ملائکہ پر ایمان رکھیں اور باہم مل کر بامقصد زندگی بسر کریں۔ ان کی تہذیب، معاشرت، معاملات، کاروبار، حقوق و فرائض، تدبیر منزل، امور سیاسب، سب ایک اللہ، رسولؐ اور قرآن مجید کے احکامات کے تابع ہوں گے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان (اقبالؒ)

اسلامی معاشرے کی خصوصیات

اسلامی معاشرہ منفرد حیثیت رکھتا ہے، جو اسلامی عقائد و نظریات اور ضابطہ حیات کا ترجمان ہے۔ اس کی یہی انفرادیت اسے دوسرے معاشروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ذیل میں اس کی اہم خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ توحید

اسلامی معاشرے کی بنیادی خصوصیت "توحید" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا خالق اور مالک اللہ تعالےٰ ہے۔ اس کے سوا کوئی

معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک اور ہمسر نہیں ہے۔ تمام مخلوق اسی کی پیدا کردہ ہے، وہ بے نیاز ہے، سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ یہ انسان کی بہت بڑی توہین ہے کہ وہ اپنے جیسی یا اپنے سے کم تر ہستیوں کے سامنے سربسجود ہو۔ توحید کے ذریعے اسلام نے انسانیت کو اس کا صحیح مقام بخشا ہے اور مخلوق میں تمیز اور تفریق کو ختم کر دیا ہے۔ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت اور حاکمیت اعلیٰ کا اقرار نیز اس کے احکام پر عمل پیرا ہونا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مسلمان صرف اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں کی حدود میں رہ کر زندگی گزارتا ہے اور وہ صرف اپنے معبود حقیقی کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ نظریہ توحید کے تحت تمام انسان برابر ہیں اور رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں میں کوئی تمیز نہیں۔ تمام انسانوں پر احکامِ خداوندی یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ کوئی امیر ہو یا غریب، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ البتہ اللہ کے نزدیک وہی شخص سب سے معزز ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

۲۔ رسالت

کلمہ طیبہ اسلام کا پہلا رکن ہے۔ اس کلمے کے پہلے حصّے یعنی توحید کا بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے حصّے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ رسالت کی تصدیق کے ساتھ خود بخود یہ بات ہم پر لازم ہو جاتی ہے کہ خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، کتبِ آسمانی اور انبیاء و آخرت کے متعلق جو کچھ اور جیسا کچھ آنحضرتؐ نے تعلیم فرمایا ہے، اس پر ایمان لائیں اور خدا کی عبادت اور فرمانبرداری کا جو طریقہ حضورؐ نے بتایا ہے، اس کی پیروی کریں۔ خدا کے آخری رسول کی حیثیت سے جو دین اور شریعت حضورؐ لاتے ہیں، اس پر عمل کریں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ: بیشک تمہارے لیے رسول اللہؐ کی ہستی میں بہترین نمونہ ہے۔

؎ کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں (اقبالؒ)

۳۔ اخوت و مساوات

اسلامی تعلیمات کی رو سے سب انسان، انسان ہونے کے لحاظ سے برابر ہیں۔ رنگ، نسل، خون، خاندان اور ذات برادری کے اختلافات محض جغرافیائی اختلاف یا آب و ہوا کے فرق کی وجہ سے ہیں اور

ان کا مقصد محض تعارف اور پہچان ہے۔ بزرگی اور بڑائی کا معیار نیکی اور خوفِ خدا ہے۔
قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے،

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى
وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (الحجرات: ۱۳)

ترجمہ، اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد عورت سے پیدا کیا اور تمہاری برادریاں اور خاندان بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلا شبہ اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔

پھر فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

ترجمہ: بے شک سب اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری خطبۂ حج میں فرمایا تھا:

"اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ (آدمؑ) بھی ایک ہے۔ کسی عربی کو غیر عربی پر غیر عربی کو عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے سوائے تقویٰ کے۔"

یہی اسلامی اخوت اور انسانی مساوات کا محکم عقیدہ اسلامی معاشرے کی بنیاد ہے۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کا ایک واحد معاشرہ ہے، جس کی بنیاد میں انسانی شرف و بزرگی اور اسلامی بھائی چارے کا عظیم تصور رچا ہوا ہے، اس معاشرے کی بنیاد جغرافیائی حدبندیوں اور رنگ و نسل کے اختلافات سے بالاتر ہے۔ اس معاشرے میں قومیت کی بجائے بین الاقوامیت پائی جاتی ہے، یہ سارے جہان کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کا داعی ہے اور اس میں ہمہ گیریت اور آفاقیت پائی جاتی ہے۔

غبارِ آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
(اقبالؒ)

۴۔ عدل واحسان

اگر غور سے دیکھا جائے تو اسلامی معاشرے کی جان عدل واحسان ہے۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ایک

دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں، ان کے جذبات واحساسات کا احترام کریں اور اپنے فرائض کو بخوشی ادا کریں۔ جبکہ احسان کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں سے معاملہ کرتے وقت ان کے حق سے بھی کچھ زیادہ انہیں دے دیا جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ

ترجمہ: بلاشبہ اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔"

عدل سے حقوق وفرائض کی ادائیگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور احسان سے ہمدردی، خیر خواہی، انسانیت کی محبت، دردِ دل اور خدمت وتواضع کے اعلیٰ جذبات اُبھرتے ہیں۔ ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ وبیاں (میر درد)

دنیا کے کسی معاشرے نے عقیدے کے طور پر عدل واحسان کو وہ اہمیت نہیں دی جو اسلام نے دی ہے۔

۵۔ فرد اور جماعت میں توازن

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں (اقبال)

دنیا میں دو قسم کے غیر اسلامی معاشرے پائے جاتے ہیں۔ پہلے معاشرے میں فرد کو غیر محدود بلکہ مادر پدر آزادی حاصل ہے۔ مثلاً مغربی معاشرہ۔ جبکہ دوسرے معاشرے میں فرد کی آزادی وانفرادیت کو معاشرے پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ یہ عامرانہ نظام ہے۔ جیسے کمیونسٹ معاشرہ ـــــ اسلام ان دونوں نظریات کے درمیان ایک تیسری راہِ اعتدال اختیار کرتا ہے جس میں فرد کے پنپنے اور ترقی کرنے کے پورے مواقع موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے بندھن بھی فطرتی حدود کے اندر رہتے ہیں۔ وہ نہ تو فرد کو معاشرے پر قربان کرتا ہے اور نہ معاشرے کو فرد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کا قائل ہے۔ اس نے فرد اور جماعت کے اندر ایک حسین و متوازن اور صالح تناسب قائم کیا ہے۔ دونوں اپنی اپنی حدود کے اندر رہتے ہیں معاشرے کو فرد کی مسلمہ آزادیوں پر دست اندازی کا کوئی حق نہیں اور فرد کو معاشرے کے اجتماعی مفاد کے خلاف کوئی حرکت کرنے کا اختیار نہیں۔ ہر ایک کے حقوق وفرائض کو واضح طور پر متعین کر دیا گیا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے   انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

۶۔ امداد باہمی

اسلامی معاشرہ کی فضاء بالعموم ان اچھائیوں سے پُر ہونی چاہیئے: خیر خواہی، ہمدردی، اشتراک و تعاون، ایثار و قربانی اور حسن سلوک وغیرہ۔ اسلام نے سلامتی کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ہر دو ملنے والوں پر ایک دوسرے کو سلام کہنا لازم ٹھہرایا ہے۔ اسلامی معاشرے میں حسد، بغض، نفرت و عداوت، ظلم و زیادتی، چغلی، غیبت، بدگمانی، فریب، الزام تراشی، بہتان طرازی اور ایک دوسرے کو بُرے نام سے پکارنا حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ: ۲)

ترجمہ: اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔

پھر فرمایا:

وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ط (القصص: ۷۷)

ترجمہ: جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی لوگوں سے بھلائی کیا کرو اور ملک میں طالبِ فساد نہ ہو۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ

ترجمہ: دین خیر خواہی کا نام ہے۔

پھر فرمایا: "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مومن بھائی کے لیے بھی وہی کچھ نہ چاہے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

پھر ارشاد ہوا: "مومن طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا اور گالیاں بکنے والا نہیں ہو سکتا۔"

۷۔ احساس ذمہ داری

اسلامی معاشرہ محض اس احساس پر ہی قائم نہیں ہے کہ فلاں فلاں کام اچھے ہیں، جن کی ادائیگی سے فرد اور جماعت کو فائدہ پہنچتا ہے، انہیں ادا کرنا افراد کا معاشرتی اور انسانی فریضہ ہے، جبکہ اس سے آگے بڑھ کر اسلام نے باہمی حقوق و فرائض کی اہمیت میں خالص دینی رنگ بھرا ہوا ہے اور بتایا

ہے کہ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بارے میں خدا کے حضور سوال ہو گا۔ جس طرح عبادات کو ترک کرنے والا گنہگار ہے اسی طرح معاشرتی حقوق و فرائض سے روگردانی کرنے والا بھی گنہگار اور خدا کا مجرم ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اسلام نے حقوق العباد کے بارے میں یہ تصور دیا ہے کہ وہ بالکل معاف نہ ہوں گے اللہ تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف کر سکتا ہے، لیکن بندوں کے حقوق تو بندے ہی معاف کریں تو کریں، ورنہ دوزخ کی آگ ہو گی اور حقوق العباد میں کوتاہی کرنے والے ہوں گے ارشادِ نبویؐ ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ

ترجمہ: تم میں سے ہر ایک نگہبان (ذمہ دار) ہے اور ہر ایک سے اسکی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائیگا

۸۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امر بالمعروف کا مطلب ہے نیکی کا حکم دینا اور نہی عن المنکر کے معنی ہیں برائی سے روکنا۔ اسلامی معاشرے کا ہر فرد نیکی پھیلانے اور برائی مٹانے پر مامور ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک خاص جماعت تیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے جس کا کام ہی یہ ہو کہ معاشرے کی نگہبانی اور محاسبہ کرتے رہیں۔ سارے اجتماعی وسائل و ذرائع کو اسی مقصد کے لیے صرف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی فریضہ کو امتِ اسلامیہ کا امتیازی نشان اور اسلامی حکومت کا مقصد ٹھہرایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۝ (آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: "تم وہ بہترین امت ہو، جسے لوگوں کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو"

ارشادِ نبویؐ ہے:

"تم جب کوئی برائی دیکھو تو اسے طاقت سے روک دو۔ اگر ایسا نہ کر سکو تو زبان سے روکو، اور اگر ایسا بھی نہ کر سکو تو دل سے اسے برا جانو۔ اور یہ کمزور ترین ایمان ہے"

ان اسلامی احکام سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی معاشرہ نیکیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے۔ یہ ایک اصولی اور مثالی معاشرہ ہے جس کے سامنے انسانیت کی بلند ترین اقدار ہیں۔ اچھائی کو جو اہمیت یہ معاشرہ دیتا ہے اور کوئی نہیں دیتا۔ برائی کے خلاف جو احساسِ بیزاری اس میں پایا جاتا ہے، دنیا بھر میں اور کوئی موجود نہیں ہے۔

۹۔ سادگی و پاکیزگی

اسلام نے ایک نہایت سادہ و پاکیزہ معاشرہ قائم کیا ہے۔ یہ سادگی لباس، خوراک، رہائش غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مطلوب ہے۔ اسی طرح پاکیزگی خیالات، جسم، لباس اور کمائی کے تمام ذرائع کو محیط ہے۔ اس بارے میں رزق حلال پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی معاشرہ پاکیزہ اخلاق کا مظہر ہوتا ہے اس میں اخلاق حسنہ کو اختیار کرنے اور برے اخلاق کو ترک کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ظاہر ہے، جب تک اخلاق درست نہ ہوں، اعمال و افعال کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ایک مثالی معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔

۱۰۔ دولت کی منصفانہ تقسیم

اسلامی معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم کا علمبردار ہے۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ معاشرے میں امیر تو امیر تر ہوتے جائیں اور غریب، غریب تر ہو کر رہ جائیں۔ رزق کی کمی بیشی اللہ کے اختیار میں ہے وہ جسے چاہے رزق میں کشادگی عطا کر دے اور جسے چاہے، رزق کی تنگی میں مبتلا کر دے۔ لیکن وہ اہلِ ثروت کو زیادہ مال و دولت عطا کر کے انہیں آزماتا ہے کہ وہ خدا کے عطا کردہ رزق کو راہِ خدا میں اور محروم طبقے پر کس طرح خرچ کرتے ہیں۔ چنانچہ زکوٰۃ کی ادائیگی کو فرض قرار دیا گیا ہے اور جو لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کا مال قیامت کے روز ان کے لیے عذاب کا سبب بن جائے گا۔ اسلام زکوٰۃ کے علاوہ بھی صدقات و خیرات اور جذبۂ ایثار و قربانی کی ترغیب دیتا ہے، تاکہ محروم طبقے کی محرومیوں کا ازالہ ہو سکے۔ اسلام جائز طریقوں سے دولت کمانے کو برا نہیں گردانتا، بس اس کی تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ اس دولت کی منصفانہ تقسیم ہو، دولت گردش میں رہے اسے خدا کی راہ میں اور ضرورت مندوں اور محتاجوں پر خرچ کیا جائے۔ تاکہ اسلامی معاشرے میں کوئی شخص غربت و افلاس کا شکار نہ ہو سکے اور سارے زندگی کی بنیادی سہولتیں میسر آ سکیں۔ زکوٰۃ کو اسلام کا خزانہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر زکوٰۃ پر مبنی اسلام کا اقتصادی نظام قائم کر دیا جائے تو معاشی مسئلہ بطریق احسن حل ہو سکتا ہے اور اس طرح ایک مثالی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

۱۱۔ برائیوں کے خاتمے کے لیے تدابیر

معاشرے کی برائیوں کو دور کرنے کے لیے اسلام کیا تدابیر اختیار کرتا ہے؟

اس سوال کا کچھ جواب تو "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے عنوان کے تحت آ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے ہر فرد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نیکیوں کو فروغ دے۔ انہیں نافذ و قائم کرے اور برائیوں سے روکے، ان کا خاتمہ کرے، ان کے خلاف محاذ قائم کرے۔ اگر ہر شخص یہ فریضہ

سرانجام دے تو معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور وہ امن و سلامتی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

اسلام کے نظامِ حیات میں تقویٰ کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اسے بلاشبہ تمام نیکیوں اور اچھائیوں کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر افرادِ معاشرہ میں تقویٰ یعنی خوفِ خدا کی صفت پیدا ہو جائے تو معاشرے سے خود بخود برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور اس مقصد کے لیے کسی قسم کی تعزیرات کی ضرورت نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ نبویؐ میں حضورؐ کے قائم کردہ معاشرے میں تقویٰ کی صفت افرادِ معاشرہ میں یوں رچ بس گئی تھی کہ برائیاں خود بخود ختم ہوتی گئیں اور نیکیاں فروغ پاتی رہیں۔ جب شراب کی حرمت کا اعلان ہوا تو لوگوں نے ساغر و جام وہیں روک لیے اور شراب کے مٹکے اپنے ہاتھ سے توڑ ڈالے اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں شراب بارش کے پانی کی طرح بہنے لگی۔ یہ صفتِ تقویٰ ہی کا کمال تھا کہ اگر کسی فرد سے نادانستہ کوئی گناہ سرزد ہو جاتا تو وہ خود بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر اعترافِ جرم کرتا اور شرعی سزا کا طلب گار ہوتا۔ یہ مثالی معاشرہ آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کی اکثریت بالعموم فطرتِ سلیم کی حامل ہوتی ہے اور وہ خود بخود خوفِ خدا کی وجہ سے اپنا دامن برائیوں سے بچا کر رکھتے ہیں۔ صرف چند بدفطرت افراد ایسے ہوتے ہیں، جو تقویٰ کی صفت سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ ایسے بدفطرت اور جرائم پیشہ افراد کے سدِباب کے لیے قانون کے کوڑے کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ اسلام نے ایسے مجرم افراد کے لیے کچھ تعزیرات کا تعین کیا ہے۔ چوری، ڈاکہ، قتل، رہزنی، بدکرداری، شراب نوشی، قماربازی جیسے سنگین جرائم کے لیے سنگین سزائیں رکھی گئی ہیں تاکہ ان سزاؤں کے نفاذ سے معاشرہ ہر قسم کی وارداتوں اور جرائم سے پاک ہو سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سعودی عرب میں ان شرعی تعزیرات کے نتیجہ میں وہاں جرائم کی شرح دنیا بھر کے ممالک کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے بلکہ برائے نام ہے۔

برائیوں کے خاتمے کے لیے اربابِ حکومت اور عوام کا اشتراک و تعاون نہایت ضروری ہے۔ اگر ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے اور بالخصوص محکمہ پولیس اپنے فرائضِ منصبی کو بطریق احسن ادا کرے تو برائیوں کا سدِباب ہو سکتا ہے اور معاشرہ اس امن و سلامتی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

؎ زمانہ منتظر ہے پھر نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی

(حفیظ جالندھری)

رشتہ داروں کے حقوق

سوال: قرآن و سنت کی روشنی میں رشتہ داروں کے حقوق کی وضاحت کیجئے۔

جواب: **رشتہ داروں کے حقوق**

اسلامی معاشرے میں رشتہ داری کی اہمیت

اسلامی معاشرے میں رشتہ داری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید نے بار بار "ذوی القربیٰ" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں قرابت دار۔ کتاب و سنت میں رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ بار بار صلہ رحمی پر زور دیا گیا ہے اور قطع رحمی سے روکا گیا ہے۔ خاندان کے بعد قرابت داری معاشرے کا دوسرا اہم ادارہ ہے۔ رشتہ داری اور قرابت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جو لوگ ماں باپ یا بھائی بہنوں کے متعلق سے یا سسرال کے تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار بنتے ہیں اسلام ان سب کو ہمدردی، خیرخواہی اور بوقت ضرورت مدد کی تلقین کرتا ہے۔ اگر یہ رشتہ دار ایک دوسرے کے حقوق اچھے طریقے سے ادا کرتے ہیں تو پورے خاندان اور برادری میں محبت اور اپنائیت کی فضا قائم ہو گی اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو نفرت اور دوری پیدا ہو جائے گی۔ اور آئے دن کے جھگڑوں سے خاندان کا سکون برباد ہو کر رہ جائے گا ظاہر ہے جو شخص رشتہ داروں کے تعلقات کا لحاظ نہیں رکھتا۔ اس سے یہ توقع کب ہو سکتی ہے کہ وہ عام مسلمانوں اور پھر دوسرے عام انسانوں کے حقوق کا خیال رکھے گا۔

ذیل میں رشتہ داروں کے اہم اور بنیادی حقوق بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔ حسن سلوک

کتاب و سنت میں والدین کے علاوہ رشتہ داروں کے ساتھ بھی احسان (حسن سلوک) کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی ان آیاتِ مبارکہ سے ظاہر ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ ۝ (النساء ۳۶)

ترجمہ: اور ماں باپ اور قرابت داروں کے ساتھ احسان (نیک سلوک) کرو۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (بنی اسرائیل: ۲۶)

ترجمہ: اور رشتہ داروں کو ان کا حق ادا کرو۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ (النساء: ۱)

ترجمہ: اور اللہ سے ڈرو جس کے نام سے تم ایک دوسرے کے حق مانگتے ہو۔ اور رشتہ داریوں کے معاملے میں حق تلفی سے ڈرو۔

احادیث مبارکہ میں بھی رشتہ داروں سے حسن سلوک پر بہت زور دیا گیا ہے، جیسا کہ ان ارشاداتِ نبویؐ سے ظاہر ہے۔

۱۔ جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے رشتہ داروں سے ملاپ کرنا چاہیے۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ جو شخص چاہے کہ اس کی روزی کشادہ ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے اپنے رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ (بخاری و مسلم)

۳۔ نادار کو صدقہ دینا صرف ایک نیکی ہے کہ وہ خیرات ہے، لیکن رشتہ دار کو دینے سے صدقہ بھی ادا ہوگا اور رشتہ داری کا حق بھی۔ (ترمذی)

۴۔ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھنے لگا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے جو جنت میں لے جائے۔ حضورؐ نے فرمایا وہ عمل یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، نماز قائم رکھے، زکوٰۃ ادا کرے اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ **صلہ رحمی** اسلام صلہ رحمی کی تعلیم دیتا ہے اور رشتہ داروں سے قطع تعلق کی ممانعت کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے معاشرے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ جو رشتہ دار بدسلوکی کریں۔ ان سے نیک سلوک کرنے کو کہا گیا ہے۔ ان کی اہمیت قرآن مجید کی ان آیاتِ مبارکہ سے ظاہر ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (الرعد: ۲۱)

ترجمہ: اور وہ قرابت داری ان رشتوں کو جوڑے رکھتے ہیں جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۝ (محمد: ۲۲)

ترجمہ: "(اے منافقو!) تم سے عجب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ تو ملک میں فساد کرنے لگو اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔"

وَيَقْطَعُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ ۙ أُو۟لَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوٓءُ ٱلدَّارِ ‎(الرعد: ۲۵)

ترجمہ: "اور جو لوگ ان رشتوں کو قطع کرتے ہیں جن کے ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد کرتے ہیں اور ان کے لئے لعنت ہے اور ان کا انجام بہت برا ہے۔"

مختلف احادیث مبارکہ میں بھی قطع تعلق کی سخت مذمت اور صلہ رحمی کی تاکید کی گئی ہے:

۱۔ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعُ رَحِمٍ

یعنی: "رشتہ داری کو قطع کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہو گا۔"

۲۔ "رشتہ داروں سے نیک سلوک کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلے احسان کرے بلکہ وہ ہے کہ جس کا رشتہ کٹ جائے تب بھی وہ اسے جوڑ لے۔" (بخاری)

۳۔ "بہترین خوش خلقی یہ ہے کہ تم تعلقات توڑنے والوں کو جوڑو اور جو تمہیں محروم کرے اسے عطا کرو اور جو تم پر زیادتی کرے اسے معاف کر دو۔" (مسند احمد، طبرانی)

۴۔ "ایک شخص نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں جن سے میں تعلق جوڑتا ہوں، مگر وہ مجھ سے رشتہ کاٹتے ہیں۔ میں ان سے نیک سلوک کرتا ہوں اور وہ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان کی کوتاہیوں کو برداشت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر زیادتی کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: اگر معاملہ وہی ہے جو تم نے بیان کیا ہے تو گویا تم انہیں گرم راکھ کھلا رہے ہو۔ اور جب تک تم ایسا کرتے رہو گے۔ اللہ تمہاری پشت پر رہے گا۔" (مسلم)

۵۔ "رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے: جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے۔"

۶۔ "جب اللہ تعالےٰ مخلوق کو پیدا کر چکا تو رحم (رشتہ) اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: "اے اللہ! میں تجھ سے قطع تعلقی سے پناہ مانگتا ہوں۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں! کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تجھے ملانے والوں کو میں ملاؤں گا اور تجھے کاٹنے والوں کو میں قطع کر دوں گا۔" (بخاری ومسلم)

۳۔ **مالی امداد کرنا** عام حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کے علاوہ کتاب و سنت میں رشتہ داروں کی مالی خدمت کی بھی بہت ترغیب دی گئی ہے ۔

جیسا کہ قرآن مجید کی ان آیات مبارکہ سے ظاہر ہے :۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى (البقرہ: ۱۷۶)

ترجمہ: "نیک وہ شخص ہے جو رضائے الٰہی کے لئے رشتہ داروں کو مال دے ۔"

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (البقرہ: ۲۱۵)

ترجمہ: "آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا ۔"

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى ۝ (النحل: ۹۰)

ترجمہ: "بے شک اللہ تم کو احسان اور انصاف کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے ۔"

احادیث مبارکہ میں بھی رشتہ داروں کی خاص طور پر مالی امداد کرنے کی تاکید کی گئی ہے :

۱۔ "نادار کو صدقہ دینا صرف ایک نیکی ہے کہ وہ خیرات ہے، لیکن رشتہ دار کو دینے سے صدقہ بھی ادا ہو گا اور رشتہ داری کا حق بھی ادا ہو گا ۔" (ترمذی)

۲۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ اپنا ایک باغ صدقہ کرنا چاہتے تھے حضورؐ نے انہیں حکم دیا کہ اسے اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دو ۔

۳۔ بوقت ضرورت مالی امداد کے علاوہ اسلام رشتہ داروں کی عام اخلاقی و مادی امداد کا بھی حکم دیتا ہے ۔

ارشاد نبویؐ ہے: "اپنے بھائی کی مدد کر، چاہے وہ ظالم ہو چاہے مظلوم ۔" یاد رہے کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دیا جائے ۔

۴۔ **وراثت کا حصہ** اسلام نے رشتہ داروں کو وراثت کا حصہ بنایا ہے ۔ قریبی رشتہ داروں کی عدم موجودگی میں وراثت دور کے رشتہ داروں کو ملتی ہے جنہیں قرآن اُولُوا الْاَرْحَام کے لفظ سے پکارتا ہے ۔ اس حقِ وراثت پر اگر غور کیا جائے تو رشتہ داروں کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿ (النساء : ۷)

ترجمہ: "جو مال ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ مریں، تھوڑا ہو یا بہت، اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی، یہ حصے (خدا کے) مقرر کئے ہوئے ہیں"

۵۔ رشتہ داروں سے پیار محبت

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا تو قبائل نے مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ سب سے زیادہ مخالفت مکہ والوں نے کی۔ جن میں حضورؐ کے دور و نزدیک کے رشتہ دار بھی شامل تھے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ انہیں کہیئے کہ اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو تمہاری مرضی، لیکن کم از کم دنیا کی عام روایت کا پاس کرتے ہوئے شرفا کی مانند یہ تو دیکھو کہ میں تمہارا رشتہ دار ہوں، اور شریف لوگ رشتہ داری کا لحاظ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ﴿ (الشوریٰ : ۲۳)

ترجمہ: (اے نبیؐ!) کہہ دو کہ میں اس کا تم سے صلہ نہیں مانگتا مگر (تم کو) قرابت کی محبت (تو چاہیئے)

اس آیت مبارکہ سے رشتہ داروں کی باہمی محبت ومودت کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مودت اللہ تعالےٰ کو پسند ہے، ورنہ وہ حضورؐ کو اس کی اہمیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کا حکم نہ دیتا۔

ہمسایوں کے حقوق

سوال: قرآن وسنت کی روشنی میں ہمسایوں کے حقوق بیان کیجیئے؟

جواب: ہمسایوں کے حقوق

۱۔ تعریف

ہمسایہ فارسی کا لفظ ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ پڑوسی کیا جاتا ہے عربی میں اس کے لئے جار کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسلام کے معاشرتی احکام میں یہ لفظ ذرا وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (النساء : ۳۶)

ترجمہ: "اور رشتہ دار ہمسایوں، اور اجنبی ہمسایوں اور رفقائے پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں) کے ساتھ احسان کرو۔"

اس آیت کریمہ کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں :

۱۔ وہ پڑوسی جو رشتے دار بھی ہوں۔

۲۔ غیر رشتے دار پڑوسی (خواہ وہ غیر مسلم ہوں)۔

۳۔ جن سے عارضی طور پر تعلقات قائم ہو جائیں مثلاً ہم پیشہ، ہم جماعت یا ہمسفر وغیرہ۔

۲۔ حق ہمسایہ کی اہمیت

اسلام اپنے قائم کردہ معاشرے میں ہمدردی، مددگاری رفاقت اور خیر خواہی کا ماحول دیکھنا چاہتا ہے ساتھ رہنے والوں، قریب بسنے والوں، ہمسفروں اور ساتھیوں میں اگر باہمی ہمدردی و الفت اور اخوت و محبت کے جذبات نہ ہوں تو زندگی بے لطف اور اجیرن بن کر رہ جاتی ہے اسلام پڑوسیوں کو ہمدردی، مددگاری اور رفاقت کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر بھروسا کر سکیں۔ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا سکیں مصیبت میں ایک دوسرے کا ساتھ دے سکیں۔ ایک دوسرے کے پاس رہتے ہوئے اپنی جان و مال اور آبرو کو محفوظ سمجھ سکیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے :

اُطْلُبِ الْجَارَ قَبْلَ الدَّارِ ۝

یعنی : "گھر بنانے سے پہلے ہمسایہ تلاش کرو۔"

۳۔ ہمسایوں کے درجے

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ہمسایوں کے تین درجے ہیں :

۱۔ پہلے درجے میں وہ ہمسایہ جس کا ایک حق ہے۔ اس میں غیر مسلم ہمسایہ آتا ہے جس کا حق صرف ہمسائیگی کی بنا پر ہے۔

۲۔ دوسرا وہ جس کے دو حق ہیں (یعنی مسلمان ہمسایہ)۔ ایک حق ہمسائیگی کی وجہ سے اور دوسرا حق اسلام کے سبب سے۔

۳۔ تیسرا وہ ہمسایہ جس کے تین حق ہیں یعنی رشتہ دار مسلمان ہمسایہ۔ ایک ہمسائیگی کا حق، دوسرا اسلام کا حق اور تیسرا رشتہ داری کا حق۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ارشاد ہے کہ میں نے حضورؐ سے پوچھا کہ میرے دو ہمسائے ہیں۔ ایک کا دروازہ بالکل میرے گھر سے قریب ہے اور دوسرے کا دروازہ دور ہے۔ بعض دفعہ میرے پاس اتنی چیز نہیں ہوتی کہ دونوں کو بھجوا سکوں تو ان میں سے زیادہ حق کس کا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، جس کا دروازہ قریب ہے، اس کا حق زیادہ ہے۔ (بخاری)

۴۔ **ہمسائیگی کی حد**

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اپنے ہمسائے کی شکایت لے کر آیا حضورؐ نے اسے حکم دیا کہ مسجد کے دروازے پر اعلان کر دو کہ چالیس گھر ہمسائے ہوتے ہیں۔

مشہور محدث امام زہریؒ نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا کہ حضورؐ کی مراد یہ ہے کہ چاروں طرف کے چالیس چالیس گھر ہمسائیگی کے احکام میں داخل ہیں۔ (ابوداؤد۔ طبرانی)

حقوق ہمسائیگی

۱۔ **عزت و تکریم**

ارشاد نبویؐ ہے: "جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے اپنے ہمسائے کی عزت کرنی چاہیئے۔ (بخاری و مسلم)

نیز فرمایا: "اللہ کے نزدیک بہترین ہمسایہ وہ ہے جو اپنے ہمسایوں سے بہت اچھا سلوک کرتا ہے۔" (ترمذی)

۲۔ **حسن سلوک:** اس سلسلے میں آیت قرآنی اوپر بیان ہو چکی ہے۔

ارشادات نبویؐ

۱۔ جو شخص خدا اور رسولؐ سے محبت رکھتا ہے۔ اسے سچ بولنا چاہیئے۔ امانت میں خیانت نہ کرنا چاہیئے۔ اور ہمسایوں سے حسن سلوک کرنا چاہیئے۔ (بیہقی)

۲۔ اپنے ہمسائے سے نیک سلوک کرو گے تو پورے ایمان دار بن جاؤ گے۔ (ترمذی)

۳۔ ایک شخص نے حضورؐ سے پوچھا کہ مجھے کیونکر معلوم ہو سکتا ہے کہ میں اچھائی کر رہا ہوں یا برائی؟ حضورؐ نے فرمایا: اس کا معیار یہ ہے کہ جب تیرے ہمسائے کہیں کہ تو نیک کام کر رہا ہے تو سمجھ لے کہ تو نیک ہی کام کر رہا ہے اور جب تو انہیں یہ کہتا ہوا سُنے کہ تو بُرا کام کر رہا ہے تو سمجھ لے کہ تو واقعی بُرا کام کر رہا ہے۔ (مسند احمد۔ طبرانی)

۳۔ **ایذارسانی سے پرہیز:۔**

ارشادات نبویؐ

۱۔ حضورؐ نے تین مرتبہ قسم کھا کر فرمایا کہ وہ شخص ایماندار نہیں جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں اور تکلیفوں سے محفوظ نہ ہو۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ جس کی شرارتوں سے اس کا ہمسایہ محفوظ نہ ہو، وہ جنت میں نہیں جائیگا۔ (مسلم)

۳۔ قیامت کے میدان میں سب سے پہلے جن دو شخصوں کا مقدمہ پیش ہوگا۔ وہ ہمسائے ہوں گے۔ (مسند احمد، طبرانی)

۴۔ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے ہمسائے کی شکایت کی۔ آپؐ نے اسے صبر

کا حکم دیا۔ وہ بار بار آتا اور یہی شکایت کرتا۔ آپ نے تیسری یا چوتھی مرتبہ فرمایا جاؤ اپنے گھر کا سامان نکال کر راستے پر ڈال دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ لوگ گزرتے اور ایک دوسرے سے پوچھتے کہ کیا سبب ہے؟ جواب ملتا کہ اس کے ہمسائے نے اسے سخت تکلیف دی ہے (اور یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہے) تو وہ ہمسائے کو برا بھلا کہتے۔ ہمسائے کو پتہ چلا تو آکر اس سے معافی مانگی اور آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔ (ابو داؤد)

۵۔ کوئی شخص اپنے ہمسائے کو اس بات سے منع نہیں کر سکتا کہ وہ درمیانی دیوار میں کیل ٹھونک لے۔ (بخاری و مسلم)

۶۔ دو عورتیں تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتی، دن کو روزے رکھتی، صدقہ و خیرات بھی بہت کرتی مگر زبان کی تیز تھی۔ زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھی لوگوں نے اس کا حال حضورؐ سے عرض کیا تو فرمایا: اس میں کوئی نیکی نہیں، اسے دوزخ کی سزا ملے گی۔ پھر صحابہؓ نے دوسری عورت کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتی اور معمولی صدقہ دے دیتی مگر کسی کو ستاتی نہ تھی۔ فرمایا: یہ عورت جنتی ہو گی۔ (بخاری)

۴۔ مالی خدمت:

ارشادات نبویؐ:

۱۔ جو شخص سیر ہو کر کھانا کھا لے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہ کر رات گزار دے، وہ مومن نہیں۔ (بیہقی)

۲۔ کوئی شخص ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ہمسائے کے لئے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔ (مسلم)

۳۔ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ہمسائے کے حق یہ ہیں:۔

اگر وہ تمہاری اطاعت کا طالب ہے تو اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ اگر تم سے مدد مانگے تو اس کی مدد کرو۔ اگر تم سے قرض مانگے تو اسے قرض دے دو۔ اگر وہ محتاج ہو تو اس کا خیال رکھو اگر بیمار ہو تو تیمارداری کرو۔ اگر مر جائے تو کفن دفن میں حصہ لو۔ اگر اسے کچھ بھلائی پہنچے تو مبارکباد دو۔ اگر وہ مصیبت میں ہو تو اظہار ہمدردی کرو۔ اپنے مکان کی عمارت اس سے بلند کر کے اس کی ہوا نہ روک دو۔ ہاں، اگر وہ اجازت دے دے تو جائز ہے۔ اسے ایذا مت دو۔ اگر کوئی پھل وغیرہ خرید کر لاؤ تو اسے بھی بھیجو، ورنہ پوشیدہ طور پر گھر میں لاؤ اور تمہارے بچے اسے لے کر باہر نہ جائیں تاکہ ہمسائے کے بچے دیکھ کر رنجیدہ نہ ہوں اور اپنی ہنڈیا میں زیادہ سالن پکا کر کچھ اسے بھی بھیج دو۔ (ابن عدی)

تحفہ دینا ایک دوسرے کو تحفے دینا محبت کا باعث ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

تَهَادُوْا تَحَابُّوْا

یعنی: "ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو، اس سے باہم محبت بڑھے گی۔"

لیکن ہمسایہ چونکہ زیر دیوار ہوتا ہے اس لئے اس کے متعلق ہدیے بھیجنے کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ جب ہنڈیا پکاؤ تو شوربا زیادہ بنایا کرو اور اس میں سے اپنے ہمسائے کو بھی بھیج دیا کرو۔ (مسلم)

حضورؐ نے عورتوں سے خاص طور پر خطاب کر کے فرمایا کہ اے مسلم عورتو! اپنی پڑوسنوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو بھی حقیر مت جانو، حتیٰ کہ اگر بکری کی کھری ہی بھیج سکو تو یہ بھی اہم چیز ہے۔ (بخاری، مسلم)

۶۔ حق شفعہ

حق شفعہ سے وہ حق مراد ہے جو گھر یا زمین کی ہمسائیگی یا شرکت سے حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ اسے ایک قانونی حق سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اس کی اخلاقی قدر و قیمت بھی بہت زیادہ ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے کہ "اگر کوئی شخص تمہاری دیوار میں برابر کا شریک ہے یا دیوار تو تمہاری ہے لیکن وہ تمہارا ہمسایہ ہے تو اس مکان کو اس وقت تک کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں جب تک پہلے اس ہمسائے کے سامنے اس کی فروخت کا معاملہ پیش نہ کر لو۔ اگر وہ چاہے تو خرید لے، ورنہ تم کسی اور کے ہاتھ بیچ سکتے ہو۔ (ابن ماجہ، حاکم)

حضورؐ نے ہمسائے کا یہ حق بھی قرار دیا ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کی دیوار پر اپنی لکڑی یا شہتیر وغیرہ رکھ سکتا ہے، چاہے وہ پسند کرے یا نہ کرے۔

۷۔ جان، مال اور عزت کی حفاظت

ہمسائے کا یہ بھی حق ہے کہ اس کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: "جو شخص اپنے جان و مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے" نیز فرمایا، "چوری حرام ہے لیکن دس چوریوں سے بڑھ کر جرم یہ ہے کہ اپنے پڑوسی کی چوری کرے۔" پھر ارشاد ہوتا ہے "زنا حرام ہے۔ لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر جرم یہ ہے کہ اپنے پڑوسی کی عورت سے بدکاری کی جائے۔" (بخاری)

مثل مشہور ہے: "ہمسایہ ماں جایا" یعنی ہمسائے کا حق ایسا ہی ہے جیسے ماں جائے کا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمسایہ کے جان، مال اور عزت و عصمت کی حفاظت ضروری ہے۔

۸۔ حق ہمسایہ کی خصوصی اہمیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمسائے سے حسنِ سلوک کو قربِ الٰہی کا ذریعہ بتاتا

ارشاد فرمایا: خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھیوں میں بہتر ہے اور پڑوسیوں

میں بھیجو جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی غرض سے ان سے فرمایا کہ جبرائیلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو وراثت کا حق نہ دلا دیں۔ حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

ایک صحابی حضرت مجاہدؓ سے بھی اسی قسم کی روایت بیان کی گئی ہے۔

۹۔ امام غزالیؒ کے ارشادات

امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب احیاء العلوم میں ہمسائے کے حقوق کی یہ تفصیل بیان کی ہے :۔

۱۔ ہمسائیگی کا حق صرف یہی نہیں کہ آدمی اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ پہنچائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی پہنچائی ہوئی تکلیفوں پر صبر کرے اور پھر اتنا ہی کافی نہیں بلکہ تکلیف دینے والے ہمسائے کے ساتھ نرمی اور نیکی کا سلوک کرے۔

۲۔ ہمسائے کو سلام میں پہل کرنا۔

۳۔ اس سے اکتا دینے والی لمبی گفتگو نہ کرنا۔

۴۔ اس کی بار بار مزاج پرسی کرنا۔

۵۔ بیماری میں اس کی تیمارداری کرنا۔

۶۔ مصیبت میں اظہار ہمدردی کرنا۔

۷۔ موت وغیرہ میں اس کا پورا ساتھ دینا۔

۸۔ خوشی میں اسے مبارکباد دینا اور اس کی خوشی میں شریک ہونا۔

۹۔ اس کی لغزشوں سے درگزر کرنا۔

۱۰۔ اپنی چھت سے اس کے مکان پر نہ جھانکنا۔

۱۱۔ پرنالہ اس کے مکان یا صحن کی طرف نہ رکھنا۔

۱۲۔ کوڑا کرکٹ اس کے مکان کے سامنے نہ ڈالنا۔

۱۳۔ اس کے مکان کا راستہ تنگ نہ کرنا۔

۱۴۔ وہ جو کچھ گھر میں لے جا رہا ہو اسے غور سے نہ دیکھنا۔

۱۵۔ اس کی کمزوریوں کو چھپانا اور اس کی پردہ پوشی کرنا۔

۱۶۔ بوقت ضرورت اس کا پورا ساتھ دینا۔

۱۷۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کا خیال رکھنا۔

۱۸۔ اس کے خلاف کسی کی غیبت اور چغلی نہ سننا۔

۱۹۔ اس کی عزت و حرمت سے نگاہ جھکا لینا۔

۲۰۔ اس کے ملازموں اور نوکرانیوں کی طرف نگاہ نہ اٹھانا۔

شہریوں کے حقوق و فرائض

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ

ترجمہ: تحقیق اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

سوال: شہری کے کیا معنی ہیں؟ اسلامی ریاست میں شہریوں کے حقوق و فرائض بیان کیجیے۔

جواب: **شہری کا مفہوم** لفظ (City) کے معنی شہر ہے اور (Citizen) کے معنی عام طور پر شہری یا شہر میں رہنے والا لیے جاتے ہیں جدید اصطلاح میں ہر وہ شخص شہری ہے جو ریاست کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور انتظامی امور میں براہ راست حصہ لے اور اسے تمام سیاسی اور معاشرتی حقوق حاصل ہوں۔ یا "شہری ریاست کا وہ باشندہ ہے جو ریاست کی طرف سے مہیا کی گئی تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہو اور جسے نہ صرف ہر قسم کے بنیادی حقوق حاصل ہوں بلکہ اس پر چند فرائض بھی عائد ہوتے ہوں، ریاست کی حدود میں بسنے والا ہر شخص اس کا شہری ہوتا ہے، خواہ وہ شہر میں رہتا ہو یا دیہات میں۔

اسلامی ریاست میں رہنے والے شہری دو قسم کے ہو سکتے ہیں، ایک مسلمان شہری اور دوسرے غیر مسلم شہری۔ غیر مسلم شہری کو اسلامی اصلاح میں "ذمی" کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری میں ہیں اور اسلامی ریاست ان کی خصوصی حفاظت کرتی ہے۔

(ب) **شہریوں کے حقوق و فرائض کی اہمیت** شہریت کا دائرہ محلہ داری اور ہمسائیگی سے وسیع تر ہے ایک ملک یا آبادی کے باشندے آپس میں کئی قسم کے تعلقات کی زنجیروں میں بندھے ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں لین دین کرتے ہیں۔ عبادت گاہوں میں جمع ہوتے ہیں۔ ان کے بہت سے مفاد مشترک ہوتے ہیں۔ حکومت سے انہیں بہت کچھ لینا اور اسے بہت کچھ دینا ہوتا ہے۔ اس لیے جب تک وہ اپنے فرائض ادا نہ کریں اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت نہ کریں، ریاست کا امن و امان قائم نہیں رہ سکتا اور نہ وہ خود آرام و آسائش کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے شہریوں پر کچھ فرائض عائد کیے ہیں اور انہیں کچھ حقوق دیئے ہیں، تاکہ وہ مل جل کر راحت و امن کی زندگی گزار سکیں۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے ✧ انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے (اقبال)

(ج) شہریوں کے حقوق کی اقسام

شہریوں کے حقوق وفرائض کی دو قسمیں ہیں کچھ حقوق وہ ہیں جو ریاست کے ذمہ ہیں اور ان کی ادائیگی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ اور کچھ حقوق وہ ہیں جو شہری ایک دوسرے کو اخلاقی طور پر ادا کرنے کے پابند ہیں لیکن ریاست اور حکومت ان میں دخل اندازی نہیں کرتی جب تک قوانین کی خلاف ورزی نہ ہو۔ احادیث مبارکہ کی روشنی میں ان حقوق وفرائض کی یوں وضاحت کی گئی ہے:

۱۔ ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کہنا پہلے سلام کہنے والا افضل ہے اور سلام کا جواب دینا واجب ہے۔

۲۔ جب کوئی مدد کے لیے بلائے یا دعوت کرے تو وقت پر حاضر ہونا۔

۳۔ جب دوسرا چھینک مار کر الحمدُ للہ کہے تو اس کے لیے دعا کرنا اور یرحمکُ اللہ کہنا۔

۴۔ بیماری میں اس کی تیمار داری کرنا۔

۵۔ موت کے وقت اس کے جنازے میں شامل ہونا۔

۶۔ جب کوئی تم پر بھروسہ کر کے قسم کھالے تو اس کی قسم پوری کرنا اور اس کے بھروسے کو ٹھیس نہ پہنچانا۔

۷۔ جب مشورہ طلب کیا جائے تو صحیح مشورہ دینا اور اس کی خیر خواہی کرنا۔

۸۔ اس کی غیر حاضری میں اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنا۔

۹۔ جو کچھ تم اپنے لیے پسند کرتے ہو، اس کے لیے بھی پسند کرنا اور اسے نیکیوں کی ترغیب دینا۔

۱۰۔ جو کچھ تمہیں اپنے لیے ناپسند ہے، اس کے لیے بھی ناپسند کرنا، اسے برائیوں سے روکنا اور ہاتھ اور زبان سے اسے ایذا نہ دینا۔

۱۱۔ نیک کاموں میں دوسروں سے تعاون کرنا اور معاشرے کی ہر قسم کی اصلاح میں لگے رہنا۔

۱۲۔ گنہگاروں سے دلی خیر خواہی کے پیش نظر ان کے لیے توبہ اور بخشش کی دعا کرنا۔

شہری کے حقوق

شہری کے حقوق چار قسم کے ہوتے ہیں:۔

۱۔ مذہبی حقوق ۲۔ سیاسی حقوق ۳۔ معاشی حقوق ۴۔ معاشرتی حقوق

۱۔ مذہبی حقوق

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو مذہب اور مسلک کی آزادی دیتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

یعنی: "دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں۔"

ذیل میں ان حقوق کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ عقیدہ کی آزادی

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو مذہب و مسلک کی آزادی دیتی ہے۔ اس کی اپنی بنیاد تو اسلامی عقیدے پر ہوتی ہے لیکن وہ کسی پر اس کو ٹھونستی نہیں۔ ہر شہری کو آزادی ہے کہ وہ جس مذہب و عقیدے کو چاہے، اختیار کرے۔ اس پر کوئی پابندی نہیں۔ کوئی حکومت کسی شہری کو اپنا عقیدہ و مذہب چھوڑنے یا اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ غیر مسلم شہری کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ دلائل و براہین سے کسی کو اسلام کی دعوت دینے کی اجازت ہے۔ خلافت راشدہ، خلافت بنی امیہ اور خلافت بنو عباس میں بہت سے غیر مسلم اہم عہدوں پر فائز رہے اور مسلم حکمرانوں نے انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہ کیا۔ خود ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری مشہور ہے۔

چونکہ اسلامی ریاست کی بنیاد دین اسلام پر ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ کھلم کھلا کفر و شرک کی تبلیغ کرے یا اسلام کے بنیادی و آفاقی اصولوں پر نکتہ چینی کرے اسی طرح مسلمان شہریوں کو بھی اجازت ہوگی کہ جس فقہی مسلک پر عمل کرنا چاہیں، اس پر عمل کریں فقہی اختلاف تو ہو سکتا ہے۔ لیکن فرقہ بندی اور انتشار کی رواداری نہیں ہو سکتی۔

۲۔ عبادت کی آزادی

اسلامی ریاست اس بات کی بھی ذمہ دار ہے کہ اس کے شہری اپنی عبادت اور مذہبی رسوم و رواج میں آزاد ہیں اس سلسلے میں ان پر کوئی پابندی اور روک ٹوک نہیں ہے۔

۳۔ عبادت گاہوں کی تعمیر میں آزادی

اسلام ریاست کے غیر مسلم باشندے اپنی عبادت گاہیں بھی تعمیر کر سکتے ہیں۔ البتہ اس بارے میں حکومت سے انہیں اجازت حاصل کرنا ضروری ہوگی۔ عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ سے لیکر آج تک مسلمانوں نے ہمیشہ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ہے اور ان کو تباہ کرنے یا مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ البتہ ان عبادت گاہوں کو سازش اور فتنہ و فساد کے مراکز بنانے کی اجازت نہیں۔

(ب) سیاسی حقوق

۱۔ تنقید اور فریاد کا حق

اسلامی ریاست کا ہر شہری حق رکھتا ہے کہ اپنی بات پوری آزادی سے ارکانِ حکومت تک پہنچائے اور اپنے مسائل اور تکالیف سے انہیں آگاہ کرے۔ ان پر دیانتدارانہ اور مخلصانہ تنقید کرے اور ان کی حکمت عملی پر اعتراض کرے۔ ارکانِ ریاست کا فرض ہے کہ ہر شہری کی بات سُنیں اور اسے مطمئن کریں۔ لوگوں نے خلفائے راشدینؓ پر برسرِ عام تنقید کی۔ انہیں ٹوکا اور ان حضرات نے خندہ پیشانی سے ان کی بات سنی اور اُن کی حوصلہ افزائی اور دادرسی کی۔

۲۔ اجتماع و تنظیم اور نقل و حرکت کی آزادی

اسلامی ریاست کے شہریوں کو جمع ہونے، اپنی تنظیم کرنے اور بلا روک ٹوک حدودِ سلطنت میں آنے جانے کا حق حاصل ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کے بغیر کسی کا یہ حق چھینا نہیں جا سکتا اور نہ اس پر کوئی پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ہر تنظیم کو آئینی حدود میں رہتے ہوئے جلسے جلوس کرنے کی اجازت ہے۔

۳۔ ووٹ دینے اور انتخاب لڑنے کا حق

اسلامی ریاست عوام کے مشورے سے قائم ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)

ترجمہ: اور ان کے معاملات آپس میں مشورے سے طے پاتے ہیں۔

لہٰذا ہر عاقل اور بالغ شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت کے چناؤ میں آزادی اور بغیر کسی دباؤ کے اپنا ووٹ استعمال کرے اور حکومت کے معاملات میں سرگرمی سے حصہ لے۔

اسی طرح ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت کے کسی منصب یا عہدے کیلئے انتخاب میں حصہ لے اور اگر دوسرے شہری اسے پسند کریں تو ووٹ کے ذریعے اسے چن لیں۔ اس بارے میں کوئی ممانعت یا پابندی نہیں ہے۔

۴۔ بے لاگ عدل و انصاف

اسلامی ریاست کے شہری کا یہ بھی ایک اہم اور بنیادی حق ہے کہ ریاست اسے ہر قسم کے ظلم و ستم اور زیادتی سے بچائے اور اگر کوئی اس پر ظلم و زیادتی کرے تو اسے بلا معاوضہ اور امیر و غریب

اور خاص و عام کے فرق کے بغیر بے لاگ عدل و انصاف مہیا کرے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں فرمایا تھا:

"تم میں جو لوگ کمزور ہیں وہ میرے نزدیک طاقتور ہیں، جب تک کہ میں خدا چاہے تو ان کا حق دلا دوں اور تم میں جو طاقتور ہیں وہ میرے نزدیک کمزور ہیں، جب تک کہ میں دوسروں کے حق وصول کر لوں۔ انشاء اللہ۔"

حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں:

"میں تم میں سے کسی کو کسی پر ظلم و تعدی نہیں کرنے دوں گا۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو میں اس کا ایک رخسار زمین پر رکھ کر دوسرے پر اپنا پاؤں رکھ دوں گا، حتیٰ کہ وہ حق کے سامنے جھک جائے۔"

(ج) معاشی حقوق

۱۔ حقوق ملکیت کی حفاظت جو چیز کسی شہری کی جائز ملکیت میں ہے، وہ بالکل محفوظ ہے۔ ریاست اس کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اور نہ خود اس میں مداخلت کر سکتی ہے، نہ کسی کو مداخلت کرنے دیتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

"حکومت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی شہری سے ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کوئی چیز لے۔"

شہری جو کچھ کمائیں گے، وہ ان کی ذاتی ملکیت ہو گی اور حکومت انہیں ان کی ذاتی ملکیت سے محروم نہیں کر سکتی، جب تک وہ حکومت کے واجبات ادا کرتے رہیں۔

۲۔ روزی کمانے کا حق ریاست کے باشندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی پسند اور قابلیت کے مطابق ذریعۂ معاش اختیار کریں البتہ یہ کاروبار اخلاقی اور شرعی لحاظ سے جائز ہونا چاہیئے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شہری جوا خانہ یا شراب خانہ کھولنا چاہے یا دیگر منشیات و بے حیائی کا کاروبار کرنا چاہے تو حکومت اسے روک دینے کا حق رکھتی ہے۔ نیز اس ضمن میں کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں ہونا چاہیئے اور معاشی مساوات کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیئے۔

۳۔ مال و جان کی حفاظت کا حق:۔ تمام شہریوں کے مال اور جائیداد کی حفاظت

کرنا بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ورنہ امن وامان کے ختم ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتے گا۔

۴۔ ضرورت مندوں کی کفالت

جو شہری حاجت مند ہوں اور ان کی ضروریات زندگی کا کوئی ذمہ دار نہ ہو، اسلامی ریاست ان کی تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار ہے۔ اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم برابر ہیں۔ اسلامی قانونِ وراثت میں جس شہری کا کوئی وارث نہ ہو، اس کی وراثت ریاست ہے۔ اسی طرح جس کا کوئی کفیل نہ ہو، اس کی ضروریات کی ذمہ دار بھی ریاست ہے۔

۵۔ مزدوروں کے حقوق کی حفاظت

اسلامی ریاست میں مزدوروں کو بھی معاش کے حقوق یکساں طور پر حاصل ہونے چاہئیں ان کی فلاح و بہبود کی طرف خاص توجہ دینی چاہیئے۔ ان کو معقول معاوضہ اور مناسب مراعات ملنی چاہئیں۔ ان کے اوقات کار مناسب و معقول ہونے چاہئیں اور انہیں پیداواری منافع میں برابر شریک کرنا چاہیئے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
(اقبالؒ)

۶۔ مزارع اور کاشتکار کا حق

اسلامی ریاست غلط قسم کے جاگیردارانہ نظام کے سخت خلاف ہے۔ زمینداری کے اس غلط نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے اور مزارع اور کاشت کار کو اس کا مناسب اور جائز حق ملنا چاہیئے۔ اصل زمیندار وہ ہے جو زمین خود کاشت کرے زمین کی پیداوار کے ثمرات میں معاشی مساوات ضروری ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
(اقبالؒ)

د۔ معاشرتی حقوق

۱۔ معاشرتی مساوات

اسلامی ریاست میں تمام شہری یکساں حیثیت رکھتے ہیں، نسل، خون، رنگ اور ذات، برادری کے اختلافات

کے باعث یا پیشے کی وجہ سے کسی شہری کو ادنیٰ یا اعلیٰ نہیں سمجھا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری خطبۂ حج میں فرمایا تھا:۔

"کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر سوائے تقویٰ کے کوئی برتری نہیں، تم سب اولادِ آدمؑ ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔"

۲۔ قانونی مساوات

اسلامی ریاست کا ہر شہری امیر ہو یا غریب، شہری ہو یا دیہاتی، شریف ہو یا عامی، حاکم ہو یا محکوم، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ سب پر ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے۔ ایک ہی نظامِ عدالت کے تحت مقدمات کا فیصلہ ہوتا ہے۔ کسی طبقے گروہ، خاندان، برادری یا شخص کے لیے کسی قسم کا کوئی قانونی امتیاز نہیں ہے۔ قریش کے ایک معزز گھرانے کی عورت چوری کے الزام میں پکڑی گئی۔ بعض لوگوں نے اس سلسلے میں سفارش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حضور اکرمؐ نے فرمایا: "خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔"

اسی طرح خلافت راشدہ میں قانونی مساوات کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔

۳۔ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت

اسلامی ریاست کے شہری کا اولین اور اہم ترین حق یہی ہے کہ اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لی جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان پر ایک دوسرے کا خون، مال اور عزت و آبرو سب حرام ہیں۔" (بخاری و مسلم)

ریاست کسی شہری کی ان چیزوں میں صرف اسلامی قانون کے اندر رہ کر ضرورت کے موقع پر دخل انداز ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں کا تحفظ ہی اسلامی ریاست کا اصل تقاضا ہے۔ اگر ان کی صحیح طور پر حفاظت ہو جائے تو ایک مثالی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

۴۔ شخصی آزادی کی حفاظت

اسلامی ریاست میں ہر شہری کی شخصی آزادی بالکل محفوظ ہے۔ اس میں کوئی دخل اندازی نہیں ہو سکتی۔ صرف شک و شبہ کی بنا پر کسی کی شخصی آزادی کو سلب نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کی نگاہ میں کسی شہری کی شخصی آزادی پر حملہ کرنا عدل و انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ مقدمہ چلائے اور جرم ثابت کیے بغیر کسی کو قید نہیں رکھا جا سکتا۔ عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ کے دور میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

"حکومت جب حیلے بہانے سے لوگوں میں تہمت تلاش کرنے لگے تو وہ انہیں بگاڑ کر رکھ دے گی۔" (ابو داؤد)

۵۔ تعلیم کا حق

اسلامی ریاست کے ہر شہری کا حق ہے کہ حکومت اس کی ابتدائی اور ضروری تعلیم کا انتظام کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگِ بدر میں قیدیوں کا فدیہ اس بات کو ٹھہرایا کہ وہ مسلمانوں کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ حضورؐ اصحابِ صفہ کو خود تعلیم دیا کرتے تھے اور لوگوں کی تعلیم کے لیے صحابہ کرامؓ کو وفود کی شکل میں باہر بھیجا کرتے تھے۔ آپؐ نے بعض صحابہؓ کو اپنے زیرِ اہتمام دوسری قوموں کی زبانیں بھی سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ حکومت کے اعلیٰ ملازمین کے ذمہ یہ فرض لگایا جاتا تھا کہ لوگوں کی تعلیم و تدریس کا انتظام کریں۔ تعلیم کو ہر عہدے کے لیے معیار ٹھہرایا گیا تاکہ لوگ علم حاصل کرنے کی طرف توجہ دیں۔

۶۔ حفظانِ صحت

اسلامی ریاست کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی حفظانِ صحت کے لیے مناسب اقدامات کرے اور تمام شہریوں کو طبی سہولتیں مہیا کرے۔ اس مقصد کے لیے ہسپتال اور شفاخانے تعمیر کرنا حکومت کے ذمہ ہے۔

(نوٹ: اوپر جو حقوق شہریوں کے بیان ہوئے ہیں، وہ تمام حقوق اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو بھی حاصل ہیں۔ بہر حال انہیں الگ بھی بیان کیا جاتا ہے۔)

غیر مسلموں کے حقوق

سوال: قرآن وسنت کی روشنی میں غیر مسلموں کے حقوق بیان کیجیے۔

جواب: **غیر مسلموں کے حقوق**

اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ کافر اور مشرک ہرگز مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے لیکن اس کے باوجود غیر مسلموں سے حسنِ سلوک سے پیش آنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہ صرف اسلام کی خوبی ہے کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے سے شہری حقوق عطا کرتا ہے اور مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ ان سے عمدہ برتاؤ کریں۔

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں۔ جنھیں بجا لانا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔ تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم

ہے۔ اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ کر دے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ: ۸۳)

ترجمہ: "اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔"

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں۔ دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے. چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ: ۸)

ترجمہ: اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار غیر مسلموں سے ویسا ہی برتاؤ کریں، جیسا ایک ڈاکٹر مریض سے کرتا ہے اسی حسن سلوک سے مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے دل جیتے لئے۔

۱۔ جان و مال کا تحفظ اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے غیر مسلم شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کرے۔ اس سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہ کرے۔ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرے گا تو اس کا بدلہ اور قصاص اسی طرح لیا جائے گا جس طرح مسلمان کے قتل کا لیا جاتا ہے۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے کسی ذمی کو قتل کیا۔ وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا، جو چالیس سال کی مسافت سے محسوس ہوگی۔" (بخاری)

حضرت علی المرتضیٰؓ کا ارشاد ہے:

"جو ہماری ذمہ داری میں ہے۔ اس کا خون ہمارے خون کی مانند اور اس کا خون بہا ہمارے خون بہا کی طرح ہے۔"

آپ ہی کا قول ہے:

"غیر مسلم شہریوں کے مال کی حیثیت مسلمانوں کے مال کی مانند ہے۔"

یعنی ان کا مال قابلِ احترام ہے جس کا چھیننا، چرانا، ضائع کرنا اور جلانا اسی طرح ناجائز ہے

جس طرح مسلمانوں کے مال کا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی فوج کے ہاتھوں ایک غیر مسلم ذمی کی فصل کو نقصان پہنچا تو آپ نے بیت المال سے دس ہزار درہم ہرجانہ دلوایا۔

۲۔ قانونی مساوات

اسلام کے فوجداری اور دیوانی قانون میں مسلم اور غیر مسلم برابر ہیں۔ جرائم کی سزا دونوں کے لئے ہے۔ انصاف دونوں کے لئے ہے۔ اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم شہری پر ظلم و زیادتی کرے۔ اس کی چوری کرے۔ اس پر تہمت لگائے، اس کی حق تلفی کرے۔ ان سب صورتوں میں اسی سزا کا حق دار ہے جو مسلمانوں کے باہمی معاملات میں مقرر ہیں۔ بلکہ غیر مسلموں سے کچھ مزید رعایت بھی ہے۔ مثلاً شراب بیچنے۔ پینے اور نکالنے کا انہیں حق ہے۔ اسی طرح وہ اگر چاہیں تو سوٗر بھی کھا سکتے ہیں بلکہ اسے پال اور فروخت بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ان کی شراب یا سوٗر کو ضائع کر دے تو اسے قانونی سزا ملے گی۔ (مبسوط)

۳۔ عزت کی حفاظت

غیر مسلم شہری کی عزت و ناموس اسی طرح محفوظ و محترم ہے جس طرح مسلم شہری کی۔ اسے گالی دینا، مارنا، پیٹنا اور غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں یہ تمام چیزیں حرام ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے جرنیلوں کو تاکیدی حکم دے رکھا تھا۔

"مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے سے روکو۔ نہ ان کو نقصان پہنچانے پائیں اور نہ ان کا مال ناجائز طور پر کھانے پائیں۔ اور جو شرائط تم نے ان سے کی ہیں، انہیں پورا کرو۔"

۴۔ مذہبی آزادی

غیر مسلم اپنی آبادیوں میں مذہبی شعائر و رسوم کی علی الاعلان ادائیگی میں آزاد ہیں۔ ان کے جلسے جلوس اور اجتماع پر کوئی پابندی نہیں۔ البتہ خالص مسلم آبادیوں میں اگر بدنظمی کا خدشہ ہو تو پابندی عائد کی جا سکتی ہے اور اس میں خود ان کا فائدہ ہے۔ ان کی عبادت گاہیں پوری طرح محفوظ اور آزاد ہیں۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید، سیف اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حیرہ پر فتح حاصل کی تو یہ معاہدہ لکھ دیا۔

"ان کے گرجے برباد نہ کئے جائیں گے۔ نہ ان کو ناقوس بجانے سے منع کیا جائے گا۔ نہ تہوار کے دن صلیب نکالنے سے روکا جائے گا۔"

۵۔ شخصی آزادی

غیر مسلم شہریوں کے شخصی معاملات میں ان کا اپنا قانون نافذ کیا جائے گا۔ نکاح، طلاق اور عدت وغیرہ میں وہ اپنے مذہبی

احکام کے پابند ہوں گے اور ان کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ ان کی تہذیب و تمدن آزاد ہوں گی اور انہیں ان پر عمل کرنے کا پورا حق ہوگا۔ انہیں اظہار خیال اور آزادی رائے کا حق حاصل ہے۔

۶۔ معاشی حقوق اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو مکمل معاشی حقوق حاصل ہیں۔ انہیں ہر قسم کے کاروبار، تجارت اور مالی معاملات کی آزادی ہے۔ انہیں ہر قسم کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ ان کی معاشی کفالت بھی اسلامی حکومت کے ذمہ ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے اندھے یہودی کو ایک آدمی کے دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا تو پوچھا: "تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟" اس نے کہا: "اپنی ضرورت اور غربت کی وجہ سے۔" حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے۔ اور اپنے گھر سے اس کو کچھ دیا اور پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور پیغام دیا کہ:

"خدا کی قسم! یہ انصاف نہیں ہے کہ ہم ان کی جوانی سے تو فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں چھوڑ دیں۔"

چنانچہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے سوا دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جا سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا۔ امیر المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا۔

۷۔ عہدے اور ملازمتیں سوائے چند ایک کلیدی اور مرکزی عہدوں کے جن کا تعلق براہ راست اسلامی ریاست کی پالیسی سے ہے، باقی ہر ملازمت کے دروازے غیر مسلم شہریوں پر کھلے ہیں۔ وہ صلاحیت کی بنیاد پر ان عہدوں پر کام کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں فوجی خدمت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا اور اس کے بدلے میں ان سے ایک برائے نام ٹیکس وصول کیا جائے گا۔ اگر وہ چاہیں تو فوجی خدمت بھی کر سکتے ہیں۔

۸۔ معاہدوں کی پابندی غیر مسلم رعایا اور اقلیتوں سے جو معاہدے کئے جائیں، ان کی پابندی لازم ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان معاہدوں کی پابندی اور ذمیوں کے حقوق کے تحفظ کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ آپ وقتاً فوقتاً اپنے حکام کو اس بارے میں تاکیدی احکامات لکھتے رہتے تھے۔ غیر مسلم بھی

خلافتِ راشدہ میں ان معاہدوں سے خوش اور مطمئن تھے۔ غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کی ایک وجہ ایفائے عہد بھی تھا۔

۹۔ عام لوگوں کی بھلائی ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ باتیں گنائیں جن میں ایک یہ تھی کہ "تم لوگوں کے لئے وہی چاہو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے"۔ اس حدیث مبارکہ میں الناس کا لفظ عام ہے۔ یعنی لوگ، اس میں تمام انسان شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو، انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔ ایک اور حدیث مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچائے"

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں (مولانا حالیؒ)

شہریوں کے فرائض

ریاست کے حقوق یا اچھے شہری کے اوصاف

اسلامی ریاست میں بسنے والے شہریوں کے جہاں حقوق ہیں، وہاں ان کے ذمہ کچھ فرائض بھی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ ریاست کے حقوق ہیں۔ حقوق حاصل کرنے کے لیے ان فرائض کی بجا آوری ضروری ہے۔

۱۔ اطاعت اسلامی ریاست کا پہلا حق یہ ہے کہ ہر حال میں حکومت کی اطاعت کی جائے۔ بشرطیکہ اس کا حکم خدا اور رسولؐ کے احکام سے ٹکراتا نہ ہو۔ اس صورت میں کسی کی اطاعت کسی کے لیے جائز نہیں۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

"تنگی و آسانی، خوشی و ناخوشی ہر حال میں حاکم کی بات سننا اور ماننا ضروری ہے"۔ (صحاح)

قرآن مجید میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اسے خدا اور رسول کی اطاعت سے مشروط کر دیا گیا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج (النساء: ۵۹)

ترجمہ: اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے جو حاکم ہیں ان کی اطاعت کرو۔

پھر فرمایا:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (النساء:۵۹)

ترجمہ: پھر اگر تمہارا ان سے کسی بات میں تنازعہ ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف لوٹا دو۔"

ارشادِ نبوی ؐ ہے:

"خدا کی نافرمانی میں کسی کی بات ماننا جائز نہیں ہے۔"

۲۔ وفاداری و خیر خواہی

اسلامی ریاست کے سربراہوں کا دوسرا حق یہ ہے کہ ان سے ہمدردی رکھی جائے، دل سے ان کی خیر خواہی کی جائے اور وفاداری کا مظاہرہ کیا جائے۔ ارشادِ نبوی ؐ ہے:

"دین اس چیز کا نام ہے کہ اللہ، اس کے رسول ؐ، مسلمانوں کے حکام اور عوام کی خیر خواہی و وفاداری کی جائے۔ (ابوداؤد)

۳۔ تعاون

اسلامی ریاست کے سربراہوں کا حق ہے کہ شہری ان سے دل و جان سے تعاون کریں۔ جو شخص ضرورت اور خطرے کے موقع پر دفاع میں تعاون نہ کرے، قرآن مجید اسے منافق قرار دیتا ہے۔ اگر خدانخواستہ دارالاسلام خطرہ میں ہو تو شہریوں کو اپنے تمام وسائل حکومت کو پیش کر دینے چاہئیں اور اس کے دفاع میں جانیں لڑا دینی چاہئیں۔

۴۔ مالی و جانی قربانی

ہر شہری کا فرض ہے کہ ریاست کی ترقی اور حفاظت کے لیے مالی قربانی کرتا رہے۔ شریعت کے مقرر کردہ ان حقوق کو بخوشی ادا کرے، جو ریاست کو حاصل ہیں۔ مالی مطالبات کو پوری رضامندی سے پورا کرے اور حکومت کے عائد کردہ ٹیکس کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔ جہاد وغیرہ ہنگامی ضرورت کے لیے اپنا سب کچھ پیش کر دے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ (البقرۃ: ۱۹۵)

ترجمہ: اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو (مالی قربانی سے جی چرا کر) ہلاکت میں مت ڈالو۔

اسی طرح جہاد کے لیے جب لوگوں کی جان کی ضرورت پڑے تو شہریوں کا فرض ہے کہ بخوشی اپنی جانیں ریاست کے ذمہ داران کو پیش کر دیں۔ قومیں قربانیوں سے زندہ رہتی ہیں اور

جہاد تو مسلمانوں کا شیوہ اور عظیم روایت ہے ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی (اقبالؔ)

دیگر فرائض یا اوصاف

۵۔ قانون کا احترام ہر شہری پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ریاست کے قوانین کی پابندی کرے۔ حکومت وقت حکمت عملی کے تحت وقت کے تقاضوں اور مصلحتوں کے پیش نظر جو بھی مناسب حال احکام صادر کرے، ان کی پابندی شہری پر لازم ہے۔ قانون کی پابندی اور احترام ہی سے امن و سلامتی کی فضا پیدا ہوتی ہے، ورنہ قانون شکنی بدنظمی اور انتشار پیدا کرتی ہے۔

۶۔ فرض کی بجا آوری ہر شہری کے لیے لازم ہے کہ اپنے فرائض منصبی پوری دیانتداری اور محنت سے بجالائے۔ اگر تاجر ہے تو اپنی تجارت امانت و دیانت کے اصول پر چلائے۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور سمگلنگ وغیرہ سے دامن بچائے کسی کو دھوکہ نہ دے اور کم نہ تولے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: "دیانتدار تاجر جنت میں میرا ہمسایہ ہوگا"۔ اگر وہ ملازم ہے تو اپنی ڈیوٹی مکمل دیانتداری اور ذمہ داری سے ادا کرے۔ وقت ضائع نہ کرے، رشوت اقربا پروری اور ناجائز سفارش سے اجتناب کرے۔

۷۔ ووٹ کا صحیح استعمال ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ انتخاب میں ووٹ کا صحیح استعمال کرے اور اس سلسلے میں کسی قسم کے لالچ، خوف یا سودے بازی کا شکار نہ ہو۔ ووٹ صحیح امانت ہے۔ اس میں خیانت جرم عظیم ہے۔ اسی طرح جب کسی سیاسی یا کسی اور اہم مسئلہ میں رائے طلب کی جائے تو بڑی احتیاط اور خوب سوچ سمجھ کر اپنی رائے کا اظہار کرے۔

۸۔ آمدنی کا صحیح استعمال ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا استعمال صحیح طور پر کرے۔ بے جا اسراف اور فضول خرچی سے کام نہ لے اور ایسے منصوبوں اور کاموں کو ترجیح دے، جن سے ملک و قوم کی ترقی اور بہتری وابستہ ہو۔

۹۔ جذبہ خدمت ہر شہری کا فرض ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لے۔ دوسرے شہریوں کی خدمت کرے، حاجت مندوں کی حاجت پوری کرے ضرورت مندوں کے کام آئے۔ دکھی لوگوں کے دکھ دور کرے۔ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شُد

یعنی لوگوں کا مخدوم و محترم وہی بن سکتا ہے جو ان کی خدمت کرے۔

۱۰۔ بچوں کی تعلیم و تربیت شہریوں کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے شہریوں سے رواداری اور فراخدلی کا سلوک کرے تعصب اور تنگ نظری سے کام نہ لے۔ دوسروں کے جذبات و خیالات کا احترام کرے، دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں اور شعائر کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھے۔ یہ رواداری اور فراخ دلی ملک میں امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ وسعتِ نظری اور عالی ظرفی شرفِ انسانیت ہیں۔

۱۲۔ حفظانِ صحت و صفائی ہر شہری پر لازم ہے کہ وہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی کرے، کیونکہ اچھے معاشرے کے قیام کے لیے صحت مند افراد کی ضرورت ہے۔ آج کل ماحول کی آلودگی ایک سنگین مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اسے حل کرنا اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنا ہر شہری کا ذمہ داری ہے۔

بقول مولانا حالیؒ مولانا حالیؒ نے اپنی مشہور نظم "مسدسِ حالی" میں مخلص بندوں کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ یہی اچھے شہری کے اوصاف ہیں۔

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے — نشاں جن سے قائم ہیں صدق و صفا کے
نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے — نمائش سے بیزار دشمن ریا کے

ریاضت سب ان کی خدا کے لیے ہے
مشقت سب ان کی رضا کے لیے ہے

بہت نوعِ انساں کے غمخوار و یاور — ہوا خواہِ ملت بہ اندیشِ کشور
شدائد کے دریائے خوں میں شناور — جہاں کی پر آشوب کشتی کے لنگر

ہر اک قوم کی ہست و بود ان سے ہے یاں
سب اس انجمن کی نمود ان سے ہے یاں

اسلامی ریاست

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف: ۴۰)

ترجمہ: اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے

؎ حاکم اعلیٰ ہمارا ہے خدا ٭ اوّل و آخر سہارا ہے خدا (ساغر صدیقی)

سوال: اسلام کا تصورِ حکومت کیا ہے؟ نیز اسلامی ریاست کی اتباع کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے؟

جواب: **اسلامی ریاست کا مفہوم** کسی ملک کی وہ سیاسی تنظیم جس میں علاقہ، آبادی حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ۔ یہ چار عناصر پائے جائیں ریاست کہلاتی ہے۔ جدید نظریے کی رو سے ریاست متعدد افراد کی ایسی جمعیت کا نام ہے، جو مستقل طور پر ایک خاص علاقے پر قابض ہو، بیرونی دباؤ سے آزاد ہو اور ان کی اپنی ایک منظم حکومت ہو، جس کی اطاعت تمام افراد پر لازم ہو۔

جب کسی ریاست کا دستور و قانون اسلامی احکام و ہدایات کے مطابق تیار کیا جائے تو وہ "اسلامی ریاست" کہلاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسانوں کے کسی گروہ یا ملک کے اجتماعی معاملات کو باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے اسلامی احکام کے ماتحت منظم و با اختیار ادارہ وجود میں آتا ہے، اسے اسلامی ریاست کہا جاتا ہے۔

اسلام کا تصورِ حکومت

ضرورت و نوعیت اسلام نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ معروف (نیکی) کا حکم دینا اور منکر (بدی) سے روکنا مسلمانوں کے انفرادی و اجتماعی فرائض میں شامل ہے۔ پیغمبروں کو بھیجنے کا مقصد قرآن مجید نے یہ بیان کیا ہے کہ خدا کی اُتاری ہوئی میزان عدل دنیا میں قائم ہو جائے یعنی خدا کی زمین پر خدا کا قانون نافذ ہو جائے۔ ظاہر ہے، یہ کام قوت و حکومت اور اقتدار کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔

بقول علامہ اقبال رح ؎

عصا نہ ہو تو کارِ کلیمی ہے بے بُنیاد

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک مدینہ منورہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، دشمنوں نے اسلام اور اہلِ اسلام کو ایک پل بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیا اور نہ نیکی کا وہ نظام رائج ہو سکا جو اسلام کو مطلوب تھا۔ لیکن اسلامی ریاست کے وجود میں آتے ہی نیکیاں ابھرنے لگیں اور برائیاں مٹنے لگیں، یہاں تک کہ مکمل اسلامی نظام کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ریاست و اقتدار کے بغیر یہ ضابطہ مکمل طور پر نافذ نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا نظامِ قانون، نظامِ شہادت، فوجداری و دیوانی قانون اور اس طرح دیگر تمام معاملات کے قوانین ریاست و قوت کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے۔ اسلام کا اپنا قانون تعزیرات

ہے جو قوت کے بغیر نہ نافذ ہو سکتا ہے، نہ چل سکتا ہے۔ دراصل اسلام کا مزاج ہی اس قسم کا ہے کہ وہ غلبہ و اقتدار چاہتا ہے، ورنہ اس کا ایک بڑا حصہ معطل اور بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ پورا قرآن مجید پڑھ جائیے آپ کو ایک آیت بھی ایسی نہیں ملے گی جو انسان کو خوئے غلامی کا درس دیتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید تو نازل ہی اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہوا کہ خدا کا قانون غالب آئے اور مسلمان دنیا کے حکمران بن کر رہیں۔ دوسرے الفاظ میں قرآن کی رو سے مسلمان، غلامی کے لیے نہیں بلکہ حکمرانی کے لیے پیدا ہوا ہے۔

نظریہ و تصور

اسلام کا تصورِ حکومت یہ ہے کہ اس میں ریاست و حکومت کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔

اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے اور وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان کے خلیفہ و نائب کی حیثیت سے کام کرے اور خدا کے عطا کردہ اقتدار کو اس کی امانت سمجھ کر بروئے کار لائے۔

اسلامی ریاست نہ آمریت (ڈکٹیٹر شپ) ہے نہ مغربی طرز کی جمہوریت۔ وہ موجودہ دور کے ازموں میں سے کوئی ازم بھی نہیں۔ نہ سوشلزم، نہ کمیونزم نہ سیکولرزم وغیرہ۔ اسلام کا اپنا ایک نظریہ سیاست ہے، جسے وہ "خلافت" کا نام دیتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے اعلیٰ اقتدار اللہ کا ہے، نہ صرف فطری اعلیٰ اقتدار بلکہ سیاسی بھی۔ اس اعلیٰ اقتدار کو نافذ و قائم کرنے کے لیے پیغمبر دنیا میں آئے۔ دنیا والوں کا فرض ہے کہ پیغمبروں اور بالخصوص خدا کے آخری محبوب رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت و پیروی کریں۔

اسلامی نظریۂ سیاست کے مطابق اسلامی ریاست کے تمام ارکان اپنی فرداً فرداً خلافت کو ایک شخص میں مرتکز کر دیتے ہیں تاکہ انتظام و مرکزیت قائم رہے۔ وہ شخص اسلامی احکام و قوانین کو چلانے میں رسولؐ کا نائب ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں، مشورے، ہمدردی، اطاعت و خیر خواہی سے اس کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں تاکہ اسلامی نظام مضبوط و مستحکم رہے۔ وقتی اور ہنگامی ضروریات کے مشورے اور اجتہاد کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ ہر نئے پیش آنے والے معاملہ کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں طے کیا جائے۔ اس ضمن میں مروجہ نظام ہائے حکومت سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　مومن فقط احکامِ الٰہی ہے پابند

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

(اقبالؒ)

اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیات

ایک مثالی اسلامی ریاست جو قیامت تک امت مسلمہ کے لیے مشعل راہ ہے۔ وہ ریاست ہے جو دورِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مدینہ منورہ میں قائم ہوئی اور حضور اکرمؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے انہی اصولوں پر قائم کی ، سے خلافتِ راشدہ کہتے ہیں۔ ارشادِ نبویؐ ہے : خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ یعنی "بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اور اس کے بعد میرے صحابہؓ کا"۔ ذیل میں اسی اعلیٰ نمونے کے پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں :-

۱۔ قانونِ خداوندی کی بالاتری

اسلامی ریاست کی اولین بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اہل ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے ، بلکہ اس کو لازماً قانونِ خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیئے ، جس کا سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (الیوسف ۴۰)

ترجمہ : اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے ۔

پھر فرمایا :-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔۔۔۔۔۔۔۔ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔۔۔۔۔۔۔
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (المائدہ : ۴۴، ۴۵، ۴۷)

ترجمہ : اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ ظالم ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ فاسق ہیں "

ارشادِ نبویؐ ہے :

"میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں جنہیں اگر تم تھامے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔" (کنز العمال)

۲۔ عدل و انصاف

اسلامی ریاست کی دوسری اہم خصوصیت عدل و انصاف ہے۔ یعنی قرآن و سنت کا دیا ہوا قانون سب کے لیے یکساں ہے اور اس کو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہونا چاہیئے۔ کسی کے لیے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت فرماتا ہے کہ:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ (الشوریٰ: ۱۵)

ترجمہ: اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

ارشادِ نبوی ہے:

"تم میں سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اسی لیے تو تباہ ہوئیں کہ وہ لوگ کمتر درجے کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان ہے، اگر محمدؐ کی اپنی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔" (بخاری شریف)

۳۔ مساوات

اسلامی ریاست کی تیسری اہم خصوصیت مساوات ہے یعنی تمام مسلمانوں کے حقوق بلا لحاظ رنگ ونسل و زبان و وطن بالکل برابر ہیں۔ کسی فرد، گروہ، طبقے یا نسل و قوم کو اس ریاست کے حدود میں نہ امتیازی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کی حیثیت کسی دوسرے کے مقابلے میں کمتر قرار پا سکتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات: ۱۳)

ترجمہ: لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

ارشادِ نبویؐ ہے:

"مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔"

۴۔ حکومت کی ذمہ داری

ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال، خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں، جنہیں خدا ترس، ایماندار اور عادل لوگوں کے سپرد کیا جانا چاہیئے اور اس امانت میں کسی شخص کو من مانے طریقے پر یا نفسانی اغراض کے لیے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ

(النساء: ۵۸)

ترجمہ: "تحقیق، اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔"

ارشادِ نبویؐ ہے:

"خبردار رہو، تم میں سے ہر ایک راعی (نگران و ذمہ دار) ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے، اور مسلمانوں کا سب سے بڑا سردار جو سب پر حکمران ہو، وہ بھی راعی ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔" (بخاری شریف)

حضرت عمر فاروقؓ فرماتے تھے:

"اگر دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا۔" (کنز العمال)

۵۔ شورائی نظام

ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ سربراہِ ریاست مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رضامندی سے مقرر ہونا چاہیئے اور اسے حکومت کا نظام بھی مشورے سے چلانا چاہیئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ ص (الشوریٰ: ۳۸)

ترجمہ: اور مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"میری امت کے عابد لوگوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو آپس کے مشورے کے

لیے پیش کر دو۔ کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کر ڈالو" (تفسیر روح المعانی)
حضورؐ نے یہ ہدایت حضرت علی المرتضیٰؓ کے سوال پر جاری فرمائی۔
حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے:
"مشورے کے بغیر کوئی خلافت نہیں" (کنز العمال)

۶۔ اطاعت فی المعروف

ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ حکومت کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے، معصیت میں کسی کو اطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے الفاظ میں حکومت اور حکام کا صرف وہی حکم ان کے ماتحتوں اور رعیت کے لیے واجب الاطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو۔ قانون کے خلاف حکم دینے کا نہ انہیں حق پہنچتا ہے اور نہ کسی کو اس کی اطاعت کرنی چاہیئے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ (الممتحنہ: ۱۲)

ترجمہ: (اے نبیؐ) اور یہ کہ وہ کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت صرف معروف میں ہے" (مسلم شریف)

خلفائے راشدینؓ کا طرز عمل یہی رہا کہ ہماری اطاعت کرو، جب تک ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہیں اور جب ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کریں تو تم پر ہماری اطاعت لازم نہیں ہے۔

۷۔ اقتدار کی طلب و حرص کی ممانعت

اسلامی ریاست کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ حکومت کے ذمہ دارانہ عہدوں کے لیے عموماً اور خلافت کے لیے خصوصاً وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں ہیں، جو خود عہدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں اور اس کے لیے ہر جائز و ناجائز تدبیر اختیار کریں۔ اسلامی حکومت میں اقتدار کی حرص و ہوس سخت ناپسندیدہ ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ○

(القصص: ۸۳)

ترجمہ: وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے، جو زمین میں نہ اپنی بڑائی کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں اور انجام (نیک) تو متقی لوگوں ہی کا ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"بخدا ہم اپنی اس حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے، جو اس کا طالب ہو یا اس کا حریص ہو۔" (بخاری شریف)

۸۔ اسلامی نظامِ زندگی کا قیام

اسلامی ریاست کا مقصدِ وجود اسلامی نظامِ زندگی کا قیام ہے۔ اسلامی ریاست میں حکمران اور اس کی حکومت کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ مکمل اسلامی نظامِ زندگی کو کسی رد و بدل کے بغیر جوں کا توں قائم کرے اور اسلام کے معیارِ اخلاق کے مطابق بھلائیوں کو فروغ دے اور برائیوں کو مٹائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج : ۴۱)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"جو شخص ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالے جو اس کی جنس سے نہ ہو، اس کی بات مردود ہے۔" (مشکوٰۃ شریف)

پھر فرمایا:

"خبردار! نرالی باتوں سے بچنا، کیونکہ ہر نرالی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" (مشکوٰۃ شریف)

۹۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ

اسلامی ریاست کی ایک اہم خصوصیت اور قاعدہ و اصول یہ ہے کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق ہے، بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے کہ کلمۂ حق کہے، نیکی اور بھلائی کی حمایت کرے اور معاشرے یا مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام

ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں مقدور بھر کوشش صرف کر دے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ (التوبہ: ۱۱۲)

ترجمہ: (اور مومن) نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے منع کرنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ارشادِ نبوی ہے:

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اسے چاہیئے کہ اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے (برا سمجھے اور روکنے کی خواہش رکھے) اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔" (مسلم شریف)

پھر فرمایا:

"لوگ جب ظلم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذابِ عام بھیج دے۔" (ابوداؤد)

(اسلامی ریاست، سید ابوالاعلیٰ مودودی)

۱۰۔ فلاحی ریاست

اسلامی ریاست صحیح معنوں میں ایک فلاحی ریاست ہے وہ صرف ٹیکس لینے، اندرونی و بیرونی امن و امان قائم رکھنے اور دفاع کی ذمہ دار نہیں ہوتی بلکہ اپنی حدود میں زندگی کے ہر شعبے میں مساوات اور پائیدار عدل و انصاف قائم کرنے کے ساتھ شہریوں کی تمام بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ذمہ دار بھی ہے۔ خدمت خلق اس کا شعار ہے۔ وہ فقر و فاقہ اور اونچ نیچ کو مٹانا چاہتی ہے۔ غربت و افلاس اور ظلم و ستم کا خاتمہ اس کا نصب العین ہے۔ اس کی حدود میں کوئی شہری مسلم ہو یا غیر مسلم بنیادی انسانی ضروریات کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں دورِ نبوی اور عہد خلافت راشدہ آج بھی ہمارے لیے مینارۂ روشنی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (الذّٰریٰت: ۱۹)

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں سائلوں اور محتاجوں کا حق ہے۔

ارشادِ نبوی ہے:

"جس کا کوئی سرپرست نہیں، حکومت اس کی سرپرست ہے۔" (ترمذی)

زکوٰۃ کا مقصد حضورؐ نے یہ فرمایا: "دولت مندوں سے لی جائے گی اور محتاجوں کو لوٹا دی جائے گی۔" (بخاری و مسلم)

۱۱۔ بیت المال بطور امانت

بیت المال کا قیام اسلامی ریاست کی ایک اہم خصوصیت رہا ہے۔ اس کا قاعدہ و اصول یہ ہے کہ بیت المال خدا کا مال اور مسلمانوں کی امانت ہے، جس میں کوئی چیز حق کی راہ کے سوا کسی دوسری راہ سے آنی نہ چاہیئے اور جس میں سے کوئی چیز حق کے سوا کسی دوسری راہ میں جانی نہ چاہیئے۔ دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ کا بیت المال ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ کوئی اسلامی ریاست اس سے غافل نہیں ہو سکتی۔ اس کا فرض ہے کہ زکوٰۃ، عشر، خراج اور دیگر محصولات سے روپیہ اکٹھا کر کے ایک مرکزی بیت المال کا قیام عمل میں لائے اور اس کی شاخیں پوری مملکت میں پھیلائے۔ یہ مال قومی امانت ہے۔ اس کی حفاظت اور اس کے صحیح استعمال کا بندوبست اسلامی ریاست کا فریضہ ہے۔ بیت المال کے ذریعے غرباء، مساکین، حاجت مندوں، یتامیٰ، بیوگان اور دیگر محروم طبقوں کی کفالت کی جاتی ہے۔

۱۲۔ شہریوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت

اسلامی ریاست کا فریضہ ہے کہ وہ ہر شہری کی جان و مال اور عزت و ناموس کی پوری طرح محافظ ہو۔ اس حفاظت کی ذمہ داری ریاست پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا تھا:

"یقیناً تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ویسی ہی محترم ہیں، جیسا آج کا دن قابلِ احترام ہے۔"

کوئی حکومت شہریوں کے بنیادی حقوق میں اس وقت تک دخل انداز نہیں ہو سکتی، جب تک اسلامی قانون کی رو سے ایسا کرنا ضروری یا جائز نہ ہو۔ اس ضمن میں مسلم یا غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے۔

اس طرح اسلامی ریاست کی حدود میں شہریوں کو تحریر و تقریر، نقل و حرکت اور اجتماع و تنقید کی جو آزادیاں حاصل ہیں، ریاست کا فرض ہے کہ انہیں محترم و مقدس فریضہ سمجھ کر محفوظ رکھے۔ نہ خود ان میں دخل دے نہ کسی کو دخل انداز ہونے دے۔ یہ آزادیاں خدا اور رسولؐ کی ضمانت سے دی گئی ہیں اور ان کا ہر قیمت پر باقی رکھنا لازم ہے۔ صرف شک و شبہ کی بنا پر کسی کی بنیادی آزادیوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ارشادِ نبوی ہے:

"اسلام میں کوئی شخص عدل و انصاف کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔" (موطاء)

۱۳۔ اسلامی قانون و تعزیرات کا نفاذ

اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ بدی کے انسداد کے لیے اسلامی حدود قانون نافذ کرے۔ قتل، چوری، شراب نوشی، تہمت تراشی، بدکاری، اغوا، ڈاکہ زنی کی سزائیں بروئے اسلام دی جائیں اور اس ضمن میں کسی قسم کی کوتاہی یا نرمی روا نہ رکھی جائے اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ برائیاں مٹیں گی بلکہ امن و امان قائم ہوگا اور داخلی و خارجی استحکام پیدا ہوگا۔ اس قانون کے لیے فضا تیار کرنا، اسے نافذ کرنا اور ہر برائی اور جرم کا انسداد اسلامی ریاست کا فریضہ ہے۔ ان سزاؤں کا مقصد یہ ہے کہ جرائم پیشہ افراد کا سد باب ہو اور دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بن سکے، اور تمام شہری سکون و راحت کی زندگی گزار سکیں۔

۱۴۔ خارجہ پالیسی

اسلامی ریاست اپنی خارجہ پالیسی میں ہر وقت اسلامی مفاد کو پیش نظر رکھے گی۔ اس کے تعلقات مسلم ممالک کے ساتھ برادرانہ ہوں گے اور وہ اتحادِ عالم اسلام کو اپنا نصب العین سمجھے گی۔ اس کے تعلقات ہر ملک کے ساتھ ہوں گے اور حق و انصاف کی حمایت اور ظلم و زیادتی کی مخالفت کرے گی، لیکن وہ دشمنانِ اسلام کو دلی دوست نہیں بنائے گی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ (المائدہ: ۵۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

۱۵۔ غیر مسلموں کی حفاظت

جو غیر مسلم اسلامی ریاست کی حدود میں رہتے ہوں انہیں ذمی کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی ذمہ داری میں ہیں۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ انہیں ہر قسم کا تحفظ فراہم کرے۔ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے علاوہ انہیں معاشرتی، معاشی اور مذہبی آزادی مسلمانوں کے برابر مہیا کرے۔ ان سے فوجی خدمت نہیں لی جا سکتی۔ اس کے بدلے میں ان سے جزیہ (شرعی ٹیکس) وصول کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ قیامِ پاکستان کا مقصد۔ اسلامی ریاست

قیامِ پاکستان کا مقصد ایک اسلامی ریاست قائم کرنا ہے۔ اس کے تین اہم اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ عین ہمارے ایمان کا تقاضا ہے اور

ہم ہرگز اپنے ایمان میں مخلص نہیں ہو سکتے، اگر آزادی اور اختیارات پانے کے بعد بھی ہم اس قرآن اور اس رسول ﷺ کے احکام کو نافذ نہ کریں، جس کے برحق ہونے پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ یہاں ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے، جس میں خدا اور رسول ﷺ کے احکام جاری ہوں، اور اسی تمنا کے پیچھے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں، عزتیں اور جائدادیں قربان کیں۔ تیسرے یہ کہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم الشان اکثریت چاہتی ہے کہ ان کی قومی ریاست ایک اسلامی ریاست ہو اور اکثریت کی مرضی کو بہر حال نافذ ہونا چاہیئے۔ ہمارے تمام الجھے ہوئے مسائل کا حل اسلامی نظام کے قیام و نفاذ میں مضمر ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
(علامہ اقبال)

؎ سارے جہاں کی پیاس بجھانی محال ہے
اسلام کے پیالۂ لبریز کے بغیر
(ظفر علی خاں)

عالمِ اسلام

ا۔ اُمّت
ب۔ اُخوّت
ج۔ تبلیغ
د۔ جہاد

؎ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
(اقبال)

؎ کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
(اقبال)

اُمّت

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں (کی بھلائی) کے لیے ظاہر کیا گیا ہے۔

ہ۔ اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
(اقبال)

سوال: اُمت اور قوم میں کیا فرق ہے؟ اُمتِ اسلامیہ کی امتیازی خصوصیات بیان کیجئے۔

جواب: (ا) **امت کا مفہوم** امت کا لفظ اُمّ سے نکلا ہے جس کا معنی ہے مرکز۔ اس لحاظ سے امت سے مراد مرکزیت ہے۔ لغوی معنی کی رو سے اس لفظ کا معنی "بڑا گروہ" "جماعت" اور "طریقہ" ہے۔ امت کے اصطلاحی معنی ہیں کسی پیغمبر کی جماعت اور اس پر ایمان لانے والا گروہ۔ امت اسلامیہ سے مراد وہ بڑی جماعت ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری محبوب رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش کردہ دین میں داخل ہو چکی ہے۔ ملت کا لفظ امت کا ہم معنی ہے۔ امت اسلامیہ کی بنیاد کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پر ہے۔ جو لوگ یہ کلمہ پڑھ کر اسلامی جماعت کے رکن بن جائیں، وہ نسل و رنگ اور زبان و وطن وغیرہ کے اختلاف کے باوجود ایک امت کہلاتے ہیں۔ امتِ اسلامیہ قومیت کی بنیادوں پر نہیں بلکہ بین الاقوامیت کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کے افراد مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان ایک امت ہیں، خواہ وہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں۔ یہ ایک عالمگیر تصور ہے۔

(ب) **قوم کا تصور** جدید نظریہ کے مطابق قوم سے مراد ایسے لوگوں کی جماعت ہے جن کی زبان، رنگ، نسل، وطن، معاشی اغراض اور نظام حکومت مشترک ہو۔ گویا قوم کی بنیاد جغرافیائی حد بندیوں پر رکھی گئی ہے۔ مثلاً فرانس میں بسنے والے فرانسیسی قوم کے افراد ہیں، انگلستان میں رہنے والے انگریز قوم اور جرمنی میں بسنے والے جرمن قوم ہیں۔ قومیت اور وطنیت کا یہ محدود تصور، باطل، تباہ کن اور فساد کی جڑ ہے۔ دو عالمی جنگیں اسی باطل نظریہ کے نتیجہ میں لڑی گئیں۔ اسی سے قوم پرستی اور وطن پرستی کی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ اس تصور کی بنیاد کسی عالمگیر نظریہ پر نہیں ہے۔ بلکہ محض وقتی اور علاقائی مفادات کے پیش نظر یہ تصور وجود میں آتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس باطل نظریے کی خرابی کی نشان دہی یوں کی ہے:

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

د) ملت اسلامیہ کی آفاقیت

اسلام نے ان تمام محدود مادی، حسی، وہمی اور باطل بنیادوں کو جن پر دنیا کی مختلف قومیتوں کی عمارتیں قائم کی گئی تھیں ڈھا دیا۔ رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت اور سیاست کی غیر عقلی تفریقوں کو جن کی بنا پر انسان نے اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے انسانیت کو تقسیم کر رکھا تھا، مٹا دیا اور انسانیت کے ملاپ میں تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا ہم مرتبہ قرار دے دیا اسلام کے تصور قومیت کی بنیاد روحانی اور جوہری امتیاز پہ ہے۔ اس کی رو سے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی گئی، جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی پاکیزگی و طہارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوعِ بشری کو دعوت دی۔

ہر مسلمان خواہ وہ چین کا باشندہ ہو یا مراکش کا، گورا ہو یا کالا، اردو بولتا ہو یا عربی، سامی ہو یا آرین، ایک حکومت کی رعیت ہو یا دوسری حکومت کی، مسلمان قوم کا فرد ہے۔ اسلامی معاشرے کا رکن ہے۔ اسلامی ریاست کا شہری ہے۔ اسلامی فوج کا سپاہی ہے اور اسلامی قانون کی حفاظت کا مستحق ہے۔ یوں اسلام نے عالمگیر قوت کا ایک ایسا عظیم الشان قصر تعمیر کیا جو سارے کرۂ ارضی پر چھایا ہوا ہے۔ ؎

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک تیرا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لیے (اقبال)

ذ) امتِ اسلامیہ کی امتیازی خصوصیات

۱۔ خیر الامم ۔ بہترین اُمت

امت اسلامیہ کو خیر الامم یعنی بہترین امت کا لقب دیا گیا ہے، کیونکہ یہ امت اپنے مقاصد اور اصول و اقدار کے لحاظ سے ایک بلند ترین مقام و منصب پر فائز ہے۔ اسے لوگوں کی بھلائی اور ہدایت و رہنمائی کے لیے چنا گیا ہے۔ دنیا کی مختلف نسلوں اور قوموں میں سے چھانٹ چھانٹ کر یہ جماعت نکالی گئی ہے تاکہ اسلام کا بول بالا کر سکے۔ یہ وہ بلند مقام ہے جو بنی اسرائیل کے بعد اس امت کا حصہ میں آیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران : ۱۱۰)

ترجمہ: تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے، تم

نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

۲۔ اُمتِ وسط یا بیچ کی اُمت

امت وسط، درمیانی یا بیچ کی امت سے مراد یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ افراط و تفریط سے پاک ہے اور راہِ اعتدال پر کاربند ہے۔ یعنی یہ امت اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خاندانی اور اخلاقی طور طریقوں میں سیاسی و معاشی حالتوں میں اعتدال یعنی میانہ روی کی راہ پر چلنے والی ہے۔ اور میانہ روی بہترین راہ ہے۔ جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے:

خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا

یعنی: میانہ روی بہترین حکمت عملی ہے۔

اس کے تمام عقائد و اعمال میں شانِ اعتدال پائی جاتی ہے اور ساری کائنات کے جو لوگ اسلامی اصول کو مان لیں وہ اس کے ارکان قرار پاتے ہیں۔ اس امت کا انحصار کسی رنگ و نسل اور زبان و وطن پر نہیں ہے۔

"بیچ کی امت" سے یہ بھی مُراد ہے کہ مسلمان ایک بین الاقوامی جماعت کا نام ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرۃ: ۱۴۳)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر نگران ہو اور رسولؐ تم پر نگران ہو۔

۳۔ حزب اللہ۔ اللہ کی پارٹی

قرآن مجید کی رو سے روئے زمین پر انسانوں کی صرف دو ہی پارٹیاں ہیں۔ ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) دوسری شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان)۔ شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول و مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلافات ہوں، قرآن ان سب کو ایک سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہیئے ان کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں، جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقِ فکر اور مسلکِ حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حبل اللہ) سے باہم جڑ گئے اور اس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام

تعلقات حزب الشیطان سے کٹ گئے۔ یہی حزب اللہ امت اسلامیہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(المجادلہ: ۲۲)

ترجمہ: یہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ آخر کار اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔

پھر فرمایا:

أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

(المجادلہ: ۱۹)

ترجمہ: وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ شیطان کی پارٹی آخر کار نامراد ہی رہنے والی ہے۔

۴۔ امت واحدہ وآفاقیت

ارشادِ ربانی ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (البقرۃ:

ترجمہ: سب لوگ ایک ہی اُمت ہیں۔"

شروع میں انسان ایک ہی وحدت یعنی عقیدۂ توحید و رسالت پر قائم تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے۔ پھر جب کچھ لوگوں نے کفر و شرک کے مختلف راستے اختیار کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے اس اختلاف کو مٹانے اور ہدایت کا راستہ دکھانے کے لیے وقتاً فوقتاً بے شمار پیغمبر بھیجے جن کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچتی ہے۔ خدا کے آخری محبوب رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جو ساری کائنات کو ایک مرکز پر جمع کرتے اور منتشر گروہوں کو ایک عقیدے اور نظریے پر اکٹھا کرنے کے لیے تشریف لائے۔ چنانچہ اسلام سب لوگوں کو ایک وحدت پر جمع کر کے ایک امت بنانا چاہتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ۝

(الانبیاء: ۹۲)

ترجمہ: بلاشبہ یہ ایک ہی امت تمہاری امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو تم

صرف میری ہی عبادت کرو۔

اس اُمت واحدہ کی بنیاد ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، ایک دین اور ایک کعبہ (مرکز اسلام) پر ہے۔ اللہ رب العلمین ہے۔ رسول رحمۃ للعلمین ہے کتاب نذیر للعلمین ہے۔ کعبہ ھدیً للعلمین ہے اور اسلام کائناتی، آفاقی اور عالمگیر دین ہے۔ پس یہ اُمت بھی اپنی فطرت کے لحاظ سے عالمی و آفاقی ہے اور اس میں وحدت و مرکزیت کی شان پائی جاتی ہے ہر کلمہ گو مسلمان خواہ مشرق میں رہتا ہو یا مغرب میں، کالا ہو یا گورا، عربی ہو یا عجمی، ایک ہی عالمگیر امت کا فرد ہے۔

۵۔ امت مسلمہ

قرآن مجید نے اہل اسلام کو امتِ مسلمہ کا لقب دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ص (البقرۃ: ۱۲۸)

ترجمہ: (اور ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہوئے دعا کی) اے ہمارے پروردگار، ہمیں اپنا فرمانبردار (مسلمان) بنائے رکھیو اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امتِ مسلمہ پیدا فرما۔

(امت مسلمہ کا معنی ہے خدا اور رسولؐ کے احکام کی فرمانبردار جماعت۔ گویا یہ امت ایک اصولی جماعت ہے، جس کی امتیازی شان اسلام (فرمانبرداری) ہے۔ اس کی بنیاد کسی عارضی اور مصنوعی امتیاز پر نہیں بلکہ ایک خاص اصول پر ہے جس کا نام اسلام ہے۔

۶۔ آخری اُمّت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

أَنَا آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَأَنْتُمْ آخِرُ الْأُمَمِ (ابن ماجہ)

ترجمہ: میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمت ہو۔

پھر فرمایا:

نَحْنُ الْآخِرُونَ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا وَالْأَوَّلُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (مُسلم)

ترجمہ: ہم دنیا والوں میں سے آخری اُمت ہیں اور قیامت کے دن ہم اوّل ہوں گے۔

اسلام ساری دنیا کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت قیامت تک تمام لوگوں اور زمانوں کے لیے ہے۔ حضورؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ حضورؐ پر ایمان لانے والے ایک ہی جماعت ہیں جو آخری امت ہے۔ جس طرح حضورؐ کی نبوت عالمگیر ہے، اسی طرح امتِ محمدیہ کی وسعت کا دائرہ بھی غیر محدود ہے۔

۷۔ فضائل امتِ اسلامیہ

احادیث مبارکہ میں امت اسلامیہ کے ایسے امتیازی فضائل بیان کیے گئے ہیں جو دیگر امتوں کو حاصل نہیں۔ ذیل میں چند فضائل بیان کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ قیامت کے دن امتِ محمدیہ کی تعداد تمام امتوں سے زیادہ ہو گی۔ (بخاری ومسلم)

۲۔ اہلِ جنت کی کل ۱۲۰ قطاریں ہوں گی، جن میں ۸۰ قطاریں امت اسلامیہ کی ہوں گی۔ (مشکوٰۃ شریف)

۳۔ امت اسلامیہ کے لیے ساری زمین کو مسجد اور پاک قرار دیا گیا ہے۔ (بخاری ومسلم)

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساری دنیا اور تمام قوموں کیلئے نبی بنا کر بھیجا گیا۔ (بخاری ومسلم)

۵۔ امت اسلامیہ کی بادشاہت وحکمرانی مشرق ومغرب تک پہنچ جائے گی۔ (مسلم)

۶۔ یہ امت عام قحط سے ہلاک نہ ہو گی، نہ غیر مسلم اس پر مسلط ہوں گے۔ اگرچہ مسلمانوں کے مقابلہ پر زمین کے تمام کافر جمع ہو جائیں۔ (مسلم)

۷۔ قیامت کے دن سب سے پہلے امت محمدیہ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ (مسلم)

۸۔ اس امت کو حمادون کا لقب دیا گیا ہے۔ یعنی بہت حمد کرنے والی اور خوشی غمی میں خدا کا شکر بجا لانے والی۔ (دارمی)

۹۔ اس امت کو تھوڑی عبادت پر بے پناہ اجر وثواب سے نوازا گیا۔ مثلاً لیلۃ القدر کو ایک ہزار ماہ سے بہتر قرار دیا گیا۔ مسجد نبویؐ اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر اور خانہ کعبہ میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر۔ اسی طرح ایک نیکی کا اجر دس گنا، سو گنا اور بے شمار۔ وغیرہ۔ نیز اس امت کے لیے جنت الفردوس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی امت کے معاملہ میں راضی کر دے گا، اور اس امت کی پہچان یہ ہو گی کہ پیشانی اور ہاتھ پاؤں وضو کے سبب سے روشن اور چمکتے ہوں گے۔ (مشکوٰۃ شریف)

(س) اُمتِ مُسلمہ کے فرائض

۱۔ نیابتِ رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا ہے۔ اب کوئی نبی مبعوث نہیں ہو گا۔ البتہ نبوت کے فرائض کی ادائیگی اور پیغمبر کی نیابت کا فریضہ امت کے سپرد کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ (الحج: ۷۸)

ترجمہ: اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں اور (تمہارے لیے) تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین (پسند کیا)، اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور (اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے)، (تو جہاد کرو) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلے میں شاہد ہو۔

یعنی دین فطرتی اور آسان ہے۔ تمہارا فریضہ اس پر خود عمل کرنا اور دوسروں سے عمل کرانا ہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ سب مل کر اللہ کی رسی (دین) کو تھام لو، جدا جدا امت ہو جاؤ۔ بلکہ ایک مرکز پر جمع رہو اور رسولؐ کے بعد اس کے فرائض منصبی کو ادا کرتے رہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۠ (آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: اور سب مل کر اللہ کی رسی (دین) کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقے میں نہ پڑو۔

۲۔ شہادتِ حق

"مسلمان" کے نام سے ایک مستقل امت بنانے کی واحد غرض جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ یہ امت تمام بندگانِ خدا پر شہادتِ حق کی حجت پوری کر دیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ: ۱۴۳)

ترجمہ: اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امتِ وسط" بنایا ہے، تاکہ تم دنیا

— کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔

بقولِ مولانا مودودیؒ:

"یہ شہادت جس کی ذمہ داری اس امت پر ڈالی گئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جو حق اس کے پاس آیا ہے، جو صداقت اس پر آشکارا کی گئی ہے، یہ دنیا کے سامنے اس کے حق اور صداقت ہونے پر اور اس کے راہِ راست ہونے پر گواہی دے۔ ایسی گواہی جو اس کے حق اور راستی ہونے کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دے اور دنیا کے لوگوں پر دین کی حجت پوری کر دے۔ اسی شہادت کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے تھے اور اس کا ادا کرنا ان پر فرض تھا۔ پھر یہی شہادت تمام انبیاء کے بعد ان کی امتوں پر فرض ہوتی رہی اور اب خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ فرض امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی اسی طرح عائد ہوتا ہے جس طرح حضورؐ پر آپ کی زندگی میں شخصی حیثیت سے عائد تھا۔

۳۔ ایمان باللہ

قرآن مجید نے اللہ پر صحیح ایمان کو امتِ مسلمہ کے فرائض میں شمار کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ (البقرۃ: ۲۸۵)

ترجمہ: رسولؐ (خدا) اس کتاب پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئی، ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی۔ سب خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔

خدا پر ایمان کا دعویٰ تو اور لوگ بھی کرتے ہیں، لیکن اس کو ذات وصفات میں اکیلا معبود مان کر توحید کی اشاعت وتبلیغ اس امت ہی کا کام ہے چونکہ یہ امت توحید کی علمبردار ہے اور شرک کی ہر آلائش سے بری ہونے پر مامور ہے۔ اس لیے ایمان باللہ کو اس کا مقصدِ وجود قرار دیا گیا ہے۔ اسی ایمان باللہ کی بدولت اُمت کے پہلے بہترین طبقے (صحابہ کرامؓ) نے اسلام کو دنیا میں غالب کر دیا تھا۔

اسلام کا زمانے میں سکہ بٹھا دیا — اپنی مثال آپ ہیں یارانِ مصطفےٰؐ

(ظفر علی خاں)

۴۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

نیکی کو فروغ دینا، پھیلانا اور اس کی اشاعت وتلقین کرنا نیز برائی کو مٹانا،

اسے روکنا اور لوگوں کو اس سے منع کرنا بھی امت مسلمہ کا فرض منصبی ہے۔ دین صرف یہی نہیں کہ انسان خود تو نیکی کی راہ پر گامزن ہو، خدا کی عبادت میں مشغول رہے اور اپنے ماحول سے بے نیاز رہے، بلکہ دین کا تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان دوسروں کو برائی سے روکے اور انہیں بھلائی کی تلقین کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی ہو۔ بدی سے روکتے ہو۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اس امت کا بہترین ہونا اس شرط کے ساتھ ہے کہ نیکی کو بلند کرتے اور برائی کا قلع قمع کرنے کا بیڑا اٹھائے۔

۵۔ دعوت الی الخیر

بھلائی کی دعوت دینا، اچھائی کا بول بالا کرنا اور خود بھلائیوں کو اختیار کر کے دوسروں کے سامنے انہیں پیش کرنا بھی امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ ویسے تو پوری امت مبلغ ہے لیکن بھلائی کی دعوت کو پھیلانے کے لیے اسے حکم دیا گیا ہے کہ اپنے میں سے ایک بڑی جماعت کو اس مقصد کے لیے وقف کر دے۔ اس جماعت کا نصب العین ہی یہ ہو کہ بھلائی کی دعوت دے۔ اور باضابطہ منظم طریقے سے اپنے تمام وسائل اس کے لیے وقف کر دے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ (آل عمران: ۱۰۴)

ترجمہ: اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ اور یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔

۶۔ جہاد فی سبیل اللہ

امت مسلمہ کے فرائض میں سے اہم ترین فریضہ جہاد ہے۔ بلکہ علمائے کرام کے نزدیک جہاد کی حیثیت اسلام کے چھٹے رکن کی ہے۔ اپنے دل کے جذبات اور ولولوں، زبان و قلم و مال اور آخر کار ہر ممکن ہتھیار سے اسلام کو سربلند کرنے، اس کا دفاع کرنے کی کوشش اور اس کے ماننے والوں کی

مظلومیت کو مٹانے کی جدوجہد کا نام جہاد ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ (الحج : ۷۸)

ترجمہ : اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔

ع شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی (اقبال)

امتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

(شکوہ۔ علامہ اقبال)

اخوّت

سوال، اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ۔ حضور اکرمؐ نے اس حکمِ قرآنی کے تحت اختلاف رنگ و نسل مٹا کر مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔" اخوت کی روشنی میں اس پر مفصل تبصرہ کیجئے!

جواب:

اَخوّت

۱۔ **مفہوم**

اخوت کا لفظ اخؐ سے نکلا ہے جس کے معنی برادری، بھائی بندی اور بھائی چارے کے معنی۔ اس مفہوم میں حقیقی بھائی کے علاوہ رکن خاندان ہم قوم اور ہم مذہب بھی شامل ہیں۔ اسلامی اخوت درحقیقت ان باہمی حقوق کا جامع نام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری امت مسلمہ پر لازم قرار دیئے ہیں، جس کی بنیاد محبت الفت، اخلاص، ہمدردی اور خیر خواہی پر ہو۔ ایک شخص جونہی کلمہ طیبہ پڑھتا ہے وہ اسلام کی عالمگیر برادری کا رکن بن جاتا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی علاقے، خاندان اور رنگ و نسل سے ہو۔ بقولِ علامہ اقبالؒ سے

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

۲۔ **اسلامی اخوت کی بنیاد**

اسلامی اخوت کی بنیاد کلمہ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر ہے۔ جو شخص اس کلمہ پر ایمان لا کر اس کا اقرار کرتا ہے وہ اسلامی برادری میں شامل ہو جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کلمہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ حلفِ وفاداری ہے اور اس کے انکار سے وہ اسلامی برادری سے خارج ہو جاتا ہے۔ یوں اسلامی اخوت کی بنیاد رنگ و نسل، خاندان، زبان اور علاقے پر نہیں بلکہ عقیدے پر ہے ملتِ اسلامیہ ایک عالمگیر، آفاقی اور وسیع رشتہ ہے جس کے ارکان وہ تمام مسلمان ہیں جو دنیا کے کسی گوشے میں بھی بستے ہیں۔ یہ دینی اور روحانی رشتہ خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر ہے

مثال کے طور پر ابو لہب اگرچہ رسولِ اکرمؐ کا حقیقی چچا تھا۔ لیکن چونکہ وہ کلمہ طیبہ کے عقیدے کا منکر تھا، اس لئے اسلامی برادری سے خارج ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں حضرت بلال حبشیؓ اگرچہ ایک حبشی غلام تھے، لیکن چونکہ وہ اس عقیدہ پر ایمان لے آئے تو اسلامی برادری کے ایک معزز رکن بن گئے۔ بقول علامہ اقبال ؎

اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے — رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

بقول مولانا ظفر علی خاں ؎

اخوت اس کو کہتے ہیں چُبھے کانٹا جو کابل میں

تو ہندوستاں کا ہر پیر و جواں بے تاب ہو جائے

۳۔ قبلِ اسلام کا معاشرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا جانی دشمن تھا۔ ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے۔ اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے آپ کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ لوٹ مار، قتل و غارت، ڈاکہ زنی خونریزی اور جنگ و جدال کا بازار گرم تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی۔ پانی پینے پلانے گھوڑا آگے بڑھانے وغیرہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائیوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ بقول مولانا حالی ؎

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ — ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ

فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ — نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے

درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

کہیں تھا مویشی چرانے کا جھگڑا — کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

لبِ جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا — کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں

یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

۴۔ درسِ اخوت و محبت

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتے سے بڑھ کر ایک اور

رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا۔ جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا۔ دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اور خاندانی و قبائلی یگانگت سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگت ان کے اندر پیدا کر دی۔ جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا۔ اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی بن گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس معاشرے کی کایا پلیٹ دی اور جاہل، اجڈ اور غیر مہذب قوم کو اعلیٰ درجے کی مہذب اور ہدایت یافتہ قوم بنا دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختصر سے عرصے میں اس معاشرے کو ایک عظیم انقلاب سے روشناس کر دیا۔ اور لوگوں کو درس اخوت و محبت دیا۔ آپؐ نے اپنے اخلاق و کردار سے دشمنوں کو دوست، بیگانوں کو یگانہ اور خون کے پیاسوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ بقول مولانا حالی ؎

مس خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

۵۔ قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں اخوتِ اسلامی اور مسلمانوں کے باہمی حقوق پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ان آیات مبارکہ سے ظاہر ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ج (آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔

وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ٥ (الانفال: ۶۳)

ترجمہ: اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے۔ تم روئے زمین

کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے، مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے، یقیناً وہ زبردست اور دانا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الحجرات، ۱۰)

ترجمہ: بے شک مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

۶۔ حدیث کی روشنی میں احادیث مبارکہ میں بھی اخوت اسلامی پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس کی بھرپور ترغیب دی گئی ہے۔

جیسا کہ ان احادیث سے ظاہر ہے:

۱۔ اللہ کے بندو! تم سب بھائی بھائی بن جاؤ۔

۲۔ مسلمان وہ ہے جو اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی مثال ایک عمارت یا دیوار کی سی ہے، جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔

۴۔ تمام مسلمان ایک جسم واحد کی طرح ہیں، اگر جسم کے کسی ایک حصے کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ ۔۔۔ کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

۵۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ اسے رسوا کرے، نہ جھٹلائے نہ ظلم کرے۔ تم ایک دوسرے کیلئے مثل آئینہ ہو۔ اگر اپنے بھائی میں کوئی تکلیف کی بات دیکھو تو اس کو دور کرو۔

۶۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

۷۔ جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکالیف میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی تکالیف میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا اور جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالےٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی کرے گا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا اور اللہ تعالےٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

۷۔ انصار و مہاجرین کی مواخاۃ

اخوت اسلامی کا بہترین نمونہ ہمیں انصار و مہاجرین کی مواخاۃ کی صورت میں ملتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف لے گئے تو مہاجر صحابہ کرام ؓ بالکل بے سرو سامانی کی حالت میں تھے۔ گو ان میں دولت مند اور خوشحال بھی تھے۔ لیکن چونکہ کفار مکہ سے چھپ کر نکلے تھے۔ اس لئے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر بار، زمینیں، باغات اور جائیدادیں پیچھے چھوڑی تھیں۔ وہ بڑے پریشان تھے ان کا نہ کوئی ذریعہ معاش تھا اور نہ سر چھپانے کی جگہ۔ اس لئے حضور اکرم ؐ نے ان کا سہارا قائم کرنے اور ان کی اجنبیت اور غربت دور کرنے کی خاطر ان میں اور انصار مدینہ میں رشتہ اخوت قائم کر دیا۔ جسے تاریخ اسلام میں "مواخات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جب مسجد نبوی ؐ کی تعمیر ختم ہوئی تو حضور ؐ نے انصار کو طلب فرمایا حضرت انس بن مالک جو اس وقت دہ سالہ تھے۔ ان کے مکان پر لوگ جمع ہوئے۔ مہاجرین کی تعداد پنتالیس تھی حضور ؐ نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تمھارے بھائی ہیں۔ پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ سعد ؓ بن ربیع جو عبدالرحمن ؓ بن عوف کے بھائی قرار پائے ان کی دو بیویاں تھیں۔ انہوں نے حضرت عبدالرحمن سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں آپ اس سے نکاح کر لیجئے۔ لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کر دیا۔ اخوت و محبت کی یہ مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ انصار کے ایثار و قربانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے مکانات باغات اور کھیت آدھوں آدھ بانٹ کر اپنی رضامندی اور خوشدلی کے ساتھ اپنے مہاجر بھائیوں کو دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی انصاری وفات پاتا تو اس کی جائیداد اور مال مہاجر کو ملتا تھا۔ اور بھائی بند محروم رہتے۔ دوسری طرف مہاجرین کی خود داری کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت سعد ؓ نے اپنے مہاجر بھائی حضرت عبدالرحمن ؓ کو آدھے مال کی پیشکش کی تو انہوں نے کہا: "خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے۔ مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے"۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا کاروبار چمک اٹھا۔

۸۔ اخوت و بھائی چارے کا تقاضا

اسلامی تعلیمات اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی روشنی میں اخوت و بھائی چارے کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے سے حسد نہ کیا جائے۔ باہمی بغض و عداوت سے بچا جائے

قیمت بڑھانے کی بولی نہ دی جائے، کیونکہ اس سے غربا کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک دوسرے سے بے رخی نہ برتی جائے۔ ایک سودے پر دوسرا سودا نہ کیا جائے۔ اپنے بھائی پر ظلم نہ کیا جائے۔ اپنے بھائی سے جھوٹ نہ بولا جائے۔ اس کی غیبت اور چغلی نہ کی جائے، اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھا جائے۔ مسلمان کو بے یار و مددگار نہ چھوڑا جائے۔ مسلمان کے خون، مال اور عزت کا احترام کیا جائے۔ جب ہمارا خدا رسولؐ ایک، دین و مذہب ایک، قبلہ ایک اور نفع و نقصان ایک تو پھر باہمی تفریق و انتشار کیوں، نفرت و عداوت کیوں؟ ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!! (اقبال)

۹۔ مسلمانوں کا مستقبل

جب تک مسلمانوں میں ایمان کی صفت موجود تھی اور وہ بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ ان میں اتحاد تھا نتیجۃً وہ دنیا میں سرفراز ہوئے اور ہر طرف ان کا طوطی بولتا تھا۔ لیکن جب مسلمان ایمان کی حرارت کھو بیٹھے اور ان میں پھوٹ پڑ گئی تو وہ زوال اور انحطاط کا شکار ہو گئے اور دوسروں کے غلام بن کر رہ گئے۔ اب بھی اگر مسلمان پھر سے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے اسلاف کی پیروی کرنی ہوگی، اپنے اندر ایمان کی حرارت پیدا کرنی ہوگی اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہنا ہوگا۔ اس وقت دنیا میں مسلمان کی تعداد ایک ارب سے زائد ہے اور وہ تقریباً پچاس آزاد مملکتوں کے مالک ہیں۔ اگر تمام دنیا کے مسلمان صحیح معنوں میں اخوت و بھائی چارے کے رشتے میں منسلک ہو جائیں تو وہ ایک ایسی زبردست قوت بن کر ابھر سکتے ہیں کہ کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکتی۔

؎ کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے

یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

(اقبال)

تبلیغ

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (المائدہ: ۶۷)

ترجمہ: تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے، اُسے لوگوں تک پہنچا دو۔

سوال: تبلیغ سے کیا مراد ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے اور اسوۂ نبویؐ سے اس کی مثالیں دیجئے۔ نیز مبلغ کے اوصاف لکھیئے۔

تبلیغ کا مفہوم

"تبلیغ" کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں، اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد ہے اسلام اور اس کے عقائد و احکام کو خدا کے بندوں تک ٹھیک ٹھیک بے کم و کاست پہنچا دینا۔ قرآن مجید میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں، جن میں سے ایک لفظ "انذار" ہے، جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں۔ دوسرا لفظ "دعوۃ" ہے، جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ "تذکیر" ہے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں۔

تبلیغ کی ضرورت و اہمیت

یہ دنیا حق و باطل کی رزم گاہ ہے، یعنی یہاں حق و باطل کی کشمکش اور جنگ جاری ہے۔ ایک طرف خالق کائنات نے دنیا میں پیغمبر بھیجے اور دوسری طرف شیطان کو پیدا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اختیار دیا اور حق و باطل کی دونوں راہیں اس کے سامنے کھول دیں۔ اب وہ چاہے تو حق کی پیروی کرے اور چاہے تو باطل کی راہ پر گامزن ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ

ترجمہ: پس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔

پھر فرمایا:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (الدھر:)

ترجمہ: بلاشبہ ہم نے انسان کو راستہ سمجھا دیا ہے۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ شکر کرنے والا بن جائے یا ناشکرا ہو جائے۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (البقرۃ:

ترجمہ، دین میں جبر نہیں۔ ہدایت گمراہی سے بالکل ممتاز ہو چکی ہے۔

یہ ایک تاریخی اور علمی حقیقت ہے کہ کفر و شرک کی باطل قوتیں ہر دور میں حق یعنی اسلام پر غلبہ پانے بلکہ اسے دنیا سے نابود کر دینے کی پوری کوشش کرتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اگر باطل پرست اپنے باطل پر اتنا مضبوط ہے تو مومن حق پرست کا فرض ہے کہ وہ حق پر اس سے بھی زیادہ کاربند ہونے اور اس کے لیے قربانی دینے کا ثبوت دے۔ دنیا میں نیکی کو پھیلانے اور برائی کو مٹانے کے لیے پوری جدوجہد کرے۔ اگر تبلیغ اسلام کا کام ختم کر دیا جائے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آخرکار ہر طرف کفر ہی کفر نظر آئے گا اور اسلام خدانخواستہ دنیا سے ناپید ہو جائے گا۔ اچھائی پنپ نہیں سکتی اور برائی مٹ نہیں سکتی، جب تک اہلِ حق نیکی کو فروغ دینے اور بدی کا قلع قمع کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور اس راہ میں ہر قسم کی قربانی نہ کریں۔ یہی وہ راز ہے جس کے لیے اللہ رب العزت نے ہر نبی کو مبلغ بنا کر دنیا میں روانہ کیا اور انہوں نے تبلیغِ اسلام کے راستے میں ناقابلِ بیان تکالیف اٹھائیں ؎

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم — سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

(اقبال)

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن — پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

(ظفر علی خاں)

سب سے بڑا اور پہلا مبلغ خود پیغمبر ہوتا ہے اور پیغمبروں کی مقدس جماعت میں سے بھی عظیم ترین مبلغ جناب رسالت مآب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تبلیغ اسلام کا حکم ان الفاظ میں دیا تھا:

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (المائدہ: ۶۷)

ترجمہ، اے رسولؐ! تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔

یہ حقیقت تو بالکل واضح ہے کہ حضورؐ سے خدا کے احکام کی تبلیغ میں کوتاہی ہونے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے یہ طرزِ بیان اختیار فرمایا۔ حضورؐ پر کیا کچھ ظلم وستم ڈھائے گئے اور اس سلسلے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ "مجھے تمام نبیوں میں سب سے زیادہ ستایا گیا ہے۔" لیکن اس کے باوجود آپؐ مسلسل تبلیغ فرماتے رہے۔ مسجد میں ہوں یا میدانِ جنگ میں، گھر میں ہوں یا بازار میں، جنگل میں ہوں یا سفر میں ہر حالت میں آپؐ مبلغ تھے۔

حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ہر حصہ تبلیغ اسلام کی منہ بولتی تصویر ہے۔ یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہی، جبکہ اسلام کو مکمل غلبہ حاصل ہو گیا۔ پھر حضورؐ نے تبلیغ کا فریضہ امت کے ذمہ ڈالا۔ اس کے سارے نشیب و فراز سمجھائے، اس کی شرائط و ارکان واضح کیے اور اپنی زندگی ہی میں تبلیغ دین کا ایک زندہ و متحرک نظام قائم کر دیا۔ حضورؐ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں طور پر مستحق قرار دیا۔ اسلام کے پیروکاروں کے لیے لازم کر دیا گیا کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

اسلام کا نظامِ تبلیغ

اسلام کو سربلند اور ہرا بھرا رکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضہ تبلیغ رسالت کو اُمت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ تبلیغ دین میں اُمتِ مُسلمہ، رسولؐ کی نائب ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (البقرۃ: ۱۴۳)

ترجمہ: اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر نگران ہو اور رسولؐ تم پر نگران ہو۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہیں دین کی امانت پہنچا دی ہے۔ اب تمہارا فرض یہ ہے کہ اسے سب انسانوں تک پہنچا دو۔

تبلیغ کے دو طریقے

اُمت تبلیغ کی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے دو طریقے اختیار کرنے پر مامور ہے۔

۱۔ انفرادی تبلیغ　　　۲۔ اجتماعی تبلیغ

۱۔ انفرادی تبلیغ

امت کے ہر فرد کو مبلغ بنایا گیا ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ بقدرِ ضرورت اسلام کا علم حاصل کرے اور اسے حتی المقدور دوسروں تک پہنچائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ط (آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

پھر فرمایا:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ م يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ: ۷۱)

ترجمہ: اور مومن مرد اور مومن عورتیں، ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

سورۃ العصر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ع

ترجمہ: (اور مومن) آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

۲۔ **اجتماعی تبلیغ** تبلیغ محض انفرادی ذمہ داری نہیں بلکہ اسے ایک نظم و ضبط کے تحت لا کر اہل اسلام کی اجتماعی ذمہ داری بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ قرآن مجید کی رو سے جب اہل اسلام کو حکومت و اقتدار ملے تو نیکی کو پھیلانا اور برائی کو مٹانا ان کا اجتماعی فریضہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط (الحج: ۴۱)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے میں سے ایک جماعت کو تبلیغ دین کے لیے وقف کر دیں۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَأُولٰئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران : ۱۰۴)

ترجمہ: اور تم میں سے ایک بڑی جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو بھلائی کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے، برائی سے روکے اور یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک اور موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝ (التوبۃ : ۱۲۲)

ترجمہ: اور مومنوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ سب کے سب نکل پڑیں۔ تو کیوں نہ ان کی ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ نکلے، تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو تبلیغ کریں، جب وہ ان کی طرف واپس جائیں تاکہ وہ بھی (برائی سے) بچیں۔

اس آیت سے اجتماعی تبلیغ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں لوگ باری باری گروہ در گروہ مدینہ منورہ میں آکر حضورؐ کے پاس رہتے اور احکامِ دین سیکھ کر واپس جایا کرتے تھے۔ آپؐ نے اس غرض کے لیے درس گاہ صفہ قائم کی تھی۔ باہر تبلیغ اسلام کے لیے جو جماعتیں بھیجی جاتی تھیں وہ بھی اسی اجتماعی تبلیغ کا حصہ ہیں۔ چنانچہ تعلیم و تربیت کے لیے درس گاہیں قائم کرنا اور تبلیغ کو ایک منظم نظام کے تحت بروئے کار لانا مسلمانوں کا فرض ہے۔

اصولِ تبلیغ

موجودہ دور میں دوسرے لوگوں کے ذہن میں کسی خاص بات کو بٹھانے کے لیے کئی نفسیاتی اور حکیمانہ طریقے ایجاد ہو چکے ہیں اسلامی تبلیغ کے لیے ان طریقوں سے کام لینا قرآنی احکام کی تکمیل ہو گی۔ تبلیغ کا انداز حکیمانہ ہونا چاہیئے اور موقع محل کی مناسبت سے کام لینا چاہیئے۔ انسانی نفسیات بڑی پہلو دار اور پیچیدہ ہے۔ اسے مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ (النحل : ۱۲۵)

ترجمہ: لوگوں کو حکمت و دانش اور اچھی نصیحت سے اپنے رب کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔

تبلیغ کے مخاطب بالعموم تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کو تبلیغ کرنے کے الگ الگ طریقے اور اصول ہیں:۔

۱۔ **حکمت** پڑھے لکھے، عقلمند اور دانا لوگ۔ انہیں تبلیغ کرنے کے لیے حکمت کی ضرورت ہے۔

۲۔ **موعظہ حسنہ** مصنف مزاج عوام۔ ان کے لیے اچھی نصیحت (موعظہ حسنہ) کافی ہے۔

۳۔ **جدال** ضدی اور ہٹ دھرم مخالفین۔ ان کے ساتھ بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن قرآن نے بحث کے لیے احسن طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ مخالف میں تعصب اور جانبداری اور نہ بڑھ جائے۔ مناظرے کا مقصد محض مخالف فریق کو ہرانا نہیں ہے اور نہ ہی تبلیغ کا مقصد مخالف کے منہ بند کرنا یا خاموش کرا دینا ہے، بلکہ اصل مقصد حق کو واضح کرنا ہے۔ واضح دلائل اور حکیمانہ انداز کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہیئے۔ مثلاً حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ایک دہریے کو وجودِ باری تعالیٰ کا ثبوت دیتے ہوئے اس مثال سے لاجواب کر دیا کہ جب ایک معمولی کشتی بغیر بڑھئی کے نہیں بن سکتی تو اتنا بڑا نظامِ کائنات بغیر کسی بنانے والے کے کیسے چل سکتا ہے؟

تبلیغ کے بارے میں احادیث مبارکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات گرامی کا ایک بڑا حصہ تبلیغ کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ ذیل میں چند احادیثِ مبارکہ پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے منع کرے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں برا سمجھے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

۲۔ میری طرف سے آگے پہنچاؤ، اگرچہ ایک آیت ہی ہو۔ (بخاری شریف)

۳۔ مجھے اس خدا کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے کہ تم ضرور نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے رہو گے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے۔ پھر تم اس سے دعائیں کرو، لیکن وہ قبول نہ ہوں۔ (ترمذی)

۴۔ اللہ تعالیٰ عام لوگوں کے گناہوں سے خاص لوگوں کو سزا نہیں دیتا، جب تک کہ ان میں

گناہ نہ پھیل جائیں اور وہ انہیں مٹانے پر قادر ہوں مگر نہ مٹائیں۔ (مسند احمد و طبرانی)

۵۔ خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد ہوتا ہے: "جو لوگ حاضر ہیں، وہ ان تک پہنچا دیں جو غیر حاضر ہیں۔"

۶۔ بہترین جہاد یہ ہے کہ ظالم حاکم کے سامنے حق بات کہہ دی جائے۔

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

۷۔ حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے کہ ہم نے جن باتوں پر حضورؐ سے بیعت کی تھی، ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہم جہاں بھی ہوں، حق بات کہیں اور اللہ کے معاملے میں کسی بُرا بھلا کہنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں۔ (بخاری و مسلم)

۸۔ ایک حدیث کے مطابق بنی اسرائیل میں سب سے پہلا نقص جو داخل ہوا وہ یہی تھا کہ ایک شخص دوسرے سے ملتا تو کہتا، اے شخص! اللہ سے ڈر اور یہ کام چھوڑ دے۔ یہ تیرے لیے حلال نہیں۔ پھر دوسرے دن اس سے ملتا اور وہ شخص ابھی ویسا ہی ہوتا تو اب یہ اسے منع نہ کرتا بلکہ اس کے ساتھ کھاتا پیتا اور دوستی رکھتا۔ جب یہ وبا عام ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل مردہ کر دیئے۔ وہ پیغمبروں کی زبان سے ملعون ٹھہرائے گئے اور نافرمانی ان کا قومی شعار بن گیا پھر آپؐ نے فرمایا: نہیں، خدا کی قسم تم ہرگز بچ نہیں سکتے، یہاں تک کہ نیکی کا حکم دو برائی سے روکو، ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف لاؤ۔ ورنہ تمہارے دل بھی انہی کی طرح سخت ہو جائیں گے اور تم بھی ان ہی کی طرح لعنت کے سزاوار ٹھہرو گے۔ (ابوداؤد، ترمذی)

۹۔ خدا اس شخص کو مسرور و شادماں رکھے جو میری بات سن کر یاد کرے اور اسے آگے پہنچائے کیونکہ بہت سے سننے والے، ان لوگوں سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں، جنہوں نے براہِ راست (مجھ سے) سُنا۔ (بخاری شریف)

۱۰۔ اس شخص کی مثال جو حدود اللہ پر قائم ہے اور اس کی جو اللہ تعالیٰ کی حدود میں زیادتی کرنے والا ہے، اس قوم کی سی ہے جو ایک جہاز میں سوار ہو۔ بعض جہاز کے اوپر کے حصے میں ہوں اور بعض نچلے حصے میں۔ جب نیچے والوں کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اوپر جا کر پانی لیتے ہیں۔ اگر وہ یہ خیال کریں کہ ان کے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے، وہ کیوں نہ نچلے حصے میں سوراخ کر لیں تاکہ انہیں وہیں سے پانی مل جائے اور اوپر والوں کو کوئی تکلیف بھی نہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر اوپر والے انہیں نہ روکیں تو سب ہلاک ہو جائیں گے۔ اگر وہ انہیں روک دیں تو دونوں فریق ڈوبنے سے بچ

جائیں گے۔

اسوۂ رسولؐ تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق قرآن مجید میں کھلے اور واضح احکام دیئے اور اس کے داعی و حامل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا۔ اس لیے اپنی تبلیغ کے لیے قریش وغیر قریش، حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی، بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الہٰی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ ایک موقع پر حضورؐ نے حضرت علی المرتضیٰ رضؓ سے فرمایا:

"اے علیؓ! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق کو قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہوشیار کیا۔ حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپؐ کی آواز پہنچ گئی۔ اور لوگ تلاش حق کے لیے آپؐ کے پاس آتے۔ مدینہ منورہ آئے قریش گو برسوں تک دوسرے قبائل تک اسلام پہنچنے میں سدِ راہ بنے رہے، پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبائل تک آواز پہنچائی گئی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لیے تلوار اٹھائی کہ اسلام کو تبلیغ کی پر امن آزادی ملے۔ چھ برس کی جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی۔ قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو "فتح مبین" قرار دیا۔ اس کے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے واعظ، قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ روم و ایران اور حبش وغیرہ کے طالبین اسلام لائے اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے۔ مشرکین عرب، یہود، عیسائی اور پارسی سب نے آپؐ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی:

يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا

یعنی: دین اسلام کو آسان کر کے پیش کرنا، سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا۔"

علاوہ ازیں حضورؐ نے یہ تعلیم فرمائی کہ تبلیغ میں تدریج کا خیال رکھا جائے۔ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ ہی اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے، بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کئے جائیں۔ پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم، پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، پھر زکوٰۃ ہے۔ پھر دوسرے فرائض ہیں حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپؐ نے فرمایا "تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کا رسول ہے۔ جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے۔ یہ صدقہ (زکوٰۃ) ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دے دیا جائے، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بڑھیا مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں تبلیغ اسلام کا بہترین اسوہ پیش فرمایا۔ حضورؐ کو ڈرایا دھمکایا گیا، گالیاں دی گئیں، نام دھرے گئے، قطع تعلقی کی گئی، پتھر برسائے گئے، آپؐ کے سر پر کنکر اور ریت ڈالی گئی، حالتِ نماز میں لوگوں نے آپؐ پر گندگی تک پھینکی۔ طائف میں آپؐ کو پتھر مار مار کر لہو لہان کر دیا گیا۔ راستے میں کانٹے بچھائے گئے، دولت وحسن اور حکومت واقتدار کا لالچ دیا گیا۔ آپؐ کے ساتھ آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے، لیکن آپؐ اپنے ساتھیوں سمیت صبر وثبات کا پہاڑ بن کر جمے رہے اور تبلیغ و اشاعت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ آپؐ کا ظاہری سہارا جو کچھ تھے آپؐ کے چچا ابوطالب تھے۔ جب انہوں نے آپؐ کو سمجھایا کہ بیٹا! چچا پر ناقابلِ برداشت بوجھ نہ ڈال اور اپنی قوم کی مخالفت چھوڑ دے۔ تو آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر آفتاب اور دوسرے ہاتھ پر ماہتاب لا کر رکھ دیں تو بھی میں اس فریضہ سے دستکش نہیں ہو سکتا، تاآنکہ میں کامیاب ہوں، یا اسی راہ میں میرا خاتمہ ہو جائے"

ابوطالب یہ جواب سن کر سخت متاثر ہوئے اور کہا: "بھتیجے! جو دل میں آئے کرو، میں کسی حالت میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا"

مخالفین کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ لیکن کارلائل کے قول کے مطابق نہتے اور بےوتنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام

کی تبلیغی دعوت تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسنِ اخلاق اعلیٰ سیرت و کردار اور حکیمانہ و کریمانہ انداز دعوت تھا۔ مدینہ منورہ میں جب کہ اسلامی حکومت قائم ہو جانے سے آپؐ کی مصروفیات کئی گنا بڑھ گئی تھیں، آپؐ نے تبلیغ کے فریضہ کو کبھی نہیں بھلایا مسجد میں ہوں یا میدانِ جنگ میں، گھر میں ہوں یا بازار میں، جنگل میں ہوں یا سفر میں ہر حالت میں آپؐ مبلغ تھے۔ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ　　عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی　　اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

مبلغ کے اوصاف

تبلیغ اسلام کے سلسلے میں سب سے بڑا کردار خود مبلغ کا ہوتا ہے۔ مبلغ کو سب سے پہلے خود دل و جان سے اسلام کا شیدائی ہونا چاہیے۔ اس کا ایمان مستحکم و پائدار ہونا چاہیے۔ دین اس کا اوڑھنا اور بچھونا بن جائے۔ مبلغ کی گفتگو، چال ڈھال، سیرت و کردار اور صفات کو دیکھ کر ہی سننے والے متاثر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسوۂ رسولؐ، سیرت صحابہ کرامؓ اور صوفیائے کرامؒ و بزرگانِ دینؒ کا طریق و کردار ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ذیل میں کچھ اہم اوصاف بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ ایمانِ کامل

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، مبلغ حق کا فرض ہے کہ سب سے پہلے اس کا اپنا ایمان کامل، پختہ اور پائدار ہو۔ دین سے اسے والہانہ لگاؤ ہو۔ اور وہ پورے ذوق و شوق کے ساتھ تبلیغ کے فریضہ کو ایک مشن سمجھ کر بجا لائے۔ قرآن نے سورۂ آلِ عمران میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ایمان باللہ کا ذکر کر کے ایمان کی اہمیت اور مبلغ کے لیے اس کی زیادہ ضرورت پر زور دیا ہے۔ خود پیغمبر بھی لوگوں کو دعوتِ حق دینے سے پہلے ایمان لاتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ

(البقرۃ: ۲۸۵)

ترجمہ: رسولؐ اس دین پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور مومن بھی ایمان لائے۔

۲۔ عمل

مبلغ کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ وہ جس چیز کو دوسروں تک پہنچا رہا ہے اس پر خود بھی عمل کرے۔ کیونکہ عمل کے بغیر تبلیغ و تلقین لاحاصل اور

بے اثر ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ خود میاں فضیحت اوروں کو نصیحت مبلغ کا جسم و جان اس کی زبان اور قول کے ساتھ موافقت رکھتا ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (البقرة ۴۴)

ترجمہ: کیا لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝

(الصف: ۲، ۳)۔

ترجمہ: اے ایمان والو! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کے ہاں یہ سخت بیزاری کی بات ہے کہ تم کہو جو کرتے نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے روز کسی شخص کو لایا جائے گا اور اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے پیٹ کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی اور وہ ان کے گرد اس طرح گھومے گا، جس طرح گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے۔ دوزخی جمع ہو کر اسے کہیں گے کہ اے شخص! یہ کیا بات ہے؟ کیا تو نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے منع نہ کرتا تھا؟ وہ جواب دے گا: "ہاں! لیکن لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا اور خود اس پر عمل نہ کرتا تھا۔ انہیں برائی سے روکتا تھا، لیکن خود برائی کرتا تھا۔" (بخاری و مسلم)

۳۔ شہادتِ حق

شہادتِ حق سے یہ مراد ہے کہ جو حق ہمارے پاس آیا ہے، جو صداقت ہم پر واضح و روشن ہو چکی ہے، ہم دنیا کے سامنے اس کے حق اور صداقت ہونے پر اور اس کے راہِ راست ہونے پر گواہی دیں۔ تاکہ لوگوں پر دین کی حجت پوری ہو جائے۔ جس حق پر ہم خود ایمان لائے ہیں، زبان سے اس کی گواہی دیں، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں۔ حق کو واضح کریں، اسے پھیلائیں اور ہر قیمت پر اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ کسی لالچ یا خوف سے حق کو نہ چھپائیں۔ ارشادِ نبوی ہے:

"حق بات سے خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔"

پھر فرمایا:

"حق پر خاموش رہنے والے شخص کے منہ میں قیامت کے روز آگ کی لگام دی جائے گی۔"

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق (اقبال)

۴۔ خلوص و بے لوثی

مبلغ کو پورے خلوص اور بے لوثی سے تبلیغ کرنی چاہیئے۔ اس کا مقصد محض دین حق کی سرفرازی ہونا چاہیئے۔ اسے ذاتی اور دنیاوی لالچ سے بے نیاز ہو کر فقط رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر کام کرنا چاہیئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (الفرقان: ۵۷)

ترجمہ: "اے نبیؐ! ان سے کہیے کہ میں اس پر تم سے کچھ معاوضہ نہیں مانگتا۔"

۵۔ نرمی اور شفقت

مبلغ میں نرمی اور شفقت کی ضرورت عام لوگوں سے زیادہ ہے۔ وہ اپنے مخاطب سے ہمدردی اور شفقت رکھے، اس سے نرم لہجے میں بات کرے، خوش خلقی سے پیش آئے اور اس کے دل میں مخاطب کی خیر اندیشی کے جذبات موجزن ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جب فرعون کے پاس تبلیغِ حق کے لیے بھیجا تو فرمایا:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ: ۴۴)

ترجمہ: "سو اسے نرم بات کہو، شاید وہ نصیحت پکڑے یا ڈرے۔"

۶۔ تیسیر و تبشیر یا آسانی اور بشارت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار اپنے رسولؐ کی صفت بشیر بیان فرمائی ہے، جس کے معنی ہیں، خوشخبری دینے والا۔ لہٰذا مبلغ کا فرض ہے کہ اپنے مخاطبین کو خوشخبری دے، انہیں متنفر نہ کرے اور اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ دین کو ان کے سامنے آسان اور سہل بنا کر پیش کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کو یمن میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا تو فرمایا:

يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا (بخاری شریف)

ترجمہ: "دین کو آسان بنا کر پیش کرو اور مشکل مت بناؤ، لوگوں کو خوشخبری دو اور متنفر مت کرو۔"

تدریج و ترتیب

مبلغ کو تبلیغ دین کے سلسلے میں تدریج و ترتیب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ لوگوں کے سامنے اسلامی اصول و احکام رفتہ رفتہ اور تدریج کے ساتھ پیش کرنے چاہئیں اور ایک ہی دفعہ سارا بوجھ ان پر نہ رکھ دیا جائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن بھیجتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ سب سے پہلے لوگوں کے سامنے عقیدۂ توحید و رسالت پیش کرو۔ اگر وہ مان لیں تو نماز پیش کرو اور

اس کے بعد صدقہ و زکوٰۃ کی بات کرو اور انہیں سمجھا دو کہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ اسے تمہارے دولت مندوں سے لے کر تمہارے مفلسوں میں بانٹ دیا جائے۔ (بخاری شریف)

۸۔ تالیفِ قلوب

تالیف قلوب کے معنی ہیں "دلوں کو ملانا" اس سے مراد اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو، لطف و محبت، غم خواری و ہمدردی، مالی امداد و اعانت و سرپرستی کرنا ہے، کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون و احسان مند ہوتا ہے اور یہ احسان مندی عناد، دشمنی اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ حضور اکرمؐ نے بہت سے لوگوں کو اسی حکمت عملی سے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے، حضورؐ نے غزوۂ حنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی میں تقسیم فرما دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں۔ اسوۂ حسنہ میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

؎ بنتے ہیں غیر اپنے، ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں (حالی)

تبلیغ کے طریقے

حالات، موقع و محل اور تقاضائے وقت کے لحاظ سے تبلیغ کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جا سکتے ہیں مثلاً:۔

۱۔ زبانی تبلیغ ۲۔ قلمی و تحریری تبلیغ ۳۔ سائنس کے جدید آلات و ایجادات ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈر، وی، سی، آر، دیگر ذرائع ابلاغ اخبارات و رسائل وغیرہ کو دعوتِ حق میں استعمال کرنا۔ ۴۔ ان کے علاوہ تبلیغ کے لیے نئے نئے وسائل و ذرائع اختیار کرنا اور ہر قوم و ملک کے خاص حالات، رسم و رواج اور عوام کی نفسیات کا لحاظ رکھنا۔

یہ بات غور طلب ہے کہ جدید سائنسی ایجادات و آلات کو اگر باطل نظریات و تصورات کی تشہیر کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے تو دعوتِ حق کے کام کے لیے بروئے کار کیوں نہیں لایا جا سکتا۔

جہاد

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (الحج: ۷۸)

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔

سوال: جہاد کا مفہوم واضح کیجیے۔ اس کی کتنی اقسام ہیں؟ جنگ اور جہاد میں کیا فرق ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جہاد کی ضرورت اور فضیلت بیان کیجیے۔

جواب:

جہاد کا مفہوم

جہاد کا مادہ جہد ہے، جس کے معنی کوشش کرنا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں جہاد سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لیے ہر جائز اور ممکن کوشش کی جائے۔ زبان سے دین کو سرفراز کرنے کی کوشش کرنا، کتاب و سنت کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا، مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینا زبانی جہاد ہے۔ قلم سے اسلام کی خدمت سرانجام دینا، پریس کو نیکی کے لیے استعمال کرنا، کتابیں، رسائل اور نظم ونثر شائع کرنا قلمی جہاد ہے۔ اس مقصد کے لیے مال خرچ کرنا، مدارس، کتب خانے اور لائبریریاں کھولنا مبلغین کو مالی وسائل بہم پہنچانا اور دین کی خدمت کے لیے اجتماعی فنڈ قائم کرنا مالی جہاد ہے اگر وقت آپڑے تو حق کے لیے جان کی بازی لگا دینا اور حفاظتِ حق، مسلمانوں کے ننگ و ناموس کو بچانے اور مظلوموں کی دادرسی کے لیے مسلح کارروائی کرنا جانی جہاد ہے۔ جسے قرآن قتال کے نام سے یاد کرتا ہے۔ لیکن عام طور پر قتال کے لیے جہاد ہی کا لفظ استعمال ہوتا ہے، کیونکہ قتال جہاد کی اعلیٰ ترین اور آخری صورت کا نام ہے۔

جنگ اور جہاد

یورپی مفکرین نے جہاد اور جنگ کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے اور اسلام کے تصور جہاد کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام ایک جنگی جنون رکھنے والا مذہب ہے جو غیر مسلموں کے خلاف جنگ کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے اور اس طرح امن و امان کو برباد کرنے پر ہر وقت تلا رہتا ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

یہ پراپیگنڈہ دراصل تعصب اور اسلام کے خلاف بے جا نفرت کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان میں جہاد جنگ کا ہم معنی ہرگز نہیں۔ جنگ کا سبب ہمیشہ بغض و عناد، نفرت و

دشمنی، ملک گیری اور ہوس مال و زر ہوتا ہے، جبکہ جہاد ہر اس کوشش کا نام ہے، جس کا مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ یہ جہاد حق و صداقت کے فروغ، ظلم و جبر کے خلاف اور مظلوم کی حمایت میں ہوتا ہے۔ اس کا مقصد دنیا کے امن و امان کو تہ و بالا کرنا نہیں بلکہ اسے صحیح معنوں میں قائم کرنا ہے۔ یہ لوگوں کے لیے زحمت نہیں بلکہ رحمت بن کر آتا ہے۔ اس طرح اسلام نے جنگ کے مفہوم کو یکسر بدل دیا ہے، اسلامی جہاد محض جنگ و قتال نہیں ہے بلکہ یہ ایک پاکیزہ اور اعلیٰ تر مقصد ہے گویا اسلام نے جنگ کو ایک عبادت کا درجہ دے دیا ہے۔ اسلام کا تصورِ جہاد ایک امتیازی اور منفرد حیثیت رکھتا ہے اور کوئی دوسرا مذہب اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جہاد کی ضرورت واہمیت

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بدی کی قوتیں منظم ہیں۔ تنظیم کا جواب تنظیم ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اسلام کی مرکزیت کی حفاظت کے لیے جہاد کو فرض کیا گیا ہے۔ اگر جہاد کا حکم نہ دیا جاتا تو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی، آزادی، جان و مال اور عزت و آبرو ہر وقت خطرے میں رہتی اور اس کا کوئی مداوا نہ ہو سکتا۔ اسلام ایک فطری دین ہے، اس نے اس فطری ضرورت کا احساس کرتے ہوئے درجہ بدرجہ زبانی، تحریری، مالی اور جانی جہاد فرض قرار دیا ہے۔ اس کے بغیر ظلم و ستم مٹ نہیں سکتا تھا، فتنہ و فساد کی سرکوبی نہیں ہو سکتی تھی اور حق و صداقت زندہ و پائندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ بقولِ علامہ اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

فتنہ و فساد کو مٹانا اور ظلم کو ظلم سے روکنا عظیم ترین عبادت ہے۔ کیونکہ اس سے امن قائم ہوتا ہے، لوگوں کی جان و مال اور عزت و ناموس محفوظ ہوتی ہے، ڈاکو، لٹیرے اور دنیا کے امن و امان کو خاکستر کر دینے والے اپنے کیفر کردار کو پہنچتے ہیں۔ فتنے کو اگر بڑھنے کا موقع ملا تو دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ جہاد میں بعض دفعہ انسانی جانوں کا قتل بھی ہوتا ہے، لیکن چونکہ فتنہ و فساد اس سے بھی بُرا ہے اس لیے اسے مٹانے اور امن و امان قائم کرنے کے لیے اس کی اجازت دی گئی ہے، بلکہ جب ظلم و فساد اور فتنہ و شر انتہا کو پہنچ جائے تو اسے اعلیٰ ترین عبادت قرار دیا گیا ہے۔

بقول مولانا مودودیؒ:

دوسرے تمام دینوں کی طرح دین اللہ بھی محض اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتا کہ آپ بس اس کے حق ہونے کو مان لیں اور اپنے اس اعتقاد کی علامت کے طور پر محض رسمی عبادت پر اکتفا کر لیں۔ کسی دوسرے دین کے ماتحت رہ کر آپ اس دین کی پیروی کر ہی نہیں سکتے۔ کسی دوسرے دین کی شرکت میں بھی اس کی پیروی ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر آپ واقعی اس دین کو حق سمجھتے ہیں تو آپ کے لیے اس

کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس دین کو زمین میں قائم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں اور یا تو اسے قائم کر کے چھوڑیں یا اسی کوشش میں جان دے دیں۔ یہی جہاد کی اہمیت ہے۔

۷۔ شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی (اقبالؒ)

جہاد کی اقسام

۱۔ جہادِ اکبر۔ نفس کے خلاف جہاد

علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔ اسی کا نام ان کے ہاں "جہادِ اکبر" ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی سے واپس آئے تھے، فرمایا: "تمہارا آنا مبارک! تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔" ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

المجاهد من جاهد نفسه

یعنی: "مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔"

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا (ذوقؔ)

۲۔ جہاد بالعلم

دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے۔ اس کا دور کرنا ہر طالبِ حق کے لیے ضروری ہے۔ ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو منور کرے۔ تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ سکون و اطمینان پیدا ہو سکتا جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ (النحل: ۱۲۵)

ترجمہ: (اے نبیؐ!) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقۂ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" ہے۔ یہ علم کا جہاد ہے جو اہلِ علم پر فرض ہے۔

امام ابو بکر رازیؒ کا قول ہے:

"جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے۔"

۳۔ جہاد بالمال

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مال و دولت عطا کی ہے، اس کا منشار بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسائش کے لیے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لیے۔ دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے۔ چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں۔ اس لیے جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا، جہاد بالمال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابہ کرامؓ نے جہاد بالمال کی روشن مثالیں پیش کیں۔ اسی جذبہ ایثار و قربانی کی بدولت گلستانِ اسلام کی آبیاری ہوئی۔ ارشادِ ربانی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (الانفال: ۷۲)

ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔

۴۔ جہاد بالنفس

جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کی ان تمام قسموں کو شامل کیا ہے، جس میں کوئی نہ کوئی جسمانی مشقت صرف ہو۔ اس جہاد کی آخری حد یہ ہے کہ خطرات سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی جو انسان کی سب سے زیادہ عزیز متاع ہے، اللہ کی راہ میں قربان کر دے۔ یہ انتہائی جذبہ ہے جس کی ایک مسلمان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ جان کے ذریعے جہاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لیے ہر قسم کی جسمانی تکلیف اٹھائی جائے اور انسان اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے، پھانسی پر چڑھنے، تیر اور نیزوں سے چھد جانے، تلوار سے کٹنے اور توپ و بندوق سے ہلاک ہونے کے لیے ہر وقت آمادہ اور تیار رہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے: "دین کے کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔"

؎ جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

۵۔ زبان و قلم سے جہاد

زبان و قلم سے بھی جہاد کیا جا سکتا ہے۔ آج کل سراسر علمی دور ہے اور لوگ تحریر سے بہت زیادہ اثر قبول

کرتے ہیں۔ لہٰذا اس دور میں جو شخص تصانیف، رسائل اور مضامین اس غرض سے لکھتا ہے کہ اس سے دین کی حمایت اس کی اشاعت و ترویج ہو اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں تو یہ بھی جہاد کی ایک صورت ہے اسی طرح خطابت اور ولولہ انگیز شاعری بھی جہاد کا ایک ذریعہ ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

"مشرکین سے اپنی جان و مال اور زبانوں کے ذریعے جہاد کرو۔"

۶۔ جامع اور دائمی جہاد

جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان و مال اور دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی جہاد ہے۔ عورتوں کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "تمہارا جہاد نیک حج ہے۔" ایک صحابی جہاد کی خواہش لے کر آئے تو حضورؐ نے فرمایا: "تم اپنے والدین کی خدمت میں جہاد کرو۔" اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے:

"بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔"

ایک مسلمان کے لیے دائمی جہاد یہ ہے کہ وہ دین کی حمایت، علمِ دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیردستوں کی امداد، سیہ کاروں اور گمراہوں کی ہدایت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اقامت عدل، ردِ ظلم اور احکامِ الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک تسلسل نظر آئے۔ یہی وہ جہادِ محمدیؐ ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و کامرانی کا نشان ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: "جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔"

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان (اقبالؔ)

(سیرۃ النبیؐ۔ از سید سلیمان ندوی سے ماخوذ)

جہاد کی فضیلت قرآن کی روشنی میں

جہاد کی فضیلت میں قرآن مجید کی بے شمار آیات موجود ہیں، ذیل میں چند آیات پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصف: ۴)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کے راستے میں صف باندھ کر یوں لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ (التوبہ: ۱۱۱)

ترجمہ: بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں۔ (اس کے بدلے میں) کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، سو دشمنوں کو قتل کرتے اور خود بھی مارے جاتے ہیں۔

۳۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ٥ (التوبہ: ۲۰)

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرتے رہے، خدا کے ہاں ان کے درجے بہت بڑے ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

(۴) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ٥ (البقرۃ: ۱۵۴)

ترجمہ: اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں (وہ مردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔

۵۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال: ۳۹)

ترجمہ: اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کے سب اللہ کے لیے ہو جائیں۔

جہاد کی فضیلت حدیث کی روشنی میں

جہاد کی فضیلت اور ثواب کے لیے بہت سی احادیث بیان کی گئی ہیں، چند احادیث یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضورؐ سے پوچھا کہ کونسا عمل سب سے بہتر ہے؟

آپؐ نے فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا "خدا کی راہ میں صبح کو یا شام کو نکلنا، دنیا اور اس کی سب چیزوں سے بہتر ہے۔" (بخاری و مسلم)

۳۔ ایک شخص حاضر خدمت ہوا اور پوچھا: سب سے بہتر آدمی کون سا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: وہ مومن جو خدا کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرتا ہے، سب سے بہتر ہے۔" (بخاری و مسلم)

۴۔ ارشاد فرمایا: خدا کی راہ میں ایک دن ڈٹ جانا دوسری جگہوں میں گزرے ہوئے ہزار دنوں سے بہتر ہے۔" (ترمذی)

۵۔ جنت کے دروازے تلواروں کے سایوں کے نیچے ہیں۔ (مسلم)

۶۔ فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جنت میں خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے سو درجے تیار کیے ہیں۔ ان میں ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے۔" (بخاری)

۷۔ "اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے کہ مجھے یہ پسند ہے کہ اللہ کی راہ میں قتال کروں اور قتل ہو جاؤں، پھر زندہ ہو کر قتال کروں تو قتل ہو جاؤں۔ پھر قتال کروں اور قتل ہو جاؤں۔" (مسلم)

۸۔ جنت میں داخل ہو کر کوئی شخص واپس دنیا میں جانے کی خواہش نہیں کرتا، چاہے اسے ساری دنیا دے دی جائے۔ ہاں! شہید جو عزت و اکرام پاتا ہے، اسے دیکھ کر وہ آرزو کرتا ہے کہ کاش وہ دس دفعہ دنیا میں آئے اور خدا کی راہ میں قتل ہو۔ (بخاری و مسلم)

۹۔ فرمایا: "دو آنکھوں کو آگ نہ چھوئے گی۔ ایک وہ جو خدا کی خوف سے روئے اور دوسری جو خدا کی راہ میں پاسبانی کرتے ہوئے جاگتی رہے۔ (ترمذی)

۱۰۔ جس شخص کے پاؤں خدا کی راہ میں غبار آلود ہو جائیں، اسے جہنم کی آگ نہ چھوئے گی۔ (بخاری)

جہاد کی فرضیت

جہاد کی بعض قسمیں ہر وقت فرض ہیں۔ مثلاً زبانی اور فکری جہاد۔ مالی جہاد اور قلمی جہاد۔ اس قسم کے جہاد کے لیے صرف یہی شرط ہے کہ جس شخص کے پاس جو قابلیت و صلاحیت موجود ہے وہ اسے راہِ حق میں لگا دے۔ جب مسلمانوں کے کسی ملک پر کفار کی یورش ہو جائے یا وہ دین کو مٹانے کے لیے کھلم کھلا نکل آئیں تو تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ یہ فرضِ عین کہلاتا ہے۔ جب کسی علاقے یا ملک کے لوگ دفاع کرنے کے لیے کافی ہوں تو دوسرے مسلمانوں پر جہاد فرضِ کفایہ ہو گا۔

جہاد کی اعلیٰ ترین قسم (قتال) کی فرضیت کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں:

۱۔ مظلوموں کا اپنی حفاظت و مدافعت کے لیے جنگ کرنا جائز ہے۔ مگر آزاد مسلمانوں کو ان کی حمایت میں لڑنا فرض ہے۔

۲۔ جو لوگ مسلمانوں کو ان کے جانی و مالی حقوق سے بے دخل کر دیں، ان سے لڑنا۔

۳۔ جب مسلمانوں پر محض مذہبی عقائد و اعمال کے باعث ظلم و تشدد کیا جائے۔

۴۔ مسلمانوں کی آزادی، وطن اور حکومت چھیننے والوں سے لڑنا۔

۵۔ جب کسی جگہ اسلام کی تبلیغ کا راستہ تشدد سے روکا جائے تو جہاد فرض ہے۔

۶۔ دغابازوں اور عہد شکن دشمنوں سے لڑنا اور انہیں سزا دینا بھی فرض ہے۔

۷۔ باغیوں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کے انسداد کے لیے لڑنا۔

جہاد کا مقصد

ایک دیہاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہؐ! ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے۔ ایک شخص بہادر کہلانے کے لیے لڑتا ہے۔ ایک شخص قوم اور برادری کی عزت اور غصے میں لڑتا ہے۔ فرمائیے، ان میں سے فی سبیل اللہ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں وہ لڑتا ہے جو محض اس وجہ سے لڑے کہ خدا کی بات اونچی ہو جائے۔ (بخاری مسلم)

کتاب و سنت میں ہر جگہ جہاد یا قتال کے ساتھ فی سبیل اللہ کی شرط موجود ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد کی روشنی میں جہاد کا اصل مقصد اور غرض و غائت واضح ہے۔

جہاد کی تیاری فرض ہے

اللہ تعالیٰ نے اہلِ اسلام کو ہر وقت دشمنوں کے خلاف ہر طرح تیار رہنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

(الانفال: ۶۰)

ترجمہ: اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر ہیبت بیٹھی رہے گی۔

یہاں قوت کے لفظ اور گھوڑوں کی تیاری سے ہر قسم کے قدیم و جدید ہتھیار مراد ہیں۔ چنانچہ

اہلِ اسلام آج ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، ہوائی طاقت، بری و بحری طاقت کے جدید ترین طریقوں سے ہر وقت تیار رہنا فرض ہے۔

؎ شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تُو (اقبالؒ)

جہاد میں کامیابی کی شرائط

۱۔ ثابت قدمی اور ذکرِ الٰہی

ارشادِ ربّانی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَٱثْبُتُواْ وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (الانفال: ۴۵)

ترجمہ: مومنو! جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور خدا کو بہت یاد کرو، تاکہ تم مراد حاصل کرو۔

۲۔ خدا اور رسولؐ کی اطاعت اور اختلاف سے گریز:۔

جہاد میں کامیابی کے لیے خدا اور رسولؐ کی اطاعت اولیں شرط ہے اور اس کے ساتھ ہی اختلاف و انتشار اور جھگڑے سے گریز بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَأَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَا تَنَٰزَعُواْ فَتَفْشَلُواْ وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (الانفال، ۴۶)

ترجمہ: اور خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔

۳۔ صبر سے کام لینا

جہاد میں صبر و استقامت سے کام لینا ضروری ہے، یہی دلیل کامیابی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَٱصْبِرُوٓاْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ (الانفال: ۴۶)

ترجمہ: اور صبر سے کام لو۔ بے شک خدا صبر کرنے والوں کا مددگار ہے۔

۴۔ فخر و تکبر اور ریاکاری سے پرہیز

جہاد میں کامیابی کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اپنی تیاری اور تعداد

فخر نہ کریں بلکہ صرف خدا پر بھروسہ رکھیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (الانفال: ۴۷)

ترجمہ: اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو اتراتے ہوئے (یعنی حق کا مقابلہ کرنے کے لیے) اور لوگوں کو دکھانے کے لیے گھروں سے نکل آئے۔

۵۔ اتحاد و یک جہتی

جہاد میں کامیابی کے لیے اتحاد و یک جہتی ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: اور تم سب مل کر اللہ کی رسی (دین) کو مضبوطی سے تھامو اور تفرقے میں نہ پڑو۔

آداب جہاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام جنگ منقول ہیں ان میں یہ ہدایات شامل ہیں:

۱۔ بیماروں، زخمیوں، اندھوں، لنگڑوں، لولوں، پاگلوں، سیاحوں، خانقاہ نشینوں اور مذہبی مجاوروں سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔

۲۔ غیروں کے مذہبی شعاروں اور عبادت گاہوں کو محفوظ رکھا جائے۔

۳۔ جو لوگ جنگ میں حصہ نہیں لیتے، انہیں کچھ نہ کہا جائے۔

۴۔ کسی کو باندھ کر بے دردی سے نہ مارا جائے۔

۵۔ دشمن کے علاقے میں عام لوٹ مار اور تباہی نہ مچائی جائے۔

۶۔ قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔

۷۔ سفیروں کو بالکل محفوظ رکھا جائے۔

۸۔ عام وحشیانہ افعال سے پرہیز کیا جائے۔

خلیفۂ رسولؐ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مجاہدین کو روانہ کرتے وقت یہ ہدایات دیں:

۹۔ اللہ کا نام لے کر راہِ خدا میں نکلو۔

۱۰۔ امانت میں خیانت نہ کرنا۔

۱۱۔ مالِ غنیمت کو مت چھپانا۔

۱۲۔ بدعہدی اور بے وفائی سے بچ کر رہنا۔

۱۳۔ دشمنوں کے مردوں کا حلیہ نہ بگاڑنا۔

۱۴۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔

۱۵۔ سرسبز اور پھل دار درختوں کو مت کاٹنا۔

۱۶۔ کھانے کی ضرورت کے علاوہ جانوروں کو ذبح مت کرنا۔

ان ہدایات سے جنگ اور جہاد کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے اور اسلام نے اس سلسلے میں جو اصلاحات کی ہیں، ان کی عظمت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

(شکوہ)
علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

تاریخِ اسلام

عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۵۷۱ء تا ۶۳۲ء)

جزیرۃ العرب۔ جغرافیائی حالات

سوال: جزیرۃ العرب کے جغرافیائی حالات کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیل سے بیان کریں۔

جواب:

محل وقوع و حدود اربعہ

عرب کا ملک براعظم ایشیا میں شامل ہے اور اپنے محل وقوع کے اعتبار سے جزیرہ نما ہے۔ اس کے تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی ہے۔ مشرق میں خلیج فارس اور بحر عمان، مغرب میں بحیرۂ احمر، جنوب میں بحر ہند اور شمال میں سمندر کی بجائے شام اور فلسطین کا وسیع علاقہ ہے۔

رقبہ

اس ملک کا کل رقبہ تقریباً ۱۲ لاکھ مربع میل ہے جس میں سے چار پانچ لاکھ مربع میل کا رقبہ ریگستانوں اور بے آباد علاقوں نے گھیر رکھا ہے جن میں سے "ربع خالی" سب سے مشہور ریگستان ہے۔ جگہ جگہ مختلف پہاڑی سلسلے ہیں اور سرسبزی و شادابی کا نام تک نہیں ہے عراق، شام، یمن اور حجاز نسبتاً سرسبز اور زرخیز ہیں۔ چلچلاتی دھوپ پڑتی ہے اور بدن کو جھلسا دینے والی لو چلتی ہے۔

آبادی

آبادی ڈیڑھ اور دو کروڑ کے اندر اندر ہے۔

طبعی حالات

عرب کے طبعی حالات یکساں نہیں۔ بحیثیت مجموعی اگرچہ اس میں لق و دق صحرا پائے جاتے ہیں لیکن بعض حصے خاصے سرسبز و شاداب ہیں چنانچہ طائف اور یمن کے پہاڑوں پر وہ بہار اور رنگینی ہے کہ جسے دیکھ کر آنکھوں کی تازگی اور ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ باقی حصوں میں بارش کم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے میں یہ لوگ کہیں جم کر رہنے کے عادی نہ ہو سکے۔ زیادہ تر آبادی خیموں میں رہتی۔ جہاں پانی اور سبزہ دیکھتے وہیں ڈیرے ڈال دیتے اور خیمے گاڑ کر رہنا شروع کر دیتے۔

آب و ہوا

عرب کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ بارش سارے سال میں برائے نام ہوتی ہے۔ دن کے وقت چلچلاتی دھوپ اور لو کے باعث سخت گرمی پڑتی ہے۔ صرصر اور سموم دونوں خطرناک ہوائیں بلکہ آندھیاں ہیں۔ صرصر اپنے ساتھ ریت کے بادل اڑا کر لاتی ہے اور جس جگہ وہ ریت ڈھیر کرتی ہے اس میں قافلوں کے قافلے دب کر رہ جاتے ہیں۔ سموم ایک زہریلی ہوا ہے جو چلتی ہے تو کئی انسانوں اور جانداروں کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ مولانا حالی مسدس میں

لکھتے ہیں ؎

نہ آب و ہوا ایسی تھی روح پرور — کہ قابل ہی پیدا ہوں خود جس سے جوہر
نہ کچھ ایسے سامان تھے واں میسر — کنول جس سے کھل جائیں دل کے سراسر
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
فقط آب باراں پہ تھی زندگانی!

پیداوار عرب کا سب سے مشہور میوہ کھجور ہے جو نخلستان میں بکثرت پیدا ہوتی ہے چنانچہ اہلِ عرب کی خوراک کا بیشتر دار و مدار کھجوروں پر ہے۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں جو، باجرہ اور گیہوں بھی پیدا ہوتے ہیں۔ شہر طائف کے انگور اور انار بہت مشہور ہیں عرب کے پالتو جانوروں میں اونٹ، گھوڑا، بھیڑ اور بکری زیادہ مشہور ہیں جن میں سے اونٹ اور گھوڑے کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اہلِ عرب اونٹ کا دودھ پیتے اور گوشت کھاتے ہیں۔ اونٹ ہی سب سے بڑا ذریعہ آمد و رفت ہے۔ اونٹ کو ریگستان کا جہاز کہا جاتا ہے۔ اونٹ کی کھال اور اون سے پوشاک کا کام لیا جاتا ہے۔ گھوڑے عام طور پر جنگوں کے موقعوں پر کام آتے تھے۔

طبعی تقسیم جزیرۃ العرب کو طبعی لحاظ سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

۱۔ **حجاز** یہ علاقہ بحر احمر کے کنارے واقع ہے۔ یہ وہی خطہ ہے جسے یہود کی آسمانی کتاب تورات نے فاران کا نام دیا ہے۔ اس علاقے کا وہ حصہ جو سمندر کے قریب ہے، زرخیز و شاداب ہے۔ وہاں کھیتیاں اگتی ہیں اور باشندے خوش و خرم زندگی بسر کرتے ہیں۔ پہاڑ کا دامن سرسبز ہے۔ آبادی گنجان ہے اور بڑے بڑے شہر موجود ہیں لیکن حجاز کا اکثر حصہ ریگستان ہے جہاں کسی قسم کی زراعت نہیں ہو سکتی۔ حجاز کا سب سے بڑا ساحلی شہر جدہ ہے جو مکے کی مشہور بندرگاہ بھی ہے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور طائف مشہور و مقدس شہر ہیں۔ مکہ معظمہ میں خانہ کعبہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہیں پیدا ہوئے۔ مدینہ منورہ میں حضورؐ ہجرت فرما کر تشریف لائے۔ آپؐ کا روضہ مبارک بھی یہیں ہے۔ طائف کا شہر حجاز کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں سرسبز و شاداب ہے۔ پانی کافی مقدار میں مل جاتا ہے۔ عام طور پر حجاز کے امراء و رؤسا موسم گرما یہیں آکر گزارتے ہیں۔

۲۔ **نجد** یہ عرب کا درمیانی علاقہ ہے اور سرسبز و شاداب ہونے کے علاوہ بلند و فراز قطعۂ ملک بھی ہے۔ یہ علاقہ خود بھی ایک پھول کی طرح خوبصورت ہے لیکن اس کے اردگرد صحراؤں کے کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔ امراؤ القیس جو عرب کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا

ہے، اسی خاک سے اٹھا اور وہی اس ریاست کا آخری تاجدار تھا۔ عربی زبان اور شاعری کو اس خطے کی آب وہوا کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے۔ بارہویں صدی ہجری کا مشہور مصلح اور وہابی تحریک کا بانی محمد بن عبدالوہاب بھی اسی سرزمین کا فرزند تھا سعودی عرب کا دارالسلطنت "الریاض" اسی علاقے میں واقع ہے۔

۳۔ عروض

یمامہ اور بحرین پر مشتمل حصے کا نام عروض ہے۔ یہ علاقہ عمان کے شمال میں خلیج فارس کے کنارے کنارے عراق کی سرحد تک چلا گیا ہے۔ اگرچہ یہ علاقہ بنجر ہے لیکن تیل کی جدید صنعت کے باعث اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ غیر ملکی کمپنیوں نے اپنے کیمپ لگا رکھے ہیں اور تیل نکال کر مغربی ممالک کو بھیجتی ہیں۔ بحرین کے علاقے میں سمندر سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں۔

۴۔ حضرموت

یہ وہ علاقہ ہے جو نجد سے ملا ہوا ہے اور بحیرۂ عرب تک چلا گیا ہے اس میں حضرموت، مسقط، شمر اور عمان بڑے شہر ہیں۔ قوم عاد و ثمود کے قبائل کا اصلی وطن یہی تھا۔ اگرچہ اس علاقے میں شادابی تو نہیں، لیکن تیل کی دولت نے اسے بھی امیر بنا رکھا ہے اور دولت نے اسے بھی امیر بنا رکھا ہے اور دولت کی ریل پیل ہے۔

۵۔ تہامہ

یہ وہ نشیبی علاقہ ہے جو بحیرۂ احمر کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ یہاں گرمی بہت پڑتی ہے اور گھٹن زیادہ ہوتی ہے۔ اصل میں بحیرۂ احمر کے متوازی دور تک شمال کی طرف پہاڑوں کا متوازی سلسلہ چلا جاتا ہے۔ اس سلسلۂ کوہ اور بحیرۂ احمر کے درمیان زمین کی ایک پٹی چلی جاتی ہے جو بمشکل تیس میل چوڑی ہوگی۔

شمالی عرب اور جنوبی عرب

اللہ کی قدرت کی رنگا رنگی دیکھو کہ ایک ملک ہے اور بالکل دو طرح کے حالات عرب کا ایک حصہ خشک اور دوسرا سرسبز و شاداب۔ ایک حصہ تہذیب و تمدن کی گھما گھمی سے محروم اور دوسرا تہذیب کا مرکز۔ حضورؐ سے بہت پہلے جنوبی عرب میں بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ خورنق اور سدیر جیسے اونچے اونچے محل تعمیر ہوئے اور وہ بند بنا جو سدِ مآرب کے نام سے مشہور ہوا۔ یمن اور ریاسی عظیم الشان مملکتیں وجود میں آئیں اور اس طرح زندگی، قانون، رسم و رواج اور قاعدہ و نظام کے ابتدائی سانچوں میں ڈھلی۔ جبکہ عرب کے دوسرے حصے میں اس چہل پہل اور ترقی کا سراغ نہیں ملتا۔ شمالی عرب اور جنوبی عرب میں تہذیب کے اس نمایاں فرق کا پتا ان بچے کھچے کھنڈرات سے چلتا ہے۔ جو ان علاقوں میں کھدائی سے دریافت ہوئے۔ اسلام سے بہت پہلے تمام عرب یکساں جہالت و نادانی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کی لپیٹ میں آچکا تھا اسلام نے آکر اس ملک کو اور دنیا کو نئی روشنی اور تہذیب بخشی۔

جدید سعودی عرب

کسی زمانے میں عرب کو لق و دق صحرا اور بنجر و غیر آباد علاقہ سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ لیکن قدرت خداوندی سے یہی عرب نور ہدایت کا مرکز اور تہذیب و تمدن کا علمبردار بن گیا۔ اب تو ماشاء اللہ دولت کی ریل پیل ہے۔ قدرت نے اس ریگستانی علاقے کو معدنی تیل کے ذخائر سے مالا مال کر رکھا ہے جس کے نتیجے میں آج سعودی عرب دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ عمدہ سڑکیں ہیں۔ لق و دق صحراؤں کو سرسبز وادیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ملک میں تعلیم کا چرچا ہو رہا ہے نئے کارخانے اور فیکٹریاں لگائی جا رہی ہیں۔ طرح طرح کے ترقیاتی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ پہلے وقتوں میں تو لوگوں کی اکثریت خانہ بدوش تھی جہاں پانی کا ذخیرہ دیکھتے تھے وہیں ڈیرے لگا لیتے تھے مگر اب حالات وہ نہیں ہیں۔ بڑے بڑے نئی طرز کے شہر تعمیر ہو گئے ہیں۔ جدہ کو دیکھ کر مغربی شہر کا گمان ہوتا ہے۔ وہاں کی سر بفلک عمارات اور وسیع و کشادہ سڑکیں دور تک ساحل سمندر پر تفریح گاہیں سعودی عرب کی ترقی کی عکاسی کرتی ہیں۔ دوسرے ممالک کے باشندے جوق در جوق رزق کی جستجو میں سعودی عرب کا رخ کر رہے ہیں اور یہ ملک دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔

عربوں کی قسمیں

اہل عرب حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد میں سے ہیں جنہیں بالعموم حسب ذیل تین طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:۔

۱۔ عرب بائدہ

یہ وہ لوگ تھے جن کو تاریخی انقلاب نے مٹا دیا اور آج ان کا صرف نام ہی باقی ہے۔ ان کا سراغ ہمیں یا تو قرآن حکیم یا تورات وغیرہ سے ملتا ہے اور یا پھر ان اشعار سے ان کے کچھ حالات کا اندازہ ہوتا ہے جو قدیم شعراء نے لکھے۔ یہ اہل عرب کا وہ قدیم ترین طبقہ ہے جو دور تاریخ سے بھی پہلے اس ملک میں آباد تھے اور پھر مٹ گئے۔ ان کے متعدد قبیلے تھے جن میں سے عاد اور ثمود، عمالقہ، طسم، جدیس، امیم، جرہم وغیرہ آج بھی مشہور ہیں۔

ان لوگوں نے عراق سے لے کر شام اور مصر تک اپنی حکومتیں قائم کی تھیں۔ بابل اور اشور کی حکومت اور قدیم تمدن کے بانی یہی لوگ تھے۔ ان کے مفصل حالات تاریخوں میں نہیں ملتے۔ لیکن اس زمانے کی یاد میں کچھ قصے کہانیاں، عرب شاعروں کے اشعار اور آسمانی کتابوں میں مندرج واقعات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اب بابل، مصر، یمن اور عراق کے آثار قدیمہ سے کچھ تحقیقات عمل میں آ رہی ہیں اور ان کے بارے میں کتابیں بھی لکھی جا رہی ہیں۔

۲۔ عرب عاربہ:۔

یہ لوگ عرب کے اصلی باشندے ہیں جو یمن کے گرد و نواح میں آباد

تھے ان کا دوسرا نام قحطان ہے۔ ان کے مشہور قبیلے حمیر، کہلان اور اُزد ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے یمن، سبا اور حمیر کی بنیاد رکھی اور خصوصیت سے آب پاشی کے نظام کو بہت ترقی دی۔

حمیر کی تین شاخیں ہیں؛ ہمدان، انمار، طے، مذحج، لخم، جذام اور کندہ۔

اسی طرح اُزد کی بھی بہت سی شاخیں ہیں۔

انہی قبیلوں سے ملوک تبابعہ ہوئے اور یہیں کے شہر سبا کی ملکہ بلقیس مشہور ہے جسے حضرت سلیمانؑ نے اسلام کی دعوت دی اور ملکہ بلقیس اپنی قوم سمیت مسلمان ہو گئی اور ملکہ بلقیس کی شادی حضرت سلیمانؑ سے ہوئی۔

یہ لوگ ملک کی آبادی کے لیے چشموں میں جگہ جگہ بند باندھ کر ان کا پانی محفوظ کر لیتے تھے، اور ان سے اپنے باغوں اور کھیتوں کو سیراب کرتے تھے۔ ان میں سب سے بڑا شہر مآرب کا بند تھا جو بہت مشہور ہے۔ یہ بند تین پہاڑوں کے درمیان واقع تھا، جہاں سے چشموں کا پانی آکر جمع ہوتا تھا۔

ازد میں ثعلبہ اپنے قبیلے کے ساتھ مدینے کی طرف آیا اور یہاں بنی اسرائیل کے جو خاندان تھے اس نے ان کو مغلوب کر لیا۔ پھر اس علاقے میں قلعے بنائے اور نخلستان لگائے۔ مدینے کے دو مشہور قبیلے اوس اور خزرج اسی کی اولاد سے تھے۔

۳۔ عرب مستعربہ

ان سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کی زبان عبرانی تھی۔ جب قبیلہ جرہم کے لوگ ان کے قریب یعنی مکے آکر بس گئے تو ان سے نہ صرف میل جول بڑھا بلکہ آپس میں رشتے ناطے بھی قائم ہوئے جن کی وجہ سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ یہ عربی زبان تھی جس میں سریانی اور عبرانی کی خوبیاں بھی جمع ہیں اور اس کے علاوہ اس کی اپنی خوبیاں بھی ہیں۔ عبرانی اور سریانی تو مدت ہوئی، زندگی کھو بیٹھیں مگر قرآن کی زبان ابھی تک زندہ اور مقبول ہے۔ یہی عربی زبان اہلِ جنت کی زبان ہوگی۔

ان کا دوسرا نام عدنان ہے جو حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ عدنان کا اصلی وطن مکہ ہے ان کے بیٹے کا نام معد اور پوتے کا نزار تھا۔ اسی وجہ سے عدنانی قبائل معدی اور نزاری بھی کہلاتے ہیں جن کے آگے بیسیوں شاخیں ہیں۔ قبیلہ قریش اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس میں نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔

عربوں کی قسمیں بلحاظ رہائش

مذکورہ بالا تقسیم زمانے کے اعتبار سے ہے ان کو رہائش کے لحاظ سے حسب ذیل طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ **حضری** یہ وہ لوگ ہیں جو شہروں اور دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ یہ عام طور پر تجارت زراعت اور صنعت کے ذریعے سے روزی حاصل کرتے ہیں۔

۲۔ **بدوی** یہ وہ لوگ ہیں جو صحراؤں اور نخلستانوں میں خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتے ہیں جہاں کہیں پانی اور گھاس نظر آتی، وہیں اپنے قبیلے اور مویشیوں کے ساتھ ٹھہر گئے اور جب کھانے پینے کی اشیاء ختم ہوگئیں تو کسی اور مناسب مقام کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گئے۔ خوراک کی قلت اور معاشی بدحالی نے ان کو ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا سکھا دیا تھا اور یہ جھگڑا عام طور پر کسی چشمے یا نخلستان ہی پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں پیدا ہوتا ہے۔

اسلام سے قبل عرب کی حالت

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا — نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

(مسدسِ حالی)

سوال: ظہور اسلام سے پہلے عربوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کا جائزہ پیش کیجئے۔

جواب:

اسلام سے قبل عرب کی حالت

سیاسی حالت

۱۔ باضابطہ نظام حکومت کا فقدان

۱۔ اسلام سے پہلے عرب کی سیاسی حالت نہایت ابتر تھی۔ ملک میں کوئی باضابطہ نظامِ حکومت نہ تھا۔ ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے پولیس نہ تھی اور باہمی لڑائیوں اور جھگڑوں کے فیصلے کے لیے کوئی عدالت نہ تھی۔ ان کے پاس کوئی سکہ یا ٹکسال بھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ کسی بیرونی حملے سے بچاؤ کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ فوج بھی نہیں تھی، چنانچہ جب یمن کے عیسائی حکمران ابرہہ نے ۵۷۰ء میں خانہ کعبہ کو گرانے کے لیے (معاذ اللہ) ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا تو کوئی عرب لشکر مقابلے کو نہ نکلا اور اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر کو معمولی پرندوں کی کنکریوں سے تباہ و برباد کردیا۔ عرب کے پڑوس میں روم و ایران کی دو بڑی سلطنتیں موجود

تھیں۔ روم میں عیسائی اور ایران میں آتش پرست حکمران تھے۔ ان سلطنتوں نے کچھ عرب علاقے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے۔ یہ سلطنتیں عربوں کو اپنا محکوم سمجھتی تھیں اور انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔

۲۔ قبائلی زندگی

اہلِ عرب مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا اپنا سردار تھا، جو عام طور پر قبیلے کا کوئی بزرگ ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ اپنے سردار کے سوا اور کسی کی کوئی بات نہیں سنتا تھا۔ امن کے زمانے میں وہی سردار قبیلے کا نگران ہوتا تھا اور جنگ کی صورت میں اسی کو سپہ سالار کہا جاتا تھا۔ اہلِ عرب چونکہ طبعی طور پر حریت پسند تھے، اسی لیے وہ خاندان اور قبائل میں تقسیم تھے۔ ہر قبیلے کا سردار شیخ کہلاتا تھا۔ قبائلی نظام میں شیخ کا چناؤ جمہوری طریقے سے کیا جاتا تھا اور اس پر قوم کی جان، مال اور عزت کے مکمل تحفظ کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی

۳۔ قتل وغارت اور لڑائیاں

عربوں نے چونکہ کسی سیاسی طاقت کو قبول نہیں کیا تھا، اس لیے ان کے ہاں کوئی سیاسی سانچہ بھی نہ بن سکا۔ نہ ایک دوسرے کے حقوق کی وضاحت و حفاظت ہی ہو سکی۔ جو چاہتا اور جب چاہتا پانی اور چراگاہ پر قبضہ جما لیتا اور اکثر اسی بات پر لڑائیاں ہوتیں جو عرصۂ دراز تک جاری رہتیں، جن میں ناحق خون بہتا، عورتیں بیوہ ہو جاتیں، بچے یتیم ہو جاتے۔ عرب ان لڑائیوں پر فخر کرتے اور انہیں "ایام العرب" کے نام سے پکارتے اور اپنے اپنے قبیلے کے ان جیالوں کا ذکر اشعار میں کرتے جو ان لڑائیوں میں جرأت اور بہادری کا غیر معمولی مظاہرہ کرتے۔ اس طرح قتل وغارت اور خونریزی ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔

بسوس کی لڑائی بنی بکر و بنی تغلب میں چالیس برس تک جاری رہی اور بات صرف اتنی سی تھی کہ بنی تغلب کے ایک آدمی نے بسوس نامی بڑھیا کی اونٹنی کو زخمی کر دیا تھا۔ حرب قیس کی لڑائی قبیلہ عبس و ذبیان کے درمیان گھوڑ دوڑ کے مسئلہ پر ہوئی۔ ایک فریق نے دوسرے فریق کے گھوڑے کو بھڑکا کر ہرا دیا تھا۔ یہ لڑائی بھی چالیس سال تک جاری رہی۔ فجار کی لڑائیوں کا سلسلہ ان مقدس مہینوں میں شروع ہوا، جن میں قتل و خونریزی ممنوع تھی۔ یہ مقدس مہینے چار ہیں، رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ پہلی لڑائی کنانہ میں ہوئی۔ دوسری لڑائی قریش اور ہوازن میں چھڑی اور تیسری اور چوتھی لڑائی میں بھی قریش نے باقاعدہ حصہ لیا۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل وغارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے
(حالی)

سماجی حالت

ا۔ معاشی حالت عرب کا زیادہ تر علاقہ دشت و صحرا پر مشتمل ہے، اس لیے یہاں کے باشندوں کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی۔ شہروں میں رہنے والے حضری کہلاتے تھے۔ ان کی معاشی حالت قدرے بہتر تھی۔ کیونکہ یہ تجارت و زراعت پیشہ تھے۔ مکہ اور طائف میں بڑے بڑے روساء رہتے تھے۔ اہلِ مکہ تجارت میں خوب نفع کماتے اور اہلِ طائف زرخیز زمینوں اور باغات کی بدولت بڑے خوشحال تھے۔ جو لوگ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے، انہیں بدوی کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ انتہائی غربت کا شکار تھے۔ اونٹ کی کھال اور بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے اور پانی اور گھاس کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے۔ ان کی کل جائیداد ان کے مویشی تھے۔ قافلوں کو لوٹنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یہی لوٹ مار ان کا ایک اہم ذریعہ آمدنی تھا۔ سود خور یہودی سرمایہ داروں نے عرب کی معیشت کو جکڑ رکھا تھا۔

معاشرتی خرابیاں

شراب نوشی اور جُوا عرب طرح طرح کی معاشرتی برائیوں میں مبتلا تھے۔ یہ برائیاں ان کے معاشرتی رسوم و رواج کا لازمی حصہ بن چکی تھیں۔ شراب پانی کی طرح پی جاتی تھی۔ حالانکہ اسلام نے اسے ام الخبائث یعنی تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ وہ اپنی اس بری عادت کو بھی شرافت کا حصہ سمجھتے تھے۔ ان کے اشعار میں شراب کا ذکر فخریہ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دورِ جاہلیت کے عرب قمار بازی یعنی جوا کے بھی بری طرح شکار تھے۔ وہ اس کو کرم و سخاوت ہی کا ایک ضروری حصہ سمجھتے تھے، کیونکہ وہ اس طریقے سے جو کچھ جیتتے، عام طور پر فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اشعار میں قمار بازی کا ذکر بھی ایک خوبی کے طور پر کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ان دونوں برائیوں کو آپس کی دشمنی کا سبب اور شیطانی کام قرار دے کر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دیا۔

بقول مولانا حالی ؎

جوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی | شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی، دیوانگی تھی | غرض ہر طرح ان کی حالت بُری تھی

بہت اس طرح ان کو گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پہ تھیں بدیاں

۳۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا

اہلِ عرب لڑکی کی پیدائش کو منحوس قرار دیتے تھے۔ وہ اول تو لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے یا جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوتی تو باپ اسے کسی بہانے جنگل میں لے جاتا اور اسے کسی گڑھے میں پھینک کر مٹی میں دفن کر دیتا۔ یہ بیحد ظالمانہ فعل تھا جس کی قرآن مجید میں سخت مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے؛

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر، ۸، ۹)

ترجمہ: اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفن کر دی گئی ہو پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی۔

۴۔ غلام اور عورت سے بدسلوکی

قدیم اہلِ یونان کی طرح اہلِ عرب میں بھی غلام کا رواج عام تھا۔ لونڈیاں اور غلام بازار میں عام مال کی طرح بیچے جاتے تھے۔ آقا اپنے غلاموں سے طرح طرح کے کام لیتے اور ان پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھاتے تھے۔ اسی طرح عورت عرب معاشرے کا مظلوم ترین طبقہ تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، بیٹیوں کو باعثِ عار سمجھ کر پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ایک مرد جتنی عورتوں سے چاہتا شادی کر لیتا باپ کی بیوہ ورثے کے طور پر بڑے بیٹے کی داشتہ بن جاتی۔ عورت کی کوئی عزت نہ تھی۔ اس کا مقام حیوانیت سے بھی کم تر سمجھا جاتا تھا۔ جائیداد میں عورت کا کوئی حصہ نہ تھا۔ شعر و شاعری میں محبوبہ کا نام ننگے الفاظ میں لیا جاتا اور اس پر فخر کیا جاتا۔ بدکرداری، بے حیائی اور فسق و فجور کا بازار گرم تھا۔

۵۔ چوری و ڈاکہ زنی

چوری اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام تھیں۔ کسی کی جان و مال اور آبرو محفوظ نہ تھی۔ ایک طاقتور قبیلہ کمزور قبیلے پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیتا۔ عام طور پر رات کے پچھلے پہر چھاپے مارے جاتے اور تباہی و بربادی کا بازار گرم کیا جاتا۔

۶۔ توہم پرستی

عرب طرح طرح کے توہم پرستیوں میں مبتلا تھے۔ وہ خبیث روحوں، جنوں اور دیوتاؤں سے بہت ڈرتے تھے اور اکثر بیماریوں اور آفتوں کو ان کی ناراضگی کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے طرح طرح کے منتر، ٹوٹکے اور تعویذ استعمال کیے جاتے تھے جانوروں کے اڑنے سے اچھا برا شگون لیتے تھے۔ کوئی مصیبت آ جائے تو گھر میں صدر دروازے کی بجائے پچھواڑے سے داخل ہوتے تھے۔ خشک سالی میں بارش برسانے کا ٹوٹکہ یہ تھا کہ گائے کی دم میں سوکھی گھاس اور جھاڑیاں باندھ کر آگ لگا دیتے اور اسے پہاڑوں میں چھوڑ دیتے۔ جب کسی شخص کے پاس ایک ہزار سے زائد اونٹ ہو جاتے تو ان میں سب سے بڑے کی آنکھیں پھوڑ دیتے۔ ان کے خیال میں اس طرح باقی اونٹ نظرِ بد سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی کھوپڑی سے

ایک پرندہ برآمد ہوتا ہے، جو اس وقت تک چلاتا رہتا ہے جب تک انتقام نہ لیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ الو کے بولنے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جن خرگوش سے ڈرتا ہے اس لیے جنوں سے بچنے کے لیے خرگوش کی ہڈی گلے میں لٹکا دیتے تھے۔ وہ جب سفر پر روانہ ہوتے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ ایسے سفر کبھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر انسان کے پیٹ میں ایک سانپ ہوتا ہے جب اس سانپ کو بھوک لگتی ہے تو وہ پسلی کی ہڈیوں سے گوشت نوچ کر کھاتا ہے۔

مذہبی حالت

ظہورِ اسلام سے پہلے اہلِ عرب کی مذہبی حالت عجیب و غریب تھی ان لوگوں میں سے اکثریت پیغمبروں کی اولاد میں سے تھے لیکن ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد وہ پیغمبروں کی تعلیمات فراموش کر چکے تھے۔ کسی زمانے میں ان کا مذہب دینِ ابراہیمی ہی تھا، لیکن بعد میں ان کے اندر اس دین کی کوئی بات نہ رہی تھی۔

بُت پرستی

عرب کے لوگوں میں اگرچہ اللہ کا تصور موجود تھا، لیکن وہ لوگ خالص توحید سے بہت دور جا پڑے تھے۔ انہوں نے بے شمار خود ساختہ معبود خدا کے شریک ٹھہرا لیے تھے۔ اسی لیے انہیں مشرک کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے کچھ پرانے نیک بزرگوں کے بت بنا لیے تاکہ ان کو دیکھ کر وہ اپنے نیک زمانے کو یاد کر سکیں۔ لیکن جب آئندہ نسل آئی تو اس نے یہ سمجھا کہ شاید ہمارے اسلاف ان بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس خیال سے رفتہ رفتہ انہوں نے انہی بتوں سے مرادیں مانگنا شروع کر دیں اور ان بے جان پتھروں کو خدائی اوصاف کا حامل سمجھنے لگے ایک شخص عمرو بن لحی ملک شام سے ایک بُت لے آیا، جس کا نام ہبل تھا۔ اس بت کو بعد میں خانہ کعبہ کے پاس نصب کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ مرض بڑھتا گیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کئی بُت بنا کر ان کو اپنا خدا قرار دے لیا۔ چنانچہ اب ہر قبیلے کا بت جدا تھا۔ یہاں تک کہ خانہ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت جمع ہو گئے۔ حالانکہ یہ وہ گھر ہے جسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے محض ایک خدا کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ ہبل کے علاوہ مشہور بت یہ تھے، لات، منات، عُزّیٰ، نائلہ، یعوق، نسر، ود، سواع وغیرہ۔ وہ لوگ ان بتوں کی نسبت سے اپنے نام رکھتے تھے، جس سے ان کی غیر معمولی تعظیم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مثلاً عبدالات، عبدالمنات، عبدالعزیٰ وغیرہ۔ بقول مولانا حالی؂

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عُزّہ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

۲۔ ستارہ پرستی بت پرستوں کے علاوہ وہاں ایسے لوگ بھی موجود تھے، جو مختلف مظاہر قدرت مثلاً سورج، چاند اور ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔ انہیں صابئین کہا جاتا ہے۔ بقولِ علامہ اقبال ؒ ؎

ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر دے گا   کہ وہ خود فراخئ افلاک میں ہے خوار و زبوں

۳۔ آتش پرستی عرب کے مشرقی حصے، خاص طور پر بحرین میں مجوسی لوگ بھی آباد تھے، جو آگ کی پوجا کیا کرتے تھے۔ وہ خیر و شر دو قوتوں کو خدائی کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک نور یا روشنی خیر کی علامت تھی اور اسی وجہ سے وہ آگ کی پوجا کرتے تھے، کیونکہ آگ روشنی کا ذریعہ ہے۔ یہ لوگ دو خداؤں کو مانتے تھے۔ ایک نیکی کا خدا یعنی یزداں اور دوسرا بدی کا خدا یعنی اہرمن۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب :۔

۱۔ یہودیت اسلام سے پہلے عرب میں یہودی بھی موجود تھے۔ یثرب، یمن، خیبر، تیماء وغیرہ میں ان کی کافی تعداد موجود تھی۔ بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع یہود کے مشہور قبیلے تھے، جو ہجرتِ نبویؐ کے وقت مدینے میں آباد تھے۔ یہ لوگ کہنے کو تو حضرت موسیٰؑ کے پیروکار تھے، لیکن ان میں دینِ موسوی کی کوئی بات باقی نہ رہ گئی تھی اور ان کا مذہب مختلف علماء و اکابر کی خواہشات کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔

۲۔ عیسائیت عرب میں عیسائی بھی موجود تھے، جو حضرت عیسیٰؑ ابن مریمؑ کو اپنا پیغمبر اور ان کی آسمانی کتاب انجیل کو اپنی کتاب ہدایت کہتے تھے لیکن یہودیوں کی طرح انہوں نے بھی اپنے پیغمبر کی تعلیمات کا نقشہ بگاڑ رکھا تھا۔ عرب کے بعض مشہور قبائل مثلاً تغلب، غسان اور قضاعہ وغیرہ عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا تصور کرتے تھے۔

۳۔ دہریئے عرب میں دہریئے بھی موجود تھے۔ جو خدا اور جزائے اعمال کے منکر تھے۔ وہ دنیا کو قدیم جانتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ خود بخود ہو رہا ہے اور اسی طرح ہوتا رہے گا۔ گویا یہ دہر یعنی زمانے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ خدا، آخرت اور مذہب کے قائل ہی نہیں تھے۔

۴۔ حنفا ان تمام غلط مذاہب کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو اب تک دینِ ابراہیمیؑ کے پیروکار تھے۔ یہ حتی الامکان کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد و

نظریات سے گریز کرتے تھے، لیکن یہ تعداد میں بہت قلیل تھے، اس لیے ان کفرزاروں میں ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی تھی۔ یہ بت پرستی اور شرک سے بیزار تھے۔ انہوں نے اگرچہ عقیدۂ توحید کی سچائی کو پا لیا تھا، لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اس ایک خدا کی کیا صفات ہیں اور اس کو خوش کرنے کے لیے ہمیں عبادت کا کیا ڈھنگ اختیار کرنا چاہیئے۔ زید بن عمرو، عبداللہ بن جحش، اُمیہ بن ابی صلت اور ورقہ بن نوفل اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

عربوں کی خوبیاں

ان خرابیوں کے ساتھ عربوں میں کچھ خوبیاں بھی موجود تھیں، جن کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ شجاعت

اہلِ عرب اور شجاعت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان کی بہادری کے قصے ضرب المثل ہیں۔ وہ صرف ایک آواز پر جنگ کے لیے تیار ہو جانے، اور انجام سے بے نیاز ہو کر سخت سے سخت معرکوں میں گھس جاتے تھے۔ وہ میدانِ جنگ میں تلواروں کی چھاؤں میں جان دینے کو بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر ترجیح دیتے تھے۔

۲۔ سخاوت

سخاوت عربوں کا اعلیٰ جوہر تھا۔ وہ کسی سائل کی معمولی طلب و خواہش پر اونٹوں کے گلے بخش دیا کرتے تھے اور اس بخشش کو اپنے لیے طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ ان کے اسی امتیاز نے حاتم طائی پیدا کیا، جس کی سخاوت کا جواب تاریخ میں نہیں ملتا۔

۳۔ مہمان نوازی

جب کسی شخص کے گھر میں کوئی مہمان آجاتا تو خواہ وہ ان کے کسی عزیز یا رشتہ دار کا قاتل ہی کیوں نہ ہوتا، اس کی حفاظت اور مہمان نوازی ان پر فرض ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میزبان کے پاس ایک ہی اونٹنی ہوتی جو پورے خاندان کا سہارا ہوتی لیکن اسے ذبح کر لیا جاتا۔ اکثر گھرانوں میں مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ان کی آگ کبھی بجھتی ہی نہ تھی۔

۴۔ ایفائے عہد

عہد و پیمان کی پابندی اہلِ عرب کے نزدیک فرض تھی۔ وہ ایفائے عہد کی خاطر اپنے مال اور اپنی جان کی بھی قربانی دے سکتے تھے لیکن وعدہ شکنی انہیں کسی صورت میں گوارا نہ تھی۔

۵۔ خطابت و شعر گوئی

اہلِ عرب خطابت اور شعر گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ وہ بڑے زبان آور اور شعر و خطابت کے فن کے ماہر تھے۔ اپنی اسی خوبی کے باعث وہ دوسرے ممالک کو عجم (یعنی گونگے) کہتے تھے۔ عرب میں جس قدر شعرا پیدا ہوئے، شاید باقی ساری دنیا کے تمام شعراء کی تعداد ان کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اہلِ قبیلہ اپنے شاعروں کی قدر و عزت اپنے بہادروں اور شہسواروں سے بھی زیادہ کرتے تھے۔ شاعری عربوں کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ فن خطابت میں

بھی کمال دسترس رکھتے تھے۔ مقرر تقریر کرتا تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ و فقرات پہلے سے ڈھلے ڈھلائے موجود ہیں۔ امرؤ القیس نامور شاعر تھا۔

۶۔ زبردست حافظہ

اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو بلا کا حافظہ دیا تھا۔ انسان تو ایک طرف رہے، انہیں جانوروں کے نسب تک بھی زبانی یاد ہوتے تھے۔ کسی شعر یا واقعہ کو صرف ایک بار سن لینے کے بعد اسے زبانی یاد رکھتے۔ ایک عرب بادشاہ نے اعلان کیا کہ اسے اپنے دربار کے لیے ایک ایسا شخص درکار ہے جسے سو شاعروں کا دیوان یاد ہو۔ یہ اعلان سن کر ایک ایسا شخص بادشاہ کے دربار میں پہنچا جسے نہ صرف سو مرد شاعروں بلکہ سو عورت شاعروں کا دیوان بھی زبانی یاد تھا۔

۷۔ سادگی اور آزاد فطرت

عرب لوگ صحرائی زندگی کی وجہ سے فطری سادگی کے حامل تھے۔ سخت موسم میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے وہ سخت جان ہو چکے تھے۔ اسی طرح عربوں کو آزادی سے بڑی محبت تھی۔ وہ آزاد فضا میں زندہ رہنا چاہتے تھے کسی دوسری قوم کا محکوم بننا انہیں کسی طور پر گوارا نہ تھا۔

۸۔ دیگر متفرق اوصاف

اس کے علاوہ اہلِ عرب دیگر مختلف علوم میں بھی کمال رکھتے تھے مثلاً تعبیرِ خواب، علم الامثال، علم الانساب (نسب ناموں کا علم)، علم نجوم، طب، قیافہ شناسی اور دست کاری وغیرہ۔ عرب اگرچہ ایک زمانے تک لکھنے کو اپنے لیے عار سمجھتے تھے، لیکن بعد میں ان میں کتابت کا رواج بھی آ گیا۔

عظیم اسلامی انقلاب کے لیے موزوں قوم

شاہ معین الدین احمد ندوی اپنی کتاب "تاریخ اسلام" میں لکھتے ہیں:۔

"ظہورِ اسلام کے زمانہ میں ایران و روم اور فرنگ کے خطے تعلیم و تہذیب، دولت و ثروت اور دوسرے تمدنی اثرات سے بالکل مسخ ہو چکے تھے۔ ان میں صدائے حق کو سننے کی صلاحیت باقی نہ تھی۔ عرب کا خطہ اب تک ان تمام تمدنی اثرات سے بالکل محفوظ اور فطری سادگی پر قائم تھا۔ عرب کتابی تعلیم سے ناآشنا اور تمدنی اثرات سے پاک تھے اور ہر طرح کی برائیوں کے باوجود ان میں آزادی، حریت، حق گوئی، جرأت و بے باکی، شجاعت اور بہادری کے بدویانہ اخلاق موجود تھے، اس لیے متمدن اقوام کے مقابلہ میں ان میں قبول حق کی سب سے زیادہ صلاحیت تھی۔ اس لیے امانت الٰہی کا بار اٹھانے اور مخلوق کی رہنمائی کے لیے اسی سادہ مگر پُرجوش قوم کا انتخاب ہوا۔ اور دنیا کے موحدِ اعظم حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نسل سے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ منصب جلیل عطا ہوا۔"

شجرہ نسب

حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

خلفائے بنی عباس

حسن — حسین

علی

عقیل — جعفر

ابوطالب

حمزہ — ابوطالب — عبداللہ — عباس — ابولہب

خلفائے بنی امیہ — اُمیہ

عبدالمطلب

عبدشمس — نوفل — ہاشم — مطلب

عبدالدار — عبدالمناف — عبدالعزیٰ

قصی

زہرہ

مخزوم — کلاب — تیم

مرہ

عدی — سہم — کعب — جمح

لوئ

غالب

قریش

(فہر بن مالک)



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی ابتدائی زندگی بعثت تک

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے حالات بعثت تک لکھیے۔

جواب:

حضورؐ کا خاندان :-

خاندانی شرافت شرطِ نبوت

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم تمام انسانوں کے جسم و جان کی پرورش کے لیے ہر طرح کی سہولتیں بخشی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت اور مہربانی سے ہمارے اخلاق و عادات کو سنوارنے کے لیے ہر دور میں اپنے پیارے رسول اور نبی بھیجے ہیں اور اس بات کا خیال رکھا کہ جن گھرانوں میں یہ پیدا ہوں وہ اس دور میں محترم اور شریف شمار کئے جاتے ہوں تاکہ جب وہ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا چاہیں تو لوگ ان کی بات کو پوری توجہ سے سنیں اور انہیں حقیر نہ جانیں۔

حضورؐ کا معزز ترین خاندان

اسی قاعدے کے مطابق حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس خاندان میں پیدا ہوئے وہ ایسا معزز تھا کہ سارا عرب ان کا احترام کرتا تھا۔ حضورؐ کے خاندان کا تعلق حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے صاحبزادے حضرت اسماعیل ذبیح اللہؑ سے ہے جو اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ انہی باپ بیٹے نے خانہ کعبہ کو از سر نو تعمیر کر کے اسے آباد کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ملت ابراہیمی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں قیدار وہ شخص تھا جس کی اولاد مکے میں آ کر آباد ہوئی۔ یہ بہت نامور سردار تھا۔ قیدار کی اولاد میں عدنان نامی ایک بزرگ گزرا ہے جس کے چھوٹے بھائی عک نے یمن میں سلطنت قائم کر لی۔

حضورؐ کا شجرۂ نسب

قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مورث اعلیٰ کا نام ہے والد کی طرف سے حضورؐ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیّ بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن قریش۔

ان میں سے قریش کا اصلی نام فہر بن مالک تھا لیکن وہ اپنے لقب سے زیادہ مشہور ہو گئے تھے۔

ہاشم

آنحضرتؐ کے شجرۂ نسب میں قصی، عبد مناف اور ان کے فرزند ہاشم کا ذکر خصوصیت سے ملتا ہے۔ ہاشم اپنی سخاوت و شرافت کے باعث عرب بھر میں مشہور تھے۔ حج کے موقع پر زائرین کی خدمت گزاری اور مہمان داری اس شان سے کرتے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ قریش کی تجارت

کو بڑھانے کے لیے انہوں نے ہمسایہ ملکوں کے سرداروں اور عرب کے قبائل سے معاہدے کئے۔ ایک بار ملک میں قحط رونما ہوا تو انہوں نے منوں اناج خریدا اور اس کی روٹیاں پکوا کر قحط زدہ لوگوں میں تقسیم کرائیں اس لحاظ سے بنی ہاشم عرب میں سب سے زیادہ معزز قبیلہ تھا۔

عبدالمطلب

ہاشم زمانۂ شباب میں ایک بار یثرب (مدینہ) گئے اور وہاں بنی نجار کی ایک معزز خاتون سلمیٰ سے شادی کی۔ ان سے عبدالمطلب پیدا ہوئے جو نبی اکرمؐ کے دادا تھے۔ ہاشم کے بعد مکّے کی سرداری عبدالمطلب کو ملی۔ ان کے زمانے کا اہم واقعہ یمن کے حاکم ابرہہ کا حملہ ہے۔ انہوں نے مکے کے چاہ زمزم کی مرمت کرائی اور نواحِ مکہ کو ہر طرح کی بدامنی سے پاک کیا۔

عبدالمطلب کے بارہ بیٹے تھے:

۱۔ عبداللہ	۲۔ ابوطالب	۳۔ عباس	۴۔ حمزہ
۵۔ غداق	۶۔ ابولہب	۷۔ حارث	۸۔ مقوم
۹۔ زبیر	۱۰۔ قشم	۱۱۔ ضرار	۱۲۔ عبدالکعبہ

عبداللہؓ

ان میں حضورؐ کے والد ماجد عبداللہ سب سے چھوٹے تھے اور اس وجہ سے ماں باپ کے بڑے لاڈلے اور پیارے تھے۔ جب حضرت عبداللہ جوان ہوئے اور کاروبار کے قابل ہو گئے تو ان کے والد عبدالمطلب نے حضرت آمنہؓ سے ان کی شادی کر دی۔ وہ دہب یثرب کی بیٹی اور ایک نہایت باعزت اور قابل احترام خاندان کی عورت تھیں۔ کچھ عرصے بعد حضرت عبداللہ تجارت کے سلسلے میں ملک شام کی طرف چلے گئے لیکن وہاں اچانک بیمار ہو گئے، اسی حالت میں مکے واپس آرہے تھے کہ یثرب سے گزرتے ہوئے اپنی ننھیال میں ٹھہر گئے لیکن وہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکے اور وہیں انتقال کر گئے۔ چنانچہ ان کی قبر بھی اسی جگہ بنائی گئی۔

ولادت باسعادت

حضرت عبداللہؓ کی اس افسوس ناک موت کے چند ماہ بعد پیر کو صبح صادق کے وقت حضورؐ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے۔ یہ ربیع الاول کی نو تاریخ تھی اور ایک عام الفیل مطابق ۴۵ھ جلوس کسریٰ نوشیرواں تھا۔ انگریزی مہینے کے مطابق یہ تاریخ ۲۲ اپریل ۵۷۱ھ تھی۔ بعض مؤرخین آپؐ کی تاریخ پیدائش ۱۲ تا ۱۳ ربیع الاول بھی بتاتے ہیں۔ بقول حفیظ جالندھری ؎

سلام اے آمنہؓ کے لال اے محبوب سبحانی　　سلام اے فخر موجودات فخر نوعِ انسانی
ترے آنے سے رونق آگئی گلزار ہستی میں　　شریکِ حال قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربانی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیدائش سے خاندان کے سب افراد کو انتہائی مسرت ہوئی اور آپؐ کے

عبدالمطلب کی مسرت کا تو کوئی اندازہ ہی نہ تھا کیونکہ آپؐ ان کے مرحوم بیٹے عبداللہ کی یادگار اور نشانی تھے انہوں نے آپؐ کا نام محمدؐ رکھا، جو اس سے پہلے عموماً اہلِ عرب میں نہیں تھا۔ اس لیے اکثر لوگوں کو اس نئے اور انوکھے نام پر حیرت ہوئی۔ اس پر عبدالمطلب نے فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر دُنیا کا بہت بڑا آدمی بنے اور ساری دنیا میں اس کی عزت اور تعریف کی جائے۔"

حضرت آمنہؓ نے آپؐ کا نام احمدؐ رکھا جو انہیں آپؐ کی پیدائش سے پہلے ایک فرشتے نے بتایا تھا۔

یہ دونوں نام معنوی اعتبار سے نہایت اعلیٰ ہیں۔ محمدؐ کے معنی ہیں، جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو اور احمدؐ کا مطلب ہے جو سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ گویا محمدؐ کے اعتبار سے دنیا نے آپؐ کی سب سے زیادہ تعریف کی اور احمدؐ کے لحاظ سے آپؐ اپنے خدا کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والے تھے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

جب حضورؐ سات دن کے ہوئے تو آپؐ کا عقیقہ کیا گیا۔

اس گلِ رعنا کی مہک اور خوشبو سے سارے عالم کو معطر ہونا تھا۔ ہدایت اور رہنمائی کا ایک دریچہ کھلا جس نے اپنی روشنی سے ساری دنیا کو بقعۂ نور بنانا تھا۔ تاریخ اور کتاب کے اس باب کا آغاز ہوا جسے آئندہ چل کر وحی اور رسالت کے تمام تقاضوں کی تکمیل کرنی تھی یا یوں کہیئے کہ سلسلۂ نبوت کی اس آخری اور سنہری کڑی کا اظہار ہوا جس کے بعد نبوت و رسالت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

رُخِ مصطفٰےؐ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ کسی کی بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

پرورش

پیدائش کے بعد چند روز آپؐ نے اپنی والدہ ماجدہ کا دودھ پیا۔ اس کے بعد آپؐ کے چچا ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے آپؐ کو چند روز دودھ پلایا۔ ان دنوں حجاز میں یہ دستور تھا کہ مختلف شہروں کے شرفاء اور معززین اپنے نوزائیدہ بچوں کو آزاد اور کھلی فضا میں پلنے کے لیے دیہات میں بھیج دیا کرتے تھے تاکہ وہ تنومند اور دلاور بن جائیں اس کے علاوہ بدوی ماحول میں وہ خالص عربی زبان سیکھ جاتے تھے۔ شہروں کے اور بالخصوص مکے کے لوگوں کی زبان غیر ملکیوں کے میل جول کے باعث خالص نہ رہی تھی۔ اسی دستور کے مطابق آپؐ کو بنی سعد کے خاندان کی ایک نیک دل عورت حلیمہ کے سپرد کر دیا گیا وہ آپؐ کو اپنے قبیلے کی بستی میں لے گئیں اور بڑی محبت اور توجہ سے آپؐ کی پرورش کرنے لگیں۔ حضورؐ کے وجودِ مسعود کے باعث حلیمہ سعدیہ کا گھر خیر و برکت سے معمور ہو گیا۔

آپؐ تین برس کے ہوئے تو حلیمہ آپؐ کو مکے میں لائیں۔ ماں اور دادا نے اپنے ہونہار لختِ جگر کو سینے سے لگایا۔ ان دنوں مکے میں وباؤں کا زور تھا۔ اس لیے آپؐ کو پھر حلیمہ کے ہمراہ بھیج دیا گیا تاکہ شہر کی

مصر آب و ہوا سے محفوظ رہیں۔ آپؐ مزید تین سال اس قبیلے میں رہے۔ اس زمانے میں آپؐ اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ چھے سال کی عمر میں آپؐ نے اپنے دادا اور والدہ کی صحبت میں آگئے۔ اس وقت آپؐ بے حد توانا اور اپنی عمر سے بہت زیادہ بڑے معلوم ہوتے تھے۔

بی بی آمنہؓ کی وفات

آنحضرتؐ کی حلیمہ سعدیہ سے مکے میں واپسی کے اگلے سال حضرت آمنہؓ آپؐ کو لے کر یثرب (مدینہ) روانہ ہوئیں۔ ان کے والدین کا وطن یہی شہر تھا اور آنحضرتؐ کی پردادی بی بی سلمیٰ بھی وہیں کی رہنے والی تھیں وہاں حضرت آمنہؓ ایک ماہ مقیم رہیں۔ واپسی پر ابواء کے مقام پر آپ بیمار ہو کر انتقال فرما گئیں۔ اس کم سنی اور پردیس میں یہ واقعہ آنحضرتؐ کے لیے انتہائی پریشانی اور رنج و اندوہ کا موجب ہوا۔ آپؐ کی والدہ کی ایک خادمہ اُمِ ایمن اس وقت ہمراہ تھی۔ وہ احتیاط سے آپؐ کو اپنے ہمراہ مکے میں لے آئی اور آپؐ کے دادا عبد المطلب کے پاس پہنچا دیا جنہوں نے اس بے ماں باپ کے بچے کی پرورش کا بیڑا اٹھایا۔

دادا کی وفات

بوڑھے دادا عبد المطلب بڑی دلسوزی اور محبت و شفقت سے آنحضرتؐ کی پرورش کرنے لگے لیکن دو ہی سال بعد جب آنحضرتؐ کی عمر مبارک ابھی آٹھ سال کی تھی، آپؐ کے دادا جان بھی ۸۲ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

ابو طالب کی کفالت

وقت رحلت عبد المطلب نے اپنے فرزند ابو طالب کو وصیت کی کہ وہ اپنے یتیم بھتیجے کے کفیل بنیں۔ چنانچہ ابو طالبؓ نے اس فریضے کو بطریق احسن سرانجام دیا اور اپنی اولاد سے بڑھ کر آپؐ کا خیال رکھا اور بہتر سلوک روا رکھا۔ اکابر قریش کی طرح ابو طالب بھی تجارتی قافلوں کے ہمراہ دوسرے ممالک کو جایا کرتے تھے چنانچہ آنحضرتؐ بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔

آنحضرتؐ کی شخصیت بچپن ہی سے بہت دلکش اور پُرکشش تھی۔ جو شخص بھی آپ سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ آغازِ شباب ہی میں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بزرگی اور بلند مرتبتی کے آثار آپؐ کی ذات سے ہویدا تھے۔ دنیاوی معاملات اور تجارتی کاروبار میں آپؐ کا طرزِ عمل اس قدر بے داغ تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی دیانت و امانت، راست بازی اور معاملہ فہمی کا سکہ بیٹھ گیا اور لوگ اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھنے لگے۔ مکہ کے لوگ اس زمانے میں آپؐ کو صادق اور امین کہا کرتے تھے۔ آپؐ کو شروع ہی سے کھیل تماشے جیسے ناپسندیدہ مشاغل سے نفرت تھی اور ہمیشہ ان سے کنارہ کش رہے۔

شام کا پہلا سفر

جب آپؐ کی عمر بارہ برس کی تھی تو آپؐ کے چچا نے تجارت کی غرض سے ملک شام کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ آپؐ چونکہ ان

کے ساتھ بہت مانوس ہو گئے تھے اس لیے ساتھ جانے پر ضد کرنے لگے۔ ابوطالب راستے کی مشکلات کے خیال سے ساتھ لے جانے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن آخر آپؐ کے اصرار سے مجبور ہو کر ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔

راستے میں ایک عیسائی راہب بحیرا نامی سے ملاقات ہوئی۔ وہ توریت و انجیل کا عالم تھا۔ اس نے ان کتابوں میں نبی آخر الزمانؐ کی جو علامات پڑھ رکھی تھیں وہ سب آپ میں موجود دیکھ کر آپؐ کے چچا ابوطالب سے کہا کہ آپ اس بچے کو ساتھ ساتھ نہ لیے پھریں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہودی ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ابوطالب نے یہ کچھ سنا تو اپنے غلاموں کے ساتھ فوراً آپؐ کو مکے واپس بھیج دیا۔

عالم شباب

لڑکپن میں چچا کے زیر سایہ رہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کاروبار تجارت میں بہت تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے از خود تجارت شروع کر دی اور اس غرض سے یمن، شام اور دیگر علاقوں کے سفر کیے۔ اکثر آپؐ دوسروں کی شراکت کے ساتھ کاروبار کرتے تھے لیکن آپؐ کے کردار میں اسی عمر میں سنجیدگی اور پختگی پیدا ہو چکی تھی آپؐ کی جوانی بھی آپؐ کے بچپن کی طرح نہایت پاکیزہ اور صاف و شفاف تھی۔ آپؐ نہ لڑکپن میں لڑکوں کے ساتھ کھیلے نہ جوانی میں جوانوں کی بری صحبت میں بیٹھے۔ فضول مشاغل اور جاہلیت کی خرافات سے ہمیشہ دور رہے۔ البتہ آپؐ شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا شغل فرماتے تھے۔ دنیاوی معاملات اور تجارتی کاروبار میں آپؐ کا رویہ اس قدر دیانتداری اور راست بازی پر مبنی تھا کہ مکے کے لوگ آپؐ کو صادق اور امین کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ آپؐ کے پاس اپنی امانتیں رکھتے تھے اور کاروبار میں شرکت کی خواہش رکھتے تھے۔

حرب فجار

جس وقت آپؐ کی جوانی کا آغاز تھا اور عمر مبارک پندرہ سال تھی۔ ان دنوں بدقسمتی سے قریش اور قیس عیلان کے قبیلوں میں ایک زبردست جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ چونکہ حدود حرم میں ہوئی اور پھر ان مہینوں میں لڑی گئی، جن میں لڑنا اہل عرب گناہ سمجھتے تھے اس لیے اس جنگ کو حرب فجار (گناہ کی جنگ) کہا جاتا ہے۔ آپؐ کا دل جنگ و جدل سے متنفر تھا، لیکن اس جنگ میں آپؐ صرف اس حد تک شامل ہوئے کہ ترکش میں سے تیر نکال کر حضرت ابوطالب کو دیتے تھے۔ یہ جنگ ۵۸۶ء میں ہوئی تھی۔

حلف الفضول

قبائل کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے سینکڑوں گھرانے برباد ہو چکے تھے اور حجاز کا امن و امان خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ جنگ فجار کے بعد لوگوں کو ان تباہ کن نتائج کا احساس ہوا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب

کی تحریک پر بنی زہرہ اور بنی تمیم نے آپس میں معاہدہ کیا کہ ملک میں امن وامان قائم کرنے کی کوشش، مسافروں کی حفاظت اور غریبوں کی امداد کریں گے اور مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑائیں گے۔ اس معاہدے میں جن سرداروں نے کردار ادا کیا، ان کے ناموں میں فضل کا لفظ آتا تھا۔ اس کا نام حلف الفضول مشہور ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس معاہدہ میں شریک تھے اور اس کو اس قدر پسند فرمایا کہ زمانۂ اسلام میں آپؐ ارشاد فرماتے تھے کہ اگر اس معاہدہ کے بدلے مجھے سرخ اونٹ دیئے جاتے تو بھی میں نہ لیتا اور آج بھی اس قسم کا کوئی معاہدہ ہو تو میں اس میں شرکت کے لیے تیار ہوں۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ سے شادی

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ مکے کی انتہائی معزز اور مالدار خاتون تھیں اور طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ یکے بعد دیگرے ان کے دو شوہروں کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کا تجارتی کاروبار نہایت وسیع تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تجارتی تجربات اور دیانتداری کا شہرہ سن کر انہوں نے درخواست کی کہ میرا سامان فروخت کرنے کے لیے شام لے جائیے، جو معاوضہ میں دوسروں کو دیتی ہوں، اس کا دونا آپ کو دوں گی۔ آپؐ نے منظور فرمالیا اور سامانِ تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرت خدیجہ رضؓ کا غلام میسرہ بھی ساتھ تھا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و عادات کے مشاہدے کئے اور واپسی پر اپنی مالکہ سے بیان کئے۔ حضرت خدیجہ رضؓ آپؐ کے پاکیزہ اخلاق سے پہلے ہی سے واقف تھیں میسرہ کے بیان سے مزید تصدیق ہو گئی۔ ان کو اپنا کاروبار چلانے کے لیے ایک پاکیزہ اخلاق اور امین شوہر کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کی درخواست کی۔ آپؐ نے منظور فرمالیا اور ابو طالب نے پانسو طلائی درہم پر نکاح پڑھا دیا۔ اس وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ رضؓ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ پانچویں پشت پر دونوں کا نسب نامہ مل جاتا ہے۔ حضرت خدیجہ رضؓ حضورؐ کی نہایت وفادار ہمدرد اور خدمت گزار بیوی ثابت ہوئیں۔ آپؐ کی حضرت خدیجہ رضؓ کے بطن سے چار بیٹیاں؛ زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دو صاحبزادے حضرت قاسم رضؓ اور حضرت عبداللہ رضؓ (طیب و طاہر) تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیک صحبت اور حسنِ اخلاق کا حضرت خدیجہ رضؓ پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے امیرانہ زندگی ترک کر دی اور اپنی ساری دولت محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے آنحضورؐ کے سپرد کر دی۔

خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ایک مرتبہ مسلسل بارشوں کے باعث سیلاب آگیا اور اس کا پانی جمع ہو جانے سے خانہ کعبہ کی دیواروں کو بھی نقصان پہنچا۔ یہ واقعہ ۶۰۵ء تا ۶۰۶ء میں پیش آیا۔ اس پر اہل قریش نے اسے گرا کر سرِ نو تعمیر کا ارادہ کیا۔ آپؐ بھی ان کے ساتھ اس کارِ خیر میں شریک ہوئے۔ جب کعبے کی باقی تعمیر

ہو چکی تو حجرِ اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا۔ قریش میں اس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ حجرِ اسود کو کون اٹھا کر نصب کرے۔ یہ کام ہر فرد کی نگاہ میں فخر و سعادت کا باعث تھا۔ اس لیے ان میں سے کوئی بھی اس شرف سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ تلواریں سونپ کر لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے اور سخت خونریزی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر کسی عقل مند نے یہ مشورہ دیا کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہو، اُسے اس قضیے کا ثالث مان لیا جائے۔ خوش قسمتی سے سب لوگ اس پر متفق ہو گئے۔ دوسرے روز سب سے پہلے بیت اللہ میں جو داخل ہوا، اتفاق سے وہ آنحضرتؐ تھے۔ آپؐ کا چہرہ مبارک دیکھ کر سب لوگ بیک زبان پکار اُٹھے۔ "امین آگیا۔ امین آگیا۔ ہم سب اس کے فیصلے پر رضامند ہیں۔" آپؐ نے اس پیچیدہ مسئلہ کو یوں حل کیا کہ حجرِ اسود کو اپنی چادر پر رکھا اور ہر خاندان کے سردار سے کہا کہ وہ اس چادر کے کناروں اور کونوں سے پکڑ کر اسے اس کی جگہ تک لے جائیں۔ جب پتھر اپنی جگہ پر پہنچ گیا تو آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے اس پتھر کو درست طور پر نصب کر دیا۔ اس طرح آپؐ کے حکیمانہ فیصلے سے یہ نازک مسئلہ امن و عافیت سے طے پا گیا اور سب آپؐ کی حکمت و دانائی پر عش عش کر اُٹھے۔

خلوت پسندی

حضرت خدیجہؓ سے شادی ہو جانے کے بعد آپؐ کو مالی اعتبار سے نسبتاً بے فکری اور فارغ البالی حاصل ہو گئی۔ آپؐ نے اس سے پورہ فائدہ اٹھایا۔ یوں تو بچپن سے ہی آپؐ نے ہر قسم کے شرک اور بت پرستی سے اپنا دامن بچا رکھا تھا، لیکن اب آپؐ نے جاہلیت کے اس معاشرے ہی کو خیرباد کہہ دیا اور اکثر وقت تنہائی میں گزارنے لگے۔ غور و فکر اور سوچ بچار کی عادت آپؐ کو پہلے بھی تھی، لیکن اب اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور آپؐ روز و شب گہرے خیالات میں مشغول نظر آنے لگے۔ آپؐ کی روح ایک لامعلوم شے کے لیے بے قرار تھی۔ لیکن مطلوب کا پتہ نہ چلتا تھا۔ اب آپؐ نے کئی کئی دنوں تک تنہائی میں وقت گزارنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لیے آپؐ نے مکے سے کچھ فاصلے پر ایک پرسکون جگہ غارِ حرا کا انتخاب کیا۔ آپؐ اکثر ستو، کھجوریں پانی وغیرہ ساتھ لے جاتے اور اس غار میں پہروں کسی گہری سوچ میں کھوئے سے کھوئے رہا کرتے۔ آپؐ اپنے خالق و مالک کی عبادت میں مصروف رہتے۔ کائنات پر تدبر اور غور و فکر فرماتے۔ اس دوران میں آپؐ کو رات کے وقت ایسے خواب بھی آنے لگے جو نہ صرف یہ کہ سچے ہوتے بلکہ آپؐ نے ان میں سے بعض واقعات کا دن میں بھی مشاہدہ فرمایا۔ یہ گویا نبوت کی تمہید تھی۔

اعلانِ نبوّت اور تبلیغ دین

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانِ نبوت کب اور کن حالات میں فرمایا؟ تبلیغ دین کے سلسلہ میں آنحضرتؐ کی جدوجہد اور پیش آمدہ مشکلات کا جائزہ لیجیے۔

جواب:

اعلانِ نبوت اور آغاز وحی

اس سے پیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلوت پسندی اور غور وفکر کی عادت کا ذکر ہو چکا ہے۔ آپؐ مدت تک اپنی اس عادت میں مصروف رہے اور حسبِ معمول غارِ حرا میں جا کر خدا کی عبادت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جس وقت آپؐ کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو ایسے خواب دیکھنے لگے جو سپیدۂ صبح کی طرح سچے ثابت ہوتے۔ یہ کیفیت کوئی چھ ماہ تک جاری رہی اور اس کے بعد فرشتے کے ذریعے سے خدا کے پیغامات ملنے لگے۔

آغازِ وحی

آخر ایک روز یہ حیرت ناک واقعہ بھی پیش آیا کہ غارِ حرا میں آنحضرتؐ کے سامنے اچانک ایک نورانی صورت ظاہر ہوئی۔ یہ حضرت جبریلؑ تھے۔ آپؐ نے خلافِ معمول اپنی اس تنہائی میں کسی اور کو بھی موجود دیکھا تو آپؐ یکایک گھبرا گئے، لیکن حضرت جبریلؑ نے آپؐ سے کہا، اِقْرَاْ (پڑھیے)۔ آپؐ نے جواب دیا: مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ (میں پڑھنا نہیں جانتا) اس پر جبریلؑ نے آپؐ کو سینے سے لگا کر نہایت زور سے دبایا اور پھر پڑھنے کو کہا۔ آپؐ نے پھر وہی جواب دیا۔ اسی طرح یہ واقعہ تین بار پیش آیا۔ آخر جبریلؑ نے کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۭ (سورۃ العلق پارہ ۳۰)

ترجمہ: اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھیے، جس نے پیدا فرمایا، انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپؐ کا پروردگار سب سے بزرگ ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ کچھ سکھایا جو اسے معلوم نہ تھا۔

حضورؐ کی زبان مبارک پر یہ کلام الٰہی جاری ہو گیا۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ خدائے بزرگ و برتر نے آپؐ کو نبوت کے عظیم منصب سے سرفراز فرمایا ہے اور آپؐ کو خدا کے آخری محبوب رسولؐ کی حیثیت سے گمراہ اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہِ ہدایت پر لانے کی عظیم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا ۔۔۔ اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا (حالی)

آنحضرتؐ کی گھبراہٹ اور حضرت خدیجہؓ کی تشفی

حضرت جبریلؑ تو خدا کا یہ پیغام دے کر غائب ہو گئے۔ لیکن اس غیر معمولی واقعے نے آپؐ کی حیرت میں انتہا کا اضافہ کر دیا۔ آپؐ حیران تھے کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے یا خواب؟ آخر اس پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں اپنے گھر کو تشریف لے آئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بستر پر لیٹ گئے اور اپنی خدمت گار و وفا شعار بیوی حضرت خدیجہؓ سے فرمایا:

زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ (مجھے کمبل اڑھا دو، مجھے کمبل اڑھا دو)

حضرت خدیجہؓ اس صورت حال سے گھبرا گئیں۔ جب آپؐ ذرا پرسکون ہوئے تو حضرت خدیجہؓ سے کہا، لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ (مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے) اس پر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو ان الفاظ میں تسلی و تشفی دی:

"نہیں، نہیں، آپؐ کو خوش رہنا چاہیئے۔ خدا کی قسم! خدا آپؐ کو کبھی غمگین نہ ہونے دے گا۔ کیونکہ آپؐ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ جن کے پاس دولت نہیں، ان کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ آپ مہمانوں کی خاطر داری کرتے ہیں اور اگر حق کے باعث کسی پر مصیبت آجائے تو اس کی مدد کرتے ہیں۔"

ورقہ بن نوفل سے ملاقات

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ دورِ جہالت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی میں لکھنا جانتے تھے۔ چنانچہ عبرانی زبان میں حسب توفیقِ الٰہی انجیل لکھتے تھے۔ اس وقت بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ ان سے حضرت خدیجہؓ نے کہا، "بھائی جان! آپ اپنے بھتیجے کی بات سنیں۔" ورقہ نے کہا: "بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟" آنحضرتؐ نے جو کچھ دیکھا تھا، بیان فرما دیا۔ اس پر ورقہ نے آپؐ سے کہا: "یہ تو وہی ناموس ہے جسے اللہ نے حضرت موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں اس وقت توانا ہوتا کاش میں اس وقت زندہ ہوتا، جب آپؐ کی قوم آپؐ کو نکال دے گی۔" آنحضرتؐ نے فرمایا: "اچھا! تو کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ میری قوم تو مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے ساتھ عزت سے پیش آتی ہے۔"

ورقہ نے کہا: "ہاں! جب بھی کوئی آدمی اس طرح کا پیغام لایا، جیسا تم لائے ہو تو اس سے ضرور دشمنی کی گئی اور اگر میں نے تمہارا زمانہ پالیا تو تمہاری زبردست مدد کروں گا۔" ورقہ سے ملنے کے بعد آپؐ کو ایک اطمینان سا ہو گیا۔ اس کے بعد ورقہ جلد ہی فوت ہو گئے۔

خفیہ دعوتِ اسلام

ابتدائی مسلمان:۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فریضہ رسالت کا کام باقاعدہ

شروع کر دیا۔ ابتداء میں تبلیغ کا فریضہ پوشیدہ طور پر رہا۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمانِ خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ ایک ایسی قوم کو جو صدیوں سے شرک اور بت پرستی کی ضلالت و گمراہی میں مبتلا تھی توحید کی دعوت دینا آسان نہ تھا، خصوصاً اس حالت میں کہ رؤسائے قوم کے سالہا سال کا اقتدار خطرے میں پڑ جائے۔ اس لیے اول اول اپنے ان مقربانِ خاص کو دعوت دی جو لوگ آپؐ کے عادات و خصائل سے اچھی طرح واقف تھے، انہوں نے بلا تامل بغیر کسی حیل و حجت کے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ چنانچہ عورتوں میں سب سے اول آپؐ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ صدیقہؓ، مردوں میں آپؐ کے قدیم رفیق محرم راز حضرت ابوبکر صدیقؓ غلاموں میں آپؐ کے محبوب غلام زیدؓ، نوعمروں میں آپؐ کے چچیرے بھائی حضرت علی المرتضیٰؓ اسلام سے مشرف ہوئے اور آپؐ تین سال تک خاموشی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بڑے بااثر تھے، ان کے اثر سے حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت زبیرؓ بن عوام، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت طلحہؓ بن زبیر مشرف باسلام ہوئے۔ ان حضرات کے قبولِ اسلام کے اثر سے اس کا دائرہ بڑھنے لگا۔ چنانچہ حضرت خبابؓ بن ارت، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عثمانؓ ابن مظعون، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت صہیبؓ اور حضرت ارقمؓ وغیرہ نے اسلام قبول کیا اور یوں ایک اچھی خاصی جماعت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ یہ تمام کام خفیہ ہوا اور دارِ ارقم کو دعوت اسلامی کا مرکز بنایا گیا۔

اس زمانے میں یہ ابتدائی مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چھپ کر نماز ادا کرتے اور اس مقصد کے لیے کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے۔ البتہ چاشت کی نماز حرم ہی میں ادا کی جاتی، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ، حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے آپؐ کے چچا ابوطالب آ نکلے۔ ان کو اس جدید طریقۂ عبادت پر تعجب ہوا، کھڑے ہو گئے اور بغور دیکھتے رہے۔ نماز کے بعد پوچھا: بھتیجے! یہ کون سا دین ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہمارے دادا حضرت ابراہیمؑ کا یہی دین تھا۔" ابوطالب نے کہا: میں اس کو اختیار تو نہیں کر سکتا، لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا راستہ نہ روک سکے گا۔"

اہلِ خاندان کو دعوت اسلام

کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم ملا کہ:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ (الشعراء: ۲۱۴)

ترجمہ: اور اپنے قریبی اہلِ خاندان کو برے انجام سے ڈرائیں۔

اس حکم خداوندی کی تعمیل کے لیے آنحضرتؐ نے یہ اہتمام کیا کہ بنو ہاشم میں سے تقریباً چالیس افراد

کو کھانے پر دعوت دی۔ جب لوگ کھانے سے فراغت پا چکے تو آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا: "میں تمہاری طرف وہ بات لایا ہوں جس سے زیادہ اچھی چیز کوئی شخص اپنے قبیلے کی طرف نہیں لایا۔ بتاؤ، تم میں سے کون میرا ساتھ دے گا؟" سب حاضرین خاموش رہے۔ آپ کے چچا ابولہب نے زبردست مخالفت کی۔ ابوطالب ایمان تو نہ لائے، لیکن اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ حضرت علی المرتضیٰؓ اس وقت اگرچہ نوعمر تھے، لیکن کھڑے ہو کر اعلان کیا: "گو مجھے آشوب چشم کی شکایت ہے، میری ٹانگیں پتلی ہیں اور نوعمر ہوں لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" حاضرین نے اس بات کو اہمیت نہ دی، لیکن زمانے نے دیکھ لیا کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے کس طرح عمر بھر حضورؐ کا بھرپور ساتھ دیا۔

اعلانیہ تبلیغ

تین سال تک خفیہ تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن آپ کا فریضہ چند آدمیوں کے ہدایت یاب ہونے سے ختم نہ ہو جاتا تھا، بلکہ سارے عالم کو اعلانیہ اسلام کی دعوت سے مشرف کرنا تھا۔ اس لیے اب آپ کو حکم ہوا کہ کسی کی پروا کئے بغیر کھلم کھلا اعلانِ حق کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر: ۹۴) یعنی "اے نبیؐ! جس کام پر آپ کو مامور کیا گیا ہے وہ کھلے الفاظ میں بیان کر دو۔"

اس حکم کے نازل ہونے پر آپ عرب کے رواج کے مطابق کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور تمام قریش کو باآواز بلند پکارا (کسی نازک اور اہم مسئلے کی خاطر اہلِ مکہ ایسا ہی کرتے تھے)۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: "اے قومِ قریش! اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ صبح کو یا شام کو اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم لوگ مجھے سچا جانو گے؟" سب نے کہا: "ہاں، کیونکہ ہم نے تمہیں ہمیشہ سچ بولتے دیکھا ہے۔" آپ نے فرمایا: "تو پھر سن لو کہ اگر تم لوگ میری دعوت پر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر سخت عذاب نازل ہو گا۔" یہ سن کر تمام لوگ جن میں ابولہب بھی شامل تھا، بڑبڑاتے اور کوستے ہوئے واپس چلے گئے کہ خواہ مخواہ ہمیں زحمت دی اور ہمارا وقت ضائع کیا۔ بقولِ مولانا حالی ؎

کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا   کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا   تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا؟
کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر"
کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے   کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے"
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہے   تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

ابتدائی مشکلات اور رکاوٹیں

حضورؐ کی ذات پر سختیاں

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکے کے اس مرکزِ کفر و شرک میں ایک خدا کا نام بلند کیا اور کفار و مشرکین نے اپنے خود ساختہ خداؤں کا اقتدار خطرے میں دیکھا تو وہ اس صورت حال کی تاب نہ لا سکے اور ایک دم سب کے سب مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ مخالفت بدترین قسم کی عداوت میں تبدیل ہو گئی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مخالفت و عداوت میں آپؐ کا اپنا قبیلہ قریش سب سے آگے تھا۔

اب کفار نے اس دعوت اسلامی کے راستے میں مختلف رکاوٹیں ڈالنی شروع کر دیں اور آنحضرتؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی مخالفت میں سارے ہتھکنڈے اور حربے استعمال کرنے لگے۔ سب سے پہلے تو مذاق اڑایا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ اس میں غنڈہ گردی کا رنگ آنے لگا جو خود بے دین تھے وہ آپؐ کو معاذاللہ بے دین کہنے لگے۔ کبھی مجنوں کہتے۔ کبھی جادوگر پکارتے اور کبھی شاعر قرار دیتے۔ کبھی کہتے کہ یہ کوئی جن ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آتا ہے اور انہیں سکھا پڑھا جاتا ہے۔ کبھی کسی کاہن کا شاگرد کہتے۔

علاوہ ازیں یہ لوگ آپؐ کو جسمانی اذیتیں بھی دینے لگے۔ وہ آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے تاکہ رات کے اندھیرے میں آپؐ کے پاؤں زخمی ہو جائیں۔ آپؐ کے دروازے پر گندگی پھینک دی جاتی۔ راہ گزرتے وقت آپؐ پر طرح طرح کے فقرے کستے اور پتھر مارتے، آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا۔ مکہ میں ہر نئے آنے والے آدمی کو پہلے سے جا کر بہکا دیتے کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ جب آپؐ نماز میں مصروف ہوتے تو سردارانِ قریش طرح طرح سے آپؐ کا مذاق اڑاتے اور آپؐ کی عبادت میں رکاوٹ ڈالتے۔ ایک مرتبہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط نے آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اسے اس قدر زور سے بل دیئے کہ آپؐ کا دم رکنے لگا۔ اسی طرح اس بدبخت نے ابوجہل کے کہنے پر نماز کی حالت میں آپؐ کی پشت پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی، جس کے بوجھ سے آپؐ کے لیے سجدے سے سر اٹھانا مشکل ہو گیا۔ آنحضرتؐ ہر طرح کی سختیاں جھیلتے مصیبتیں اٹھاتے تھے، لیکن خدا کے دین کی تبلیغ سے باز نہ آتے تھے۔ ان سب مشکلات کے مقابلے میں آپؐ کا دل صبر و استقامت کا پہاڑ تھا۔

صحابہ کرامؓ پر مظالم

ابتداء میں اسلام لانے والے عام طور پر غریب اور کمزور لوگ تھے، چنانچہ کفار و مشرکین کا زور ان پہ خاص طور پر زیادہ چلتا تھا۔ وہ انہیں سخت سے سخت جسمانی تکلیف و ایذا پہنچاتے تھے۔ حضرت بلالؓ مشہور سردار امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ امیہ کو جب ان کے ایمان لے آنے کی خبر ملی تو وہ انہیں کبھی گرم ریت پر لٹا دیتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتا۔ کبھی مشکیں کس کر کوڑے لگواتا۔ کھانے پینے کو کچھ نہ دیتا اور گردن میں رسی باندھ کر لڑکوں سے کہتا کہ اسے شہر کے گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرو اور خوب پیٹو۔ لیکن حضرت بلالؓ اس ذات پر ایمان لائے تھے، جس کی محبت میں اس قسم کی تکالیف تو ایک طرف، جان بھی دی جا سکتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ برداشت کرتے، لیکن زبان سے احد، احد ہی پکارتے تھے۔ ؎

منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں ابوجہل سب سے آگے تھا۔ وہ حضرت عمارؓ، ان کے والد حضرت یاسرؓ اور ان کی والدہ حضرت سمیہؓ کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ انہیں ابوجہل نے نیزے سے چھید چھید کر ہلاک کر دیا یہ اسلام میں پہلی شہیدہ ہیں۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو فرمایا "آلِ یاسر! صبر کرنا۔ تمہارا ٹھکانا جنت ہے۔" حضرت عثمانؓ بن عفان کا چچا انہیں کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر نیچے سے دھواں دیتا۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ماں کو ان کے اسلام لانے کا علم ہوا تو ان کا دانہ پانی بند کر دیا اور انہیں گھر سے نکال دیا۔ حضرت خبابؓ بن ارت کو مشرکین طرح طرح کی سزائیں دیتے تھے۔ ان کے سر کے بال نوچتے تھے اور سختی سے گردن مروڑتے تھے۔ انہیں کئی بار دہکتے ہوئے انگاروں پہ لٹا کر اوپر سے پتھر رکھ دیا کہ وہ اٹھ نہ سکیں۔

مشرکین نے سزا کی ایک شکل یہ بھی اختیار کی تھی کہ بعض بعض صحابہؓ کو اونٹ اور گائے کی کچی کھال میں لپیٹ کر دھوپ میں ڈال دیتے تھے اور بعض کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلتے ہوئے پتھر پہ لٹا دیتے تھے۔

درحقیقت اللہ کی راہ میں ظلم و جور کا نشانہ بننے والوں کی فہرست بڑی لمبی ہے اور بڑی تکلیف دہ بھی۔ حالت یہ تھی کہ جس کسی کے مسلمان ہونے کا پتہ چل جاتا تھا مشرکین اس کے درپے آزاد ہو جاتے تھے، لیکن یہ تمام سفاکیاں اور ظلم و جور کسی ایک مسلمان کو بھی جادۂ اسلام سے نہ ہٹا سکے۔ ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　　لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

(اقبال)

مخالفت کا طوفان اور متفرق حربے

سو نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

مولانا ظفر علی خان

سوال، قریش مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے خلاف کیوں ہو گئے تھے؟ انہوں نے آپؐ کو اپنے مشن سے باز رکھنے کے لیے کیا کیا کوششیں کیں؟ (دیاً)

قریش مکہ کی مخالفت کے اسباب کیا تھے؟ اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو تبلیغ اسلام سے روکنے کے لیے کون سے مختلف حربے استعمال کیے؟

جواب:

کفار مکہ کی مخالفت

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے کفر و شرک میں بری طرح مبتلا عرب معاشرے میں خالص توحیدِ باری تعالیٰ کا تصور پیش کیا تو وہی اہلِ مکہ جو اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو صادق و امین کہہ کر پکارتے رہے تھے اور آپؐ کی راستبازی اور پاکیزگیٔ اخلاق کے تہِ دل سے قائل و معترف تھے، یکایک بدترین مخالفت پر اتر آئے۔ مکہ ایک ایسی آواز سن کر جس میں مشرکین اور بت پرستوں کو گمراہ کہا گیا تھا، احساسِ غضب سے پھٹ پڑا۔ کیونکہ اہلِ مکہ جانتے تھے کہ غیر اللہ کی الوہیت کے انکار اور رسالت و آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس رسالت کے حوالے کر دیا جائے اور اس کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے، یعنی اس طرح کہ دوسرے تو در کنار خود اپنی جان اور اپنے مال تک کے بارے میں کوئی اختیار نہ رہے اور اس کے معنی یہ تھے کہ اہلِ مکہ کو دینی رنگ میں خانہ کعبہ کے متولی و مجاور ہونے کے سبب، اہلِ عرب پر جو بڑائی اور سرداری حاصل تھی، اس کا صفایا ہو جائے گا اور اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مقابل میں انہیں اپنی مرضی پر عمل پیرا ہونے کا اختیار نہ رہے گا، یعنی نچلے طبقے پر انہوں نے جو مظالم روا رکھے تھے اور صبح و شام جن برائیوں میں لت پت رہتے تھے، ان سے دستبردار ہوتے ہی بنے گی۔

قریش کی مخالفت کے اسباب

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنی مشہور تصنیف "سیرۃ النبیؐ" میں قریش مکہ کی مخالفت کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصراً جائزہ لیا جاتا ہے:

۱۔ آبائی رسم و عقائد کی پیروی

عام قاعدہ اور دستور ہے کہ ناتربیت یافتہ اور تند خو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو ان کے آبائی

رسم و عقائد کے خلاف ہو ان کو سخت برہم کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی ہی نہیں ہوتی، بلکہ ان کا جذبۂ انتقام خون کے سوا کوئی چیز ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔ اہل عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے توحید کے سب سے بڑے مرکز خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت معبود بنا کر رکھے ہوئے تھے، جن میں ہبل ان سب سے بڑا معبود تھا۔ یہی بت ہر قسم کے خیر و شر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے معرکہ ہائے جنگ میں فتح دلاتے تھے۔ اور پھر ہر قبیلے نے اپنا اپنا الگ معبود بنا رکھا تھا اور اس طرح وہ خالص توحید سے بہت دور جا پڑے تھے۔ وہ اپنے باپ دادا کے مذہب اور طور طریقوں کو چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون بار بار بیان ہوا ہے کہ جب بھی کسی پیغمبر نے اپنی قوم کو خالص توحید اور اسلام کی دعوت دی تو اس قوم نے اسی ہٹ دھرمی پر اصرار کیا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے دین اور طور طریقوں کو ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتے۔ خواہ وہ گمراہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

(اقبال)

۲۔ اقتدار و اختیار کو خطرہ

اسلام کے فروغ و استحکام کی صورت میں قریش کو اپنا اقتدار و اختیار خطرے میں نظر آتا تھا۔ اس لیے انہوں نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اسی قدر وہ مخالفت میں زیادہ سرگرم تھا۔ قریش کا رئیسِ اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حربِ فجار میں وہی سپہ سالارِ اعظم تھا، لیکن حرب کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصبِ عظیم کو حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا، اس لیے ولید بن المغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا۔ ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب حاصل نہ کر سکا، لیکن بنو امیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا۔ خاندان ہاشم میں ابولہب با اثر تھا جو حضورؐ کا حقیقی چچا تھا قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ با اثر عاص بن وائل تھا جو نہایت دولت مند اور کثیر الاولاد تھا قریش کی عنانِ حکومت انہی رؤسا کے ہاتھ میں تھی اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی۔

۳۔ عیسائیت سے نفرت

قریش کو عیسائیوں سے فطرتاً نفرت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ ابرہہ شاہِ حبش جو خانہ کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا، عیسائی تھا۔ اسی لیے قریش عیسائیوں کے مقابلے میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، چنانچہ جب ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ دل ہوئے۔ علاوہ ازیں اسلام اور عیسائیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں قبلہ بیت المقدس تھا اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا۔ ان اسباب کی بناء پر قریش کو خیال

ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں (معاذ اللہ)

قبائل کی خاندانی رقابت

مخالفت کا ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور ایک دوسرے کے حریف تھے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ۔ عبد المطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا۔ لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی صاحبِ اثر پیدا نہ ہوا۔ ابو طالب دولت مند نہ تھے۔ عباس دولت مند تھے لیکن فیاض اور سخی نہ تھے۔ ابولہب کا کردار ویسے ہی درست نہ تھا۔ ان حالات میں بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جا رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو خاندان بنو امیہ اپنے حریف (بنو ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے حضورؐ کی مخالفت کی۔ بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابو سفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔ عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ حضورؐ کا دشمن تھا اور جس نے نماز کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر اونٹ کی اوجھری لا کر ڈالی تھی اموی تھا۔

بنو امیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا وہ بنو مخزوم تھے۔ ولید بن المغیرۃ اسی خاندان کا رئیس تھا۔ اس لیے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ ابوجہل نے ایک موقع پر کہا تھا:

"ہم اور بنو ہاشم ہمیشہ حریفِ مقابل رہے۔ انہوں نے مہمان داریاں کیں تو ہم نے بھی کیں۔ انہوں نے خون بہا دیئے تو ہم نے بھی دیئے۔ انہوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں۔ یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے کندھے سے کندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعوے دار ہیں۔ خدا کی قسم! ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے۔"

۵۔ اخلاقی برائیاں

ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں بڑے بڑے سردار، رئیس نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے ابولہب جو خاندانِ ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ اس نے حرم محترم کے خزانہ سے سونے کا ایک ہرن چرا کر بیچ دیا تھا۔ اخنس بن شریق جو بنی زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، چغل خور اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی۔ اسی طرح اکثر سردارانِ عرب مختلف قسم کی معاشرتی برائیوں میں گرفتار تھے مثلاً شراب نوشی، جوا، وغیرہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک طرف تو بت پرستی کی برائیاں بیان کرتے تھے اور دوسری طرف ان بداخلاقیوں کی مذمت کرتے تھے جس سے ان کی عظمت و اقتدار کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ قرآن مجید میں مسلسل اعلانیہ ان بدکاروں کی مذمت میں آیتیں نازل ہوتی تھیں اور وہ خوب جانتے تھے کہ روئے سخن

کس کی طرف ہے۔

سب سے بڑا سبب۔ بُت پرستی کا مکمل خاتمہ

لیکن مخالفت کا جو سب سے بڑا سبب تھا اور جس کا اثر تمام قریش مکہ بلکہ عرب پر یکساں تھا یہ تھا کہ جو معبودان باطل سینکڑوں برس سے عرب کے حاجت روائے عام تھے اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام و نشان مٹاتا تھا اور ان کے بارے میں کہتا تھا:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ

(انبیاء:)

ترجمہ: بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، سب دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔

؎ باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول (اقبال)

(اقبال)

؎ بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

(اقبال)

قریش کے مخالفانہ حربے

۱۔ **رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ظلم و ستم** اس کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔

۲۔ **ترغیب و تحریص** جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے مقابلے میں کفار و مشرکین کی اس قسم کی ہر کوشش ناکام ہو گئی اور اسلام پھر بھی روز بروز بڑھتا رہا تو انہوں نے اپنے ایک بہت بڑے مدبر اور سیاست دان عتبہ بن ربیعہ کو حضور کے پاس بھیجا۔ عتبہ نے مصالحانہ انداز سے نہایت نرم الفاظ میں آپؐ سے کہا:

"محمدؐ! تم اور تمہارا خاندان دونوں معزز اور شریف ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کی باتوں سے آخر تم قوم میں انتشار کیوں پیدا کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہیں مال و دولت کی ضرورت ہو تو ہم تمہارے لیے سونے چاندی کے ڈھیر لگا سکتے ہیں۔ کسی اونچے گھرانے کی خوبصورت ترین عورت سے شادی کی خواہش ہو تو پوری ہو سکتی ہے۔ اگر تم حکومت و بادشاہی کے خواہش مند ہوں تو ہم سب اس کے لیے بھی حاضر ہیں اور اگر تمہیں کوئی بیماری ہے تو ہم

اس کا علاج کرانے کی کوشش کریں گے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سب باتیں نہایت ٹھنڈے دل سے سن کر فرمایا "مجھے ان میں سے کسی بھی چیز کی خواہش و ضرورت نہیں اور نہ ہی مجھے کوئی بیماری ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم لوگ میری بات سنو اور اس پر عمل کرو، کیونکہ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ حٰم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں۔ جب حضورؐ اس آیت پر پہنچے:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۝

ترجمہ: پس اگر وہ روگردانی کریں تو تم کہہ دو کہ میں تمہیں عاد و ثمود کی کڑک جیسی ایک کڑک کے خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔

تو عتبہ تھرا کر کھڑا ہو گیا اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ حضورؐ کے منہ پر رکھ دیا کہ "میں آپؐ کو اللہ اور قرابت کا واسطہ دیتا ہوں کہ ایسا نہ کریں۔" اسے خطرہ تھا کہیں یہ ڈراوا ان پر نہ آن پڑے۔ پھر عتبہ اپنی قوم کے پاس گیا اور کہا:

"میں نے جو کلام سُنا ہے، ایسا کبھی نہیں سنا، خدا کی قسم! وہ نہ شعر ہے، نہ جادو نہ کہانت تم اس شخص کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ کوئی زبردست انقلاب آنے والا ہے۔ اگر کسی نے اس شخص کا خاتمہ کر دیا تو خیر، ورنہ اگر وہ غالب آکر بادشاہ بن گیا تو اس میں تمہاری عزت ہے۔"

قریش نے عتبہ کی بات سن کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم پر بھی محمدؐ کا جادو چل گیا ہے۔"

۲۔ ابو طالب کو قریش کی دھمکی

عتبہ کی اس ناکامی سے قریش بہت پریشان ہوئے اور اب انہوں نے آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس ایک وفد بھیجا۔ ان لوگوں نے یوں دھمکی دی:

"ابو طالب! آپ ہمارے اندر سن و شرف اور اعزاز کے مالک ہیں۔ ہم نے آپ سے گزارش کی کہ اپنے بھتیجے کو روکیے۔ لیکن آپ نے نہیں روکا۔ آپ یاد رکھیں، ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے آباؤ اجداد کو گالیاں دی جائیں۔ ہماری عقل و فہم کو حماقت زدہ قرار دیا جائے اور ہمارے خداؤں کی عیب چینی کی جائے۔ آپ روک دیجیے، ورنہ ہم آپ سے اور ان سے ایسی جنگ چھیڑ دیں گے کہ ایک فریق کا صفایا ہو کر رہے گا۔"

ابو طالب پر اس زوردار دھمکی کا بہت زیادہ اثر ہوا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو بلا کر کہا:

"بھتیجے! تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور ایسی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں۔ اب مجھ پر اور خود اپنے آپ پر رحم کرو، اور اس معاملے میں مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میرے بس سے باہر ہے"

یہ سن کر حضورؐ نے سمجھا کہ اب آپؐ کے چچا بھی آپؐ کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور وہ بھی آپؐ کی مدد سے کمزور پڑ گئے ہیں۔ اس لیے فرمایا:

"چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں کہ میں اس کام کو اس حد تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں کہ یا تو اللہ اسے غالب کر دے یا میں اسی راہ میں فنا ہو جاؤں تو نہیں چھوڑ سکتا"

اس کے بعد آپؐ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور اٹھ گئے جب واپس ہونے لگے تو ابو طالب نے پکارا اور سامنے تشریف لائے تو کہا "بھتیجے! جاؤ جو چاہو کہو، خدا کی قسم! میں تمہیں کبھی بھی کسی بھی وجہ سے چھوڑ نہیں سکتا"

۴۔ قریش کا ابو طالب سے عجیب و غریب مطالبہ

پچھلی دھمکی کے باوجود جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنا کام کیے جا رہے ہیں تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ ابو طالب حضورؐ کو چھوڑ نہیں سکتے، بلکہ اس بارے میں قریش سے جدا ہونے اور ان کی عداوت مول لینے کو تیار ہیں چنانچہ وہ لوگ ولید بن مغیرہ کے لڑکے عمارہ کو ہمراہ لے کر ابو طالب کے پاس پہنچے اور ان سے یوں عرض کیا:

"اے ابو طالب! یہ قریش کا سب سے بانکا اور خوبصورت نوجوان ہے۔ آپ اسے بیٹا بنا لیں اور اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم اسے قتل کریں گے۔ بس یہ ایک آدمی کے بدلے ایک آدمی کا حساب ہے"

ابو طالب نے کہا: "خدا کی قسم! کتنا بُرا سودا ہے جو تم لوگ مجھ سے کر رہے ہو۔ تم مجھے اپنا بیٹا دیتے ہو کہ میں اسے کھلاؤں پلاؤں، پالوں پوسوں اور میرا بیٹا مجھ سے طلب کرتے ہو کہ اسے قتل کر دو۔ خدا کی قسم! یہ نہیں ہو سکتا"

۵ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی تجویز

ان دونوں گفتگوؤں کی ناکامی کے بعد قریش کا جذبۂ جور و ستم اور بھی بڑھ گیا۔ اب سرکشوں کے دماغ میں نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خاتمے کی ایک تجویز ابھری۔ اس سازش کے تحت ایک صبح ابو جہل ایک بھاری پتھر لے کر حضور اکرمؐ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حسبِ دستور

تشریف لائے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ قریش بھی اپنی اپنی مجلسوں میں آ چکے تھے۔ اور ابوجہل کی کارروائی کے منتظر تھے۔ جب حضورؐ سجدے میں تشریف لے گئے تو ابوجہل نے پتھر اٹھایا، پھر آپؐ کی جانب بڑھا، لیکن قریب پہنچا تو شکست خوردہ حالت میں واپس بھاگا۔ اس کا رنگ فق تھا اور وہ اس قدر مرعوب تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پتھر پر چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ بمشکل ہاتھ سے پتھر پھینک سکا۔ ادھر قریش کے کچھ لوگ اس کے پاس آئے اور اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا: "جب میں اس کے قریب پہنچا تو ایک اونٹ آڑے آگیا، بخدا میں نے کبھی کسی اونٹ کی ویسی کھوپڑی، ویسی گردن اور ویسے دانت دیکھے ہی نہیں۔ وہ مجھے کھا جانا چاہتا تھا۔

ابنِ اسحاق کہتے ہیں: "مجھے بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ جبریلؑ تھے اگر ابوجہل قریب آتا تو اسے دھر پکڑتے۔"

ایک نصرانی مؤرخ کی رائے

کفارِ مکہ کے یہ تمام ظلم وستم اور طرح طرح کے حربے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے استقلال میں ذرہ بھر لغزش پیدا نہ کر سکے اور ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کر سکے۔ اس پر ایک نصرانی مؤرخ نے نہایت سچ لکھا ہے:

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خصائل نے وہ درجہ نشہ دینی کا آپؐ کے پیروؤں میں پیدا کیا، جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے۔ برعکس اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپؐ کے بچاؤ میں جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپؐ کو غالب کیا۔"

(بحوالہ "سیرۃ النبیؐ"
مولانا شبلیؒ و سید سلیمان ندویؒ)

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا قبول اسلام

ے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں
(اقبالؒ)

سوال: حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کا مفصل حال لکھئے۔

جواب: **حضرت حمزہ کا قبول اسلام**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچاؤں میں سے حضرت حمزہؓ کو آپؐ سے خاص محبت تھی۔ وہ آپؐ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے۔ دونوں نے ثوبیہ کا دودھ پیا تھا اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے۔ وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ لیکن آپؐ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سپاہ گری اور شکار کے شوقین تھے۔ معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحن حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے۔ حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طرح سب سے دوستانہ تھا، اور سب لوگ ان کی قدرومنزلت کرتے تھے۔

ان کے اسلام لانے کا سبب یہ ہے کہ ایک روز ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچائی سخت سُست کہا اور پتھر مار کر آپؐ کو زخمی کر دیا۔ ایک کنیز یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ حضرت حمزہؓ شکار سے واپس آئے تو اس نے ان سے ابوجہل کی ساری حرکت کہہ سنائی۔ حضرت حمزہؓ غصے سے بھڑک اٹھے۔ یہ قریش کے سب سے طاقتور اور مضبوط جوان تھے۔ فوراً مسجد حرام میں پہنچے اور ابوجہل سے مخاطب ہوئے "بزدل! تو میرے بھتیجے کو گالی دیتا ہے۔ حالانکہ میں بھی اسی کے دین پر ہوں۔" اس کے بعد کمان اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ اسے شدید زخمی کر دیا۔ اس پر ابوجہل کے قبیلے اور حضرت حمزہؓ کے قبیلے کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف بھڑک اٹھے۔ لیکن ابوجہل نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کہ اسے جانے دو۔ میں نے واقعی اس کے بھتیجے کو بہت بری گالی دی تھی۔"

حضرت حمزہؓ جوش اور حمیت میں آکر یہ کام تو کر گئے، مگر جب گھر پہنچے تو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر اللہ سے دعا کی کہ اے خدا! میری صحیح رہنمائی فرما۔" آخر رات بھر کی سوچ بچار کے بعد انہوں نے دین حق پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ آنحضورؐ کے پاس آئے اور کہا "بھتیجے! تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے ابوجہل سے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔" آنحضورؐ نے فرمایا: "چچا جان! مجھے ایسی باتوں سے خوشی نہیں ہوتی۔ البتہ آپ مسلمان ہو جائیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔" اس پر حضرت حمزہؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے قبولِ اسلام

سے مسلمانوں کو تقویت ملی۔

۲۔ حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام

کفر و شرک کے تاریک بادلوں کی گمبھیر فضا میں ایک اور برقِ تاباں نمودار ہوئی یعنی حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے کا واقعہ ۶ نبوی کا ہے۔ وہ حضرت حمزہؓ کے صرف تین دن بعد مسلمان ہوئے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اسلام لانے کے لیے دعا کی تھی۔ چنانچہ طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"اے اللہ! عمر بن خطاب اور ابوجہل بن ہشام میں سے جو شخص تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے، اس کے ذریعے سے اسلام کو قوت پہنچا۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے حق میں یہ دعا قبول فرمائی۔

مولانا شبلی نعمانیؒ نے حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ یوں بیان کیا ہے:

"حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ آفتابِ رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے۔ حضرت سعیدؓ کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا۔ اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں۔ اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیمؓ بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے۔ یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے، ان کے دشمن بن گئے۔ لبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی، جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ "دم لوں تو پھر ماروں گا۔" اس کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا، زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا، اترتا نہ تھا۔ ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی اسلام سے بددل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا۔ تلوار کمر سے لگا سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چلے۔ کارکنانِ قضا نے کہا کہ شکار کرنے چلے ہو، خود شکار ہو جاؤ گے۔ راہ میں اتفاقاً نعیمؓ بن عبداللہ مل گئے۔ ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں۔" انہوں نے کہا: "پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔" فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا لیے، لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بہن سے پوچھا: یہ کیا آواز تھی؟ بولیں: کچھ نہیں۔ بولے: میں سن چکا ہوں، تم دونوں بے دین ہو گئے ہو۔" یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں

ہوئے اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی۔ یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہو گیا لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی۔ بولیں کہ "عمر! جو بن آئے کرو۔ لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا۔" ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا۔ بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، ان کے جسم سے خون جاری تھا۔ دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی۔ فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے، مجھ کو بھی سناؤ۔

حضرت خبابؓ بن الارت جو حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو قرآن سکھا رہے تھے، حضرت عمرؓ کی آمد پر گھر کے اندر چھپ گئے تھے، اب باہر آ گئے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے بارے میں بتایا۔ حضرت عمرؓ نے قرآن کے اجزاء مانگے تو بہن نے کہا "تم ناپاک ہو۔ پہلے غسل کرو اور پھر اس کتاب کو ہاتھ لگاؤ۔" حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا، پھر کتاب لی اور سورہ طٰہٰ کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی کہنے لگے: یہ تو بڑا عمدہ اور بڑا محترم کلام ہے۔ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پتہ بتاؤ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ حضورؐ حضرت ارقمؓ کا مکان میں جو کوہِ صفا کے پہلو میں تھا تشریف فرما تھے حضرت عمرؓ نے آستانۂ مبارک پر پہنچ کر دستک دی۔ چونکہ شمشیر بکف گئے تھے۔ صحابہؓ کو تردد ہوا۔ لیکن حضرت حمزہؓ نے کہا: آنے دو۔ مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔" حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو حضورؐ خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا "کیوں عمرؓ! کس ارادے سے آیا ہے؟" نبوت کی پُرجلال آواز نے ان کو کپکپا دیا۔ نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ "ایمان لانے کے لیے۔" حضورؐ بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

حضرت عمرؓ نے ایمان لا کر اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کر دیا۔ اس وقت تک اگرچہ چالیس افراد اسلام لا چکے تھے۔ عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہؓ بھی اسلام لا چکے تھے۔ تاہم مسلمان اپنے فرائض دینی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کے ساتھ دفعتاً یہ حالت بدل گئی۔ انھوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا۔ کفار نے اوّل اوّل بڑی شدت کی، لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی۔ اس پر حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو فاروق کا لقب عطا فرمایا، یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والا۔ ؎

جب عمرؓ کا نعرۂ مستانہ ہوتا تھا بلند نشہ ہو جاتا تھا روما اور ایران کا ہرن

(مولانا ظفر علی خاں)

ہجرت حبشہ ۵ نبوی

سوال: ہجرت حبشہ کب اور کن حالات میں ہوئی؟ اس کا مفصل حال بیان کیجئے۔

جواب:

ہجرت حبشہ ۵ نبوی

۱۔ قریش کے مظالم کی انتہا

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام لانے سے قریش کی مخالفت میں فرق آنے کی بجائے اور اضافہ ہوا۔ وہ جوں جوں اپنی ناکامی کے آثار دیکھتے، ان کا جوشِ غضب اور جذبۂ انتقام کچھ اور بڑھتا گیا۔ انہوں نے ان واقعات کے بعد مسلمانوں کو تنگ کرنے اور نقصان پہنچانے کی مہم تیز تر کر دی اور حرم کی سرزمین پر ان کا عرصۂ حیات دشوار کر دیا۔ جاں نثارانِ اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مکہ میں رہ کر فرائض اسلام کا آزادی سے بجا لانا ممکن نہ تھا۔ اس وقت حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا، میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا، لیکن وہ باز نہ آئے، حرم میں گئے اور مقامِ ابراہیمؑ کے پاس کھڑے ہو کر سورۃ الرحمٰن پڑھنا شروع کی، کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کئے۔ اگرچہ انہوں نے جہاں تک پڑھنا تھا، پڑھ کر دم لیا، لیکن واپس گئے تو چہرہ پر زخم کے نشان لے کر گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جاہ و اقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے، لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لیے آمادہ ہو گئے۔

۲۔ ہجرت کی اجازت

آخر کفار مکہ کے متواتر و مسلسل مظالم سے تنگ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ملکِ حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا۔ وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے۔ اہل عرب حبش کے فرمانروا کو نجاشی کہتے تھے۔ اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔ وہ شریف النفس اور بے تعصب انسان تھا۔ اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں۔ اوّل اوّل گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی۔ ان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں:۔

حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت ابو حذیفہؓ مع اپنی زوجہ کے، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت مصعبؓ بن عمیر،

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوسبرةؓ، حضرت عامرؓ بن ربیعہ وغیرہ حضرت ابوسلمہؓ مع اپنی زوجہ کے۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہِ رجب میں سفر کیا۔ حسن اتفاق یہ کہ جب یہ لوگ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جارہے تھے۔ جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھالیا۔ ہر شخص کو صرف پانچ درہم دینے پڑے۔ قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے لیکن موقع نکل چکا تھا۔

ہر درجہ کے مہاجرین

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا، لیکن فہرستِ مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ بنو امیہ سے تھے، جو سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار خاندان تھا متعدد بزرگ مثلاً حضرت زبیرؓ اور حضرت مصعبؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے ہیں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت ابوسبرةؓ معمولی لوگ نہ تھے۔ اس بنا پر زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بیکسوں تک محدود نہ تھا، بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

قریش کی سفارت

نجاشی کی بدولت مسلمان حبش میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو۔ اس مقصد کے لیے عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) منتخب ہوئے۔ نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لیے گراں بہا تحفے مہیا کیے گئے اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی۔ یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں، آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔

صحابہ کرامؓ اور نجاشی کا مکالمہ

دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہمارے حوالے کر دیئے جائیں۔ درباریوں نے بھی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا "تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے؟"

مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کو منتخب کیا انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی۔

حضرت جعفرؓ کی تقریر

اَيُّهَا الْمَلِكُ ! (اے بادشاہ!) ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ طاقتور لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، قرابت داروں سے تعلق توڑتے تھے۔ اس اثناء میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا، جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں ہمسایوں کو آرام دیں، پاک دامن عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں اس نے ہمیں امانتیں ادا کرنے، قرابت جوڑنے، حرام کاری و فواحش سے باز رہنے کی تلقین کی۔ ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمالِ بد سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی اور ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اُسی گمراہی میں پھر واپس آ جائیں۔"

نجاشی کا تاثر

نجاشی نے کہا "جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں پڑھیں۔ نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر کہا "خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پَرتو ہیں۔ یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا "تم واپس جاؤ۔ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔"

مکّی سفیروں کی ایک اور چال

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا "اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰؑ بن مریمؑ کے بارے میں ایک بڑی بات کہتے ہیں۔" اس پر نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں مسلمان کیا کہتے ہیں؟ اس دفعہ مسلمانوں کو گھبراہٹ ہوئی کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے، ناراض ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے طے کیا کہ سچ ہی بولیں گے نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ چنانچہ جب مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے اور اس نے سوال کیا تو حضرت جعفرؓ نے فرمایا:

"ہم عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کر آئے ہیں، یعنی حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا وہ کلمہ ہیں، جسے اللہ نے کنواری پاکدامن حضرت مریمؑ کی طرف القا کیا تھا۔"

نجاشی کا فیصلہ

نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا "واللہ! جو تم نے

کہا عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں۔" دربار کے پادری نہایت برہم ہوئے۔ نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی۔ لیکن نجاشی نے ان کے غصے کی کچھ پروا نہ کی۔ بادشاہ نے قریش کے سفیروں کے ہدیے واپس دلا دیئے اور وہ بے آبرو ہو کر واپس چلے گئے۔

مسلمانوں کی کامیابی

اس کے بعد نجاشی نے مسلمانوں سے کہا "جاؤ، تم لوگ میری سلطنت میں امن و امان سے رہو۔ جو تمہیں گالی دے گا اس پر تاوان لگایا جائے گا۔ مجھے گوارا نہیں کہ تم میں سے میں کسی آدمی کو ستاؤں اور اس کے بدلے میں مجھے سونے کا پہاڑ مل جائے۔"

چنانچہ مسلمان نجاشی کے پاس ایک اچھے ملک میں ایک اچھے پڑوسی کے زیر سایہ مقیم رہے۔ اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا۔ نجاشی اس کے مقابلہ کے لیے خود گیا۔ صحابہؓ نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لیے آئیں۔ حضرت زبیرؓ اگرچہ سب سے زیادہ کم سن تھے، لیکن انہوں نے اس خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ وہ مشک کے سہارے نیل تیر کر محاذِ جنگ پر پہنچے، ادھر صحابہؓ نجاشی کی فتح کے لیے خدا سے دعا مانگتے تھے۔ چند روز کے بعد حضرت زبیرؓ واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی۔

ہجرت حبشہ ثانیہ ۶ نبوی

حبش میں تقریباً ۸۳ مسلمان ہجرت کر گئے تھے اور وہاں امن سے اسلام کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد یہ افواہ پھیل گئی کہ مکہ میں کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر صحابہؓ میں بیشتر نے مکہ کا رُخ کیا۔ لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ واپس چلے گئے اور کچھ کسی نہ کسی طرح مکہ میں داخل ہو گئے۔ انہیں اہلِ مکہ نے اور بھی زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور جب ظلم حد سے بڑھ گیا تو یہ لوگ دوبارہ حبش چلے جانے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اب کہ ہجرت اتنی زیادہ آسان نہ تھی۔ کفار نے سخت مزاحمت کی۔ پھر بھی جس طرح ہو سکا، سو کے قریب صحابہؓ مکہ سے نکل گئے اور حبش میں قیام پذیر ہوئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو کچھ لوگ فوراً مدینہ چلے آئے اور باقی ماندہ کو آپؐ نے ۷ نبوی میں بلا لیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی ہجرتِ حبشہ کے لیے تیار ہوئے تھے۔ لیکن قبیلہ قارہ کا ایک رئیس انہیں پناہ میں لے کر واپس لایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے چند دنوں کے بعد اس کی پناہ لوٹا دی، کیونکہ اس پناہ نے آپ پر کئی پابندیاں عائد کر دیں۔ اس لیے آپ نے انسانی سہارے کی بجائے اللہ رب العزت کے سہارے کو کافی سمجھا۔

؎ خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے — کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے (حالیؔ)

شعب ابی طالب، عام الحزن اور سفر طائف

سوال:۔ مندرجہ ذیل پر مختصر مگر جامع نوٹ لکھئے:

(ا) شعب ابی طالب (ب) عام الحزن (ج) سفر طائف

جواب:۔ ا

شعب ابی طالب میں محصور ہونا، محرم ۷ ؁ نبوی

قریش دیکھتے تھے کہ بے پناہ سختیوں اور ظلم و ستم کے باوجود اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے لوگ ایمان لا چکے، نجاشی نے مسلمانوں کو حبشہ میں پناہ دی، سفراء بے نیل و مرام واپس آئے۔ مسلمانوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے اب یہ تدبیر سوچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا، جس کی اہم شرائط یہ تھیں:۔

۱۔ اگر بنی ہاشم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کے لیے حوالے نہ کریں تو ان کا مکمل مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے۔

۲۔ کوئی شخص ان کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات استوار نہ کرے۔

۳۔ کوئی شخص ان سے خرید و فروخت نہ کرے۔

۴۔ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان نہ جائے۔

۵۔ ان کے ساتھ کسی قسم کا میل جول نہ رکھیں گے۔

یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور درِ کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

سخت ترین آزمائش

ابو طالب مجبور ہو کر تمام خاندانِ ہاشم (سوائے ابو لہب) کے ساتھ شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہوئے۔ یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا جو خاندانِ بنو ہاشم کا موروثی تھا۔ تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے۔ حدیثوں میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے۔ حضرت سعد وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا چمڑا ہاتھ آگیا میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی۔ قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے، لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا۔ ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے

غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے۔ راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا۔ اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آگیا، وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو یہ کچھ کھانے کے لیے بھیجتا ہے، تو کیوں روکتا ہے؟

تبلیغ اسلام

ابتلا اور آزمائش کے اس دور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا اصل مشن نہ چھوڑا، بلکہ تبلیغ اسلام کا سلسلہ برابر جاری رہا ایک گھاٹی میں محصور غیر مسلموں کو اچھی طرح تعلیماتِ اسلام دینے کا موقع مل گیا۔ دوسری طرف حج کے دنوں میں جب کہ کافر بھی دشمن سے لڑنا حرام سمجھتے تھے، حضورؐ گھاٹی سے باہر نکل کر لوگوں کے سامنے اسلام کا پیغام پیش فرماتے تھے۔ بدبخت ابولہب صبح سے شام تک حضورؐ کے پیچھے پھرتا اور کہا کرتا: "لوگو! یہ دیوانہ ہے (معاذ اللہ) اس کی بات نہ سنو، جو کوئی اس کی بات سنے گا اور مانے گا، تباہ ہو جائے گا۔"

معاہدہ ختم کرنے کی تحریک

مسلسل تین برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آلِ ہاشم نے یہ مصائب برداشت کیے۔ بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود انہی کی طرف سے اس معاہدہ کو توڑنے کی تحریک ہوئی۔ ہشام عامری خاندانِ بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس گیا جو عبدالمطلب کے نواسے تھے اور کہا "کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو، ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو۔" زہیر بولا "کیا کروں، اکیلا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں۔" ہشام نے کہا "میں موجود ہوں۔" دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے اور ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا۔ دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

"اے اہلِ مکہ! یہ کیا انصاف ہے؟ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو۔ خدا کی قسم! جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا، میں باز نہ آؤں گا۔" ابوجہل برابر سے بولا: ہرگز نہیں، اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" زمعہ نے کہا: "تو جھوٹ کہتا ہے، جب یہ لکھا گیا تھا، اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے۔ غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی۔

خدائی معجزہ

اسی اثنا میں ایک معجزہ رونما ہوا۔ وہ یہ کہ اس باطل معاہدے کو دیمک نے چاٹ لیا۔ صرف اس پر اللہ کا نام باقی رہ گیا۔ حضورؐ نے اپنے چچا ابوطالب کو یہ بات بتائی تو انہوں نے قریش سے کہا کہ ان کے بھتیجے نے انہیں یہ خبر دی ہے۔ اگر وہ جھوٹا ثابت ہوا تو ہم تمہارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں گے، لیکن اگر وہ سچا ثابت ہوا تو تمہیں

یہ بائیکاٹ اور ظلم ختم کرنا ہوگا۔ اس پر قریش نے کہا، آپ انصاف کی بات کہہ رہے ہیں چنانچہ انہوں نے دیکھا تو واقعی یہ بات درست ثابت ہوئی ۔ چنانچہ مذکورہ لوگ ہتھیار باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے ۔

مشرکین نے حضورؐ کی نبوت کی ایک عظیم الشان نشانی دیکھی، لیکن انہوں نے اس نشانی سے بھی رخ پھیر لیا اور اپنے کفر کی راہ میں چند قدم اور آگے بڑھ گئے ۔

(ب) عام الحزن سنہ نبویؐ

عام الحزن کے معنی ہیں، غم کا سال، اس سال یعنی سنہ نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق و مہربان اور ہمدرد چچا ابوطالب کا انتقال ہوا۔ نیز اسی سال حضورؐ کی وفاشعار اور خدمت گزار بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے وفات پائی ۔ اسی لیے حضورؐ نے خود اس سال کو عام الحزن قرار دیا ۔

ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جو جاں نثاریاں کیں، اس سے کون انکار کر سکتا ہے ۔ وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپؐ پر نثار کرتے تھے ۔ آپؐ کی محبت و سرپرستی میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا ۔ آپؐ کی خاطر شعب ابی طالب میں محصور ہوئے، فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جدائی سے آنحضورؐ کے قلب مبارک پر بہت صدمہ ہوا ۔

ابوطالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا بھی انتقال ہو گیا ۔ حضرت خدیجہؓ سے آنحضورؐ کو بہت محبت تھی ۔ وہ آپؐ کے تمام مصائب و تکالیف میں آپؐ کے ساتھ رہیں ۔ سب سے پہلے وہی ایمان لائیں ۔ انہوں نے ہمیشہ آپؐ کی ہمت بندھائی اور مصیبتوں میں آپؐ کو تسلی دی ۔

ان دو ظاہری سہاروں کے ہٹ جانے کے بعد مخالفتوں کا طوفان اور بڑھ گیا تھا ۔ ایک بار دشمنان حق بیٹھے تذکرہ کر رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معاملہ میں جو کچھ ہم نے برداشت کیا ہے ۔ اس کی مثال نہیں ملتی ۔ اسی اثنا میں حضورؐ بھی وہیں تشریف لے آئے ۔ ان لوگوں نے آپؐ سے پوچھا کہ تم ایسا کہتے ہو؟ جواب میں "ہاں" کہنا تھا کہ چاروں طرف سے دھاوا بول دیا گیا ۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے کہ قریش کی طرف سے اس سے بڑھ کر حضورؐ کے خلاف میں نے کوئی دست درازی نہیں دیکھی ۔ ایک مرتبہ کسی بدبخت نے راہ چلتے حضورؐ کے سر پر کیچڑ ڈال دیا ۔ آپؐ گھر پہنچے تو حضرت فاطمہؓ نے دیکھا وہ زار و قطار رونے لگیں ۔ آپؐ کا سر مبارک دھویا اور کہنے لگیں "ابا جان! آپؐ لوگوں کو حق کی دعوت دیتے ہیں اور لوگ آپؐ کو ستاتے ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا "پیاری بیٹی! تو اس بات کا غم نہ کر ۔ تیرا آبا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس دعوت کو لے کر آیا ہے وہ ہر کچے اور پکے مکان تک پہنچ کر رہے گی اور اللہ تعالیٰ تیرے باپ کو بچا لے گا۔"

؎ یہ بی بی تھیں وہ ہمدرد یتیمی تھے محمدؐ کے
یہ دونوں غمگسار ان قدیمی تھے محمدؐ کے

("شاہنامہ اسلام" حفیظ جالندھری)

ج) سفرِ طائف

۱۔ اہلِ طائف کو دعوتِ حق

اہلِ مکہ کی طرف سے ظلم وستم کی انتہا ہو چکی تھی ان کی اکثریت دعوتِ حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شوال ۱۰ نبوی میں دل برداشتہ ہو کر طائف کا رُخ کیا تاکہ انہیں اسلام کی دعوت دی جائے۔ یہ مکے سے تقریباً ساٹھ میل دور ہے۔ آپؐ نے یہ مسافت آتے جاتے پیدل طے فرمائی تھی۔ آپؐ کے ہمراہ آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ تھے۔ راستے میں جس قبیلے سے گزر ہوتا اسے اسلام کی دعوت دیتے، لیکن کسی نے بھی یہ دعوت قبول نہ کی۔ جب طائف پہنچے تو قبیلہ ثقیف کے تین سرداروں کے پاس تشریف لے گئے جو آپس میں بھائی تھے اور جن کے نام یہ تھے: عبدیالیل، مسعود اور حبیب۔ حضورؐ نے ان کے پاس بیٹھنے کے بعد انہیں اللہ کی اطاعت اور اسلام کی مدد کی دعوت دی۔ انہوں نے نہایت گستاخانہ جواب دیئے۔ ایک نے کہا کہ "وہ کعبے کا پردہ پھاڑے، اگر اللہ نے تمہیں رسول بنایا ہو۔" دوسرے نے کہا: "کیا اللہ کو تمہارے علاوہ کوئی اور نہ ملا؟" تیسرے نے کہا: "میں بہرحال تجھ سے بات نہیں کر سکتا۔ تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلافِ ادب ہے اور جھوٹا ہے، (معاذ اللہ) تو گفتگو کے قابل نہیں۔"

۲۔ پتھروں کی بارش

ان بدبختوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ طائف کے بازاریوں کو اُبھار دیا کہ آپؐ کی ہنسی اڑائیں۔ شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ یہ مجمع دورویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا، جب آپؐ ادھر سے گزرے تو آپؐ کے پاؤں پر پتھر مارنا شروع کر دیتے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ ادھر حضرت زیدؓ ڈھال بن کر چلتے ہوئے پتھروں کو روک رہے تھے، جس سے ان کے سر میں کئی جگہ چوٹ آئی۔ جب آپؐ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے تھے۔ جب آپؐ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے۔ ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے جاتے۔

۳۔ باغ میں پناہ

آخر آپؐ نے ایک باغ میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا جو باوجود کفر کے شریف النفس تھا۔ یہ باغ طائف سے تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ عتبہ نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا، انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا۔ آپؐ نے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کیا۔ عداس نے کہا: "یہ جملہ تو اس علاقے کے لوگ نہیں بولتے۔" حضورؐ نے فرمایا: "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تمہارا دین کیا ہے؟" اس نے کہا: "میں عیسائی ہوں اور نینوا کا باشندہ ہوں۔" آپؐ نے فرمایا: "اچھا! تم مردِ صالح یونسؑ بن متی کی بستی کے رہنے والے ہو؟" اس نے کہا: "آپؐ یونسؑ بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا: "وہ میرے بھائی تھے۔ وہ نبی تھے اور میں بھی

نبی ہوں "یہ سن کر عداس حضورؐ پر جھک پڑا اور آپؐ کے سر اور ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد جب عداس واپس گیا تو عتبہ نے اس سے کہا "اجی! یہ کیا معاملہ تھا؟" اس نے کہا "میرے آقا! روئے زمین پر اس شخص سے بہتر کوئی اور نہیں۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے، جسے نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔ اس کے مالک نے کہا "دیکھو، کہیں یہ شخص تمہیں تمہارے دین سے پھیر نہ دے"۔

۴۔ بددعا کی بجائے دعا

اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا فرمائی۔ آپؐ بہت آزردہ اور پریشان حال تھے۔ اسی اثناء میں حضرت جبریلؑ حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ بھی تھا، جس نے سلام کے بعد عرض کیا "اگر آپؐ چاہیں تو میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان کچل دوں"۔ حضورؐ نے فرمایا "نہیں، مجھے امید ہے کہ اللہ عزوجل ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے گی"۔ پھر آپؐ نے دعا فرمائی "اے اللہ! میری اس قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ سمجھتے نہیں ہیں"۔

سفر طائف کا یہ واقعہ نہایت دردناک اور رقت انگیز داستان ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر جس صبر اور استقامت کا ثبوت دیا، وہ بلاشبہ آپؐ کی پیغمبرانہ عظمت و جلالت کی روشن دلیل ہے طائف میں اس قسم کے صبر آزما اور دلدوز حالات سے دوچار ہو کر حضورؐ پھر مکے واپس تشریف لے آئے۔ خانہ کعبہ کا طواف کیا، نماز ادا فرمائی اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔

میں ان کے حق میں کیوں قہرِ الٰہی کی دعا مانگوں
بشر ہیں بے خبر ہیں کیوں تباہی کی دعا مانگوں
الٰہی فضل کر کہسارِ طائف کے مکینوں پر
الٰہی پھول برسا پتھروں والی زمینوں پر
(شاہنامۂ اسلام۔ حفیظ جالندھری)

واقعۂ معراج اور بیعت عقبہ

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی یہ مسلماں سے معراج کی رات

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
(اقبالؒ)

سوال: مندرجہ ذیل پر مختصر اور جامع نوٹ لکھیے:۔

(ا) واقعہ معراج (ب) بیعتِ عقبۂ اُولیٰ (ج) بیعتِ عقبۂ ثانیہ

جواب: (ا)

واقعہ معراج

نبوت کے گیارہویں سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غم و حزن کو دور کرنے اور آپؐ کے مرتبہ و مقام کو اور بڑھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو آسمانوں کی سیر کرائی۔ اس تاریخی واقعہ کو معراج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (بنی اسرائیل: ۱)

ترجمہ: "وہ ذات پاک ہے، جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ یعنی (بیت المقدس) تک لے گیا، جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

معراج عروج سے نکلا ہے، جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، چونکہ احادیث میں آپؐ سے لفظ "عُرِجَ بِی" مروی ہے، جس کے معنی ہیں "مجھ کو اوپر چڑھایا گیا۔" اس لیے اس کا نام معراج پڑ گیا۔

واقعہ کی تفصیل

بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق ابوذر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں تھے کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ حطیم خانہ کعبہ میں آرام فرما رہے تھے۔ ان کے ساتھ چند اور فرشتے بھی تھے۔ پہلے وہ آپؐ کو چاہِ زمزم کے پاس لے گئے اور وہاں آپؐ کے سینۂ مبارک کو چاک کیا اور قلبِ اطہر کو نکال کر آبِ زمزم سے دھویا۔ اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان و حکمت سے معمور لایا گیا۔ حضرت جبرئیلؑ نے اس طشت سے ایمان و حکمت کے خزانہ کو لے کر آپؐ کے سینۂ مبارک میں رکھ کر اس کو برابر کر دیا۔

مسجد اقصیٰ میں

اس کے بعد خچر سے کچھ چھوٹا سپید رنگ کا ایک لمبا جانور براق نامی لایا گیا، جس کی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ اس کا ہر قدم وہاں پڑتا تھا جہاں نگاہ کی آخری حد ہوتی تھی۔ آپؐ اس پر سوار ہو کر بیت المقدس آئے اور براق کو اس حلقہ میں باندھ کر جس میں حضرات انبیائے کرامؑ اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے، آپؐ نے مسجد اقصیٰ کے اندر قدم رکھا اور تمام انبیائے کرامؑ کی جماعت کی امامت کر کے نماز پڑھائی۔ یہاں سے باہر تشریف لائے تو حضرت جبرئیل نے شراب اور دودھ کے دو پیالے آپؐ کے سامنے پیش کیے، آپؐ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ حضرت جبرئیلؑ

نے کہا: آپؐ نے فطرت کو پسند کیا۔ اگر شراب کا پیالہ اُٹھاتے تو آپؐ کی امت گمراہ ہو جاتی۔

آسمانوں پر نبیوں سے ملاقات

بعد ازاں حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لیکر آسمان پر چڑھے۔ پہلے آسمان پر آپؐ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ آپؐ نے انہیں سلام کیا، انہوں نے آپؐ کو مرحبا کہا۔ سلام کا جواب دیا اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان کے دائیں جانب سعادت مندوں کی روحیں اور بائیں جانب بدبختوں کی روحیں دکھلائیں دوسرے آسمان پر آپؐ کی ملاقات حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوئی۔ آپؐ نے سلام کیا۔ دونوں نے سلام کا جواب دیا، مبارک بادی اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔ تیسرے آسمان پر اسی انداز سے حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام اور چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اسی انداز میں ملاقات ہوئی۔ ساتویں آسمان پر آپؐ کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ آپؐ نے انہیں سلام کیا، انہوں نے جواب دیا، مبارک بادی اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔

سدرۃ المنتہیٰ

آگے بڑھ کر آپؐ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے، جو حضرت جبریل علیہ السلام کا آخری مقام ہے۔ اس درخت پر شانِ ربانی کا پرتو تھا، جس کی وجہ سے حسن و نور کی وہ کیفیت پیدا ہوئی۔ اور ایسے انوار کی تجلی نظر آئی جسے الفاظ ادا نہیں کر سکتے، یہاں پہنچ کر حضرت جبریل علیہ السلام اچانک رک گئے اور کہنے لگے کہ مجھے اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں اگر میں اس سے ذرا بھی آگے بڑھوں تو میرے پر جل جائیں گے۔ چنانچہ آگے آپؐ اکیلے تشریف لے گئے۔ اسی کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ؎

جلتے ہیں جبریل علیہ السلام کے پر جس مقام پر — اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہی تو ہو

(مولانا ظفر علی خاں)

؎ جبریل علیہ السلام مقام سدرہ سے گر آگے بڑھے، پر جل جائیں
محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے

بارگاہِ رب العزت

اب آپؐ کے سامنے رف رف نامی تخت نمودار ہوا، آپؐ اس پر سوار ہو کر انتہائی بلندیاں طے کرتے ہوئے بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوئے۔ اور آپؐ اللہ تعالیٰ کے اتنے قریب ہوئے کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ (النجم: ۸، ۹، ۱۰)

ترجمہ: "پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے، تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔ پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمائی تھی۔"

عطیاتِ الٰہی

اس وقت آپؐ کو بارگاہِ الٰہی سے تین عطیے مرحمت ہوئے۔ سورۂ بقرہ کی آخری آیات، جن میں اسلام کے عقائد و ایمان کی تکمیل ہوئی اور اس کے دورِ مصائب کے خاتمہ کی بشارت ہے۔ رحمتِ خاص نے خوشخبری سنائی کہ اُمتِ محمدی میں سے ہر ایک جو شرک کا مرتکب نہ ہوا ہو، کرمِ مغفرت سے سرفراز ہو گا اور ندا آئی امت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی گئی۔ آپؐ ان عطیات کو لے کر واپس پھرے اور حضرت موسیٰؑ کے پاس پہنچے۔ انہیں جب پچاس نمازوں کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا، آپؐ کی اُمت یہ بار نہ اٹھا سکے گی۔ واپس جایئے اور نمازیں کم کرائیے۔ آپؐ پھر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوئے تو دس نمازیں کم ہو گئیں۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر کمی کا مشورہ دیا۔ اسی طرح آمد و رفت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ صرف پانچ نمازیں باقی رہ گئیں۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر کمی کا مشورہ دیا۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا "اب مجھے اپنے رب سے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ میں اسی پر راضی ہوں۔" اللہ تعالیٰ سے ندا آئی میں نے اپنا فریضہ نافذ کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی لیکن پانچ نمازوں پر ثواب پچاس ہی کا ملے گا۔"

جنت کی سیر

بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق، سدرۃ المنتہیٰ سے گزر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت میں داخل ہوئے اور اس کی سیر کی۔ وہاں حضورؐ نے موتیوں کے قبے (گنبد) دیکھے اور جنت کی مٹی مشک تھی۔ نیز حضورؐ نے فرمایا: "جب میں جنت میں داخل کیا گیا تو اچانک میری ملاقات ابو طلحہؓ کی بیوی رمیصاءؓ سے ہوئی اور میں نے قدموں کی چاپ سُنی۔" میں نے پوچھا "یہ کس کے قدموں کی آواز ہے؟" جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ حضرت بلالؓ کے قدموں کی آواز ہے۔ پھر میں نے ایک قصر (محل) کو دیکھا جس کے صحن میں ایک نوجوان عورت بیٹھی ہوئی تھی؛ میں نے پوچھا "یہ قصر کس کا ہے؟" جنتیوں نے کہا: "ابن الخطابؓ کا ہے۔" میں نے چاہا اندر داخل ہو کر قصر کو دیکھوں، لیکن پھر تمہاری غیرت مجھ کو یاد آ گئی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ کیا میں آپؐ کے داخل ہونے پر غیرت کروں گا؟

سُبحان اللہ! کیا شان ہے صحابہ کرامؓ کی!

دوزخ کے عبرتناک مشاہدات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس موقع پر دور سے دوزخ کے کچھ عبرتناک مشاہدات بھی کرائے گئے۔

۱۔ آپؐ نے مالک، داروغہ جہنم کو دیکھا۔ وہ ہنستانہ تھا اور نہ اس کے چہرے پر خوشی اور بشاشت تھی۔

۲۔ آپؐ نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو یتیموں کا مال ظلماً کھا جاتے ہیں۔ ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے۔ اور وہ اپنے منہ میں پتھر کے ٹکڑوں جیسے انگارے ٹھونس رہے تھے جو دوسری جانب ان کے پاخانے کے راستے سے نکل رہے تھے۔

۳۔ آپؐ نے سود خوروں کو بھی دیکھا۔ ان کے پیٹ اتنے بڑے بڑے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے تھے اور جب آل فرعون کو آگ پر پیش کرنے کے لیے لے جایا جاتا تو ان کے پاس سے گزرتے وقت انہیں روندتے ہوئے جاتے تھے۔

۴۔ آپؐ نے زناکاروں کو بھی دیکھا۔ ان کے سامنے تازہ اور فربہ گوشت تھا اور اسی کے پہلو میں سڑا ہوا چھیچھڑا بھی تھا۔ یہ لوگ تازہ اور فربہ گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا چھیچھڑا کھا رہے تھے۔

۵۔ آپؐ نے ان عورتوں کو دیکھا جو اپنے شوہروں پر دوسروں کی اولاد داخل کر دیتی ہیں۔ ان کے سینوں میں بڑے بڑے ٹیڑھے کانٹے چبھا کر انہیں آسمان و زمین کے درمیان لٹکا دیا گیا تھا۔

معراج سے واپسی

ان سب واقعات سے فارغ ہو کر آپؐ پھر اس دنیا میں تشریف لے آئے اور لوگوں سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ چونکہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے غیر معمولی اور حیرت انگیز تھا، اس لیے آپؐ کے مخالفوں کو گویا مذاق کا ایک اور موقع ملا۔ روایت ہے کہ ابو جہل، حضرت ابو بکرؓ سے مل کر کہنے لگا "لو اور سنو! اب تمہارا دوست یہ کہتا ہے کہ اس نے راتوں رات ساتوں آسمانوں کی سیر کر لی ہے اور اپنے خدا سے مل کر آیا ہے۔ کیا تم یہ بات بھی مان لو گے؟" اس پر حضرت ابو بکرؓ نے کہا: "اگر یہ بات خدا کے رسولؐ نے فرمائی ہے تو خدا کی قسم! اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا اور میں سب سے پہلے اس کی تصدیق کرتا ہوں۔" اسی تصدیق کے صلے میں حضرت ابو بکرؓ کو دربارِ رسالت سے "صدیق" کا معزز لقب عطا کیا گیا۔

کفار نے آپؐ کی تکذیب کی اور آپؐ سے سوال کیا کہ بیت المقدس کی کیفیت بیان کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے بیت المقدس کو ظاہر فرما دیا اور وہ آپؐ کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ چنانچہ آپؐ نے قوم کو اس کی نشانیاں بتلانا شروع کیں اور ان سے کسی بات کی تردید نہ بن پڑی۔

واقعۂ معراج سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اب اسلام کا دورِ آزمائش ختم ہونے والا

ہے اور اس کے عروج و غلبہ کا دور قریب ہے۔

(ب) **بیعتِ عُقبہ اولیٰ ۱۱ نبوی**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے۔ رجب ۱۰ نبوی میں بھی آپؐ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے، قبیلہ خزرج کے چند اشخاص آپؐ کو نظر آئے۔ آپؐ نے ان سے نام و نسب پوچھا، انہوں نے کہا "خزرج"۔ آپؐ نے دعوتِ اسلام دی اور قرآن مجید کی آیات سنائیں ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا "دیکھو، یہود ہم سے اس اولیت میں بازی نہ لے جائیں"۔ یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا۔ یہ چھ شخص تھے۔ اس طرح اسلام کی یہ پہلی کرن یثرب میں نمودار ہوئی اور اسلام کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

دوسرے سال یعنی ۱۱ نبوی میں بارہ اشخاص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی۔ اس کے ساتھ اس بات کی خواہش بھی کی کہ احکامِ اسلام کے سکھانے کے لیے کوئی معلم ان کے ساتھ بھیجا جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ حضرت مصعبؓ ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور سابقینِ اسلام میں سے تھے۔ غزوۂ بدر میں لشکر کی علم برداری کا منصب انہی کو ملا۔ وہ مدینہ میں آ کر سعد بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے۔ انہوں نے نہایت حکیمانہ اور موثر انداز میں تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے۔ اس طرح روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے۔ رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف چند گھرانے باقی رہ گئے۔

قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ تھے۔ وہ زبردست شخصیت کے مالک تھے۔ قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ حضرت مصعبؓ نے ان کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی پہلے تو انہوں نے نفرت ظاہر کی، لیکن حضرت مصعبؓ سے قرآن کی آیات سنیں تو متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اب وہ اپنے قبیلے کے پاس آئے اور کہا "اچھا تو سنو! اب تمہارے مردوں اور عورتوں سے میری بات چیت حرام ہے، جب تک تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لاؤ"۔ ان کی اس بات کا یہ اثر ہوا کہ شام ہوتے ہوتے تمام قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ یہ اسلام کے لیے قابلِ رشک کامیابی تھی۔ اگلے موسم حج سے پہلے حضرت مصعبؓ کامیابی کی بشارتیں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت اقدس میں مکہ تشریف لائے اور آپؐ کو قبائلِ یثرب کے حالات، ان کی جنگی اور دفاعی صلاحیتوں اور خیر کی لیاقتوں

کی تفصیلات سنائیں، جس پر حضور اکرمؐ نے انتہائی تشکر کا اظہار فرمایا:

بیعتِ عقبہ ثانیہ ۱۲ سنہ نبویؐ

پہلی بیعت عقبہ کے ایک سال بعد یعنی ۱۲ سنہ نبویؐ میں بہتر اشخاص حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے (جو بت پرست) چھپ کر مقام منیٰ (عقبہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ بھی موجود تھے۔ اگرچہ وہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، لیکن ان میں خون کی محبت موجود تھی۔ ان بہتر انصاریوں سے فرمایا:

"گروہِ خزرج! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خاندان میں معزز و محترم ہیں۔ ہم ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ سپر رہے ہیں۔ اب وہ تمہارے یہاں جانا چاہتے ہیں۔ اگر تم لوگ مرتے دم تک ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتے ہو تو بہتر ہے، ورنہ ابھی صاف جواب دے دو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تم لوگ اس بات پر بیعت کرو کہ اپنے اہل وعیال کی طرح میری حفاظت کرو گے۔"

یہ سن کر حضرت براءؓ بن معرور انصاری نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ آپؐ نے ان سے بیعت لی۔ حضرت براءؓ نے عرض کی: یارسول اللہؐ! ہم نے پشت ہاپشت سے جنگ وجدل میں پرورش پائی ہے ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں۔" وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ حضرت ابوالہیثم نے بات کاٹ کر کہا "یارسول اللہؐ! ہم میں اور یہود میں جو تعلقات ہیں، وہ بیعت کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب آپؐ کو اقتدار حاصل ہو، اس وقت آپؐ ہم کو چھوڑ دیں اور اپنے وطن لوٹ جائیں۔" آپؐ نے مسکرا کر فرمایا "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے۔ تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔"

اس گفتگو کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جماعتِ انصار میں سے بارہ نقیب مقرر فرما کر ان سے بیعت لی۔ حضرت سعدؓ بن زرارہ نے کھڑے ہو کر اپنی جماعت سے کہا "بھائیو! خبر ہے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ بیعت عرب وعجم اور جن وانس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا "ہاں، ہم اسی پر بیعت کرتے ہیں۔"

بارہ شخص جو نقیب مقرر کئے گئے، رئیس القبائل تھے۔ ان کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا۔ صبح کو اس بیعت کی اڑتی سی خبر پھیلی۔ قریش انصار کے پاس آئے اور شکایت کی۔ انصار کے ساتھ جو بت پرست تھے، ان کو اس بات کی خبر نہ تھی۔ انہوں نے تکذیب کی کہ اگر ایسا ہوتا تو ہم سے کیوں چھپ سکتا تھا؟

اس طرح مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو اجازت

دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی۔ لیکن چوری چھپے مسلمانوں نے ہجرت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ اکثر صحابہؓ چلے گئے، صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ رہ گئے، جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے، وہ مدت تک نہ جا سکے گویا اب مرکز اسلام مدینہ منورہ کو منتقل ہو رہا تھا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے اہم واقعات

ایک نظر میں

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی

سوال:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کے اہم واقعات بیان کریں؟

جواب:۔ ۱۔ مخالفتوں کا طوفان:۔ مکی دور میں ایک ہنگامی اور مخالفتوں کا دور ہے۔ آپؐ نے رسول کی حیثیت سے دعوت حق پیش کی تو لوگوں نے اچانک آنکھیں پھیر لیں۔ پہلے وہ خود آپؐ کو صادق اور امین کہہ کر پکارتے تھے لیکن اب مخالفت پہ اتر آئے۔ کل تک جو شخص قوم کے لیے سرمایۂ افتخار تھے آج وہ اس کے بدترین دشمن اور مخالف بن گئے۔ کل تک بچہ

بچہ آپؐ کا احترام کرتا تھا لیکن اب یہی لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیر پر اُتر آئے تھے وہ شخص جو چالیس برس تک سچائی اور امانت و دیانت کی ہر آزمائش میں کھرا ثابت ہوا۔ توحید و رسالت کا پیغام سناتے ہی سرداران قریش کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ وہ خود غرضی کے بندے بن گئے۔ اور انہوں نے حق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور راہِ حق و صداقت کے بدترین دشمن بن گئے۔

۲۔ قریش کی مخالفت:۔ رسول اکرمؐ کے کردار میں نہ تو کوئی خامی تھی جو قریش کو آپؐ کی مخالفت پر اکساتی اور نہ آپؐ دولت، جاہ و حشمت اور حکومت کے خواہاں تھے بلکہ مخالفت کی وجہ محض خود غرضی تھی۔ قریش مکہ عرصہ دراز سے اپنی قوم کے سیاسی و مذہبی چودھری تھے۔ وہ عرب کے مشرکانہ مذاہب کے ٹھیکیدار اور مجاوری فریب کاری پر قائمؔ تھی یہ وہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ کوئی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔

۳۔ فسق و فجور:۔ قریش فسق و فجور کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ شراب، بدکاری، جوا، سود خوری، عورتوں کی تذلیل، بیٹیوں کا زندہ دفن کرنا، غلامی کا رواج، کمزوروں پر ظلم ڈھانا، قتل و غارت گری اور بری عادات پر فخر، یہ سب ان کی زندگی کے لوازمات تھے۔ وہ ان بُری عادتوں کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے جان لیا کہ دعوتِ محمدیؐ ان کی عادات، خواہشات اور ان کی معاشرت کی دشمن ہے چنانچہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اسلام کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔

۴۔ خُفیہ دعوتِ اسلام:۔ غارِ حرا میں پہلی وحی کے نزول کے بعد آپؐ گھر تشریف لائے تو جلالِ خداوندی سے لبریز تھے اب آپؐ خدا کی طرف سے دعوتِ حق پر باضابطہ طور پر مامور ہو چکے تھے۔ اس دعوتِ حق کو سب سے پہلے قبول کرنے والے حضرت خدیجہؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت زیدؓ تھے۔ دعوتِ حق کا یہ سلسلہ خفیہ اور دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوشش سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت طلحہؓ ایمان لائے۔ علاوہ ازیں حضرت عمارؓ، حضرت خبابؓ، حضرت ارقمؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت عبیدہؓ اور حضرت صہیب رومیؓ،

بھی اسی دور میں اسلام لائے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ایمان لانے والوں میں چھٹے یا ساتویں تھے۔ ان صحابہ رضؓ میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اعلیٰ درجے کے مذہبی یا قومی منصب پر فائز ہو۔ اس لیے قریش مکہ نے ان ایمان لانے والوں کو کوئی اہمیت نہ دی اور مذہبی قیادت اور سیاسی سرداری کے نشے میں مخمور رہے۔

۵۔ دعوتِ عام:۔ اب وقت آگیا تھا کہ لوگوں کو اعلانیہ اسلام کی جانب بلایا جائے۔ حکم خداوندی پہنچا:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ۔

"یعنی جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اسے واشگاف الفاظ میں کہہ دیجئے۔"

چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر تشریف لے گئے اور قوم کو پیغام حق سنایا۔ انکار کی صورت میں سخت عذاب کی وعید سنائی لیکن قوم نے اس پیغام پر کان نہ دھرا اور برہم ہو کر چلے گئے۔ اسی طرح آپؐ نے تمام خاندانِ عبدالمطلب کو کھانے پر جمع کیا۔ اور پیغام حق سنایا اور پوچھا کہ "کون اس مہم میں میرا ساتھ دیتا ہے" اس پر ایک سکوت چھا گیا۔

حضرت علی المرتضیٰؓ جو اس وقت تیرہ برس کے تھے اٹھ کر کہا کہ "اگرچہ میری پنڈلیاں کمزور ہیں لیکن میں اس مہم میں آپؐ کا ساتھ دوں گا۔" آپؐ کے خاندان نے اسے ایک مذاق سمجھا اور جنون سمجھا۔

۶۔ خفیہ نمازیں:۔ مخالف ماحول کی وجہ سے آنحضورؐ اور آپؐ کے ساتھی شہر سے باہر وادیوں اور گھاٹیوں میں چھپ کر نمازیں پڑھتے۔ مشرکینِ مکہ نے ایک بار انہیں دیکھ لیا اور عین حالتِ نماز میں انہیں برا بھلا کہا ایک مشرک نے تلوار نکال کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کو زخمی کر ڈالا۔ خون کی یہ پہلی دھار تھی جو خاکِ مکہ پر خدا کی راہ میں بہی۔

۷۔ تلواروں کا سامنا:۔ علانیہ کلمہ حق پکارنے کا حکم تو آ ہی چکا تھا۔ اب آپؐ نے اس کی تعمیل میں ایک دن حرمِ کعبہ میں توحید کا اعلان کیا۔ قریش مکہ نے اسے خانہ کعبہ کی توہین سمجھتے ہوئے تلواریں کھینچ لیں۔ حارثؓ بن ابی ہالہ آپؐ کو بچانے دوڑے۔ وہ تلواروں کی زد میں آ کر شہید ہو گئے۔ اسلام اور کفر کی کش مکش میں پہلی جان تھی جو راہِ خدا میں قربان ہوئی۔

۸۔ **دعوتِ حق کی مخالفت کے طریقے:۔** قریشِ مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیخلاف پروپیگنڈے اور گالیوں کا سہارا لیا۔ کہتے ہیں کہ اس شخص کی بات کیوں سنتے ہو۔ یہ اپنے آباؤ اجداد کے دین سے پھر گیا ہے۔ کبھی کہتے کہ "اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" (معاذاللہ) کبھی کہتے کہ "یہ شخص جادوگر اور کاہن ہے"۔ اور کبھی آپؐ کو شاعر ہونے کا الزام دیتے۔ شعرائے عرب آپؐ کے خلاف ہجویہ اشعار کہتے۔ یہ ساری مہم اس لیے تھی کہ لوگ آپ کی بات نہ سن سکیں۔ قرآن مجید کے مطابق انہوں نے مل کر طے کیا تھا:۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝

ترجمہ:۔ اور کفار کہتے تھے "قرآن کو سنو ہی نہیں۔ بس ہاؤ ہو کا خوب شور مچا کر اس میں رخنہ اندازی کرو۔"

۹۔ **مذاق اور تمسخر:۔** مشرکینِ مکہ آپؐ کا اور آپؐ کی تعلیمات کا مذاق اڑاتے بار بار پوچھتے کہ تمہارے نبی ہونے کی کوئی واضح نشانی کیا ہے؟ قرآن تھوڑا تھوڑا کیوں نازل ہو رہا ہے؟ پوری کتاب ایک ہی وقت میں آسمان سے کیوں نہیں اترتی؟ کبھی کہتے، فرشتوں کے جھنڈ ان کے سامنے زمین پر انسانوں کی طرح اتریں اور خود خدا ان کے سامنے ظاہر ہو جاتے۔ کبھی کہتے کہ تم تو ہماری طرح کے آدمی ہو، بازاروں میں چلتے پھرتے ہو۔ کھانا کھاتے ہو وغیرہ۔ جدھر سے حضورؐ کا گذر ہوتا انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہتے:۔

اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝

ترجمہ:۔ دیکھنا یہ ہیں وہ صاحب جنھیں اللہ نے رسول مقرر کیا ہے۔"

۱۰۔ **قیامت کب آئے گی:۔** مشرکین مذاق کے طور پر کہتے کہ اے محمدؐ! جس عذاب کی تم دھمکیاں دیتے ہو، اسے لے کیوں نہیں آتا: نافرمانوں پر آسمان کا کوئی ٹکڑا کیوں نہیں توڑ گراتے ہو؟ قیامت کا حادثہ کب ہونے والا ہے کیا اس کی کوئی تاریخ یا گھڑی مقرر نہیں؟ مذاق و تمسخر کے اس طوفان سے حضورؐ اور حضورؐ کے ساتھی پوری ثابت قدمی سے گزرتے رہے اور دعوتِ حق کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ لیکن قریش کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی۔

۱۱۔ **غنڈہ گردی:۔** اب قریش غنڈہ گردی پر اتر آئے تھے۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت شور مچاتے۔

حالتِ نماز میں گندگی اور غلاظت آپؐ پر ڈالتے۔ اوباش لڑکوں کو پیچھے لگا دیتے قرآن اور قرآن پڑھنے والوں کو گالیاں دیتے۔ اس معاملے میں ابولہب اور اس کی بیوی پیش پیش تھی۔ لیکن حضورؐ ان تمام رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لاتے۔ اور دعوتِ حق کو جاری رکھا۔

۱۲۔ حمایت سے محروم کر دینے کی کوشش:۔ قریش نے بھرپور کوشش کی کہ آپؐ کو آپؐ کے حامیوں سے محروم کر دیا جائے۔ قریش کا ایک وفد آپؐ کے چچا ابوطالب کے پاس پہنچا اور مطالبہ کیا، کہ وہ اپنے بھتیجے کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ چچا نے آپؐ کو سمجھانا چاہا تو آپؐ کا جواب یہ تھا کہ "خدا کی قسم! یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ کر چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں تو پھر بھی اس سے باز نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کر دے یا میں اسی جدوجہد میں ختم ہو جاؤں۔"

۱۳۔ قبائل عرب کو اکسانا:۔ قریش نے آپؐ کے ساتھیوں پر سختیاں کرنے کے لیے تمام قبائلِ عرب کو اکسانا شروع کر دیا۔ چنانچہ جہاں کہیں کوئی مسلمان تھا اس پر ظلم ڈھایا جانے لگا۔ لیکن یہ مظالم کسی ایک مسلمان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔

۱۴۔ حج کے موقع پر تبلیغ:۔ حج کے موسم میں عرب کے قبائل جوق در جوق مکہ معظمہ آتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا پیغام پھیلانے کے لیے خیمہ بہ خیمہ جاتے۔ حج کی طرح آپؐ میلوں کے اجتماعات میں بھی دعوتِ حق پیش کرتے۔ ابوجہل آپؐ کے ساتھ لگا رہتا۔ مٹی اٹھا اٹھا کر آپؐ پر پھینکتا اور کہتا کہ "لوگو! اس کے قریب نہ جانا۔ یہ چاہتا ہے کہ تم لات اور عزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔" مخالفین اسلام ہر اہم شخصیت کو جب وہ مکے میں آتی۔ حضورؐ کی ملاقات سے روکتے مگر اس کا الٹا اثر ہوا۔

۱۵۔ قریش کی ایک اور چال:۔ قریش نے حضورؐ کو دعوتِ حق سے روکنے کے لیے سودا بازی کی اور عتبہ بن ربیعہ کو حضورؐ کی خدمت میں بھیجا، جس نے یہ پیش کش کی:۔

۱۔ اگر دولت چاہتے ہو تو اتنی دولت جمع کر دیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار بن جاؤ۔

۲۔ سردار یا بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ اور سردار تسلیم کر لیتے ہیں۔

۴۔ اگر مقصد کسی حسین عورت سے شادی ہے تو عرب کی حسین ترین عورت سے شادی کا انتظام کئے دیتے ہیں۔

یہ تمام باتیں بڑے سے بڑے پاکباز کو بھی ڈگمگانے کے لیے کافی تھیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سورہ حم کی آیات تلاوت فرمائیں ، عتبہ جب وہاں سے رخصت ہوا تو اس کا رنگ بدل چکا تھا۔

۱۶۔ **ہجرت حبشہ :۔** جب قریش مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ پہلے گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل گروہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ مسلمان کچھ عرصہ حبشہ میں رہے اور یہ افواہ سن کر کہ قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے مکے لوٹ آئے لیکن یہ افواہ غلط تھی۔ قریش کا جبر و تشدد اور شدت اختیار کر گیا اور اب کی بار ۸۵ مردوں اور ۱۷ عورتوں کا قافلہ حبشہ پہنچا۔ قریش نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ لیکن وہاں کے انصاف پسند بادشاہ نجاشی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔

۱۷۔ **اسلام کی قوت میں اضافہ :۔** اب حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ اور قریش کے فرزند حضرت عمرؓ بھی ایمان لے آئے تھے۔ ان دونوں کا اسلام قبول کر لینا صد درجہ تقویت کا باعث بنا اور حضرت عمرؓ نے تو علی الاعلان حرم کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام اب ایک قوت بن کر ابھرے گا۔

۱۸۔ **شعب ابی طالب :۔** مکے کے تمام قبائل نے محرم ۷ھ نبوی میں ایک معاہدہ کیا اور طے پایا کہ خاندان بنو ہاشم کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اور ان سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ بنو ہاشم بے بس ہو کر شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہوئے۔ نظر بندی کا یہ انتہائی سخت دور تین سال تک رہا اور حالت یہ ہو گئی کہ درختوں کے سوکھے پتے اور سوکھے چمڑے ابال ابال کر کھائے جانے لگے اور بچے بھوک سے تڑپنے لگے۔ آخر قریش ہی کے ایک خدا ترس شخص ہشام بن عمرو کی کوششوں سے یہ ظالمانہ فیصلہ ختم ہوا۔

۱۹۔ **غم کا سال :۔** نبوت کے دسویں سال آپؐ کے شفیق چچا ابوطالب وفات پا گئے اور دشمنوں سے حفاظت کا واحد ظاہری سہارا بھی آپؐ سے چھن گیا۔ اسی سال سے آپؐ کی مونس و غمگسار بیوی حضرت خدیجہؓ کا بھی انتقال ہو گیا ان دو سہاروں کے چھن جانے سے قریش مکہ اور بے باک ہو گئے۔ اور مخالفت کا طوفان اور ~~تیز ہو گیا~~ اس سال کو غم کا سال کہتے ہیں۔

۲۰۔ طائف میں دعوتِ حق:۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ مکے کے لوگوں پر تبلیغ بے اثر ہو رہی ہے تو مکے سے باہر تبلیغِ دین کا ارادہ فرمایا۔ حضورؐ مکے سے پیدل چلے اور راستے میں قبائل کو دعوتِ حق دیتے طائف پہنچے۔ یہاں کے لوگ خوشحال مگر خدا فراموش اور بد اخلاق تھے۔ حضورؐ نے رئیسانِ طائف کے سامنے اسلام پیش کیا لیکن ہر ایک نے ایک دوسرے سے بڑھ کر حق کی مخالفت کی اور بازاری لڑکوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا کہ وہ پتھر مار مار کر آپؐ کو شہر سے باہر نکال دیں۔ پتھروں سے آپؐ کے جوتے خون سے بھر گئے آپؐ نے بے دم ہو کر شہر سے باہر انگور کے ایک باغ میں پناہ لی۔ اتنی اذیت اور تکلیف اٹھانے کے باوجود حضورؐ نے اہلِ طائف کیلئے کوئی بد دعا نہ کی۔ پہاڑوں کا فرشتہ حاضر ہوا کہ اگر آپؐ اجازت دیں تو اہلِ طائف پر پہاڑ الٹ دوں۔ لیکن رحمۃ اللعلمین نے یہ گوارا نہ فرمایا بلکہ ان کی ہدایت کے لیے دعا فرمائی۔

۲۱۔ معراج شریف:۔ واقعہ طائف کے بعد رسول اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے معراج سے سرفراز فرمایا۔ حضورؐ رات کے مختصر سے حصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تشریف لے گئے۔ وہاں تمام انبیائے کرامؑ کی امامت فرمائی۔ پھر آسمانوں سے گزر کر عرشِ الٰہی تک پہنچے اور حضورؐ کو قربِ الٰہی کا انتہائی بلند مقام نصیب ہوا جو کسی اور نبیؑ کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہ معراج جسمانی تھی۔ اس میں نمازِ پنجگانہ فرض ہوئی۔

۲۲۔ ہجرت مدینہ:۔ ان کٹھن حالات میں یثرب (مدینہ) کے کچھ نوجوان بڑے خلوص کے ساتھ اسلام لائے۔ پہلی بیعت عقبہ اور دوسری بیعت عقبہ میں اہلِ یثرب کے قبیلوں اوس و خزرج کے متعدد افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ اب حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کو یثرب کی طرف ہجرت کی اجازت دیدی۔ اور بعد میں حکمِ خداوندی کے تحت حضورؐ نے بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہمراہی میں سفرِ ہجرت فرمایا۔ قریش نے آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ وہ آپؐ کے قتل کے درپے تھے لیکن حضورؐ صحیح سلامت وہاں سے تشریف لے گئے اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ حضرت علیؓ بلا خوف و خطر حضورؐ کی ہدایت پر حضورؐ کے بستر پر سو گئے۔ دشمن حضرت علی المرتضیٰؓ کو بستر پر پا کر بہت سٹپٹائے۔ دورانِ سفر آپؐ تین روز غارِ ثور میں رہے اور دشمنانِ دین آپؐ کی تلاش میں سر مارتے رہے۔ سراقہ آپؐ تک پہنچا بھی لیکن کرشمۂ قدرت سے اسے ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ بریدہ اسلمی ستر ہمراہیوں کے ساتھ انعام کے لالچ میں تلاش کو نکلا لیکن سامنے آیا تو کایا پلٹ گئی اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اسلام لے آیا۔ اس طرح ہجرتِ مدینہ کے ذریعہ اسلام ایک پُرشکوہ دور میں داخل ہوا۔

ہجرت مدینہ ۱ھ

اسلام کی قوت و شوکت کا آغاز

سوال: ہجرت مدینہ کے اسباب، واقعات اور اہمیت بیان کیجیے۔

جواب: **ہجرت کا مفہوم** اسلامی اصطلاح میں صرف اللہ کے دین کی خاطر اپنے وطن اور گھر بار کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جانا، جہاں دین کے تقاضے پورے ہو سکیں اور اسے نافذ و قائم کیا جا سکے۔ ہجرت کہلاتا ہے۔ ہجرت حضرات انبیائے کرامؑ کی قدیم سُنت ہے، مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلسل تیرہ سال یہ جدوجہد فرمائی کہ کفار کے دلوں کو شرک اور بت پرستی سے پاک کیا جائے، مکہ کے وہ نفوس جن کے اندر کچھ بھی قبولِ حق کی صلاحیت تھی۔ ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہو چکے ہیں، لیکن ان کی اکثریت بدستور ہٹ دھرمی اور شدید ترین مخالفت و دشمنی پر قائم کی تھی اس لیے آپؐ نے حکمِ الٰہی کے مطابق مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

ہجرت مدینہ کے اسباب :-

۱۔ **اہل مکہ کی عصبیت و ہٹ دھرمی** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لگاتار تیرہ سال تک شدید ترین مخالفت و دشمنی کے باوجود اہلِ مکہ کو دعوتِ اسلام دیتے رہے۔ لیکن سوائے چند سلیم الفطرت نفوس کے ان کی اکثریت بدستور انتہائی عصبیت و ہٹ دھرمی پر قائم رہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ زمین قبولِ حق کے لیے محض بنجر ہو کر رہ گئی ہے۔ اہلِ مکہ اپنے آبائی اعتقاد و نظریات چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ کیونکہ اس سے ان کے جھوٹے وقار اور عظمت کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ وہ اپنے خود ساختہ معبودانِ باطل کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ حضورؐ نے مکہ کے نواحی علاقوں میں بسنے والے عرب قبائل اور اہلِ طائف کو بھی اسلام کی دعوت دی، مگر وہ بھی عصبیت و ہٹ دھرمی میں قریش سے مختلف نہ نکلے۔ ان حالات میں مکہ میں رہ کر اسلام کا نفاذ و قیام امرِ محال تھا اس لیے آپؐ نے اس مقصد کے حصول کے لیے کسی نئے مرکز کا انتخاب پسند فرمایا۔

۲۔ قریش کی سرداری وقیادت کو خطرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں قریش کو اپنی سرداری و قیادت خطرے میں نظر آتی تھی۔ وہ اپنے زعم باطل میں خود کو خانہ کعبہ کا متولی اور مجاور سمجھتے تھے اور اس وجہ سے قبائل عرب ان کی سرداری وقیادت کا دم بھرتے تھے اور ان کے اطاعت گزار تھے۔ لہٰذا وہ کسی قیمت پر آنحضرت ؐ کے وجود کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔

۳۔ مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا

وطن سے محبت ولگاؤ ایک فطری امر ہے۔ اسی تقاضے کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنے وطن مکہ کو چھوڑنا پسند نہ فرماتے تھے اور پھر بیت اللہ اسی مکہ میں شروع سے مرکز اسلام تھا۔ لیکن حضور ؐ کے سامنے جو عظیم مقصد تھا یعنی اسلام کو پوری دنیا میں غالب کرنا۔ وہ یہاں رہتے ہوئے پورا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ اب کفار مکہ کے ظلم وستم حد سے بڑھ گئے تھے۔ یہ تو مسلمانوں کے صبر واستقامت کا کمال تھا۔ جس نے کفار کو کامیاب نہ ہونے دیا، ورنہ انہوں نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ چنانچہ جب حضور ؐ نے دیکھا کہ مسلمانوں کے لیے اسلام کی تبلیغ تو کیا، خود اسلام پر آزادی سے کاربند وقائم رہنا بھی محال ہوتا جا رہا ہے تو آپ ؐ نے دین کی حفاظت کی خاطر ہجرت کی اجازت دے دی۔

۴۔ ہجرت حبشہ کا کامیاب تجربہ

مسلمان اس سے پہلے بھی ایک بار حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے اور اپنے اس تجربہ میں وہ کامیاب رہے تھے اور وہ وہاں آزادی اور امن وچین سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کامیاب تجربے سے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے سوچا کہ وہ ہجرت کے ذریعے ہی اسلام پر صحیح طور پر عمل کر سکتے ہیں اور اسے فروغ وترقی دے سکتے ہیں۔ اگرچہ حبش میں مسلمان امن وامان سے رہتے رہے تھے، لیکن مقصد صرف اتنا نہ تھا۔ بلکہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اسلام کو مکمل غلبہ حاصل ہو۔ چنانچہ ہجرت کے لیے کسی ایسے علاقے کی ضرورت تھی جو عرب میں واقع ہو اور جس کی آبادی اسلام کے لیے ہر قسم کی قربانی پر آمادہ ہو چنانچہ اس مقصد کے لیے مدینہ سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔

۵۔ ابوطالب کا مشورہ

ابوطالب، حضور ؐ کے مہربان وشفیق اور ہمدرد وسرپرست چچا تھے۔ وہ ایک جہاندیدہ، مدبر اور صائب الرائے شخص تھے۔ انہوں نے بھی قریش کی شدید مخالفت ودشمنی کے پیش نظر حضور ؐ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مکے کے لوگ تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے، لہٰذا تم یثرب کی طرف چلے جانا، وہ تمہارا ننھیال بھی ہے اور وہاں کے لوگ اچھی فطرت کے مالک ہیں، وہ ضرور تمہارا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ حضور ؐ

کے پیش نظر اپنے چچا کا یہ مشورہ بھی تھا

۶۔ اہل مدینہ کا قبول اسلام

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، مکہ کی سرزمین قبولِ حق کے لیے بنجر ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نفاذ و غلبہ کے لیے ایک اور راہ کھول دی۔ آخر حق کی روشنی مدینہ تک پہنچ ہی گئی۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانی کے ذریعے اسلام کا پودا مدینہ میں مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی اس لیے اب مدینہ میں اسلام کے لیے راہ ہموار ہو چکی تھی اور یہ پودا ایک دن تناور درخت بننے والا تھا۔

۷۔ مدینہ کی دفاعی اہمیت

اسلام صرف چند عبادات و رسوم ہی کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسے سیاسی استحکام کے ذریعے پوری دنیا میں غالب کرنا اصل مقصد ہے۔ مدینہ ہی اس معیار پر پورا اترتا تھا اس کے تین اطراف پہاڑ تھے۔ اس لیے اس کی دفاعی حیثیت بڑی مضبوط تھی۔ صرف ایک طرف سے راستہ کھلا تھا۔ جہاں سے دشمن کے حملہ کا امکان ہو سکتا تھا، لیکن اس کا دفاع آسانی سے کیا جا سکتا تھا پھر اس لحاظ سے بھی اہلِ مدینہ کی اہمیت بہت زیادہ تھی کہ یہاں سے اہلِ مکہ پر معاشی دباؤ ڈالا جا سکتا تھا، کیونکہ شام سے مکہ جانے والے تمام تجارتی قافلے مدینہ کے قریب سے گزرتے تھے۔ قریش مکہ اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے۔

۸ حضورؐ کے قتل کی سازش

جب کفار مکہ نے دیکھا کہ وہ تمام تر ظلم و ستم کے باوجود اہلِ حق کا راستہ نہیں روک سکے اس کے برعکس وہ اور زیادہ استقلال و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور روز بروز اسلام کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور باہر کے لوگ بھی اسلام قبول کر رہے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اہلِ مدینہ نہ صرف اسلام قبول کر چکے ہیں بلکہ وہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو قبول کرنے اور انہیں تحفظ دینے کو تیار ہیں تو ان کی آتشِ غضب اور بھڑک اٹھی۔ چنانچہ انہوں نے یہ گھناؤنا فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہادیٔ برحقؐ کا قصہ تمام کر دیا جائے۔ (معاذ اللہ)۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دارالندوہ میں ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا، جس میں روسائے قریش شریک تھے۔ ایک تجویز پیش کی گئی کہ حضورؐ کو اپنے شہر سے جلا وطن کر دیں۔ لیکن اس تجویز کو رد کر دیا گیا۔ ایک تجویز یہ پیش ہوئی کہ حضورؐ کو لوہے کی بیڑیوں میں جکڑ کر قید کر دیا جائے۔ لیکن اسے بھی رد کر دیا گیا۔ اب اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر قبیلے سے ایک مضبوط جوان لیا جائے۔ پھر سب مل کر بیک وقت حضورؐ پر تلواروں سے وار کریں اور کام تمام کر دیں،

(معاذ اللہ) تاکہ کسی ایک شخص سے انتقام نہ لیا جا سکے۔ سب نے اس تجویز کو پسند کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

۹۔ حکم الٰہی یہ تو ظاہری اسباب تھے۔ لیکن اصل حقیقی اور سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ کو ہجرت کرنے کا حکم مل گیا تھا۔ رسولؐ کا ہر فعل وحی الٰہی اور حکم خداوندی کے تابع ہوتا ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی منشاء اور رضا تھی، حضورؐ مکہ میں مقیم رہے اور جب منشائے الٰہی اور مشیت ایزدی کو منظور ہوا، آنحضرتؐ ہجرت پر آمادہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہی تمام حکمتوں اور مصلحتوں کو خوب سمجھتا ہے۔ اب حکمت اور مصلحت اسی میں تھی کہ ہجرت کا اہتمام کیا جائے۔

ہجرت مدینہ کے واقعات:۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم ہجرت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کفار مکہ نے یہ سازش مکمل کر لی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کر کے آپؐ کا خاتمہ کر دیا جائے (معاذ اللہ)۔ چنانچہ انہوں نے طے شدہ منصوبے کے مطابق حضورؐ کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا۔ اہل عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لیے باہر ٹھہرے رہے کہ حضورؐ نکلیں تو یہ سازش مکمل کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی تاہم آپؐ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ وہ اپنی امانتیں حضورؐ ہی کے پاس رکھتے تھے۔ اس وقت بھی آپؐ کے پاس بہت سی امانتیں تھیں۔ آپؐ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی اس بناء پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے۔ تم میرے بستر پر سو جاؤ صبح کو سب کی امانتیں واپس کر کے آ جانا۔ تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچے گا۔ چنانچہ حضرت علیؓ حضورؐ کی چادر مبارک اوڑھ کر بے خطر سو رہے۔

۲۔ آنحضرتؐ کی بحفاظت روانگی کفار مکہ ننگی تلواریں لیے حضورؐ کے گھر کو گھیرے ہوئے تھے۔ لیکن رات کے پچھلے پہر حضورؐ گھر سے باہر تشریف لائے۔ اس وقت حضورؐ سورہ یٰسین کی تلاوت فرما رہے تھے۔ آپؐ نے مشرکین کی صفیں چیریں، ایک مٹھی بھر مٹی ان کے سروں پہ ڈالی۔ اللہ نے ان کی نگاہیں پکڑ لیں اور وہ آپؐ کو دیکھ نہ سکے۔ آپؐ وہاں سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے گھر پہنچے۔ ان سے پہلے سے ہجرت کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ حضورؐ کی رفاقت ان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے دو اونٹنیاں پال رکھی تھیں حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ نے سفر کا سامان کیا اور دو تین دن کا کھانا توشہ دان میں رکھا

اس کے بعد حضورؐ خانہ کعبہ کی طرف آئے اور فرمایا:

"مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔"

۳۔ گھر سے غار تک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ مکہ سے باہر نکلے اور جنوب کا راستہ اختیار کیا جبکہ مدینہ کا راستہ شمال کو جاتا تھا۔ آپؐ تین میل کا فاصلہ طے کر کے غارِ ثور میں پہنچے۔ یہ نہایت بلند اور مشکل چڑھائی والا پہاڑ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور غار میں جا پہنچے۔ پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے غار کی صفائی کی اور اس کے سوراخ بند کر دیئے۔ دو سوراخ باقی بچ رہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان پر اپنے پاؤں رکھ دیئے۔ پھر حضورؐ اندر تشریف لائے اور حضرت ابوبکرؓ کی آغوش میں سر رکھ کر سو گئے۔ اُدھر حضرت ابوبکرؓ کے پاؤں میں کسی چیز نے ڈس لیا، مگر اس ڈر سے ہلے بھی نہیں کہ حضورؐ جاگ نہ جائیں۔ لیکن اُن کے آنسو حضورؐ کے چہرے پر ٹپک گئے اور آپؐ کی آنکھ کھل گئی۔

آپؐ نے فرمایا "ابوبکرؓ! تمہیں کیا ہوا؟ عرض کی میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! مجھے کسی چیز نے ڈس لیا ہے۔ حضورؐ نے اس پر لعاب دہن لگا دیا اور تکلیف جاتی رہی۔

حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور قریش کی خبریں حضورؐ سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہ بکریاں چراتا رہتا اور رات کو غار میں دودھ پہنچا دیتا۔ اس کے علاوہ حضرت اسماءؓ بھی روزانہ شام کو غار میں کھانا پہنچا آتیں۔ اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں۔

۴۔ قریش کی تگ و دو

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو بستر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے حضرت علیؓ تھے۔ ظالموں نے آپؓ کو پکڑ کر اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر قید میں رکھا اور چھوڑ دیا۔ اس کے بعد قریش نے ایک ہنگامی اجلاس کر کے یہ طے کیا کہ ان دونوں کو ہر قیمت پر گرفتار کیا جائے۔ انہوں نے مکے سے نکلنے والے تمام راستوں پر سخت پہرہ بٹھا دیا اور یہ اعلان کیا کہ جو کوئی حضورؐ کو یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اسے سو اونٹوں کا انعام دیا جائے گا۔ اس اعلان کے نتیجہ میں سوار، پیادے اور کھوجی نہایت سرگرمی سے تلاش میں لگ گئے۔

آخر وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے پاؤں دیکھے تو غمزدہ ہوتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں۔ آپؐ نے فرمایا:

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ؕ (التوبہ : ۴۰)

یعنی ، غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے ۔"

ایک روایت کے مطابق غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا اور ببول کے درخت پر کبوتر نے گھونسلا بنا کر اس میں انڈے دے رکھے تھے ۔ اس لیے کفار کو شبہ تک نہ ہو سکا کہ اس غار کے اندر کوئی چھپا ہوا ہے ۔

۵۔ مدینہ کو روانگی

چوتھے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار سے نکلے ۔ عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا ، رہنمائی کے لیے اجرت پر مقرر کیا گیا ۔ ایک رات دن برابر چلتے گئے ۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت ایک چٹان کے سائے میں آرام کیا ۔ وہاں ایک چرواہا مل گیا ، اس کی بکری کے دودھ نے غذا کا کام دیا ۔ اسی سفر میں آپؐ کا گزر ام معبد خزاعیہ کے خیمے سے ہوا ۔ وہاں ایک کمزور دبلی پتلی بکری بندھی تھی ۔ آپؐ نے اس خاتون سے اجازت لے کر اس بکری کو دوہا تو تمام برتن دودھ سے بھر گئے ۔ حضورؐ نے دودھ نوش فرمایا ۔ کچھ دیر بعد اس خاتون کا شوہر آیا تو خاتون نے بڑے جامع اور خوبصورت انداز میں حضورؐ کا حلیہ مبارک بیان کیا ، جس سے وہ بہت متاثر ہوا ۔ حسن اتفاق سے حضرت زبیرؓ شام سے مال تجارت لے کر آ رہے تھے ۔ انہوں نے آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کیے جو اس موقع پر غنیمت تھے ۔

۶۔ سراقہ کا تعاقب

رہبر نے حفاظت کے خیال سے وہ راستہ اختیار کیا جو عام طور پر زیادہ نہیں چلتا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ایک شخص سراقہ بن مالک نے انعام کے لالچ میں حضورؐ کا پیچھا کیا ۔ جب گھوڑا دوڑ کر قریب آیا تو گھوڑے نے ٹھوکر کھائی ۔ وہ گر پڑا ۔ ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں ؟ جواب میں "نہیں" نکلا ۔ لیکن سو اونٹوں کے لالچ میں دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا ۔ اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے ۔ گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی ۔ اب بھی وہی جواب تھا ۔ لیکن بار بار کی ناکامی نے اس کی ہمت پست کر دی اور اسے یقین ہو گیا کہ کوئی غائبانہ قوت ان کی محافظ ہے ۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجیے ۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامرؓ بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا ۔ پھر یہی سراقہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گیا ۔ حضورؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ سراقہ ! میں تمہارے ہاتھ میں کسریٰ ایران کے سونے کے کنگن دیکھتا ہوں ۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی ۔

۷۔ قبا میں قیام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سفرِ ہجرت کے دوران سولہ مقامات پر قیام فرمایا۔ مدینہ میں حضورؐ کی آمد کی اطلاع کئی دن پہلے پہنچ چکی تھی اور لوگ ہر روز شہر سے باہر آکر راہ دیکھا کرتے تھے۔ قدم بوسی کی پہلی جگہ مقام قبا ہے۔ یہ آبادی مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز حضرت عمروؓ بن عوف کا خاندان تھا اور حضرت کلثومؓ بن الہدم خاندان کے افسر تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ حضورؐ نے انہی کی مہمانی قبول کی۔ انصار ہر طرف سے جوق در جوق آتے اور جوشِ عقیدت کے سلام عرض کرتے۔ اکثر اکابر صحابہؓ حضورؐ سے پہلے مدینہ میں آچکے تھے۔ وہ بھی انہی کے گھر میں اترے تھے۔ حضرت علیؓ بھی یہیں حضورؐ سے آن ملے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قبا میں ۱۴ دن قیام فرمایا اور یہاں اپنے دستِ مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی جو مسجدِ قبا کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپؐ خود بھی کام کرتے تھے۔ اسی مسجد کی شان میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ (توبہ : ۱۰۸)

ترجمہ: وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن تقویٰ و پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں قیام کرو۔

۸۔ مدینہ منورہ میں والہانہ استقبال

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) آنحضرتؐ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز کا وقت آگیا، جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی۔ نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ یہ حضورؐ کی سب سے پہلی نماز جمعہ اور سب سے پہلا خطبۂ نماز تھا۔ لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر ہوئی تو ہر طرف سے جوشِ مسرت سے پیش قدمی کے لیے دوڑے۔ آپؐ کی ننھیالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج سج کر آئے۔ قبا سے مدینہ تک دو رویہ جانثاران کی صفیں تھیں۔ راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے۔ ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا حضورؐ یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے۔ آپؐ مسرت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے۔ شہر قریب آگیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گیت گانے لگیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا	چاند نکل آیا ہے	مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا	ہم پر خدا کا شکر واجب ہے	مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں

معصوم بچیاں دف بجا بجا کر گیت گاتی تھیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَارِ — ہم خاندانِ نجار کی لڑکیاں ہیں
یَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ — محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اچھا ہمسایہ ہے۔

حضورؐ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا "کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟" بولیں "ہاں"، فرمایا کہ میں بھی تم کو چاہتا ہوں۔"

۔ مسلمانوں کے بچے بچیاں مسرور تھے سارے — گلی کوچے خدا کی حمد سے معمور تھے سارے
نبوت کی سواری جس طرف سے ہو کے جاتی تھی — درود و نعت کے نغمات کی آواز آتی تھی

(شاہنامۂ اسلام۔ حفیظ جالندھری)

۹۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ۔ میزبان رسولؐ

جہاں اب مسجد نبویؐ ہے اس سے متصل حضرت ابوایوب انصاریؓ کا گھر تھا۔ حضورؐ کی سواری یہاں پہنچی۔ سخت کش مکش تھی کہ حضورؐ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ سعادت حضرت ابوایوبؓ کے حصہ میں آئی۔ ان کا مکان دو منزلہ تھا، انہوں نے بالائی منزل پیش کی، لیکن حضورؐ نے زائرین کی آسانی کے لیے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ حضرت ابوایوبؓ دو وقت آپؐ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپؐ جو چھوڑ دیتے حضرت ابوایوبؓ اور ان کی زوجہ کے حصہ میں آتا۔ کھانے میں جہاں حضورؐ کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا، حضرت ابوایوبؓ تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا۔ اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے نہ چلا جائے اور حضورؐ کو تکلیف نہ ہو۔ گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، حضرت ابوایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔

حضورؐ نے سات ماہ تک یہیں قیام فرمایا۔ اس اثناء میں جب مسجد نبویؐ اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپؐ نے نقل مکان فرمایا۔ اسی دوران حضورؐ کی صاحبزادیاں اور بیویاں بھی مدینہ منورہ تشریف لے آئیں۔

ہجرت مدینہ کے نتائج و اہمیت

تاریخِ اسلام میں ہجرت مدینہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بظاہر اس سے مسلمانوں کی بے بسی اور کمزوری کا اظہار ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ واقعہ اسلام کی قوت و شوکت اور عروج کی بنیاد بنا۔ گویا اسلام کا مرکز مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ منتقل ہوا۔ اسی عظیم الشان واقعہ سے ہجری سال کا نام پڑا۔ کاروانِ اسلام کا یہ سنگِ میل ہے۔ جہاں محکومی و مظلومی ختم ہوتی ہے اور فرمانروائی کا دور شروع ہوتا ہے۔ ذیل میں ہجرت مدینہ کے اہم نتائج و اثرات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ پُرامن ماحول

کفار مکہ نے نہ صرف اسلام کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا، بلکہ انہوں نے اہلِ ایمان پر بے پناہ ظلم وستم ڈھائے تھے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے کفار کے ظلم وستم سے کلی طور پر نجات پائی اور انہیں مدینہ میں ایسا پرسکون و پرامن ماحول میسر آیا، جہاں وہ امن وچین سے زندگی بسر کر سکتے تھے اور اسلامی اعمال وعبادات کو آزادی کے ساتھ سرانجام دے سکتے تھے۔

۲۔ اسلامی معاشرے کا قیام

ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کو یہ سنہری موقع ملا کہ وہ ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کر سکیں، اور آپس میں اسلامی خصوصیات و روایات کا مظاہرہ کریں۔ مہاجرین نے اپنا گھر بار چھوڑ کر ایثار وقربانی کی بہترین مثال قائم کی۔ دوسری طرف انصارِ مدینہ نے اسلامی اخوت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ اس طرح مہاجرین اور انصار کے یکجا ہونے سے ایک مثالی اسلامی معاشرہ وجود میں آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رہنمائی میں ایک ایسا مثالی معاشرہ تشکیل دیا جس کی مثال تاریخِ عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

۳۔ اسلامی ریاست کا قیام

اسلام محض چند رسومات کی ادائیگی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی غرضیکہ ہر شعبے میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسے اقتدار اور قوت کا تقاضا کرتا ہے جو اسے تمام دنیا کے نظاموں پر غالب کر دے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ
لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ (التوبہ: ۳۳)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس (دین) کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب کر دے۔

اس اقتدار و قوت کو حاصل کرنے کے لیے ایک الگ ریاست کا قیام ضروری تھا، چنانچہ مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ مکہ میں مسلمان مظلوم تھے، اس لیے دین کے تقاضوں پر عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اب مدینہ میں مسلمان ایک حاکم قوم کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی الٰہی کی روشنی میں ایک مثالی اسلامی ریاست قائم فرمائی۔

۴۔ اخوت کا مظاہرہ

ہجرت سے پہلے مدینہ میں اوس اور خزرج قبائل برسرِپیکار رہتے تھے۔ اسلام نے ان کے یہ تفرقے مٹا ڈالے اور انہیں ایک لڑی میں پرو دیا اور یہ قبائل شیر وشکر ہو گئے۔ ہجرت نے ثابت کر دیا کہ علاقہ، رنگ، نسل،

زبان، کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ تمام مسلمانوں میں ایک وحدت ہے اور وہ ہے توحید و رسالت۔ پھر انصار و مہاجرین اخوت و ایثار کے ایسے رشتے میں منسلک ہو گئے کہ قرآن مجید میں ان کی مثال ان الفاظ سے دی گئی ہے :۔

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ

ترجمہ : وہ دوسروں کو اپنے اوپر فوقیت دیتے ہیں خواہ انہیں خود گھاٹے میں رہنا پڑے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
اُن کی جمعیت کا ہے مُلک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

(اقبال)

۵۔ اشاعتِ اسلام

ہجرت سے اشاعت اسلام کی نئی راہیں کھل گئیں۔ مکہ میں تیرہ سال کی انتھک جدوجہد کے نتیجہ میں صرف چند گنے چُنے افراد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، جبکہ ہجرت کے بعد دس سال کے مختصر عرصہ میں اسلام تیزی کے ساتھ ہر طرف پھیلنے لگا اور روم و ایران میں بھی اس کی صدائیں گونجنے لگیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ اصحابؓ نے اسلام کا نور عرب کے گرد و پیش میں پھیلا دیا۔

اسلام کا زمانے میں سکہ بٹھا دیا — اپنی مثال آپ ہیں یارانِ مصطفٰےؐ

(مولانا ظفر علی خاں)

۶۔ معاشی ترقی

مکہ میں مسلمان کفارِ مکہ کے بے پناہ ظلم و ستم کے باعث معاشی طور پر پس کر رہ گئے تھے۔ وہاں ان کے لیے تجارت، کاروبار و حرفت کے دروازے بند تھے۔ اب مدینہ میں انہیں آزاد ماحول اور وسیع میدان میسر آیا، انھوں نے تجارت و کاروبار میں کافی ترقی کی اور اس طرح ان کی معاشی حالت بہت بہتر ہو گئی۔

۷۔ ایمان کی کسوٹی

فتح مکہ سے قبل ہجرت ہی کو ایمان کی کسوٹی قرار دیا گیا۔ جو شخص اسلام لانے کے بعد مدینہ آجاتا اس کا ایمان پختہ تصور کیا جاتا، کیونکہ ہجرت بذاتِ خود ایک کڑی آزمائش اور امتحان کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ پیغمبروں کی سُنت ہے۔

۸۔ جہاد کی اجازت

مکہ میں مسلمان مظلوم اور دبے ہوئے تھے۔ وہ صبر و استقامت سے کام لے کر ہر قسم کا ظلم برداشت کرتے تھے، انہیں ابھی تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اب مدینہ میں انہیں ایسا ماحول میسر آیا، جہاں کفار کے خلاف جہاد کی تیاریوں کا موقع مل گیا۔ اسی لیے مدنی دور میں وہ آیات نازل ہوئیں جن میں ظالم کے ظلم و ستم کو

ختم کرنے کے لیے میدانِ جہاد میں اترنے کا حکم دیا گیا۔ اسی جذبۂ جہاد کے نتیجہ میں اسلام کو غلبہ حاصل ہوا۔

ے ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن (اقبال)

۹۔ سن ہجری کا آغاز

واقعۂ ہجرت کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں اسلامی سن کی ضرورت محسوس کی گئی تو آپ نے اسے سن ہجرت سے شمار کرنا شروع کیا۔ اسی لیے اسلامی سال سن ہجری کہلاتا ہے، یہی اسلامی کیلنڈر ہے۔

ے۔ برائے زندگی قرآن دستور العمل ان کا
صداقت بن گئی آئینہ ظاہر اور باطن کا
ضیائے حق سے رشکِ طورِ سینا بن گیا یثرب
نبیؐ کا آستاں بن کر مدینہ بن گیا یثرب
(شاہنامۂ اسلام، حفیظ جالندھری)

مسجدِ نبویؐ و اصحابِ صُفّہ

سوال: مندرجہ ذیل پر مختصر اور جامع نوٹ لکھیے:۔
ا۔ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر (ب) اصحابِ صُفّہ

جواب ا

مسجدِ نبویؐ کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد تعمیر فرمائی جو بعد میں مسجدِ نبویؐ کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر کے قریب خاندان بنجار کی زمین تھی، جس پر کچھ قبریں تھیں اور کچھ کھجور کے درخت تھے۔ حضورؐ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا: "میں یہ زمین قیمتاً خریدنا چاہتا ہوں۔" وہ بولے "ہم قیمت لیں گے، لیکن آپؐ سے نہیں بلکہ خدا سے۔" چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کی تھی۔ آپؐ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا۔ انہوں نے بھی یہ زمین نذر کرنی چاہی، لیکن آپؐ نے گوارا نہ کیا۔ حضرت ابوایوبؓ نے قیمت ادا کر دی۔ قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر اس تعمیر میں حصہ لیا۔

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے آزاد اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی۔ یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، کھجور کی شاخوں اور پتوں کی چھت، کھجور کے ستون تھے۔ پہلے قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، لیکن جب قبلہ بدل کر خانہ کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا۔ فرش چونکہ بالکل خام تھا

بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ صحابہؓ نماز کے لیے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشستگاہ پر بچھالیں۔ حضورؐ نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔ تین دروازے لگوائے گئے۔ قبلے کی دیوار تک ایک سو ہاتھ لمبائی تھی، چوڑائی بھی اتنی یا اس سے کچھ کم تھی۔ بنیاد تقریباً تین ہاتھ گہری تھی۔

مسجد نبویؐ محض ادائے نماز ہی کے لیے نہ تھی بلکہ یہ ایک یونیورسٹی تھی، جس میں مسلمان اسلامی تعلیمات و ہدایات کا درس حاصل کرتے تھے۔ یہ اسلامی معاشرت کا ایک مرکز تھا، جہاں سے اسلامی ریاست کا سارا نظام چلایا جاتا تھا اور مختلف قسم کی مہمات بھیجی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس کی حیثیت ایک پارلیمنٹ کی بھی تھی، جس میں مجلسِ شوریٰ اور مجلسِ انتظامیہ کے اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔ بعد میں مختلف مراحل میں اس مسجد میں توسیع ہوتی گئی اور موجودہ مسجدِ نبویؐ بہت وسیع اور کشادہ ہو چکی ہے اور یہ فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مسجد سے ملحق ہی روضۂ رسولؐ ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے "میری قبر اور مسجد کے منبر کے درمیان کی جگہ باغِ جنت ہے۔" اسلامی فقہ کی رو سے مسجد نبویؐ میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔" ؎

جب مسجدِ نبویؐ کے مینار نظر آئے   اللہ کی رحمت کے آثار نظر آئے

(ب) صُفّہ و اصحابِ صُفّہ

صفہ سائبان کو کہتے ہیں۔ یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبویؐ کے ایک کنارہ پر مسجد سے ملا ہوا، تیار کیا گیا تھا۔ صحابہ کرامؓ میں اکثر تو مشاغلِ دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے، لیکن چند حضرات نے اپنی زندگی صرف عبادت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دین سیکھنے کیلئے وقف کر دی تھی۔ ان حضرات کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے۔ اُن میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لیے کچھ کھانا مہیا کرتی۔ یہ حضرات دن کو بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑے رہتے۔ حضرت ابوہریرہؓ بھی انہی حضرات میں تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہمد دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی۔ اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے۔ کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں یہ اٹھا کر کھا لیتے۔ کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ حضرات آکر شریکِ نماز ہوتے، لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں۔ حضور اکرمؐ کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو مسلم ان کے پاس بھیج دیتے اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ان

کے پاس بیٹھ کر کھاتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو حضور اکرمؐ ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے، یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعدؓ بن عبادہ نہایت فیاض اور دولتمند تھے۔ وہ کبھی کبھی "اَسّی" "اَسّی" مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے کہ جب ایک دفعہ حضور اکرمؐ سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا "یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صُفّہ والے بھوکے رہیں"۔ راتوں کو عموماً یہ حضرات عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے۔ ان کے لیے ایک معلم مقرر تھا، اس کے ساتھ جا کر پڑھتے۔ اسی بنا پر ان میں سے اکثر "قاری" کہلاتے تھے۔ دعوت اسلام کے لیے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے۔ غزوۂ معونہ میں انہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی۔ کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی۔ لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد ہوتی ہوئی، نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی۔

(سیرۃ النبیؐ، مولانا شبلیؒ)

مواخات مدینہ و میثاق مدینہ ۱ھ

سوال: مندرجہ ذیل پر مختصر اور جامع نوٹ لکھیے:۔

ا۔ مواخاتِ مدینہ (ب) میثاق مدینہ ۱ھ

جواب (ا)

مواخات مدینہ

مہاجرین مکہ معظمہ سے بے سر و سامان آئے تھے۔ گو ان میں دولتمند اور خوشحال بھی تھے، لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے، اس لیے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔ اگرچہ مہاجرین کے لیے انصار کا گھر مہمان خانہ عام تھا، تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ وہ دست و بازو سے کام لینے اور محنت کرنے کے عادی تھے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیال فرمایا کہ مہاجرین اور انصار میں رشتہ اخوت قائم کر دیا جائے۔ اسے مواخاتِ مدینہ کہتے ہیں۔

رشتہ مواخات

جب مسجد نبویؐ کی تعمیر مکمل ہوتی تو حضورؐ نے انصار کو طلب فرمایا حضرت انسؓ بن مالک کے مکان میں لوگ جمع ہوئے۔ مہاجرین کی تعداد ۴۵ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی

ہیں ۔" پھر مہاجرین اور انصار سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو اور اب وہ حقیقت میں بھائی بھائی تھے ۔ انہوں نے اس روحانی رشتے کو خونی رشتے سے بڑھ کر جانا ۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے ۔ حضرت سعدؓ بن ربیع نے جو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بھائی قرار پائے ، ان کی دو بیویاں تھیں ۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں ، آپ اس سے نکاح کر لیجئے ، لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کر دیا ۔

انصار کا جذبۂ ایثار

انصار کا مال و دولت جو کچھ تھا نخلستان تھے ، روپے پیسے تو اس زمانے میں تھے نہیں ، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں ۔ مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اسی وجہ سے کھیتی باڑی سے ناواقف تھے ، اس بنا پر آنحضرتؐ نے ان کی طرف سے انکار کیا ۔ انصار نے کہا : سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے ، جو کچھ پیداوار ہو گی ، اس میں سے نصف حصہ مہاجرین کا ہو گا ۔" مہاجرین نے اس کو منظور کیا ۔ اس طرح یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا ۔ کوئی انصاری فوت ہوتا تو اس کی جائیداد اور مال مہاجر کو ملتا تھا اور بھائی بند محروم رہتے تھے ، غزوۂ بدر کے بعد یہ قاعدہ جاتا رہا ۔

مہاجرین کی خودداری

دنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی ، لیکن مہاجرین نے ان پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا ۔ بلکہ اپنا بوجھ خود اٹھایا ۔ جب حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کو اپنے نصف مال کی پیش کش کی تو انہوں نے کہا : خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے ۔ مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے ۔ انہوں نے قینقاع کے مشہور بازار کا راستہ بتا دیا ۔ انہوں نے کچھ گھی اور پنیر خریدا اور شام تک خرید و فروخت کی ۔ چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی ۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو اتنی ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے ۔ ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا ، تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی ۔

بعض صحابہ کرامؓ نے دکانیں کھول لیں ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا کارخانہ سخ میں تھا جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے ۔ حضرت عثمانؓ بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے ۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی تجارت میں مشغول ہو گئے ان کی تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی ۔ دیگر صحابہ کرامؓ نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی ۔

عہدنامہ مرتب فرمایا جسے "میثاق مدینہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مدینہ کے اندر چند محلوں میں اور مدینہ کے گرد و نواح میں بھی یہودیوں نے آبادیاں اور قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔ ان کے تین بڑے خاندان تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ ادھر مدینہ کے عرب قبائل اوس اور خزرج آپس میں لڑ لڑ کر کمزور ہو چکے تھے۔ ان کے مقابلے میں یہودی طاقتور، منظم اور مالدار تھے۔ اس لیے عرب قبائل کو ان کے سامنے دب کر رہنا پڑتا تھا۔ یہودی اگرچہ درپردہ مسلمانوں سے عداوت رکھتے تھے، لیکن انہوں نے اب تک کسی محاذ آرائی اور جھگڑے کا اظہار نہیں کیا تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ ایک معاہدہ منعقد کیا، جس میں انہیں دین و مذہب اور جان و مال کی مطلق آزادی دی گئی تھی اور جلا وطنی، ضبطیٔ جائیداد یا جھگڑے کی سیاست کا کوئی رخ اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ حضورؐ کا اصل مقصد یہ تھا کہ امن و امان کا ماحول پیدا ہو تاکہ لوگوں کو دین اسلام کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملے۔

معاہدے کی دفعات

۱۔ میثاقِ مدینہ کی اہم دفعات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ بنو عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہیں گے۔ یہود اپنے دین پر عمل کریں گے اور مسلمان اپنے دین پر۔ خود ان کا بھی یہی حق ہوگا اور ان کے غلاموں اور متعلقین کا بھی۔ اور بنو عوف کے علاوہ دوسرے یہود کے بھی یہی حقوق ہوں گے۔

۲۔ یہود اپنے اخراجات کے ذمے دار ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات کے۔

۳۔ جو طاقت اس معاہدے کے کسی فریق سے جنگ کرے گی سب اس کے خلاف آپس میں تعاون کریں گے۔

۴۔ اس معاہدے کے شرکاء کے باہمی تعلقات خیر خواہی، خیر اندیشی اور فائدہ رسانی کی بنیاد پر ہوں گے، گناہ پر نہیں۔

۵۔ کوئی آدمی اپنے حلیف کی وجہ سے مجرم نہ ٹھہرے گا۔

۶۔ مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

۷۔ جب تک جنگ برپا رہے گی، یہود بھی مسلمانوں کے ساتھ خرچ برداشت کریں گے۔

۸۔ اس معاہدے کے سارے شرکاء پر مدینہ میں ہنگامہ آرائی اور کشت و خون حرام ہوگا۔

۹۔ اس معاہدے کے فریقوں میں کوئی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے، جس میں فساد کا اندیشہ ہو تو اس کا فیصلہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمائیں گے۔

۱۰۔ قریش اور اس کے مددگاروں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔
۱۱۔ جو کوئی مدینہ پر دھاوا بول دے، اس سے لڑنے کے لیے سب باہم تعاون کریں گے اور ہر فریق اپنے اپنے اطراف کا دفاع کرے گا۔
۱۲۔ یہ معاہدہ کسی ظالم یا مجرم کے لیے آڑ نہ بنے گا۔

نتائج اس معاہدے کے طے ہو جانے سے مدینہ اور اس کے اطراف ایک وفاقی حکومت بن گئے، جس کا دارالخلافہ مدینہ تھا اور جس کے سربراہ رسول اللہ ﷺ تھے اور جس میں غالب حکمرانی مسلمانوں کی تھی۔ اس طرح مدینہ فی الحقیقت اسلام کا دارالخلافہ بن گیا۔ اور اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی۔ امن و سلامتی کے دائرے کو مزید وسعت دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ دوسرے قبائل سے بھی حالات کے مطابق اسی طرح کے معاہدے کیے۔ اس طرح دفاعی لحاظ سے مدینہ اور اس کے گردونواح کی پوری آبادی ایک متحدہ طاقت بن گئی اور دشمنوں کے لیے کھلم کھلا فتنہ و فساد مشکل ہو گیا۔ انفرادی خونریزی تقریباً ختم ہو گئی اور بیرونی قبائل پر اہل مدینہ کا ایک حد تک رعب بیٹھ گیا، نیز اہل اسلام کو قدرے اطمینان ہوا اور اشاعتِ اسلام میں وسعت پیدا ہوئی۔

مہاجرین کی رہائش

مہاجرین کے لیے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس جو افتادہ (غیر آباد) زمینیں تھیں، ان کو دے دیں اور جن کے پاس زمین نہ تھی، انہوں نے اپنے رہائشی مکانات دے دیئے۔

مواخات کا عظیم مقصد

مواخات کا یہ رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لیے قائم کیا گیا، لیکن درحقیقت یہ اسلام کے ایک عظیم الشان مقصد کی تکمیل کا سامان تھا۔ اسلام کی عظیم الشان سلطنتِ الٰہی کے لیے وزراء، اربابِ تدبیر سپہ سالارانِ لشکر ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں۔ صحبتِ رسولؐ کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی درس گاہِ تربیت سے اور قابل جوہر نکلیں۔ اس بنا پر جن لوگوں میں رشتہ اخوت قائم کیا گیا، ان میں مزاج اور ذوق کی مطابقت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا اور اس طرح مطلوبہ عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں۔ (سیرۃ النبیؐ: مولانا شبلیؒ)

مواخات کے بھائی

مواخات کے رشتہ سے جو لوگ آپس میں بھائی بھائی تھے ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں:۔

مہاجرین	انصار	مہاجرین	انصار
حضرت ابو بکر صدیقؓ	حضرت خارجہؓ بن زید انصاری	حضرت عمارؓ بن یاسر	حضرت حذیفہؓ بن یمان
حضرت عمر فاروقؓ	حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری	حضرت سلمان فارسیؓ	حضرت ابو درداءؓ
حضرت عثمان غنیؓ	حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری	حضرت سلمان فارسیؓ	حضرت ابو درداءؓ
حضرت ابو عبیدہ جراحؓ	حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری	حضرت بلالؓ	حضرت ابو رویحہؓ
حضرت زبیرؓ بن العوام	حضرت سلامتہؓ بن دقش	حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ	حضرت عبادؓ بن بشر
حضرت مصعبؓ بن عمیر	حضرت ابو ایوبؓ انصاری	حضرت سعیدؓ بن زید	حضرت ابی بن کعبؓ

(ب) میثاق مدینہ ۱ھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کے درمیان عقیدے، سیاست اور نظام کی وحدت کے ذریعے ایک نئے اسلامی معاشرے کی بنیادیں استوار کر لیں تو غیر مسلموں کے ساتھ اپنے تعلقات منظم کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔ چنانچہ ہجرت کے پہلے سال کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ مدینہ کے تمام شہریوں کے درمیان جن میں یہود و مشرکین عرب وغیرہ سب شامل تھے۔ ایک

فریضۂ رسالت مدینے میں

سوال:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی کے اہم واقعات بیان کریں؟

جواب: مکی و مدنی زندگی کا فرق:۔ انسانیت کے سب سے بڑے محسن اور تاریخ عالم کی عظیم ترین شخصیت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی دور دعوت اور تبلیغ کا دور تھا اور مدنی دور دعوت اور غلبۂ حق دونوں کا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول پاکؐ نے اعلان نبوت کے بعد اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے منصب کی تکمیل میں گزارا اور وہ منصب تھا "اللہ کے دین کی تبلیغ اور اس کو عملی طور پر نافذ اور قائم کرنا وہ یوں مکے میں ہمت اور صبر و استقامت کے تحت افراد تیار ہوئے۔ اور مدینے میں ایک مثالی اجتماعی نظام وجود میں آیا اور دین کے احکام نافذ ہوئے۔ مکی دور میں زیادہ تر عقائد و تعلیمات پر زور دیا گیا۔ اور مدنی دور میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم ہوئی۔

۲۔ مدنی دور اسلام لبطور طاقت:۔ یہ درست ہے کہ مدینے میں اسلام ایک طاقت بن کر ابھرا۔ بظاہر ہجرت سے مسلمانوں کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت ایک نئے مرکز پر جمع ہو رہی تھیں۔ اگرچہ یہاں بھی مشکلات کم نہ ہوئیں اور شر انگیز عناصر نے حضورؐ کے ساتھیوں کو یہاں بھی شروع سے آخر تک پریشان رکھا اور نئے اصلاحی و تعمیری مقاصد میں رکاوٹیں ڈالیں۔

۳۔ مدینے کے لوگ:۔ مدینے کا اصل نام یثرب تھا۔ یہاں دو قسم کے لوگ آباد تھے، یہود اور غیر یہود۔ یہ پورا علاقہ یہودیوں کے مذہبی اور سیاسی اثر میں تھا۔ یہود اکثر اہل یثرب کو ایک نبی مبعوث کی خبر دیا کرتے تھے کیونکہ تورات میں آپؐ کی پیشین گوئی موجود تھی۔

۴۔ مدینے میں اسلام کا دور:۔ نبوت کے گیارہویں سال مدینے سے جو گروہ حج کے لیے آیا وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ اچھے اشخاص تھے۔ مدینے میں ان کی کوششوں سے اسلام پھیلنے لگا۔ اگلے سال بارہ افراد کا وفد مکے پہنچا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ حضورؐ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ مدینے بھیجا تاکہ لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور اسلام کی دعوت دیں۔ انہی کی کوششوں سے اوس اور

خزرج کے دو سرداروں سعد بن عبادہ اور سعد بن خیر رضی اللہ عنہما نے اسلام قبول کیا تھا۔ جس سے مسلمانوں کی تعداد میں معقول اضافہ ہوا۔ اور اس طرح اسلام کے پودے نے مدینے میں جڑیں پکڑ لیں۔ اگلے سال تقریباً پچھتر آدمی مدینے سے آئے اور حج کے موقع پر ایمان لائے۔ اس موقع پر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی۔

۵۔ مدینے میں آمد:۔ رسول اللہؐ نے مدینے میں اسلام کو پھلتا پھولتا ہوا دیکھ کر مکے کے مسلمانوں کو مدینے کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دیدی ان مہاجرین کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا اور اس طرح دعوت حق کا اجالا بڑھتا جا رہا تھا۔ اب تو انصار و مہاجرین کی نگاہیں مکے سے آنے والے راستے پر لگی ہوئی تھیں کہ حضورؐ کب تشریف لا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ خبر مدینہ پہنچ چکی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ چھوڑ چکے ہیں۔

۶۔ مسجد قبار کی تعمیر:۔ مدینے پہنچنے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام "قبار" نامی بستی میں ہوا۔ جو مدینے سے تین میل کے فاصلے پر تھی۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد تعمیر کی۔ یہ اسلام کی پہلی مسجد تھی جس کی شان میں قرآن عزیز نے کہا ہے:۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى۔

"یہ ایسی مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔"

۷۔ اہلِ مدینہ کا خیر مقدم:۔ چودہ دن قبار میں قیام کے بعد آپؐ اپنے ساتھیوں سمیت مدینے میں وارد ہوئے اور اہلِ مدینہ نے دل و جان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لیے فرش راہ کر دیئے۔ مدینہ کا نصیب جگمگا اٹھا کہ رحمۃ للعالمین تشریف لے آئے۔ مدینے کی معصوم لڑکیاں گھروں اور راستوں پر کھڑی گیت گا رہی تھیں:۔

اَشْرَقَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا	چاند نے ہم پر طلوع کیا۔
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا	ہم پر شکر واجب ہے
مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ	جب تک دعا مانگنے والے مانگیں

عارضی قیام کے لیے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قسمت جاگی۔ یہاں حضورؐ سات ماہ تک قیام پذیر رہے۔

۸۔ مسجد نبوی و حجروں کی تعمیر:۔ مدینے پہنچ کر اولین کام مسجد کی تعمیر تھی۔ جس کے لیے زمین حاصل کی گئی۔ قیمت حضرت ابو ایوبؓ نے ادا کی۔ اس کی تعمیر میں ہر شخص نے دل و جان سے حصہ لیا۔ خود حضورؐ نے

صحابہ کے ساتھ مل کر کام کیا۔ یہی مسجد نبوی ہے جو اسلامی نظام تمدن کا اور روحانیت کا سرچشمہ اور مرکز بنی۔ اسی مسجد کے ساتھ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حجرے تعمیر ہوئے۔ اور اسی مسجد کے ساتھ وہ سائبان اور چبوترہ تھا جو "صفہ" کہلاتا تھا۔ یہ اسلام کی پہلی درسگاہ تھی۔ اور ان لوگوں کا مسکن تھا جو ہر وقت اسلامی تعلیم میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے کفیل اور معلم خود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

۹۔ نظام مواخات:۔ مدینے پہنچ کر ایک بڑا مسئلہ مہاجرین کی بحالی اور آبادکاری کا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کو جس خوش اسلوبی اور حکمت سے سلجھایا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک مہاجر کا ایک ایک انصاری کے ساتھ برادرانہ رشتہ قائم کر دیا۔ انصار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی ہر چیز کو آدھا بانٹ کر اپنے مہاجر بھائی کو دے دیتے لیکن مہاجرین کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ محنت مزدوری سے روزی کمانے کو ترجیح دیتے۔ اخوت اور بھائی چارے کا یہ رشتہ حقیقی رشتوں سے بھی بڑھ گیا تھا کہ کوئی انصاری وفات پاتا تو اس کے مال وجائیداد میں اس کے مہاجر بھائی کا حصہ بھی ہوتا۔ یہاں تک کہ وراثت کے قرآنی احکام بھی نازل ہوئے۔

۱۰۔ اسلامی ریاست کا قیام - میثاق مدینہ:۔ یہود کے تین قبائل مدینہ کے آس پاس آباد تھے۔ یہود و انصار میں اسلام سے قبل کئی خونریز معرکے ہو چکے تھے۔ یہودی ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ انصار کبھی متحد نہ ہو پائیں۔ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا سیاسی اقدام مدینہ کے یہود اور مسلمانوں کو ایک نظام میں پرو دینا تھا چنانچہ تنظیم معاشرہ کے لیے سیاسی نوعیت کا ایک معاہدہ یہود اور مسلمانوں میں طے پایا جو تاریخ اسلام میں "میثاق مدینہ" کے نام سے مشہور ہے اور یہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے۔ اس کی چند اہم دفعات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مدینے کے اس منظم معاشرے میں خدا کے قانون کو بنیادی اہمیت حاصل ہو گی۔

۲۔ سیاسی قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہو گا۔

۳۔ دفاعی لحاظ سے مدینہ اور اس کے نواح کی آبادی ایک متحدہ طاقت ہو گی اور بیرونی حملے کی صورت میں وہ متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

۴۔ انصار و یہود میں سے کوئی بھی قریش کو پناہ نہ دے گا۔

اس معاہدے سے باضابطہ طور پر اسلامی ریاست اور اسلامی نظام حیات کی بنیاد رکھ دی گئی۔

۱۱۔ **مخالفتِ یہود:۔** یہودِ مدینہ سے صلح امن کا معاہدہ تو طے پاگیا اور یہود نے اسلام کو ایک الگ قوت بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن اسلام کی روز افزوں ترقی کے لیے مستقل خطرہ اور پریشانی کا باعث بن گیا تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تورات کی پیش گوئیوں کے مطابق وہ ایک نئے نبی کے ظہور کے ساتھ ہی ان پر ایمان لے آتے تھے۔ لیکن یہی لوگ مدینے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے زبردست مخالف بن گئے۔

یہودی علماء نے تورات کی تعلیمات کو اپنے مفاد کی خاطر بدل ڈالا تھا۔ اور اب مذہب ان کے لیے ایک نفع بخش کاروبار تھا۔ اشاعتِ اسلام سے چونکہ ان کی مذہبی اجارہ داری اور اہلِ مدینہ پر ان کا اثر و رسوخ خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس لیے اعلانیہ جنگ کی بجائے یہود نے مکاری سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ نفاق اور سازش ان کی مخالفت کے دو بڑے حربے تھے۔ مکہ میں صرف دو گروہ تھے۔ مسلمان اور کافر۔ لیکن مدینے میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ایک تیسرا گروہ منافقوں کا بھی تھا۔

۱۲۔ **تحویلِ قبلہ:۔** مسلمان آغازِ اسلام میں بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہودیوں کو اس پر فخر تھا۔ لیکن جب اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو کے مطابق یہ حکم نازل ہوا کہ نماز میں اپنا رخ بیت المقدس کی بجائے خانۂ کعبہ کی طرف کر لو تو یہودی بہت برہم ہوئے۔ اور بہت سے یہودی جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے لیکن دراصل مسلمانوں کے لیے مارِ آستین تھے۔ ان کی منافقت کا راز فاش ہو گیا۔ تحویلِ قبلہ کا مقصد یہ تھا کہ اب دنیا کی قیادت یہود کی بجائے اُمتِ مسلمہ کے ہاتھ میں آرہی ہے۔

۱۳۔ **متعدد مسائل:۔** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ مسلسل آنے والے مہاجرین کی بحالی، قریشِ مکہ کی طرف سے ہر حملے کا خطرہ اور مدینے کا دفاع ملان سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مدینے کی نئی ریاست میں غداروں اور سازشیوں کی ایک بڑی تعداد فتنہ پھیلا رہی تھی۔ یہود نے پہلے تو شر انگیزی سے کام لیا، پھر تخریبی کارروائیاں کیں حتیٰ کہ غداری سے کام لیا اور عملاً کفار و مشرکین کو اپنا عملی تعاون پیش کیا۔

یہود کی نت نئی مخالفتوں اور فتنہ انگیزیوں کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغِ اسلام اور فریضۂ رسول کے اہم فریضہ میں شب و روز مصروف رہے اور خدا کے بھروسہ پر اپنا مشن جاری رکھا۔

۱۴۔ **دفاعی جنگیں:۔** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں داخل ہوئے تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قریش نے رئیس المنافقین

عبداللہ بن ابی کو جو ہجرت سے پہلے انصار کا سردار تھا خط لکھا کہ

"تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے یا تو تم اس کو قتل کر ڈالو، یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم تم پر حملہ کر کے تمہیں فنا کر دیں گے۔"

قریش خانہ کعبہ کے مجاور تھے اور اس وجہ سے تمام عرب ان کا احترام کرتے تھے مکے سے مدینے تک کے تمام قبائل ان کے زیر اثر تھے۔ قریش نے انہیں بھی اسلام کا مخالف بنا دیا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے بلکہ مدینے کے لیے ایک مسلسل خطرہ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خطرے کے پیش نظر راتوں کو اکثر جاگا کرتے تھے، حتیٰ کہ صحابہ کرام رات کو ہتھیار لگا کر سوتے تھے لیکن خدا کی طرف سے ابھی جنگ کی اجازت نہ تھی۔ ۲ھ میں راہِ خدا میں صرف ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت ملی جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ بدر سے پہلے بیتی مہمیں نواحِ مدینہ میں روانہ کیں۔ ان کا مقصد قریش کی نقل و حمل اور حرکت کا پتہ لگانا اور آس پاس کے قبائل سے امن و اتحاد کے معاہدے کرانا تھا۔

۱۵۔ غزوۂ بدر:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امن کا درس دینے کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے، لیکن اسلام کے دشمنوں نے آپ اور آپ کے ساتھیوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی قوت میں اضافہ ہوا تو مشرکین مکہ کی آتش عداوت بھڑک اٹھی۔ چنانچہ شروع میں کرزبن جابر فہری رئیس مکہ نے مدینے کی چراگاہ پر حملہ کر کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مویشی لوٹ لیے اور بچ کر نکل گیا۔ چند روز بعد عمرو بن الحضرمی مسلمانوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا جس نے قریش کو مدینے پر فوری حملے کا موقع فراہم کر دیا۔ ایک طرف مخلص مسلمانوں کی مختصر جماعت (۳۱۳)، سامان جنگ کی کمی اور بے سروسامانی تو دوسری طرف قریش مکہ پورے سازوسامان کے ساتھ مسلح بدر کے میدان میں دونوں جماعتوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نہایت عاجزی کے ساتھ خدا کے حضور میں دعا فرما رہے تھے "خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے، آج پورا کر" اس کے جواب میں وحی نازل ہوئی۔

سَیُہۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَیُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ ۝

ترجمہ:- فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پیٹھ پھیر دیں گے۔

بدر کا معرکہ اسلام اور کفر کا پہلا معرکہ تھا۔ جس میں حق غالب آیا کفر کی کمر ٹوٹ گئی۔ قریش کے ستر سردار مارے گئے اور اتنے ہی قید ہوئے۔ انہیں چھڑانے کے لیے قریش نے مدینے میں آمد و رفت شروع کی۔ اس طرح اشاعتِ اسلام میں اضافہ ہوا، فتح بدر مسلمانوں کی ترقی کا پہلا قدم تھا۔ اس فتح نے مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کے جذبۂ حسد کو بڑھا دیا اور ان کی ...

۱۶۔ **غزوۂ اُحد:۔** مقتولین بدر کا انتقام لینے کے لیے اُحد کا معرکہ ہوا۔ یہود نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے درپردہ قریش مکہ کا ساتھ دیا۔ کوہِ اُحد کے دامن میں فوجوں کا سامنا ہوا۔ حضورؐ نے پہاڑی درے پر پچاس تیر انداز کھڑے کر دیئے اور انہیں تاکید کی تھی کہ کسی بھی صورت میں یہاں سے نہ ہٹیں۔ لیکن ابتدائی فتح دیکھ کر ان لوگوں نے درہ خالی چھوڑ دیا جس سے حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کو سخت آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ ستر مسلمان شہید ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دندان مبارک شہید ہو گئے اور چہرۂ مبارک پر زخم آئے۔ لیکن حضورؐ کے عزم و استقلال میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ آخر کفار بھاگ نکلے۔ خواتین قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ اور ان کے ناک کان تک کاٹ لیے۔ مسلمان عورتوں نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور مجاہدوں کو پانی پلاتی تھیں۔

۱۷۔ **یہودیوں کا قلع قمع:۔** یہودِ مدینہ نے معاہدۂ امن کے باوجود مسلمانوں سے غداری کی تھی۔ اس لیے ان کی سرکوبی نہایت ضروری تھی۔ چنانچہ ۲ھ سے ۷ھ تک ان کے خلاف جو لڑائیاں لڑی گئیں وہ غزوات بنو نضیر بنو قینقاع اور بنو قریظہ کے نام سے مشہور ہیں۔ جن میں غدار یہودیوں کو قتل یا جلاوطن کر دیا گیا تاکہ ان کی مکاریوں اور عیاریوں کا خاتمہ ہو جائے۔ آخر غزوۂ خیبر کے بعد ان کی سیاسی قوت بھی ختم ہو گئی۔

۱۸۔ **اسلام کیخلاف عرب کی متحدہ جنگ:۔** ۵ھ میں قبائلِ قریش کنانہ، غطفان، اسد اور کئی دوسرے قبائل نے متحد ہو کر مدینے پر حملہ کیا۔ مسلمانوں نے مدینے کے گرد خندق کھود کر شہر کا دفاع کیا اور محصور ہو گئے یہ محاصرہ اس قدر شدید تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ پر تین تین دن فاقے گذر گئے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور کفار کو مجبور ہو کر بھاگ جانا پڑا۔ اس جنگ کا نام غزوہ خندق یا احزاب ہے۔ اس جنگ میں احزاب سے قریش کی متحدہ قوت کا زور ٹوٹ گیا اور بہت سے قبائل جو قریش کے زیرِ اثر تھے مسلمان ہو گئے۔

۱۹۔ **عہد نامہ حدیبیہ:۔** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشِ مکہ کے خلاف مجبوراً تلوار اٹھائی تھی تاکہ اسلام کی تبلیغ کا راستہ کھل جائے۔ چھ برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد قریش نے اسلام کے اس حق کو تسلیم کر لیا اور حدیبیہ کا عہد نامہ طے پایا۔ جس کے بعد آزادانہ میل جول سے کفار کو مسلمانوں کے اخلاق و عادات

کا تجربہ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے قبل غزوات کے باوجود جس قدر لوگ اسلام لائے تھے صرف دو ہی برس میں یہ تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ چنانچہ قرآن مجید میں اسے "فتح مبین" یعنی واضح اور روشن فتح قرار دیا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ کے سال حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم عمرے کے ارادے سے مدینے سے نکلے تو صرف ڈیڑھ ہزار افراد ساتھ تھے۔ دو برس کے بعد مکے کے لیے چلے تو دس ہزار مسلمانوں کا لشکر ساتھ تھا اور آہستہ آہستہ سارا عرب مطیع و فرمانروا ہو گیا۔

۲۰۔ **شاہانِ روم و عجم کو دعوتِ اسلام:۔** اسلام صرف عرب کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ یہ ایک عالمگیر مذہب ہونے کے لحاظ سے اپنی دعوت کو پوری دنیا تک پہنچانے کا علمبردار تھا۔ چنانچہ عہد نامہ حدیبیہ کے بعد عرب اور عرب سے باہر اسلام کے مبلغ اور قاصد بھیجے گئے۔ دنیا کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام دی گئی۔ ایران، حبش اور روم والے آپؐ کی تعلیم سے فیض یاب ہوئے۔ مشرکین عرب، یہودی اور عیسائیوں نے بھی آپؐ کے زمانے ہی میں آپؐ کے نورِ ہدایت سے روشنی حاصل کی۔

حجاز سے باہر نبوت کے بیس برس میں قریش اور یہود کی مزاحمت کے باعث اسلام کا قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ اور ادھر ادھر خال خال مسلمان نظر آتے تھے۔ ان دیواروں کا ہٹنا تھا کہ صرف تین برس یعنی ۸ھ، ۹ھ اور ۱۰ھ میں اسلام کا اثر ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان اور دوسری طرف شام اور عراق کی حدود تک وسیع ہو گیا۔

۲۱ **فتح مکہ:۔** اصل بات یہ ہے کہ تمام ملک قریش مکہ کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ ۸ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ کفار مکہ نے بدترین مظالم ڈھائے تھے۔ لیکن اب وہ شرم سے گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے انتقام نہ لیا بلکہ عفو و درگذر سے کام لیتے ہوئے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ تاریخ عالم میں ایسی منفرد فتح کی مثال نہیں ملتی۔ مکہ فتح ہو گیا تو اشاعتِ اسلام کی شاہراہیں کھل گئیں۔ عرب کے تمام قبائل جوق در جوق حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور اس طرح رفتہ رفتہ پورا عرب مسلمان ہو گیا۔ اسی لیے ۹ھ کو "عام الوفود" کہتے ہیں۔ عربی میں "عام" کا مطلب "سال" اور "وفود" وفد کی جمع ہے۔

۲۲۔ **خطبہ حجۃ الوداع:۔** ہجرت سے اب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حج ادا نہ فرمایا تھا۔ آپؐ کو معلوم ہو چکا تھا کہ رحلت کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ اب ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے سامنے شریعت، اخلاق اور حکومت کے تمام بنیادی اصولوں کا اجتماع عام میں اعلان کر دیا جائے۔ حج کا اعلان ہوتے ہی ہمرکابی کے لیے پورا عرب امڈ آیا۔ اور آگے پیچھے، دائیں

بائیں، جہاں تک نظر کام کرتی، انسانوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ مدینے سے مکہ کا سفر دنوں میں طے ہوا اور چار ذوالحجہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور رسوم حج ادا کرنے کے بعد نویں ذوالحجہ کو میدان عرفات میں اونٹنی پر سوار ہو کر وہ مشہور خطبہ (خطبۃ الوداع) دیا جو تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

"جس طرح تم اس دن، اس مہینے اور اس مقام کی عزت کرتے ہو، اسی طرح ایک مسلمان کا خون، مال اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے ۔۔۔۔۔۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، اسی طرح کسی عجمی کو بھی کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ ۔۔۔۔۔۔ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ وغیرہ۔

۲۳۔ تکمیلِ دین:۔

اسی موقع پر قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ

آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کر دی اور

رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

تمہارے لیے دین کے طور پر اسلام کو پسند فرمایا۔

خ

غزوۂ بدر ۲ھ / ۶۲۴ء

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (آل عمران : ۱۲۳)

ترجمہ : یقیناً اللہ نے تمہاری مدد کی بدر میں۔ جب تم کمزور تھے تو اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

سوال : غزوۂ بدر کے اسباب، واقعات اور نتائج بیان کیجئے۔

جواب :

غزوات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ اسلام کا فریضہ مکہ سے شروع کیا تو کفارِ مکہ نے شدید مزاحمت کی اور ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ مکی دور میں بہت کم تعداد میں صرف ایسے افراد ایمان لائے جو فطرتِ سلیم رکھتے تھے، جبکہ اکثریت ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھی۔ جب کفارِ مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم اور اجازت سے مسلمان مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور آخر خود حضورؐ بھی ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف آور ہوئے اور اسلام اپنے نئے مرکز میں قوت واستحکام حاصل کرنے لگا۔ لیکن کفارِ مکہ نے وہاں بھی مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور طرح طرح کی سازشیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ ان کی طرف سے مدینہ پر حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ان حالات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دفاع کے لیے جہاد کا حکم دیا اور غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا جن جنگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود شریک ہوئے انہیں غزوات کہتے ہیں اور جن میں آپؐ نے شرکت نہیں فرمائی انہیں سریہ کہتے ہیں۔

غزوۂ بدر کے اسباب

۱۔ قریش کی منافقین اور یہود سے ساز باز

جب قریش مکہ نے دیکھا کہ مسلمانوں کو مدینہ میں ایک نیا مرکز حاصل ہو گیا ہے اور اسلام روز بروز ترقی کر رہا ہے تو ان کی آتشِ غضب اور بھی بھڑکی۔ ان کے سرکردہ رہنماؤں نے مدینہ کے ایک رئیس عبداللہ بن اُبی کو خط لکھا کہ :

"تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ یا تو اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر ڈالو یا انہیں اپنے شہر سے نکال دو۔ ورنہ ہم مدینہ پر حملہ کریں گے اور ان کے ساتھ

تمہیں بھی فنا کریں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے ۔"

ادھر عبداللہ بن ابی بھی اپنے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دینِ اسلام کے خلاف سخت عداوت رکھتا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے مدینہ ہجرت کرنے سے پہلے وہ وہاں کا رئیس اعظم تھا اور بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ان دنوں اس کی رسمِ تاجپوشی ہونے والی تھی کہ حضور اکرمؐ کی تشریف آوری سے اس کے خواب پریشان ہو گئے۔ اب وہ بے بس تھا اس لیے ظاہری طور پر اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ جب اسے قریش کا خط ملا اور حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپؐ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا:

"کیا تم قریش کے رعب میں دب کر اپنے ہی بھائی بندوں سے لڑو گے؟"

اس وقت تو عبداللہ بن اُبی جنگ کے ارادے سے باز آ گیا۔ لیکن اس کی منافقت اور عداوت بڑھتی ہی گئی۔ اس کے علاوہ قریش نے مدینہ کے یہودیوں سے بھی سازباز شروع کر رکھی تھی۔ چنانچہ کفار منافقین اور یہود کی یہ سازشیں رنگ لائیں اور غزوۂ بدر کی نوبت پیش آئی۔

۲۔ قریش کی انصار سے دشمنی

قریشِ مکہ انصار کے بھی جانی دشمن بن چکے تھے ہجرت سے تھوڑا عرصہ بعد ہی قبیلہ اوس کے ایک رئیس حضرت سعدؓ بن معاذ طوافِ کعبہ کے ارادے سے مکہ گئے۔ وہاں وہ اپنے ایک قریشی دوست امیہ بن خلف کے ہاں ٹھہرے اور طوافِ کعبہ کے لیے نکلے تو ابوجہل سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے غصے سے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑے امن و اطمینان سے طواف کر رہے ہو، حالانکہ تم لوگ نے بے دینوں کو پناہ دے رکھی ہے اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو اپنے گھر سلامت پلٹ کر نہ جا سکتے۔" اس پر حضرت سعدؓ نے باآواز بلند کہا:

"سن لو! خدا کی قسم اگر تو نے مجھ کو مکہ آنے سے روکا تو ہم تمہاری تجارتی شاہراہ کو جو شام کی طرف مدینہ کے راستے جاتی ہے بند کر دیں گے۔" اس سے قریش کو اپنی تجارت میں رکاوٹ کی فکر ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کو ہر قیمت پر مدینہ سے نکالنے کا تہیہ کر لیا۔

۳۔ قریش کی تولیت و مجاورت کعبہ خطرہ میں

خانہ کعبہ کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے، سب قریش کے زیرِ اثر تھے۔ اس بناء پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا۔ انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر ان کے اس خود ساختہ باطل دین کے مقابلے میں صحیح دینِ توحید آ گیا تو ان کی یہ سرداری، عزت و تکریم اور شان و شوکت ختم ہو کر رہ جائے گی اور اس طرح عرب کی روحانی پیشوائی ان کے ہاتھ سے چھن جائے گی۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر اسلام کی ابھرتی ہوئی قوت کو مٹانا چاہتے تھے۔

۴۔ قریش کی تجارتی شاہراہ پر نگرانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ کفارِ مکہ کسی وقت بھی مدینہ پر حملہ کر دیں گے تو آپؐ نے قریش کی تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اس کے لیے مضبوط و طاقتور قبائل سے حلیفانہ تعلقات قائم کئے تاکہ قریش کو اپنے مذموم مقاصد سے روکا جا سکے۔ لیکن قریش کے غصے کی آگ اور بھڑک اٹھی۔

۵۔ مہاجرین کو قریش کی دھمکی

قریش نے مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ تم مغرور نہ ہونا کہ مکہ سے صاف بچ کر نکل آئے، ہم یثرب ہی پہنچ کر نہارا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ اور یہ محض دھمکی نہ تھی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حقیقتاً قریش کی چالوں اور بُرے ارادوں کا علم ہو گیا تھا کہ آپؐ یا تو جاگ کر رات گزارتے تھے یا صحابہ کرامؓ کے پہرے میں سوتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ

اللہ آپؐ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

پھر یہ خطرہ صرف حضور اکرمؐ کی ذات تک محدود نہ تھا، بلکہ سارے ہی مسلمانوں کو لاحق تھا۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے رفقاء مدینہ تشریف لائے اور انصار نے انہیں اپنے ہاں پناہ دی تو سارا عرب ان کے خلاف متحد ہو گیا۔ چنانچہ یہ لوگ نہ ہتھیار کے بغیر رات گزارتے اور نہ ہتھیار کے بغیر صبح کرتے تھے۔

۶۔ کرز بن جابر فہری کا مویشیوں پر ڈاکہ

کرز بن جابر فہری قریشی سردار تھا۔ اس نے مدینہ کی اس چراگاہ پر حملہ کر دیا جہاں مسلمانوں کے مویشی چر رہے تھے۔ وہ مویشی لوٹ کر بھاگ نکلا۔ اطلاع ملتے ہی حضور اکرمؐ نے کچھ مجاہدین کو حکم دیا۔ انہوں نے وادی صفوان تک تعاقب کیا، لیکن دشمن بچ کر نکل چکا تھا۔

۷۔ عمرو بن حضرمی کا قتل

رجب ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطنِ نخلہ کی طرف بھیجا۔ یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ دو دن کے بعد اس کو کھولنا۔ حضرت عبداللہؓ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات معلوم کرو اور اطلاع دو۔ اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے مالِ تجارت لیے آتے تھے، سامنے سے نکلے۔ حضرت عبداللہؓ نے ان پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص

عمرو بن حضرمی مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللہؓ نے مدینہ میں آکر یہ واقعہ بیان کیا اور مالِ غنیمت پیش کیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی۔ غنیمت کے قبول کرنے سے بھی آپؐ نے انکار فرمایا۔ جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے۔ عمرو بن حضرمی، عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا جو حرب بن امیہ (حضرت امیر معاویہؓ کے دادا) کا حلیف تھا۔ دونوں قیدی مغیرہ کے پوتے تھے۔ مغیرہ، حضرت خالدؓ کا دادا تھا۔ اس بنا پر اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کر دیا۔ یہی واقعہ غزوۂ بدر کا سبب بنا۔

۸۔ قافلہ ابوسفیان پر حملے کی افواہ

شعبان ۲ھ میں قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہا تھا۔ اس قافلے میں اہلِ مکہ کی بڑی دولت تھی۔ یعنی ایک ہزار اونٹ تھے، جن پر کم از کم پچاس ہزار دینار (اشرفیاں) کی مالیت کا ساز و سامان لدا ہوا تھا اور اس کی حفاظت کے لیے صرف چالیس آدمی تھے جب یہ قافلہ اس علاقے میں پہنچا جو مدینہ کی زد میں تھا تو ابوسفیان کو خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے اس پرخطر علاقے میں پہنچتے ہی ایک مخبر مکہ دوڑا دیا تاکہ وہاں سے مدد لے آئے۔ اس شخص نے عرب دستور کے مطابق اپنے اونٹ کی ناک چیری، کان کاٹے، کجاوا الٹا، کرتا پھاڑا اور وادیٔ مکہ میں اسی اونٹ پر کھڑے ہو کر آواز لگائی کہ:

"اے جماعت قریش! قافلہ..... قافلہ ...... تمہارا مال جو ابوسفیان کے ہمراہ ہے، اس پر محمدؐ اور اس کے ساتھی دھاوا بولنے جارہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ تم اسے پاسکو گے۔ مدد...... مدد......"

اس اعلان پر سارے مکہ میں ہیجان برپا ہو گیا۔ قریش کے اکثر لوگ کا مال اس قافلہ میں لگا ہوا تھا۔ تمام بڑے بڑے سردار جنگ کے لیے تیار ہو گئے، جن میں ابوجہل پیش پیش تھا۔ یہ صرف قافلہ ہی کو بچانا نہیں چاہتے تھے بلکہ مسلمانوں کو ختم کر کے ہمیشہ کے لیے اس تجارتی شاہراہ کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔

(ب) واقعات

۱۔ لشکر کفار کی روانگی

قریش نے اپنے تجارتی قافلے کے بچاؤ کے لیے آن کی آن میں تقریباً ایک ہزار کا مسلح لشکر تیار کر لیا۔ یہ لشکر عتبہ بن ربیع کی زیر کمان مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر ابوسفیان سمندر کی طرف سے محفوظ و مامون مکے واپس پہنچ گیا۔ اس پر کچھ صلح پسند لوگوں نے کہا، جس قافلے کی حفاظت کے لیے ہم تیار ہوئے تھے وہ تو بحفاظت واپس آگیا ہے، اب مدینے تک سفر کرنا کیا ضروری ہے؟ لیکن ابوجہل نہ مانا اور کہنے لگا،

اب ہمیں یونہی واپس نہیں جانا چاہیئے۔ اور نہیں تو کم از کم بدر تک ضرور جاتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر ٹھہریں گے۔ دعوتیں اڑائیں گے اور رنگ رلیاں منائیں گے۔ اس سے یقیناً مسلمانوں پر ہمارا رعب بڑھے گا۔"
چنانچہ یہ لشکرِ جرار مدینے کی طرف بڑھتا رہا اور بدر کے مقام پر پہلے پہنچ کر مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا۔

۲۔ لشکرِ کفار کی سروسامانی

قریش کے لشکر میں ایک ہزار سے زیادہ سپاہی تھے۔ ان میں سو سو سواروں کا رسالہ تھا اور ۶۰۰ زرہ پوش تھے اس کے علاوہ اونٹوں کا ہجوم اور سامانِ رسد وافر تھا۔ جانبازوں کی خوشنودی کے لیے شراب کے مٹکے اور دجز گانے والیاں ساتھ تھیں۔ مکہ کے تمام بڑے بڑے سردار اس جنگ میں شریک ہوئے۔ ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا۔ اس لیے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا۔ رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس (بن عبدالمطلب) عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل، اُمیہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے۔ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا، لشکرِ کفار کا سپہ سالار تھا۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ کی مجلس شوریٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صورتِ حال کا علم ہوا تو آپؐ نے مہاجرین و انصار کو جمع کیا اور انہیں بتایا کہ "ایک طرف شمال میں تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف جنوب میں قریش کا مسلح لشکر ہے۔ کدھر چلنا ہے۔ اللہ نے مجھ سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے۔"
اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی پرجوش حمایت کا یقین دلایا۔ پھر حضرت مقدادؓ بن عمر اٹھے اور عرض کی:

> "یارسول اللہ ﷺ! جدھر آپؐ کا رب آپؐ کو حکم دے رہا ہے، اس طرف چلیے۔ جس طرف بھی آپؐ جائیں، ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں کہ اے موسیٰؑ! جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ آپؐ اور آپؐ کے پروردگار چلیں اور لڑیں اور ہم بھی آپؐ کے ساتھ اپنی جانیں لڑائیں گے۔"

حضور اکرم ﷺ نے ان کے حق میں کلمہ خیر ارشاد فرمایا اور دعا دی۔ یہ مہاجرین کی رائے تھی، جن کی تعداد لشکر میں کم تھی۔ حضورؐ کی خواہش تھی کہ انصار کی رائے معلوم کریں، کیونکہ وہی لشکر میں اکثریت رکھتے تھے۔ یہ بات انصار کے کمانڈر اور علمبردار حضرت سعدؓ بن معاذ نے بھانپ لی اور عرض کیا:

> "ہم تو آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کی ہے۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپؐ کا جو ارادہ ہے اس کے لیے پیش قدمی فرمایئے۔ اس ذات کی قسم! جس نے آپؐ کو حق

کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اگر آپؐ ہمیں ساتھ لے کر اس سمندر میں کودنا چاہیں تو ہم اس میں بھی آپؐ کے ساتھ کود پڑیں گے۔ ہمارا ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔"

حضرت سعدؓ کی یہ بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے تمتما اٹھا اور انہیں دعائے خیر دی۔

۴ اسلامی لشکر کی تیاری اور روانگی

غرض ۱۲ رمضان ۲ھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین سو جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے

ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا۔ جو کم عمر تھے واپس کر دیئے گئے کہ ایسے پرخطر موقع پر بچوں کا کام نہیں۔ عمیرؓ بن ابی وقاص ایک کم سن صحابی تھے، جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے۔ آخر حضورؐ نے اجازت دے دی۔ عمیرؓ کے بھائی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے کم سن مجاہد کے گلے میں تلوار حمائل کی۔ اب اسلامی لشکر کی کل تعداد ۳۱۳ تھی، جس میں ساٹھ مہاجرین اور باقی انصار تھے۔ چونکہ غیر حاضری میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا، اس لیے حضورؐ نے حضرت ابولبابہؓ کو مدینہ کا حاکم مقرر فرما کر واپس بھیج دیا۔ ان انتظامات کے بعد حضورؐ بدر کی طرف بڑھے تاکہ کفار کو راہ میں روکا جا سکے۔ بدر مدینے اور مکے کے درمیان ایک چشمے یا کنوئیں کا نام ہے جہاں اس نام سے کچھ آبادی بھی بس گئی تھی۔ بدر پہنچ کر آپؐ ایک جگہ ٹھہرے۔ ایک صحابی حضرت حبابؓ بن منذر نے بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کیا "حضورؐ! یہاں اترنے کا حکم خدا کی طرف سے ہے یا آپؐ اسے اپنے طور پر جنگی اعتبار سے بہتر سمجھتے ہیں؟" حضورؐ نے فرمایا: "یہ خود میری رائے ہے۔" انہوں نے کہا: "اگر ذرا آگے چل کر ہم قریش کے قریب ترین چشمے پر قبضہ کر لیں تو ہمیں ان کے مقابلے میں پانی کی آسانی رہے گی۔" حضورؐ نے اس مدبرانہ مشورے کو پسند فرمایا اور ایسا ہی کیا۔ رات کے وقت اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و کرم سے ابرِ رحمت بھی برسا جس سے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی جمع ہو گیا، جو مسلمانوں کے وضو اور غسل کے کام آیا۔ نیز ریت خوب جم گئی اور پڑاؤ میں آسانی پیدا ہو گئی

۵ لشکرِ کفار کا تذبذب اور ابوجہل کی ہٹ دھرمی

قریش جنگ کے لیے بیتاب تھے

تاہم کچھ نیک دل اس خونریزی سے بچنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے ایک دانا سردار حکیم بن حزام نے سردارِ فوج عتبہ سے کہا کہ جنگ کی ضرورت نہیں۔ قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے۔ وہ تمہارا حلیف تھا۔ تم اس کا خون بہا ادا کر دو۔" عتبہ نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے نہایت خوشی سے منظور کر لیا۔ لیکن ابوجہل نے سختی کے ساتھ اس تجویز کو رد کر دیا۔ اور عتبہ کو اشتعال دلایا کہ اس کے

بیٹے حضرت ابو حذیفہؓ مسلمان ہو چکے ہیں اور اسلامی لشکر کے ساتھ آئے ہیں، اس لیے یہ لڑائی سے جی چراتا ہے۔" عتبہ نے ابو جہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا اور کہا کہ یہ میدانِ جنگ بتا دے گا کہ نامرادی کا داغ کون اٹھاتا ہے؟"

۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ خداوندی میں دعا اور وعدۂ نصرتِ الٰہی

صحابہ کرامؓ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپؐ اس میں تشریف رکھیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ آپؐ کے ہمراہ تھے۔

یہ عجیب منظر تھا۔ ایک طرف کفار کا ایک ہزار کا مسلح لشکر جرار تھا اور دوسری طرف مٹھی بھر مجاہدین۔ سامانِ جنگ کے لحاظ سے مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے، چھ زرہیں، آٹھ دس تلواریں اور ستر اونٹ تھے۔ گویا اتنی بڑی دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی۔ ایسے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی۔ آپؐ دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے:" خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر۔" محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی۔ کبھی سجدہ میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ" خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تیری عبادت نہ ہو گا۔" اس بے قراری پر بندگانِ خاص کو رقت آگئی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے عرض کی:" حضورؐ! خدا اپنا وعدہ وفا کرے گا۔" آخر وحی کے ذریعے آپؐ کو یہ خوشخبری ملی:-

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ (قمر: ۴۵)

ترجمہ: عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔

۷۔ لشکر کی صف بندی اور مبارزت

صبح ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صف آرائی شروع کی۔ دستِ مبارک میں ایک تیر تھا، اس کے اشارہ سے صفیں درست فرماتے تھے۔ پھر آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ جب کفار تمہارے قریب آئیں تو ان پر تیر چلانا اور جب تک وہ تم پر چھا نہ جائیں تلوار نہ کھینچنا۔ حضورؐ نے پہلے سے صحابہ کرامؓ سے فرما دیا تھا کہ یہ فلاں کافر کی قتل گاہ ہے۔ چنانچہ بعد میں وہ کفار وہیں مقتول پڑے تھے۔

عرب کے دستور کے مطابق لڑائی کا آغاز مبارزت سے ہوا۔ یعنی سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا اور مبارز طلبی کی۔ حضورؐ کی ہدایت پر حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ مقابلے کو نکلے۔ عتبہ نے نام پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصارؓ ہیں تو عتبہ نے کہا، ہم کو تم سے غرض نہیں۔" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف خطاب کر کے پکارا کہ" محمدؐ! یہ لوگ ہمارے

جوڑ کے نہیں"۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے۔ عتبہ بولا "ہاں! اب ہمارا جوڑ ہے"۔ عتبہ حضرت حمزہؓ سے ولید حضرت علیؓ سے مقابل ہوا اور دونوں کا فر مارے گئے۔ لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہؓ کو زخمی کر دیا۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہؓ کو کندھے پر اٹھا کر حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔

۸۔ عام لڑائی اور فرشتوں کا نزول

دنیا کی تاریخ میں یہ انوکھی جنگ تھی۔ دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے (جو اب تک کافر تھا) میدانِ جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکرؓ تلوار کھینچ کر نکلے۔ عتبہ میدان میں آیا تو اس کے فرزند حضرت حذیفہؓ اس کے مقابلہ کو آئے۔ حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔ مبارزت کے بعد عام لڑائی شروع ہو گئی اور دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ مسلمانوں کی تعداد اگرچہ بہت تھوڑی تھی، لیکن وہ اس جذبے سے سرشار تھے کہ فتح مند ہوئے تو غازی اور مارے گئے تو شہید۔ گویا دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو گی۔ ابتدا میں کفار نے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ اب حضور اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں نے جوابی حملہ کیا۔ دشمن کے حملوں کی تیزی ختم ہو چکی تھی اور ان کا جوش وخروش سرد پڑ رہا تھا۔ صحابہ کرامؓ ان کی صفوں کو درہم برہم کرتے اور گردنیں کاٹتے آگے بڑھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسولؐ کی دعا قبول فرمائی اور وعدے کے مطابق ایک ہزار فرشتے مسلمانوں کی مدد کو بھیجے۔ حضور اکرمؐ نے ایک مٹھی کنکریلی مٹی لی اور کفار کی طرف پھینکی۔ مشرکین میں سے کوئی بھی نہیں تھا جس کے چہرہ پر یہ مٹی نہ پڑی۔ صحابہ کرامؓ کا بیان ہے کہ ہم دیکھتے تھے کہ ایک کافر کا سر کٹ کر گرتا اور یہ پتا نہ چلتا کہ اسے کس نے مارا۔ ظاہر ہے فرشتے انہیں مار رہے تھے۔

۹۔ ابوجہل کا قتل

ابوجہل کی شرارت اور دشمنیٔ اسلام کا عام چرچا تھا۔ اس بنا پر انصار میں سے معوذؓ اور معاذؓ دو نوجوان بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آئے گا یا اس کو مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعتاً مجھ کو دائیں بائیں دو نوجوان نظر آئے۔ انہوں نے مجھ سے ابوجہل کا پوچھا۔ میں نے اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے۔ یہ سنتے ہی دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آ کر معاذؓ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری، جس سے بازو کٹ گیا، لیکن تسمہ باقی لگا رہا [illegible] حالت میں لڑتے رہے تھے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤں

کے نیچے دبا کر کھینچا کر تسمہ بھی الگ ہو گیا اور اب وہ آزاد تھے۔

ابو جہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے۔ ابو جہل کا کیا انجام ہوا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود نے جا کر لاشوں میں دیکھا تو وہ زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ بولے تو ابو جہل ہے؟ اس نے کہا، ایک شخص کو اس کی قوم نے قتل کر دیا تو یہ فخر کی کیا بات ہے؟ ابو جہل نے ایک دفعہ اُن کو تھپڑ مارا تھا۔ انہوں نے اس انتقام میں اُس کی گردن پر پاؤں رکھا۔ ابو جہل نے کہا، او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے؟ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اس کا سر کاٹ لائے اور حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"یہ اس امت کا فرعون ہے۔"

۱۰۔ خاتمۂ جنگ

اسلام و کفر کے اس اولین فیصلہ کن معرکہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فقید المثال فتح و نصرت سے نوازا۔ اس جنگ میں مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ حضرات نے شہادت پائی۔ جن میں چھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی اور رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قریش کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے۔ ان میں شیبہ، عتبہ، ابو جہل، ابو البختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف وغیرہ قریش کے سرتاج تھے۔ تقریباً ستر آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایات دیں کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ مسلمانوں نے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے قیدیوں کو نان و پنیر کھلایا اور خود کھجوروں پر گزارا کیا۔ مدینہ پہنچ کر حضور اکرمؐ نے مشاورتی اجلاس منعقد کیا کہ جنگی قیدیوں کا کیا کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے سب کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اکثر صحابہؓ نے اس رائے کی تائید کی۔ اس لیے اسی رائے پر عمل کیا گیا۔ صرف دو قیدیوں عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کو قتل کر دیا گیا۔ باقی سب کو فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ جو قیدی فدیہ ادا نہ کر سکے ان کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک تعلیم کس قدر اہم تھی۔ اسیران جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا۔

مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب

بقول مولانا شبلیؒ مغربی مؤرخین کو جن کے نزدیک عالمِ اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسباب ظاہری کے نتائج ہیں۔ حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار پر جن میں سو سوار تھے کار سالہ تھا کیونکر فتح پائی۔ لیکن تائید آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھلائے ہیں تاہم اس واقعہ میں

ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں۔ ذیل میں ان اسباب کا جائزہ لیا جاتا ہے :۔

۱۔ قریش کی نااتفاقی

قریش میں باہم اتفاق نہ تھا۔ عتبہ سردار لشکر لڑنے پر تیار نہ تھا۔ محض ابوجہل کے طعنۂ بزدلی اور اشتعال دلانے پر اسے لڑنے پر آمادہ کیا۔ ادھر قبیلہ زہرہ اور عدی کے لوگ بھی ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کے ساتھ، صحیح سلامت مکہ پہنچنے کی خبر سن کر لڑائی سے کنارہ کش ہو گئے۔ قریش کے معزز و دانا شخص حکیم بن حزام کی بھی یہی مرضی تھی کہ ابن حضرمی کے حلیف اس کا خون بہا ادا کر دیں اور مسلمانوں سے لڑائی نہ کی جائے۔ ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفار مکہ ایک سپہ سالار کے تحت نہیں لڑ رہے تھے بلکہ ہر نامور سردار اپنے تئیں فوج کا کماڈر تھا۔

۲۔ مسلمانوں کا اتحاد اور نظم وضبط

اس کے برعکس مسلمانوں میں کمال درجے کا اتحاد موجود تھا اور وہ ایک ایسے رہنما کی سرکردگی میں لڑ رہے تھے جو اللہ کے محبوب رسول تھے، جن کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ واحکامات براہ راست بذریعۂ وحی خدا کی طرف سے آرہے تھے۔ مسلمانوں میں انتہائی نظم وضبط تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود صفوں کو ترتیب دیا تھا اور فوج کی ہر حرکت آپؐ کے اشارے سے ہوتی تھی، جبکہ کفار مکہ اس خوبی سے بالکل محروم تھے۔ وہ بری طرح بے ترتیبی کے شکار تھے۔

۳۔ مسلمانوں کا جذبۂ جہاد

مسلمانوں نے اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے جہاد وشہادت کے فضائل سنے تھے اس لیے وہ حد درجہ جذبۂ جہاد سے سرشار تھے۔ وہ موت کے خوف سے بے نیاز ہو کر لڑ رہے تھے اور جنت کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی امداد پر پورا پورا یقین تھا، کیونکہ قرآن مجید میں مسلمانوں کی کامیابی کی بشارتیں آچکی تھیں ؎

شہادت ہے مطلوب ومقصودِ مومن ۔۔۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی (اقبال)

۴ مسلمانوں کا سکون واطمینان

مسلمان رات کو سکون واطمینان سے سوئے تھے صبح اٹھے تو تازہ دم تھے۔ بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔ ان پر گھبراہٹ اور پریشانی طاری تھی۔

۵۔ مسلمانوں کی خود اعتمادی

مسلمانوں کے اندر صحبتِ رسولؐ کی بدولت اتنا اعتماد پیدا ہو چکا تھا کہ انہیں ہر کام میں کامیابی نظر آتی تھی۔ وہ سوائے خدا کے کسی اور مخلوق سے ڈرنے اور دبنے والے نہیں تھے۔ اس لیے وہ لڑائی میں نہایت اعتماد سے شریک ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑائی سے پہلے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ اس

جگہ فلاں کافر مارا جائے گا۔ حضورؐ کی اس بات پر انہیں کامل یقین و بھروسا تھا۔ وہ فتح و نصرت کو واضح طور پر اپنے روبرو دیکھ رہے تھے۔

۶۔ مبارزت میں شکست

شروع شروع کی انفرادی لڑائی (مبارزت) میں ہی کفار کے تین مشہور سردار عتبہ، شیبہ اور ولید مارے گئے، جس کی وجہ سے ان کے حوصلے بالکل پست ہو گئے تھے۔

۷۔ محاذِ جنگ کی سہولت

رات کو بارش ہو گئی۔ جس جانب لشکر اسلام کا کیمپ تھا وہاں زمین ریتلی تھی۔ بارش ہونے کی وجہ سے اس کی تہہ جم گئی۔ نیز مسلمانوں کو تازہ پانی وافر مقدار میں میسر آ گیا۔ قریش کا کیمپ چکنی مٹی کے باعث کیچڑ سے بھر گیا۔ انہیں چلنے پھرنے میں دقت محسوس ہونے لگی۔ علاوہ ازیں سورج مسلمانوں کی پشت پر تھا، جبکہ کفار کے عین سامنے تھا، لہٰذا اس کی تیز روشنی کی وجہ سے وہ اچھی طرح سے جم کر نہیں لڑ سکتے تھے

۸۔ نصرت و تائیدِ ایزدی

سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خدا کے آخری محبوب رسول مسلمانوں کے امیرِ لشکر تھے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت و تائید حاصل تھی۔ حضور اکرمؐ نے اس نازک موقع پر خدا کی بارگاہ میں خصوصی دعا مانگی تھی، جسے خدا نے شرفِ قبولیت بخشا اور مسلمانوں کی امداد کے لیے ایک ہزار فرشتے بھیج دیئے۔ نیز حضور اکرمؐ نے مٹھی بھر کنکریلی مٹی کفار کی طرف پھینکی جو حکمتِ خداوندی سے ہر کافر کے منہ پر جا پڑی۔ جس سے وہ ہراساں ہو گئے۔ اسی کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال: ۱۷)

ترجمہ: جب آپؐ نے پھینکا تو درحقیقت آپؐ نے انہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔

کفار پر ابتدا ہی سے مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب طاری کر دیا کہ انہیں مسلمانوں کی تعداد اپنے سے دگنی نظر آنے لگی۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی
(مولانا ظفر علی خاں)

غزوۂ بدر کی اہمیت و نتائج

غزوۂ بدر دنیا کی چند عظیم اور فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتا ہے، کیونکہ اس سے غیر معمولی نتائج برآمد ہوئے۔ اسلام کی راہ میں جو بڑے بڑے دشمن اب تک رکاوٹ بنے ہوئے تھے وہ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے۔ کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور اسلام پرشکوہ دور میں داخل ہوا۔ یہ لڑائی شوکتِ اسلام کا سنگِ بنیاد

بی۔ یہی وجہ ہے کہ جو صحابہ کرامؓ اس غزوہ میں شریک ہوئے انہیں خصوصی فضیلت عطا ہوئی اور وہ جنتی قرار دیئے گئے۔ ذیل میں اہم نتائج بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ یوم الفرقان

قرآن مجید میں غزوۂ بدر کو "یوم الفرقان" قرار دیا، جس میں حق و باطل کا نمایاں فرق کھل کر سامنے آگیا۔ اس دن فیصلہ ہوگیا کہ زندہ رہنے کا حق کس کو ہے۔ کفر کو عبرت ناک شکست فاش ہوئی اور اس کا فخر و غرور خاک میں مل گیا۔ یہ حقیقت ثابت ہوگئی کہ اسلام ایک برتر قوت ہے اور اسے زندہ و پائندہ رہنا ہے۔ کفر اپنے زعم باطل میں اسلام کو ملیامیٹ کرنے آیا تھا، لیکن وہ خود ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔

۲۔ قریش کی ذلت و رسوائی

اس جنگ نے قریش کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا۔ عتبہ، ولید، شیبہ، ابوجہل اور امیہ بن خلف وغیرہ کے مارے جانے سے سیاسی لحاظ سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ مکہ کے گھر گھر میں ماتم کی صفیں بچھ گئیں۔ ان کی ندامت و شرمندگی کا یہ عالم تھا کہ با اثر لوگوں نے بین و بکا کرنے سے منع کر دیا۔ ابولہب کو تو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔

۳۔ مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوگئے

اس غزوہ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوگئے۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اگر اللہ کی راہ میں صبر و استقامت کے ساتھ پیش قدمی اور جہاد کیا جائے تو دشمن کی کثرت کچھ معنی نہیں رکھتی بشرطیکہ انسان اپنی قوت و طاقت پر نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل و کرم اور رحمت پر نظر رکھے۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی غیبی امداد فرماتا ہے جیسا کہ اس غزوہ میں اس نے فرشتوں کے ذریعے مدد فرمائی۔

۴۔ اسلام کا رشتہ قوی تر

اس غزوہ نے یہ حقیقت بھی ثابت کر دی کہ وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں۔ حضورؐ کے حکم پر بیٹا، باپ کے خلاف اور بھائی بھائی کے خلاف تلوار اٹھا سکتا ہے۔ اس آزمائش میں مسلمان پورے اتر چکے تھے۔ انہیں اللہ اور رسولؐ کا رشتہ تمام رشتوں سے عزیز تھا اور اس رشتہ کو قائم رکھنے کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دے سکتے ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بیٹا جنگ کے بعد کہنے لگا کہ اباجان! آپ بدر کے میدان میں کئی دفعہ میری تلوار کے سامنے آئے، لیکن میں نے باپ سمجھ کر چھوڑ دیا۔" حضرت ابوبکرؓ بولے: بیٹا! اگر تم میری تلوار کے آگے آتے تو میں تمہیں قطعاً نہ چھوڑتا، کیونکہ اس وقت تم اللہ کے رسولؐ کے خلاف لڑ رہے تھے۔"

۵۔ یہود کی مسلم دشمنی

غزوۂ بدر نے یہودیوں کی خباثت، بدباطنی، مکروفریب اور سازش کا پردہ چاک کر دیا، کیونکہ انہوں نے جنگ میں مسلمانوں کا کوئی ساتھ نہ دیا، بلکہ جب مسلمانوں کو اس قدر عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تو یہودیوں کے حسد اور کینے میں اور اضافہ ہو گیا۔ انہیں اپنی سیاسی حیثیت خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ اب انہوں نے پہلے سے بڑھ کر کفارِ مکہ کے ساتھ سازشوں کا جال بُننا شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخر کار انہیں مدینہ سے نکالنا پڑا۔

۶۔ قبائلِ مدینہ پر اثرات

غزوۂ بدر نے مدینہ سے باہر کے عرب قبائل میں بھی یہ احساس پیدا کر دیا کہ اسلام اب تک غالب قوت ہے جس کا راستہ روکنا ممکن نہیں، لہٰذا اس کے آگے سرِ تسلیم خم کیے بغیر گزارہ نہیں۔ اس طرح پورے ملک عرب میں اسلامی طاقت کی دھاک بیٹھ گئی اور مختلف قبائل مدینہ کے ساتھ سیاسی الحاق و اتحاد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یوں مسلمانوں کے حلیفوں کی تعداد بڑھ گئی۔

۷۔ اشاعت و فروغِ اسلام

غزوہ بدر نے حق و باطل کے درمیان فرق کر کے حق کی اشاعت و فروغ کے دروازے ہمیشہ کیلئے کھول دیئے۔ اس فیصلہ کن معرکے نے لوگوں کو اسلام کی طرف متوجہ کر دیا۔ اگر خدانخواستہ اس جنگ میں مسلمان ہار جاتے تو وہ واقعی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے اور اسلام کی عالمگیریت مشکوک ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک واضح فتح نصیب کی، جس سے ان لوگوں کو بھی راہِ ہدایت نصیب ہوئی جو اب تک اسلام کی حقانیت اور کامیابی کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا تھے۔

۸۔ بعد کی جنگوں کا پیش خیمہ

اگرچہ اس جنگ میں کفارِ مکہ کو عبرتناک شکست ہوئی اور مدینہ کی اسلامی ریاست کافی حد تک محفوظ ہو گئی، لیکن کفار اپنی ذلت آمیز شکست کو بھلا نہیں سکتے تھے۔ جنگ سے پہلے تو وہ محض عمرو بن حضرمی کا انتقام رکھتے تھے، اب گھر گھر سے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ مسلسل اس آگ میں جل رہے تھے انہوں نے بدلہ لینے کے لیے اندر ہی اندر تیاریاں شروع کر دیں۔ اس لحاظ سے یہ جنگ بعد میں ہونے والے غزوات اور جنگوں کا پیش خیمہ بنی۔

۹۔ مسلمانوں کا حسنِ اخلاق

جو جنگی قیدی مسلمانوں کے پاس تھے، وہ مسلمانوں کے عمدہ حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے جا کر اسلام اور مسلمانوں کی بڑی تعریفیں کیں، جس سے کفار بہت متاثر ہوئے۔ اسی غزوہ میں ایفائے عہد کی

عمدہ مثال سامنے آتی ہے۔ جنگ سے پہلے حضرت حذیفہؓ بن الیمان اور حضرت حسیلؓ دو صحابی کہیں سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے روک کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی مدد کو جا رہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا۔ وہ حضور اکرمؐ کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی۔ اس نازک موقع پر ایک ایک آدمی کی بھی سخت ضرورت تھی، لیکن حضورؐ نے فرمایا: ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔

۱۰۔ اغیار کی گواہی انسائیکلو پیڈیا بریطانیکا کی رو سے غزوۂ بدر نہ صرف تاریخ اسلام کا زبردست معرکہ ہے بلکہ ساری دنیا کا اہم ترین واقعہ ہے۔

۱۱۔ قرآنی تبصرہ اسی غزوہ کے تعلق سے سورۂ انفال نازل ہوئی۔ جو درحقیقت اس غزوے پر ایک خدائی تبصرہ ہے۔ اس تبصرے کی چند باتیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی کہ وہ اپنی کوتاہیوں اور اخلاقی کمزوریوں کی اصلاح کریں اور اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے پاک صاف کر کے کامل ترین بن جائیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ اس فتح میں اس کی تائید اور غیبی مدد شامل تھی۔ مسلمان اپنی شجاعت و قوت کے فریب میں نہ آجائیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کریں اور اس کے رسولؐ کی پیروی پر کاربند رہیں۔

۳۔ مسلمانوں کو مالِ غنیمت کے معاملے میں مخاطب کرتے ہوئے انہیں اس مسئلے کے تمام بنیادی قواعد و اصول سمجھائے گئے ہیں۔

۴۔ اس مرحلے پر اسلامی دعوت کو جنگ و صلح کے جن قوانین کی ضرورت تھی ان کی وضاحت کی گئی۔ علاوہ ازیں اسلامی حکومت کے قوانین کی کئی دفعات بیان کی گئی ہیں اور جہاد کے اصل اغراض و مقاصد واضح کیے گئے ہیں۔

۵۔ پھر مشرکین و منافقین کو اور یہود اور جنگی قیدیوں کو مخاطب کر کے ترغیب دی گئی ہے کہ وہ حق کے سامنے جھک جائیں اور اس کے پابند ہو جائیں۔

غزوۂ بدر

شاہنامہ اسلام سے اقتباس

(حفیظ جالندھری)

یہ لشکر ساری دنیا سے انوکھا تھا نرالا تھا
کہ اس لشکر کا افسر ایک کالی کملیؐ والا تھا

یہ پہلا جیش تھا دنیا میں افواجِ الٰہی کا
جسے اعلان کرنا تھا خدا کی بادشاہی کا

تھے ان کے پاس دو گھوڑے چھ زرہیں آٹھ تلواریں
پلٹنے آئے تھے یہ لوگ دنیا بھر کی تقدیریں

نہ تیغ و تبر پر تکیہ نہ خنجر پر نہ بھالے پر
بھروسا تھا تو اک سادہ سی کالی کملیؐ والے پر

غزوۂ اُحد ۳ھ / ۶۲۵ء

سوال: غزوۂ اُحد کے اسباب، واقعات اور نتائج بیان کیجیے، نیز بتایئے کہ اس میں مسلمانوں کو نقصان کیوں اٹھانا پڑا؟

جواب (۱)

غزوہ احد کے اسباب

۱۔ کفار کا جذبہ انتقام

بدر کے میدان میں اہل مکہ کو جس ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس کے انتقام کی آگ ان کے دلوں میں مسلسل بھڑک رہی تھی۔ چنانچہ ان کے کچھ سردار مل کر ابوسفیان کے پاس گئے اور اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی لے گئے، جن کے رشتہ دار بدر کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ چونکہ جنگِ بدر کا فوری سبب ابوسفیان ہی تھے، اس لیے وہ انکار نہ کر سکے اور سالِ تجارت کے نفع میں سے جو مشترک رقم جمع کی جاتی تھی، اس سے جنگ کی تیاری شروع کر دی گئی۔ یہ سارا مال جس کی مقدار ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار تھی جنگ کی تیاری کے لیے بیچ ڈالا تھا۔

اس بار قریش نے اپنے مددگار قبائل کو بھی ساتھ ملا لیا۔ نیز ان کے شاعروں نے جذبۂ انتقام میں ڈوبے ہوئے اشعار سنا سنا کر لوگوں کو خوب جوش دلایا۔ سرداروں کی بیویاں اور بیٹیاں ساتھ چلنے پر تیار ہو گئیں، تاکہ مقتولوں کے قاتلوں کا انجام دیکھیں، اس سے یہ بھی مقصد تھا کہ اہل لشکر ان کی حفاظت کے خیال سے میدان سے نہیں بھاگیں گے۔ قریش کے مشہور سردار جُبیر بن مطعم کا ایک حبشی غلام تھا جو وحشی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ حربہ (چھوٹا نیزہ) چلانے میں مشہور تھا۔ جُبیر نے کہا تم بھی ساتھ چلو۔ اگر تم نے حمزہؓ کو ہلاک کر دیا تو تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔

۲۔ غزوہ سویق ۲ھ

جب جنگ بدر میں اہل مکہ کے ممتاز سردار مارے گئے تو انہوں نے اس کے بعد ابوسفیان بن حرب کو اتفاق رائے سے اپنا امیر اعظم مقرر کیا۔ اس پر ابوسفیان نے مکے میں پہنچ کر یہ عہد کیا کہ میں جب تک بدر کے مقتولوں کا انتقام نہ لوں گا، غسل نہ کروں گا اور نہ سر میں تیل ڈالوں گا۔ چنانچہ وہ ایک بار مدینے کے قرب وجوار میں رہنے والے یہودیوں کے پاس دو سو سوار لے کر آئے اور رات کے وقت بنو نضیر کے سردار سلام بن مشکم کے پاس پہنچے اور مسلمانوں کے حالات دریافت کیے، سلام بن مشکم نے ان کو اپنا

مہمان رکھا، بلکہ مسلمانوں پر شب خون مارنے کے طریقے سمجھائے۔

چنانچہ ابوسفیان نے مناسب موقع دیکھ کر مدینے سے چند میل کے فاصلے پر مقام عریض پر حملہ کیا، نخلستان کو آگ لگا دی اور انصار کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اپنے خیال میں اپنی قسم پوری کر کے تیزی سے مکے کی راہ لی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اس اچانک حملے کی خبر ملی تو آپ مقام کدر تک ان کے پیچھے گئے، لیکن وہ لوگ اتنی تیزی سے بھاگ گئے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی ہاتھ نہ آیا۔ ابوسفیان رسد کے طور پر جو ستو لایا تھا، اس کے تھیلے راستے میں پھینکتا گیا تا کہ بوجھ ہلکا ہو جائے۔ ستوؤں کو عربی میں سویق کہتے ہیں۔ لہٰذا اس مناسبت سے اس مہم کا نام غزوہ سویق پڑ گیا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش

قریش مکہ بدر کے مقتولین کا بدلہ لینے کے لیے سخت بے تاب تھے۔ وہ آتش انتقام میں سلگ رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی گھناؤنی سازش تیار کی۔ ان کے ایک رئیس صفوان بن امیہ نے جس کا باپ بدر میں مارا گیا تھا۔ ایک شخص عمیر بن وہب کو جس کا بیٹا ابھی تک مسلمانوں کی قید میں تھا، پوشیدہ طور پر آنحضرتؐ کو قتل کرنے پر ابھارا اور اسے یہ لالچ دیا گیا کہ اہل و عیال کی کفالت کرے گا اور اس کا قرض اتار دے گا۔ یہ معاملہ دونوں کے درمیان خانہ کعبہ میں انتہائی راز داری سے طے ہوا۔ چنانچہ عمیر نے زہر میں تلوار بجھائی اور مدینہ چل پڑا۔ وہاں پہنچا تو حضرت عمر فاروقؓ نے اسے دیکھ لیا۔ انہیں اس پر شک گزرا، چنانچہ اسے پکڑ کر حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ حضورؐ نے اُسے آنے کا مدعا پوچھا تو بولا: "اپنا بیٹا چھڑانے آیا ہوں۔" حضورؐ نے فرمایا: "کیا تم اور صفوان نے خانہ کعبہ میں میرے قتل کی سازش نہیں کی؟" اس پر عمیر حیران رہ گیا۔ وہ جان گیا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے یہ خبر حضورؐ کو بتا دی ہے۔ چنانچہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ حضورؐ نے اس کے بیٹے کو آزاد کر دیا۔ وہ مکہ چلا گیا اور اس کی تبلیغ سے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔

۴۔ یہودیوں کی درپردہ سازش

قریش مکہ ایک طرف تو خود جنگ کی تیاریاں کرنے لگے اور دوسری طرف انہوں نے مدینہ کے یہودیوں اور عرب کے دیگر قبائل کے ساتھ ساز باز شروع کر دی اور انہیں مسلمانوں کے خلاف حملہ کے لیے تیار کرنے لگے۔ کعب بن اشرف ایک مال دار اور بااثر یہودی تھا۔ وہ معروف شاعر بھی تھا۔ ہمیشہ حضورؐ اور مسلمانوں کی ہجو کرتا اور کفار کو بھڑکاتا۔ اس نے مکہ پہنچ کر مشرکین کی غیرت اور آتش انتقام کو خوب تیز کیا اور مدینہ واپس آ کر صحابہ کرامؓ کی عورتوں کے بارے میں بیہودہ شعر کہنے شروع کیے۔ آخر مسلمانوں نے اسے قتل کر دیا۔ مشرکین کی خواتین نے بھی جوشِ انتقام میں یہ قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مقتول عزیزوں کے

قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گی۔

۵۔ معاشی بدحالی کا خطرہ

جنگ بدر میں کفار کی شکست نے ان پر واضح کر دیا کہ مسلمان جب بھی چاہیں، شام کا تجارتی راستہ بند کر کے انہیں اقتصادی لحاظ سے تباہ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ عراق کا راستہ بھی مسلمانوں سے محفوظ نہ تھا۔ ایک دفعہ صفوان نے نجد کے راستے ایک قافلہ عراق بھیجا تو مسلمانوں نے حضرت زیدؓ بن حارث کی قیادت میں لوٹ لیا۔ لہٰذا کفار مکہ نے تہیہ کر لیا کہ ریاست مدینہ کو ختم کر کے اپنے معاشی مفادات کا تحفظ کریں۔

واقعات

۱۔ قریش کا لشکر

قریش نے شوال ۳ھ میں تین ہزار کا لشکر تیار کیا سواری و باربرداری کے لیے تین ہزار اونٹ تھے اور رسالے کے لیے دو سو گھوڑے، حفاظتی ہتھیاروں میں سات سو زرہیں تھیں۔ اس کے علاوہ قائدین قریش کی کئی عورتیں بھی ساتھ تھیں جو رواج کے مطابق فوج میں غیرت و جوش پیدا کرنے کے لیے رجز و مرثیہ پڑھتیں۔ ابوسفیان کے پورے لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ رسالے کی کمان خالد بن ولید کو دی گئی اور عکرمہ بن ابوجہل کو معاون بنایا گیا۔ پرچم مقررہ دستور کے مطابق قبیلہ بنی عبدالدار کے ہاتھ میں دیا گیا۔ یہ لشکر کفار مکہ سے چل کر بدھ کے روز مدینہ کے قریب احد پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا۔

۲۔ لشکر اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ مسلمان ہو چکے تھے اور ابھی مکہ میں ہی تھے۔ انہوں نے حضورؐ کو قریش کی تیاریوں کی اطلاع بھجوا دی۔ اس پر آپؐ نے قریش کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کے لیے جاسوسی دستے متعین کر دیئے چنانچہ آپؐ کو اطلاع دی گئی کہ لشکر کفار مدینہ کے قریب آگیا ہے اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا ہے۔ آپؐ نے حضرت حبابؓ بن منذر کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں۔ انہوں نے آکر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی۔ چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، اس لیے ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ اور حضرت سعدؓ بن معاذ ہتھیار لگا کر تمام رات مسجد نبوی کے دروازے پر پہرہ دیتے رہے۔

صبح کو آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعے میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گزین ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے بھی یہی رائے دی۔ لیکن ان نوخیز صحابہؓ نے جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر

تشریف لائے۔ اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خلاف مرضی نکلنے پر مجبور کیا۔ سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن نمازِ جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہؓ کے ساتھ شہر سے نکلے۔ ان میں ایک سو زرہ پوش تھے۔

۳۔ منافقین کی دغابازی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے صرف ایک میل ہی باہر گئے تھے کہ عبداللہ بن ابی، رئیس المنافقین اپنے تین سو ساتھیوں سمیت یہ بہانہ بنا کر واپس ہو گیا کہ میری تجویز یعنی شہر کے اندر رہ کر لڑنے پر عمل نہیں کیا گیا۔ دراصل یہ اس کی باطنی خباثت اور منافقت کا کھلم کھلا مظاہرہ تھا۔ وہ درپردہ کفار سے ساز باز رکھتا تھا اور اس بہانے سے محض اس کا مقصد مسلمانوں میں بددلی پیدا کرنا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ مسلمانوں کے لیے بہتر تھا کہ منافقت کا کھوٹ الگ ہو گیا۔

۴۔ مسلمانوں کا بے پناہ جذبۂ جہاد

لشکر اسلام میں جذبۂ جہاد کے تحت شریک ہونے کے لیے لوگ بڑے جوش وخروش سے آئے تھے یہاں تک کہ کمسن بچے بھی جذبۂ جہاد سے سرشار تھے اور وہ حضورؐ کے قدموں میں نچھاور ہونے کے لیے حاضر ہوئے۔ کچھ بچوں کو واپس کر دیا گیا، لیکن جب کم سن صحابی حضرت رافعؓ سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو، واپس جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے۔ چنانچہ ان کی ترکیب چل گئی اور وہ لے لیے گئے۔ حضرت سمرہؓ ایک نوجوان جو ان کے ہم عمر تھے، انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافعؓ کو کشتی میں پچھاڑ لیتا ہوں، اس لیے اگر ان کو اجازت ملی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیئے۔ چنانچہ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا۔ حضرت سمرہؓ نے حضرت رافعؓ کو زمین پر دے مارا، اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاعی منصوبہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگے بڑھ کر وادی کے آخری سرے پر واقع اُحد پہاڑ کی گھاٹی میں نزول فرمایا اور وہیں اسلامی لشکر کا کیمپ لگوایا۔ سامنے مدینہ تھا اور پیچھے اُحد کا بلند و بالا پہاڑ۔ اس طرح دشمن کا لشکر مسلمانوں اور مدینہ منورہ کے درمیان حدِ فاصل بن گیا۔ اس طرح حضور اکرمؐ نے کوہِ احد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کو علم عنایت فرمایا، حضرت زبیرؓ بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے حضرت حمزہؓ کو اس حصّہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف ایک پہاڑی درہ تھا۔ اندیشہ تھا کہ دشمن ادھر سے حملہ نہ کر دے۔ اس لیے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حضرت عبداللہؓ بن جبیر اس دستے کے افسر مقرر ہوئے۔ انہیں حضورؐ نے یہ تاکید فرمائی:

"اگر تم لوگ دیکھو کہ ہمیں پرندے اچک رہے ہیں تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا اور اگر دیکھو کہ ہم نے قوم کو شکست دے دی ہے اور ہم مالِ غنیمت سمیٹ رہے ہیں تو بھی ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا۔"

۶۔ قریش کا جنگی منصوبہ

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے انہوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی۔ میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا۔ میسرہ عکرمہ بن ابو جہل کو دیا، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا، جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیراندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، دو سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔ یاد رہے کہ کوتل بن سوار کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔

۷۔ آغازِ جنگ اور مسلمانوں کی فتح

جنگ کا آغاز اس طرح ہوا کہ قریشی عورتیں دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں جن میں مقتولین بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں۔ پھر ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبولِ عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ انصار جب ان کو دیکھیں گے تو رسول اللہؐ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لیکن انصار نے اس پر لعن طعن کی اور وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا: "کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے۔" حضرت علی مرتضیٰؓ نے آگے بڑھ کر اسے جہنم واصل کر دیا۔ طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے عَلَم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا، حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور وہ بھی مارا گیا۔

اب عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ فوجوں کے دل میں جا گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ حضرت ابو دجانہؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ انہیں آنحضرتؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اپنی تلوار عطا فرمائی اور انہوں نے واقعی اس کا حق ادا کر دیا۔ ہند سامنے آئی تو ہاتھ روک لیا کہ حضورؐ کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔ حضرت حمزہؓ بھی کفار کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔

۸۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت

حضرت حمزہؓ دو دستی تلوار چلاتے تھے اور جو کافر سامنے آتا اسے جہنم واصل کرتے جاتے تھے۔ وحشی حبشی ان کی تاک میں تھا۔ جب حضرت حمزہؓ اس کے پاس سے گزرے تو اس نے تاک کر حربہ پھینکا، جو ان کی

ناف سے گزر کر پشت سے پار نکل گیا۔ حضرت حمزہؓ وحشی کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھے، لیکن زخم کاری تھا۔ اس لیے چکرا کر گرے اور رُوح عرش کی طرف پرواز کر گئی۔ ہند بنت عتبہ نے انتقام کے طور پر حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا، لیکن نگل نہ سکی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مرحوم چچا کو "سید الشہدا" کا لقب دیا۔

۹۔ کفار کے قدم اکھڑ گئے

کفار کے علم بردار لڑ لڑ کر قتل ہو جاتے تھے، تاہم علَم گرنے نہیں پایا تھا۔ ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علَم کو ہاتھ میں لے لیتا۔ کفار بہت بے جگری سے لڑ رہے تھے، تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف تھا علَم برداروں کے قتل اور حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ کے بے پناہ حملوں سے لشکر کفار کے قدم اکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں، بدحواس ہو کر بھاگیں اور مطلع صاف ہو گیا۔ کفار نے شکست کھا کر میدان سے منہ پھیر لیا۔

۱۰۔ فتح شکست میں بدل گئی

جب مسلمانوں نے دیکھا کہ کفار میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں تو وہ اپنی فتح جان کر مالِ غنیمت سمیٹنے لگے ادھر جب پہاڑی درے کے تیر اندازوں نے یہ نقشہ دیکھا تو وہ بھی میدان میں اُتر آئے۔ حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے انہیں حضور اکرمؐ کے تاکیدی احکامات یاد دلائے، لیکن وہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے نیچے اُتر آئے اور وہاں صرف حضرت عبداللہؓ سمیت دس آدمی رہ گئے۔ ادھر خالد بن ولید نے جب مورچہ تقریباً خالی دیکھا تو اپنے دستے کی مدد سے پیچھے سے اچانک حملہ کر دیا۔ حضرت عبداللہؓ اپنے باقی ساتھیوں سمیت شہید ہوئے مسلمان جو بالکل بے خبر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول تھے، اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکے، ان میں ایک دم سراسیمگی پھیل گئی اور وہ بدحواسی میں باہم ایک دوسرے پر وار کرنے لگے۔

۱۱۔ سخت ترین آزمائش

اسی دوران ایک مشہور کافر شہسوار ابن قمیئہ نے مسلمانوں کے علمبردار حضرت مصعبؓ کو شہید کر دیا، وہ کسی حد تک رسول اللہؐ کے مشابہ تھے، چنانچہ وہ پکار پکار کر کہنے لگا "میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا۔" (معاذ اللہ) اس خبر نے مسلمانوں کے رہے سہے اوسان خطا کر دیئے اور بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ حضورؐ کے گرد صرف بارہ جانثار باقی رہ گئے، لیکن ذوالفقار حیدری اس وقت بھی بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے دل شکستہ ہو کر تلوار پھینک دی کہ اب لڑنے سے کیا حاصل ہے؟ ابن نضرؓ انصاری نے کہا "اب زندہ رہ کر کیا کریں گے، اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

بہت سے جاں نثار اس حالت میں بھی لڑتے جاتے تھے۔ عین اس وقت حضرت کعبؓ بن مالک کی نظر حضورؐ پر پڑی، انہوں نے پہچان کر پکارا "مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ادھر ہیں۔" یہ آواز سنتے ہی

ٹوٹی ہوئی ہمت پھر بندھ گئی اور مسلمان اس سمت آ گئے۔ کفار نے بھی ہر طرف سے سمٹ کر اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ ان کا ریلا دیکھ کر حضورؐ نے آواز دی "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" اس آواز پر سات انصاری بڑھے اور ایک ایک کر کے نثار ہو گئے۔ کسی بدبخت نے دور سے پتھر مارا جس سے آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے۔ عبداللہ بن قمیہ بڑھتے بڑھتے حضورؐ تک پہنچ گیا اور چہرۂ انور پر تلوار ماری، مغفر کی دو کڑیاں پیوست ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے ہر طرف سے حصار میں لے لیا۔ حضرت ابودجانہؓ آپؐ کے سامنے جھک کر سینہ سپر ہو گئے، جو تیر آتا تھا، اسے پیٹھ پر روکتے تھے۔ حضرت طلحہؓ تلوار کے وار ہاتھوں پر روکتے تھے۔ ایک ہاتھ کٹ کر الگ ہو گیا۔ حضرت ابوطلحہؓ نے تین کمانیں توڑیں اور سینہ سامنے کر دیا کہ حضور اکرمؐ کو زخم نہ پہنچے۔ حضورؐ پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی، لیکن رحمتِ عالمؐ کی زبان پر اس وقت بھی یہ الفاظ تھے: "اے خدا! میری قوم کو بخش دے کہ وہ جانتے نہیں۔" چہرۂ انور سے خون جاری تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ نے زخم کو دھویا اور چٹائی کا ٹکڑا جلا کر اسے زخم میں بھرا، اس سے خون تھما۔

۱۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نئی دفاعی حکمت عملی

مشرکین کا ریلا رکا تو رسول اللہؐ نے یہ دفاعی حکمت عملی اختیار فرمائی کہ چند جاں نثاروں کے ساتھ پہاڑی کے اوپر چڑھ گئے۔ دشمن بھی اس طرف بڑھے، لیکن حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے ان پر پتھر برسائے، اس لیے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ ابوسفیان نے پہاڑی پر چڑھ کر آواز دی "محمد یہاں ہیں؟" حضورؐ نے مسلمانوں کو جواب دینے سے منع فرما دیا۔ ابوسفیان نے جواب نہ پا کر حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کو آواز دی، اس پر بھی جب کوئی جواب نہ ملا، تو اس نے مسرت سے نعرہ لگایا کہ سب مارے گئے۔ حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے۔ بولے: "دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں۔" ابوسفیان نے کہا "اعل ھبل (اے ہبل! تو اونچا رہ)" صحابہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے کہا "اللہ اعلیٰ واجل (اللہ اونچا اور بڑا ہے)" اس کے بعد ابوسفیان نے پکار کر کہا، یہ بدر کی جنگ کا بدلہ ہے۔ ہمارا تمہارا مقابلہ آئندہ برس پھر بدر میں ہوگا۔" آپؐ نے صحابہؓ سے کہلوایا "ہمیں منظور ہے۔"

۱۳۔ خاتمہ جنگ

اس معرکہ میں ۷۰ مسلمان شہید ہوئے اور ۴۰ زخمی۔ کفار کے ۳۰ آدمی مارے گئے۔ مشرکین نے جاتے جاتے اس درندگی کا مظاہرہ کیا کہ شہدا کی نعشوں کا مثلہ کیا۔ ہندہ زوجہ ابوسفیان نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ دانتوں سے چبایا۔ دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو یہ خیال کر کے کہ ابوسفیان کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو، تو حضورؐ نے ستر آدمی اس کے تعاقب میں بھیجے۔ ابوسفیان اُحد سے روانہ ہو کر جب مقام روحا پہنچا، یہاں خیال آیا کہ کام ناتمام رہ گیا۔ آنحضرتؐ کو پہلے ہی سے گمان تھا، دوسرے ہی دن حضورؐ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ

جائے۔ چنانچہ حمراء اسد تک جو مدینہ سے ۸ میل ہے، تشریف لے گئے۔ اس دوران قبیلہ خزاعہ کا سردار معبد ابوسفیان سے ملا اور اسے بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تازہ تیاری کر کے نکلے ہیں، جس کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ ابوسفیان نے یہ سن کر اپنا ارادہ بدل دیا اور مکہ کی طرف کوچ کر گیا۔

حضور اکرمؐ کی شہادت کی افواہ مدینے میں پہنچ گئی تھی۔ یہ سنتے ہی بہت سی مسلمان عورتیں میدان جنگ میں کود پڑیں۔ انہی میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ بھی شامل تھیں۔ انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے تھے۔ باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا "بخیر ہیں"۔ اس نے پاس آ کر چہرہ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھیں:

کُلُّ مصیبۃٍ بعدک جلل

تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں

ہیں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا

اے شہِ دینؐ تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

تبصرہ غزوہ احد کے انجام کے بارے میں طویل بحثیں کی گئی ہیں کہ آیا اسے مسلمانوں کی شکست سے تعبیر کیا جائے یا نہیں؟ یہ درست ہے کہ وقتی طور پر مشرکین کو برتری حاصل تھی اور مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا، لیکن اسے کفار کی فتح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مسلمان عارضی شکست کے باوجود میدان میں ڈٹے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نئی دفاعی حکمت عملی اختیار کر کے اسلامی فوج کو پھر سے منظم کر لیا، کفار کا تعاقب کیا گیا اور آخر وہ میدان سے فرار ہو گئے۔ قریش کو زیادہ سے زیادہ صرف یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انہوں نے ایک وقتی موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچا دیا، لیکن وہ کوئی زیادہ نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے چنانچہ ابوسفیان یہ خطرہ محسوس کر کے میدان سے کوچ کر گیا کہ مسلمانوں سے دوبارہ ٹکر لی تو سخت تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس لحاظ سے حملہ آور کا اپنا مقصد پورا کئے بغیر واپس چلے جانا فتح کیونکر ہوا؟ چنانچہ یہ عجیب بات ہے کہ بظاہر فتح حاصل کرنے والا دشمن میدان سے بھاگ رہا ہے اور وقتی طور پر ہارنے والا فریق میدان میں برابر ڈٹا ہوا ہے۔

علامہ ابن قیمؒ کا جائزہ علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ غزوۂ احد میں پیش آنے والے زک میں بڑی عظیم ربانی حکمتیں اور فوائد تھے، مثلاً مسلمانوں کو معصیت کے برے انجام سے آگاہ کرنا۔ تیر اندازوں نے حکم رسولؐ کی خلاف ورزی کی۔ اسی وجہ سے زک اٹھانا پڑی۔ ایک حکمت پیغمبروں کی اس سنت کا اظہار تھا کہ پہلے وہ ابتلا میں ڈالے جاتے ہیں، پھر

انجام کار انہیں کو کامیابی ملتی ہے۔ اگر انہیں ہمیشہ کامیابی ہی کامیابی حاصل ہو تو اہل ایمان کی صفوں میں وہ لوگ بھی گھس آئیں گے جو صاحبِ ایمان نہیں ہیں۔ پھر صادق و کاذب میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اللہ اہلِ ایمان کو شہادت اور صبر و استقامت کے نتیجہ میں بلند درجات سے نوازتا ہے۔ وغیرہ۔

مسلمانوں کو نقصان کیوں اٹھانا پڑا؟

۱۔ مسلمان تیر انداز جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے سالار حضرت عبداللہ بن جبیر کے واضح اور تاکیدی احکامات کی خلاف ورزی کی، اس کا خمیازہ زبردست نقصان کی شکل میں بھگتنا پڑا اسے عملاً نافرمانی تو نہیں کہہ سکتے، کیونکہ صحابہ کرامؓ ایسا نہیں کر سکتے، البتہ اسے اجتہادی غلطی قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ رئیس المنافقین، عبداللہ بن ابی کا اپنے تین سو ساتھیوں سمیت پلٹ جانا اور انصار کے بعض قبائل میں بددلی پیدا کرنے کا موجب بنا۔

۳۔ بعض مسلمان خالد بن ولید کی اس جنگی چال کو بھانپ نہ سکے جو اس نے اپنے لشکر کو جان بوجھ کر پسپا کر کے عقب سے حملہ کرنے کے لیے چلی تھی اور اسے کفار کی پسپائی سمجھ کر مالِ غنیمت لوٹنے لگے۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی غلط افواہ نے بہت سے مسلمانوں کو بددل کر دیا کہ اب لڑنے کا کیا فائدہ؟

۵۔ مسلمان عین لڑائی کے وقت مال کی محبت میں ایسے گرفتار ہوئے کہ یہ بھی انتظار نہ کیا کہ دشمن کو پوری طرح شکست ہو جائے۔ چنانچہ مالِ غنیمت کو لوٹنے کے لیے درہ پر متعین مجاہدین بھی نیچے اتر آئے۔

غزوہ احد کے نتائج و اثرات

۱۔ مسلمانوں کے رعب و دبدبہ میں کمی

جنگ بدر میں عظیم الشان فتح کے بعد عرب کے قبائل مسلمانوں سے مرعوب ہو گئے تھے، لیکن احد سے مسلمانوں کے رعب و دبدبہ کو اتنا نقصان پہنچا کہ اب وہ قبائل پھر سے پر پرزے نکالنے لگے اور آئندہ جنگ میں مسلمانوں کے خلاف کفار کے حلیف بن گئے۔ ان میں سے اکثر نے مسلمانوں سے کیے گئے معاہدوں کی خلاف ورزی شروع کر دی اور مسلمانوں کو دھوکے دیئے۔ قبیلہ کلاب نے دھوکہ سے ۷۰ صحابہ مبلغین اسلام کو شہید کر دیا۔

۲۔ **کفار کی جنگی تیاریاں:** کفار کے حوصلے بلند ہو گئے اور اب انہیں یقین ہو گیا کہ

مسلمانوں پر ایک بھرپور حملہ کر کے انہیں ختم کیا جا سکتا ہے اس طرح انہوں نے جنگ خندق کی تیاری شروع کر دی تاکہ ایک فیصلہ کن جنگ ہو جائے۔

۳۔ یہود کی مخالفت میں شدت

یہود کی مخالفت پہلے سے تیز ہو گئی۔ اب انہوں نے قریش مکہ کو ہر قسم کی امداد اور تعاون کی پیشکش کر دی۔

۴۔ منافقین بے نقاب

اس جنگ میں منافقین بے نقاب ہو گئے۔ اگرچہ وہ جنگ سے پہلے تو مسلم تصور کیے جاتے تھے، تاہم ان کے ناپاک عزائم کا ابھی اندازہ نہیں ہوا تھا، لیکن اس جنگ میں ان کا کردار کھل کر سامنے آگیا۔ مسلمان جان گئے کہ یہ کبھی ہمارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔

۵۔ مسلمانوں کی حُبِّ رسُولؐ

اس جنگ سے مسلمانوں کا یہ بے مثال انفرادی کردار اجاگر ہو گیا کہ وہ اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو حقیقتاً اپنی جان، مال، اولاد غرض ہر شے سے بڑھ کر جانتے ہیں اور پروانہ وار اپنی زندگیاں حضورؐ پر نچھاور کر سکتے ہیں۔

۶۔ مسلمانوں کا اعلیٰ کردار

اس جنگ میں مسلمانوں کی اخلاقی برتری بدستور قائم رہی حضرت ابو دجانہؓ کے سامنے جب ایک عورت آئی، تو انہوں نے اس پر عمداً وار نہ کیا، حالانکہ یہ عورت ہندہ تھی جس کی اسلام دشمنی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ مسلم خواتین نے بھی جنگ میں عمدہ کردار ادا کیا۔ انہوں نے زخمیوں کی مرہم پٹی اور ساقی گیری کا کام کیا۔ حضرت عمارہؓ نے تو اپنے آپ کو حضورؐ کے لیے سپر بنا دیا تھا۔

۷۔ مسلمانوں کے لیے سبق

اس جنگ میں مسلمانوں کو یہ ناقابلِ فراموش سبق بھی دیا گیا کہ اگر انہوں نے اطاعت رسُولؐ کو اپنے ایمان کی بنیاد بنایا تو فتح و نصرت ان کا مقدر رہے گی اور اگر انہوں نے ایک لمحہ بھی فرمانِ رسولؐ سے غفلت برتی تو یقیناً باطل سے نقصان اٹھائیں گے۔ نیز انہیں یہ سبق بھی دیا گیا کہ بالفرض اگر اللہ کے رسولؐ شہید ہو جائیں یا وہ وصال فرما جائیں تو تمہیں اسلام سے پھرنے کی بجائے اس پر ثابت قدم رہنا چاہیئے اور اپنے رسولؐ کے مشن کو جاری رکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی سمجھایا گیا کہ انہیں مال کی محبت کہیں اپنے اصل فرض منصبی سے غافل نہ کر دے۔

۸۔ کفار کا گھٹیا کردار

اس جنگ میں کفار کا گھٹیا کردار بھی سامنے آگیا۔ انہوں نے انتقام کے جوش میں مسلمان شہداء کی لاشوں کا مثلہ کیا۔ عورتوں نے ناک،

کان کاٹ کر ہار بنائے اور انہیں اپنے گلوں کی زینت بنایا۔ لشکر کفار کا سپہ سالار ابوسفیان، حضرت حمزہؓ کے دہن مبارک پر کمان سے مار مار کر کہتا کہ لو اب مزہ چکھو۔ یہ انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں نے اپنے دشمنوں کی قطعاً بے حرمتی نہ کی بلکہ انہیں گڑھے میں ڈال دیا۔

غزوۂ خندق یا جنگِ احزاب ۵ھ، ۶۲۷ء

سوال: غزوۂ خندق یا جنگ احزاب کے اسباب، واقعات اور نتائج بیان کیجیے۔

جواب: **غزوہ خندق یا جنگ احزاب** تاریخ اسلام میں غزوہ خندق کو جنگ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ احزاب کا واحد حزب ہے جسے عربی میں جماعت یا گروہ کہتے ہیں۔ چونکہ کفار کے تمام قبائل اور اسلام کے تمام دشمن گروہ اس جنگ میں شریک ہوئے تھے، اس لیے یہ جنگ احزاب کے نام سے مشہور ہوئی۔ قرآن مجید میں الاحزاب کے نام سے ایک سورۃ بھی نازل ہوئی۔ اسی جنگ میں مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز پر خندق کھودی گئی، اس لیے غزوۂ خندق کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ جنگ ۵ھ میں لڑی گئی۔

اسباب جنگ

۱۔ عرب قبائل کا جذبۂ انتقام غزوہ احد میں مسلمانوں کو عارضی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، اگرچہ مسلمان اس شکست کے بعد پھر سے سنبھل گئے تھے، لیکن پھر بھی ان کے رعب و دبدبہ میں کمی واقع ہوئی، جس کے نتیجہ میں بعض عرب قبائل کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے اسلام دشمن سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کئی بار کامیابی سے مقابلہ کیا۔ اس کامیابی نے ان عرب قبائل کا جذبۂ انتقام کو اور بھی بھڑکا دیا۔ اس لیے وہ مشترکہ طور پر مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے ابوسفیان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

۲۔ ابوسفیان کا چیلنج جنگ احد کے خاتمے پر کفار مکہ کے سردار ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو للکارا تھا کہ بدر کی جنگ کا بدلہ لے لیا گیا ہے۔ اگلے سال بدر کے میدان میں پھر سامنا ہوگا۔ آنحضرتؐ نے اس چیلنج کو قبول فرمایا اور اگلے سال اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مقررہ میعاد پر بدر کے میدان میں پہنچ گئے۔ لیکن ابوسفیان مسلمانوں کی تیاری دیکھ کر گھبرا گیا اور قحط سالی کا بہانہ بنا کر راہ فرار اختیار کر گیا۔ تاہم وہ اندر ہی اندر حسد اور بغض پالتا

رہا اور مدینہ منورہ پر حملے کے منصوبے بناتا رہا، جس کا نتیجہ جنگ احزاب کی صورت میں نکلا۔

۳۔ تجارت کی بندش کا خطرہ

کفار مکہ کے لیے یہ بات نہایت پریشان کن ہے کہ مسلمانوں کے مدینہ منورہ چلے جانے سے ان کی شام کے ساتھ تجارت کو پہلے ہی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اب مسلمانوں کے نجد اور دومتہ الجندل تک کا علاقہ زیرنگیں کرنے سے ان کے تجارتی قافلے عراق تک بھی نہیں جا سکتے تھے۔ گویا انہیں اپنی تجارت مکمل طور پر ختم ہوتی نظر آرہی تھی۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی اقدام کا فیصلہ کیا۔

۴۔ یہودیوں کا اخراج اور سازش

یہودی قبائل میثاقِ مدینہ میں شامل ہونے کے باوجود باغیانہ سرگرمیوں سے باز نہیں آتے تھے۔ بنونضیر نے کھلم کھلا حضورؐ کے قتل کی سازش کی۔ آپؐ نے ان کی اس شرارت پر نوٹس دیا کہ تم دس روز کے اندر اندر یہاں سے چلے جاؤ۔ بنونضیر نے صاف انکار کر دیا۔ آپؐ نے ان کی گڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ انہیں منافقین سے امداد کی توقع تھی، مگر کوئی بھی مدد کو نہ آیا۔ بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اونٹوں پر جتنا سامان لے جا سکتے تھے، لے کر خیبر میں جا بسے۔ اور وہاں پہنچ کر مسلمانوں کے خلاف قریش مکہ اور دوسرے قبائل سے سازباز کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے وفد کے ذریعہ قریش کو یقین دلایا کہ تم مدینہ پر حملہ کرو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ انہیں مدینہ میں رہ جانے والے تنہا یہودی قبیلے بنوقریظہ سے بھی امداد کی توقع تھی۔

۵۔ جاہلانہ رسوم کے خاتمے کا خوف

اسلام تمام جاہلانہ رسوم ورواج کو ختم کر کے خالص توحید کی تعلیم پر مبنی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہے۔ لیکن قبائل عرب بدستور اپنی جاہلانہ رسوم پر کاربند تھے۔ ان کی اسلام کے ساتھ دشمنی اور عناد کا سب سے بڑا سبب توحید اور اسلام کے پاکیزہ اصولِ اخلاق تھے۔ جو ان کی بت پرستی، توہمات، جاہلانہ رسوم اور اخلاقی جرائم کے لیے موت کا باعث تھے۔ اس سے ان کے قدیم معاشی نظام، سود، جوئے، چوری ڈکیتی، مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ پر کاری ضرب پڑتی تھی، اس لیے اسلام کے غلبہ کی صورت میں یہ سارا نظام درہم برہم ہوتا نظر آتا تھا، لہٰذا وہ نئے اسلامی نظام کو مٹانے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔

واقعات جنگ

۱۔ لشکر کفار کی تیاری

طے شدہ پروگرام کے مطابق جنوب سے قریش، کنانہ اور تہامہ میں آباد دوسرے حلیف قبائل نے مدینے کی جانب کوچ کیا

ان سب کا سپہ سالارِ اعلیٰ ابوسفیان تھا اور ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ راستے میں عرب کے دیگر قبائل بھی شامل ہو گئے۔ ان تمام قبائل نے ایک مقررہ وقت اور پروگرام کے مطابق مدینے کا رخ کیا۔ اس لیے چند دن کے اندر اندر مدینے کے پاس دس ہزار سپاہ کا ایک زبردست لشکر جمع ہو گیا۔ کفار کی طرف اتنی بڑی اجتماعی یلغار یقیناً مسلمانوں کے لیے ایک عظیم خطرہ تھی۔ یہ لشکر تین مستقل فوجوں میں تقسیم تھا۔ غطفان کی فوجیں، عیینہ بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں، جو عرب کا مشہور سردار تھا۔ بنو اسد، طلیحہ کی افسری میں تھے اور ابوسفیان بن حرب، سپہ سالارِ کل تھا۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی تیاری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار کی تیاریوں کا حال سنا تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقہ سے واقف تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں، ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے۔ حضورؐ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور خندق کھودنے کا اہتمام کیا گیا۔ ضروری آلات مہیا کیے گئے۔ مدینہ میں تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا۔ صرف شامی رخ کھلا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہؓ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضورؐ نے خود حدود قائم کیے۔ داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی۔ خندق پانچ گز گہری رکھی گئی اور اتنی ہی چوڑائی تھی۔ بیس دن میں تین ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔ حضورؐ بذاتِ خود مزدوروں کی صورت میں تھے۔ سخت سردی کا موسم تھا، تین تین دن فاقے سے گزر جاتے۔ مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لا دلاد کر پھینکتے تھے اور رجز پڑھتے تھے۔ کھدائی کے دوران ایک سخت چٹان آ گئی، جسے صحابہؓ توڑ نہ سکے۔ حضورؐ نے ایک ضرب لگائی تو ایک ٹکڑا ٹوٹ گیا۔ فرمایا: "اللہ اکبر! مجھے ملک شام کی کنجیاں دی گئی ہیں۔" دوسری ضرب لگائی تو ایک دوسرا ٹکڑا کٹ گیا: فرمایا "مجھے فارس دیا گیا ہے۔ واللہ! میں اس وقت مدائن کا سفید محل دیکھ رہا ہوں۔" پھر تیسری ضرب لگائی تو چٹان پاش پاش ہو گئی اور فرمایا: "مجھے یمن کی کنجیاں دی گئی ہیں۔" یوں حضور اکرمؐ نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کی کھدائی مکمل کی۔

سَلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی۔ مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں اور چونکہ بنو قریظہ کے حملہ کا اندیشہ تھا۔ اس لیے حضرت سلمہؓ بن اسلم ۲۰۰ آدمیوں کے ساتھ متعین کیے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

۳۔ **یہودیوں کی خطرناک سازش**:۔ بنو قریظہ کے یہود اب تک لڑائی سے الگ

تھے. لیکن بنو نضیر نے ان کو ملا لینے کی کوشش کی۔ حیی بن اخطب (حضرت صفیہؓ کا باپ) خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ تمام عرب امڈ آیا ہے، اب اسلام کو ختم کرنے کا اچھا موقع ہے۔ کعب راضی نہ ہوا کہ عہد شکنی کرنا خلاف مروت ہے۔ لیکن حیی کا جادو رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقیقت حال جاننے کے لیے حضرت سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو بھیجا اور فرمایا کہ اگر درحقیقت بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو اس خبر کو عام نہ کرنا تاکہ لوگوں میں بے دلی نہ پھیلے۔ دونوں حضرات نے بنو قریظہ کو معاہدہ یاد دلایا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ غرض بنو قریظہ نے کفار کی بے شمار فوج میں اور اضافہ کر دیا اور حملہ اور شدید ہو گیا۔

۴۔ لشکر کفار کی یلغار اور محاصرہ

قریش یہود اور قبائل عرب کی مشترکہ فوجیں تین اطراف سے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئیں، لیکن وہ خلاف توقع خندق کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ یہ ان کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ وہ خندق عبور نہ کر سکے۔ اس لیے وہیں ڈیرے ڈال دیئے اور محاصرے اور مورچہ بندی کی راہ اختیار کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تین ہزار لشکر کو سلع پہاڑی کی پشت پر مورچہ بند کیا اور خود ایک سرخ خیمہ میں مقیم ہو گئے۔ فریقین کے درمیان خندق حائل تھی، اس لیے دونوں طرف سے تیروں اور پتھروں کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ حضورؐ نے خندق کی حفاظت کے لیے محافظ دستے متعین کر رکھے تھے۔

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ اس لیے قریش نے ایک دن نسبتاً تنگ جگہ سے خندق کو عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ عرب کے سب سے بڑے پہلوان عمرو بن عبدود نے اپنا گھوڑا سب سے پہلے ڈالا۔ اس کے پیچھے عرب کے نامور بہادر ضرار، ہبیرہ، نوفل اور عمرو بن عیدار آگے بڑھے اور اسلامی لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ عمرو بن عبدود نے مبارزت طلب کی تو حضرت علی المرتضیٰؓ اس کے مقابلے پر آئے۔ عمرو نے کہا، "میں تجھے قتل نہیں کرنا چاہتا، واپس چلے جاؤ"۔ لیکن حضرت علیؓ ڈٹے رہے اور اسے اسلام کی دعوت دی جسے اس نے ٹھکرا دیا۔ پہلے اس نے وار کیا، جو خالی گیا۔ حضرت علیؓ نے جوابی وار کر کے اسے جہنم واصل کر دیا۔ اس کے بعد ضرار اور ہبیرہ ہمت کر کے آگے بڑھے، لیکن پھر ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ نوفل خندق میں گر پڑا۔ حضرت علیؓ نے کود کر اس کو بھی ختم کر دیا۔

دن بھر لڑائی جاری رہی۔ حضورؐ کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں۔ محاصرہ جاری رہا اور مسلمان انتہائی مصیبتوں میں گھرے ہوئے تھے۔ باہر ہزاروں کا لشکر خون کا پیاسا پڑا ہے۔ بنو قریظہ نے بدعہدی کر دی ہے اور ہر لمحہ ان کی طرف سے خطرہ ہے۔ عورتیں اور بچے تک محفوظ نہیں۔ معاشی حالت ابتر ہے۔ منافقین یہ بہانہ بنا کر کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ غرض مسلمانوں کے لیے یہ سخت ترین آزمائش کا مرحلہ تھا۔ بعض اوقات

تو کلیجے منہ کو آتے تھے، لیکن نبی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی مطمئن تھی اور حضورؐ کو اللہ رب العزت کی تائید و نصرت کا کامل یقین تھا۔

۵۔ حضرت صفیہؓ کی بہادری

مستورات جس قلعہ میں تھیں وہ بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا۔ یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہے، قلعہ پر حملہ کیا۔ ایک یہودی قلعہ کی پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ حضرت صفیہؓ (حضورؐ کی پھوپھی) نے دیکھ لیا۔ مستورات کی حفاظت کے لیے مشہور شاعر حضرت حسانؓ مقرر تھے، لیکن وہ بیماری کے باعث معذور تھے۔ چنانچہ حضرت صفیہؓ نے خود ہی خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کر اس کا سر پھٹ گیا۔ پھر اس کا سر کاٹ کر نیچے پھینک دیا۔ اس پر یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے۔ اسی خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جرأت نہ کی۔

۶۔ لشکر کفار کی پسپائی

محاصرہ کو جس قدر طول ہوتا جاتا تھا، محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے۔ ویسے بھی دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا۔ اسی دوران لشکر کفار میں پھوٹ پڑ گئی۔ وہ اس طرح کہ قبیلہ غطفان کے ایک سردار حضرت نعیمؓ بن مسعود الشجعی نے جو دل سے مسلمان ہو چکے تھے، ایک سیاسی حکمت عملی اور تدبیر سے کام لیا اور ایک طرف بنو قریظہ کے پاس جا کر کہا:

"بنو غطفان واپس جانے کی سوچ رہے ہیں۔ تمہیں ان کا آلہ کار بنے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اگر وہ لوگ محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے تو تم پھر مسلمانوں کے رحم و کرم پر ہو گے۔ لہٰذا جب تک یہ لوگ بطور یرغمال کچھ لوگ تمہارے پاس نہ چھوڑیں، تم لڑائی میں ان کا ساتھ نہ دو۔" دوسری طرف وہ غطفان اور قریش کے پاس گئے اور کہا: "بنو قریظہ کو تم پر اعتماد نہیں۔ وہ تم سے کچھ آدمی بطور یرغمال لے کر انہیں مسلمانوں کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔" اس سے احزاب کی جمعیت میں بدگمانی پھیل گئی، ان میں بے دلی کے آثار نمودار ہونے لگے اور پھوٹ پڑ گئی۔

پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آ گیا، جس سے خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں کھانے کے دیگچے چولہوں پر الٹ الٹ جاتے تھے۔ اس طوفان نے فوجوں سے بڑھ کر کام کر دیا۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں بادِ صرصر کو عسکر الٰہی سے تعبیر کیا گیا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ

تَرَوْهَا ؕ (الاحزاب : ۹)

ترجمہ : مومنو ! اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت کی) جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں۔ تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کئے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کی طوالت، آندھی کا زور، رسد کی قلت، یہود کی علیحدگی، یہ تمام اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ابوسفیان نے فوج سے کہا : رسد ختم ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، اب محاصرہ بے کار ہے۔ یہ کہہ کر طبل رحیل (واپسی) بجنے کا حکم دیا۔ غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ بنو قریظہ بھی محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰، ۲۲ دن تک غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

اس جنگ میں مسلمانوں کا کم نقصان ہوا۔ صرف ایک مشہور صحابی حضرت سعدؓ بن معاذ زخمی ہوئے جس کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے اور غزوۂ بنو قریظہ کے بعد انتقال کر گئے۔

کفار کی ناکامی کے اسباب :

۱۔ اس جنگ میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے اور حکمت عملی سے جو خندق کھودی گئی وہ قبائل عرب کے لیے انوکھی چیز تھی اور اس نئی صورت حال کا ان کے پاس کوئی حل موجود نہ تھا۔ یہ خندق ان کی یلغار کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بن گئی۔

۲۔ مسلمانوں نے بڑی مستعدی، عزم و استقلال اور جانفشانی سے خندق کی حفاظت کی۔ کفار انتہائی کوشش کے باوجود خندق کو عبور کر کے عام حملہ نہ کر سکے۔ جو اکا دکا فوجی ادھر آیا بھی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

۳۔ کفار کی کثیر تعداد خود ان کے لیے پریشانی کا سبب بن گئی، کیونکہ اس دور میں جب کہ ذرائع نقل و حمل تیز نہ تھے، اتنے بڑے لشکر کے لیے رسد کی بحالی انتہائی سنگین مسئلہ بن گئی۔

۴۔ اتنے طویل محاصرہ میں سامانِ جنگ اور رسد کی کمی کے باوجود مسلمانوں نے کمال حوصلے اور عزم و استقلال سے کام لیا۔

۵۔ موسم کی خرابی نے بھی کفار کے ارادے پسپا کر دیئے۔ شدید جاڑے کے موسم میں کفار کے لشکر کو باہر خیموں میں راتیں گزارنی پڑیں۔ اس پر غضب یہ کہ شدید آندھی اور طوفان نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ یہ غیبی امداد تھی۔

۶۔ لشکر کفار مختلف اور متضاد گروہوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ اگرچہ وقتی طور پر اسلام دشمنی میں اپنے ذاتی مفادات کے تحت متحد ہو گئے تھے، لیکن ان میں حقیقی ہم آہنگی اور یک جہتی نہ تھی۔ پھر جب حضرت نعیمؓ نے ان کے درمیان غلط فہمی پیدا کر دی تو قریش، قریظہ سے بالکل مایوس ہو گئے۔

۷۔ یہ جنگ ایسے موقع پر شروع کی گئی تھی کہ اس کے فوراً بعد مقدس مہینوں کی آمد تھی، جن میں لڑائی تمام عربوں کے نزدیک حرام تھی۔ علاوہ ازیں حج کے ایام بھی قریب تھے۔ قریشی سرداروں نے خانہ کعبہ کی تولیت کے باعث حج کے انتظامات کرنے تھے، جس سے انہیں بہت مالی فوائد بھی حاصل ہوتے تھے۔ اس لیے قریش نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔

غزوۂ خندق کے نتائج و اہمیت

سیرت نگار لکھتے ہیں کہ جنگ احزاب درحقیقت نقصانِ جان و مال کی جنگ نہ تھی بلکہ اعصاب کی جنگ تھی۔ اس میں کوئی خونریز معرکہ پیش نہیں آیا، لیکن پھر بھی یہ اسلامی تاریخ کی ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں مشرکین کے حوصلے ٹوٹ گئے اور یہ واضح ہو گیا کہ عرب کی کوئی بھی قوت مسلمانوں کی اس چھوٹی سی طاقت کو جو مدینہ منورہ میں نشو و نما پا رہی ہے، ختم نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جنگِ احزاب میں جتنی بڑی طاقت فراہم ہو گئی تھی، اس سے بڑی طاقت فراہم کرنا عربوں کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب کی واپسی کے بعد فرمایا:

"اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے۔ وہ ہم پر چڑھائی نہ کریں گے۔ اب ہمارا لشکر ان کی طرف جائے گا۔"

ذیل میں اس جنگ کے اہم نتائج بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ اس جنگ کی فتح نے جنگ احد میں مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار بحال کر دیا اور وہ قبائل عرب جو سر اٹھانے لگے تھے، نہ صرف مطیع و فرمانبردار بن گئے بلکہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

۲۔ قریش کو ایک بھاری زک یہ پہنچی کہ اب ان کا شام سے تجارت کے علاوہ عراق سے تجارت کا راستہ بھی بند ہو گیا، کیونکہ اس جنگ میں فتح کے بعد مسلمانوں کا اثر و رسوخ نجد سے آگے بڑھ کر یمامہ تک پھیل گیا۔ قریش کی اس اقتصادی ناکہ بندی نے ان کی قوت کو مزید کم کر دیا۔

۳۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے ڈسپلن اور نظم و ضبط کا بہت عمدہ مظاہرہ کیا اور ان کی بہترین اخلاقی و عسکری تربیت ہوئی۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ جنگ میں مختلف تدابیر اور چالوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً خندق کی کھدائی ایک عمدہ اور نرالی تدبیر تھی۔ اسی طرح کفار کے مختلف گروہوں میں پھوٹ ڈالنے سے فتح کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ یوں یہ دفاعی جنگ آگے چل کر جارحانہ جنگ کا پیش خیمہ بنی۔

۴۔ اس جنگ میں چونکہ بنو قریظہ نے مسلمانوں سے غداری کی تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

انہیں سبق سکھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ آخر انہوں نے تنگ آکر کہا کہ ہم حضرت سعدؓ بن معاذ کا فیصلہ قبول کریں گے۔ آنحضرتؐ نے قبول فرمایا۔ حضرت سعدؓ نے یہود کی کتاب توریت کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ "تمام لڑنے والے قتل کر دیئے جائیں، عورتیں اور بچے گرفتار کر لیے جائیں اور ان کا مال و اسباب مالِ غنیمت سمجھا جائے۔" یہ فیصلہ توریت کے حکم کے مطابق تھا اس لیے یہودیوں کو چار و ناچار قبول کرنا پڑا اور صحیح روایت کی رو سے چار سو یہودی، جن میں دورانِ محاصرہ کے مقتولین بھی شامل ہیں، قتل کئے گئے۔ یہ فیصلہ اگرچہ بظاہر سخت نظر آتا ہے، لیکن یہود کی شرارتوں، عہد شکنیوں اور ایذا رسانیوں کے لحاظ سے مناسب ہے۔

صلح حدیبیہ و بیعت رضوان ۶ھ

سوال: صلح حدیبیہ کی شرائط و نتائج پر تفصیلی بحث کیجئے اور ثابت کیجئے کہ یہ معاہدہ واقعی اسلام کی عظمت و برتری کا کھلم کھلا نشان تھا۔

جواب:

صلح حدیبیہ ۶ھ

۱۔ عمرہ کے لیے روانگی

غزوۂ احزاب کے ایک سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا، جس میں آپؐ کو حج کرنے کا اشارہ ہوا۔ صحابہ کرامؓ کو اور خود حضورؐ کو مکہ معظمہ کی سرزمین سے جو محبت تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت بلالؓ کو مکہ میں کتنا ستایا گیا تھا، لیکن وہ اس شہر کو یاد کر کے رویا کرتے اور اس کی یاد میں شعر پڑھتے تھے۔ دوسرے مہاجرین کے گھر بار، رشتہ دار اور بعض کے اہل و عیال تک مکہ میں رہ گئے تھے، چھ سال سے وہ اپنے پیارے شہر کو ترس گئے تھے۔ جونہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کی تیاری کا حکم دیا تو صحابہ کرامؓ میں مسرت و شادمانی کی لہریں دوڑ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چودہ سو صحابہؓ کی جماعت اس مبارک سفر کے لیے تیار ہو گئی۔

چنانچہ ماہ ذی قعدہ ۶ھ میں حضورؐ نے مدینہ پر ابن ام مکتوم کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ مکہ کو روانہ ہوئے۔ آپؐ کے ہمراہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بھی تھیں۔ قربانی کے ستر اونٹ بھی ہمراہ تھے۔ کوئی جنگی ہتھیار ساتھ نہ تھا، صرف تلواریں ساتھ رکھ لی گئیں۔ آپؐ نے یہ حکم دیا کہ تلواریں بھی نیام میں ہوں۔

ذوالحلیفہ پہنچ کر قربانی کے جانوروں کو نشان زد کر دیا اور عمرہ کا احرام باندھ لیا، تاکہ لوگوں کو اطمینان رہے کہ آپؐ جنگ نہیں کریں گے۔

۲۔ قریش کی رکاوٹ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احتیاط کے طور پر قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا، پہلے بھیج دیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے۔ جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا تو اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں کبھی نہیں آسکتے۔ غرض قریش نے بڑے زور سے مقابلہ کی تیاری کی۔ قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا تو وہ عظیم جمعیت لے کر آئے مکہ سے باہر بلدح کے مقام پر فوجیں جمع ہوئیں۔ خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لاتے تھے۔ دو سو سوار لے کر جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا۔ ہراول دستے کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی تو کترا کر داہنی طرف سے آگے بڑھے۔ خالد کو پتہ چلا تو وہ فوراً قریش کے پاس پہنچے اور لشکر اسلام کی آمد کی اطلاع دی۔ آنحضرتؐ آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی، ایک خالی کنواں تھا، لیکن اعجازِ نبویؐ سے اس میں اس قدر پانی آگیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

۳۔ سفیر کی بات چیت

اس موقع پر قبیلۂ خزاعہ کا سردار بدیل بن ورقا، جو اسلام کے لیے حامیانہ جذبات رکھتا تھا، اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حضورؐ کے پاس پہنچا اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آرہا ہے۔ وہ آپؐ کو خانہ کعبہ میں نہ جانے دیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "قریش سے جا کر کہو کہ عمرہ کے لیے آئے ہیں، لڑنا مقصود نہیں۔ قریش جنگ کے بڑے شائق ہیں، حالانکہ اس میں سراسر ان کا گھاٹا ہے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ قریش چند سال کے لیے مصالحت کر لیں۔" بدیل قریش کے پاس پہنچا اور ان کو حضورؐ کے ارادوں سے آگاہ کیا۔ نوجوان تو بہت بگڑے مگر بوڑھوں نے بات دھیان سے سنی اور ایک شخص کو واقعات کی تصدیق کے لیے بھیجا۔ اس نے آکر بتایا کہ واقعی مسلمانوں کے پاس قربانی کے جانور ہیں اور وہ زیارتِ کعبہ کے لیے آئے ہیں۔

اب قریش نے اپنے ایک مدبر سردار عروہ بن مسعود ثقفی کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ عروہ حضورؐ کے پاس پہنچا اور کہا "محمدؐ! فرض کرو کہ تم نے قریش کا خاتمہ کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو؟ اس کے سوا اگر لڑائی کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ یہ جو بھیڑ ہے، گرد کی طرح اُڑ جائے گی۔" عروہ کی اس بات پر حضرت ابوبکرؓ کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ رسول اللہؐ کے فدائی ان کو کسی حالت میں بھی چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" عروہ عرب کے رواج کے مطابق حضورؐ کی ریش مبارک

کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر بات کر رہا تھا۔ اس پر حضرت مغیرہؓ نے اسے ڈانٹا کہ اب ہاتھ بڑھایا تو یہ واپس نہ جا سکے گا۔"

عروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صحابہؓ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اس کے دل پر عجب اثر کیا۔ اس نے قریش سے جا کر کہا،

"میں نے قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، یہ عقیدت اور کیفیت کہیں نہیں دیکھی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے اس پر خلقت لوٹ پڑتی ہے کھنکار یا تھوک گرتا ہے تو عقیدت مند ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں۔"

۴ بیعت رضوان

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراشؓ بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا لیکن قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو جو خاص حضورؐ کی سواری کا تھا، مار ڈالا اور خود ان پر بھی یہی گزرنے والی تھی لیکن قبائل متحدہ کے لوگوں نے بچا لیا اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے۔ اس کے ساتھ ہی قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو، لیکن یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی، لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی۔

بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح کی بات چیت کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا انتخاب کیا، لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ لہٰذا حضورؐ نے حضرت عثمان غنیؓ کو بھیجا۔ وہ اپنے ایک عزیز کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرتؐ کا پیغام سنایا۔ انہوں نے پیش کش کی کہ آپ خانہ کعبہ کا طواف کر لیں، مگر آپؓ نے انکار کر دیا اور یہ گوارا نہ کیا کہ حضور اکرمؐ کے طواف کرنے سے پہلے خود طواف کر لیں۔

حضرت عثمان غنیؓ اپنی سفارت کی مہم پوری کر چکے تھے۔ لیکن قریش نے انہیں اپنے پاس روک لیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ پیش آمدہ صورتِ حال پر باہمی مشورہ کر کے کوئی قطعی فیصلہ کر لیں مگر حضرت عثمانؓ کے زیادہ دیر تک رکے رہنے کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ جب حضورؐ کو یہ اطلاع ملی تو فرمایا "ہم اس جگہ سے ٹل نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ لوگوں سے معرکہ آرائی کر لیں۔ عثمان کا قصاص لینا فرض ہے۔" پھر آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو بیعت کی دعوت دی۔ صحابہ کرام ٹوٹ پڑے اور اس بات پر آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے۔ ایک جماعت نے موت پر بیعت کی جب

سب بیعت کر چکے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیتے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا اور ان کی طرف سے اس عہد کو دہرایا۔ صرف ایک بدبخت منافق جد بن قیس نے بیعت نہ کی۔ اسی بیعت کا نام بیعت رضوان ہے اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح: ۱۸)

ترجمہ: تحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے راضی ہوا جبکہ یہ لوگ آپؐ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

صلح نامہ حدیبیہ

مسلمان اس جوش و خروش سے بے تاب تھے اور کٹ مرنے پر تیار تھے کہ حضرت عثمانؓ مکے سے بالکل محفوظ و مامون واپس تشریف لے آئے۔ انہیں دیکھ کر مسلمانوں کا غصہ ایک حد تک دور ہو گیا اور مسرت سے ان کے چہرے چمک اٹھے۔ مسلمانوں کے اس جذبۂ جہاد کو دیکھ کر کفار اپنے موقف میں نرم پڑ گئے۔ انہوں نے حضورؐ کے پاس سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھا۔ چنانچہ لوگوں نے اس کو خطیبِ قریش کا خطاب دیا تھا۔ پہلے کفار یہ کہتے تھے کہ مسلمان کبھی بھی مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے، لیکن اب اپنی ناک بچانے کے لیے یہ ترمیم کر دی کہ اس سال واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آ کر عمرہ کر سکتے ہیں۔

حضورؐ سے سہیل کی دیر تک صلح کی شرائط پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار چند شرائط پر اتفاق ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلم بند کریں۔ حضرت علیؓ نے عنوان پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا۔ عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتدا میں بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھتے تھے وہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے آشنا نہ تھے۔ اس بنا پر سہیل نے کہا کہ ہمارے طریقے کے مطابق الفاظ لکھے جائیں۔ حضورؐ نے منظور فرمایا۔ پھر معاہدہ میں مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ کے الفاظ آئے۔ اس پر سہیل نے کہا: اگر ہم آپؐ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے ہیں تو پھر جھگڑا کیا تھا؟ آپؐ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں۔" حضورؐ نے فرمایا کہ "تم تکذیب کرتے ہو، لیکن خدا کی قسم! میں خدا کا پیغمبر ہوں۔" یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ خالی میرا نام مع ولدیت لکھو۔ لیکن انہوں نے پاسِ ادب سے معذرت کی، چنانچہ آپؐ نے خود "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیا اور "محمدؐ بن عبداللہ" لکھوا دیا۔ ایسا عظیم تر مصلحت کے تحت کیا گیا۔

شرائط صلح

صلح حدیبیہ کے معاہدے کی شرائط حسب ذیل تھیں:۔

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جاتیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلواریں ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام بھی تھیلوں میں۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے، لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

مسلمانوں کے فوری تاثرات

اس معاہدہ کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ ان میں سے ایک دو تو ذلت آمیز بھی دکھائی دے رہی تھیں، چنانچہ مسلمان دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اسی دوران سہیل کے صاحبزادے حضرت ابو جندلؓ جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح اذیتیں دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے سہیل نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے، ابو جندلؓ کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا“۔ سہیل نے کہا: ”تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں“۔ آخر حضورؐ نے معاہدے کے مطابق حضرت ابو جندلؓ کو سہیل کے حوالے کر دیا۔

یہ صحابہ کرامؓ کی اطاعت شعاری کا سخت امتحان تھا۔ ایک طرف (ظاہر میں) اسلام کی توہین ہے۔ حضرت ابو جندلؓ بیڑیاں پہنے چودہ سو جاں نثارانِ اسلام سے فریاد کرتے ہیں۔ سب کے دل جوش سے لبریز ہیں، اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذرا اشارہ ہو جائے تو تلوار فیصلہ کر سکتی ہے۔ دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے۔ حضورؐ نے حضرت ابو جندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا: ”ابو جندل! صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے“۔

سب سے زیادہ حضرت عمرؓ بے قرار ہوئے۔ انہوں نے حضورؐ سے عرض کی ”اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپؐ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟“ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”کیوں نہیں؟“ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ”کیا ہم مسلمان اور وہ مشرک نہیں؟“ آپؐ نے فرمایا: ”کیوں نہیں؟“ حضرت عمرؓ نے پھر عرض کی: ”جب ہم حق پر ہیں تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟“ آپؐ نے فرمایا: ”میں خدا کا رسول ہوں، اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ خدا میری مدد

کرے گا؟ اسی قسم کے الفاظ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تسلی دلائی۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہو گیا کہ حضور کا یہ فیصلہ نہایت مدبرانہ اور دور اندیشی پر مبنی تھا اور جب وحی کے ذریعے اسے فتح مبین قرار دیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مکمل اطمینان حاصل ہو گیا۔ اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی اس خلش کو بھی دور کر دیا کہ میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ خانہ کعبہ کا طواف کریں گے، لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال ہی لازماً کریں گے۔ یوں صلح نامہ مکمل ہوا۔ اس پر طرفین دستخط ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بطور گواہ اس پر دستخط کیے۔ مسلمانوں نے قربانی کے جانور وہیں ذبح کر دیئے اور سر کے بال اترا کر وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔ مکہ سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلہ پر سورۂ فتح نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو فتح مبین قرار دیا۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۙ (الفتح: ۱)

ترجمہ: (اے محمد ﷺ!) ہم نے آپ کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف)

صلح حدیبیہ کے نتائج و اثرات

عظمت اسلام کا نشان

اگرچہ اہل ایمان تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے کہ یہ "فتح مبین" ہے، مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس صلح کے فوائد ایک ایک کر کے واضح ہو کر سامنے آ گئے، یہاں تک کہ کسی کو بھی اس امر میں شک نہ رہا کہ فی الواقع یہ صلح ایک عظیم الشان فتح تھی۔ ذیل میں ان فوائد کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے:

۱۔ اسلامی ریاست کا وجود تسلیم کر لیا گیا

اس معاہدے کی رو سے پہلی مرتبہ عرب میں اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی حیثیت محض قریش اور قبائل عرب کے خلاف خروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی۔ اب خود قریش ہی نے آپ سے معاہدہ کر کے سلطنت اسلامی کے مقبوضات پر آپ کا اقتدار مان لیا اور قبائل عرب کے لیے یہ دروازہ بھی کھول دیا کہ ان دونوں سیاسی طاقتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدے کر لیں۔

۲۔ زیارت بیت اللہ کا حق تسلیم کر لیا گیا

مسلمانوں کے لیے زیارت بیت اللہ کا حق تسلیم کر کے قریش نے خود ہی یہ بھی مان لیا کہ اسلام کوئی بے دینی نہیں ہے، جیسا کہ وہ اب تک کہتے چلے آ رہے تھے، بلکہ عرب کے مسلمہ ادیان میں سے ایک ہے اور دوسرے عربوں کی طرح اس دین کے پیرو بھی حج و عمرہ کے مناسک

ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس سے اہلِ عرب کے دلوں کی وہ نفرت کم ہو گئی جو قریش کے پروپیگنڈا سے اسلام کے خلاف پیدا ہو گئی تھی۔

وسیع پیمانے پر اشاعت اسلام

دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جانے سے مسلمانوں کو امن میسر آگیا اور انہوں نے عرب کے تمام اطراف و نواح میں پھیل کر اس تیزی سے اسلام کی اشاعت کی کہ صلح حدیبیہ سے پہلے پورے ۱۹ سال میں اتنے آدمی مسلمان نہ ہوتے تھے، جتنے اس کے بعد دو سال میں اندر ہو گئے۔ یہ اسی صلح کی برکت تھی کہ یا تو وہ وقت تھا جب حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ کے ساتھ صرف ۱۴ سو صحابہؓ آئے تھے، یا دو ہی سال کے بعد جب قریش کی عہد شکنی کے نتیجے میں حضورؐ نے مکہ پر چڑھائی کی تو دس ہزار کا لشکر آپؐ کے ہمرکاب تھا۔

۴۔ اسلامی حکومت کا استحکام

قریش کی طرف سے جنگ بند ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ موقع مل گیا کہ اپنے مقبوضات میں اسلامی حکومت کو اچھی طرح مستحکم کر لیں اور اسلامی قانون کے اجراء سے مسلم معاشرے کو ایک مکمل تہذیب و تمدن بنا دیں۔ یہی وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ
نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (المائدہ: ۳)

ترجمہ: "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

۵۔ مخالف طاقتیں مسخر ہو گئیں

قریش سے صلح کے بعد جنوب کی طرف سے اطمینان نصیب ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے شمالی عرب اور وسطی عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخر کر لیا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ پر تین ہی مہینے گزرے تھے کہ یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ، خیبر فتح ہو گیا اور اس کے بعد فدک، وادی القریٰ، تیما اور تبوک کی یہودی بستیاں بھی اسلام کے زیرنگیں آتی چلی گئیں۔ پھر وسطی عرب کے وہ تمام قبیلے بھی، جو یہود اور قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے، ایک ایک کر کے تابع فرمان ہو گئے۔ اس طرح حدیبیہ کی صلح نے دو ہی سال کے اندر عرب میں قوت کا توازن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہو گیا۔

قریش کی جیت ہار بن گئی: سب سے زیادہ جو چیز اس صلح میں مسلمانوں کو ناگوار ہوئی تھی

اور جسے قریش نے اپنی جیت سمجھا تھا، وہ یہ تھی کہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ جانے والوں کو واپس کر دیا جائے گا اور مدینہ سے بھاگ کر مکہ جانے والوں کو واپس نہ کیا جائے گا، مگر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ یہ معاملہ بھی قریش پر الٹا پڑا اور تجربہ نے بتا دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ دوررس نے اس کے کن نتائج کو دیکھ کر یہ شرط قبول کی تھی۔

صلح کے کچھ دن بعد مکہ سے ایک مسلمان حضرت ابوبصیرؓ قریش کی قید سے بھاگ نکلے اور مدینہ پہنچے۔ قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور حضورؐ نے معاہدے کے مطابق انہیں ان لوگوں کے حوالے کر دیا، جو ان کی گرفتاری کے لیے مکہ سے بھیجے گئے تھے، مگر مکہ جاتے ہوئے راستہ میں وہ پھر ان کی گرفت سے بچ نکلے اور ساحل بحرِ احمر کے اس راستے پر جا بیٹھے، جس سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے اس کے بعد جس مسلمان کو بھی قریش کی قید سے نکلنے کا موقع ملتا، وہ مدینہ جانے کی بجائے حضرت ابوبصیرؓ کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا، یہاں تک کہ وہاں ستر آدمی جمع ہو گئے۔ اور انہوں نے قریش کے قافلوں پر چھاپے مار مار کر ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ آخر کار قریش نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مدینہ بلا لیں اور حدیبیہ کے معاہدے کی وہ شرط خود بخود ختم ہو گئی۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن۔ مولانا مودودیؒ)

علامہ شبلی نعمانیؒ کی رائے

علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی مشہور تصنیف "سیرت النبیؐ" (جسے بعد میں ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مکمل کیا) میں لکھتے ہیں:۔

"تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے، خدا نے اس کو فتح کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے، انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ "ہاں"۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو تسکین ہو گئی اور مطمئن ہو گئے۔ نتائج مابعد نے اس رازِ سربستہ کی عقدہ کشائی کی۔ اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے۔ اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی، خاندان اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسنِ عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکہ جاتے، ان کی صورتیں بھی یہی مناظر پیش کرتی تھیں۔ اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس معاہدۂ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے یہ لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے۔

"حضرت خالدؓ سیف اللہ (فاتح شام) اور حضرت عمروؓ بن عاص (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانے کی یادگار ہے"۔

شاہ معین الدین احمد ندوی کی رائے

شاہ معین الدین احمد ندوی اپنی مشہور کتاب "تاریخ اسلام" میں لکھتے ہیں :-

"گو صلح حدیبیہ بظاہر دب کر ہوئی تھی ، لیکن خدا نے اس کو فتح سے تعبیر کیا اور سورۃ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا نازل ہوئی کہ نتائج کے اعتبار سے یہ صلح درحقیقت فتح کا دیباچہ تھی ، صلح سے پہلے مسلمان کافروں سے الگ تھلگ رہتے تھے ۔ اس کے بعد دونوں میں میل جول اور آمد و رفت شروع ہوئی ، ہر مسلمان اسلام کی سچی تصویر تھا اس تصویر کو دیکھ کر اور تبادلۂ خیالات سے کفار کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچنے لگے اور اسلام نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے لگا ، چنانچہ صلح حدیبیہ سے لیکر فتح مکہ تک جس کثرت سے کفار اسلام میں داخل ہوتے اتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوتے تھے ۔"

ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے

قریش کا اس صلح پر آمادہ ہو جانا اسلامی سیاست خارجہ کی ایک واقعی فتح مبین تھی ، جس کے باعث فوری خطرات سے نجات ملنے پر انھوں نے آزادی کے ساتھ تین ہی سال میں پر امن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا ۔ یہی وہ صلح حدیبیہ ہے جسے عہد نبوی کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار کہنا چاہیئے ۔" (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی)

نعیم صدیقی کی رائے

"یہ تھا وہ تاریخی معاہدہ جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بجائے خود فتح مبین کی حیثیت رکھتا تھا اور جس تک قریش کو لانے اور اس سلسلے کے جملہ پر پیچ مراحل کو طے کرنے میں حضور انورؐ نے ایسی سیاست ، حکمت اور قائدانہ بصیرت کا مظاہرہ کیا ، جس سے بعد والوں کو تاقیامت راہنمائی ملتی رہے گی ۔ یہ مصالحت حضورؐ کی سیاستکاری کا ایک بے مثال شہ کار ہے ۔" (محسن انسانیت)

فرماں رواؤں کو دعوتِ اسلام

سارے جہاں کی پیاس بجھانی محال ہے
اسلام کے پیالۂ لبریز کے بغیر

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

ظفر علی خاں

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف ملکوں کے فرمانرواؤں (حکمرانوں) کو جو دعوتِ اسلام دی، اس کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: **اسلام ایک عالمگیر مذہب**

اسلام ایک مذہب یا دین ہے، جس کا تعلق کسی ایک خاص علاقے یا ملک سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عالم گیر مذہب یا دین ہے جو قرآن مجید کی صورت میں خدا کے آخری محبوب رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ اسلام کی ابتدا عرب سے ہوئی، لیکن یہ دین پوری دنیا میں غالب آنے والا تھا۔ یہ دین قیامت تک کے لئے تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لیے مکمل راہِ ہدایت ہے۔

فرمانرواؤں (حکمرانوں) کو دعوتِ اسلام

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کو کسی قدر اطمینان ملا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام دنیا میں رہنے والوں کے کانوں تک پہنچایا جائے۔ حضور اکرم ﷺ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور فرمایا کہ:

"اے میرے ساتھیو! اللہ تعالیٰ نے مجھے ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے میں کل انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کا ذمہ دار ہوں۔ تم لوگ یہ پیغام لے کر، جہاں جہاں میں تمہیں بھیجوں، جاؤ۔" مگر یاد رکھو کہ آپس میں ایک دل اور ایک جان ہو کر رہنا۔ اسی اتحاد اور ایک ہونے میں تمہاری کامیابی کا راز ہے۔"

چنانچہ اس مقصد کے لیے حضور اکرم ﷺ نے اپنے زمانے کے مختلف حکمرانوں کو تبلیغی خطوط لکھے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس زمانے میں عرب کے آس پاس کے ملکوں میں جو حکمران زیادہ مشہور تھے، ان میں قیصرِ روم، کسرائے ایران، سلطانِ مصر اور شاہِ حبشہ شامل ہیں۔ ان خطوں پر اپنی نشانی کے طور پر آپ ﷺ نے چاندی کی ایک مہر بنوائی جس پر محمد رسول اللہ ﷺ کے الفاظ اس ترتیب سے لکھے گئے تھے (محمد رسول اللہ)

ا۔ **قیصرِ روم کے نام خط**

سب سے پہلے اسلام کی دعوت کا خط روم کے بادشاہ کے نام بھیجا گیا، جو "قیصر" کہلاتا تھا۔ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ یہ خط لے کر قیصرِ روم کے پاس پہنچے۔ اس خط کا مضمون درج ذیل ہے:

قیصر روم کے نام خط :

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اللہ کے رسول محمدؐ بن عبداللہ کی طرف سے

ہرقل قیصر روم کے نام

" اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔ اسلام لے آؤ۔ سلامتی میں رہو گے۔ اللہ تمہیں دگنا اجر دے گا۔ اگر تم نے منہ پھیرا تو تمہاری رعایا کا گناہ بھی تمہاری گردن پر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب! آؤ ہم آپس میں مشترکہ بات پر جمع ہو جائیں۔ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا ہمسر و شریک بنائیں۔ اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب اور مالک نہ بنائیں۔ اگر تم انکار کر دو تو گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار مسلمان ہیں۔

(مہر)

قیصر کا جواب :۔

جب یہ خط پہنچا تو قیصر روم ان دنوں شام کے علاقے میں آیا ہوا تھا۔ حضرت دحیہ کلبیؓ اس کے پاس خط لے کر گئے تھے۔ ہرقل نے جب یہ خط دیکھا تو آپؐ کے سفیر سے عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا اور اس نے حکم دیا کہ اگر میرے ملک میں اس وقت کوئی عرب موجود ہو تو اسے بلایا جائے اتفاق سے اس وقت قریش کا سردار ابوسفیان اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ چنانچہ اسے دربار میں بلایا گیا۔ ہرقل نے ابوسفیان کو اپنے سامنے بٹھایا اور اس کے ساتھیوں کو ان کے پیچھے بٹھا کر حکم دیا کہ میں اس شخص سے جو باتیں پوچھوں گا۔ اگر یہ غلطی کرے تو تم فوراً ٹوک دو۔"

قیصر روم اور ابوسفیان کی گفتگو :۔

قیصر روم نے ان لوگوں سے پوچھا کہ نبوت کا دعویٰ کرنے والے محمدؐ کا تم میں رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں ہوں۔ اس کے بعد دونوں میں یہ گفتگو یا بات چیت ہوئی۔

قیصر : محمدؐ کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان : شریف ہے۔

قیصر: کیا اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوّت کا دعوی کیا تھا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے۔

ابوسفیان: کبھی نہیں۔

قیصر: جن لوگوں نے ان کا دین قبول کیا، وہ امیر ہیں یا غریب؟

ابوسفیان: غریب لوگ ہیں۔

قیصر: اس کے ماننے والے گھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھ رہے ہیں۔

قیصر: کبھی تم لوگوں سے اس نے جھوٹ بھی بولا ہے؟

ابوسفیان: نہیں، بلکہ ہمارے علاقے میں وہ صادق (سچا) اور امین (امانتیں رکھنے والا) مشہور رہے۔

قیصر: وہ کبھی اپنے وعدے یا اقرار سے پھرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ حال ہی میں اس سے ہمارا معاہدۂ صلح (صُلحِ حُدیبیّہ) ہوا ہے۔ دیکھیں، اس پر وہ قائم رہتا ہے کہ نہیں۔

قیصر: تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی ہے؟

ابوسفیان: ہاں۔

قیصر: نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب رہے اور کبھی وہ۔

قیصر: اس کی تعلیمات کیا ہیں؟

ابوسفیان: کہتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ نماز پڑھو، سچ بولو، عام انسانوں اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرو اور نیکی کے راستے پر چلو۔

قیصر کی رائے

اس سوال جواب کے بعد قیصر بولا، تم کہتے ہو کہ وہ شریف خاندان میں سے ہے۔ نبی ہمیشہ شریف خاندان ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ ان کے خاندان میں پہلے نبوّت کا دعوے کسی نے نہیں کیا اور نہ ان میں کوئی بادشاہ گزرا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ یہ خاندانی عزت ووقار کا اثر ہے۔ تم نے کہا کہ

وہ جھوٹ نہیں بولتے جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم نے بتایا کہ غریب لوگ اس کے ماننے والے ہیں۔ پیغمبروں پر سب سے پہلے غریب لوگ ہی ایمان لایا کرتے ہیں، تم مانتے ہو کہ ان کے دین کے ماننے والے بڑھتے جاتے ہیں۔ سچے دین کا یہی حال ہوتا ہے۔ تم قبول کرتے ہو کہ وہ کبھی اپنے وعدے یا اقرار سے نہیں پھرتے۔ سچا نبی ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم نے اقرار کیا کہ وہ نماز اور نیکی کی ہدایت کرتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ایک نہ ایک دن میرے پایۂ تخت تک ان کا قبضہ ہو جائے گا۔

حقیقت کا اعتراف اور ایمان سے محرومی

قیصر روم نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ یہ سچا نبی ہے اور سچا دین ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ کو معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں ظاہر ہوگا۔ اگر میں ان تک پہنچ سکتا تو اس کے قدم دھوتا۔" قیصر کی یہ باتیں سن کر مشرکین بہت بگڑے اور اُٹھ کر چلے گئے، قیصر کے درباری اور عیسائی پادری بہت ناراض ہوئے اور وہ غصے سے بھپرنے لگے۔ قیصر نے جب یہ صورت دیکھی تو وہ تخت و تاج اور بادشاہت کے لالچ میں اسلام کی دعوت سے محروم ہو گیا۔ سچ ہے کہ اسلام اور ایمان اللہ کی نعمت ہے، وہ جسے چاہتا ہے، یہ نعمت عطا فرماتا ہے۔

سوال: خسرو پرویز (کسرائے ایران) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط مبارک کے ساتھ کیا بدتمیزی کی؟ اس کا کیا انجام ہوا؟

جواب:
خسرو پرویز کو اسلام کی دعوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرا خط ایران کے بادشاہ (کسرائے ایران) خسرو پرویز کے نام بھیجا جو صحابی یہ خط لے کر گئے، ان کا نام حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ ہے، خط کا مضمون یہ ہے۔

کسریٰ کے نام خط:

اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے
کسریٰ شاہ ایران کے نام

جس نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لایا تو وہ امن و سلامتی میں رہا میں تمہیں خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ میں دنیا کے تمام لوگوں کی طرف رسول بن کر آیا ہوں تاکہ

ہر شخص کو بُرے کاموں کے نتیجوں سے باخبر کر دوں اور ان کی سزا سے ڈراؤں تاکہ کفار پر حجت پوری ہو جائے۔

تم اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ امن و سلامتی میں رہو گے۔ اگر تم نے حق کے پیغام سے منہ پھیرا تو تمام آتش پرستوں کا وبال تمہارے کندھوں پر ہو گا۔

(مہر)

خسرو پرویز کی بدتمیزی اور اس کا انجام

خسرو پرویز بڑی شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ اس کے زمانے میں ایران کے دربار کو جو رعب اور شان و شوکت تھی، وہ پہلے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ایرانیوں کا دستور (طریقہ) تھا کہ بادشاہوں کو جو خط لکھے جاتے ان میں سب سے اوپر بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ خسرو نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا خط مبارک کھولا تو اس میں سب سے اوپر اللہ کا نام اور اس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اسمِ مبارک نظر آیا اور اپنا نام تیسرے نمبر پر دیکھا اس پر خسرو کو سخت غصہ آیا اور اس نے غصے میں حضور اکرمؐ کا خط مبارک پھاڑ ڈالا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے یمن کے گورنر کو لکھا کہ اس نبیؐ کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔ (معاذ اللہ) چنانچہ گورنر نے اپنے آدمی اس مقصد کے لئے مدینہ منورہ بھیجے۔ انہوں نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں پہنچ کر اپنا مقصد بیان کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "کل آنا"۔ چنانچہ جب اگلے روز وہ حضورؐ کے پاس پہنچے تو حضورؐ نے فرمایا کہ "جاؤ، تمہارا بادشاہ قتل ہو چکا ہے"۔ چنانچہ وہ گھبراہٹ میں واپس چلے گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ خسرو پرویز اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہے۔

رسول اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مَزَّقَ مُلْکَہٗ یعنی "اس نے اپنی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا"۔ اس طرح خسرو پرویز اپنے بدترین انجام کو پہنچا اور ایران جلد ہی صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں فتح ہوا۔

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثربؐ کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا۔ (ظفر علی خاں)

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی، شاہ حبش کے نام جو خط لکھا اس کا کیا اثر ہوا؟

جواب:

نجاشی کے نام خط

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرا خط حبش کے بادشاہ نجاشی کے نام لکھا۔ اس خط کا مضمون درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؏

اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے

شاہ حبشہ نجاشی کے نام

تم پر سلام ہو۔ میں تمہارے سامنے اس خدا کی تعریف کرتا ہوں جو سچا بادشاہ ہے۔ پاک ہے امن و سلامتی کا سرچشمہ ہے۔ امن عطا فرمانے والا اور انصاف کرنے والا۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰؑ بن مریمؑ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جو خدا نے مریمؑ کو عطا کئے۔ وہ پاک باز اور پرہیزگار تھیں۔ خدا نے عیسیٰؑ کو اس طرح اپنی قدرت سے پیدا فرمایا، جس طرح آدمؑ کو پیدا کیا گیا تھا۔ میں تمہیں اس خدائے واحد کی طرف بلاتا ہوں، جس میں کوئی شریک نہیں اور تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ہوں کہ تم خدائے واحد کی اطاعت اور میری پیروی کرو اور اس پیغام پر ایمان لاؤ جو میں لے کر آیا ہوں۔ میں خدا کا رسول ہوں۔ میں تمہیں اور تمہارے سب ساتھیوں کو خدا کی طرف بلاتا ہوں میں اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کر چکا ہوں۔ تمہیں حق بات سنا دی گئی ہے۔ میری نصیحت مان لو۔ جو سیدھی راہ پر چلے گا۔ امن و سلامتی میں رہے گا۔"

(مہر)

نجاشی کا قبولِ اسلام

حبش میں حضرت علیؓ کے بڑے بھائی حضرت جعفر طیارؓ پہلے سے موجود تھے۔ یہ ان صحابہؓ میں شامل تھے جنہوں نے رسولِ اکرمؐ کے حکم پر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اس وقت سے یہ صحابہؓ حبش ہی میں موجود تھے۔ شاہ حبش نجاشی کے پاس جب حضور اکرمؐ کا خط مبارک پہنچا تو وہ اس کے احترام میں تخت سے نیچے اتر آیا اور اس کو آنکھوں سے لگایا۔ پھر اس نے حضرت جعفر طیارؓ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہؐ کو جواب میں لکھا کہ میں تہ دل سے گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔" اس کے علاوہ نجاشی نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں کچھ تحفے بھی بھیجے۔ روایت ہے کہ جب نجاشی نے وفات پائی تو حضور اکرمؐ نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔

سوال: رسول اللہؐ نے شاہِ مصر، مقوقس کے نام جو خط لکھا، اس کا کیا اثر ہوا؟

مقوقس کے نام خط

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تھا خط مقوقس شاہ مصر کے نام لکھا۔ اس خط کا مضمون یہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمدؐ کی طرف سے

قبطیوں کے سردار مقوقس کے نام

جس نے ہدایت پائی اس پر سلام ہو۔

میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر لو، امن و سلامتی میں رہو گے خدا تمہیں دوگنا اجر دے گا۔ اگر تم حق سے منہ پھیرو گے تو ہر قبطی کا گناہ تمہاری گردن پر ہو گا۔

اے اہلِ کتاب! آؤ ہم آپس میں اس مشترکہ بات پر متفق ہو جائیں کہ ہم ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں اگر تم منہ پھیرو، تو گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار مسلمان ہیں۔"

(مہر)

مقوقس کا جواب

مقوقس، قیصر روم کا صوبائی حاکم تھا۔ اس نے بھی ہرقل کی طرح حضور اکرمؐ کے خط مبارک کو عزت کی نظر سے دیکھا اور آپ کے سفیر کے ہاتھ بہت سے تحفے بھیجے، جن میں ماریہ قبطیہ بھی تھیں، جو بعد میں حضور اکرمؐ کے نکاح میں آ کر امہات المومنین (مومنوں کی مائیں) میں شامل ہوئیں۔ لیکن مقوقس نے اپنی قوم کے ڈر اور حکومت کے لالچ کی وجہ سے اسلام قبول نہ کیا۔

دیگر مختلف خطوط

اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے کچھ اور حاکموں کو بھی اس قسم کے خطوط بھیجے، جن میں یمامہ، بصریٰ، بحرین اور بنو غسان کے حکمران شامل ہیں۔

چند خطوط عرب کے رئیسوں کے نام لکھے گئے، جن کے مختلف جواب آئے۔ ان میں سے ایک رئیس نے یہ جواب دیا:

"آپ جو باتیں فرماتے ہیں، وہ نہایت اچھی ہیں، لیکن اگر حکومت میں کچھ میرا حصہ بھی ہو، تو میں ایمان لانے کے لئے تیار ہوں۔"

حضور اکرمؐ نے اس لالچی انسان کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔

ایک خط قبیلۂ غسان کے مشہور رئیس حارث کے نام بھیجا گیا، جو آپ ہی کے عربوں

پر حکومت کرتا تھا اور حکومت روم کے ماتحت تھا۔ وہ حضور اکرمؐ کا خط مبارک پڑھ کر بہت بگڑا اور غصے میں آکر اپنی فوج کو مسلمانوں پر حملے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کے بعد مسلمانوں کو ہر وقت اس حملے کا خطرہ رہتا تھا۔ اسی کے نتیجے میں غزوہ تبوک پیش آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حارث کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

(اقبالؒ)

اسلام کا زمانے میں سکہ بٹھا دیا اپنی مثال آپ ہیں یارانِ مصطفےؐ

(ظفر علیخاں)

اسلام کا ہم سکہ دنیا میں بٹھا دیں گے توحید کے نعروں سے دنیا کو ہلا دیں گے

فتح خیبر ۷ھ اور جنگ موتہ ۸ھ

سوال: مندرجہ ذیل پر مختصر مگر جامع نوٹ لکھئے:

(ا) فتح خیبر (ب) جنگ موتہ

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟ شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟ (اقبالؒ)

جواب: ا۔ **غزوہ خیبر**

مدینہ منورہ سے کوئی تین سو پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر یہودی نہایت مضبوط قلعے بنا کر رہتے تھے۔ عبرانی زبان میں قلعے کو "خیبر" کہتے ہیں، اس لیے یہ پورا علاقہ خیبر کے نام سے مشہور ہوا۔ خیبر عرب یہودیوں کی قوت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہودی لگاتار اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔

غزوہ خیبر کے اسباب

۱۔ **یہودی سازشیں**

خیبر کے باشندوں میں ایک قبیلہ بنو نضیر تھا۔ جو مدینہ منورہ چھوڑ کر یہاں آباد ہو گیا تھا۔ یہ یہودی مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ بنو نضیر نے اپنی حرکتیں یہاں بھی نہ چھوڑیں اور آس پاس

کے قبیلوں سے سازباز کر کے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

۳۔ **قلعوں کی تعمیر** خیبر میں جا بسنے کے بعد یہودیوں نے وہاں مضبوط قلعے تعمیر کر لئے تھے۔ ان قلعوں کی تعداد چھ تھی اور ان میں بیس ہزار تربیت یافتہ سپاہی موجود تھے۔ یہودیوں کی ان زبردست جنگی تیاریوں کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا۔

۴۔ **منافقوں سے سازباز** ان یہودیوں نے مدینے کے منافقوں کو بھی درپردہ (چوری چھپے) اپنے ساتھ ملا لیا تھا جو انہیں مسلمانوں کی ایک ایک بات کی خبر دیتے رہتے تھے۔

واقعات:۔

رسول اللہؐ کی تیاری جہاد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہودیوں کے ان ناپاک اور خطرناک ارادوں کا علم ہوا تو آپؐ نے بھی مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیاری کا حکم دے دیا۔ آپ محرم ۷ھ میں سولہ سو مجاہدین کے ساتھ خیبر کی طرف بڑھے۔ آپ نے اپنے لشکر کے تین علم (جھنڈے) تیار کرائے، جن میں ایک علم حضرت حباب بن منذر کو، دوسرا حضرت سعدؓ بن عبادہ کو اور تیسرا حضرت علی مرتضیٰؓ کو عطا فرمایا۔

اسلامی لشکر کا رعب مسلمانوں کا یہ لشکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہنمائی میں اس جوش و خروش سے آگے بڑھ رہا تھا کہ جدھر سے یہ لشکر گزرتا تھا، کافروں اور مشرکوں کے دل لرز جاتے تھے۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے　　جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا　　سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی　(اقبالؔ)

رسول اللہؐ کی دعا جب یہ اسلامی لشکر خیبر کے قریب پہنچا تو نماز مغرب کا وقت ہونے کو تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو ٹھہرنے کا حکم دیا اور پھر یہ دعا مانگی۔

"یا اللہ! ہم تجھ سے اس بستی کی تمام چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کے شر سے پناہ مانگتے ہیں۔"

صلح کی کوشش

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا مانگنے کے بعد نماز مغرب وعشاء باجماعت ادا کی اور رات وہیں بسر کی۔ کیونکہ حضور اکرمؐ رات کے وقت جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضورؐ یہ چاہتے تھے کہ اگر صلح سے معاملہ طے ہو جائے اور یہودی اسلام دشمنی چھوڑ دیں، تو مسلمانوں کا لشکر واپس چلا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

جنگ کا آغاز

یہودیوں کے ارادے خطرناک تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بات چیت کا موقع ہی نہ دیا اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس وقت حضور اکرمؐ نے صحابہؓ کو جہاد کے لیے بڑھنے کا حکم دیا اور ضروری باتوں کے متعلق نصیحتیں فرمائیں۔ یہودیوں نے جب اسلامی لشکر کو آتے دیکھا تو قلعہ بند ہو کر مقابلہ شروع کر دیا۔ انہوں نے عرب کے ایک قبیلے بنو غطفان کے ساتھ ساز باز کر رکھی تھی لیکن وہ اس موقع پر پہنچ کر مدد نہ کر سکے اور مسلمانوں نے ایک ایک کر کے پانچ قلعے بہت جلد فتح کر لیے۔

حضرت علیؓ کا کارنامہ

خیبر کے پانچ قلعے صحابہ کرامؓ نے آسانی سے فتح کر لیے تھے۔ لیکن چھٹا قلعہ "قموص" نامی آسانی سے فتح نہ ہو سکا۔ یہ قلعہ ایک نامی گرامی یہودی پہلوان کا مرکز تھا، جس کا نام مرحب تھا اور جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ جب بیس دن تک مسلمان اس قلعے کو فتح نہ کر سکے تو ایک دن شام کو رسول اللہؐ نے فرمایا:

"کل میں ایک خاص عَلَم (جھنڈا) اس شخص کو دوں گا، جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا اور جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو چاہتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسولؐ بھی اس کو چاہتے ہیں۔"

آپؐ کا یہ ارشاد سُن کر ہر صحابیؓ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ خوش نصیبی اسے حاصل ہو۔ صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ علیؓ کہاں ہے؟ حضرت علیؓ حاضر خدمت ہوئے۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ حضور اکرمؐ نے اپنا تھوک مبارک ان کی آنکھوں میں لگایا تو تکلیف دور ہو گئی۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؓ کو جھنڈا دیا اور فتح کی دعا کی اور نصیحت فرمائی کہ یہودیوں کو نرمی سے اسلام کی دعوت دینا۔ اگر ایک شخص بھی ایمان لے آئے تو یہ سُرخ اونٹوں کے ملنے سے بہتر ہے۔"

مرحب پہلوان کا خاتمہ

جب حضرت علیؓ شیر خدا قلعے کے نزدیک پہنچے، تو مرحب آپ کے مقابلے میں آیا۔ آپ نے اُسے

اسلام کی دعوت دی۔ اس نے جواب میں یہ جنگی شعر پڑھے۔

"خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر ہوں، تجربہ کار ہوں اور ہتھیار باندھ کر آیا ہوں"

اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا:

"میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر (شیر) رکھا میرا حملہ شیر کی طرح ہیبت ناک ہے"

اس کے بعد مرحب نے حملہ کیا۔ لیکن وار خالی گیا۔ پھر حضرت علیؓ نے جواب میں اس زور سے تلوار ماری، جو مرحب کے سر کو کاٹتی ہوئی اس کے دانتوں تک اتر آئی اور یوں مرحب کا غرور خاک میں مل گیا۔

عام لڑائی اور فتح

مرحب کے مارے جانے پر یہودی مل کر حضرت علیؓ پر ٹوٹ پڑے اور عام لڑائی شروع ہو گئی۔ آخر کار یہ قلعہ بھی فتح ہو گیا۔ اس جنگ میں ۹۳ یہودی مارے گئے اور ۱۵ مسلمان شہید ہوئے۔ روایت ہے کہ اس قلعے کا لوہے کا دروازہ بہت وزنی تھا جسے کئی آدمی مل کر مشکل سے اٹھاتے تھے۔ لیکن حضرت علیؓ اس دروازے کو اکھاڑ کر ڈھال کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ یہ خدائی طاقت تھی۔

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے ۔ اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر (اقبال)

نتائج

۱۔ خیبر کی فتح سے اسلام کے دشمنوں پر مسلمانوں کا رعب اور بیٹھ گیا۔ اور یہودیوں کی قوت اور سازشوں کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۔ خیبر کے یہودیوں کی شکست سے دوسرے علاقوں کے یہودی بھی مسلمانوں کی اطاعت قبول کر کے جزیہ (شرعی ٹیکس) ادا کرنے پر تیار ہو گئے۔

۳۔ فتح کے بعد پورا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ یہودیوں نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضے میں رہنے دی جائے۔ ہم پیداوار کا آدھا حصہ مسلمانوں کو ادا کریں گے۔ حضور اکرمؐ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی۔

۴۔ مسلمانوں کا لشکر فتح حاصل کرنے کے بعد رسول اللہؐ کے ساتھ مدینہ منورہ لوٹ گیا

مسلمانوں کا مثالی عدل و انصاف

معاہدے کے مطابق جب فصل کی بٹائی کا وقت آتا تو رسول اللہ اپنے صحابی حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجتے۔ وہ غلے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کہتے کہ جو حصہ چاہے لے لو۔ یہودیوں پر اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ کہتے تھے کہ:

"زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں"۔

حضرت صفیہؓ حضور کے نکاح میں

فتح خیبر میں، خیبر کے یہودی سردار کی بیٹی صفیہ قید ہو ئی تھیں کیونکہ وہ ایک سردار اور رئیس کی بیٹی تھیں۔ اس لئے رسول اللہؐ نے انہیں آزاد کرکے ان سے نکاح کر لیا اس طرح حضرت صفیہؓ امہات المومنین (مومنوں کی مائیں) میں شامل ہوگئیں۔

یہودی سازش

فتح خیبر کے بعد اگرچہ یہودیوں کا زور ٹوٹ گیا تھا لیکن پھر بھی وہ مختلف طریقوں سے اور چھپ کر مسلمانوں اور حضور اکرمؐ کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک یہودی عورت زینب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ جب حضورؐ نے کھانے کے لئے لقمہ اٹھایا تو گوشت کی بوٹی میں سے آواز آئی کہ "اے اللہ کے نبیؐ! مجھے مت کھایئے۔ مجھ میں زہر ملا ہوا ہے" چنانچہ آپ نے لقمہ واپس رکھ دیا۔ لیکن ایک دوسرے صحابی بشرؓ بن براءؓ نے لقمہ کھا لیا اور وہ ہلاک ہوگئے۔ اس لئے آپؐ نے ان کے بدلے میں زینب کو قتل کرا دیا۔

(ب) جنگ موتہ ۸ھ

۱۔ اسلامی سفیر کا قتل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی اشاعت کے لیے جن حکمرانوں کو خطوط لکھے تھے، ان میں بنو غسان کا حاکم شرجیل بن عمرو غسانی بھی شامل تھا۔ بنو غسان عرب کا ایک زبردست قبیلہ تھا، جو عرب اور شام کی سرحد پر آباد ہو گیا تھا۔ یہ لوگ کچھ عرصہ سے عیسائی ہو گئے تھے اور اب قیصر روم کے باج گذار بن کر اس کے زیر حمایت رہتے تھے۔ شرجیل ایک مغرور اور سرکش انسان تھا، جب اس کے پاس حضور ؐ کے سفیر حضرت حارث ؓ بن عمیر ازدی خط لے کر پہنچے تو انہیں قتل کر دیا گیا۔

۲۔ اسلامی لشکر کی روانگی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اس افسوسناک واقعہ کی خبر ملی تو آپ ؐ کو قدرتی طور پر سخت رنج پہنچا۔ چنانچہ مسلمان سفیر کے انتقام اور غسانی حکمران کی اس گستاخی کی سزا کے لیے آپ ؐ نے تین ہزار مسلمانوں پر مشتمل ایک لشکر مرتب کیا اور حضرت زید ؓ بن حارثہ کو اس کا امیر مقرر کر کے فرمایا: اگر وہ شہید ہو جائیں تو حضرت جعفر ؓ بن ابی طالب امیر ہوں اور اگر وہ بھی جام شہادت نوش کر جائیں تو حضرت عبداللہ ؓ بن رواحہ سپہ سالار ہوں گے۔

۳۔ واقعات جنگ

لشکر اسلام منزل کی طرف روانہ ہو رہا تھا کہ اس کا سامنا قیصر روم کی جرار فوج کے ساتھ ہو گیا، جو اُن دِنوں اس طرف خیمہ زن تھی چنانچہ موتہ کے مقام پر دونوں فوجوں میں سخت جنگ شروع ہو گئی۔ تین ہزار کی مٹھی بھر فوج دو لاکھ ٹڈی دل لشکر کے طوفانی حملوں کا مقابلہ کر رہی تھی، عجیب و غریب معرکہ تھا، حق و باطل کے ٹکراؤ میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں۔

سب سے پہلے حضرت زید ؓ نے علم لیا اور بے جگری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت جعفر ؓ کی باری تھی، انہوں نے لپک کر جھنڈا اٹھا لیا اور بے مثال جنگ شروع کر دی۔ اسی دوران ان کا داہنا ہاتھ کٹ گیا اور انہوں نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ یہاں تک کہ وہ بھی کاٹ دیا گیا۔ پھر دونوں باقی ماندہ بازوؤں سے جھنڈا آغوش میں لے لیا اور اسی حالت میں لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اللہ نے انہیں ان کے دونوں بازوؤں کے عوض جنت میں دو بازو عطا کیے، جن کے ذریعے وہ جہاں چاہتے ہیں اڑتے ہیں۔ اسی لیے ان کا لقب جعفر طیار ؓ پڑ گیا (یعنی اڑنے والا)۔ اب حضرت عبداللہ ؓ بن رواحہ نے پرچم اٹھایا، اور وہ بھی بہادری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

۴۔ حضرت خالد سیف اللہؓ علم اٹھاتے ہیں

اس موقع پر صحابہؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو منتخب کیا اور انہوں نے جھنڈا لیتے ہی نہایت پرزور جنگ کی۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس روز حضرت خالدؓ کے ہاتھ سے آٹھ تلواریں ٹوٹیں۔ اس موقع پر حضرت خالدؓ نے بے مثال بہادری وشجاعت کے علاوہ بہترین جنگی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے اپنے لشکر کو اس نئے سرے سے مرتب کیا کہ دشمن یہ سمجھا کہ مسلمانوں کو نئی کمک پہنچ گئی ہے۔ پھر کچھ دیر تک جھڑپ ہو چکی تو مسلمانوں کو تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹانا شروع کیا، لیکن رومیوں نے اس خوف سے ان کا پیچھا نہ کیا کہ مسلمان دھوکہ دے رہے ہیں اور کوئی چال چل کر انہیں صحرا کی وسعتوں میں پھینک دینا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن اپنے علاقے میں واپس چلا گیا اور مسلمان کامیابی اور سلامتی کے ساتھ پیچھے ہٹے اور پھر مدینہ واپس آگئے۔ اس جنگ میں بارہ مسلمان شہید ہوئے، دشمن کے آدمی بڑی تعداد میں مارے گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت خالدؓ کی دانائی و بہادری کا علم ہوا تو آپؐ ان پر بہت خوش ہوئے اور انہیں سیف اللہ (یعنی اللہ کی تلوار) کا خطاب عطا فرمایا۔

وحی کے ذریعے پیشگی اطلاع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ موتہ ہی کے روز جبکہ ابھی میدانِ جنگ سے کسی قسم کی اطلاع نہیں آئی تھی، وحی کی بناء پر فرمایا کہ جھنڈا زیدؓ نے لیا، اور وہ شہید کر دیئے گئے، پھر جعفرؓ نے لیا، وہ بھی شہید کر دیئے گئے، پھر عبداللہؓ بن رواحہ نے لیا اور وہ بھی شہید کر دیئے گئے۔ اس دوران حضورؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ یہاں تک کہ جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے لے لیا (اور ایسی جنگ لڑی کہ) اللہ نے ان پر فتح عطا کی۔"

نتیجہ جنگ

اگرچہ اس معرکہ میں دشمن سے خاطر خواہ انتقام نہ لیا جا سکا، لیکن مسلمانوں کی ساکھ اور شہرت میں بڑا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ سے سارے عرب انگشت بدنداں رہ گئے کہ مسلمان بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جانے کا دم خم رکھتے ہیں۔ پھر اتنے بڑے لشکر کے مقابلے میں مٹھی بھر فوج کو بحفاظت صحیح سلامت واپس لے آنا بذات خود ایک کارنامہ ہے۔ اس معرکہ کے نتیجہ میں عرب کے وہ ضدی قبائل جو مسلمانوں سے برسر پیکار رہتے تھے۔ اسلام کی طرف مائل ہو گئے یہی معرکہ ہے جس سے رومیوں کے ساتھ خونریز ٹکر شروع ہوئی جو آگے چل کر رومی ممالک کی فتوحات اور دور دراز علاقوں پر مسلمانوں کے اقتدار کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

فتح مکّہ ۸ھ

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۙ (الفتح:۱)

ترجمہ: (اے محمدؐ!) ہم نے آپؐ کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف

سوال: فتح مکہ کے اسباب، واقعات اور نتائج بیان کیجئے؟

جواب

۱۔ فتح مکہ کا پس منظر اور اسباب

بقول مولانا شبلی نعمانی جانشینِ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے مقدم فرض توحیدِ خالص کا احیاء اور بیت اللہ کو شرک کی ہر آغوش سے پاک کرنا تھا، لیکن قریش کے پے درپے حملوں اور عرب کی مخالفتِ عام نے پورے ۲۱ برس تک اس فرض کو روک رکھا۔ صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ کچھ عرصہ کے لیے امن و امان قائم ہو گیا اور مسلمانوں کو اللہ کے گھر کی زیارت کا موقع مل گیا تھا، لیکن یہ مقصودِ حقیقی نہ تھا۔ آخر حالات ایسے بدلے کہ قریش معاہدہ حدیبیہ کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اب پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا اور فیصلہ کن مرحلہ آن پہنچا تھا۔

صلح حدیبیہ کی بناء پر قبائلِ عرب میں سے بنو خزاعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر قریش کے طرفدار بن گئے تھے۔ ان دونوں حریفوں میں عرصہ سے لڑائیاں چلی آتی تھیں۔ ظہورِ اسلام کے باعث یہ لڑائیاں رکی رہیں اور صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن بنو بکر کی نیت یکدم بدل گئی۔ انہوں نے سوچا کہ اب انتقام کا اچھا موقع ہے۔ چنانچہ وہ اچانک بنو خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور قریش نے علانیہ ان کی مدد کی۔ بنو خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی۔ لیکن انہیں وہاں بھی نہ چھوڑا گیا اور عین حدودِ حرم میں بنو خزاعہ کا خون بہایا گیا۔ اس پر بنو خزاعہ کا ایک وفد فریاد لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچا۔ حضورؐ کو یہ واقعات سن کر سخت رنج ہوا۔ آپؐ نے اتمامِ حجت کی خاطر قریش کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے:

۱۔ مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے۔

۲۔ قریش، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

۳۔ معاہدہ حدیبیہ کے ٹوٹنے کا اعلان کر دیا جائے۔

قریش میں سے کسی نے کہہ دیا:

"صرف تیسری شرط منظور ہے۔"

معاہدہ حدیبیہ کے بارے میں غیر یقینی کیفیت

اسلامی قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی کہ یہ کام اچھا نہیں ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کرالیں۔ ابوسفیان نے مدینہ آکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی، لیکن بارگاہِ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا۔ ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا، لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا بالآخر ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے ایماء سے مسجد نبویؐ میں اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا "یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں، نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے"۔

لشکر اسلام کی روانگی

قریش نے معاہدہ حدیبیہ کے سلسلے میں عہد شکنی کی تھی اور انہوں نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو بکر پر بہت ظلم کئے تھے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چڑھائی کا فیصلہ فرمالیا اور تیاری کا اعلان فرمایا۔ اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں۔ اس ضمن میں حضورؐ نے بہترین جنگی حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کارروائی کو ایسا خفیہ رکھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ غرض ۱۰ رمضان ۸ ھ کو لشکر اسلام حضور اکرمؐ کی سرکردگی میں مکہ معظمہ کی طرف بڑھا اور عام راستے کی بجائے طویل اور خلاف معمول راستہ اختیار کیا گیا۔ دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں۔ قبائل عرب راہ میں آکر ملتے جاتے تھے۔ مرالظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔ حضورؐ کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا روشن و منور ہو گئے۔ اس طرح جب رات کو مسلمانوں کی قیام گاہوں پر آگ روشن ہوئی تو قریش نے دیکھا کہ مسلمان تو ان کے سر پر آپہنچے ہیں۔ اب یہ وقت ایسا تھا کہ وہ مقابلے کے لیے تیاری نہ کر سکتے تھے۔

ابوسفیان دربار رسالتؐ میں

حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اپنے اہل و عیال سمیت ہجرت کر کے مدینے جا رہے تھے کہ راستے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات ہو گئی اور وہ بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔ ابوسفیان دوسرے چند سرداروں کے ساتھ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلے تو ہر طرف مسلمان فوجوں کا اجتماع دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ حضرت عباسؓ دل سے چاہتے تھے کہ ان کی قوم اسلام قبول کر لے تاکہ وہ بڑی تباہی سے بچ جائے۔ وہ اس خیال سے رات کو حضورؐ کے خچر پر سوار ہو کر مکے کی طرف گئے۔

اتفاق سے راہ میں ابوسفیان مل گئے۔ حضرت عباسؓ ان کے پرانے دوست تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کی بھی جان بچائی جائے، چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو اپنے ساتھ خچر پر بٹھالیا اور انہیں تیزی سے آپؐ کے پاس لے آئے تاکہ ان کے لیے امان حاصل کر لی جائے۔

ابوسفیان اب تک اسلام کے سخت دشمن چلے آ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو راہ میں دیکھ کر پہچان لیا اور انہیں قتل کرنا چاہا، لیکن حضرت عباسؓ ابوسفیان کو بچا کر حضور نبویؐ میں لے گئے۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا کیوں ابوسفیان! کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟ انہوں نے جواب دیا "کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا"۔ بہرحال ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا اور وہ سچے مسلمان بن گئے اور اسلام کی بڑی خدمات سرانجام دیں۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دو تاکہ وہ شوکت اسلام کا نظارا کر سکے۔ ابوسفیان اس زبردست لشکر اسلام کو دیکھ کر بہت مرعوب ہوئے اور کہا "عباسؓ! تمہارا بھتیجا بادشاہ بن گیا ہے"۔ حضرت عباسؓ بولے "یہ بادشاہت نہیں نبوت ہے"۔ حضرت عباسؓ نے حضورؐ سے عرض کی کہ ابوسفیان جاہ پسند شخص ہے، اس لیے اسے کوئی اعزاز دے دیا جائے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ہر اس شخص کو امان حاصل ہے جو:

۱۔ ہتھیار ڈال دے اور اپنے مکان کا دروازہ بند کر دے۔

۲۔ مسجد الحرام میں داخل ہو جائے۔

۳۔ ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے۔

ابوسفیان اپنی اس عزت افزائی پر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مکے میں جا کر اعلان کر دیا کہ لوگو! اگر جان کی امان چاہتے ہو تو کعبے میں یا میرے گھر میں پناہ لو یا اپنے دروازے بند کر لو اور تلواریں میانوں میں رکھو۔"

مکہ میں فاتحانہ داخلہ

اس کے بعد لشکر اسلام نہایت شان و شوکت کے ساتھ مکے کی طرف بڑھا۔ آپؐ نے مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ حرم کے احترام کی خاطر خونریزی بالکل نہ ہو، چنانچہ مکہ میں داخلہ نہایت پرامن ہوا۔ صرف حضرت خالدؓ کے دستے پر تیر برسائے گئے جس پر انہیں جوابی کارروائی کرنی پڑی جس سے کچھ جانی نقصان ہوا۔ جب حضور اکرمؐ شہر میں داخل ہو رہے تھے تو آپؐ کا سر مبارک اپنی سواری پر رب العزت کے حضور میں حمد و شکر کے لیے جھکا ہوا تھا۔ یہ دنیا کے فاتح اعظم کی منفرد شان تھی۔ سب سے پہلے آپؐ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اپنی سواری پر اس کا سات بار طواف کیا اور حجر اسود کو چوما۔ اس وقت آپؐ کے ہاتھ مبارک میں ایک کمان

تھی اور بیت اللہ کے گرد اور اس کی چھت پر تین سو ساٹھ بت تھے۔ آپؐ اسی کمان سے ان بتوں کو ٹھوکر مارتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝

(بنی اسرائیل: ۸۱)

ترجمہ: حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا۔ بے شک باطل نابود ہونے والا ہے۔

اور آپؐ کی ٹھوکر سے بت چہروں کے بل گرتے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ آپؐ کے حکم کے مطابق وہاں جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دی گئیں۔ بیت اللہ ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپؐ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے چابی طلب کی اور دروازہ کھلوایا۔ آپؐ حضرت بلالؓ اور حضرت طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ اس کے بعد حضورؐ نے خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا:

"اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ اپنے بندے کی امداد فرمائی اور سارے جتھوں کو شکست دی۔ ہر قسم کا فخر، خون اور مال کے دعوے میرے قدموں کے نیچے ہیں"۔

اے جماعت قریش! تمہارے جاہلیت کے تکبر اور نسب کے غرور کو خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی"۔

عفوِ عام

خطبہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، وہ کون سا ظلم تھا جو ان لوگوں نے روا نہ رکھا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے آپؐ پر اور صحابہ کرامؓ پر بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔ وہ طرح طرح کی گستاخیاں کرتے اور اذیتیں دیتے رہے تھے، وہ بھی تھے جنہوں نے حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔ وہ بھی تھے جنہوں نے آپؐ کے قتل کی سازشیں کی تھیں۔ وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ کر ٹکراتا تھا۔ اگر آپؐ چاہتے تو ان سے گن گن کر بدلے لے سکتے تھے اور حضورؐ کے ایک ادنیٰ اشارے پر خون کی ندیاں بہہ سکتی تھیں۔ لیکن آپؐ کو تو اللہ تعالیٰ نے رحمت للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ آپؐ کا مقصد انسان کو ہلاک کرنا نہیں بلکہ انہیں راہِ راست پر لانا تھا۔ چنانچہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان رئیسانِ قریش کی طرف دیکھا جو سر جھکائے حضورؐ کے روبرو بیٹھے تھے اور پُرجلال لہجہ میں پوچھا، تم کو کچھ معلوم ہے، میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں"؟

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، سنگدل تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے کہ:

اخٌ کریمٌ و ابن اخٍ کریمٍ

آپ شریف بھائی ہیں اور شریف برادر زادہ ہیں۔

ارشاد ہوا، تو میں تم سے وہی بات کہہ رہا ہوں، جو حضرت علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی:

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ، اِذْ هَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ

یعنی آج کے دن تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

چنانچہ چند اشتہاری مجرموں کے علاوہ سب کو امان دے دی، نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی۔ قریش کی قوت اور رعونت اگرچہ خاک میں مل چکی تھی، لیکن اب بھی جاہلی تعصب باقی تھا، چنانچہ اذان کی آواز سن کر بعض نے ناک بھوں چڑھائی اور باتیں بنائیں۔ تاہم ان کے لیے دامنِ رحمت کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ باقی نہ رہ گئی تھی اور رحمتِ عالمؐ کے عفوِ عام نے اکثر کے دلوں سے اسلام کی نفرت دور کردی تھی، اس لیے صدہا پرغرور سر آستانِ اسلام پر خم ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقامِ صفا میں ایک بلند مقام پر تشریف فرما تھے اور کفار جوق در جوق بیتِ اسلام سے مشرف ہوتے تھے۔

حضورؐ نے ہندہ زوجہ ابوسفیان کو بھی معاف فرمادیا، جس نے حضورؐ کے پیارے چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا، اب وہ اسلام لاچکی تھیں۔ آپؐ نے اس ظالم وحشی کو بھی معاف فرمادیا جس نے حربہ پھینک کر حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔ وہ بھی اسلام لے آئے۔ حضورؐ نے صرف اتنا فرمایا کہ تم جب میری مجلس میں آؤ تو میرے سامنے نہ بیٹھا کرو کہ مجھے چچا یاد آجاتے ہیں۔ عکرمہ بن ابوجہل خوف سے مکہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، لیکن عفوِ عام کا سنا تو حاضرِ خدمت ہوئے اور اسلام قبول کرلیا۔

مدینہ منورہ کو واپسی

مکہ معظمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قیام پندرہ دن تک رہا، انصارِ مدینہ نے خیال کیا کہ شاید حضورؐ اب اپنے وطن مکہ ہی میں مستقل قیام فرمائیں گے۔ جب حضورؐ کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا "اے گروہِ انصار! میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہے"۔ اس پر انصار کے دل باغ باغ ہوگئے۔ جب حضورؐ یہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت معاذؓ بن جبل کو اس خدمت پر مقرر کرگئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں۔

نتائج

فتح مکہ کا یہ عظیم الشان واقعہ اسلام کی آئندہ ترقی کے لیے سنگِ میل ثابت ہوا۔ کیونکہ قریش کو اہلِ عرب کی نظر میں مذہبی پیشوائی حاصل تھی۔ ان کے بہت سے قبائل اسلام کی ابدی تعلیمات سے متاثر ہونے کے باوجود بھی محض اس وجہ سے اسلام قبول کرنے سے گریز کرتے تھے کہ قریش

ابھی تک کفر و شرک کی حالت پر قائم تھے۔ قریش کے کثیر تعداد میں مسلمان ہو جانے کے بعد ایک بہت بڑی رکاوٹ دور ہو گئی اور دیگر قبائل بھی جوق در جوق دائرہ اسلام میں شامل ہو گئے۔ گویا کعبے کے بُت ٹوٹنے لگے ساتھ عرب کے سارے بت ٹوٹ گئے۔ اب دشمنانِ اسلام کو یقین ہو گیا کہ اسلام حق ہی ہے، اسی لیے مسلمان مکہ فتح کر سکے ہیں۔ اس کے علاوہ فتح مکہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کو انتہائی بے فکری اور اطمینان نصیب ہوا اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لیے فضا ساز گار ہو گئی۔ قرآن مجید کی سورۃ النصر میں اس فتح کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے:

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۧ

ترجمہ: جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح (حاصل ہو گئی) اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی تعریف کے تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو بیشک وہ معاف کرنے والا ہے۔

غزوۂ حنین ۸ھ و غزوۂ تبوک ۹ھ

سوال: مندرجہ ذیل پر مختصر مگر جامع نوٹ لکھیے:

(ا) غزوۂ حنین (ب) غزوۂ تبوک

جواب

(ا) غزوۂ حنین ۸ھ

۱۔ اسباب جنگ

حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ حنین میں قبیلہ بنو ہوازن برسر اقتدار تھا اور طائف میں بنو ثقیف۔ یہ قبیلے نہایت جنگجو اور فنونِ جنگ کے ماہر تھے۔ اس کے باوجود کہ عرب کے بیشتر قبائل فتح مکہ کے بعد اسلام میں جوق در جوق داخل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان دونوں قبیلوں کی اسلام دشمنی پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا تھا، یہ زیادہ مضطر اور بے قرار ہوتے تھے۔ انہیں اپنی ریاست و اقتدار ختم ہوتا نظر آتا تھا۔ اس لیے انہوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ مکہ پر حملہ کر کے قریش کی جاگیروں پر قبضہ کر لیا جائے اور مسلمانوں سے بت شکنی کا انتقام لیا جائے۔ ان قبائل کی کچھ شاخوں نے ان کا

ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ان کے جوش کا یہ عالم تھا کہ قبیلہ اپنا تمام اہل و عیال لے کر آیا تھا کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہوں گی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔ کفار کا چار ہزار کا لشکر حنین کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ انہوں نے تیر اندازوں کی انتہائی ماہر جماعت کو وادی کے درے پر متعین کر دیا۔ لیکن اسلامی لشکر کا وہیں سے گزرنا متوقع تھا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ تیروں کی بوچھاڑ سے اسلامی لشکر کے پاؤں اکھڑیں گے تو پہاڑی پر متعین ہوازن کی فوجیں آسانی سے مسلمانوں کو گھیر لیں گی اور پھر وہ مکہ پر قبضہ کر لیں گے۔

۲۔ اسلامی لشکر کی تیاری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ میں ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپؐ نے تصدیق کے لیے حضرت عبداللہؓ بن ابی حدرد کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر تمام حالات کا جائزہ لیا اور حضورؐ کو مطلع کیا۔ چنانچہ حضورؐ نے جہاد کا اعلان فرمایا تو بارہ ہزار کا لشکر تیار ہو گیا اور حنین کی طرف روانہ ہوا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں دشمن کی تعداد صرف چار ہزار تھی۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب مسلمان دشمن کے مقابلے میں زیادہ بلکہ تین گنا تھے۔ اس بات پر بعض مسلمانوں کے دل میں یہ بات آ گئی کہ آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے؟ خدا کو چھوڑ کر صرف اپنی کثرتِ تعداد پر یہ فخر و ناز خدا کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں اس کا یوں ذکر آیا ہے:

"اور اللہ نے حنین کے دن تمہاری مدد کی۔ جب تمہیں تمہاری کثرت نے غرور میں ڈال دیا تھا پس وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی۔ پھر تم لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر تسلی نازل کی اور ایسا لشکر نازل کیا، جسے تم نے نہیں دیکھا اور کفر کرنے والوں کو سزا دی اور یہی کافروں کا بدلہ ہے۔"

۳۔ مسلمانوں کی عارضی پسپائی اور دوبارہ فتح

مسلمان اپنی کثرت پر مطمئن تیزی سے چلے جا رہے تھے کہ وادیٔ حنین کی ایک گھاٹی سے اچانک تیروں کی بارش ہونے لگی۔ رات ختم ہو چکی تھی لیکن ابھی دن کی روشنی پوری طرح پھیلی نہ تھی۔ کچھ تاریکی کا وقت اور کچھ دفعتاً اس صورتِ حال کا سامنا، مسلمان بدحواس ہو کر انتشار کی حالت میں ادھر اُدھر بھاگنے لگے اور میدانِ جنگ میں صرف ایک سو کے قریب رہ گئے۔

حضورؐ نے جب ہر طرف حملہ آوروں کا زور دیکھا اور اپنی فوج کو بھاگتے پایا تو خود نہایت عزم و استقلال اور جرأت و شجاعت کا پیکر بنے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا،

"اے لوگو! کہاں جا رہے ہو! ادھر آؤ۔ میں خدا کا رسول ہوں۔ میں محمدؐ بن عبداللہ ہوں۔ میں عبدالمطلب

کانپتا ہوں"

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ — أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں — میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں

حضرت عباسؓ نہایت بلند آواز تھے حضورؐ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو۔ انہوں نے نعرہ مارا

اے گروہِ انصار! اے بیعت رضوان والو!

اس پر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام لشکر دفعتاً پلٹ پڑا۔ جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے۔ جب پھر مقابلہ شروع ہوا تو مسلمانوں نے نہایت بے جگری سے دادِ شجاعت دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ جنگ کا نقشہ ایسا پلٹا کہ دشمن منتشر ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے ان کے علمبردار کو اونٹ سے نیچے گرا دیا اور ایک انصاری نے اسے قتل کر ڈالا اس کے ساتھ ہی کفار کے حوصلے ٹوٹ گئے اور وہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دشمنوں کی فوج دو حصوں میں بھاگ نکلی۔ ایک حصہ جس میں کفار کے اہل و عیال اور مال مویشی تھے، اوطاس کی گھاٹی میں جا چھپا۔ یہ جگہ طائف سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ فوج کا دوسرا حصہ اپنے سردار مالک بن عوف کی سرکردگی میں طائف کے قلعہ کی طرف جا نکلا اور وہاں جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ یہ سب لوگ لڑنے والے اور فنونِ جنگ میں ماہر سپاہی تھے۔

اوطاس کی فتح

حضورؐ نے اپنے ایک سالار حضرت ابو عامر اشعریؓ کو اوطاس کی طرف بھیجا، انہوں نے وہاں جا کر دشمن کے اہل و عیال اور مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا، جس میں چھ ہزار عورتیں اور بچے، چوبیس ہزار اونٹ چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی شامل تھی۔

طائف کا محاصرہ

دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود فوج لے کر طائف کو روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا اور دشمن کے پاس لڑائی کے لیے کافی سامان موجود تھا۔ مسلمانوں نے قلعہ شکن آلات سے بار بار حملے کیے، لیکن قلعہ فتح نہ ہوا۔ دشمن طویل عرصے کے لیے اپنے دفاع کا انتظام کر چکا تھا۔ بیس دن تک محاصرہ جاری رہا۔ چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی اور اوطاس میں دشمن کو شکست فاش ہو چکی تھی اور وافر مقدار میں مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا۔ اس لیے اتنی کارروائی کو کافی سمجھ کر محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ اس موقع پر صحابہؓ نے عرض کی کہ آپؐ ان کو بددعا دیں۔ آپؐ نے یہ دعا دی:

"اے اللہ! ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔"

خاتمہ جنگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی یہاں سے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ قبیلہ ہوازن کے کچھ سردار حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے رحم کی درخواست کی۔ آپؐ نے ان کی درخواست پر فرمایا "میں اپنے اور بنو عبدالمطلب کے قیدیوں کو بلامعاوضہ آزاد کرتا ہوں۔" اس کے بعد مہاجرین اور انصار نے بھی اپنے قیدی کسی معاوضے کے بغیر آزاد کر دیئے لیکن بنو سلیم اور بنو فزارہ نے ایک قیدی کے عوض چھ چھ اونٹ کی شرط لگائی اور معاوضہ حضورؐ نے اپنے پاس سے ادا فرما کر ان کو آزاد کرا دیا۔

انہی قیدیوں کے اندر حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی ایک بیٹی شیما بھی تھیں جو حضورؐ کی رضاعی بہن تھیں جب یہ گرفتار ہوئیں تو انہوں نے کہا: "میں تمہارے پیغمبر کی رضاعی بہن ہوں۔" لوگ تصدیق کے لیے آپؐ کے پاس لائے۔ شیما نے پشت کھول کر دکھائی کہ ایک مرتبہ بچپن میں آپؐ نے دانت سے کاٹا تھا، یہ اس کا نشان ہے۔" یہ سن کر فرطِ محبت میں حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے خود چادر مبارک بچھائی، لطف و محبت کی باتیں کیں۔ چند اونٹ اور بکریاں عطا کیں۔ ارشاد فرمایا: جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور اگر گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔" شیما نے گھر جانا پسند کیا، آپؐ نے عزت و احترام کے ساتھ بھجوا دیا۔

اس جنگ سے جو مالِ غنیمت ملا، وہ مسلمانوں میں درجہ بدرجہ بانٹ دیا گیا۔ غزوۂ حنین میں گو مسلمانوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑا اور انہیں کافی پریشانی ہوئی۔ لیکن نتائج کے اعتبار سے یہ جنگ اور محاصرۂ طائف ان کے حق میں کافی فائدہ مند بھی ثابت ہوئے۔ کیونکہ عرب کے تمام قبائل یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے ساتھ زور آزمائی کر چکنے کے بعد پھر کبھی ان کے مقابلہ پر نہ آئے۔ اور اس طرح ان کے تمام مخالف رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو (اقبالؒ)

(ب) غزوۂ تبوک ۹ھ

۱۔ رومیوں کی لشکر کشی تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینہ اور دمشق کے درمیان میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ منزل ہے۔ جنگِ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے

زیراثر حکومت کر رہا تھا، مذہب کے لحاظ سے عیسائی تھا، اس لیے قیصر روم نے اسی کو اس مہم پر مقرر کیا۔ مدینہ منورہ میں یہ خبریں اکثر گشت کرتی رہتی تھیں۔ شام کے نبطی سوداگر مدینہ منورہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انہوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں زبردست لشکر جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں جمع کر دی ہیں۔ اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش (ہراول دستہ) بلقاء تک آ گیا ہے۔ ہرقل روم نے چالیس ہزار فوج بھیج دی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاری جہاد

بہر حال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں اور آثار و قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جہاد کی تیاری کا حکم دیا۔ سوء اتفاق سے یہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں۔ ان اسباب سے لوگوں کا گھر سے نکلنا نہایت گراں اور شاق تھا۔ ادھر منافقین کا یہ حال تھا کہ وہ خود بھی جی چراتے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ گرمی میں نہ نکلو۔ سویلم ایک یہودی تھا، اس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے۔ آنحضرتؐ نے تمام قبائل عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی۔

۳۔ صحابہ کرامؓ کا ایثار

حضور اکرمؐ نے جب مالدار لوگوں کو مالی امداد دینے کا حکم دیا تو صحابہ کرامؓ نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا خیال تھا کہ وہ اس دفعہ ضرور حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بڑھ جائیں گے، چنانچہ انہوں نے اپنا آدھا مال حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے گھر کی ہر چیز لے آئے تھے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ "ابو بکرؓ! بیوی بچوں کے لیے کیا رکھا ہے؟" انہوں نے عرض کی "یا رسول اللہؐ! گھر والوں کے لیے خدا اور رسولؐ کا نام کافی ہے۔" حضورؐ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس بے پناہ اور مثالی ایثار پر بہت خوش ہوئے اور اسے خدا کی خوشنودی کا سبب قرار دیا۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

حضرت عثمان غنیؓ نے مجموعی طور پر نو سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے پیش کیے۔ دس ہزار اشرفیاں اس کے علاوہ تھیں۔ حضور اکرمؐ اشرفیوں کو الٹتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے: "آج کے بعد عثمانؓ جو بھی کریں، انہیں ضرر نہ ہوگا۔" دیگر صحابہ کرامؓ نے بھی دل کھول کر مالی امداد کی۔ عورتوں نے بھی ہار، بازو بند، پازیب، بالی اور انگوٹھی وغیرہ جو کچھ ہو سکا، آپؐ کی خدمت میں بھیجا۔

۴۔ لشکر اسلام کی روانگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپؐ مدینہ منورہ سے تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا نائب حاکم مقرر فرما کر

جاتے۔ چنانچہ اس غزوہ میں دوسرے معرکوں کے برعکس ازواجِ مطہراتؓ ساتھ نہیں گئی تھیں۔ چنانچہ اہلِ حرم کی حفاظت کے لیے کسی عزیزِ خاص کا رہنا ضروری تھا، اس لیے اب کے یہ ذمہ داری حضرت علی المرتضیٰؓ کو سونپی گئی۔ انہوں نے شکایت کی کہ آپؐ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو، جو ہارونؑ کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی ۔ (لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں)۔

الغرض حضورؐ تیس ہزار کے ساتھ مدینہ سے نکلے، جس میں دس ہزار گھوڑے تھے۔ راہ میں وہ عبرت ناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے تھے چونکہ اس مقام پر عذابِ الٰہی نازل ہو چکا تھا، اس لیے حضورؐ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پیئے اور نہ کسی کام میں لائے۔

۵۔ لشکرِ اسلام تبوک میں

اسلامی لشکر تبوک میں اتر کر خیمہ زن ہوا۔ وہ رومیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ پھر رسول اللہؐ نے اہلِ لشکر کو مخاطب کر کے نہایت بلیغ و جامع خطبہ دیا۔ دنیا اور آخرت کی بھلائی کی رغبت دلائی، اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور اس کے انعامات کی خوشخبری دی۔ اس طرح فوج کا حوصلہ بلند ہوا۔ دوسری طرف رومیوں اور ان کے حلیفوں کا یہ حال ہوا کہ اسلامی لشکر کی آمد کی خبر سن کر ان کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ انہیں آگے بڑھنے اور ٹکر لینے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ اندرونِ ملک مختلف شہروں میں بکھر گئے۔ اس کے نتیجہ میں عرب کے اندر اور باہر مسلمانوں کی فوجی ساکھ پر بہت عمدہ اثر مرتب ہوا اور مسلمانوں کو بہت سے اہم سیاسی فوائد حاصل ہوئے۔

اَیلہ کے حاکم یحنہ بن روبہ نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر جزیہ کی ادائیگی منظور کی اور صلح کا معاہدہ کیا۔ جربا اور اذرح کے باشندوں نے بھی خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہو کر جزیہ دینا منظور کیا۔ حضورؐ نے ان کے لیے ایک تحریر لکھ دی۔ اس کے علاوہ حضورؐ نے حضرت خالدؓ کو سوا چار سو سواروں کا رسالہ دے کر دومۃُ الجندل کے حاکم اکیدر کے پاس بھیجا، انہوں نے حملہ کر کے اکیدر کو گرفتار کر لیا اور اسے حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ آپؐ نے اس کی جان بخشی کی اور دو ہزار اونٹ، آٹھ سو غلام، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے دینے کی شرط پر مصالحت فرمائی۔ اس نے جزیہ بھی دینے کا اقرار کیا۔

حضورؐ نے تبوک میں ۲۰ دن قیام فرمایا۔ ان حالات کو دیکھ کر وہ قبائل جو اب تک رومیوں کے آلۂ کار بنے ہوتے تھے مسلمانوں کے حمایتی بن گئے۔ یوں اسلامی حکومت کی سرحدیں وسیع ہو کر براہِ راست رومی سرحد سے جا ملیں اور رومیوں کے آلۂ کار کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا۔

۶۔ مدینہ کو واپسی اسلامی لشکر تبوک سے کامیاب و کامران واپس آیا۔ کوئی ٹکر نہ ہوئی اللہ جنگ کے معاملے میں مومنوں کے لیے کافی ہوا۔ البتہ راستے میں ایک جگہ ایک گھاٹی کے پاس بارہ منافقین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ سازش ناکام ہوئی۔ جب حضورؐ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو لوگوں نے پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد آپؐ نے ان لوگوں سے باز پرس فرمائی جو اس غزوہ میں شریک نہ ہوئے تھے۔ منافقین تو طرح طرح کے بہانے بنا کر بچ نکلے۔ البتہ جو صحابہ کرامؓ اس غزوہ میں شریک نہ ہو سکے، ان کا پچاس روز تک معاشرتی بائیکاٹ کیا گیا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

انہی دنوں میں منافقین نے مدینہ میں مسجدِ ضرار کی تعمیر کی جسے وہ اپنی سازشوں کا گڑھ بنانا چاہتے تھے۔ حضور اکرمؐ نے وحی الٰہی کے مطابق اسے منہدم کرا دیا۔ اسی زمانہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا انتقال ہو گیا، جس کے بعد منافقوں کا زور بھی کم ہو گیا جو ہمیشہ آپ کے ساتھ ساز باز کرتے رہتے تھے۔

نتیجہ گو اس لشکر کی روانگی سے کسی دشمن کے ساتھ مقابلہ نہ ہوا، لیکن مسلمانوں کے دشمنوں اور خاص طور پر منافقوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں میں تنگی اور بدحالی کے باوجود بڑے سے بڑے خطرے کے مقابلے کا حوصلہ موجود ہے اور ان کو خوف زدہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

خطبہ حجۃ الوداع ۱۰ھ

سوال: خطبہ حجۃ الوداع کے اہم نکات اور اس کی اہمیت بیان کیجیے؟

جواب: **حجۃ الوداع ۱۰ھ** جب سارے عرب میں اسلام پھیل چکا، خدا کی بھٹکی ہوئی مخلوق اپنے اصلی مرکز پر آ چکی، اسلام کے عقائد و اعمال اور شریعت کے اصول و قوانین کی تکمیل ہو چکی، حکومتِ الٰہی کا قیام عمل میں آ چکا اور سارے عالم کی رہنمائی کے لیے صحابہ کرامؓ کی جماعت تیار ہو چکی تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جزیرۃ العرب کے مسلمانوں کے سامنے خصوصاً اور ساری دنیا کے لیے عموماً اسلام، اس کی شریعت اور اخلاق کے تمام اساسی اصولوں کا اعلان کرنے کے لیے حج کا اعلان فرمایا۔ اسلام میں حج ۹ھ میں فرض ہوا۔ اسی سال آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیرِ حج بنا کر تین سو صحابہ کرامؓ کے ہمراہ حج کے لیے مکے بھیج دیا۔ آپؐ نے خود صرف ایک بار ۱۰ھ میں حج کیا۔ اس موقع پر لوگوں کو الوداع کہا۔ اسی وجہ سے یہ حج حجۃ الوداع

کے نام سے مشہور ہے۔

اس سال جب ذوالعقدہ کے مہینے میں اعلان کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے لیے مکے تشریف لے جائیں گے تو یہ خبر سن کر عرب کے بے شمار لوگ حضورؐ کے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئے چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر جس قدر لوگوں نے فریضۂ حج ادا کیا، ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ حج کے جملہ مناسک و عبادات سے فارغ ہو کر آپؐ نے اس موقع پر میدانِ عرفات میں ایک موثر خطبہ ارشاد فرمایا جو تاریخی اہمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ گرانقدر ہے۔ ذیل میں اس خطبہ کے اہم نکات بیان کئے جاتے ہیں:۔

خطبہ حجۃ الوداع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد ثنائے ربّ العزت خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ ارشاد فرمایا: (ترجمہ)

لوگو! میں جو کہوں، سن لو، گو مجھے معلوم نہیں، لیکن ممکن ہے کہ اس حج کے بعد پھر میں تم سے یہاں نہ مل سکوں۔

جان مال اور عزّت کی حرمت

لوگو! جس طرح یہ دن، یہ مہینا اور یہ مقام محترم ہے اسی طرح جب تک تم زندہ ہو، تمہاری جانیں، تمہاری عزتیں اور تمہارے مال بھی باہم ایک دوسرے پر حرام ہیں۔

اعمال کی باز پرس

عنقریب تم اپنے پروردگار کے سامنے دربار میں حاضر ہو گے اور وہ تمہارے اعمال کی بابت تم سے باز پرس کرے گا۔

گمراہی و جاہلیت کا خاتمہ

خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو! جاہلیت کی ہر بات کو میں اپنے پاؤں تلے پامال کرتا ہوں۔

حق امانت

غرض میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا اور اس ذمے داری کی بنا پر کہتا ہوں کہ تم میں سے جس کسی کے پاس کسی کی امانت ہو اسے پہنچا دے۔

سود حرام

سارا سود متروک۔ جس قدر اصل سرمایہ ہے، وہ تمہارا حق ہے۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم ہو۔ اللہ جلِّ شانہٗ نے فرما دیا ہے کہ سودی کاروبار حرام ہے اور عباس بن عبدالمطلب کا سارا سود متروک ہے۔

خون کا انتقام موقوف

لوگو! زمانہ جاہلیت کے جتنے خون رہ گئے ہیں ان سب کا انتقام موقوف ہے اور سب سے پہلا خون جسے میں اپنی طرف

سے معاف کرتا ہوں، وہ عبدالمطلب کے پوتے ربیعہ بن حارث کا ہے۔ جس کی رضاعت بنی لیث میں ہوئی تھی اور وہیں بنی ہذیل نے اسے قتل کر ڈالا۔ اور اس طرح دورِ جاہلیت کے اور تمام خون چھوڑ دیئے جائیں

توحید باری تعالیٰ

لوگو! شیطان اس سے مایوس ہے کہ پھر کبھی وہ تمہاری اس سرزمین (عرب) میں پوجا جائے۔ یہاں کے سوا اور مقامات پر اس کی پرستش ممکن ہے (یعنی اب یہاں صرف خدائے واحد کی عبادت ہوگی)

حلال اور حرام مہینے

لوگو! اسی زمانہ کفر کی زیادتی ہے۔ جس سے کفار اور زیادہ گمراہ ہوگئے ہیں۔ کسی سال کے مہینے کو حلال کرتے اور کسی سال اسے حرام بناتے ہیں تاکہ وہ کام جو اس متبرک مہینے میں ان پر حرام ہو جائیں انہیں کبھی حرام رکھیں اور کبھی حلال کریں۔ زمین و آسمان کی پیدائش سے آج تک زمانہ اپنے معمولی حساب سے چلا جاتا ہے۔ خدا کے نزدیک مہینوں کا شمار بارہ ہے۔ جن میں سے فقط چار حرام ہیں۔ ان میں سے تین یعنی ذیلقعد، ذی الحجہ اور محرم جو متواتر ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اور ایک ان تینوں سے الگ ہے جو جمادی آلاخر اور شعبان کے درمیان آتا ہے۔

عورتوں کے حقوق

لوگو! تمہاری عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں اور اس طرح تم پر ان کے حقوق ہیں۔ ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے بچھونے میں کسی کو شریک نہ کریں اور فحش کام نہ کریں اور اگر ان سے ایسا کوئی قصور سرزد ہو جائے تو خدا نے تمہیں اجازت دی کہ انہیں بستروں میں چھوڑ دو اور ایسی مار مارو جو شدید نہ ہو اور جب ایسے گناہوں سے باز رہیں تو تم پر ان کا روٹی کپڑا فرض ہے۔

لوگو! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو۔ وہ ایک شریکِ زندگی کی حیثیت سے تمہارے ساتھ ہیں اور اپنی ذات سے تمہارے گھر کی چیز کی مالک نہیں۔ تم نے کلمات الٰہی کے ذریعے سے انہیں اپنے اوپر حلال کیا ہے اس لیے میری بات کو سمجھو اور گواہ رہو کہ میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔

غلاموں کے حقوق

غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ جو خود کھاؤ، وہی ان کو بھی کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو بھی پہناؤ۔ ان سے کوئی خطا ہو جائے تو درگزر کر دو یا ان کو الگ کر دو۔ وہ بھی خدا ہی کے بندے ہیں۔ ان پر سختی نہ کرو۔

مساوات

عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر گورے کو کالے پر، کالے کو گورے پر کوئی بڑائی نہیں۔ بڑائی کا معیار نیکی اور خوف خدا ہے۔ تم سب اولادِ آدمؑ

ہو اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

ہدایت کا ذریعہ
لوگو! میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک انہیں تھامے رہو گے، ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیزیں کتاب اللہ اور اس کے رسولؐ کی سُنت ہے۔

ختم نبوت
لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ کوئی جدید اُمت پیدا ہونے والی ہے۔

فرائض اسلام
خوب سن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نماز پنجگانہ ادا کرو۔ سال بھر ایک ماہِ رمضان کے روزے رکھو اپنے مالوں کی زکوٰۃ بڑی خوشی سے دیا کرو۔ خدا کے گھر کا حج بجا لاؤ۔ جس کی جزا یہ ہے کہ تم پروردگار کے فردوسِ بریں میں داخل ہو جاؤ گے۔

سینے کی پاکیزگی
لوگو! عمل میں خلوص، مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی اور جماعت میں اتحاد۔ یہ تین باتیں ایسی ہیں، جو سینے کو پاک رکھتی ہیں۔

باہمی حقوق
لوگو! جو کچھ میں کہتا ہوں۔ اسے سنو اور خوب سمجھ لو۔ یاد رکھو کہ ہر مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو دوسرے سے وہی چیز لینے کا حق ہے جو وہ خوشی سے اسے دے۔ کسی پر ظلم و جور ہرگز نہ کرو۔

وراثت کا بچہ
لوگو! خدا نے ہر حقدار کو اس کا حق پہنچا دیا۔ لہٰذا اب وارث کو بذریعہ وصیت اس کے حصے سے زیادہ دینا جائز نہیں یاد رکھو کہ بچہ اس کا ہے، جس کے بستر پر پیدا ہوا ہو۔ جو کوئی اپنے اصلی باپ کے سوا دوسرے کو اپنا باپ بناتے، اس پر خدا، ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔

تبلیغ کا فریضہ
جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو جو اس وقت موجود نہیں، ان احکام کی تبلیغ کرتے رہیں، ممکن ہے، بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں، جن پر تبلیغ کی جائے۔

تکمیل دین
خطبے کے آخر میں رسول اکرمؐ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:
"لوگو! قیامت کے روز خدا تم سے سوال کرے گا کہ میں نے اس کے احکام تم کو پہنچا دیئے تھے یا نہیں۔ تم اس کا جواب کیا دو گے؟"

سب لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا "اے خدا کے رسولؐ! ہم گواہی دیں گے کہ آپؐ نے خدا کے

احکام ہم تک پہنچا دیئے اور رسالت کا فریضہ ادا فرما دیا۔

"یہ سن کر آپؐ نے آسمان کی طرف اپنے ہاتھ اٹھائے اور تین بار فرمایا:"

"اے اللہ! تو گواہ رہ۔ اللہ! تو گواہ رہ۔ اے اللہ! تو گواہ رہ۔"

اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناؕ

ترجمہ: "آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین کے طور پر اسلام کو پسند فرمایا۔"

خطبہ حجۃ الوداع کی اہمیت

خطبہ حجۃ الوداع ایک ایسی عظیم الشان بین الاقوامی دستاویز ہے، جو نہ صرف اپنے دور میں آگے یا پیچھے کوئی مثال نہیں رکھتی، بلکہ آج بھی انسانیت کے پاس ایسا عظیم منشور حقوق موجود نہیں ہے جسے دینی تقدس کے ساتھ نافذ کرنے کے لیے ایک عالمی جماعت یا امت کام کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے اس کے بعض اجزا جدید دور میں دوسروں کی دستاویزات میں بھی ملتے ہیں، مثلاً اس ضمن میں اقوام متحدہ کا منشور کافی اہمیت رکھتا ہے، لیکن ان کاغذی پھولوں میں عمل کی خوشبو کبھی پیدا نہ ہو سکی، پھر خطبہ حجۃ الوداع کے اساسی عقائد کے علاوہ بعض اہم اجزا ایسے ہیں، جن کی قدر و قیمت سے ہماری آج کی روشن دماغ دنیا آشنا ہی نہیں۔

یہ خطبہ نہایت ہی خوبی سے اس حقیقت کو اجاگر کر دیتا ہے کہ اب تک کے دو تین ہزار سالہ دور تاریخ میں حضور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ پہلی مبارک شخصیت ہیں، جو ساری انسانیت کے لیے وسیع اور جامع پیغام لے کے آئے اور اس پیغام کو ایک تحریک کی شکل میں جاری کیا، اس پر مبنی ریاست قائم کی اور اسے دنیا کی تمام اقوام تک پہنچانے کے لیے شہداء علی الناس کی ایک جماعت قائم کی۔ ذیل میں اس عظیم خطبہ کی کچھ نمایاں حکمتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے:۔

۱۔ مساوات کا درس

قبل ازیں مخلوق الٰہی مختلف طبقات و مراتب کے امتیاز سے بٹی ہوئی تھی۔ غلام آقا کی ہمسری نہیں کر سکتے تھے، شرفاء ادنیٰ طبقوں سے بالاتر مخلوق سمجھے جاتے تھے، عامی، علماء کے ساتھ گفتگو کرنے کے مجاز نہ تھے۔ حضورؐ نے یہ ساری سرحدیں توڑ کر انسانیت کی ناہموار سطح کو برابر کر دیا اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ کو قرار دیا ہے

تیز ہ ، آقا فسادِ آدمیت ہے   حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں (اقبالؔ)

۲۔ وحدت و اخوت

اس خطبہ کے ذریعے یہ پیغام دیا گیا کہ انسانیت کا اتحاد وحدتِ رب اور وحدتِ اب یا وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدمؑ کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے اور یہ کہ اسلام ایک نظامِ اخوت ہے اور مسلمانوں کی بنائے اجتماع اور بنائے اخوت سوائے اسلام کے کچھ نہیں۔ ان کو حق نہیں کہ وہ وطن اور نسل اور قبیلے اور علاقے اور رنگ کی بنیاد پر جمع ہونے کے لیے ایک دوسرے کو پکاریں ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا   نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر   خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار   قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری (اقبالؔ)

۳۔ جذبہ انتقام کا خاتمہ

عرب میں اگر ایک شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تو قاتل و مقتول کے قبائل میں پشت در پشت انتقام کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا اور ایک ایک قتل کے بدلہ میں سینکڑوں برس تک خون کی ندیاں بہتی رہتی تھیں، آپؐ نے اس جاہلی حمیت اور جذبہ انتقام کو مٹا دیا اور اس کی ابتداء اپنے خاندان سے کی۔ اس کے مقابلہ میں صرف قصاص کا قانون جاری ہوا، جس میں انسانیت کے لیے حیات کا پیغام ہے۔

۴۔ سودی کاروبار کا خاتمہ

سارے عرب میں نہایت وسیع سودی کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ سرمایہ دار غرباء کا خون چوستے تھے اور ہر مقروض اپنے قرض خواہ کا غلام تھا، گویا خلقِ خدا اس سفاکانہ نظام میں جکڑی ہوئی تھی، حضورؐ نے اسے رہائی دلائی اور سب سے پہلے اپنے چچا حضرت عباس کا سود باطل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سود سرمایہ دارانہ نظام کی تمام تر خرابیوں کی جڑ ہے ؎

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے   سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات (اقبالؔ)

۵۔ جان، مال و عزت کی حرمت

عرب میں جان، مال اور عزت کی کوئی ضمانت اور حفاظت نہ تھی، جو جس کو چاہتا قتل کر دیتا تھا اور جس کا مال چاہتا تھا، چھین لیتا تھا، اسی طرح کسی کے ہاتھوں کسی کی عزت محفوظ نہ تھی۔ اس خطبہ کے ذریعے ان سب کی حرمت قائم کی گئی۔ حقیقت میں ایک صحت مند اور مثالی معاشرہ اسی صورت میں وجود میں آسکتا ہے جب ان تینوں کو تحفظ و حرمت حاصل ہو۔

۶۔ حقوق نسواں کا تحفظ

اسلام سے پہلے عورتوں کے حقوق بری طرح پامال ہوتے تھے۔ اس خطبہ کے ذریعے ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا گیا اور یہ تعلیم دی گئی کہ ان کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کیا جائے، مردوں کا یہ مقام نہیں کہ ان کو بھیڑ بکری سمجھیں بلکہ سارا معاملہ اللہ کے قوانین کے تحت ہونا چاہیئے اور انہیں ان کا جائز مقام ملنا چاہیئے۔

۷۔ غلاموں سے حُسنِ سلوک

عرب بلکہ پوری دنیا میں غلاموں سے نہایت ظالمانہ برتاؤ روا رکھا جاتا تھا اور وہ بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت ہوتے تھے، اس خطبہ میں یہ پیغام دیا گیا کہ ان کو وہی کچھ کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی کچھ پہناؤ جو خود پہنتے ہو اس کے ساتھ ہی انہیں آزاد کردینے کی ترغیب دی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ غلامی کا مکمل خاتمہ ہوگیا

۸۔ اسلام کے بنیادی ارکان کی ادائیگی اور اعمال کی جوابدہی

اس خطبہ میں اسلام کے بنیادی ارکان کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا جوابدہ گردانا گیا۔ یہ انفرادی ذمہ داری کا احساس انسان کو راہِ راست پر گامزن رکھتا ہے۔

۹۔ ہدایت ربانی کا ذریعہ

اس خطبے کے ذریعہ حضورؐ نے اپنی امت کو یہ تعلیم دی کہ قرآن و سُنت کی پیروی ہی ہدایت ربّانی کا اصل اور واحد ذریعہ ہے۔

۱۰۔ مظلوم، بیوہ اور یتیم کی دستگیری

اس خطبے میں مظلوموں، بیواؤں اور یتیموں کے حقوق کی نگہداشت کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ ان کی نگہداشت سے معاشرہ بہت سے گناہوں اور بے اعتدالیوں سے محفوظ رہتا ہے۔

۱۱۔ اطاعتِ امیر

اس خطبے میں یہ تعلیم دی گئی کہ اگر نکٹا حبشی بھی تم پر امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب اور سنتِ رسول کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت کرو۔

وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۱ھ

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ (الفجر: ۲۶)

ترجمہ: اے نفس مطمئن! تو اپنے رب کی طرف پلٹ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی۔

سوال، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال پر مفصل اور جامع نوٹ لکھیے۔

آغازِ علالت

جزیرۃ العرب سے کفر و شرک کے خاتمے، اسلام کی اشاعت شریعت و مکارم اخلاق کی تعلیم، حجۃ الوداع میں تکمیل دین کے آخری فرائض سے سبکدوشی اور الیوم اکملت لکم دینکم کی تصدیق و بشارت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد روحِ قدسی کو عالمِ جسمانی میں رہنے کی ضرورت باقی نہ رہ گئی تھی اس لیے حجۃ الوداع ہی میں آپ نے مسلمانوں کو الوداع کہا اور مدینہ منورہ واپس تشریف لانے کے بعد عالمِ آب و گل چھوڑنے اور رفیق اعلیٰ سے ملنے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے اور زیادہ وقت تسبیح و تہلیل میں بسر ہونے لگا۔

شہداء میں شہدائے اُحد نے بڑی بے کسی سے جان دی تھی۔ اس کا حضور کے دل پر گہرا اثر تھا۔ اس لیے مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد ان سے رخصت ہونے کے لیے ان کی قبروں پر تشریف لے گئے اور بعد میں ایک مختصر خطبہ فرمایا:

"میں تم سے پہلے حوض کوثر پر جا رہا ہوں۔ اس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک۔ مجھ کو تمام دنیا کے خزانوں کی چابی دی گئی ہے۔ مجھے اس کا خوف نہیں کہ تم میرے بعد شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ البتہ اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اس کے لیے آپس میں کشت و خون نہ کرو اور اس طرح ہلاک نہ ہو جاؤ، جس طرح تم سے پہلے کی قومیں ہلاک ہوئی ہیں۔"

حضرت زیدؓ بن حارثہ کو رومیوں نے شہید کر دیا تھا۔ آنحضرتؐ نے علالت سے ایک دن پہلے ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ کو حکم دیا کہ وہ لشکر لے کر جائیں اور اپنے باپ کے خون کا بدلہ لیں۔

۱۸ یا ۱۹ صفر ۱۱ھ کو آپ مسلمانوں کے گورِ غریباں جنت البقیع تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر مزاج مبارک ناساز ہو گیا۔ علالت کی حالت میں بھی حضورؐ ازراہِ عدل باری باری

سے ازواجِ مطہراتؓ کے گھروں پر بسر فرماتے تھے۔ جب مرض زیادہ بڑھا تو ان سے اجازت لے کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے یہاں مستقل قیام فرمایا۔

شدتِ مرض

جب تک آمد و رفت کی قدرت رہی حضورؐ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے تشریف لاتے رہے۔ سب سے آخری نماز جو آپؐ نے پڑھائی وہ مغرب کی نماز تھی۔ سرِ مبارک میں درد تھا، اس لیے سر میں رومال باندھ کر آپؐ تشریف لائے اور نماز ادا فرمائی۔ عشاء کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضورؐ کا انتظار ہے۔ لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا، پھر اٹھنا چاہا کہ غش آگیا۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے معذرت کی کہ "یا رسول اللہؐ! میرے والد نہایت رقیق القلب ہیں، آپؐ کی جگہ ان سے کھڑا نہ ہوا جائے گا۔" حضورؐ نے پھر یہی حکم دیا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔ چنانچہ تین دن تک حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی۔ ایک روایت کے مطابق سترہ نمازیں پڑھائیں۔ اس روز آپؐ نے چند نصیحتیں فرمائیں:

"کوئی مشرک عرب میں نہ رہنے پائے۔ سفراء کا اسی طرح احترام کیا جائے، جس طرح آپؐ کے زمانہ میں کیا جاتا ہے۔"

مسجد میں تشریف آوری

اسی دن ظہر کی نماز کے وقت حضورؐ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپؐ پر ڈالی جائیں۔ غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آہٹ پا کر وہ پیچھے ہٹے، آپؐ نے اشارہ سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ آپؐ کو دیکھ کر، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے۔

نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ آپؐ کی زندگی کا آخری خطبہ تھا۔

"خدا نے اپنے بندہ کو اختیار دیا ہے کہ خواہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس جو انعامات ہیں، ان کو لے۔ اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔ سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکرؓ کو بناتا لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے۔ مسجد کے رُخ کوئی دریچہ ابوبکرؓ کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔ ہاں، تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کو قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے۔ دیکھو، تم ایسا نہ کرنا، میں منع کر جاتا ہوں۔"

اس کے بعد انصار کے متعلق جو اسلام کے قوتِ بازو تھے، فرمایا:

"لوگو! میں انصار کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ عام مسلمان بڑھتے جائیں گے، لیکن انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے، جس طرح کھانے میں نمک۔ وہ اپنی طرف سے فرض ادا کر چکے۔ اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ وہ میرے جسم میں معدہ کی مانند ہیں۔ جو تمہارے نفع و نقصان کا متولی (یعنی خلیفہ) ہو، اس کو چاہیئے کہ ان میں سے جو نیکوکار ہیں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا سرزد ہو ان کو معاف کر دے۔"

چند دیگر نصائح

اس موقع پر حضورؐ نے چند دیگر نصیحتیں بھی فرمائیں:

"حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔"

"اے پیغمبرِ خدا کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبرِ خدا کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے یہاں کے لیے کچھ کر لو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔"

حجرہ مبارک میں واپسی

خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ مبارک میں واپس تشریف لائے۔ متفرق تعلیمات کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ آپؐ کو حضرت فاطمہ زہراؓ سے بے حد محبت تھی، علالت کے دوران ان کو بلا بھیجا۔ تشریف لائیں تو حضورؐ کی شدتِ مرض کو دیکھ کر بے قرار ہو گئیں، فرمایا: بیٹی! تمہارے باپ کو اس کے بعد کوئی تکلیف نہ ہو گی۔" اس کے بعد حضورؐ نے ان سے کچھ کان میں باتیں کیں۔ وہ رونے لگیں، پھر بلا کر کچھ کان میں کہا تو ہنس پڑیں۔ بعد میں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے دریافت کیا تو کہا پہلی دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا۔ جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تم ہی مجھ سے آ کر ملو گی۔ نیز یہ کہ تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو گی۔ تو میں ہنسنے لگی۔

اس موقع پر حضورؐ نے فرمایا:

"یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔"

اسی بے چینی کی حالت میں یاد آیا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں دریافت فرمایا کہ "عائشہؓ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ! ان کو خدا کی راہ میں خیرات کر دو۔"

آخری دیدار جمالِ اقدس

مرض میں شدت اور تخفیف ہوتی رہتی تھی جس دن وصال ہوا یعنی دوشنبہ کے روز، بظاہر طبیعت کو سکون تھا۔ حجرہ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ مسلمان نمازِ فجر میں مصروف تھے اور حضرت ابوبکرؓ امامت فرما رہے تھے کہ اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجرے کا پردہ ہٹایا اور صحابہ کرامؓ پر جو صفیں باندھے نماز میں مصروف تھے، نظر ڈالی، پھر تبسّم فرمایا۔ ادھر حضرت ابوبکرؓ اپنی ایڑ کے بل پیچھے ہٹے کہ صف میں جا ملے۔ انہوں نے سمجھا کہ حضور اکرمؐ نماز کیلئے تشریف لانا چاہتے ہیں۔ حضور اکرمؐ کے اس اچانک ظہور سے مسلمان اس قدر خوش ہوئے کہ چاہتے تھے کہ آپؐ کی مزاج پرسی کے لیے نماز توڑ دیں، لیکن حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ اپنی نماز پوری کرلو۔ حجرہ شریف میں داخل ہو کر پردے ڈال دیئے۔ یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہ کرامؓ نے جمالِ اقدس کی زیارت کی۔ اس کے بعد حضور اکرمؐ پر کسی دوسری جماعت کا وقت نہیں آیا۔

ادھر لمحہ بہ لمحہ تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔ آپؐ نے حسنؓ و حسینؓ کو بلا کر چوما اور ان کے بارے میں خیر کی وصیت فرمائی، پھر ازواجِ مطہرات کو بلایا اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو بھی وصیت فرمائی: نماز، نماز اور تمہارے زیر دست (یعنی لونڈی غلام)۔ آپؐ نے یہ الفاظ کئی بار دہرائے۔

روحِ پاک عالمِ قدس میں

۱۲۔ ربیع الاوّل بروز پیر، دن جیسے جیسے چڑھتا تھا، حضورؐ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا۔ اس حالت میں اکثر آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ ادا ہوتے رہتے۔

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

یعنی ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ نے انعام کیا

اور کبھی یہ فرماتے: اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى

یعنی اللہ تعالیٰ ہی بڑا رفیق ہے۔

وفات سے ذرا پہلے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن حاضر خدمت ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں مسواک تھی، حضورؐ نے مسواک کی طرف نظر جما کر دیکھا، حضرت عائشہ صدیقہؓ سمجھیں کہ آپؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھائی سے مسواک لے کر دانتوں سے نرم کی اور خدمتِ اقدس میں پیش کی۔ آپؐ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک فرمائی۔ آپؐ کے وصال کا وقت قریب آرہا تھا، سینہ میں سانس کی گھڑگھڑاہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے میں لبِ مبارک ہلے تو لوگوں

نے یہ الفاظ سُنے ، "نماز اور غلام"۔ پاس پانی کی لگن تھی ۔ اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرہ پر ملتے چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا دیتے تھے۔ اتنے میں ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ فرمایا اور تین دفعہ فرمایا: بل الرفيق الاعلىٰ یعنی "اب کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے"۔ یہی فرماتے فرماتے ہاتھ لٹک آئے، آنکھیں چھت سے لگ گئیں اور روحِ پاک عالم قدس میں پہنچ گئی ۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ صَلٰوةً كَثِيْرًا كَثِيْرًا

غم ہائے بے کراں

اس حادثہ اندوہناک و دل فگار کی خبر فوراً پھیل گئی اہلِ مدینہ پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ آفاق و اطراف تاریک ہو گئے حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے اس سے بہتر اور تابناک دن میں نے کبھی نہیں دیکھا، اور جس دن حضورؐ نے وفات پائی اس سے زیادہ قبیح اور تاریک دن بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ حضرت فاطمہ زہراؓ غم سے نڈھال ہو گئیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ شدتِ غم سے بے ہوش ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ پر بے ہوشی طاری ہو گئی ۔ وہ سکتے کی حالت میں تھے کئی صحابہ کرامؓ نے جنگل کی راہ لی اور حضرت عمر فاروقؓ کی یہ حالت ہوئی کہ وہ تلوار کھینچ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ جو یہ کہے گا کہ حضورؐ کا وصال ہو گیا، میں اس کی گردن اڑا دوں گا"۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی رہنمائی

اس نازک موقع پر صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت اور ذات ایسی تھی، جس نے اپنے ہوش و حواس بجا رکھے اور جو مسلمانوں کی تسلی اور رہنمائی کا ذریعہ بنی ۔ آپؓ سنح میں واقع اپنے مکان سے گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لائے اور حجرہ مبارک میں پہنچے۔ آپؓ نے رُخِ انور سے چادر ہٹائی اور اسے چوما اور روئے ۔ پھر فرمایا "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، اللہ آپؐ پر دو موت جمع نہیں کرے گا"۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسجد نبویؐ میں تشریف لائے اس وقت بھی حضرت عمر فاروقؓ جوش میں بات کر رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو روکا، لیکن وہ نہ رُکے۔ اب انہوں نے خود ہی لوگوں سے خطاب شروع کر دیا جس پر صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپؓ نے فرمایا:

"تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوجا کرتا تھا تو وہ جان لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر موت واقع ہو چکی ہے اور تم میں سے جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو یقیناً اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، کبھی نہیں مرے گا"۔

پھر آپؓ نے قرآن مجید کی یہ آیت مبارک پڑھی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران: ۱۴۴)

ترجمہ: محمدؐ نہیں ہیں مگر رسول ہی۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ (محمدؐ) فوت ہوجائیں تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو شخص الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور عنقریب اللہ شکر کرنے والوں کو جزا دے گا۔

صحابہ کرامؓ نے یہ آیت سُنی تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے اور انہیں اس بات کا یقین آگیا کہ حضورؐ واقعی رحلت فرما چکے ہیں۔

تجہیز و تدفین

منگل کے روز حضورؐ کو کپڑے اتارے بغیر غسل دیا گیا اور تین سفید یمنی چادروں میں کفنایا گیا اور میت مبارک اسی حجرے میں رکھ دی گئی غسل اور تکفین کے فرائض حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے انجام دیا۔ غسل و کفن کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپؐ کو دفن کہاں کیا جائے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: نبی جس مقام پر وفات پاتا ہے، وہیں دفن بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ آپؐ کو اسی حجرہ مبارک میں دفن کیا گیا۔ دس دس صحابہ کرامؓ نے حجرہ شریف میں داخل ہو کر نمازِ جنازہ پڑھی۔ کوئی امام نہ تھا۔ پہلے مردوں نے، پھر عورتوں نے اور پھر بچوں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ جسم مبارک کو حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ حضرت اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے قبر مبارک میں اتارا۔ وہیں اس وقت روضہ مبارک ہے۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

بس یاد رہا اتنا سینے سے لگی جالی
پھر یاد نہیں کیا کیا، انوار نظر آئے

سیرت و اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم : ۴)

ترجمہ : (اے نبیؐ) بے شک تم اخلاق حسنہ کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔

حَسُنَتْ جَمِيْعُ خِصَالِهٖ (سعدیؒ)

سوال : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ اور اخلاقِ حسنہ پر مفصل نوٹ لکھیئے :

جواب : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور اخلاق حسنہ :-

۱ قرآن کی گواہی

سیرت و اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا گواہ خود قرآن مجید ہے، جس سے بڑھ کر سچی بات اور حقیقی گواہی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم : ۴)

ترجمہ : (اے نبیؐ) بے شک تم اخلاقِ حسنہ کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔

قرآن مجید کلامِ الٰہی ہے جو خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ حضورؐ کی ذات اقدس اس کا عملی نمونہ اور نقشہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ " (الاحزاب : ۲۱)

ترجمہ : بے شک تمہارے لیے رسول اللہؐ کی زندگی ہی بہترین اور کامل نمونہ ہے۔

قرآن مجید حق و صداقت کا پیغام ہے اور آپؐ اس کے پیغامبر۔ قرآن رشد و ہدایت ہے اور آپؐ راشد و ہادی اس لیے قرآن مجید کی ہر آیت کسی نہ کسی طرح آپؐ کی ذات اقدس سے تعلق رکھتی ہے۔ گویا پورا قرآن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے۔ قرآن مجید میں جو اصول و تعلیمات محمدیہ پر پیش کی گئی ہیں حضورؐ نے اپنے اسوۂ حسنہ کی صورت میں ان کا بہترین نمونہ اپنی عملی زندگی میں پیش کر دیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی گواہی

ایک بار حضرت عائشہ صدیقہؓ سے چند صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں کچھ بتائیں؟ انہوں نے سوال کرنے والوں سے یہ سوال کر دیا: "کیا تم قرآن نہیں پڑھتے، جو خلق نبیؐ کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہو"، پھر فرمایا :

فَاِنَّ خُلُقَهٗ کَانَ الْقُرْاٰنَ ہ

ترجمہ: آپؐ کی پوری زندگی قرآن مجید کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔
قرآن نے جو کچھ کہا، حضور اکرمؐ نے اسی کو کر دکھایا۔ گویا آپؐ چلتا پھرتا عملی قرآن تھے۔ قرآن مجید کا پڑھنا آپؐ کی حیات طیبہ ہی کو سامنے لانا ہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی گواہی

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ آپؐ کی پہلی بیوی تھیں۔ انہوں نے زندگی کے پچیس سال آپؐ کے ساتھ گزارے اور ظاہر ہے، بیوی سے بڑھ کر انسان کا محرم راز اور کون ہو سکتا ہے؟ انہوں نے حضورؐ کے بارے میں فرمایا:
"میں دیکھتی ہوں کہ آپؐ اپنے عزیز و اقربا پر شفقت فرماتے ہیں، مہمان نواز ہیں، مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے والے ہیں، سچ بولتے ہیں۔ بیواؤں، یتیموں اور بے کسوں کی دستگیری فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی غمگین نہیں کرے گا۔" اخلاق کی بلندی کا یہ عالم اس وقت سے تعلق رکھتا ہے، جب آپؐ نے ابھی اعلان نبوت نہیں فرمایا تھا۔

اسلام کا شرف و امتیاز

اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اسے بہترین دور، اعلیٰ کتاب اور سیرت و کردار کے لحاظ سے بہترین پیغمبر میسر آیا۔ یعنی اس کو وہ دور ملا، جب ذہنی طور سے انسان بالغ ہو کر اس لائق ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے آخری اور مکمل دین کو سمجھ سکے اور اس کے اپنے لیے مشعل راہ قرار دے سکے۔ کتاب وہ دی گئی جس کی روشنی اور ہدایت کے چراغ رہتی دنیا تک روشن رہیں گے اور سب سے بڑھ چڑھ کر یہ کہ اسے ایسا عظیم الشان پیغمبر ملا، جس کی زندگی عمل کا بہترین اور مثالی نمونہ ہے۔ ؎

رُخِ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ کسی کی بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

ذیل میں حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ اور اخلاقِ حسنہ کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:۔

صداقت

صداقت و سچائی حضورؐ کی سیرت طیبہ کا درخشاں پہلو ہے۔ حضورؐ ہمیشہ سچ بولتے تھے۔ آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لوگوں کو اس بات کا اعتراف آپؐ کی نبوت سے پہلے بھی تھا اور بعد میں تو یہ بات اور نکھر کر سامنے آگئی تھی۔ آپؐ کی زندگی میں کوہِ صفا کا واقعہ مشہور ہے جب آپؐ نے اس پہاڑی پر چڑھ کر لوگوں کو اپنی طرف بلایا اور ان سے پوچھا کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ تو سب نے بیک زبان ہو کر کہا تھا "بلاشبہ آپؐ سچے ہیں

کیونکہ آپؐ نے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔" ایک موقع پر آپؐ کے سخت ترین دشمن اور مخالف ابوجہل نے کہا تھا "محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، لیکن کیا کروں، تمہاری باتوں پر میرا دل نہیں ٹھہرتا" ہرقل قیصر روم نے جب ابوسفیان کو اپنے دربار میں بلا کر آپؐ کے بارے میں پوچھا کہ کیا انہوں نے کبھی جھوٹ بولا ہے؟ لیکن ابوسفیان نے باوجود دشمنی کے برملا کہا کہ انہوں نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" لوگ حضورؐ کو جوانی ہی میں صادق کے نام سے پکارتے تھے۔

امانت

امانت و دیانت بھی آپؐ کی سیرت کا ایک خاص جوہر تھا۔ آپؐ ابتدائے عمر سے سارے ملکِ عرب میں اپنی امانت کی وجہ سے مشہور تھے۔ لوگ آپؐ کو "امین" کہہ کر پکارتے تھے اور آپؐ پر اس قدر اعتماد کرتے تھے کہ وہ اپنی ہزار دشمنی کے باوجود اپنی امانتیں حضورؐ کے پاس رکھتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ آپؐ کے صدق و دیانت اور امانت سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اپنا سارا مال و جائیداد اور اپنی پوری زندگی آپؐ کی خدمت کے لیے مؤقف کر دی۔ ہجرت کے موقع پر آپؐ کو لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کی اتنی فکر ہے۔ حضرت علیؓ کو خاص طور پر اس کام کے لیے پیچھے چھوڑ کر جاتے ہیں، حالانکہ دشمن آپؐ کے قتل کے درپے تھا۔

عدل و انصاف

حضورؐ عدل و انصاف کے سلسلے میں امیر و غریب اور اپنے اور بیگانے میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ آپؐ کی طبیعت میں عدل اس حد تک موجود تھا کہ آپؐ کے دشمن بھی آپؐ کے فیصلوں پر اعتماد کرتے تھے۔ آپؐ ہمیشہ مظلوموں کی فریاد سنتے اور ان سے انصاف کا برتاؤ کرتے تھے۔ اگر آپؐ کا کوئی عزیز بھی کسی کا حق چھین لیتا تو آپؐ مظلوم کا حق ضرور دلاتے تھے۔ جب تک آپؐ مکے میں تشریف فرما رہے اہلِ مکہ اپنے معاملات فیصلے کے لیے آپؐ کے پاس لے کر آتے تھے اور جب مدینہ میں تشریف لائے تو یہودی اور دوسرے مخالفین بھی اپنے مقدمات کا فیصلہ آپؐ سے کراتے اور اسے بخوشی تسلیم کر لیتے تھے۔

مساوات

آپؐ کے مزاج میں مساوات و برابری کا جذبہ بھی بہت زیادہ تھا۔ ایک مرتبہ قبیلۂ قریش کی ایک عورت سے چوری ہو گئی۔ قریش اپنی عزت کے خیال سے چاہتے تھے کہ یہ بات دب جائے اور اس عورت کو سزا نہ ہو۔ جب حضورؐ کے پاس سفارش آئی تو حضورؐ نے ناراض ہو کر فرمایا:

"بنو اسرائیل مٹ گئے، اس لیے کہ وہ امیروں کو چھوڑ دیتے تھے اور غریبوں کو سزا دیتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو اس کا بھی ہاتھ کٹوا دیتا۔"

ایک دفعہ ... آپؐ کے پاس آئے

آپؐ نے دونوں کے دلائل سن کر یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ ایک دفعہ بنو ثعلبہ کے کچھ لوگ مدینے میں آئے۔ ان کو دیکھ کر ایک انصاری نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ! ان لوگوں کے ایک فرد نے ہمارے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ آپؐ اس کے بدلے میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "یہ نہیں ہو سکتا اور باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا۔"

شفقت و رحم

حضورؐ نہایت رحم دل اور شفیق تھے۔ قرآن نے آپؐ کو رحمت للعالمین کا خطاب دیا ہے۔ آپؐ نے اپنے ذاتی معاملے میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ طائف کے سفر میں آپؐ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس پر صبر کرنا بلکہ اپنے دشمن کے حق میں نیک دعائیں مانگنا کسی عام دل گردے کے آدمی کا کام نہیں۔ اگر آپؐ ان لوگوں کے حق میں بد دعا فرما دیتے تو یقیناً ان کی نسل صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی۔ لیکن آپؐ نے فرمایا:

"اے خدا! ان کو ہدایت دے، یہ جانتے نہیں ہیں۔" آپؐ کا ارشاد ہے: "جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔"

قریش نے آپؐ پر مصائب کے پہاڑ توڑے تھے۔ لیکن اس کے باوجود فتح مکہ کے دن آپؐ نے بڑے بڑے دشمنوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔" حضورؐ جانوروں کیلئے بھی سراپا رحمت تھے۔

سخاوت

حضورؐ اس قدر سخی و فیاض تھے کہ آپؐ کبھی کسی سائل کو محروم نہیں کرتے تھے ابن عباسؓ کے قول کے مطابق "آپؐ سب سے زیادہ سخی تھے۔ خصوصاً رمضان کے مہینے میں آپؐ کی سخاوت بہت بڑھ جاتی تھی۔" ایک بار ایک شخص کو اپنی بکریوں کا پورا گلہ بخش دیا۔ کئی آدمیوں کو سو سو اونٹ سے زیادہ دے دیئے اور نبوت کے بعد تو اپنے گھر میں ذرا مال رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے جو کچھ آتا تھا، شام تک ختم کر دیتے تھے۔ ایک بار نوے ہزار درہم آئے، جو چٹائی پر ڈال دیئے گئے۔ جو سائل آتا اسے عطا فرما دیتے یہاں تک کہ سب ختم ہو گئے۔

حلم و بردباری

حضورؐ کی طبیعت میں حلم اور بردباری کا مادہ بھی بہت زیادہ تھا ایک مرتبہ ایک بدو آیا۔ اس نے آپؐ کی چادر کو اتنے زور سے کھینچا کہ آپؐ کی گردن پر نشان پڑ گیا پھر بدو بولا "محمدؐ! مجھے مال چاہیئے۔ تمہارے پاس جو مال ہے یہ نہ تمہارا اور نہ تمہارے باپ کا ہے بلکہ اللہ کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: بے شک اللہ کا ہے۔ پھر فرمایا: اسے ایک اونٹ پر جو اور ایک پر کھجوریں لاد دو۔"

قرآن میں ایک جگہ آپؐ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: "اگر آپؐ سخت دل اور ترش مزاج ہوتے

تو لوگ آپؐ کے پاس سے دور بھاگ جاتے۔"

عفو و درگزر

آپؐ عفو و درگزر کے پیکر تھے۔ آپؐ کی زندگی میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپؐ نے اپنے سخت سے سخت دشمنوں سے بھی درگزر کا سلوک فرمایا۔ ایک بار آپؐ ایک درخت کے نیچے سو گئے اور اپنی تلوار اس کی ایک شاخ سے لٹکا دی۔ ایک کافر آیا اور تلوار نکال کر آپؐ سے کہنے لگا "بتاؤ تم کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے"، آپؐ نے فرمایا "اللہ" یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی آپؐ نے تلوار اٹھا کر فرمایا "اب کہو تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا" وہ حیران اور خوفزدہ ہو گیا آپؐ نے فرمایا "جاؤ میں کسی سے بدلہ نہیں لیا کرتا۔"

شرم و حیا

آپؐ مجسم شرم و حیا تھے۔ حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کی حیا کا یہ عالم تھا کہ کسی شخص سے کوئی ایسی بات نہیں فرماتے تھے جو اس کو پسند نہ ہو اسی طرح جب کوئی بات آپؐ کے مزاج کے خلاف ہوتی تو آپؐ کے چہرے سے ظاہر ہو جاتا تھا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب کسی شخص کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ بات معلوم ہوتی تو اس کا نام لے کر کچھ نہیں کہتے تھے بلکہ یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی کسی کی طرف تیز نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے آنکھیں ہمیشہ نیچی رکھتے تھے اور ایک روایت کے مطابق "حضورؐ کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔" آپؐ کا ارشاد ہے: ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں اور حیا ان میں سے ایک ہے۔

شجاعت

آپؐ اپنے بچپن ہی سے نہایت دلیر اور بہادر تھے۔ آپؐ شجاعت کا پیکر تھے۔ قیامِ مدینہ کے زمانے میں ایک رات لوگوں نے شور و غل کی آوازیں سنیں تو ڈر گئے اور گھبرا کر صورت حال معلوم کرنے کے لیے باہر نکل آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حضورؐ تلوار لٹکائے گھوڑے پر سوار واپس آ رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ایک قافلہ ہے جو شہر سے باہر اترا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم سخت گھمسان کی جنگ کے موقع پر حضورؐ کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ غزوات کے موقعوں پر آپؐ نے بے نظیر بہادری کے ثبوت دیئے۔ بدر، احد، خندق وغیرہ میں آپؐ نے جس بہادری اور استقلال کا اظہار کیا وہ بے مثال تھا۔ جنگ حنین میں جب تقریباً سب لوگ اچانک حملے سے منتشر ہو گئے، آپؐ اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح کھڑے رہے یہاں تک کہ آپؐ کے ساتھی پھر واپس آ گئے۔

رواداری و حسن سلوک

حضورؐ نہایت روادار اور ملنسار تھے۔ آپؐ صرف اپنوں کا نہیں بلکہ غیروں کا بھی بہت لحاظ کرتے تھے۔ اگر

کوئی دشمن بھی پاس آتا تو اس کی ضرورت پوری کر دیتے تھے۔ مکے کی ایک عورت ہمیشہ چلتے وقت آپؐ کے سرِ مبارک پر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ ڈال دیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہو گئی تو حضورؐ اس کی خبر لینے گئے اور اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ مسلمان ہو گئی۔ اہلِ مکہ کے لیے نجد سے غلہ آیا کرتا تھا۔ ایک صحابی حضرت ثمامہؓ نے ان کی دشمنی اور مخالفت کی سزا دینے کے لیے غلہ بند کر دیا۔ آپؐ کو خبر ملی تو آپؐ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا، حالانکہ قریش آپؐ کے جانی دشمن تھے۔

سادگی

آپؐ کی زندگی بہت سادہ تھی۔ آپؐ کھانے پینے میں سادہ خوراک کو پسند فرماتے تھے۔ لباس ہمیشہ سیدھا سادہ ہوتا۔ لیکن صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جہاں جگہ مل جاتی، بیٹھ جاتے۔ اور اس سلسلے میں زمین، چٹائی یا فرش کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ اپنے گھر کے اکثر کام خود کر لیتے مویشیوں کو چارا بھی خود ڈال دیتے تھے اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ لیتے۔ بکری کا دودھ دھو لیتے خود بازار سے سودا خرید لاتے۔ چھوٹے بڑے کو خود سلام کرتے۔ بچوں سے نہایت مہربانی اور شفقت کا سلوک فرماتے۔ ہر امیر اور غریب کی دعوت قبول کر لیتے کپڑے کو خود پیوند لگا لیتے یہاں تک کہ اگر اپنا جوتا پھٹ جاتا تو اسے بھی خود گانٹھ لیتے تھے۔ خانہ کعبہ، مسجد نبویؐ کی تعمیر اور جنگِ خندق کے موقعوں پر خود معماروں اور مزدوروں کے ساتھ ہر قسم کا کام کرتے تھے۔ الغرض حضورؐ کی زندگی اس قدر سادہ تھی کہ ناواقف لوگ آپؐ کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ آپؐ کے فقر و غنا کا یہ عالم تھا کہ برابر ایک ایک مہینہ چولہا روشن نہ ہوتا اور صرف پانی اور کھجور پر گزارہ ہوتا۔ آپؐ تین دن تک متواتر گندم کی روٹی کبھی نہیں کھائی۔

ایفائے عہد

ایفائے عہد اور وعدے کی پابندی میں آپؐ اپنی مثال آپ تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص آپؐ کو بازار میں ملا۔ اس نے کہا کہ آپؐ ذرا یہاں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔" وہ شخص چلا گیا اور بھول گیا حضورؐ اس کے انتظار میں حسبِ وعدہ تین روز تک وہاں ٹھہرے رہے۔ تیسرے روز وہ شخص اتفاقاً وہاں سے گزرا تو حیران و شرمندہ ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا: "میں تمہارا انتظار کر رہا تھا، تم کہاں چلے گئے تھے؟" صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک صحابی ابوجندلؓ پابہ زنجیر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ کفار کی قید میں تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے رہائی کی درخواست کی لیکن حضورؐ چونکہ کفار سے معاہدہ فرما چکے تھے اس لیے انہیں واپس کر دیا گیا۔

زہد و عبادت

حضورؐ کثرت سے اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتے اور ساری ساری رات اس کے حضور میں قیام فرماتے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں مبارک میں ورم آجاتا۔ صحابہ کرامؓ معترض کرتے۔ حضورؐ! آپؐ اس قدر عبادت کیوں کرتے ہیں؟ آپؐ تو معصوم ہیں

حضورؐ فرماتے "کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں" ایک روایت کے مطابق حضورؐ دن رات میں ایک سو مرتبہ استغفار فرمایا کرتے تھے۔

ذہانت و تدبّر

آپؐ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ذہین، مدبر اور باصلاحیت تھے۔ آپؐ کی عقل مندی اور دانش مندی کے دوست دشمن سبھی معترف تھے۔ جب حضورؐ کی عمر ۳۵ سال تھی۔ حجر اسود کو اس کی اصلی جگہ نصب کرنے کے بارے میں جو اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اس میں آپؐ نے جس دور اندیشی سے قبائل مکہ کو باہمی قتل و غارت سے بچایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مدینہ جاتے ہی یہودیوں کے ساتھ میثاق مدینہ پر دستخط کر کے آپؐ نے اعلیٰ درجے کی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ جو مسلمانوں کے لیے کامرانی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کی ایک اور مثال ہے۔

فصاحت و بلاغت

آپؐ فصاحت و بلاغت میں بے مثل تھے۔ آپؐ کا اپنا ارشاد ہے: "میں فصیح ترین عرب ہوں"۔ آپؐ تمام قبائل عرب کی زبانیں جانتے تھے اور ہر قبیلہ کے لوگوں سے انہی کی زبان میں خطاب فرماتے۔ جو فقرہ زبان سے نکلتا جامع اور پُرمغز ہوتا تھا۔ آپؐ کی فصاحت و بلاغت کے سامنے عرب کے قدیم خطیبوں کے کارنامے فراموش ہو گئے۔ آپؐ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے کہ لوگ آپؐ کے الفاظ کو گن سکتے تھے۔

خوش مزاجی و مزاح

حضورؐ خوش مزاجی اور مزاح بھی فرمالیا کرتے تھے۔ ایک بڑھیا نے ایک مرتبہ حضورؐ سے جنت کی دعا کے لیے عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا: "جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جائے گی"۔ وہ بڑھیا رونے لگی۔ حضورؐ نے اسے سمجھایا کہ جنت میں جانے سے پہلے سب کو جوان کر دیا جائے گا۔ وہ خوش ہو گئی۔ اسی طرح کسی سائل نے آپؐ سے ایک اونٹ کا سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: "ہم تمہیں اونٹنی کا بچہ دیں گے۔ سائل نے عرض کی حضورؐ! میں اسے لے کر کیا کروں گا؟ حضورؐ نے فرمایا: "ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے"۔

الغرض انسانی خوبیوں میں سے کوئی ایسی خوبی نہ تھی جو حضورؐ کی ذات میں بدرجہ کمال نہ پائی جاتی ہو۔

حضورؐ کی جامعیت

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اخلاق و سیرت کے اعتبار سے وہ منور آفتاب تھی جس میں ہر خوبی کی جھلک اور ہر حسن کا رنگ تھا اس رنگا رنگی کا نام جامعیت ہے، جامعیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تمام کمالات اور خوبیاں جو کسی انسان میں ہو سکتی ہیں۔ آپؐ کی ذات میں جمع تھیں۔ آپؐ جامع اوصاف

اور تمام اخلاق حسنہ کا بہترین نمونہ تھے۔ آپؐ قدرت کا عظیم شاہکار تھے۔ نہ کوئی پہلے آپؐ جیسا ہوا ہے اور نہ بعد میں آپؐ جیسا ہو گا۔

حضورؐ تمام انبیاء کے اوصاف کے جامع

وہ تمام خوبیاں جو پہلے نبیوں میں الگ الگ پائی جاتی تھیں وہ سب بدرجۂ کمال حضورؐ کی ذات میں موجود تھیں ۔

حُسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ، ید بیضا داری ۔۔۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپؐ حضرت عیسیٰؑ کی طرح نرم خو بھی تھے، حضرت موسیٰؑ کی طرح پرجوش بھی تھے۔ حضرت یحییٰؑ کا سا اندازِ تبلیغ بھی تھا اور حضرت ایوبؑ سا صبر بھی۔ آپؐ نے بستیوں اور بیابانوں میں اللہ کا پیغام پہنچایا۔ مخالفین کی سختیاں سہیں۔ ہر حال میں اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طرح وطن چھوڑا، اور ہجرت کی۔ دشمنی اور عداوت کی آگ میں ڈالے گئے پھر بھی دنیا کو ٹھنڈک اور سلامتی کا پیغام دیا۔ حضرت یونسؑ کی طرح غارِ ثور کے شکم میں تین دن رہے، حضرت سلیمان کی طرح اس دنیا میں حکومت کی طرح ڈالی اور مدینے میں خدا کا گھر بنایا جو ہمیشہ اہلِ ایمان کا محبوب مرکز رہے گا۔

نوٹ:۔ اسوۂ حسنہ کے تحت حضورؐ کے جو اوصاف بیان ہوتے ہیں وہ اس موضوع کے تحت بھی آسکتے ہیں۔

حضورؐ کی سیرت آفتاب کی طرح روشن

حضور سرورِ کائنات کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والا کسی جگہ تاریکی کا نشان نہیں پاتا۔ ہر چیز واضح اور چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح واضح ہے۔ آپؐ کا شخصی کردار، رحمت، رأفت شفقت، خشیت، عبادت، شجاعت، عدالت، صداقت، سخاوت، فراست، متانت ایثار احساسِ ذمہ داری، عاجزی اور تواضع، صبر، توکل، ثبات، دانشمندی وغیرہ سب کی کیفیت اور ان کے عملی نمونے مل جاتے ہیں اور بہت سے مل جاتے ہیں اسی طرح آپ کی گھریلو زندگی میں اچھے شوہر، اچھے باپ اور اچھے نانا وغیرہ کے بہترین نمونے ہمیں ملتے ہیں۔ جماعتی زندگی میں اچھے دوست، اچھے ساتھی شفیق سردار اور مساکین کے سرپرست و مددگار کا بہترین نمونہ ہمیں آپؐ کی ذات میں ملتا ہے اسی طرح قومی و ملی زندگی میں عدل و انصاف فوجوں کی کمانداری، انتظاماتِ حکومت، رعایا پروری، سیاسی سمجھ بوجھ، دوستوں کی دلداری، دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک وغیرہ ایسا مکمل اور اتنا جامع نقشہ ہمیں سیرت طیبہ میں دکھائی دیتا ہے کہ ویسا اور کہیں نہیں دکھائی دیتا اور کمال یہ ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے یہ سارے نمونے صرف ایک ہی مقدس و مکمل انسان میں مل جاتے ہیں۔

اکملیت

اکملیت، جامعیت کی وہ صورت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو پہلے انبیاء نے اپنے اپنے دور میں جس منزل تک پہنچایا تھا۔ آپؐ نے اس کو تکمیل کے اس درجے تک پہنچایا جس کے آگے اور کوئی منزل نہیں یعنی نبوت توحید اور آخرت کے بارے میں ایسی مکمل تعلیمات بیان فرمائیں اور زندگی کے نقشے کو اس ڈھنگ سے واضح کیا اور نکھارا کہ آپؐ کے بعد کسی نئے دین اور نئے نبی کی ضرورت باقی ہی نہ رہی۔

اللہ رب العزت نے حضورؐ کے ذریعے دین اسلام ہی کی تکمیل نہیں فرمائی بلکہ نبوت اور رہنمائی کے سلسلہ کو آپؐ پر ختم کر کے سیرت انسان کی بھی تکمیل فرمادی اور اس طرح تکمیل فرمادی کہ اس سے زیادہ مکمل اور اتنے اچھے نمونے کردار کا تصور بھی ممکن نہیں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

ترجمہ، آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند فرمایا۔

اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رحمت للعالمین

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۱۰۷)

ترجمہ: ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی وہ بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مس خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

مولانا الطاف حسین حالی

سوال: رسول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ پر بحیثیت رحمت للعلمین روشنی ڈالئے؟

جواب: **حضورؐ کی رحمۃ للعالمینیؐ** حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر آئی تھی۔

جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

یعنی اے نبیؐ! ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اس خزانۂ رحمت میں دوست و دشمن، کافر و مسلم، بوڑھے، بچے، عورت، مرد، آقا و غلام

انسان وحیوان ہر ایک مستفیض ہوتا برابر کی حصہ دار تھی۔ ایک شخص نے حضورؐ سے کسی پر بد دعا کرنے کی درخواست کی تو غضبناک ہو کر فرمایا:

"میں دنیا میں لعنت کے لئے نہیں آیا ہوں، رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

حضورؐ نے دنیا کو پیغام دیا:

۱۔ ایک دوسرے پر بغض وحسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو۔

۲۔ اے خدا کے بندو! سب آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

۳۔ لوگوں کے لئے وہی چاہو، جو اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلم ہوگے۔

۴۔ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب لوگوں کے لئے وہی محبوب نہ رکھے جو اپنے لئے رکھتا ہے، جب تک وہ دوسرے کو بے غرض صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے۔

۳۔ رحمت کی وسعت

ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی، خدایا! مجھ کو اور محمدؐ کو مغفرت عطا کر"۔ حضورؐ نے فرمایا۔"خدا کی رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک اعرابی مسجد نبویؐ میں آیا اور حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور بولا: "خداوندا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر"۔ حضورؐ نے صحابہؓ کی طرف خطاب کر کے فرمایا: "بتاؤ یہ زیادہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اونٹ"۔ یعنی حضورؐ نے اس قسم کی دعا کرنا ناپسند فرمایا۔

۴۔ سب کے لئے رحمت

حضورؐ سے پہلے دنیا شرک وجہالت، فتنہ وفساد قتل وغارت گری اور اسی طرح کی بے شمار خرابیوں میں گھری ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دنیا کو خالص توحید کا پیغام دیا اور اس طرح انسانیت کو اس کا صحیح اور اصل شرف بخشا گیا۔ انسانیت ظلم واستبداد کی چکی میں پس رہی تھی۔ حضورؐ نے اسے امن وسلامتی کا پیغام دیا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں کو تحفظ فراہم کیا۔ دنیا بندہ وآقا کی تفریق میں بری طرح گرفتار تھی۔ حضورؐ نے انسانیت کو مساوات اور برابری کا درس دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مردوں، عورتوں غریبوں، مزدوروں، غرضیکہ ہر ایک طبقے کو اس کے حقوق دلائے۔ زبردستوں نے زیردستوں اور شہ زوروں سے کمزوروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہدایت فرمائی۔ حضورؐ نے اپاہجوں لنگڑے لولوں اور حیوانات سے بھی نیک سلوک کی تلقین فرمائی۔ الغرض دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بھلائی کا حضورؐ نے درس نہ دیا ہو۔

حضورؐ کی صفتِ رحمت کی حقیقت صحابہؓ سے اس طرح بیان کی گئی ہے ۔
"تم لوگ پروانوں کی طرح آگ کے گڑھے کی طرف لپکتے ہو اور میں تم کو کمر سے پکڑ پکڑ کر بچانے کی کوشش کر رہا ہوں ۔"

۵. اُمت پر شفقت و رحمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اُمت کے لئے نہایت شفیق و مہربان تھے۔ حضورؐ کا وجود پاک امت کے حق میں سراپا شفقت و رحمت تھا حضورؐ اپنی امت کی مغفرت و بخشش کے لئے بے حد فکر مند رہتے تھے اور اکثر رو رو کر اللہ تعالےٰ سے امت کی بخشش چاہتے تھے۔ وصال کے وقت بھی حضورؐ کی زبان پر "امتی امتی" کے الفاظ تھے ۔ قرآن مجید میں حضورؐ کی اس صفتِ رحمت کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے ۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے :

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (التوبہ : ۱۲۸)

ترجمہ: (لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری تکلیف اُن کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنیوالے اور مہربان ہیں ۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص (آلعمران : ۱۵۹)

ترجمہ: (اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے ۔"

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (آلعمران : ۱۶۴)

ترجمہ: درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان

خود انہی میں سے ایک پیغمبر اٹھایا، جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب و دانائی کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

۶۔ امت کیلئے آسانی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کے لئے آسائش و سہولت اور آسانی کا بہت خیال رکھتے تھے اور امت پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالنا چاہتے تھے، جو لوگوں پر گراں گزرے اور وہ اسے ناقابل برداشت تصور کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقروض حضرات کا قرضہ اپنے پاس سے ادا فرما دیتے۔ بحالتِ مجبوری نماز و خطبہ مختصر فرما دیتے۔ بچوں کے رونے کی آواز سن کر نماز مختصر فرما دیتے۔ ایک مرتبہ حضورؐ کو بتایا گیا کہ فلاں صاحب نماز میں بہت لمبی سورتیں پڑھتے ہیں، جس سے لوگوں کو تکلیف محسوس ہوتی ہے تو حضورؐ نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ نمازیوں میں بیمار بھی ہوتے ہیں اور کئی طرح سے مجبور رہتے ہیں۔ اس لئے نماز مختصر ہونی چاہیے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ ایسی دقت کے پیش نظر اپنے پسندیدہ عمل کو بھی اس لئے ترک فرما دیتے کہ کہیں وہ عمل امت پر فرض کی حیثیت سے عائد نہ ہو جائے مثلاً نماز تراویح صرف تین دن مسجد میں ادا فرمائی۔ تاکہ یہ امت پر فرض نہ ہو جائے۔ اسی طرح امت کو عبادات و معاملات میں دشواری سے بچانے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمر بھر فکر کی۔ مثلاً مسواک کے بارے میں فرمایا کہ اگر امت کو دشواری نہ ہوتی تو میں انہیں ہر نماز کے لئے مسواک کرنے کا حکم دیتا۔ عورتوں کے لئے فرمایا کہ اگر وہ نفلی روزے رکھنا چاہیں تو اپنے خاوندوں سے اجازت لے لیں۔ معراج النبیؐ کے موقع پر پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں، لیکن حضرت موسیٰؑ کی سفارش پر اور اپنی امت کی سہولت کے پیش نظر حضورؐ نے اللہ تعالےٰ سے بار بار التجا و فرمائش کر کے پانچ نمازیں مقرر کیں۔ لیکن ثواب بدستور پچاس نمازوں کا رہا۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل امت کے تھوڑے نیک عمل پر بدرجہا کئی گنا اجر و ثواب کا اہتمام کیا۔ مثلاً شبِ قدر کی ایک رات ہزار مہینے سے بہتر ہے، وغیرہ۔

۷۔ شفاعت امت

قیامت کے روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کی شفاعت فرمائیں گے۔ قیامت کا دن بہت سخت اور تکلیف دہ ہوگا۔ لوگ پریشان حال پھر رہے ہوں گے۔ وہ پہلے حضرت آدمؑ اور پھر باری

باری دیگر جلیل القدر نبیوں کے پاس جائیں گے کہ خدا کے سامنے ہماری سفارش کریں لیکن کوئی پیغمبر خدا کے سامنے پیش ہونے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ ہر پیغمبر نفسی نفسی پکار رہا ہو گا۔ آخر لوگ تھک ہار کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں گے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کا ساتھ دیں گے اور خدا کے سامنے پیش ہو کر شفاعت فرمائیں گے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ہر نبی کو ایک دعا کا اختیار دیا۔ اور انہوں نے دعا کے معاملے میں جلدی کی۔ مجھے بھی اللہ نے ایک دعا کا اختیار دیا ہے میں نے وہ دعا اپنی امت کے لئے مخصوص کر رکھی ہے۔

(ب) کافروں پر رحمت

۱۔ عذاب سے محفوظ گذشتہ امتیں اپنی نافرمانی اور گناہوں کے سبب مختلف عذابوں میں مبتلا ہوئیں۔ کسی قوم کی صورت مسخ کر دی گئی کسی کی بستی کو الٹ دیا گیا۔ کسی پر پتھروں کی بارش کی گئی اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم تو اپنی مسلسل نافرمانیوں کے نتیجہ میں پانی کے عظیم طوفان کی نذر ہو گئی اور صفحہ ہستی سے مٹ گئی لیکن حضور انور ؐ کے وجود کی برکت سے کفارِ مکہ باوجود اپنی سرکشی و نافرمانی کے، دنیا میں عذاب عظیم سے محفوظ رہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (الانفال:۳۳)

ترجمہ:۔ اور اللہ ہرگز ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک کہ آپؐ ان میں موجود ہیں۔

۲۔ بددعا کی بجائے دعا دشمنوں کے حق میں بددعا کرنا انسان کی فطری عادت ہے۔ لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں وہ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور جو ان کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ وہ ان کو پیار کرتے ہیں۔ ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کفار جو مظالم ڈھاتے تھے، انہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں خبابؓ بن ارت ایک صحابی نے عرض کی کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! دشمنوں کے حق میں بددعا فرمایئے"۔ یہ سن کر چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ ایک دفعہ چند افراد نے مل کر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا: "میں دنیا کے لئے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔

وہ قریش جنہوں نے تین برس تک آپؐ کو شعبِ ابی طالب میں محصور رکھا اور

میں مکہ میں اس قدر قحط پڑ گیا کہ لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے۔ ابو سفیان نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ محمدؐ! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو۔ آپؐ نے بلا عذر فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور خدا نے اس مصیبت سے ان کو نجات دی۔

جنگ احد میں دشمنوں نے حضورؐ پر پتھر پھینکے، تیر برسائے، تلواریں چلائیں، دندانِ مبارک کو شہید کیا، جبینِ اقدس کو خون آلود کیا۔ لیکن حضورؐ نے ان کے حق میں یہ دعا کی:

اَللّٰھُمَّ اِھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ: اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، کیونکہ وہ نہیں جانتے۔

طائف میں کفار نے آپؐ پر پتھر برسا کر لہولہان کر دیا۔ فرشتہ حاضر ہوا اور اجازت طلب کی ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے۔ لیکن آپؐ نے ان کی ہدایت کے لئے دعا کی۔ بعد میں یہی لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

دوس کا قبیلہ یمن میں تھا۔ طفیلؓ بن عمرو دوسی اسی قبیلہ کے رئیس تھے اسلام لانے کے بعد وہ مدت تک اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن وہ اپنے کفر پر اڑا رہا۔ ناچار وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور قبیلے کی حالت عرض کر کے گزارش کی کہ ان کے حق میں بددعا فرمایئے۔ لوگوں نے یہ سنا تو کہا کہ اب دوس کی بربادی میں کوئی شک نہیں رہا۔ لیکن رحمت عالمؐ نے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا وَّ ائْتِ بِھِمْ ○

ترجمہ: خدایا! قبیلہ دوس کو ہدایت دے اور ان کو اسلام میں لا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ماں مشرکہ تھی۔ وہ اپنی ماں کو جس قدر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے وہ انکار کرتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے اسلام کی دعوت دی تو اس کی ماں نے حضور اکرمؐ کی شان میں گستاخی کی۔ حضرت ابوہریرہؓ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ رونے لگے اور اسی حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے دعا فرمائی:

الٰہی ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت نصیب کر۔

وہ خوش خوش گھر واپس آئے اور دیکھا کہ کواڑ بند ہیں اور ماں نہا رہی ہیں۔ غسل سے فارغ ہو کر کواڑ کھولے اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئیں۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اسلام کا بدترین دشمن تھا جب وہ فوت ہوا تو حضورؐ

نے اس کے حق میں بھی دعائے مغفرت کی اور اپنی قمیص مبارک عنایت فرمائی اسے تو منافقت اور سرکشی کے باعث اس کا فائدہ نہ ہوا۔ البتہ اس کے قبیلے کے سینکڑوں افراد مسلمان ہو گئے۔

(ج) عورتوں پر شفقت

اسلام سے پہلے معاشرے میں عورتوں کی کوئی عزت اور قدر و منزلت نہ تھی۔ وہ ظلم و ستم کا شکار تھیں۔ ان سے جانوروں سے بدتر سلوک ہوتا تھا۔ ایک مرد جتنی عورتوں سے چاہتا شادی کر لیتا۔ عرب کے لوگ تنگ دعار یا بھوک اور افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل اور لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ یہ انتہائی ظلم و بربریت کا مظاہرہ تھا۔

حضرت عمر فاروق رضؓ فرماتے تھے کہ مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ناقابل توجہ سمجھتے تھے مدینہ میں نسبتاً عورتوں کی قدر تھی، لیکن اس قدر جس کی وہ مستحق تھیں۔ حضور اکرم صؐ نے جس طرح اپنے ارشاد و احکام سے ان کے حقوق قائم کئے، آپؐ کے برتاؤ نے اور زیادہ اس کو قوی اور نمایاں کر دیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم خداوندی کے تحت عورت کو عزت و احترام کا وہ مقام بخشا جس کی مثال کسی مذہب و ملت میں نہیں ملتی۔ حضور اکرم صؐ نے عورت کے حقوق و فرائض کا تعین فرمایا اور اسے ماں، بیٹی اور بیوی تینوں حیثیتوں سے عزت عطا کی۔

ماں کا حق ارشادِ ربّانی ہے:

اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ ہ

یعنی: جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

؎ کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔ (میر انیس)

؎ زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہے (مرزا دبیر)

ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: "تمھاری ماں"۔ چوتھی بار فرمایا "تمھارا باپ"۔

بیٹی کا حق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹی کو رحمتِ خداوندی قرار دیا ہے۔ فرمایا:

"جس شخص نے دو لڑکیوں کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو وہ قیامت

ہیں میرے ساتھ اس طرح ہو گا جس طرح انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی ہے۔"

بیوی کے حق

ارشادِ نبویؐ ہے : "تم میں سے بہترین لوگ وہی ہیں جو بیویوں سے بہتر سلوک کریں اور میں اپنی بیویوں سے بہترین سلوک کرتا ہوں۔"

حضورؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی عورتوں سے نیک برتاؤ کی تلقین فرمائی۔

دیگر حقوق

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کے بارے میں عورت کی رضامندی کو ضروری قرار دیا۔ ایک عورت کی شادی اس کے والدین نے اس کی مرضی کے خلاف کر دی۔ اس نے حضورؐ سے شکایت کی تو آپؐ نے اس شادی کو منسوخ فرما دیا۔ اسی طرح عورت کو خلع کا حق دیا گیا۔ یعنی اگر شوہر ظلم کرے تو عورت اس سے قانوناً علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔ نیز عورت کو اپنے باپ کی وراثت میں حصہ دار ٹھہرایا گیا۔

عورتوں کے لئے رحمتِ عام

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں چونکہ ہر وقت مردوں کا ہجوم رہتا تھا عورتوں کو وعظ و نصیحت سننے اور مسائل دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ عورتوں نے آکر درخواست کی کہ ہمارے لئے ایک دن خاص مقرر کر دیا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ان کے دربار کا ایک خاص دن مقرر ہو گیا۔

ایک مرتبہ حضور اکرمؐ کی رضاعی بہن حلیمہ سعدیہ کی بیٹی حضورؐ سے ملنے آئیں۔ آپؐ نے ان کا اتنا احترام کیا کہ ان کے لئے اپنی چادر بچھا دی۔ اور جب وہ واپس جانے لگیں تو ان کو بہت سے تحفے دیئے۔

حضرت فاطمۃ الزہرہؓ سے حضورؐ کو اتنی محبت تھی کہ انہیں اپنے جگر کا ٹکڑا فرماتے جب وہ آپؐ سے ملنے آتیں تو ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے اور ان کی بلائیں لیتے حضورؐ اکثر اپنی بیٹیوں کے گھر جایا کرتے تھے۔

ایک بار قرابت کی بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوئی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ آئے تو سب اٹھ کر چل دیں۔ حضورؐ ہنس پڑے۔ حضرت عمرؓ نے کہا : خدا آپؐ کو ہنستا ہوا رکھے، کیوں ہنسے؟ فرمایا : ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ وہ تمہاری آواز سنتے ہی سب آڑ میں چھپ گئیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا اے اپنی جان کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

نہیں ڈرتیں۔ سب نے کہا تم رسول اللہ ؐ کی نسبت سخت مزاج ہو۔"

ایک دفعہ آپؐ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں منہ ڈھانک کر سوئے ہوئے تھے۔ عید کا دن تھا۔ لڑکیاں گا بجا رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آئے تو ان کو ڈانٹا۔ حضورؐ نے فرمایا: "ان کو گانے دو۔ ان کی عید کا دن ہے۔"

عورتیں نہایت دلیری کے ساتھ آپؐ سے بے تکلف مسائل دریافت کرتی تھیں اور صحابہ کرامؓ کو اس جرأت پر حیرت ہوتی تھی۔ لیکن حضورؐ کسی قسم کی ناگواری ظاہر نہیں فرماتے تھے چونکہ عورتیں بالعموم نازک طبع اور کمزور دل ہوتی ہیں، ان کی خاطر داری کا نہایت خیال رکھتے تھے۔ انجشہ نامی ایک حبشی غلام حدی خواں تھے، یعنی اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ سفر میں ازواج مطہرات ساتھ تھیں۔ انجشہ حدی پڑھتے جاتے تھے۔ اونٹ زیادہ تیز چلنے لگے تو آپؐ نے فرمایا، انجشہ! دیکھنا شیشے (عورتیں) ٹوٹنے نہ پائیں۔

د۔ یتیموں کا والی

ا۔ یتیموں کی سرپرستی

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایہ محبت سے محروم ہے معاشرے کے ہر فرد کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، باشعور و بالغ ہوتے پر اس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس کر دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے۔ یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے ہمراہ لایا۔ عرب میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے باعث یتیموں کی کثرت تھی۔ مگر جیسا کہ چاہیئے ان کی پرورش کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے، اور نہ تنگ دل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحمت و شفقت کا جذبہ تھا۔ قرآن مجید میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ (الماعون: ۱، ۲)

ترجمہ: کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

۲۔ قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں یتیم کی حق رسی، سرپرستی اور اس سے

حسن سلوک پر بہت زور دیا گیا ہے جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہے:

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى ۝ ...... فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ (الضحیٰ)

ترجمہ: (اے نبیؐ!) کیا اللہ نے تم کو یتیم نہ پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا۔ لہذا یتیم پر سختی نہ کرو۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (النساء: ۱۲۷)

ترجمہ: اور یہ کہ یتیموں کے لئے انصاف پر قائم رہو۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ج (الانعام: ۱۵۲)

ترجمہ: اور یہ کہ مال یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائیں۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا (الدھر: ۸)

ترجمہ: اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم کو کھانا کھلاتے ہیں۔

۳۔ حدیث کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں بھی یتیم کی حق رسی اس کی سرپرستی اور دیکھ بھال پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ان احادیث سے ظاہر ہے:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یتیموں کی نگہداشت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر فرمایا:

اَنَا وَكَافِلُ الْیَتِیْمِ فِی الْجَنَّةِ هٰكَذَا (بخاری و مسلم)

ترجمہ: میں اور یتیم کی نگہداشت کرنے والا جنت میں یوں ساتھ ساتھ ہوں گے۔

۲۔ مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے، جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہو اور سب سے بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔

۴۔ یتیموں کے لئے سراپا رحمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی وہی دل جو بے کس و ناتواں یتیموں کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھا وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے۔ ہر صحابیؓ کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لئے

ئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش اور سرپرستی کے لئے ایک دوسرے سے سبقت کرنے لگا۔ بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمۃ الزہراؓ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو جاتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے خاندان اور انصار وغیرہ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل و جان سے پالتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لئے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔

ایک مرتبہ عید کے موقع پر حضور اکرمؐ نے دیکھا کہ مختلف بچوں نے اچھے اچھے نئے اور عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھے اور وہ عید کی خوشیاں منا رہے تھے۔ جبکہ ایک بچہ الگ تھلگ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس رو رہا تھا۔ حضورؐ نے اس بچے سے پوچھا کہ تم نے نئے کپڑے کیوں نہیں پہنے اور عید کی خوشی کیوں نہیں منا رہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں یتیم ہوں اس لئے اس حالت میں ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر آبدیدہ ہو گئے اور اس یتیم بچے کو گھر لے گئے اور حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ یہ ہمارا بیٹا ہے اسے نہلا دھلا کر اچھے سے کپڑے پہناؤ۔ چنانچہ اب وہ بچہ دوسرے بچوں میں ہنسی خوشی کھیلنے لگا۔ جب بچے اس سے اس کے والدین کا پوچھتے تو وہ کہتا کہ محمد رسول اللہؐ میرے باپ اور عائشہ صدیقہؓ میری ماں ہیں۔

ابوجہل حضورؐ کا بدترین دشمن تھا۔ اس نے ظلم سے ایک یتیم کا مال دبا رکھا تھا۔ حضورؐ خود اس کے گھر تشریف لے گئے اور اس یتیم کا مال واپس دلایا۔

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا حضور اکرمؐ سے پہلے یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان میں جواب نفی میں ملے گا۔

ضعیفوں، بے کسوں، آفت نصیبوں کو مبارک ہو
یتیموں کو، غلاموں کو، غریبوں کو مبارک ہو (حفیظ جالندھری)

(۲) غلاموں کا مولیٰ

۱۔ غلاموں پر ظلم کا خاتمہ

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی حالت بہت ابتر رہی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے اور ان سے کان کنی، کاشتکاری، محنت و مشقت اور بیگار کے سخت کام لئے ہیں۔ ہندوؤں میں اچھوت قومیں اس کی یادگار ہیں۔ مصر میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی۔ رومیوں میں غیر رومی غلاموں سے بدترین سلوک ہوتا تھا اور آقاؤں سے بھاگنے والے غلاموں کو بھوکے درندوں

کے آگے ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ غلام بھیڑ بکریوں کی طرح سمجھے جاتے تھے۔
عربوں میں بھی غلاموں کے ساتھ یہی برتاؤ تھا بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے باعث ہر وہ شخص جو کسی قبیلے سے وابستہ نہ تھا، وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختہ مشق تھا کیونکہ اس کو اپنی حفاظت کے لئے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ آغازِ اسلام میں ظالم قریش نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ظلم و ستم ڈھائے وہ یہی غلام تھے۔
اسلام زبردستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا۔ اسی لئے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا، چنانچہ زیدؓ بن حارثہ خبابؓ بن الارت، بلال حبشیؓ، یاسر یمینیؓ، عمارؓ، صہیب رومیؓ، ابوفکیہؓ، عامرؓ بن فہیرہ اور سالمہؓ غلاموں میں اور لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ اور سمیہؓ لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں۔

۲۔ غلامی سے رہائی

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جز بنا لیا تھا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، صحابہ کرامؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ حضرت حکیمؓ بن حزام نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے، "سو" غلام آزاد کئے، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں "چالیس" غلام آزاد کئے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے "تیس" ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ اس تعلیم کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ غلامی کا خاتمہ ہو گیا اور غلاموں کو آزاد انسانوں کا درجہ حاصل ہوا۔

قرآن کی روشنی میں

شرک کی ممانعت کے بعد اللہ تعالیٰ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ ان بندوں میں جو لوگ سرفہرست ہیں، ان میں غلام بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ (البلد، ۱۲، ۱۳)

ترجمہ: اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی (مشکل کام) کیا ہے؟ گردن سے غلامی کی رسی کو کھولنا (یعنی غلام کو آزاد کرانا)

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا .... وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۝ (النساء: ۳۶)

ترجمہ: اور والدین سے حسن سلوک کرو .... اور ان سے جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں (یعنی غلام و کنیز)

۴۔ **حدیث کی روشنی میں** احادیث مبارکہ میں بھی غلاموں سے حسن سلوک پر بہت زور دیا گیا ہے اور ان کی آزادی کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ ان احادیث سے ظاہر ہے:۔

۱۔ یہ جن کو تم غلام کہتے ہو، یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، جن کو اللہ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے پس تم ان کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ ان کو اتنا کام نہ دو، جو ان پر بھاری ہو جائے اور بھاری کام دو تو اس کام میں خود بھی شریک ہو کر ان کی مدد کرو۔

۲۔ کوئی شخص اپنے غلام یا لونڈی کو میرا عبد (میرا غلام) نہ کہے بلکہ میرا جوان، میرا بچہ اور میری بچی کہے۔

۵۔ **اسوۂ رسولؐ** حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں اور زیردستوں پر خصوصی رحمت وشفقت فرمایا کرتے تھے۔ چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ حضرت زیدؓ بن حارث غلام تھے۔ حضورؐ نے ان کو آزاد کر دیا۔ ان کے والد اور چچا انہیں لینے آئے اور وہ ہر قیمت ادا کرنے پر تیار تھے۔ حضورؐ نے جانے نہ جانے کا معاملہ زیدؓ پر ہی چھوڑ دیا۔ انہوں نے جانے سے انکار کر دیا اور حضورؐ کی سرپرستی وخدمت کو ترجیح دی حضورؐ نے انہیں منہ بولا بیٹا بنالیا۔ اور اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کی ان سے شادی کر دی تاکہ خاندانِ نبوت سے قرابت داری ہو جائے۔ بعد میں میاں بیوی میں نباہ نہ ہوسکا جس پر حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی اور پھر ان کا نکاح رسول اکرمؐ سے ہوا۔

۲۔ اسامہؓ حضرت زیدؓ کے بیٹے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسامہ بیٹی ہوتی تو میں اس کو زیور پہناتا۔ آپؐ خود اپنے دست مبارک سے ان کی ناک صاف کیا کرتے تھے۔ حضور اکرمؐ نے اپنے وصال سے قبل جنگ موتہ کے لئے جو لشکر تیار کیا تھا، اس کا سالار حضرت اسامہؓ کو بنایا۔

۳۔ حضرت انسؓ دس برس خدمتِ نبویؐ میں رہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس مدت میں مجھ پر ہمیشہ حضورؐ کی شفقت رہی اور کبھی آپؐ نے اتنا بھی نہ فرمایا کہ فلاں کام یوں ہے یوں کیوں کیا؟

۴۔ ایک دفعہ ابو مسعود انصاریؓ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی: ابو مسعود! تم

کو جس قدر اختیار اس غلام پر ہے۔ اللہ کو اس سے زیادہ اختیار تم پہ ہے۔ ابو مسعودؓ نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے۔ عرض کی: یا رسول اللہؐ! میں نے اللہ کی رضا کے لئے اس غلام کو آزاد کیا۔ فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تم کو چھو لیتی۔

۵۔ ایک شخص خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا، عرض کی: یا رسول اللہؐ! میں غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ خاموش رہے۔ اس نے پھر عرض کی۔ آپؐ نے پھر خاموشی اختیار کی۔ اس نے تیسری بار عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا: ہر روز ستر بار معاف کیا کرو۔

۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو غلاموں پر شفقت اتنی ملحوظ تھی کہ مرض الموت میں سب سے آخری یہ وصیت فرمائی کہ غلاموں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرا کرنا۔

(س) بچوں پر شفقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راستے میں جو بچے ملتے، ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھالیتے۔ راستہ میں بچے ملتے تو ان کو خود سلام کرتے۔

ایک دن حضرت خالدؓ بن سعید حاضر خدمت ہوئے۔ ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی اور سُرخ رنگ کا کرتہ بدن پر تھا۔ آپؐ نے فرمایا: سنہ سنہ۔ حبشی زبان میں حسنہ کو سنہ کہتے ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش حبش میں ہوئی تھی اس لئے آپ نے اس کی مناسبت سے حبشی تلفظ میں حسنہ کی بجائے سنہ کہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پشت پر جو مہر نبوت تھی، ابھری ہوئی تھی۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ غیر معمولی چیز نظر آئے تو اس سے کھیلنے لگتے ہیں۔ وہ بھی مہر نبوت سے کھیلنے لگیں۔ خالدؓ نے ڈانٹا تو حضورؐ نے روکا کہ کھیلنے دو۔

ایک دفعہ آپؐ کے پاس کہیں سے کپڑے آئے، جن میں ایک سیاہ چادر بھی تھی۔ یہ ایک خوبصورت چادر تھی اور اس پر بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے وہ چادر ایک چھوٹی بچی امّ خالد کو عنایت فرمائی اور فرمایا: امّ خالد! دیکھنا، اسے پہننا اور پرانی کرنا۔

ایک صحابیؓ کا بیان ہے کہ میں بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا۔ لوگ مجھ کو خدمتِ اقدس میں لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا: ڈھیلے کیوں مارتے ہو؟ میں نے کہا: کھجوریں کھانے کے لئے۔ ارشاد فرمایا کہ جو کھجوریں زمین پر ٹپکی ہیں، ان کو اٹھا کر کھالیا کرو۔ ڈھیلے نہ مارو۔ یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

آپؐ ماں بچے کی محبت و ممتا کے واقعات سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس آئی۔ دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہی اٹھا کر دے دی۔ عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں میں برابر تقسیم دیئے۔ حضور اکرمؐ باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا۔ ارشاد فرمایا: اللہ جس کو اولاد کی محبت میں ڈالے اور وہ ان کا حق بجالائے تو وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ فرماتے تھے کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا کہ اچانک صف سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی ہے اور نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی۔

یہ شفقت و محبت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی، بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی یہی لطف و کرم ہوتا تھا۔ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آکر مارے گئے۔ حضورؐ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے۔ کسی نے کہا: یا رسول اللہؐ! وہ مشرکین کے بچے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان اللہ ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔

معمول تھا کہ جب موسم کا کوئی نیا میوہ خدمت اقدس میں پیش ہوتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا، اس کو عنایت فرماتے۔ آپؐ بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے۔ ایک بدوی آیا۔ اس نے کہا: تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو۔ میرے دس بچے ہیں، مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اگر تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں؟ جو رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔

جابرؓ بن سمرہ صحابی تھے وہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے رسولِ اکرمؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ اپنے گھر کی طرف چلے، میں بھی ساتھ ہو لیا کہ ادھر سے چند اور لڑکے نکل آئے۔ آپؐ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔

ہجرت کے موقع پر جب مدینہ میں حضورؐ کا داخلہ ہو رہا تھا۔ انصار کی چھوٹی بچیاں خوشی سے دروازوں سے نکل نکل کر گیت گا رہی تھیں۔ جب آپؐ کا ادھر سے گزر ہوا تو فرمایا: اے لڑکیو! تم مجھے پیار کرتی ہو؟ سب نے کہا: ہاں، یا رسول اللہؐ۔ فرمایا: "میں بھی تمہیں پیار کرتا ہوں۔"

حضرت عائشہ صدیقہؓ کمسنی میں بیاہ کر آئی تھیں۔ وہ محلے کی لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ آپؐ جب گھر میں تشریف لاتے تو لڑکیاں آپؐ کا لحاظ کر کے ادھر ادھر چھپ جاتیں آپؐ انہیں تسکین دیتے اور کھیلنے کو کہتے۔

(س) حیوانات پر رحم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف بنی نوع انسان ہی کے لئے سراپا رحمت نہ تھے، بلکہ حضورؐ کی رحمۃ للعالمینی کا دائرہ حیوانات تک وسیع تھا۔ دنیا نے "انسداد بے رحمی حیوانات" کی ذمہ داری کو اب سمجھا ہے اور اس کے لئے قوانین بنائے ہیں۔ لیکن خدا کے آخری محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج سے چودہ سو برس قبل دنیا کو یہ زریں تعلیم دی تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے۔ ان بے زبانوں پر جو ظلم عرصہ سے عرب میں چلے آتے تھے۔ موقوف کرا دیئے۔ اونٹ کے گلے میں قلاوہ لٹکانے کا عام دستور اس کو روک دیا۔ زندہ جانور کے بدن سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیتے تھے۔ اور اسے پکا کر کھاتے تھے۔ اس کو منع کر دیا۔ جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ دم ان کا مورچھل ہے اور ایال ان کا لحاف ہے۔ جانوروں کو دیر تک ساز میں باندھ کر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشست گاہ اور کرسی نہ بناؤ۔ اسی طرح جانوروں کو آپس میں لڑانا بھی ناجائز بتایا۔ ایک بے رحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر اس کا نشانہ بناتے تھے۔ اور تیر اندازی کی مشق کرتے تھے۔ اس سنگ دلی کی بھی قطعاً ممانعت کر دی۔

ایک دفعہ ایک گدھا راہ میں نظر پڑا جس کا چہرہ داغا گیا تھا۔ فرمایا کہ جس نے اس کا چہرہ داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے۔ علامت یا بعض دیگر ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا۔ ایسی حالت میں آپؐ ان اعضاء کو داغتے جو زیادہ نازک نہیں ہوتے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکریوں کے ریوڑ میں گیا تو دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بکریوں کے کان داغ رہے تھے۔

ایک بار حضورؐ کسی سفر میں جا رہے تھے۔ لوگوں نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ وہاں ایک پرندہ نے انڈہ دیا ہوا تھا۔ ایک شخص نے وہ انڈہ اٹھا لیا۔ چڑیا بے قرار ہو کر پر مار رہی تھی۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ اس کا انڈہ چھین کر کس نے اس کو اذیت پہنچائی؟ انہوں نے کہا: "یا رسول اللہؐ! مجھ سے یہ حرکت ہوئی ہے۔" آپؐ نے فرمایا! اسے وہیں رکھ دو۔

ایک صحابیؓ حاضر خدمت ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں چادر سے چھپے کسی پرندہ کے بچے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: عرض کیا کہ ایک جھاڑی سے آواز آرہی تھی، جاکر دیکھا تو یہ بچے تھے۔ میں نے ان کو نکال لیا۔ پرندے نے یعنی ان کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی۔ آپؐ نے فرمایا: جاؤ اور بچوں کو پھر وہیں رکھ آؤ۔

ایک دفعہ حضورؐ نے ایک اونٹ دیکھا جو بلبلا رہا تھا۔ آپؐ نے اس کے مالک سے کہا کہ تمہارا اونٹ تمہاری شکایت کر رہا ہے۔ اسے پورا چارا دو اور اس سے اس کی طاقت کے مطابق کام لو۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضورؐ کے پاس ایک برتن میں اتنا پانی تھا کہ اس سے صرف وضو کرسکتے تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ حضورؐ وضو کرنا چاہتے تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بلی للچائی ہوئی نظروں سے پانی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ آپؐ نے محسوس کیا کہ بلی پیاسی ہے چنانچہ پانی اس کی طرف بڑھادیا۔ پیاسی بلی پانی پر ٹوٹ پڑی اور اپنی پیاس بجھائی۔ اور حضورؐ نے تیمم کرکے نماز ادا فرمائی۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا: جب تم کوئی جانور ذبح کرو تو اچھے طریقے سے اسے ذبح کرو۔ یعنی چھری تیز کرلیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔

ایک حدیث کے مطابق ایک بے درد اور بے رحم عورت اس لئے دوزخ میں گرائی گئی کہ اس نے بلی کو باندھ کر بھوکا مار ڈالا۔ نہ تو اسے خود کچھ کھانے کو دیا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑوں سے اپنی غذا حاصل کرلیتی۔ اسی طرح ایک عورت کو اس لئے بخش دیا گیا کہ اس نے قریب المرگ پیاسے کتے کو پانی پلایا۔

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی ؛ پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی ؛ ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

(مولانا حالی)

ـــــــــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطور سماجی مصلح اور معمارِ ملتِ نو

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ (التوبہ: ۳۳)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کر دے۔

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحیثیت سماجی مصلح اور معمارِ ملت نو جو عظیم خدمات سرانجام دیں، ان کی وضاحت کیجیے۔

جواب:

ا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصلح کی حیثیت سے

سماجی مصلح (سوشل ریفارمر) دورِ جدید کی ایک معروف اصطلاح ہے۔ بالعموم یہ اصطلاح ایک ایسے رہنما کے لیے استعمال ہوتی ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے قابلِ ستائش اور انقلابی خدمات سرانجام دے۔ یوں تو دنیا میں مختلف قسم کے کئی سماجی مصلح نظر آتے ہیں جنہوں نے کچھ نہ کچھ انسانیت کی خدمت کی، لیکن ان سب کا دائرہ کار محدود اور وقتی ہے اس کے برعکس اگر بنظر غائر اور حقیقت الامری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرات انبیائے کرام ؑ ہی اس منصبِ جلیلہ کے اہل و مستحق ہیں۔ کیونکہ یہ نفوسِ قدسیہ براہِ راست اپنے خالق حقیقی سے ہدایت و رہنمائی حاصل کر کے مخلوق کی رہنمائی و خدمت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا اور دینِ اسلام کی تکمیل ہو گئی اور آپؐ کی نبوت و رسالت قیام تک کے لیے تمام زمانوں کے انسانوں کے لیے ہدایت و رہنمائی کا مکمل ذریعہ ہے۔ اس لیے حضورؐ ہی کی ذات اقدس حقیقی معنوں میں عظیم ترین سماجی مصلح قرار پاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کی ہر لحاظ سے اصلاح فرمائی۔ آپؐ نے اخلاق بھی درست فرمائے اور عقائد بھی، تہذیب و تمدن بھی اور معاشرت، معیشت و سیاست بھی، الغرض حضورؐ نے ایک فرد کی نجی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح فرمائی۔ عربوں کی زندگی میں جہاں جہاں بھی کوئی بگاڑ اور گمراہی تھی، آپؐ نے سب سے پہلے اس کی اصلاح فرمائی۔ حضورؐ کی

اصلاحات کی بنیادیں انسانی، آفاقی اور عالمگیر ہیں جو اصول وضوابط اور حدود و قوانین حضورؐ نے بتائے ہیں ان میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، وہ تمام آنے والی نسلوں کی مکمل رہنمائی کرنے والے ہیں۔ دنیا میں پیش آنے والے ہر بگاڑ کی اصلاح کا راز انہی ضوابط میں مضمر ہے۔ بشرطیکہ پوری نیک نیتی اور خلوص دل کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصلی کارنامہ

سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ اصلی کارنامہ کیا ہے جس کی بناء پر ہم انہیں تاریخ انسانی کا سب سے بڑا آدمی قرار دیتے ہیں؛ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے انسان خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت سے آشنا تھا، مگر اس بات سے پوری طرح واقف نہ تھا کہ اس فلسفیانہ حقیقت کا انسانی اخلاق سے کیا تعلق ہے؛ بلاشبہ انسان کو اخلاق کے عمدہ اصولوں سے آگاہی حاصل تھی مگر اسے واضح طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں میں ان اخلاقی اصولوں کی عملی ترجمانی کس طرح ہونی چاہیئے؟

خدا پر ایمان، اصولِ اخلاق اور عملی زندگی .... یہ تین الگ الگ چیزیں تھیں، جن کے درمیان کوئی منطقی رابطہ، کوئی گہرا تعلق اور کوئی نتیجہ خیز رشتہ موجود نہ تھا۔

یہ صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جنہوں نے ان تینوں کو ملا کر ایک نظام میں سمو دیا اور ان کے امتزاج سے ایک مکمل تہذیب و تمدن کا نقشہ محض خیال کی دنیا میں نہیں بلکہ عمل کی دنیا میں بھی قائم کر کے رکھ دیا۔ (سیرتِ سرورِ عالمؐ مولانا مودودیؒ)

بقول علامہ اقبالؒ:۔

"اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا، لیکن بحیثیت سوسائٹی یا ملت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔"

۱۔ مذہبی اصلاحات

سماجی اصلاح خالص تصورِ توحید کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکانہ عقائد کی اصلاح فرمائی۔ انسانیت کی اس سے بڑی توہین اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے جیسی یا اپنے سے کم تر ہستیوں کے سامنے سجدہ ریز ہو اور خود ساختہ معبودانِ باطل کی چوکھٹوں پر جبہ سائی کرے انسان پتھروں، درختوں، فرشتوں، چاند، سورج، ستاروں، جانوروں غرضیکہ ہر چیز کی خدائی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالے ہوئے تھا، حضورِ اکرمؐ نے توحید کا ایسا پاکیزہ اور صاف و شفاف تصور پیش فرمایا جس نے عربوں کی مذہبی زندگی کی کایا پلٹ دی، انہیں شرک کے گورکھ دھندے سے نکال کر توحید

خالص کا ایسا نشہ دیا کہ تلواروں کی دھار پر بھی احد، احد کے سوا کوئی کلمہ ان کی زبان پر نہ تھا۔ یوں توحید خالص کی بدولت ان کی انفرادی اجتماعی زندگی میں انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ بقول علامہ اقبال ؒ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

۲۔ اخلاقی اصلاحات

عقیدہ کی اصلاح کے بعد حضورؐ کا دوسرا عظیم کارنامہ اصلاح یہ ہے کہ آپؐ نے انسانوں کو ایک نیا تصورِ اخلاق دیا۔ دراصل اخلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے آپؐ نے بہترین انسان اسے قرار دیا جس کے اخلاق بہتر ہوں۔ نیز فرمایا کہ میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ آپؐ نے مسلمان کی تعریف یہ بتائی کہ وہ امانت میں خیانت نہ کرے، گفتگو میں جھوٹ نہ بولے، ایفائے عہد کی پابندی کرے اور کسی کو دھوکا نہ دے۔ غریبوں کو ستانا، کمزوروں پر ظلم کرنا، جھوٹی گواہی دینا، ناحق تہمت لگانا، غیبت و بہتان تراشی تکبر کرنا، ریاکاری سے کام لینا اور اس طرح کی تمام خرابیوں کو حضورؐ نے گناہ کبیرہ قرار دیا۔

حضورؐ نے شراب نوشی اور قمار بازی کو حرام قرار دیا۔ شراب کو ام الخبائث یعنی تمام برائیوں کی جڑ بتایا۔ وہ عرب شراب جن کی گھٹی میں پڑی تھی اور وہ اسے پانی کی طرح استعمال کرتے تھے۔ حضورؐ نے ان کے دلوں میں اس کے خلاف اتنی نفرت پیدا کر دی کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے اور مدینہ کی گلیوں میں شراب بارش کے پانی کی طرح بہنے لگی۔ قمار بازی یعنی جُوا بھی عربوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اس بری عادت نے ان کو ناکارہ اور آرام پسند بنا دیا تھا اس کا بھی مکمل خاتمہ کر دیا گیا یہاں تک کہ عرب کا معاشرہ ان دونوں خرابیوں اور برائیوں سے قطعاً ناآشنا ہو گیا۔

یہ لوگ جو آخرت کے تصور سے بالکل بے بہرہ تھے اور اپنی زندگی فضول کاموں اور بے کار مجلسوں میں گزارنا فخر سمجھتے تھے اسلام کے تصورِ آخرت اور اس کی جواب دہی کے احساس سے اس قدر متاثر ہوتے کہ ایک ایک لمحہ نیکوکاری میں بسر کرنے لگے۔ ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا پورا نقشہ بدل گیا۔ نیکی کی جستجو اور لغویات سے پرہیز ان کی زندگی کا شعار بن گیا۔

۳۔ معاشرتی اصلاحات

معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے، اس لیے معاشرے کی اصلاح اسی صورت میں ہو سکتی ہے، جب افراد معاشرہ کی اصلاح ہو۔ ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا (اقبالؒ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاشرے کے تمام طبقوں کے حقوق مقرر کر کے ایک دوسرے کے ظلم و ستم سے نجات دلائی۔ غلام بدترین زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے بارے میں حضورؐ نے یہ تعلیم

دی کہ انہیں وہی کچھ کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی کچھ پہناؤ جو خود پہنتے ہو اور پھر غلام کو آزاد کرنا سب سے بڑا ثواب قرار دیا۔ بہت سے گناہوں کا فدیہ غلاموں کو آزاد کرنا ٹھہرایا۔ اسی اعلیٰ تعلیم کے نتیجہ میں غلامی کا رواج یکسر ختم ہو گیا۔ اس دور میں عورت، غلاموں کے بعد دوسرا مظلوم طبقہ تھی۔ عرب لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ حضورؐ نے لڑکی کی پیدائش کو باعثِ رحمت قرار دیا اور فرمایا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ بیوی کے مرد کے برابر حقوق ہیں۔ عورت کے فرائض بتائے کہ وہ گھر میں کام کاج کرے، باہر نکلے تو پردہ سے نکلے اور مرد کی ذمہ داری یہ بتائی کہ وہ کما کر لایا کرے۔ عورت کو مہر کا حق دیا اور اس کو جائیداد میں وارث بنایا۔ اس طرح عورت کو وہ حقوق حاصل ہوئے جو کسی مذہب و ملت میں نہیں ہیں۔ بیوہ کی شادی کی رغبت دلائی اور یتیموں کی سرپرستی کو خدا کی خوشنودی کا سبب قرار دیا۔ علاوہ ازیں اونچ نیچ کا تصور ختم کر کے مساوات کا درس دیا۔ حسب نسب، خاندان اور علاقے کی بجائے صرف تقویٰ کو عزت کا معیار قرار دیا گیا۔

۴۔ معاشی اصلاحات

معیشت کو انسانی معاشرے میں جو حیثیت و اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ معاشی ناہمواری اور اقتصادی بدحالی بگاڑ اور فساد کا باعث ہے۔ عربوں کی معاشی حالت نہایت ابتر تھی۔ ایک طرف تو انہیں مناسب ذرائع و وسائل میسر نہ تھے اور دوسری طرف وہ غلط اور ناجائز ذرائع سے روزی کماتے اور اسے ناجائز طریقوں سے خرچ کرتے تھے۔ سود ان کی معیشت کی بنیاد تھی، جس نے ان کی معاشی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ حضورؐ نے ان طور طریقوں میں ایسی اصلاح کی کہ تمام معاشی ناہمواریاں ختم ہو گئیں۔

حضورؐ نے معیشت کو پاک کرنے کے لیے سود اور دیگر ناجائز ذرائع پر پابندی لگا دی۔ سود جس سے سرمایہ داری کا ظالمانہ نظام جنم لیتا ہے اور غریب مجبوریوں کی چکی تلے پستا ہوا سود در سود پر رقم لینے پر مجبور ہوتا ہے، حضورؐ نے اسے حرام قرار دیا۔ آپؐ نے حرام کی کمائی کو جہنم کا ایندھن قرار دیا۔ اور حلال روزی کو جنت کی کنجی بتلایا اور رزقِ حلال کے بغیر عبادت کا ناقابل قبول ٹھہرایا۔ جو لوگ ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کے بعد اسے اپنی خواہشات نفسانی کے تحت خرچ کرتے تھے انہیں خدا کے عذاب سے ڈرایا اور یہ تعلیم دی کہ رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے امانت اور آزمائش ہے۔ اسے چاہیئے کہ وہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور غریبوں اور ناداروں کی مدد کرے پھر تعلیم دی کہ اسراف اور فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

حضورؐ نے دولت کو جمع کر کے رکھنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ ارتکازِ زر بے شمار خرابیوں کا سبب ہے۔ آپؐ نے لوگوں میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ ابھارا تاکہ دولت گردش کرے اور سب کے کام

آتی رہے۔ غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لیے امراء پر زکوٰۃ فرض کی اور زکوٰۃ کو اسلام کا خزانہ قرار دیا۔ جو صاحبِ ثروت لوگ جان بوجھ کر اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں نکالتے، انہیں یہ وعید سنائی کہ یہ مال آخرت میں ان کے لیے عذاب کا موجب بنے گا۔ زکوٰۃ کے اسی عادلانہ نظامِ معیشت کے ایسے اثرات مرتب ہوئے کہ اسلامی ریاست میں ڈھونڈنے سے کوئی شخص ایسا نہ ملتا تھا جو زکوٰۃ لینے پر آمادہ ہو۔ اسی طرح حضورؐ نے وراثت کا قانون بھی مرتب فرمایا۔ اس اسلامی قانونِ وراثت کے تحت ہر شخص کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد اس کے مرنے کے بعد جائز وارثوں میں تقسیم ہو کر پھیل جاتی ہے اور ملکِ بگاڑ اور شر کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۵۔ تمدنی اصلاحات

تمدن کسی علاقے یا قوم کی طرزِ معاشرت کا نام ہے۔ اس میں وہ تمام امور شامل ہیں جو ہماری معاشرت اور مادی زندگی کے متعلق ہوں۔ اس میں عام رہن سہن اور رسوم و رواج بھی شامل ہیں۔ حضور اکرمؐ نے ایک مثالی اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے تہذیب و تمدن کے اصول مقرر فرمائے۔ اور اس طرح کی اصلاحات کیں کہ وہ ایک مشعلِ راہ بن گیا تھا۔ حضورؐ نے ان لوگوں میں تقویٰ، خوفِ خدا اور آخرت کی جوابدہی کا اتنا احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ کبھی بھی گناہ کے قریب نہ جاتے تھے۔ شرم و حیا کے فطری جذبہ کو اتنا ابھارا گیا کہ معمولی غلطیوں پر بھی شرم و حیا سے آب آب ہو جاتے۔ ایک طرف آپؐ نے ان میں نیکی اور خیر کی ترغیب پیدا فرمائی اور دوسری طرف ایسی انسدادی تدابیر اختیار فرمائیں کہ برائی کا مکمل قلع قمع ہو گیا۔ یہی اقدامات زبردست معاشرتی تحفظات بن گئیں اور عقیدہ توحید اور تقویٰ کی بدولت بہترین تہذیب و تمدن کا قیام عمل میں آیا۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ بیان کرتے ہیں:۔

"اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی، جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیم بچے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔"

حضورؐ نے زنا کو بدترین فعل قرار دیا۔ قرآن مجید میں غیر شادی شدہ زانی کی سزا سو کوڑے اور شادی شدہ کو سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر فرمایا کہ زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو یعنی لوازماتِ زنا سے بچو۔ حقیقتاً یہ اتنا بڑا جرم ہے جو قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ گویا زانی اسلامی معاشرے کی عفت و عصمت پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور انسانیت کی بجائے حیوانیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لیے اس کی سزا بھی اس قدر سنگین رکھی گئی ہے۔ پھر عربوں میں زنا کی جھوٹی تہمتیں لگائی جاتی تھیں۔ حضورؐ نے ایسے شخص پر لعنت فرمائی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ پاک دامن عورتوں پر تہمت مت لگاؤ۔ قرآن مجید نے اس کی سزا اسی

کوڑے مقرر کی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کو پردہ کا حکم دیا تاکہ اس کی عفت وعصمت کی حفاظت ہو سکے اور وہ آرائش و زیبائش کر کے باہر نہ نکل سکے اور شیطان کو برائی اور فتنہ پھیلانے کا موقع نہ مل سکے۔ اس تعلیم کی رو سے عورت کی زینت و آرائش اس کے خاوند کے لیے مخصوص ہے نہ کہ غیر مردوں کے لیے۔ یعنی بقولِ اکبر الٰہ آبادی وہ شمع محفل بننے کی بجائے چراغِ خانہ بن کر رہے۔ اسلام نے حکم دیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں غضِ بصر سے کام لیں یعنی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ عورت کے لیے حکم ہے کہ وہ بغیر ضروری کاموں کے گھر سے باہر نہ نکلے اور اس صورت میں بھی باپردہ ہو کر باہر آئے۔ عریانی اور برہنگی کو بالکل ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ عورت لباس پہن کر بھی برہنہ رہے۔ مرد و عورت کے آزادانہ اختلاط کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس طرح ایک پاکیزہ معاشرہ وجود میں آ گیا۔

اسی طرح حضورؐ نے گھروں میں بلا اجازت اور بغیر اسلام کے آنے سے منع فرما دیا۔ قرآن مجید میں واضح حکم ہے کہ تم اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں بلا اجازت مت داخل ہو، اس لیے کہ معلوم نہیں اہلِ خانہ کس حالت میں ہیں۔ اگر کوئی چیز مانگنی ہی پڑ جائے تو پردے کی اوٹ سے مانگی جائے۔ عورت کو تلقین کی کہ وہ بلا ضرورت غیر مرد سے ہم کلام نہ ہو اور اگر کبھی بات بھی کرنی پڑے تو لہجہ سخت رکھے اور اس میں لوچ پیدا نہ کرے تاکہ کوئی منفی تاثر قائم نہ ہو۔ یہاں تک کہ بالغ اولاد کو بھی منع کر دیا کہ وہ سونے کے کمروں میں بلا اجازت رات اور دوپہر کو نہ جایا کریں تاکہ کسی قسم کی بے پردگی نہ ہو۔ یہ تمام تدابیر جنسی آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کو ختم کرنے کے لیے فرمائی گئیں۔ ان کا اثر یہ ہوا کہ عربوں کا صدیوں پرانا فرسودہ نظام حضورؐ کی تشریف آوری سے ختم ہو گیا اور ایک نیا اسلامی تمدن، پاکیزہ معاشرت اور بااخلاق و حیادار سوسائٹی وجود میں آئی۔

۶۔ سیاسی اصلاحات

سیاست کے بارے میں اہلِ مغرب نے کچھ ایسا پروپیگنڈا کیا ہے کہ گویا یہ مذہب سے الگ تھلگ چیز ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل دین اور ضابطہ حیات ہے جو اخلاق و معاشرت، معیشت و اقتصادیات اور سیاسی نظام وغیرہ تمام شعبوں پر حاوی ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی بہترین رہنمائی کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلامی نظام کو عملاً نافذ کرنے کے لیے اختیار و اقتدار اور حکومت کا حصول ناگزیر اور لازمی ہے کیونکہ اقتدار کے بغیر کوئی نظام پائیدار بنیادوں پہ استوار نہیں رہ سکتا۔ ؏

عصا نہ ہو تو کلیمیؑ ہے کارِ بے بُنیاد

اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سب سے پہلے لوگوں کو یہ بتایا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ فرمانروائی کا کلی اور تمام تر حق اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ کائنات کا مالک وہ ہے اور حکم اور قانون بھی اس میں اسی کا چلنا ہوگا۔ انسان کا مرتبہ یہاں پر خدا کے نائب کا ہے۔ وہ خلافت فی الارض کے منصب پر فائز ہے اور حکومت و اقتدار اس کے پاس خدا کی مقدس امانت ہے۔ لہٰذا اسے یہ فریضہ امین بن کر ادا کرنا ہوگا۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ خدا کی مرضی کو یہاں پورا کرے اور خدا کے بھیجے ہوئے قوانین کو عملاً نافذ کرے۔ ریاست کا حکمران اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی پیروی کرے گا۔ اس طرح سے اسلام نے انسان پر انسان کی حاکمیت، خدائی یا بادشاہت کے تصور کی جڑ کاٹ دی، کیونکہ تمام فسادات کا اصل منبع ہی یہی تصور تھا۔ حضورؐ نے بتایا کہ قانون دینے والی ذات صرف ایک ہے۔ تمام انسان مل کر بھی اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو تو علمائے وقت غور و فکر کر کے قرآن مجید کی روشنی میں اجتہاد کر سکتے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا حاکم مقرر فرمایا اور ان سے پوچھا کہ تم لوگ میں فیصلے کس طرح کرو گے؟ انہوں نے عرض کی: "میں قرآن مجید کے احکام کے مطابق فیصلے کروں گا۔" حضورؐ نے دریافت فرمایا: "اگر قرآن مجید سے یہ حکم نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟" عرض کی: "میں سنتِ رسولؐ کے مطابق فیصلے کروں گا۔" حضورؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ "اگر سنت رسولؐ سے یہ حکم نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟" عرض کی: "اس صورت میں میں اپنی رائے استعمال کروں گا اور اجتہاد کروں گا۔" حضورؐ اس جواب سے خوش ہوئے اور فرمایا:

"اللہ بزرگ و برتر کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہؐ کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی، جس سے اللہ کا رسولؐ راضی اور خوش ہے۔"

حضورؐ نے اس بات کی تعلیم دی کہ ریاست کے انتظام کے لیے امیر کا انتخاب باہمی مشورے سے کیا جائے۔ یہ منصب خاندانی، نسلی یا موروثی بنیاد پر کسی کو نہ دیا جائے گا بلکہ جو زیادہ متقی اور اہل ہو اسے امیر چنا جائے۔ امیر کا محاسبہ کیا جائے گا اور اس کی حیثیت عام شہریوں جیسی ہو گی۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ ریاست کے اہم معاملات و امور مسلمانوں کے مشورے سے سرانجام دے۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک مجلس مشاورت یا مجلسِ شوریٰ بنا سکتا ہے۔

اسلامی ریاست میں انتظامیہ سے الگ عدلیہ قائم ہو گی۔ قاضی یا جج کا کام بے لاگ اور آزادانہ فیصلہ کرنا ہے۔ امیر ریاست بھی عدالت کے سامنے جوابدہ ہو سکتا ہے۔ جج یا قاضی کے سامنے امیر و غریب، حاکم و محکوم اور چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہ ہو گی، بلکہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اس طرح گویا ریاست امن و سلامتی

اور عدل و انصاف کا گہوارہ بن جائے گی۔

علاوہ ازیں اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کو مساویانہ شہری و قانونی حقوق حاصل ہونگے اور اس سلسلے میں ان کے ساتھ کوئی ظالمانہ سلوک روا نہ رکھا جائے گا۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کو جو حقوق دیئے گئے ہیں اس کی مثال کسی اور مذہب و ملت میں نہیں ملتی۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے جن قوموں پر جزیہ لگایا ان کو تحریر کے ذریعے باقاعدہ حقوق دیئے گئے۔ مثلاً یہ کہ ان کی جان محفوظ رہے گی۔ کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔ ان کا مذہب یا عقیدہ بدلوایا نہیں جائے گا۔ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی وغیرہ۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ ملتِ اسلامیہ کے بانی

۱۔ اُمتِ محمدیہؐ ـــــ عالمگیر اُمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے آنے والے انبیائے کرامؑ کی نبوت کسی خاص قوم یا ملک یا علاقے کے لیے ہوتی تھی، بلکہ بعض دفعہ ایک ہی وقت میں مختلف علاقوں میں مختلف انبیائے کرامؑ مبعوث ہوتے تھے۔ لیکن حضورؐ کی نبوت قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ دوسرے الفاظ میں نبوتِ محمدیؐ ایک عمومی اور عالمگیر حیثیت رکھتی ہے اور اس لحاظ سے اُمتِ محمدیؐ بھی عالمگیر امت گردانی جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۝

(الاعراف : ۱۵۸)

ترجمہ: (اے محمدؐ) کہہ دو کہ لوگو! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا رسولؐ ہوں۔

ایک اور موقع پر فرمایا :

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (سبا : ۲۸)

ترجمہ: (اور اے محمدؐ) ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۔ ملتِ اسلامیہ تمام امتوں پر شاہد

علامہ سید سلیمان ندوی اپنی مشہور تصنیف "سیرۃ النبیؐ" میں لکھتے ہیں :

"امت محمدیہؐ جو آخری امت ہے، اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد

کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے۔ وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد، حمایتی، مددگار اور گواہ ہے۔ وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے۔ اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ دین الٰہی کامل ہو چکا۔ پیغام الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کا فرض اُمتِ محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے۔ اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمہ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظامِ عدل کی برقراری اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا اور امام ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے۔ چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاءؑ کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہو گی قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ (الحج: ۷۸)

ترجمہ: "اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی اور تمہارے لیے تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین پسند کیا۔ اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔ اور اس کتاب میں بھی وہی نام رکھا ہے تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلے میں شاہد ہو۔"

۳۔ نئی ملت کی بنیاد

تاریخ شاہد ہے کہ عرب اپنے قبائل سے اوپر کسی معاشرتی تنظیم یا قوم و ملت کا کوئی تصور ہی نہ رکھتے تھے۔ دنیا میں پہلی مرتبہ عرب کی سرزمین میں نسلی اور قبائلی بنیادوں کو ختم کر کے ایک نظریے اور ایک عقیدے کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ملت نو کی بنیاد رکھی اور عربوں کو ملت و قوم کے اجتماعی تصور سے روشناس کیا۔ کلمہ طیبہ یعنی خدا اور رسولﷺ پر جو بھی ایمان لے آتا وہ اس ملت کا فرد بن جاتا، خواہ اس کا تعلق کسی رنگ و نسل، خاندان یا علاقے سے ہو۔ قرآن مجید نے اس کلمہ کے ماننے والوں کو ملتِ اسلام اور انکار کرنے والے کو ملت کفر کا نام دیا۔ پہلا گروہ حزب اللہ اور دوسرا گروہ حزب الشیطان کہلایا۔

مشہور مؤرخ ہٹی لکھتا ہے کہ "یہ پہلا موقع تھا کہ عرب میں ایک معاشرہ رشتہ خون کی بجائے مذہب

کی بنیاد پر قائم ہوا۔"

بقول کارلائل "رسول اللہ ﷺ نے عرب قوم کو تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالا اور اسلام سے منور ہو کر پہلی دفعہ سرزمین عرب زندہ و پائندہ ہوئی۔"

مکہ میں قریش کی زبردست مخالفت کے باعث اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں نہ آسکا لیکن صحابہ کرامؓ کی صورت میں ایک ایسی جماعت تیار ہو چکی تھی جس کے ذریعے اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت کی تشکیل ہو سکے، چنانچہ ہجرت مدینہ کے نتیجہ میں مدینہ منورہ میں اسلام کو ایک مرکز حاصل ہو گیا، جہاں اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ مواخات کے ذریعے مہاجرینؓ و انصار بھائی بھائی بن کر ملت اسلامیہ کے افراد بن گئے۔ پھر حضورؐ نے ریاست مدینہ کو محفوظ کرنے کے لیے پہلی مرتبہ میثاق مدینہ کے نام سے یہود سے ایک معاہدہ کیا۔ اس میثاق کی بنیاد عدل و انصاف، رواداری اور مذہبی آزادی پر رکھی گئی۔ اس طرح ایک ایسی دولت مشترکہ قائم ہوتی جس کے سربراہ حضورؐ تھے۔ یہی میثاق ریاست مدینہ کی ترقی اور فلاح کا ضامن بن گیا اور یہی ریاستِ مدینہ ملت اسلامیہ کے نظامِ حیات کا پہلا مظہر بنی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عربوں کے اندر یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ اب دوستی اور دشمنی کی بنیاد ذاتیات پر نہیں ہو گی، بلکہ اس کا فیصلہ خدا کی شریعت کرے گی۔ اس شریعت کی بنا پر جو دشمن قرار پائے، پھر خواہ وہ عزیز ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، دشمن ہی شمار ہو گا اور جس کو اسلام نے دوست کہہ دیا پھر مسلمانوں کی دوستی صرف اسی سے ہو گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابو لہب جو حضورؐ کا حقیقی چچا تھا، ملت اسلامیہ سے خارج ہو گیا اور اسلام اور مسلمانوں کا دشمن قرار پایا کہ وہ کلمہ طیبہ پر ایمان نہیں لایا تھا اور حضرت بلالؓ حبشی جب اس کلمہ پر ایمان لے آئے تو ملتِ اسلامیہ کے معزز فرد بن گئے۔ یوں اس نظریہ نے نئی وسیع تر اور عالمگیر برادری کو جنم دیا، جن کی محبت اور نفرت محض خدا کی خاطر تھی۔ یہ وہ ناممکن کام تھا جو حضورؐ کی آفاقی تعلیمات اور اعلیٰ سیرت و اخلاق کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوا۔

قرآن مجید نے ملت اسلامیہ کو خیر امت قرار دیا ہے۔ حضورؐ کا مشن اسی صورت میں مکمل ہوا جب اسی خیر الامم ملت اسلامیہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ آپؐ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں اسی ملت کے ذمہ یہ فریضہ لگایا کہ جو باتیں میں بیان کر رہا ہوں وہ تم ان لوگوں تک پہنچاؤ گے جو یہاں حاضر نہیں۔ قرآن مجید نے اس فریضہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام دیا ہے۔ یہ حضورؐ کی اعلیٰ درجے کی دوراندیشی تھی کہ اسلام کی گواہی دینے کے لیے اپنے پیروکاروں کا ایک مضبوط گروہ تیار کر گئے۔ اس امر کی گواہی غیروں نے بھی دی ہے۔ چنانچہ مشہور مغربی مفکر منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

"اگر رسول اللہؐ میں انتظامی قابلیت، دانش مندی، سیاسی تدبر، دور اندیشی، یقین محکم اور توکل علی اللہ جیسی صفات نہ ہوتیں تو انسانیت کی تاریخ کا ایک نہایت ممتاز باب بغیر لکھے رہ جاتا۔"

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کے اسی پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا، روم و ایران جیسی عظیم سلطنتوں کو الٹ دیا اور عظیم ترین اسلامی سلطنت کا قیام عمل میں آیا اور یوں اسلامی مشن کی تکمیل ہوئی اور اسی عرب کی یہ قوم ملت اسلامیہ کہلاتی جس نے ہر اس خطے میں جہاں اسے غلبہ حاصل ہوا، خالق کائنات کی مرضی کو پورا کیا اور خدا کی زمین پر خدا کا قانون نافذ کیا۔ اسی ملت اسلامیہ نے اخلاق، عقائد، معیشت، معاشرت، سیاست، تہذیب و تمدن صلح و جنگ کے آفاقی قوانین و ضوابط پر اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی، جس کے ذریعے ایسا مثالی معاشرہ وجود میں آیا جس کی نظیر دنیا آج تک پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ اسلام کے اصلاحی انقلاب کی برکت تھی، جس نے دنیا کی قوموں پر ایک لازوال اثر ڈالا ہے۔

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
(اقبال)

عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ (الحج : ۴۱)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے۔ اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

سوال: عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قائم کردہ نظام حکومت کا مختصر اور جامع جائزہ پیش کیجیے۔

جواب (۱) **عہدِ نبوی میں نظام حکومت کے بنیادی اصول**

ظہور اسلام کے ساتھ جو مسلم معاشرہ وجود میں آیا اور پھر ہجرت مدینہ کے بعد سیاسی طاقت حاصل کر کے جس اسلامی ریاست کی شکل اس نے اختیار کی، اس کی بنیاد چند واضح اصولوں پر تھی۔ جو یہاں مختصراً بیان کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ قانونِ خداوندی کی بالاتری

اس ریاست کا اولین بنیادی قاعدہ یہ تھا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور اہلِ ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے، جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے، بلکہ اس کو لازماً اس قانونِ خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیئے جس کا مآخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔

۲۔ عدل بین الناس

دوسرا قاعدہ جس پر اس ریاست کی بنیاد رکھی گئی تھی، یہ تھا کہ قرآن و سنت کا دیا ہوا قانون سب کے لیے یکساں ہے اور اس کو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہونا چاہیئے۔ کسی کے لیے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت فرماتا ہے کہ:

وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (الشوریٰ:۱۵)

ترجمہ: اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں"

۳۔ مساوات بین المسلمین

اس اصول کے تحت تمام مسلمانوں کے حقوق بلالحاظ رنگ و نسل و زبان و وطن بالکل برابر ہیں۔ کسی فرد گروہ طبقے یا نسل و قوم کو اس ریاست کے حدود میں نہ امتیازی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کی حیثیت کسی دوسرے کے مقابلے میں فروتر قرار پا سکتی ہے۔

۴۔ حکومت کی ذمہ داری

چوتھا اہم قاعدہ یہ تھا کہ حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال، خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں جنہیں خدا ترس ایماندار اور عادل لوگوں کے سپرد کیا جانا چاہیئے اور اس امانت میں کسی شخص کو من مانے طریقے پر یا نفسانی اغراض کے لیے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔

۵۔ شوریٰ

اس ریاست کا پانچواں قاعدہ یہ تھا کہ سربراہِ ریاست مسلمانوں کے مشورے سے ان کی رضامندی سے مقرر ہونا چاہیئے اور اسے حکومت کا نظام بھی مشورے سے چلانا چاہیئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)

ترجمہ: اور مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں۔

۶۔ اطاعت فی المعروف

چھٹا قاعدہ یہ تھا کہ حکومت کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے، معصیت میں کسی کو اطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ یعنی حکومت اور حکام کا صرف وہی حکم ان کے ماتحتوں اور رعیت کے لیے واجب الاطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو۔

۷۔ اقتدار کی طلب و حرص کی ممانعت

یہ قاعدہ بھی اس ریاست کے قواعد میں سے تھا کہ حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب کے لیے عموماً اور خلافت کے لیے خصوصاً وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں ہیں جو خود عہدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں اور اس کے لیے کوشش کریں۔

۸۔ ریاست کا مقصد وجود

اس ریاست میں حکمران اور اس کی حکومت کا اولین فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو کسی ردوبدل کے بغیر جوں کا توں قائم کرے اور اسلام کے معیار اخلاق کے مطابق بھلائیوں کو فروغ دے اور برائیوں کو مٹائے۔ جیسا کہ شروع میں قرآن مجید کی آیت پیش کی گئی ہے۔

۹۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حق اور فرض

اس ریاست کے قواعد میں سے آخری قاعدہ، جو اس کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کا ضامن تھا، یہ تھا کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے کہ کلمۂ حق کہے، نیکی اور بھلائی کی حمایت کرے اور معاشرے یا مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں، ان کو روکنے میں اپنی امکانی حد تک پوری کوشش صرف کر دے۔

(اسلامی ریاست۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

(ب) عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت

"خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ" (ارشادِ نبویؐ)

یعنی "بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا حقیقی مقصد دعوتِ توحید، اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفوس تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے کام ضمنی تھے اور صرف اس حد تک جس حد تک مذکورہ بالا مقاصد کے حصول میں معاون اور قیامِ امن کے لیے ضروری تھے۔ اس دنیا میں شاہنشاہی قائم کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسے مٹا کر خلافتِ الٰہی قائم کرنے کے لیے آیا تھا اور اپنے ساتھ ایک دائمی شریعت اور ایک مکمل قانون لایا

تھا، جو انسانوں کی دینوی اور اُخروی فلاح کا ضامن تھا۔ اس قانون کے تحفظ نفاذ اور قیام امن کے لیے ایک نظام کی ضرورت تھی۔ اس لیے اسلام کی تبلیغ واشاعت کے ساتھ ساتھ خلافت الٰہیہ کی بھی تشکیل ہوتی گئی۔ یہ کوئی شاہنشاہی نظام نہ تھا، بلکہ اسلام کی محدود ضروریات کے مطابق ایک سادہ اور مختصر نظامِ حکومت تھا، وقتاً فوقتاً جو ضروریات پیش آتی جاتی تھیں، ان کے مطابق نظام بنتا جاتا تھا۔

اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس جملہ مذہبی وانتظامی امور کی نگران اور ذمہ دار تھی، لیکن تنہا ایک ذات عظیم الشان مذہبی ذمہ داریوں کے ساتھ انتظامی امور سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی تھی اس لیے آپؐ نے مختلف شعبے قائم کر کے انہیں اکابر صحابہ کرامؓ کے سپرد کر دیا تھا۔ ذیل میں اس سادہ نظامِ حکومت کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ فوج اور سپہ سالاری

چونکہ اسلام جنگ وجدل کے لیے نہیں آیا تھا، اس لیے اس کی کوئی باقاعدہ اور منظم فوج بھی نہ تھی۔ مگر حق و باطل کی معرکہ آرائی کے وقت ہر مسلمان مجاہد تھا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے لے کر ایک معمولی غلام تک میدانِ جہاد میں سربکف نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے معرکوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بہ نفسِ نفیس قیادت فرماتے تھے۔ ایسے معرکے غزوات کہلاتے تھے۔ چنانچہ بدر، احد، خیبر، احزاب، فتح مکہ، حنین وغیرہ میں آپؐ ہی سپہ سالار تھے کہ ان معرکوں کا مقصد خونریزی اور ہر قیمت پر فتح نہ تھا بلکہ فوج کی اخلاقی و روحانی نگرانی اور اصول و آئینِ جنگ کی تشکیل بھی تھا۔ چنانچہ مجاہدین اسلام کی جن جزئی بے اعتدالیوں اور کوتاہیوں پر آپؐ نے گرفت فرمائی، اس کی وضاحت غزوات کے حالات میں موجود ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے سرایا میں کبار صحابہ کرامؓ سپہ سالار ہوتے تھے۔

۲۔ افتاء

افتاء (فتویٰ جاری کرنا) کے فرائض حضورؐ خود انجام دیتے تھے، لیکن بعض صاحبِ علم صحابہ کرامؓ بھی اس خدمت کو بجا لاتے تھے۔

۲۔ مقدمات کا فیصلہ

مدینہ اور اس کے آس پاس کے مقدمات کا فیصلہ حضورؐ خود فرماتے تھے۔ لیکن دور دراز مقامات پر وہ صاحب علم صحابہ کرامؓ جو معلم بنا کر بھیجے جاتے تھے، اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل کو حضورؐ نے یمن کا قاضی مقرر فرمایا تھا۔ وغیرہ۔

۴۔ کاتب

حضورؐ دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجتے تھے، قبائل واقوام سے تحریری معاہدے ہوتے تھے، مسلمان قبائل اور عمال و محصلین کو احکام و ہدایات بھیجتے تھے،

اس کے لیے کتابت کا شعبہ نہایت ضروری تھا۔ اس کا کوئی باضابطہ محکمہ نہ تھا، لیکن بہت صحابہ کرامؓ اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت انصاری اور آخر میں حضرت امیر معاویہؓ کاتبِ وحی تھے۔ ان کے علاوہ مراسلات کی تحریر کی خدمت اور بہت سے صحابہ کرامؓ انجام دیتے تھے۔

۵۔ احتساب

احتساب یعنی قوم کے اخلاق و عادات، خرید و فروخت اور معاملاتِ لین دین کی نگرانی کا باقاعدہ محکمہ عہدِ نبویؐ میں موجود نہ تھا، لیکن اس کی بنیاد اسی دور میں پڑ گئی تھی، آپؐ بہ نفس نفیس ان امور کی نگرانی فرماتے تھے، لوگوں کو جزئیاتِ اخلاق کی تعلیم دیتے تھے اور اس قسم کی کوتاہیوں پر مواخذہ فرماتے تھے۔ تجارت میں آپؐ نے بہت سی اصلاحات جاری کیں اور ان پر سختی کے ساتھ عمل کرایا، جو لوگ تخمینہ اور انداز سے غلہ خریدتے تھے، ان کو اس بات پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود اسی جگہ بیچ دیں۔

کبھی کبھار تحقیق کے لیے خود بازار تشریف لے جاتے تھے۔ ایک بار آپؐ بازار سے گزرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو نمی محسوس ہوئی۔ دکاندار سے پوچھا تو اس نے جواب دیا: بارش سے بھیگ گیا ہے۔ فرمایا: تو اس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا کہ ہر شخص کو نظر آئے۔

مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا (جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں)

۶۔ عمال کا جائزہ

فرائض احتساب میں سب سے مقدم فرض عمال کا احتساب و محاسبہ ہے چنانچہ جب عمال زکوٰۃ اور صدقہ وصول کر کے لاتے تھے تو آپؐ جائزہ لیتے تھے کہ انہوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی کا جو صدقہ وصول کر کے لاتے تھے، جائزہ لیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھ کو تحفے میں ملا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، "گھر بیٹھے بیٹھے تم کو یہ تحفہ کیوں نہ ملا"۔ اس کے بعد ایک عام خطبہ دیا، جس میں اس بات کی سخت ممانعت فرمائی۔

۷۔ انتظامِ ملکی

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف ساٹھ برس کی تھی، لیکن اس عمر میں بھی اس حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے۔ ولاۃ اور عمال کا تقرر، مؤذنین اور ائمہ کا تعین، محصلین زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائیدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لیے تعین وظائف، اجرائے فرامین، نومسلموں کے انتظامات، مسائل شرعیہ میں افتاء، جرائم کے لیے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات، عہدہ داروں

کی خبر گیری اور احتساب، دور کے صوبوں میں متعدد صحابہ کرامؓ گورنر اور والی بنا کر بھیج دیئے گئے تھے۔ لیکن خود مدینہ اور اطراف مدینہ کے فرائض حضورؐ خود انجام دیتے تھے۔ خلافت الٰہی کے ان فرائض و اعمال نے آپؐ کے دل و دماغ پر جو بارِ عظیم ڈالا، اس نے آپؐ کے نظامِ جسمانی کو چور چور کر دیا۔ عام روایتوں سے ثابت ہے کہ آپؐ آخر زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

۸۔ حکام اور ولاۃ

مقدمات کا تصفیہ، اقامتِ عدل، قیامِ امن اور جھگڑوں کو چکانے کے لیے متعدد ولاۃ حکام کی ضرورت تھی۔ اس غرض سے آپؐ نے متعدد صحابہ کرامؓ کو مختلف مقامات کا حاکم و والی مقرر فرما دیا۔ ان ولاۃ یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ عہدِ نبویؐ میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر سایہ آئے ان میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیر سایہ رہ چکا تھا۔ اس بناء پر حضورؐ نے اس کو پانچ حصوں میں تقسیم فرمایا اور ہر ایک کے لیے الگ الگ گورنر مقرر فرمائے۔

عمال کو صرف بقدرِ ضرورت معاوضہ ملتا تھا۔ آپؐ نے عام منادی فرما دی تھی کہ جو شخص ہماری مقررہ شرح سے زیادہ لے گا، وہ خیانت مالی ہے۔

۹۔ محاصل اور ان کے مصارف

عہد نبویؐ میں محاصل کی پانچ قسمیں تھیں:۔ غنیمت، فے، زکوٰۃ، جزیہ اور خراج۔

غنیمت یعنی وہ مال جو دشمنوں سے فتح کے موقع پر ملتا تھا۔ یہ کوئی مستقل آمدنی نہ تھی، اس کو قرآن مجید میں خدا کی ملکیت قرار دیا گیا ہے اور اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسولؐ کے نام سے حکومت کے مصالح اور اغراض کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ یعنی یہ سپاہیوں کی ملکیت نہیں، بلکہ امام وقت مصالح کی بناء پر جس مصرف میں چاہے اس کو صرف کر سکتا ہے۔ ایک دو موقع کے علاوہ حضورؐ خمس نکالنے کے بعد کل مالِ غنیمت مجاہدین میں برابر تقسیم فرما دیتے تھے۔ خمس کا مال بھی عموماً حضورؐ ذوی القربیٰ یتامیٰ، مساکین اور غریب الدیار مسافرین میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ فیئ بزور شمشیر فتح کئے گئے، علاقے کی زمین کا لگان ہوتا تھا۔

زکوٰۃ صرف مالدار مسلمانوں پر فرض تھی اور چار مدوں سے وصول ہوتی تھی: نقد روپیہ[۱]، پھل[۲]، پیداوار مویشی (گھوڑے نہیں) اسباب[۴] اور سامانِ تجارت۔ زکوٰۃ کے مصرف قرآن مجید میں بیان کر دیئے گئے ہیں یعنی فقراء و مساکین، نو مسلم، وہ غلام جن کو آزاد کرانا ہو، مقروض، مسافر، عاملین زکوٰۃ اور دوسرے کار خیر۔ زکوٰۃ جس مقام سے وصول کی جاتی تھی، عموماً وہیں کے مستحق افراد میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

جزیہ، غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضہ میں وصول کیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار متعین نہ تھی۔ عہدِ نبویؐ میں ہر صاحبِ استطاعت بالغ مرد سے ایک دینار سالانہ وصول کرنے کا حکم تھا۔ بچے اور عورتیں اس میں شامل نہ تھے۔

خراج، غیر مسلم کاشت کاروں سے حق مالکانہ کے معاوضہ میں زمین کی پیداوار کا جس قدر حصہ باہمی مفاہمت سے طے ہو جائے، خراج کی مد میں شمار ہوتا تھا۔ خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء وغیرہ سے خراج ہی وصول ہوتا تھا۔

جزیہ اور خراج کی آمدنی سپاہیوں کی تنخواہ اور جنگی مصارف میں صرف ہوتی تھی۔ جو کچھ وصول ہوتا، حضورؐ اسی وقت مجاہدین میں تقسیم کر دیتے۔ ان سب کے نام رجسٹر میں درج تھے۔ اہل و عیال والوں کو دو حصے ملتے تھے اور مجرد کو ایک۔

۱۰۔ سفارت

تبلیغ اسلام کی غرض سے حضورؐ نے مختلف سربراہان ممالک کی طرف سفیر بھی روانہ فرمائے۔ اس کے علاوہ مختلف عرب قبائل کے وفود اور سفارتیں حاضر خدمت ہوئیں، آپؐ ہر وفد سے ان کی قبائلی بولیوں میں گفت و شنید فرماتے تھے۔ یہ خداداد وصف تھا۔

۱۱۔ مجلس مشاورت

حضور اکرمؐ نے حکمِ الٰہی وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کی تعمیل میں ہمیشہ اہم نوعیت کے مسائل کے بارے میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا۔ اس غرض سے آپؐ نے چودہ مہاجرین اور چودہ انصار پر مشتمل ایک مجلس مشاورت تشکیل دے رکھی تھی جن میں حضرت حمزہؓ، حضرت جعفرؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت حذیفہؓ بن یمان، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت بلال حبشیؓ اور حضرت مقدادؓ شامل تھے۔

۱۲۔ افتادہ زمینوں کی آبادی

ملک عرب کا اکثر حصہ ریگستانی، پتھریلا، شور اور بنجر تھا۔ جو سرسبز قطعات تھے، اُن پر بیرونی قومیں قابض تھیں۔ بقیہ افتادہ زمینیں تھیں۔ البتہ مدینہ منورہ اور طائف میں کاشت کاری ہوتی تھی۔ بقیہ عام تجارت یا لوٹ مار پر زندگی بسر کرتے تھے۔ عرب میں امن و امان نہ تھا، اس کا بڑا سبب یہی تھا کہ عرب مستقل پیشہ ور نہ تھے۔ اس بناء پر قیام امن کے لیے بھی ضروری تھا کہ زمین کا نئے سرے سے بندوبست کیا جائے۔ حجاز میں غیر قوموں کے انخلاء کے سبب سے یوں بھی بہت سی زمینیں خالی ہو گئی تھیں، جن کا انتظام ضروری تھا چنانچہ حضورؐ نے عام طور پر صحابہ کرامؓ کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ ان افتادہ اور غیر آباد زمینوں کو آباد کریں۔ چنانچہ فرمایا:

"جس شخص نے افتادہ زمین کو آباد کیا وہ اس کی ملکیت ہے۔"

اس ترغیب عام کے ساتھ حضورؐ نے خاص خاص انتظامات بھی فرمائے اور اس کے لیے قواعد و ضوابط بنائے گئے۔

(ج) مذہبی انتظامات

۱۔ تبلیغ و دعوتِ اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اصلی کام نہ صرف عرب بلکہ ساری مخلوق کو توحیدِ الٰہی کی دعوت دینا اور سارے عالم میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ مکی زندگی زبردست کش مکش سے دوچار تھی۔ اس کے باوجود تبلیغ اسلام کا کام برابر جاری رہا اور آہستہ آہستہ اسلام پھیلتا رہا اور جس قدر مزاحمتیں دور ہوتی گئیں اسلام کی اشاعت کی رفتار بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ فتح مکہ کے بعد اصل رکاوٹ دور ہو گئی اور سارے عرب میں اسلام کی روشنی پھیل گئی اور یہی رسالت کا حقیقی کارنامہ ہے۔

حضورؐ نے تبلیغ اسلام کے مختلف طریقے اختیار فرمائے، ابتدا میں تن تنہا یہ فریضہ سرانجام دیا، پھر سابقین اولین اور انصار کی جماعت معاون بنی۔ اس کے بعد جوں جوں اسلام کو قوت حاصل ہوتی گئی اس فریضہ کی ادائیگی میں اور زیادہ وسعت ہوتی گئی، تربیت یافتہ مبلغین اور چھوٹی چھوٹی تبلیغی جماعتیں مختلف قبائل اور مقامات میں بھیجی جانے لگیں، جس قبیلہ کا کوئی آدمی مسلمان ہو جاتا تھا وہ خود جا کر اپنے قبیلہ میں اسلام کی اشاعت کرتا تھا۔ بعض لوگ آپؐ کے دعویٰ نبوت کے حالات سُن کر آپؐ سے ملنے کے شوق میں آتے تھے اور نبوت کی پُرتاثیر باتیں سن کر مسلمان ہو جاتے تھے۔ پھر صحابہ کرامؓ کے اخلاق و عمل اور اسلام کے زندہ پیکر دیکھ کر اور ان سے اسلام کو سمجھ کر بکثرت کفار مسلمان ہوئے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ طبری کا بیان ہے کہ:

> ”کوئی سمجھ دار آدمی ایسا نہ تھا، جس نے اسلام پر گفتگو کے بعد اس کو قبول نہ کر لیا ہو۔ جتنے لوگ شروع سے اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے، صرف دو برسوں کے برابر یا ان سے زیادہ تعداد میں مسلمان ہوئے۔“

۲۔ وفود

فتح مکہ کے بعد جب قبائل عرب نے خود قبول اسلام کی جانب سبقت کی تو بہت سے قبائل کے وفود نے مدینہ آ کر اسلام قبول کیا یا اپنے اپنے مقامات پر قبول کر چکے تھے پھر دربار رسالت میں حاضر ہو کر اس کی تصدیق کر لی۔ بعض صرف سیاسی معاہدہ کے لیے آتے تھے، اور حضورؐ سے گفتگو کے بعد مسلمان ہو جاتے تھے۔ اس قسم کے وفود کی تعداد پندرہ سے لیکر سو سے اوپر تک ہے۔ یہ وفود مختلف اوقات میں آتے رہے، لیکن زیادہ تعداد بلکہ دو چار کے سوا باقی کل فتح مکہ کے بعد

آتے۔ سورہ النصر میں اسی کا تذکرہ ہوا ہے۔

۳ دعاۃ اور معلمین کی تعلیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دینی و مذہبی تعلیم و تربیت کے دو طریقے رکھے تھے، ایک غیر مستقل جس میں عرب کے مختلف قبائل کے آدمی مدینہ منورہ آکر چند روز قیام کر کے ضروری مسائل سیکھ کر واپس جاتے تھے اور اپنے قبیلہ کو تعلیم دیتے تھے۔ دوسرا طریقہ مستقل درس و تعلیم کا تھا اور اس کے لیے صفہ کی درس گاہ مخصوص تھی۔ اس میں وہ لوگ تعلیم دین حاصل کرتے تھے جو علائق دنیاوی سے کنارہ کش ہو کر خود کو دینی تعلیم اور عبادت و ریاضت کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ اس درس گاہ میں دو حلقے تھے، ایک درس و تعلیم کا اور دوسرا ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت کا۔ صفہ کی درس گاہ میں حضور اکرمؐ کے علاوہ اکابر صاحبِ علم صحابہ کرامؓ بھی تعلیم دیتے تھے۔ اس درس گاہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کو قراء کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ تعلیمی اور تبلیغی ضروریات کے لیے مختلف مقامات پر بھیجے جاتے تھے۔ عہدِ نبویؐ میں ان قراء کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو گئی تھی۔

۴۔ تعمیر مسجد

اسلام کا سب سے بڑا مقصد عبادت اور تسبیح و تقدیس الٰہی تھا اس لیے مسجد کی تعمیر سب سے مقدم فرض تھا۔ عبادت و ریاضت کے علاوہ مسجد مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز بھی تھی، جہاں مسلمان دن میں پانچ مرتبہ جمع ہوتے تھے اسی لیے حضورؐ نے نماز باجماعت کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ جب کوئی قبیلہ مسلمان ہوتا تھا تو اس کے لیے مسجد ضروری ہو جاتی تھی۔ بڑی بڑی آبادیوں میں ایک ایک مقام پر کئی کئی مسجدوں کی ضرورت پیش آجاتی تھی۔ چنانچہ عہدِ نبویؐ میں صرف مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے علاوہ نو مسجدیں تھیں۔

۵۔ ائمۂ نماز و مؤذنین

مساجد کی تعمیر کے ساتھ ان کے لیے آئمہ بھی مقرر فرماتے تھے بالعموم ہر قبیلہ کے بڑے حافظِ قرآن کو یہ منصب عطا ہوتا تھا اور اس میں آقا و غلام اور چھوٹے بڑے کا فرق نہ تھا۔ جن جن مقاموں پر مدینہ منورہ سے عمال مقرر ہو کر جاتے تھے، عموماً وہی وہاں کے امام بھی ہوتے تھے۔ بعض مقامات پر عامل اور امام کے فرائض الگ الگ دو شخصوں سے بھی متعلق ہوتے تھے۔ اذان کی خدمت کے لیے کوئی خاص شخص نہیں ہوتا تھا۔ مختلف حضرات یہ خدمت انجام دیتے۔ حضرت بلالؓ اور حضرت ابن ام مکتومؓ مسجد نبویؐ کے مؤذن تھے۔ وغیرہ۔

خلافت راشدہ

۱۱ھ تا ۴۱ھ بمطابق ۶۳۲ء تا ۶۶۱ء

ارشادِ ربانی :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص (النور : ۵۵)

ترجمہ : اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا بنا چکا ہے۔

ارشاداتِ نبوی :-

اَلْخِلَافَةُ بَعْدِیْ ثَلَاثُوْنَ عَامًا ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذٰلِكَ

ترجمہ: "میرے بعد نظامِ خلافت تیس سال تک رہے گا۔ اس کے بعد ملوکیت کا دور دورہ ہو گا"

پانچ ادوار حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں نبوت کا وجود اس وقت تک باقی رہے گا، جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ نبوت کو اٹھا لے گا، اور اس کے بعد نبوت کے طریقہ پر خلافت ہو گی، جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ تعالیٰ خلافت کو اٹھا لے گا۔ اور اس کے بعد بادشاہت ہو گی کاٹنے والی (یعنی جن میں بعض لوگ بعض پر زیادتی اور ظلم کریں گے) جب تک اللہ اس کو چاہے گا، قائم رکھے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو بھی اٹھا لے گا۔ پھر تجبر اور غلبہ کی حکومت ہو گی اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ قائم رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھا لے گا اور اس کے بعد نبوت کے طریقہ پر خلافت قائم ہو گی۔

(احمد اور بیہقی نے دلائل نبوت میں بیان کیا، مشکوٰۃ شریف، جلد دوم)

۷ چراغ و مسجد و محراب و منبر ۔۔۔ ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ

اس میں ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا ہوں عثمانؓ و علیؓ ۔۔۔ سب کی خوشبو سے مہکتا ہے خلافت کا چمن

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

اسلام کا زمانے میں سکہ بٹھا دیا ۔۔۔ اپنی مثال آپ ہیں یارانِ مصطفےٰ[1]
(مولانا ظفر علی خاں)

نئے دور کے مشعل بردار

وہ جاہل تھے اور اپنی جہالت پر فخر کرتے تھے ان کے ماضی کی تاریخ نہ ختم ہونے والی قبائلی جنگوں تک محدود تھی اور ان کے سامنے ان جنگوں کو جاری رکھنے کے سوا کوئی مستقبل نہ تھا۔ جو ظلم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ظلم سہنے پر مجبور کر دیئے جاتے تھے ۔۔۔ لیکن جب اسلام آیا تو یہی لوگ ایک نئے دور کے مشعل بردار بن گئے۔ کارسازِ فطرت نے اپنی رحمت کی گھٹاؤں کے نزول کے لیے ایک بے آب و گیاہ صحرا کو منتخب کیا۔ عرب کے ظلمت کدہ سے نور کا ایک سیلاب نمودار ہوا اور مختلف قبائل اور اقوام کو اپنے آغوش میں لیتا ہوا، اطراف عالم پر چھا گیا۔

اسلام تپتے ہوئے صحرا میں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا اور خلق خدا اس کی پیاسی تھی۔ دنیا جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی اور اسلام ایک نئی صبح کا آفتاب تھا۔ انسانیت ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہی تھی اور اسلام اس کے لیے عدل و مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا۔

بدر و حنین کے معرکوں میں اسلام کی ابتدائی فتوحات دراصل صدیوں کی روندی، پسی اور سسکتی ہوئی انسانیت کی فتوحات تھیں۔ مؤرخ جنہوں نے روم اور ایران کی شہنشاہوں کا جاہ و جلال دیکھا تھا، اب ان بوریا نشینوں کو اقوام و ملل کی قسمت کا فیصلہ لکھتے دیکھ رہے تھے، جو اپنی پھٹی ہوئی قباؤں کو اپنے ہاتھوں سے پیوند لگایا کرتے تھے۔

وقت کے فرعون، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواروں کی طرح حائل تھے جب یہ دیواریں ٹوٹ گئیں، تو ہمسایہ ممالک کے باشندوں نے دیکھا کہ عرب کے صحرانشیں ان کے دشمن نہیں، بلکہ دوست اور محافظ بن کر آئے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اپنی نسلی اور وطنی عصبیتوں

کے باعث کبھی اسلام کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے، اب کفر و اسلام کی نئی رزم گاہوں میں عربوں کے دوش بدوش لڑ رہے تھے۔ خلافت راشدہ اسلامی نظام حکومت کا ایک مثالی دور تھا۔

(نسیم حجازی)

خلافت راشدہ کا مفہوم

عربی زبان میں خلفاء کا لفظ خلیفہ کی جمع کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنیٰ نائب یا جانشین ہے۔ "راشدین" کا واحد "راشد" ہے جس کا مطلب ہے صاحب رُشد یا باہدایت۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ کو خلفائے راشدین کہا جاتا ہے۔ یہ چاروں حضرات کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد بالترتیب حضورؐ کے خلیفہ اور ملت اسلامیہ کے امیر مقرر ہوئے۔ انہیں امیر المؤمنین بھی کہا جاتا ہے۔

چونکہ یہ چاروں خلفاء رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد فرمودہ راستے پر گامزن رہے اور ہر معاملے میں سنت رسولؐ کی پیروی کرتے رہے، اس لیے انہیں خلفائے راشدین کہتے ہیں اور ان کے زمانے کو خلافت راشدہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں خلافتِ راشدہ سے مراد ایسا مثالی سیاسی طرزِ حکومت ہے جو علیٰ منهاجُ النبوت ہو یعنی نبوت کے طریقے پر ہو۔ دائرۃ المعارف اسلام کے مطابق:

"خلافت راشدہ مذہبی نصب العین کے ساتھ سیاسی حالات کو ہم آہنگ کرنے کی کامیاب ترین کوشش کا نام ہے۔"

مینارۂ روشنی

خلافت راشدہ کو ہم مکمل ترین اسلامی نظام حکومت کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ یہ نظامِ حکومت قرآن و سنت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ اس نظام میں عدل و انصاف، مساوات، عوام کی فلاح و بہبود، خدمتِ خلق، امن و سلامتی، حق پسندی، راست بازی، خدا ترسی اور تقویٰ و پرہیز گاری کے اعلیٰ ترین معیار پیش کئے گئے۔ یہ دور بلاشبہ ہر دور کے لیے مینارۂ روشنی اور مشعل راہ ہے۔ تشکیل پاکستان کا مقصد اسلامی نظام حکومت کا قیام تھا۔ ہم نے خدا و خلق کے سامنے یہی عہد کیا تھا۔ اس عہد کی تکمیل ہمارا اولین فریضہ ہے۔ آج بھی ہم خلافت راشدہ کو اپنے لیے مشعل راہ بنا کر اپنے اُلجھے ہوئے مسائل کو بہترین انداز میں حل کر سکتے ہیں اور پاکستان کو ایک عظیم ترین اسلامی مملکت کی صورت میں جلوہ گر کر سکتے ہیں۔ اگلے صفحات میں اس دورِ سعید کا تذکرہ اسی توقع اور امید کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

خلیفۂ اوّل

امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سالھ تا ۱۳ھ بمطابق ۶۳۲ء تا ۶۳۴ء

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ (التوبۃ : ۴۰)

ترجمہ: (اس وقت) دو (ہی شخص تھے جن) میں (ایک ابوبکرؓ تھے) دوسرے (خود رسول اللہؐ)، جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس   صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس (اقبالؔ)

ابتدائی حالات و انتخابِ خلافت

سوال: حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ابتدائی حالات اور انتخابِ خلافت پر تفصیل سے روشنی ڈالیئے۔

جواب:

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ابتدائی حالات

ابتدائی حالات

خلیفہ اوّل تاریخ میں ابوبکر صدیقؓ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کا نام عبداللہ، لقب صدیق و عتیق تھا اور کنیت ابوبکر تھی۔ علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ان کو پاکیزہ خصلتوں میں ابتکار (پیش پیش ہونے) کی وجہ سے ابوبکر کہا جاتا تھا۔ جاہلیت ہی میں وہ اس نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں آپ کا نام عبدالکعبہ تھا۔ آپ خاندان قریش کی شاخ بنو تمیم سے تھے۔ چھٹی پشت میں جاکر شجرہ نبی اکرمؐ کے نسب سے جا ملتا ہے۔ آپ کے والد کا نام عثمان (کنیت ابو قحافہ) والدہ کا نام سلمیٰ اور کنیت ام الخیر تھی اور دونوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

نبوت سے قبل بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی دوست تھے یہ ۱۸ سال کی عمر سے حضورؐ کی صحبت میں بیٹھتے تھے جبکہ حضورؐ کی عمر مبارک ۲۰ سال تھی۔ مکہ میں کوئی دو آدمی ایسے نہ تھے جن کا مزاج، عادات، خصائل اور اخلاق ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ

ہوں جتنے حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے تھے۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ بڑے ذی وجاہت اور رؤسائے قوم میں سے ایک رئیس تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اپنے اخلاق کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جاہلیت میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ قریش نے دیت کے معاملات ان کے سپرد کر رکھے تھے۔

عربوں کی تاریخ اور انساب کے معاملہ میں قریش کے لوگ سب سے زیادہ ان کے علم پر اعتماد کرتے تھے ان کا اخلاقی اثر نہ صرف قریش میں، بلکہ آس پاس کے قبائل تک بھی تھا۔ عام لوگوں میں ان کی دانائی اور معاملہ فہمی مشہور تھی۔ آپ ابتدا ہی سے سلیم الفطرت تھے۔ اسی زمانے سے لوگوں پر آپ کے حُسنِ خلق راست بازی اور متانت وسنجیدگی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اور شرفائے مکہ میں آپ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ (ماخوذ از رحمت اللعالمین، جلد ۲ ص ۱۸۸ وغیرہ)

قبولِ اسلام

حضرت ابوبکرؓ کے متعلق زرقانی نے شرحِ مواہب میں لکھا ہے کہ وہ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں حضرت حکیم کی لونڈی ان کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ آپ کی پھوپھی آج کہہ رہی تھیں کہ ان کے شوہر حضرت موسیٰؑ کی طرح نبی ہیں جنہیں اللہ نے بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور یہ معلوم کرتے ہی کہ اس لونڈی کا بیان صحیح تھا، بلا تامل ایمان لے آئے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ میں نے جس کے سامنے بھی اسلام پیش کیا، اس نے کچھ نہ کچھ تردد کیا اور سوچا، مگر ابوبکرؓ سے جونہی میں نے اس کا ذکر کیا، انہوں نے کوئی تردد نہ کیا اور تسلیم کرنے میں ذرا سی دیر بھی نہیں لگائی۔ گویا اپنی سلیم الفطرتی کے باعث انہیں اسی کی جستجو اور طلب تھی۔

خدمتِ اسلام

آپ ایمان لائے تو سامانِ تجارت کے علاوہ چالیس ہزار درہم نقد آپ کے پاس تھے، وہ سب حضورؐ کی خدمت اور اسلام کی اشاعت میں خرچ کر دیئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ بھی اسلام کی دعوت وتبلیغ میں حضورؐ کا ساتھ دینے لگے۔ اور بہترین مبلغ ثابت ہوئے۔ اس راہ میں جس قدر مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا، انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ جن لوگوں نے خاص طور پر آپ کی کوشش سے اسلام قبول کیا، ان میں حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ بن وقاص اور حضرت ابوعبیدہؓ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بہت سے غلام جو کمزور اور بے بس تھے، ایمان لے آئے تھے جس کی وجہ سے ان کے مشرک مالک انہیں بہت تکلیفیں دیتے تھے۔ آپؓ نے انہیں خرید کر آزاد کیا حضرت بلالؓ ان میں سرِفہرست ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد نے (جو اس وقت مشرک تھے) اعتراض کیا

کہ "بیٹا! اگر تم کمزور غلاموں کی بجائے مضبوط اور جوان غلاموں کو آزاد کراؤ تو وہ تمہارے لیے قوتِ بازو بن سکتے ہیں۔" آپؓ نے جواب دیا کہ: اباجان! میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے۔" اسلام لانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنوائی۔ یہ پہلی مسجد تھی جو مکہ مکرمہ میں بنائی گئی۔ یہاں بیٹھ کر آپ قرآنی آیات کی تلاوت کرتے اور اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے۔

حُبِّ رسولؐ

ایک روز حضور اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ دارارقم سے نکل کر مسجد حرام تشریف لے گئے۔ وہاں یکایک حضرت ابوبکرؓ نے اٹھ کر تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دی۔ یہ اعلانیہ دعوتِ اسلام کا پہلا موقع تھا۔ مشرکین یہ تقریر سنتے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ پر ٹوٹ پڑے اور انہیں اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے آخر ان کے قبیلے کے لوگ کفار سے چھڑا کر ان کے گھر لے گئے۔ وہ شام تک بے سدھ پڑے رہے جب ہوش آیا تو ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ رسول اللہؐ کا کیا حال ہے؟ ان کی والدہ اور قبیلے کے لوگ حیران ہو کر کہتے کہ تم اپنا تو خیال کرو۔ لیکن آپؓ بار بار حضورؐ کے بارے میں پوچھتے تھے۔ آخر بڑی مشکل سے آپ کو حضورؐ کی خیریت کی اطلاع دی گئی تو بولے کہ مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو۔ چنانچہ انہیں اسی حالت میں سہارا دے کر دارارقم میں حضورؐ کی خدمت میں لے جایا گیا تو انہیں سکون حاصل ہوا۔ حضورؐ پر ان کی حال دیکھ کر رقت طاری ہو گئی اور انہیں دعائے خیر دی۔

ہجرت مدینہ

جب کفار مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے کچھ مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو قبیلہ قارہ کے ایک رئیس نے انہیں روک لیا اور اپنی پناہ میں مکہ واپس لے آیا۔ وہاں آپ نے اپنی بنائی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے مشرکین کی عورتیں اور بچے متاثر ہونے لگے۔ اس پر قریش کے سردار گھبرا گئے۔ ان کے کہنے پر اس رئیس نے آپ پر کچھ پابندی لگانی چاہی تو آپ نے اس کی پناہ واپس کر دی اور قریش بدستور ظلم و ستم ڈھانے لگے۔

اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحیِ الٰہی کے ذریعے مکے سے ہجرت کر کے مدینے جانے کا حکم ہوا تو حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت میں اپنی ہم رکابی اور رفاقت کے لیے صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کو منتخب فرمایا۔ یہ بہت بڑا اعزاز و شرف تھا جو آپ کو عطا ہوا۔ اس سفر میں جتنی مالی اور جانی خدمت حضرت صدیق اکبرؓ نے کی اور جس بے مثال ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا

عشق و محبت کی داستانوں میں کوئی واقعہ اس سے بڑھ کر نہیں۔ آپ کے اس شرف پر حضرت عمر فاروقؓ بھی رشک کرتے تھے کہ "کاش ابو بکرؓ میری عمر بھر کی نیکیاں لے لیں اور ہجرت میں حضورؐ کی رفاقت کا ثواب مجھے دے دیں۔"

صدیق کا لقب

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج ہوئی تو سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی تصدیق کی۔ کفارِ مکہ اور خاص طور پر ابو جہل نے آپؓ سے کہا "کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ بات بھی سچ مانو گے کہ وہ بیت المقدس گئے، وہاں سے آسمانوں پر تشریف لے گئے، وہاں کے عجائب و غرائب دیکھے، پھر لوٹ آئے اور اتنا بڑا سفر رات کے ایک مختصر سے حصے میں طے کیا۔" حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا "ہم ان کی ہر بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ جبرائیل امینؑ آسمانوں کے اوپر سے ابھی آئے اور ابھی واپس گئے۔" مطلب یہ کہ جب جبرائیلؑ کی آمد و رفت چشم زدن میں ہم مان چکے تو حضور اقدسؐ کے جسم کی لطافت تو جبرائیلؑ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے؟" اس پر کفار کے منہ لٹک گئے اور دربارِ رسالت سے معراج کی اس تصدیق کے صلے میں حضرت ابوبکرؓ کو "صدیق" کا لقب عطا ہوا۔

غزوات میں شرکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک میں حق و باطل کے درمیان جتنے معرکے ہوئے، سب میں آپ حضور اکرمؐ کے دوش بدوش رہے۔ آپ حضورؐ کے مشیرِ خاص تھے۔ آپ نے کسی موقع پر جانی و مالی قربانیوں سے دریغ نہ کیا۔ غزوۂ بدر میں حضور اکرمؐ کی پاسبانی اور مشاورت کی خدمت انجام دی۔ ہمیشہ جاں نثاری، بہادری اور سرفروشی کے جوہر دکھاتے۔ غزوۂ احد اور غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں کے لشکر میں افراتفری پھیل گئی تھی تو آپ ان جاں نثاروں میں تھے جو حضورؐ کے گرد گھیرا ڈال کر پروانہ وار فدا ہو رہے تھے۔ جنگِ تبوک کے موقع پر آپ اپنے گھر کی ہر چیز لے آئے اور حضورؐ کے قدموں میں نثار کر دی۔ بقولِ علامہ اقبالؒ

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

امارتِ حج اور امامتِ نماز

۹ھ میں جب حج فرض ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے نائب کی حیثیت سے آپ کو امیرِ حج بنا کر مکہ روانہ کیا۔ پھر حجۃ الوداع میں بھی آپ حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ جب حضورؐ وصال سے قبل اس قدر بیمار ہو گئے کہ آسانی سے چلنے پھرنے اور مسجد میں تشریف لانے کے قابل نہ رہے تو حضورؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کی امامتِ نماز کے فرائض ادا کریں۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا، جس کے حق دار حضورؐ کی نظرِ مبارک میں اس وقت آپ ہی تھے۔ امامت کا یہ حکم واضح

طور پر مسلمانوں کی امارت کی نشاندہی کرتا ہے، کیونکہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وصالِ نبویؐ پر اُمت کی رہنمائی

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ سانحہ پوری امت کے لیے قیامت کی گھڑی کی طرح تھا۔ حضرت عثمانِ غنیؓ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا، حضرت علی المرتضیٰؓ شدتِ غم سے بے ہوش ہو گئے۔ کئی صحابہؓ نے جنگل کی راہ لی اور حضرت عمر فاروقؓ کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ تلوار کھینچ کر کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا کہ "جو یہ کہے گا کہ حضورؐ کا وصال ہو گیا، میں اس کی گردن اڑا دوں گا"۔ ان حالات میں صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت تھی جو مسلمانوں کی تسلی اور رہنمائی کا ذریعہ بنی۔ اس وقت مسلمانوں کو جمع کر کے آپ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"لوگو! تم میں سے جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا، وہ جان لے کہ بتحقیق اللہ زندہ ہے، اس پر کبھی موت نہیں آ سکتی، اور اگر (بالفرض) کوئی شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو وہ جان لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے۔"

پھر یہ آیتِ قرآنی تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝ (آلِ عمران: ۱۴۴)

ترجمہ: "اور نہیں ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مگر اللہ کے رسول۔ جن سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ سو اگر آپؐ کا وصال ہو جائے یا آپؐ شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو شخص الٹے پاؤں پھرے گا، وہ اللہ کو ذرا برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو انعام دے گا۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ خطبہ سن کر لوگوں کے غم و اضطراب میں کمی ہو گئی اور سب کو یقین ہو گیا کہ حضورؐ واقعی اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کو یوں محسوس ہوا کہ یہ آیت قرآنی گویا ابھی نازل ہوئی ہے۔

انتخابِ خلافت

سقیفہ بنی ساعدہ اور بیعتِ خلافت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی

زندگی میں کسی کو بھی اپنا نائب یا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ کام جمہور مسلمانوں کی پسند اور انتخاب پر چھوڑ گئے تھے۔ اگرچہ وصال کے وقت جب حضورؐ میں نقل و حرکت کی طاقت نہ رہی تو اس وقت آپؐ نے نبوت کا سب سے بڑا منصب یعنی مسجدِ نبوی کی امامت کا شرف حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کو عطا فرمایا، جو درحقیقت آپؐ کی طرف سے جانشینی کی طرف اشارہ تھا، لیکن اسلام کا نظام چونکہ شوریٰ پر ہے، اس لیے آپؐ اپنی جانب سے کسی کو اپنا جانشین نامزد کر کے اس اصول کو توڑنا نہ چاہتے تھے، اسی لیے صراحت کے ساتھ کسی کو جانشین نامزد نہیں فرمایا اس سے بڑھ کر یہ کہ حضور اکرمؐ کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم و تربیت نے آپؐ کے جانشینوں میں ایسی صحیح بصیرت اور قوتِ فیصلہ پیدا کر دی تھی کہ آپؐ کے بعد اسلامی نظام کے قیام میں کسی غلطی کا امکان باقی نہ رہ گیا تھا، اس لیے آپؐ نے آئندہ کے بارے میں تصریح سے سکوت فرمایا۔

بہر حال حضور اکرمؐ کے وصال کے فوراً بعد خلافت و جانشینی کا نازک مسئلہ چھڑ گیا۔ لیکن اکابر صحابہ کرامؓ نے اجتماعی طور پر اس مسئلے کو خوش اسلوبی کے ساتھ حل کر لیا۔ مدینے کے انصار ان دنوں دو حصوں میں منقسم تھے۔ اوس اور خزرج۔ خزرج اپنی تعداد کے اعتبار سے زیادہ تھے حضرت سعد بن عبادہؓ ان کے سردار تھے، جن کا مکان مدینہ منورہ کے بازار کے نزدیک تھا۔ اس مکان کے پاس اٹھنے بیٹھنے اور باہم مشورت کے لیے ایک سائبان بنا ہوا تھا، جسے سقیفہ بنی ساعدہ کہا جاتا تھا۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کی خبر پھیلی تو انصار کے کچھ لوگ اس جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے اپنے قبیلوں میں سے کسی شخص کو امیر منتخب کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں عام لوگوں کی نگاہِ انتخاب حضرت سعد بن عبادہؓ ہی کی طرف تھی، حضرت سعدؓ نے اس اجتماع میں انصار کی اسلامی خدمات بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت انصار کے سوا اور کسی کا حق نہیں۔" اس پر حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا "آپ نے جو کچھ کہا، بجا اور درست ہے"، ایک اور انصاری بولے، "لیکن اگر مہاجرین نہ مانے اور انہوں نے کہا کہ وہ رسول اللہؐ کے رشتہ دار ہیں تو انہیں ہم کیا جواب دیں گے؟" اس پر ایک اور انصاری بولے "اگر یہ بات ہے تو ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے ہو جائے"، لیکن اس تجویز کو مناسب خیال نہ کیا گیا۔

اکابر مہاجرین کی شمولیت

یہ لوگ اسی بحث و گفتگو میں مشغول تھے کہ یہ خبر مہاجرین کو بھی پہنچ گئی۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ فوراً حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کو ساتھ لیکر سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے، انصار منصب خلافت کے لیے اپنے حقوق و فضائل گنوا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں روک لیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت وقار، سنجیدگی اور حکمت عملی کے ساتھ تقریر فرمائی۔

صدیق اکبرؓ کی تقریر

لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ وہ ہمیں توحید کا سبق دے۔ اس سے قبل لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اہل عرب کو اپنے باپ دادا کا دین چھوڑنا ناگوار گزرا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس شرف کے لیے اس قوم کے بعض لوگوں کو مخصوص فرمایا، جنہوں نے اسلام قبول کیا اور کفار کی تکالیف میں حضورؐ کا ساتھ دیا۔ تمام روئے زمین میں سب سے پہلے عبادت کرنے والے یہی تھے اور حضورؐ پر ایمان میں بھی انہیں سبقت ملی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے تمہارے فضائل و مناقب سے انکار ہے۔ حقیقتاً تم ہی لوگوں نے مسلمانوں کو پناہ دی۔ اے انصار! ہمیں تمہاری خدمات اور اسلام کی خاطر قربانیوں سے انکار نہیں لیکن اہل عرب سوائے قریش کے کسی کی اطاعت نہیں کریں گے۔ پھر اوس و خزرج میں قدیمی رنجش کی وجہ سے دونوں کا کسی ایک قبیلے کے امیر پر کبھی اتفاق نہ ہو سکے گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ قریش امیر ہوں اور تم وزیر اور وہ تمہارے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کریں۔"

صحابہ کرامؓ میں بحث و تمحیص

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا لیکن ابھی اس مسئلے پر کچھ اختلاف رائے موجود تھا اور اس بات کا خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ اس موقع پر حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح نے کہا:

"اے انصار! تم نے سب سے پہلے اسلام کو مدد دی، اب اسے خراب کرنے میں تم ہی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔"

یہ سن کر قبیلہ خزرج کے ایک فرد حضرت بشیرؓ بن سعد انصاری نے کھڑے ہو کر کہا:

"دیکھو! ہم نے اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ خدا کی رضا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے لیے تھیں۔ یہ مناسب نہیں کہ ہم ان کی بنا پر لوگوں پر اپنا حق جتائیں۔ خدا ہم کو اس کا اجر دے گا۔ دیکھو! حضور اکرمؐ قریش ہی سے تھے، اس لیے ان کی خلافت کے زیادہ حقدار ان کے ہم قوم ہیں۔"

اس تقریر کا حاضرین پر بڑا مفید اثر ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

"یہ عمرؓ اور ابو عبیدہؓ ہیں تم ان دونوں میں سے جسے پسند کرو، اسے اپنا امیر مقرر کر لو۔"

حضرت عمر فاروقؓ کا فیصلہ کن اقدام

اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے بڑی بے باکی اور جرأت سے کام

لیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اس تجویز پر حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا:

"آپ مہاجرین میں سب سے افضل ہیں۔ آپ غار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفیق اور نماز پڑھانے میں آپ کے قائم مقام رہے ہیں۔ ایسا کون ہے جو آپ پر مقدم ہو اور آپ کی موجودگی میں خلافت کا حق دار ہو؟"

اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، اس کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت بشیر بن سعد انصاریؓ نے بھی آپ کی بیعت کر لی۔ یہ دیکھ کر تمام مجمع بیعت کے لیے ٹوٹ پڑا۔ اس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے فہم و تدبر اور دانشمندی سے مسلمان ایک بہت بڑے فتنے اور خطرے سے بچ گئے۔

بیعتِ عام

یہ بیعت خاصہ تھی۔ اگلے دن مدینہ منورہ کے تمام مسلمان مسجد نبویؐ میں جمع ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اعلان کیا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد خدا کی کتاب ہمارے لیے چراغِ منزل ہے اگر اس پر قائم رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ خدا نے ہمیں بہترین امیر عطا فرما دیا ہے۔ یہ آپؐ کے پرانے دوست اور رفیق غار ہیں۔ اٹھو اور ان کی بیعت کرو۔"

اس پر اور بہت سے لوگوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت کر کے انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا۔ یہ بیعتِ عامہ تھی اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کا مسئلہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔

نوعیتِ انتخاب

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا انتخاب ٹھیک اسلامی طریقے کے مطابق امت کے باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کا نام پیش کیا، جسے سب نے پسند کیا۔ آپ کی خدمات اور صفاتِ عالیہ سب پر واضح تھیں، اس لیے بلا اختلاف سب نے برضا و رغبت آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ چونکہ اس وقت مدینہ منورہ کے اہل الرائے اصحاب ہی پورے ملک میں نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے سارے ملک میں آپ کو امیر تسلیم کر لیا گیا۔ عربوں کا قدیم سے ہی یہی رواج چلا آ رہا تھا کہ وہ اپنے قبیلے کا سردار اسے منتخب کرتے تھے جو سن رسیدہ، تجربہ کار، بہادر، صاحب الرائے اور عقل و فہم میں ممتاز ہو۔ یہ تمام صفات حضرت ابو بکر صدیقؓ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ تمام صحابہ کرامؓ میں عمر رسیدہ اور آزمودہ کار تھے، ہر دلعزیز تھے، حلم و بردباری، استقلال و استقامت، فہم و فراست، معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر میں ممتاز تھے۔ آپ صحیح معنوں میں عاشقِ رسولؐ، محرم اسرارِ نبوت، مزاج شناس رسولؐ اور شریعت کے متبع و تابع تھے اور دین کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ وہی اس نازک موقع پر مسلمانوں

کی صحیح رہنمائی کر سکتے تھے۔ چنانچہ پوری اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ منصب خلافت کے لیے موزوں ترین انسان تھے۔ آپ کے زمانۂ خلافت نے ثابت کر دیا کہ واقعی امت کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔

مشہور انگریز مورخ سرولیم میور لکھتا ہے کہ "حضرت ابو بکر صدیق" کا زمانہ خلافت اگرچہ بہت ہی مختصر تھا، لیکن بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں کوئی ایسا نہیں جو ایمان و عمل میں ابو بکرؓ سے بالاتر ہو۔" بقول ڈاکٹر اندری سرویہ "آپ منصبِ خلافت کے لیے موزوں ترین انسان تھے۔"

علامہ شبلی نعمانیؒ کی رائے

حقیقت یہ ہے کہ اس نازک وقت (انتخاب خلافت) میں حضرت عمرؓ نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں، ان میں گو بعض بے اعتدالیاں پائی جاتی ہوں، لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ انہی بے اعتدالیوں نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا۔ اگر یہ اختلافات بڑھ جاتے تو اسی وقت جماعت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا اور وہی خانہ جنگیاں برپا ہو جاتیں جو آگے چل کر جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہؓ میں واقع ہوئیں۔ (الفاروق)

حضرت علی المرتضیٰؓ کی بیعت

حضرت علی المرتضیٰؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت داری اور اپنے اعلیٰ اوصاف کی بناء پر حضورؐ کی جانشینی کا استحقاق رکھتے تھے۔ بیعت عام کے بعد کچھ دنوں تک حضرت علی المرتضیٰؓ اور آپ کے ساتھ بعض اور صحابہؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت میں توقف کیا۔ حضرت ابو بکرؓ کے استفسار پر آپ نے خود اس توقف کا جو سبب بیان فرمایا وہ یہ ہے:

"میں آپ کی امارت ناپسند نہیں کرتا، لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک قرآن نہ جمع کر لوں گا اس وقت تک نماز کے سوا اپنی چادر تک نہ اوڑھوں گا۔"

حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی وفات کے بعد آپ نے بھی بیعت کر لی اور حضرت ابو بکرؓ کے فضائل کا اعتراف فرمایا اور آپ کے مشیر رہے۔ (تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین ندوی)

خطبۂ خلافت

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو مسجد نبویؐ میں عام بیعت کے بعد آپ نے مندرجہ ذیل خطبۂ خلافت ارشاد فرمایا۔

"لوگو! میں آپ پر حکمران بنایا گیا ہوں، حالانکہ میں آپ کا سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں لیا ہے نہ میں چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کی بجائے یہ مجھے ملے، نہ میں نے کبھی خدا سے اس کے لیے دعا کی، نہ میرے

دل میں کبھی اس کی حرص پیدا ہوئی۔ میں نے تو اسے بادلِ نخواستہ اس لیے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں فتنۂ اختلاف اور عرب میں فتنۂ ارتداد برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

میرے لیے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بارِ عظیم ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے جس کے اٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے، اِلّا یہ کہ اللہ ہی میری مدد فرماتے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بار اٹھالے۔ اب بھی اگر آپ چاہیں تو اصحابِ رسول اللہؐ میں سے کسی اور کو اس کام کے لیے چن لیں۔ میری بیعت آپ کے راستے میں حائل نہ ہوگی۔

آپ لوگ اگر مجھے رسول اللہؐ کے معیار پر جانچیں گے اور مجھ سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضورؐ سے آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا، کیونکہ آپؐ شیطان سے محفوظ تھے اور آپؐ پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجئے۔ اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجئے۔

سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمہارے درمیان جو کمزور ہے، وہ میرے نزدیک طاقتور ہے، یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں، اگر خدا چاہے۔ اور تم میں سے جو طاقتور ہے، وہ میرے نزدیک کمزور ہے، یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں، اگر خدا چاہے۔

کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کر دے اور کسی قوم میں فحاشی پھیل جاتے اور اللہ اس کو عام مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔

میری اطاعت کرو، جب تک میں اللہ اور رسولؐ کا مطیع رہوں اور اگر میں اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر نہیں ہے۔ میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔"

(ابنِ ہشام)

خطبہ کی اہمیت

یہ خطبۂ خلافت مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع ہے اور دنیا میں پہلی اسلامی جمہوریت کے سیاسی منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں اس کے اہم نکات بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔ اسلامی ریاست کا امیر مسلمانوں کی عام مرضی اور مشورے سے منتخب ہونا چاہیئے۔

۲۔ امارت کے حصول کے لیے نہ کوئی خواہش کرے اور نہ کوشش۔

۳۔ امارت کا منصب ایک عظیم ذمہ داری سمجھا جائے اور اسے خدا کی طرف سے امانت سمجھا جائے۔

۴۔ امیر کی اطاعت و اعانت ٹھیک اور نیک کاموں میں کی جائے اور غلط کاموں میں اس کی اطاعت نہ کی جائے اور اس کا محاسبہ کیا جائے۔

۵۔ امیر کی نظر میں امیر اور غریب، چھوٹے اور بڑے مساوی حقوق کے مالک ہوں اور سب کے

ساتھ انصاف کیا جائے۔

۶۔ اللہ کی راہ میں جہاد جاری رکھا جائے، یہی فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے۔

۷۔ بدکاری و فحاشی کو روکا جائے تاکہ خدا کی طرف سے ذلت و عذاب مسلط نہ ہو۔

۸۔ امیر اللہ اور رسول ؐ کا مکمل طور پر مطیع و فرمانبردار ہو۔

۹۔ اسلامی حکومت کا فرض عوام کی فلاح و بہبود ہے اور عوام کو امیر سے تعاون کرنا چاہیئے۔

خلیفۃ الرسول کا لقب

بیعت عامہ کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے امیر کو کیا لقب دیا جائے۔ اس سلسلے میں کئی تجاویز پیش کی گئیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ امیر کو "خلیفۃ اللہ" کے لقب سے پکارا جائے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے فرمایا کہ مجھے خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ "خلیفۃ الرسول" کہا جائے، کیونکہ میں حضورؐ کا نائب اور جانشین ہوں، خطبہ دیتے وقت آپ ہمیشہ منبر کی دوسری سیڑھی پر کھڑے ہوتے تھے اور تیسری سیڑھی پر کھڑا ہونا آدابِ رسولؐ کے منافی تصور کرتے تھے۔

ابتدائی مشکلات اور دینی خدمات و کارنامے

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن (اقبالؒ)

سوال: حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو خلافت سنبھالنے کے بعد کیا مشکلات پیش آئیں اور ان پر کیسے قابو پایا؟ نیز آپ کی دینی خدمات اور کارنامے بیان کیجئے۔

جواب: (۱) **حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی ابتدائی مشکلات و مسائل**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے مسند خلافت سنبھالی تو عرب کے ریگزاروں سے ارتداد اور بغاوت کے سوتے ابل پڑے۔ مدینہ منورہ، مکہ معظمہ اور طائف کے قبائل کے سوا عرب میں تقریباً ہر جگہ کسی نہ کسی رنگ میں حکومتِ مدینہ کے خلاف بغاوت ہو گئی اور بہت سے بدوی قبائل اسلام سے منحرف ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور کئی جھوٹے مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ امت کے لیے بہت آزمائش کا وقت تھا۔ اسلام کی کشتی ڈگمگا رہی تھی۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور صحابہ کرامؓ کے اشتراک و تعاون سے اسلام کی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

(ب) فتنوں کے اسباب

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں جتنے فتنے اٹھے، ان کے کئی اسباب تھے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں :۔

۱۔ وصالِ نبویؐ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو کچھ لوگوں نے خیال کیا کہ زبردست پیغمبرانہ شخصیت تو رخصت ہو گئی، اس لیے اب اسلام کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔ ان لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ اسلام کا انکار کر دیں اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کریں۔ بقول فلپ ہٹی "نبیؐ کی وفات نے ان کے لیے پرزور انکار کا ایک بہانہ پیدا کر دیا۔"

۲۔ خود مختار اور آزادانہ طبیعت

عرب قبائل زمانہ قدیم سے خود مختار اور طبعاً آزادی پسند تھے۔ وہ کسی مرکزی حکومت کے تحت منظم زندگی گزارنے کے عادی نہ تھے۔ جب عرب میں اسلام کو فروغ و غلبہ حاصل ہوا تو اس نے قدیم قبائلی نظام کی جگہ مدینہ منورہ کی مرکزی حکومت قائم کی اور تمام قبائل کو مرکز کے تحت منظم کیا۔ عرب قبائل اسے اپنی آزادی اور خود مختاری کے منافی سمجھتے تھے۔ بالخصوص وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کو محکومی کی علامت سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے موقع پاتے ہی علمِ بغاوت بلند کر دیا اور وہ اسلام سے منحرف ہو گئے۔

۳۔ ایمانی کمزوری

بہت سے قبائل کو اسلام قبول کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور اسلامی تعلیمات نے ان کے دلوں میں پوری طرح گھر نہیں کیا تھا۔ پھر مرکزِ اسلام سے دوری کے باعث وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکے تھے۔ ایمان کی اس کمزوری نے ان کو ارتداد پر آمادہ کر دیا اور پھر جب نئے مدعیانِ نبوت نے انہیں اخلاقی قواعد و ضوابط سے آزاد کیا اور سبز باغ دکھلائے تو عام قبائل ان کے فریب میں آ گئے اور قدیم جاہلیت کی طرف لوٹ گئے۔

۴۔ سیاسی اتحاد کا فقدان

عربوں کی اکثریت خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھی جو مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ غیر متمدن اور غیر منظم تھے آمد و رفت کے ذرائع و وسائل کمیاب اور دشوار تھے۔ ان حالات میں سب قبائل کو مختصر عرصہ میں ایک منظم و مرکزی حکومت کے تحت لانا مشکل تھا۔ یہ سیاسی عدمِ اتحاد بھی ان کی سرکشی اور ارتداد کا سبب بنا۔

۵۔ جھوٹی نبوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثال کامیابی و عظمت دیکھ کر کئی خود ساختہ جھوٹے نبی اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بڑے مکار، دغاباز اور شعبدہ باز

تھے۔ انہوں نے نبوت کو بھی کاروبار سمجھ لیا اور مکر و فریب سے اکثر لوگوں کو اپنے دام میں پھنسا لیا اور قبائلی عصبیت کو ہوا دی۔ بعض قبائل کے سردار حضور اکرمؐ کے قریشی ہونے کے سبب رقابت رکھتے تھے اس لیے انہوں نے نبوت کا دعویٰ کر کے جھوٹی عزت بنانی چاہی۔ چنانچہ مسیلمہ کذاب کے پیروکار کہا کرتے تھے:

"ہم جانتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا ہے لیکن قبیلہ ربیعہ کا جھوٹا نبی، قبیلہ قریش کے سچے نبیؐ سے ہمیں زیادہ محبوب ہے۔"

۶۔ غیروں کی سازش عرب میں یہود و نصاریٰ بھی آباد تھے جو اسلام کے شدید مخالف تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کی زبردست مخالفت کے باوجود اسلام ترقی کر رہا ہے تو وہ پیچ و تاب کھانے لگے۔ چونکہ وہ کھلم کھلا مخالفت و مقابلہ کی سکت نہ رکھتے تھے اس لیے خفیہ سازشوں کے ذریعے وہ مسلمانوں سے انتقام لینے پر اتر آئے۔ چنانچہ انہوں نے بھی فتنہ پردازوں کی خوب سرپرستی کی۔

۷۔ غیر ملکی امداد ان فتنہ پردازوں کو بالعموم اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کو بالخصوص غیر ملکی امداد بھی میسر آگئی، جس سے ان کی خوب حوصلہ افزائی ہوئی۔ بحرین کے باغیوں کی کسریٰ ایران نے امداد و سرپرستی کی، جبکہ سجاح بنت حارث مدعیہ تغلب کی امداد شمالی عرب کے عیسائی حکمرانوں نے کی۔ نیز اس کے پیروکاروں کی اکثریت بنو تغلب کے عیسائیوں کی تھی۔

مسائل و مشکلات

۱۔ لشکرِ اسامہؓ کی مہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے وصال سے چند روز پہلے جنگ موتہ کے شہداء کا انتقام لینے کے لیے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا تھا اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے سترہ سالہ نوجوان بیٹے حضرت اسامہؓ کو اس کا سپہ سالار مقرر فرمایا تھا، لیکن بعد میں حضورؐ کی سخت علالت اور وصال کے باعث اس لشکر کی روانگی میں دیر ہوگئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ بنتے ہی اس لشکر کی روانگی کا حکم دے دیا۔ دیگر صحابہؓ نے اس فیصلے کو ناپسند کیا۔ ان کے خیال میں ایسے نازک حالات میں اتنے بڑے لشکر کا مدینہ منورہ سے باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس رائے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ ان کی نظر میں اندرونی شورش بیرونی خطرے کے مقابلے میں، زیادہ اہم نہ تھی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے پرعزم لہجہ میں فرمایا:

"اگر مجھے علم ہو کہ اس لشکر کی روانگی کے بعد میں شہر میں اکیلا رہ جاؤں گا اور درندے آ کر مجھے پھاڑ کھائیں گے تب بھی میں اس لشکر کو ضرور بھیجوں گا۔"

اس پر صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کے ذریعہ سے کہلوایا کہ اگر اس لشکر کو ضرور ہی بھیجنا ہے تو اس کا سپہ سالار کسی عمر رسیدہ اور تجربہ کار شخص کو مقرر کر دیں۔ اس کے جواب میں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا:

"عمرؓ! تم مجھے ایسے شخص کو بدل دینے کے لیے کہتے ہو، جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا۔"

حضرت عمرؓ یہ جواب سن کر پھر نہیں بولے۔ وہ جان گئے کہ صدیق اکبرؓ کس قدر مزاج شناس رسولؐ اور پیروی رسولؐ کے پابند تھے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ خود اس لشکر کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ چلے۔ حضرت اسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے اور خود خلیفہ ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ بھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں یا مجھے اترنے کی اجازت دے دیں۔ فرمایا: "نہ میں سوار ہوں گا اور نہ تم گھوڑے سے اترو گے۔ اگر میں ایک گھڑی راہِ خدا میں اپنے قدم خاک آلود کر لوں تو میری شان میں کیا فرق پڑے گا۔"

چنانچہ یہ لشکر اس شان سے روانہ ہوا کہ بڑے بڑے عمر رسیدہ اور تجربہ کار صحابہؓ حضرت اسامہؓ کی کمان میں چل رہے تھے۔ اس لشکر میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے خود حضرت اسامہؓ سے اجازت لے کر حضرت عمرؓ کو مدینہ منورہ میں اپنے ساتھ رکھ لیا۔

اہم ہدایات

لشکر کو روانہ کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ نے یوں خطاب فرمایا:

"میں تم کو دس باتوں کی نصیحت کرتا ہوں: (۱) خیانت نہ کرنا (۲) مال نہ چھپانا (۳) بیوفائی سے بچنا۔ ۴۔ کسی لاش کو نہ بگاڑنا ۵۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا۔ ۶۔ کھجور اور پھل لانے والے درخت نہ کاٹنا ۷۔ کھانے کے علاوہ کسی اور غرض سے جانوروں کو ذبح نہ کرنا ۸۔ تم کو وہ لوگ ملیں گے جو دنیا چھوڑ کر خانقاہوں وغیرہ میں عبادت کے لیے بیٹھے ہیں، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا ۹۔ تم ایسے لوگوں سے بھی ملو گے، جو تمہارے پاس طرح طرح کے کھانے لے کر آئیں گے، جب تم ان میں سے کھاؤ تو اللہ کا نام لے کر کھانا۔ ۱۰۔ تم کو ایک جماعت ایسی بھی ملے گی، جن کے سروں میں شیطان نے گھونسلا بنا رکھا ہے، ان کو تلواروں سے کاٹ دینا۔

"اب خدا کے نام پر روانہ ہو جاؤ۔ وہ تمہیں دشمنوں کے نیزوں اور طاعون سے بچائے۔"

حضرت اسامہؓ نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا:

"وہی کرو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہے۔ یاد رہے کہ آپ کے حکم کی ذرا بھی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔

اثرات

یہ لشکر یکم ربیع الاول ۱۱ھ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوا اور شام کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی مہم کو کامیابی سے مکمل کیا اور چالیس روز کے بعد فاتحانہ انداز میں مدینے واپس آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لشکر کی روانگی نہایت مفید ثابت ہوئی، کیونکہ اس سے اسلام کے مخالفوں اور دشمنوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر مسلمانوں میں قوت نہ ہوتی تو وہ ایسے وقت میں غسانیوں کے مقابلے میں اتنا بڑا لشکر کیسے بھیج سکتے تھے۔ نیز اس لشکر کی کامیابی اور ظفر مندی نے یہ ثابت کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتخاب کتنا درست تھا اور حضرت ابوبکرؓ اس لشکر کو روانہ کرتے میں کس قدر حق بجانب تھے۔ نیز صحابہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فراست کے قائل ہو گئے اور اطاعتِ رسولؐ پر ان کا یقین مزید مستحکم ہو گیا۔

۲۔ جھوٹے نبیوں کا خاتمہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں جھوٹے مدعیانِ نبوت پیدا ہو گئے تھے۔ مسیلمہ کذاب نے اسی زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا، لیکن آپؐ کی زندگی میں وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آپؐ کے وصال کے بعد اور بہت سے حوصلہ مندوں کے دماغ میں یہ سودا سما گیا۔ وہ نبوت کو بھی ایک دنیاوی کاروبار سمجھ بیٹھے اور شیطان کے فریب میں آکر اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ نبوت سراسر عطیہ خداوندی ہے۔ ان جھوٹے نبیوں میں حسب ذیل افراد کے نام مشہور ہیں:

اسود عنسی۔ طلیحہ بن خویلد۔ مسیلمہ کذاب۔ سجاح بنت الحارث۔

ذیل میں ان کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ اسود عنسی

اسود یمن کے قبیلے بنو عنس کا سردار تھا۔ اس کا اصلی نام عبہلہ تھا، لیکن سیاہ فام ہونے کی وجہ سے "اسود عنسی" کہلاتا تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں نبوت کا اعلان کر دیا تھا اور اس کے اپنے قبیلے کے علاوہ کچھ اور گمراہ قبائل بھی اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ قیس اس کا امیر فوج تھا۔ یہ لوگ ایک عظیم لشکر مرتب کر کے مسلمانوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اتفاق سے اسود کو قیس پر کچھ شک ہو گیا اور اس نے اسے معزول کر دینا چاہا، لیکن قیس کو اسود کی بیوی نے سب کچھ بتا دیا اور دونوں نے مل کر اسود کے قتل کی سازش کی۔ پھر ایک رات جب اسود شراب کے نشے میں دھت سویا ہوا تھا تو قیس کے آدمیوں نے اسے قتل کر دیا۔ جب یہ خبر مدینہ منورہ پہنچی تو اسی شام کو حضورؐ نے وصال فرمایا۔ گویا آپؐ نے اپنی زندگی

ہی میں اسود کے انجام کے بارے میں سن لیا۔

۲۔ طلیحہ بن خویلد

یہ قبیلہ بنو اسد کا سردار تھا۔ اس کا اصلی نام طلحہ تھا مسلمان حقارت سے اسے طلیحہ کہتے تھے۔ ایک مرتبہ صحرا سے گزرتے ہوئے اس نے پانی کی نشاندہی کی اور اسے اپنا معجزہ قرار دے کر نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ قبیلہ اسد کے علاوہ بنو غطفان اور بنو طے کے بعض لوگ بھی اس پر ایمان لے آئے۔ اس نے نماز کو ساقط کر دیا اور زکوٰۃ کو بھی ختم کر دیا جس پر منکرین زکوٰۃ اس کے پیروکار بن گئے۔ ان دنوں عرب کے مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدیؓ بن حاتم مسلمان ہو کر مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ سے اجازت لے کر اپنے قبیلے طے کے پاس گئے اور انہیں سمجھا بجھا کر دوبارہ سیدھے راستے پر لے آئے۔ اس کے علاوہ حضرت خالدؓ بن ولید کی کمان میں ایک دستہ اسے سزا دینے کے لیے آیا۔ طلیحہ کے لشکر نے شکست کھائی اور وہ بھاگ کر شام کی طرف چلا گیا، جہاں نہایت ذلت اور گمنامی کی حالت میں کچھ دنوں بعد مر گیا۔

۳۔ سجاح بنت الحارث

بنو تغلب کی ایک عورت سجاح کو بھی نبوت کا شوق چرایا اس نے سوچا کہ نبوت ہمیشہ مردوں ہی کو ملتی رہی ہے، عورت کو یہ منصب کیوں نہیں ملتا، چنانچہ اس نے جب اپنی نبوت کا اعلان کیا تو اس کے اپنے قبیلے کے اکثر آزاد خیال نوجوانوں نے اس کا ساتھ دیا۔ انہی دنوں مسلیمہ کذاب بھی اپنی نبوت کے کاروبار کو وسعت دینا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے کسی نہ کسی طرح سجاح کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ سجاح نے سوچا کہ اس طرح ہم دونوں کی طاقت بڑھ سکتی ہے، چنانچہ وہ مسلیمہ کے دھوکے میں آگئی اور اس سے شادی کر لی۔ پھر جب حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں مسلیمہ کذاب شکست کھا کر مارا گیا تو اس کا یہ انجام دیکھ کر سجاح بصرے کی طرف بھاگ گئی اور کچھ روز بعد وہاں مر گئی۔

۴۔ مسلیمہ کذاب

جھوٹے نبیوں میں مسلیمہ کذاب اپنی فوجی قوت کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر تھا۔ اس کے ساتھ چالیس ہزار جنگجو سپاہی تھے۔ مسلیمہ کا اصلی نام مسلمہ بن حبیب تھا، اس نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا اور حضورؐ کو یہ مضحکہ خیز پیش کش کی کہ مجھے کارِ نبوت میں برابر کا شریک کر لیں۔ حضورؐ نے اس کے باطل دعوے کو مسترد فرماتے ہوئے اسے کذاب کا لقب دیا یعنی سب سے بڑا جھوٹا۔ اس کا تعلق قبیلہ بنو حنیفہ سے تھا اور یہ قبیلہ یمامہ (نجد) کا سب سے طاقتور قبیلہ تھا۔ مسلیمہ کذاب مسجع ومقفیٰ عربی کی مہمل عبارتیں بھی تراش کر لوگوں کو سناتا تھا اور کہتا تھا، یہ وحی ہے۔ اس نے شراب اور زنا کی حلت کا اعلان کر دیا، چنانچہ سارے نفس پرست لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ادھر جب اس نے

سجاح بنت حارث مدعیہ نبوت سے شادی رچالی تو اس کی ظاہری شان و شوکت میں اور بھی اضافہ ہوا۔

حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل اور حضرت شرجیلؓ بن حسنہ کو الگ الگ لشکر دے کر بھیجا اور ان کو ہدایت کی کہ جب تک تمہارے لشکر اکٹھے نہ ہو جائیں، تم میں سے کوئی جنگ نہ چھیڑے لیکن حضرت عکرمہؓ نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے جاتے ہی جنگ چھیڑ دی تاکہ فتح کا سہرا انہی کے سر رہے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا، کئی مسلمان شہید ہو گئے اور دشمن کے حوصلے بلند ہو گئے۔

حضرت ابو بکرؓ نے جب یہ خبر سنی تو سخت ناراض ہوئے اور حضرت خالدؓ بن ولید کو فوراً اور لشکر دے کر ان کے پیچھے بھیجا۔ حضرت خالدؓ نے میدانِ جنگ میں پہنچ کر فوج کو نئے سرے سے مرتب کیا اور نہایت منظم طریقے سے دشمن کے مقابلے پر آئے۔ یمامہ کے مقام پر حق و باطل کا معرکہ برپا ہوا۔ مسیلمہ کذاب کے جنگجو سپاہی بڑی بے جگری سے لڑے، لیکن مسلمانوں نے اس انتہائی سخت جنگ میں حوصلہ نہ ہارا۔ دشمن کے دس ہزار سپاہی مارے گئے اور مسیلمہ خود حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی حبشی کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس طرح نبوت کا یہ بہت خطرناک جھوٹا دعویدار اپنے عبرتناک انجام کو پہنچا۔ تاریخ میں یہ معرکہ جنگ یمامہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں بہت سے حافظ قرآن بھی شہید ہو گئے تھے اس لیے یہ جنگ مسلمانوں کے لیے بھی نقصان دہ تھی لیکن مسیلمہ ایسے طاقتور اور خطرناک دشمن کا خاتمہ اسلام کی بہت بڑی فتح اور کامیابی تھی۔

۳۔ منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد

کچھ قبائل ایسے تھے جو یوں تو اسلام اور مرکزی حکومت کے مطیع اور فرمانبردار تھے لیکن انہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ منکرینِ زکوٰۃ کا مسئلہ بڑا نازک تھا اور اکثر صحابہ کبارؓ بھی تذبذب میں تھے۔ ان کی رائے تھی کہ جو لوگ توحید و رسالت پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے خلاف محض انکارِ زکوٰۃ کے باعث جہاد نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا بھی یہی مشورہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا:

"عمرؓ! تم جاہلیت میں بڑے بہادر اور جابر تھے، اسلام لا کر اس قدر بزدل کیوں بن گئے ہو؟ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ دین مکمل ہو چکا۔ کیا میری زندگی میں اس میں کمی کی جا سکتی ہے؟ خدا کی قسم! اگر کوئی قبیلہ زکوٰۃ کے مال میں سے اونٹ کی رسی کے برابر بھی کوئی چیز روکے گا، جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہدِ مبارک میں دیا کرتے تھے تو میں

ان سے ضرور جہاد کروں گا۔"

حضرت عمرؓ کا کہنا ہے کہ یہ بات سن کر میں سمجھ گیا کہ خدا نے ابو بکرؓ کے دل کو حق کے لیے کھول رکھا ہے۔ چنانچہ منکرین زکوٰۃ کے خلاف اجتماعی طور پر فیصلے کے تحت جہاد شروع کر دیا گیا۔

حضرت ابو بکرؓ کچھ دیر تک لشکر اسامہؓ کی واپسی کے منتظر رہے، جب یہ فوج آ گئی تو حضرت اسامہؓ اور ان کی اس فوج کو مدینے چھوڑ کر خود صحابہؓ کی جمعیت لے کر مرتدین سے مقابلہ کے لیے نکلے اور منکرین زکوٰۃ قبائل پر حملہ کر کے انہیں شکست دی۔ اس وقت تک حضرت اسامہؓ کا لشکر تازہ دم ہو چکا تھا ان کو ساتھ لے کر پھر مدینے سے نکلے اور وسیع اور منظم طور پر ان لوگوں کے خلاف جہاد کیا۔ آپ نے گیارہ امیروں کو گیارہ جھنڈے دیکر فوج کے دستے ان میں تقسیم کر دیئے اور ان امیروں کے ذریعے مرتدین کو دوبارہ اسلام میں شمولیت کی دعوت دی اور اعلان کیا کہ جس بستی کے لوگ اذان پکاریں ان سے جنگ نہ کی جائے۔

چنانچہ اس جہاد کے نتیجہ میں چند دنوں ہی میں تمام قبائل راہِ راست پر آ گئے اور زکوٰۃ ادا کر دی۔ بعض نے خود مدینہ منورہ حاضر ہو کر بیت المال میں زکوٰۃ جمع کروائی۔ مالک بن نویرہ بنو تمیم کا سردار تھا۔ یہ بھی منکرین زکوٰۃ میں سے تھا۔ اس کے خلاف حضرت خالدؓ بن ولید نے لشکر کشی کی اور اسے شکست دی اور مالک اپنے ساتھیوں سمیت قتل ہوا، اس طرح انکارِ زکوٰۃ کا فتنہ دب گیا۔ اگر صدیق اکبرؓ اس موقع پر کمزوری کا مظاہرہ کرتے تو بعد میں دیگر قبائل نماز اور روزہ سے بھی منحرف ہو جاتے اور پھر دین کا شیرازہ منتشر ہو جاتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بجا طور پر فرمایا:

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہم ہلاکت کے قریب پہنچ چکے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت حضرت ابو بکرؓ کی صورت میں نمودار ہوتی۔ انہوں نے ہمیں دشمنانِ دین کے خلاف جمع کر کے صف آرا کیا۔ اگر ابو بکرؓ نہ ہوتے تو ہم مٹ چکے ہوتے۔"

۴۔ فتنۂ ارتداد کا خاتمہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد کچھ اور قبائل بھی مرتد ہو گئے۔ ان میں بحرین، حضرموت، عمان، مہرہ، یمن اور کندہ کے باشندے پیش پیش تھے۔ چنانچہ جھوٹے نبیوں کے خاتمے کے بعد ان مرتد سرداروں کی طرف توجہ کی جو حضور اکرمؐ کی زندگی میں مسلمان ہو چکے تھے۔ لیکن آپؐ کے بعد پھر مرتد ہو گئے، یہ سردار اپنی اپنی جگہ آزاد حکمران بن بیٹھے۔ چنانچہ نعمان بن منذر نے بحرین میں، لقیط بن مالک نے عمان میں اور متعدد سردارانِ قبائل نے کندہ کے علاقہ میں مرتد ہو کر خودسری کا اعلان کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت علاءؓ بن حضرمی، حضرت حذیفہؓ بن محصن اور حضرت زیادؓ بن لبید کو علی الترتیب ان سرداروں کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ حضرت علاءؓ نے نعمان

کا خاتمہ کیا، حضرت حذیفہؓ نے لقیط کو قتل کیا اور حضرت زیدؓ نے کندہ کے ملک عنق کو زیر کر کے قبائل کو اسلام پر قائم کیا۔

(د) کارنامے و دینی خدمات

ا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا بے پناہ عزم و استقلال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد جن فتنوں نے سر اٹھایا، اس کا مختصر جائزہ پیش کیا جا چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سب کا حال پڑھنے کے بعد اس بات کا برملا اقرار و اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکرؓ کو ایسا عزم و استقلال عطا فرمایا تھا، جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنی قوت ایمانی، تدبر، فہم و فراست، بصیرت اور بے پناہ جرأت اور استقامت سے ہر معرکہ سر کر لیا اور اسلام کو اتنے بڑے خطرے سے صاف بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ گویا اسلام کی کشتی جو بحرِ زخار میں ڈگمگا رہی تھی، اسے بخیر و خوبی سلامتی کے کنارے پر لگا دیا۔ اگر ایسے حالات میں ذرا نرمی یا مصلحت اندیشی سے کام لیا جاتا تو اسلام کی تعلیمات ہمیشہ کے لیے رخنوں کا شکار ہو کر رہ جاتیں اور دین ایک بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتا۔ مقامِ حیرت ہے کہ جن موقعوں پر حضرت عمرؓ ایسے بہادر اور جری انسان بھی مصلحت بینی کا مشورہ دیتے ہیں، وہاں حضرت ابو بکرؓ کس جرأت مندی اور بے جگری و بے باکی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

فتنۂ ارتداد میں حالات کس قدر نازک اور سنگین تھے، اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

"فتنۂ ارتداد میں مسلمان بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح تھے جو موسم سرما کی سرد رات کو زور کی بارش میں گھر سے باہر جنگل میں اپنے چرواہے کے بغیر رہ جائے۔"

لیکن ایک سال کا زمانہ بھی نہ گذرا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ نے اس فتنے کو ختم کر دیا۔ اس سے نہ صرف ان کے عزمِ راسخ کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان کے نظامِ عسکری کی بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اس صورتِ حال میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس وقت اللہ تعالیٰ کی مدد کے بعد حضرت ابو بکرؓ کا جذبۂ استقلال نہ ہوتا تو آج مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ کو اسلام کے بانی ثانی کی حیثیت حاصل ہے۔

سر ولیم میور لکھتا ہے: "آپ نے تمام مخالفتوں اور شورشوں کو ختم کر کے اسلام کو از سرِ نو

مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔"

بقول ایچ جی ویلز: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے تبلیغ واشاعت اسلام میں اس عزم وثبات کا مظاہرہ کیا، جس کے سامنے پہاڑ بھی ٹل جاتے ہیں۔"

انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے مطابق: "حضرت ابوبکرؓ کے اولین اہم کاموں میں پیغمبر اسلام کے مذہبی ورثے کو محفوظ رکھنا اور مدینے میں سیاسی ہم آہنگی پیدا کرنا شامل تھا ______ مرتدین کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کے جرنیلوں کی کامیاب مہموں سے اسلام پہلی مرتبہ پورے عرب میں ایک فوجی اور سیاسی قوت بن گیا۔"

۲۔ جمع وتدوینِ قرآن

عہدِ صدیقی کا ایک عظیم الشان کارنامہ کتابی شکل میں قرآن مجید کی تدوین ہے۔ اس کا باعث یہ ہوا کہ عہد صدیقی کی جنگوں خصوصاً یمامہ کی جنگ میں حفاظِ قرآن صحابہؓ کی بڑی تعداد شہید ہوگئی۔ اس وقت حضرت عمرؓ کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر حفاظِ قرآن کی شہادت کا یہ سلسلہ قائم رہا تو قرآن مجید کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے جمع قرآن کی درخواست کی۔ حضرت ابوبکرؓ کو یہ عذر ہوا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، اسے میں کس طرح کروں؟" لیکن حضرت عمرؓ کے پیہم اصرار سے آپ کے ذہن میں بھی اس کی مصلحت آگئی۔ چنانچہ آپ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو جو عہد نبویؐ میں کاتبِ وحی تھے، قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ ان کو بھی اس بارِ گراں کے اٹھانے میں تامل ہوا، لیکن پھر ان کے ذہن میں بھی یہ بات آگئی۔ چنانچہ انہوں نے مختلف لکھے ہوئے اجزاء اور حفاظِ قرآن کے سینوں سے قرآن کی سورتوں کو جمع کرکے کتابی صورت میں مدون کر دیا۔

قرآن مجید مکمل طور پر ۲۳ برس تک حسبِ ضرورت نازل ہوتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے مختلف کاتبانِ وحی سے ہدایتِ خداوندی کے مطابق آیتوں اور سورتوں کے لحاظ سے ترتیب دے کر لکھوا لیتے تھے۔ چنانچہ اس کے مختلف حصے پتھر کے ہموار ٹکڑوں، اونٹ کی چوڑی ہڈیوں، ہرن کی کھال اور درختوں کی چھال وغیرہ پر لکھے ہوئے تھے۔ لیکن اس کی موجودہ ترتیب اس وقت بھی اسی طرح حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھی۔

حضرت زیدؓ نے اس سلسلے میں جو طریق کار اپنایا وہ بالکل موجودہ زمانے کی طرح علمی اور تحقیقی تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اعلان فرما دیا تھا کہ جس شخص کو قرآن حکیم یاد ہو یا اس نے اس کا کوئی حصہ لکھا ہو وہ حضرت زیدؓ کو اس کی اطلاع دے۔ چنانچہ ہڈیوں، پتھروں، پتوں اور چمڑوں وغیرہ پر لکھی ہوئی آیتیں اور سورتیں جمع ہو جانے کے بعد حضرت زیدؓ نے ان کی مکمل چھان بین اور پڑتال کی۔ وہ مکمل تحقیق کے بغیر

کچھ قبول نہ کرتے تھے۔ آخر ایک طویل عرصے کی محنت و کوشش کے بعد یہ کام اس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا کہ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت زیدؓ نے قرآن مجید کے جو اوراق مکمل صورت میں یکجا کیے وہ پہلے حضرت ابو بکرؓ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ اور ان کے بعد ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رہے، جہاں سے حضرت عثمانؓ نے بعد میں نقول کرائیں۔ اس سلسلے میں حضرت عثمانؓ نے یہ کام کیا کہ انہوں نے تمام قبائل کو ایک قرأت پر جمع کر دیا ہے۔ کیونکہ ان کے زمانے میں اسلام دور دور تک پھیل چکا تھا اور بعض دوسرے قبائل اور نومسلم کچھ اس انداز سے تلاوت کرتے تھے، جس سے کہ معانی بدل جانے کا ڈر تھا۔

لیکن دراصل قرآن کی جمع و تدوین حضرت ابو بکرؓ کا کارنامہ ہے اور اس قدر عظیم اور شاندار کارنامہ ہے کہ اگر اس طرف توجہ نہ دی جاتی تو ان کی دیگر اسلامی خدمات زیادہ فائدہ مند نہ ہوتیں۔ یقیناً ملتِ اسلامیہ پر ان کا یہ اس قدر عظیم احسان ہے۔ جس سے مسلمان قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ دیگر کارنامے سرانجام نہ بھی دیتے تو ان کا تنہا یہی کارنامہ اس قدر عظمت و اہمیت کا حامل ہے کہ تاریخِ اسلام میں ان کو وہی مقام و مرتبہ حاصل ہوتا، جو آج بھی ہے۔ ؎

اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار   قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں (اقبالؔ)

۳۔ تمام عرب کا پھر سے ایک مملکت بن جانا

عربوں کی اکثریت خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھی جو مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور ملک میں کوئی مضبوط مرکزی حکومت قائم نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۱ھ میں جو سیاسی نظام مدینہ منورہ میں مرتب فرمایا، اس کی رو سے مدینہ ایک شہری مملکت بن گیا تھا۔ حضورؐ کے وصال سے پہلے تمام عرب ایک قوم کی صورت میں منظم ہو چکے تھے اور مدینہ ایک قومی مملکت کا دارالخلافہ بن گیا تھا۔ فتنۂ ارتداد میں عرب قوم کی تنظیم اور مرکزیت کا شیرازہ بکھر گیا تھا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس فتنہ کا قلع قمع کر کے عرب قبائل کو پھر سے ایک مرکز پر جمع کر دیا اور انہیں ایک قوم کی صورت میں منظم کر دیا۔ اس طرح آپ کی ذات اتحاد بین المسلمین بن گئی اور عرب میں پھر سے ایک مضبوط و مستحکم مملکت قائم ہو گئی۔

۴۔ فتوحات کا آغاز

حضرت ابو بکرؓ نے مضبوط خارجہ پالیسی اختیار کی اور روم و ایران کی حکومتوں کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا، جو دنیا پر غلبہ پائے ہوئے تھیں اور مسلمانوں کے داخلی معاملات میں دخل دے رہی تھیں اور اسلامی حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف

تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جنہوں نے دنیا بھر کو انگشت بدنداں کر دیا۔ کسریٰ کی عظیم سلطنت چند سالوں میں مسلمانوں کے قدموں میں تھی اور قیصر روم کو ایشیائی علاقوں کو خیرباد کہہ کر قسطنطنیہ واپس جانا پڑا اور مسلمان دنیا کی سب سے عظیم طاقت قرار پائے۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا (اقبالؒ)

نظامِ خلافتِ راشدہ کی بنیاد

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نہ صرف یہ کہ عظیم فتوحات حاصل کیں بلکہ علیٰ منہاج النبوۃ (طریق نبوت کی طرز پر) دنیا کے سامنے ایک مثالی اسلامی نظام مملکت کا نمونہ پیش کر دیا۔ عہدِ نبویؐ تک حکومت کی رہنمائی خدا اور رسولؐ کیا کرتے تھے اب خلافتِ راشدہ میں صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت سے حکومت چلانے کی تفصیلات طے کرنی شروع کیں اور اس طرح سے پہلی اسلامی جمہوریہ وجود میں آئی، جس میں ذمیوں اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کا بھی پورا پورا تحفظ کیا جاتا تھا۔

زمانہ منتظر ہے پھر نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی
(حفیظ جالندھری)

عہدِ صدیقی کی فتوحات

(قیصر و کسریٰ سے ٹکراؤ اور عراق و شام کی فتح)

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی (اقبالؒ)

سوال: حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں اسلامی فتوحات کا حال بیان کیجئے؟

جواب:

عہدِ صدیقی کی فتوحات

۱۔ پس منظر

داخلی خلفشار اور بغاوتوں کو فرو کرنے اور ملکی انتظامات مستحکم کرنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیرونی دشمنوں کی جانب توجہ کی۔ اس زمانہ میں جزیرۃ العرب

دو عظیم الشان مخالف سلطنتوں کے درمیان گھرا ہوا تھا، یعنی ایران و روم۔ سلطنت ایران کا تاجدار کسریٰ کہلاتا تھا اور سلطنتِ روم کا فرمانروا قیصر کہلاتا تھا۔ گویا یہ چکی کے دو پاٹ تھے، جن کے درمیان عرب قوم پس کر رہ گئی تھی۔ اسلام سے قبل عرب ایک منتشر اور مفلوک الحال قوم تھی اور وہ روم و ایران کے مقابلے پر آنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی، لیکن اسلام آیا تو اس نے صدیوں کے محکوم و مغلوب عربوں کو آن کی آن میں ایسی زبردست قوت عطا کر دی کہ نہ صرف وہ خود ناقابلِ تسخیر ہو گئے بلکہ انہوں نے کچھ ہی عرصے میں قیصر و کسریٰ کی زبردست سلطنتوں کو درہم برہم کر دیا۔

۲۔ ایرانی سلطنت

ایران میں ساسانی خاندان کی بڑی طاقتور حکومت تھی۔ ساسانی اور ان کی رعایا مذہباً مجوسی یعنی آتش پرست تھے۔ سلطنت ایران کی سرحدیں ایک طرف تو افغانستان اور ترکستان سے ملتی تھیں اور دوسری طرف رومی سلطنت تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اہلِ ایران بڑے تہذیب یافتہ اور متمدن تھے۔ انہوں نے صنعت و حرفت اور علوم و فنون میں بہت ترقی کر لی تھی۔ ایران اور عرب کی درمیانی سرحد پر عراق میں ایک چھوٹی سی ریاست آباد تھی، جس کا دارالحکومت حیرہ تھا۔ یہ ریاست عربوں اور ایرانیوں کے درمیان حد فاصل کا کام دیتی تھی۔ ان دونوں قوموں کے باہم تعلقات قبل اسلام بھی ناخوشگوار تھے۔ اہلِ ایران اپنے آپ کو مہذب اور متمدن سمجھتے ہوئے عربوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاہِ ایران خسرو پرویز کو دعوتِ اسلام کا مکتوب بھیجا تو اس نے نامۂ مبارک چاک کر دیا تھا اور اپنے صوبۂ یمن کے حکمران باذان کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کو گرفتار کر کے دربارِ ایران میں بھیج دے۔ (معاذ اللہ)۔ حضورؐ نے جب یہ سنا تو فرمایا: اس کی سلطنت اسی طرح پارہ پارہ ہو جائے گی۔ چنانچہ خسرو پرویز اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا اور پھر بہت جلد ایران مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔

۳۔ رومی سلطنت

روم بھی ایک بڑی وسیع اور طاقتور سلطنت تھی۔ یہاں کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا۔ رومی مذہباً عیسائی تھے۔ یہاں کے حکمران بازنطینی خاندان سے تھے۔ جزیرہ نمائے بلقان، ایشیائے کوچک، لبنان، شام، فلسطین اور عرب کے سرحدی قبائل، مصر، طرابلس، الجزائر اور بحیرۂ روم کے جزیرے سلطنت روم میں شامل تھے۔ رومیوں نے عرب کی سرحد پر بنو غسان کی ایک چھوٹی سی نئی ریاست قائم کر کے اپنی حمایت میں لے رکھی تھی۔ یہ حکومت گو ایرانیوں کی طرح عربوں کو حقیر نہ سمجھتی تھی، لیکن دونوں قوموں میں قدیم رقابت چلی آ رہی تھی۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں حبشہ کے عیسائیوں نے رومیوں ہی کے اشارہ سے عربوں کی مرکزیت توڑنے کے لیے "کعبۂ یمانی" بنایا تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد شام کے رومی مسلمانوں کے سخت دشمن ہو گئے تھے۔ چنانچہ

سنہ ۶ھ میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک سفیر حضرت دحیہ کلبیؓ کو جو قیصر کے پاس اسلام کا دعوت نامہ لے کر گئے تھے، لوٹ لیا تھا اور دوسرے سفیر اسلام حضرت حارثؓ بن عمیر ازدی کو سلطنت روم کے باجگزار کے عہد میں لشکرِ اسامہ کا معاملہ پیش آیا۔ گویا ٹکراؤ کا آغاز ہو چکا تھا۔

۴۔ فتح عراق وشام

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں دو اہم ممالک عراق و شام فتح ہوئے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، عراق، سلطنت ایران کا حصہ اور شام سلطنت روم کے زیر اثر تھا۔ ذیل میں ان دونوں فتوحات کا حال الگ الگ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) فتح عراق

۱۔ عراق پر عرب قبائل کا حملہ

مسلسل انقلابات و حوادث کے باعث ایرانی سلطنت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس وقت ایران کے زیر اثر عرب قبائل کو جو ہمیشہ ایرانیوں کے تختۂ مشق بنتے چلے آرہے تھے، بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ عراق کے عرب قبیلہ وائل کے دو سرداروں مثنیٰ بن حارثہ شیبانی اور سوید عجلی نے کچھ فوج کے ساتھ حیرہ اور ابلہ پر حملہ کر دیا۔ گو ایرانی حکومت پر زوال طاری ہو چکا تھا۔ تاہم اس گئی گذری حالت میں بھی اس کو زیر کرنا عرب سرداروں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے مثنیٰ شیبانی نے مدینہ جا کر حضرت ابو بکر صدیقؓ سے باقاعدہ عراق پر حملہ کی اجازت حاصل کی۔ مثنیٰ خود مسلمان تھے، لیکن ان کا قبیلہ عیسائی تھا۔ مدینہ سے واپس ہو کر انہوں نے سب سے پہلے اپنے قبیلہ کو مسلمان بنایا۔ اس کے بعد اسے لے کر عراق روانہ ہوئے۔

حضرت خالدؓ سیف اللہ میدانِ جنگ میں

۲۔ جنگ سلاسل

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جنگی مشیروں سے مشورے کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید کو مثنیٰ شیبانی کے ساتھ بھیج کر ایران سے مقابلہ شروع کر دیا۔ ان دنوں ایران کے تخت پر یزدگرد حکمران تھا۔ اس وقت حضرت خالدؓ مسیلمہ کذاب کا خاتمہ کر چکے تھے۔ آپ جلد اپنا لشکر لے کر کاظمہ کے میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔ عراق کا حکمران ہرمز خود مقابلے پر آیا۔ حضرت خالدؓ نے اسے مقابلے کے لیے پکارا۔ ہرمز مقابلے پر آیا اور حضرت خالدؓ نے اسے قتل کر دیا۔ ہرمز کے قتل سے ایرانیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ وہ زیادہ دیر تک اسلامی لشکر کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور شکست کھا

کر بھاگ نکلے۔ ایک ایرانی دستے نے جم کر لڑنے کے خیال سے خود کو زنجیروں میں محصور کر لیا تھا۔ اس لیے اسے جنگ سلاسل (زنجیروں والی جنگ) بھی کہتے ہیں۔ ویسے اسے جنگ کاظمہ کہتے ہیں۔

اس جنگ میں بے پناہ مالِ غنیمت مجاہدین کے ہاتھ آیا۔ حضرت ابوبکرؓ اس فتح پر بہت خوش ہوئے اور آپ نے حضرت خالدؓ کی بہادری کے اعتراف میں انہیں ہرمز کا تاج بخش دیا، جس کی مالیت ایک لاکھ درہم تھی۔ یہاں سے حضرت خالدؓ اپنی فوجوں کو لے کر آگے بڑھے اور اس جگہ قیام فرمایا، جہاں آج کل بصرہ آباد ہے۔

۲۔ جنگ مذار دربارِ ایران کی طرف سے قارن نامی سپہ سالار کی قیادت میں ہرمز کی مدد کے لیے ایک لشکر کثیر بھیجا گیا تھا۔ اس لشکر کو راستے ہی میں ہرمز کے قتل کی اطلاع ملی، چنانچہ قارن نے مذار کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔ حضرت خالدؓ وہیں مقابلے پر آئے۔ کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد ایرانی شکست کھا گئے اور قارن مارا گیا۔ اس جنگ میں تیس ہزار ایرانی اور دو ایرانی شہزادے مارے گئے۔ حضرت خالدؓ نے کچھ عرصہ مذار میں قیام فرمایا۔ مزارعین کو زمینوں پر برقرار رکھا۔ خراج وصول کرنے کے لیے افسر مقرر کئے اور توسیعِ فتوحات کے منصوبے بنائے۔

۳۔ جنگ دلجہ جب شہنشاہِ ایران کو اس شکست کی خبر پہنچی تو اس نے اپنے تجربہ کار سپہ سالار بہمن جادویہ کی سرکردگی میں ایک لشکر گراں روانہ کیا اور اس بار عربوں کے مقابلے کے لیے عرب کے عیسائیوں کو بھی ساتھ بھیجا۔ حضرت خالدؓ کو اس فوج کا علم ہوا تو مقابلے کے لیے آگے بڑھے اور دلجہ میں پہنچ کر تین طرف سے حملے کا انتظام کیا۔ پہلے ایک طرف سے خود بڑھے۔ جب جنگ زوروں پر آگئی تو فوج کا دوسرا حصّہ اور پھر تیسرا حصّہ اچانک میدان میں آگیا۔ ایرانی سمجھے کہ شاید مسلمانوں کو تازہ کمک آرہی ہے۔ وہ اس تدبیر سے گھبرا گئے اور بہت جلد شکست کھا کر میدان سے بھاگ نکلے۔ بہمن بدحواسی سے ایک طرف نکل گیا، اور پیاس کی شدت سے مر گیا۔

۴۔ جنگ الیس قبیلہ بکر کے جن عیسائی عربوں نے ایرانیوں کی مدد کی تھی، وہ اکثر اس جنگ میں مارے گئے۔ اس پر ان کے بہت سے ہم قوم عیسائی جوش میں آکر بہمن کی فوج میں مل گئے تاکہ مسلمانوں سے انتقام لے سکیں۔ بہمن اس وقت شکست کھا کر علاقہ انبار کے نزدیک الیس کے مقام پر اپنا لشکر لیے پڑا تھا۔ حضرت خالدؓ نے وہاں پہنچ کر اس پر حملہ کیا اور اس کی فوج کے کثیر حصّے کا صفایا کر دیا۔

۵۔ جنگ حیرہ: الیس کی جنگ سے فارغ ہو کر اسلامی لشکر نے حیرہ کا محاصرہ

کر لیا۔ اہل حیرہ نے جب یہ دیکھا کہ وہ مسلمانوں سے مقابلے کے قابل نہیں تو انہوں نے صلح کی درخواست کی۔ حضرت خالدؓ نے یہ درخواست مان لی اور ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر مصالحت ہو گئی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کو بہت سے تحفے بھی پیش کیے۔ حضرت خالدؓ نے خلیفہ کی ہدایت کے مطابق ان تحفوں کو بھی جزیے کی رقم میں شمار کر لیا اور عہد نامہ لکھ دیا۔ اس عہد نامے کے بعد دشمنوں کے اور بھی کئی قبیلوں اور جماعتوں نے سالانہ جزیے کے حساب سے مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کر لیے۔ اس طرح جنوبی عراق پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت خالدؓ نے ان علاقوں میں اپنے کارکن مقرر کئے اور ذمیوں کے امن وامان کا مکمل انتظام کر دیا۔

۶۔ فتح انبار

جن دنوں حضرت خالدؓ جنوبی عراق کی ان جنگوں میں مشغول تھے، ان دنوں شمالی عراق میں اسلام کے ایک اور مجاہد حضرت عیاضؓ بن غنم داد شجاعت دے رہے تھے۔ جب حضرت خالدؓ کو ادھر سے ذرا فراغت ملی تو وہ فوراً حضرت عیاضؓ کی مدد کیلئے روانہ ہوئے اور حیرہ میں حضرت قعقاع بن عمرو کو اپنا نائب بنا گئے۔

جب حضرت خالدؓ انبار میں پہنچے تو اس کے باشندے قلعہ گیر ہو گئے۔ اسلامی فوجوں نے ان کو محاصرے میں لے لیا اور ان پر زبردست تیر اندازی کی۔ آخر انہوں نے اس بات پر صلح کر لی کہ خالی گھوڑوں پر سوار ہو کر علاقہ چھوڑ دیں گے اور تمام مال ومتاع سمیت قلعہ مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔ حضرت خالدؓ نے یہ شرط قبول کر لی۔ اس فتح کے بعد ان اطراف کے دیگر سرداروں نے بھی جزیہ دینے پر صلح کر لی۔

۷۔ عین التمر کی تسخیر

حضرت خالدؓ انبار کے معرکوں سے فارغ ہوئے تو انہیں خبر ملی کہ عین التمر کے علاقے میں بہرام کا بیٹا مہران اپنی فوج کے ساتھ خیمہ زن ہے۔ حضرت خالدؓ نے اپنے ایک ساتھی زبرقان بن بدر کو انبار میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود عین التمر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس جنگ میں مہران کے ساتھ عرب کے عیسائی قبیلوں میں سے بنو نمر، بنو تغلب اور بنو ایاز کے کئی جنگجو بھی شامل تھے جو اپنے ایک سردار عقہ بن ابی عقہ کی سرکردگی میں جنگ کے لیے آئے تھے۔ اس موقع پر عقہ نے مہران سے کہا کہ عربوں کے ساتھ جنگ کے لیے عرب ہی زیادہ مناسب ہیں، اس لیے تم ہمیں خالدؓ کے ساتھ مقابلے کے لیے جانے دو۔ مہران بولا: تم سچ کہتے ہو۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔

اس کے بعد مہران خود اپنے قلعے میں مقیم رہا اور عقہ اپنا لشکر لے کر حضرت خالدؓ کے مقابلے پر آیا۔ دونوں لشکروں میں سخت لڑائی ہوئی۔ حضرت خالدؓ نے بڑھ کر عقہ کو گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھی شکست کھا کر قلعے کی طرف بھاگے۔ مہران نے یہ سنا تو قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شکست خوردہ عیسائی

لشکر قلعہ میں پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ ایرانی وہاں سے بھاگ چکے تھے۔ وہ مجبوراً قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ اسلامی لشکر نے اس قلعے کو گھیرے میں لے کر اس فوج کا صفایا کر دیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ کافی مالِ غنیمت آیا۔

۸۔ جنگ دومۃ الجندل

دومۃ الجندل اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے جغرافیائی اور سیاسی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ شہر حیرہ اور عراق کو جانے والی سڑک پر واقع تھا، نیز شام کو بھی یہی راستہ جاتا تھا۔ گویا یہ عراق و شام کی سرحد پر واقع تھا۔ دومۃ الجندل میں عہدِ نبویؐ سے عربی عیسائی قبائل مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔ غزوۂ تبوک اسی سلسلہ میں ہوا تھا اور حضرت خالدؓ نے یہاں کے ایک فرمانروا اکیدر بن عبدالملک کو گرفتار کر کے مطیع بھی بنایا تھا۔ یہ سازشیں بدستور جاری تھیں اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے اس کے سدِّباب کے لیے حضرت عیاضؓ بن غنم کو مامور فرمایا۔ یہ مہم تنہا ان کے بس کی نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے حضرت خالدؓ سے جو قریب ہی موجود تھے، مدد مانگی۔ وہ فوراً پہنچے۔ اکیدر کو ایک مرتبہ حضرت خالدؓ کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے دوسرے فرمانروا جودی وغیرہ کو جنگ سے روکا، مگر جودی نہ مانا۔ اکیدر نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور حضرت عیاضؓ اور حضرت خالدؓ نے دومۃ الجندل کا محاصرہ کر لیا، جودی نے مقابلہ کیا اور شکست کھا کر مارا گیا۔ حضرت خالدؓ نے پھاٹک توڑ کر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ بنی کلب کو ایک مسلمان عاصم نے امان دے دی، جبکہ باقی قبائل تہ تیغ کر دیئے گئے۔

۹۔ جنگ فراض

جب حضرت خالدؓ دومۃ الجندل کی جنگ میں مصروف تھے۔ عرب قبائل نے ایرانیوں کو عراق واپس لینے کے لیے اُبھارا۔ حضرت خالدؓ نے وہاں جا کر فتنوں اور بغاوتوں کو فرو کیا اور فراض کی طرف پیش قدمی کی۔ فراض ایک بے حد اہم مقام تھا۔ یہاں شام، عراق اور جزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں، اس لیے اپنی حفاظت کے لیے رومی بھی ایرانیوں کے ساتھ مل گئے۔ اور ان کی متحدہ افواج فراض میں جمع ہو گئیں۔ حضرت خالدؓ کو ان کے مقابلے کے لیے بہت اہتمام کرنا پڑا اور فراض پہنچ کر ازسرِ نو فوجیں مرتب کیں۔ ایک طرف ایرانی، عرب اور روم کی متحدہ طاقت تھی، دوسری طرف تنہا مسلمان، درمیان میں فرات حائل تھا۔ دشمن غرور کے نشہ میں دریا پار کر کے مقابلے پر آیا۔ زبردست مقابلہ ہوا۔ مسلمان جوشِ جہاد اور جذبۂ سرفروشی کی بدولت فتح یاب ہوئے۔ شکست خوردہ فوجوں کے عقب میں دریا حائل تھا اور سامنے مسلمان تھے، اس لیے انہیں بھاگنے کا بھی راستہ نہ ملا اور قریب قریب کل فوجیں برباد ہو گئیں۔

اس اہم معرکہ کے بعد حضرت خالدؓ جنگ ملتوی کر کے مثنیٰ کو عراق میں چھوڑ کر حج کو چلے گئے۔ حضرت

ابو بکرؓ نے اس کے بارے میں سنا تو ناراض ہوئے اور فرمایا۔ فوج کو اس طرح چھوڑ کر جانا مناسب نہ تھا۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ کو حضرت ابو بکرؓ کا یہ حکم پہنچا کہ اب شام کی طرف جاؤ اور یرموک میں مقیم اسلامی فوج کے ساتھ مل جاؤ۔ چنانچہ اب حضرت خالدؓ دوسری طرف متوجہ ہوئے اور سردست عراق کی مہم رک گئی۔

۱۰۔ فتح عراق کا جائزہ

فاتح عراق حضرت خالدؓ بن ولید عراق میں ایک سال اور دو مہینے رہے ان کے ساتھ کل دس ہزار فوج تھی اور تقریباً اتنے ہی مجاہد دیگر اسلامی سپہ سالاروں کے ساتھ تھے۔ لیکن اس قلیل فوج نے اس قلیل مدت میں جو شاندار کارنامے سرانجام دیئے وہ تاریخ میں بے مثال ہیں۔ یہ حیرت کا مقام ہے کہ حضرت خالدؓ جس معرکے میں بھی شامل ہوئے انہیں کسی موقع پر بھی شکست کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ یقیناً یہ خدا کی خاص مہربانی تھی۔ دربارِ رسالتؐ سے آپ کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا خطاب ملا تھا اور فی الواقع آپ نے اس خطاب کا حق ادا کر دیا۔ پھر آپ نے جو علاقے فتح کئے، ان میں اتنا عمدہ بندوبست کیا کہ لوگ ایرانی حکومت کے مقابلے میں عرب حکومت کو زیادہ پسند کرنے لگے۔ حضرت خالدؓ دشمنوں کے حق میں بجلی تھے۔ وہ دشمن کو سامنے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتے تھے، فوراً کوند کر ان کے سر پر جا پڑتے تھے۔ لیکن فتح کے بعد رعایا کے ساتھ اس قدر نیک برتاؤ کرتے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ فتح عراق میں آپ کی ذات مسلمانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی امداد اور رحمت تھی۔ ؎

تو نے تنہا کفر کی فوجوں میں ہلچل ڈال دی ۔۔۔ تیرا جوشِ عزم تھا بیگانۂ خوف و خطر

(ماہر القادری)

فتح شام

۱۔ فتح شام کی منصوبہ بندی

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے شام کی مہم کے سلسلے میں مندرجہ ذیل چار بڑے سپہ سالار منتخب کئے:

ابو عبیدہ بن الجراح، عمرو بن عاص، یزید بن ابی سفیان، شرجیل بن حسنہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی سرکردگی میں ایک ایک لشکر دیا اور ان کے راستے مقرر کر کے شام کی طرف روانہ کر دیا۔ حضرت ابو عبیدہؓ حمص، عمرو فلسطین، یزید دمشق اور شرجیل اردن کی طرف بھیجے گئے۔ ان چاروں سپہ سالاروں کے ماتحت کل فوج کی تعداد ۳۶ ہزار تھی۔ ان تمام افواج کے سپہ سالارِ اعظم حضرت ابو عبیدہؓ تھے۔

جب اہلِ روم کو اسلامی افواج کی آمد کا پتہ چلا تو انہوں نے مقابلے کے بارے میں سوچا۔ قیصر روم ہرقل ان دنوں حمص میں مقیم تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ اسلامی فوج چار حصوں میں ہے تو اس نے سوچا کہ یہ

فوجیں آپس میں ملنے نہ پائیں اور ہر حصے سے مقابلے کے لیے دوگنا فوج بھیج دی۔

جب مسلمان سپہ سالاروں نے یہ کچھ دیکھا تو خط و کتابت سے آپس میں مشورہ کیا۔ حضرت عمروؓ بن عاص نے کہا، ہم سب کو یکجا ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے خلیفہ سے اجازت لے لی اور سب کے سب یرموک کے میدان میں جمع ہو گئے۔ ہرقل کو اسلامی لشکروں کے ایک جگہ جمع ہونے کی خبر ملی تو اس نے بھی اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ وہ بھی یکجا ہو کر مقابلہ کریں۔

جنگ یرموک

دونوں عظیم لشکر یرموک کے میدانِ جنگ میں پہنچ چکے تھے۔ وہاں رومیوں کے ایک طرف دریا اور پشت پر پہاڑ تھا۔ انہوں نے اپنے لیے اس مقام کو زیادہ محفوظ سمجھا۔ رومی فوج کی کل تعداد دو لاکھ چالیس ہزار تھی۔

اسلامی فوج نے بھی یرموک سے بڑھ کر ان کے سامنے مورچے بنا لیے۔ اب رومی فوج بالکل محصور ہو گئی۔ یہ صورت حال کوئی دو ماہ تک رہی۔ آخر مسلمانوں نے خلیفۂ وقت سے اور امداد مانگ لی چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالدؓ کو لکھا کہ وہ فوراً عراق کی مہم پر مثنیٰ بن حارث کو چھوڑ کر خود شام میں مسلمانوں کی مدد کریں۔ اس پر حضرت خالدؓ فوراً دس ہزار کا لشکر لے کر شام میں مسلمانوں سے آملے۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ حضرت خالدؓ اور رومیوں کا سپہ سالار باہان دونوں ایک ہی وقت میں یرموک پہنچے۔ رومی سپاہی اپنے سپہ سالار پر بہت ناز کرتے تھے۔ ویسے بھی ان کی فوج مسلمانوں سے تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ لیکن اسلامی فوج میں جو جذبۂ جہاد اور جوش شجاعت تھا، وہ رومی فوج میں یکسر ناپید تھا۔

حضرت خالدؓ کا اہم جنگی مشورہ

حضرت خالدؓ جب میدانِ جنگ میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ مسلمان فوج اگرچہ ایک جگہ موجود ہے، لیکن وہ مختلف سپہ سالاروں کے زیرِ ہدایت لڑ رہی ہے تو انہوں نے سپہ سالاروں کو ایک جگہ جمع کیا اور یہ مشورہ دیا:

> "دشمن ایک نظام اور ترتیب کے ساتھ آمادۂ جنگ ہے۔ اس صورت میں ہمارا الگ الگ ہو کر مقابلہ کرنا مفید نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم ایک امیر کے تحت ہو جائیں۔ اگر ہم نے ایک بار مل کر رومیوں کو دھکیل دیا تو پھر برابر ان کو دباتے چلے جائیں گے اور اگر خدانخواستہ انہوں نے ہمیں شکست دے دی تو ہمارا کہیں ٹھکانا نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم سب باری باری امیر ہوں۔ ایک آج، دوسرا کل تیسرا پرسوں اور آج سب فوج کا امیر مجھ کو بنا دو۔"

حضرت خالدؓ کی حکمت عملی

سب لوگوں نے حضرت خالدؓ کی یہ بات مان لی اور حضرت خالدؓ کو امیر بنا لیا۔ آپ نے فوج کو اس طرح مرتب کیا، جیسے پہلے کبھی عربی فوج مرتب نہیں کی گئی تھی۔ انہوں نے کل فوج کو ۳۸ دستوں میں بانٹ دی۔ اٹھارہ دستے درمیان میں ابو عبیدہ کی کمان میں دے دیئے۔ دس دائیں طرف عمرو بن العاص اور شرجیل اور دس دستے بائیں طرف یزید بن ابی سفیان کی سرکردگی میں متعین کر دیئے ہر دستے پر ایک امیر مقرر کیا، جو دائیں بائیں اور درمیانی دستوں کے سپہ سالاروں کے احکام پر اپنے اپنے دستے کو حرکت دیتا تھا ادھر رومیوں نے بھی اپنی فوج کو بہترین طور پر صف آرا کیا تھا۔

گھمسان کی جنگ اور مسلمانوں کی فتح

جب جنگ شروع ہوئی تو حضرت خالدؓ نے قلب کے دونوں بازوؤں کو تیر اندازی کا حکم دیا۔ ان دونوں بازوؤں پر عکرمہ بن ابی جہل اور قعقاع بن عمرو متعین تھے۔ اس کے بعد حملہ شروع کر کے حضرت خالدؓ خود قلبِ لشکر کے ساتھ رومی سواروں اور پیادوں کے درمیان پہنچ گئے۔ پہلے دشمن کے سوار بھاگے مسلمانوں نے انہیں بھاگنے کا موقع دے دیا۔ اس کے بعد اسلامی فوج پیدل دستوں پر ٹوٹ پڑی۔ رومی پیچھے کی طرف پلٹے، لیکن ادھر پہاڑ تھا۔ گھبرا کر دریا کی طرف لوٹے۔ مسلمانوں نے دونوں طرف سے دبایا اور اس طرح ایک لاکھ بیس ہزار رومی صرف دریا میں غرق ہو کر مر گئے۔

یہ جنگ سارا دن اور ساری رات جاری رہی اور جب صبح ہوئی تو حضرت خالدؓ رومی سپہ سالار کے خیمے میں بیٹھے تھے اور میدانِ جنگ رومیوں سے بالکل صاف تھا۔ اس جنگ میں حضرت عکرمہؓ نے بھی بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر خود بھی شہید ہو گئے۔ اس موقع پر شہید ہونے والے مسلمانوں کی کل تعداد تین ہزار تھی۔ اس جنگ میں مسلمان عورتوں نے بھی اپنا الگ دستہ بنا کر رومیوں سے مقابلہ کیا اور کئی رومیوں کو تہ تیغ کیا۔ رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی یہ فتح ایک شاندار فتح تھی۔ اس فتح نے مسلمانوں کے لیے رومی سلطنت کی تسخیر کے دروازے کھول دیئے۔

جب ہرقل نے اس ذلت آمیز شکست کی خبر سنی تو حمص سے چلا گیا اور ملک شام کو مخاطب کر کے کہنے لگا،

"اے شام! تجھے یہ میرا آخری سلام ہے۔"

اہلِ روم نے مسلمانوں کے لشکر کا حال معلوم کرنے کے لیے ایک عرب جاسوس بھیجا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے مسلمانوں کی نسبت یہ الفاظ کہے؛

" وہ لوگ رات کو فرشتے اور دن کو دیو ہیں۔ ان کی راتیں مصلّوں پر اور دن گھوڑوں پر گزرتے ہیں۔ وہ موت کے پیچھے بھاگتے اور موت ان کے آگے بھاگتی ہے جبکہ ہمارے سپاہی

موت کے آگے بھاگتے ہیں اور موت ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ان کے انصاف کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کا شہزادہ بھی چوری کرے تو ہاتھ کاٹ دیتے ہیں اور زنا کرے تو سنگسار کر دیتے ہیں۔"

تبدیلی خلافت ابھی یہ جنگ ہو رہی تھی کہ مدینہ منورہ سے ایک قاصد خط لے کر آیا جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کی خبر تھی۔ اس میں یہ بھی تھا کہ خالدؓ کو سپہ سالاری سے معزول اور ابو عبیدہؓ اور سپہ سالار عام مقرر کیا گیا ہے۔ حضرت خالدؓ نے یہ خط خفیہ طور پر حضرت ابو عبیدہؓ کو دکھایا اور فوج کے اندر بددلی پھیلنے کے ڈر سے جنگ کے دوران میں اسے پوشیدہ رہنے دیا۔ جب فتح حاصل ہوگئی تو اس خط کا اعلان کر دیا اور حضرت ابو عبیدہؓ کو امیر تسلیم کر کے خود پھر ایک معمولی سپاہی کی طرح اسی جذبے سے مصروفِ جہاد رہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے سوا دو سالہ عہد خلافت میں ایرانیوں اور رومیوں پر فتوحات کا سلسلہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی مشہور کتاب "بانگِ درا" میں جنگ یرموک پر ایک نظم لکھی ہے، جس کے دو شعر یوں ہیں:

پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیںؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے

عہدِ صدیقی کا نظامِ حکومت

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
(اقبالؒ)

سوال: حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں قائم کردہ نظامِ حکومت پر مفصل نوٹ لکھیے۔

جواب:

عہدِ صدیقی کا نظامِ حکومت

(۱) انتظامی پالیسی چونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہر کام میں مکمل اتباعِ سنتِ رسولؐ کا خیال رکھتے تھے اور کسی کام میں عہدِ نبویؐ سے ذرا بھر انحراف کرنا پسند نہ کرتے تھے، اس لیے آپ کے عہد خلافت میں جملہ معاملات و امور عہدِ رسالت کے نظام پر قائم رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں کسی نظام کے بدلنے کی بھی زیادہ ضرورت محسوس

نہ ہوئی۔ تمام اہم امور اکابر صحابہؓ کے مشورے سے سرانجام پاتے تھے۔ بقول ابن سعد، جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو حضرت ابوبکرؓ اہل الرائے اور فقیہہ صحابہؓ سے مشورہ کرتے تھے اور مہاجرین و انصار میں سے چند ممتاز صحابہؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت کی مجلس مشورت طلب کرتے تھے۔

۱۔ عرب کی سیاسی وحدت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلھ میں جو سیاسی نظام مدینہ منورہ میں تشکیل دیا تھا، اس کی مدد سے مدینہ ایک شہری مملکت بن گیا تھا۔ حضورؐ کے وصال سے پہلے تمام عرب ایک قوم کی صورت میں منظم ہو چکے تھے اور مدینہ ایک قومی مملکت کا دارالخلافہ بن گیا تھا۔ فتنۂ ارتداد میں عرب قوم کی اس تنظیم کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس فتنہ کا قلع قمع کر کے عرب قبائل کو پھر ایک مرکز پر جمع کر دیا اور انہیں ایک منظم قوم کی صورت میں منظم کر دیا۔ یوں آپ کی ذات اتحاد بین المسلمین کا نشان بن گئی اور عرب میں پھر سے ایک مضبوط و مستحکم مملکت قائم ہو گئی۔ ملک میں مثالی امن و امان قائم ہو گیا اور اسلامی نظام حکومت کی مضبوط بنیاد مساوات، عدل و انصاف، اخوت اور حریت پر رکھی۔

۲۔ انتظامی صوبے

اب تک جزیرۃ العرب کی کوئی سیاسی و انتظامی تقسیم نہ تھی۔ آپ نے انتظامی سہولت کے پیش نظر مدینہ، مکہ، طائف، صنعا، نجران حضرموت، بحرین اور دومۃ الجندل کے صوبے تشکیل دیئے اور ان کے الگ الگ عامل و گورنر مقرر کیے۔

۳۔ حکام کے انتخاب میں احتیاط و ہدایات

آپ حکام کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور حکومت کے عہدوں کے لیے ان ہی بزرگوں کا انتخاب کرتے تھے جو درسگاہِ رسالت کے تربیت یافتہ تھے۔ عہدِ رسالت کے تمام حکام کو ان کے عہدوں پر قائم رکھا۔ چنانچہ مکہ پر عتابؓ بن اسید، طائف پر عثمانؓ بن ابی العاص، صنعاء پر مہاجرؓ بن ابی امیہ اور زبید پر زیادؓ بن لبید حاکم تھے۔ نئے حکام کا انتخاب اسی اصول کے تحت کرتے تھے اور تقرر کے وقت انہیں نہایت مفید ہدایات اور نصیحتیں فرماتے تھے۔ ولید بن عقبہ محصل صدقات کو یہ نصیحت فرمائی:

> "جلوت و خلوت میں خدا کا خوف رکھو۔ جو خدا سے ڈرتا ہے، وہ اس کے لیے ایسی سبیل اور اس کے رزق کا ایسا ذریعہ پیدا کر دیتا ہے جو کسی کے گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ بیشک بندگانِ خدا کی خیر خواہی بہترین تقویٰ ہے۔"

یزید بن ابی سفیانؓ کو شام کی مہم پر جاتے وقت یہ نصیحت فرمائی:

"اے یزید! تمہاری قرابت داریاں ہیں۔ شاید تم ان کو امامت سے فائدہ پہنچاؤ، درحقیقت یہی سب سے بڑا خطرہ ہے، جس سے میں ڈرتا ہوں۔"

۴۔ مالی انتظام عہد صدیقی میں زکوٰۃ، عشر، جزیہ اور غنیمت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے کوئی خزانہ قائم نہ کیا، بلکہ مختلف ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی، اسلامی ضروریات میں صرف کرنے کے بعد جو کچھ بچتا اس کو بلاتفریق آزاد و غلام، ادنیٰ و اعلیٰ، مرد اور عورت، عام مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ آخر عہد خلافت میں بیت المال کے لیے ایک عمارت تعمیر کرائی تھی، لیکن اس میں کوئی رقم جمع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اس کا کوئی محافظ نہ تھا، بس ایک قفل کافی تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ روپیہ تقسیم کر دینے کے بعد بیت المال میں جھاڑو دلوا دیتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وفات کے بعد جب بیت المال کا جائزہ لیا گیا تو اس میں صرف ایک درہم نکلا۔

۵۔ فوجی نظام فوج کا بھی کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا، بلکہ عہد رسالتؐ کی طرح ضرورت کے وقت مسلمان خود ہی جوشِ جہاد میں جمع ہو جاتے تھے۔ البتہ عہد صدیقی میں اتنا اضافہ ہوا کہ ضرورت کے لحاظ سے فوج کی تقسیم قبائل اور دستوں پر کر دی گئی، جن پر الگ الگ سالار ہوتے تھے اور ان سب پر ایک امیر العسکر ہوتا تھا۔ چنانچہ شام کی لشکر کشی میں خالدؓ بن ولید، یزید بن ابی سفیانؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح اور عمروؓ بن العاص کے الگ الگ دستے تھے اور سب کے امیر العسکر حضرت ابوعبیدہؓ تھے۔ فوجوں کو رخصت کرتے وقت ان کی اخلاقی نگہداشت کے لیے مفید ہدایات دیتے تھے۔ چنانچہ شام کے سالاروں سے یہ باتیں ارشاد فرمائیں:۔

"تم ایک ایسی قوم کو پاؤ گے، جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے، ان کو چھوڑ دینا، میں تم کو دس نصیحتیں کرتا ہوں، کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، کھانے کے سوا بکری اور اونٹ کو بے کار ذبح نہ کرنا، نخلستان نہ جلانا، مال غنیمت میں غبن نہ کرنا، بزدلی نہ دکھانا۔"

آج بھی اس سے بہتر فوج کا ضابطۂ اخلاق مرتب نہیں ہوا۔

بیت المال کی آمدنی سے فوجی اخراجات کے لیے ایک رقم الگ نکال لیتے تھے، جس سے اسلحہ اور باربرداری کے جانور خریدتے تھے اور جہاد کے اونٹوں اور گھوڑوں کی پرورش کیلئے بعض چراگاہیں مخصوص کر دی تھیں۔

۶۔ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آنحضر

وقت ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی۔ اس لیے حضرت ابو بکرؓ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ عہدِ رسالت میں ان کے حقوق متعین ہو چکے تھے، عہدِ صدیقی میں بھی ان کو وہی حقوق حاصل رہے اور آپ نے ان کی تجدید و توثیق فرمائی اور نئے ذمیوں کو بھی وہی حقوق عطا فرمائے۔ چنانچہ حیرہ کے عیسائیوں کو معاہدے کی رو سے یہ حقوق دیئے:

"ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ منہدم کئے جائیں اور نہ ان کا ایسا قصر گرایا جائے جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہیں۔ ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہو گی اور تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے۔"

جزیہ کی شرح نہایت آسان تھی اور اس سے بھی بکثرت ذمی مستثنیٰ کر دیئے جاتے تھے چنانچہ حیرہ کے سات ہزار باشندوں میں ایک ہزار بالکل مستثنیٰ تھے اور باقی سے دس دس درہم سالانہ لیا جاتا تھا اور اپاہج اور نادار ذمیوں کی کفالت بیت المال کے ذمے تھی۔

۷۔ تحفظ دین

خلافت کا اصل مقصد تحفظ دین اور اس کے احکام کا قیام و نفاذ ہے۔ اس لیے حضرت ابو بکرؓ تحفظ دین کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ کوئی نئی بات جو عہدِ رسالتؐ میں نہ ہوئی تھی نہ ہونے دیتے تھے۔ گو عہدِ رسالتؐ کے قرب کی وجہ سے اس کی ضرورت کم پیش آئی لیکن جہاں اس کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا تھا، اس کا تدارک فرماتے۔ اس سلسلے میں احتیاط کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کتابی صورت میں تدوینِ قرآن سے محض اس بنا پر تامل تھا کہ آنحضرتؐ نے ایسا نہیں فرمایا۔ اسی طرح احادیث کی روایت میں نہایت چھان بین اور احتیاط سے کام لیتے تھے تحفظ دین کے لیے اکابر صحابہؓ کا محکمہ افتاء قائم تھا۔

۸۔ خارجہ حکمت عملی

حضرت ابو بکرؓ نے ایک طرف تو تمام داخلی اور اندرونی مسائل بخیر و خوبی حل کر لیے اور ایک مضبوط و مستحکم اور منظم اسلامی مملکت قائم کر دی اور دوسری طرف آپ نے بہترین خارجہ حکمت عملی اختیار کی اور اعلیٰ حسنِ تدبر، جرأت، مومنانہ فراست اور آہنی عزم کا مظاہرہ کیا۔ باوجود اس بات کے کہ آپ اندرونی مسائل میں الجھے ہوئے تھے لیکن جب حالات نے تقاضا کیا تو اپنے زمانہ کی دو عظیم سلطنتوں روم اور ایران سے ٹکر لی اور دشمن کے علاقے میں جنگ لڑی اور انہیں نیچا دکھا دیا۔ آپ کو لشکر کے امیروں کے انتخاب میں بڑی بصیرت اور فراست حاصل تھی حضرت خالدؓ سیف اللہ کی اعلیٰ جنگی صلاحیتوں سے آپ نے بھرپور کام لیا۔

بقول میجر جنرل اکبر: "حضرت ابو بکرؓ نے آہنی عزم، غیر متزلزل استقلال اور برق رفتار مستعدی کے علاوہ دفاعی سیاست، فن حرب اور ڈپلومیسی کا بے نظیر مظاہرہ کیا اور بیک وقت ایران و روم کو نیچا

دکھایا کہ آج تک دوست دشمن اس کے معترف اور ثنا خواں ہیں"۔

سیرتؐ و کردار اور فضائل

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن
(اقبال)

سوال: حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سیرت و کردار اور فضائل پر تفصیل سے روشنی ڈالیے، نیز آپؓ نے خدمتِ خلق کے لیے کیا کچھ کیا؟

جواب:

حضرت ابوبکر صدیقؓ ـــــ سیرت و کردار کے آئینہ میں

حضرت ابوبکر صدیقؓ قوتِ ایمانی، تقویٰ و پرہیزگاری، فہم و فراست، عزم و استقلال، جذبۂ سخاوت اور خدمت خلق میں تمام صحابہ کرامؓ سے ممتاز نظر آتے ہیں، وہ سب سے بڑھ کر دین کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے اور مزاج شناسِ رسولؐ تھے۔ عشقِ رسولؐ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ آپ زندگی میں حضور اکرمؐ کے ساتھی تھے، غار کے ساتھی تھے، قبر میں حضورؐ کے ساتھی ہیں اور قیامت کے روز بھی حضورؐ کے ساتھی ہوں گے۔ علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبیوں کے بعد افضل ترین انسان آپؓ ہی ہیں۔ ؎ یہ نصیب، اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

۱۔ حلیہ مبارک

حضرت ابوبکر صدیقؓ دُبلے پتلے، صحت مند اور درمیانے قد کے انسان تھے۔ رنگ گورا اور ماتھا چوڑا تھا۔ چہرہ بارعب اور پُر وقار تھا۔ کمر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ ریش مبارک کو مہندی سے رنگین کیا کرتے تھے۔ بقول امام زہری:

"آپ کے بال گھنگریالے تھے۔ کم سخن اور رقیق القلب تھے۔ بہت چاک و چوبند تھے۔ آواز رعب دار اور پر جلال تھی"۔

۲۔ سادگی

آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ موٹے جھوٹے کپڑے استعمال فرماتے تھے دسترخوان بھی پر تکلف نہ تھا۔ خلافت کے بعد یہ سادگی اور ترقی کر گئی تھی۔ چنانچہ وفات کے وقت آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

"جب سے خلافت کا بار میرے سر پر آیا ہے، میں نے معمولی سے معمولی غذا اور موٹے جھوٹے

کپڑے پر قناعت کی ہے، مسلمانوں کے مال میں سے میرے پاس ایک حبشی غلام، ایک اونٹ اور اس پرانی چادر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میرے بعد یہ تمام چیزیں عمرؓ بن الخطاب کو واپس دے کر ان سے بَری ہو جانا۔"

تجہیز و تکفین کے متعلق فرمایا:

"اس وقت جو کپڑا بدن پر ہے اس کو دھونا اور دو اور کپڑے ملا کر مجھے کفن دینا"۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: "یہ تو پرانا ہے، کفن نیا ہونا چاہیئے"۔ جواب دیا: "زندہ، مردوں کی نسبت نئے کپڑوں کے زیادہ حق دار ہیں"۔

آپ نے چونکہ اپنی تمام دولت اسلام پر نثار کر دی تھی، اس لیے عسرت و ناداری کے باعث بارہا دو دو، تین تین وقت فاقے میں گزر جاتے تھے۔ خلافت سنبھالنے پر صحابہؓ کے اصرار پر بیت المال سے اس قدر وظیفہ لیتے تھے جس میں ایک عام آدمی گزارہ کر سکے۔ اور وفات سے پہلے اس رقم کا بھی باقاعدہ حساب کیا اور زمین کا ایک ٹکڑا بیچ کر حساب بے باق کر دیا۔

ایک دفعہ ان کی بیوی نے شیرینی کی فرمائش کی۔ جواب دیا کہ اس کی گنجائش نہیں۔ انہوں نے روزمرہ خرچ سے کچھ رقم بچا کر شیرینی تیار کی تو فرمایا کہ معلوم ہوا کہ یہ خرچ ضرورت سے زیادہ ہے۔ لہٰذا اسی قدر اپنا وظیفہ کم کر دیا۔

بقول وان کریمر، "انہیں نظام اسلامی میں اگرچہ وسیع ترین اختیارات حاصل تھے لیکن ان کے طرز زندگی اور رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور آپ اپنے قدیمی عرب تمدن پر قائم رہے۔ وہ مدینہ سے باہر سنخ نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک بدو شیخ کی مانند اونٹ کی کھال سے بنے ہوئے خیمے میں اہل و عیال سمیت زندگی بسر کرتے تھے۔

۳۔ انفاق فی سبیل اللہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ انفاق فی سبیل اللہ میں اپنی مثال آپ تھے آپ کی تمام تر دولت اسلام کی خدمت اور ضرورت مندوں کی حاجت کے لیے وقف تھی۔ قبول اسلام کے وقت آپ کے پاس چالیس ہزار درہم نقد موجود تھے۔ آپ نے یہ تمام دولت لا کر حضورؐ کے قدموں پر نچھاور کر دی۔ حضورؐ اکثر فرماتے تھے: "ابوبکرؓ کے مال سے زیادہ کوئی مال میرے لیے مفید نہ ہوا"۔

آغاز اسلام میں جو لوگ ایمان لائے ان میں ایک بڑی تعداد غلاموں اور لونڈیوں کی تھی جو اپنے مشرک آقاؤں کے ظلم و ستم کا شکار تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اکثر کو آزاد کرایا۔ غزوہ تبوک کے موقع پر حضورؐ نے جہاد کے لیے مالی امداد کی اپیل کی تو آپ نے گھر کا پورے کا پورا مال و اسباب حضورؐ کی خدمت میں پیش

کر دیا اور اپنے لیے کوئی چیز نہ چھوڑی۔ حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا:

"میں نے ہر شخص کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے۔ صرف ابوبکرؓ کے احسانات مجھ پر باقی ہیں۔ ان کا اجر انہیں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ دے گا۔"

حضرت ابوبکرؓ کی فیاضی کا سلسلہ آخری لمحہ حیات تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ نے فقراء و مساکین کو فراموش نہ کیا اور اپنے مال میں ان کے لیے ایک خمس کی وصیت فرمادی۔

۴۔ زہد و تقویٰ

آپ بڑے عابد و زاہد تھے، نرم دل اور رقیق القلب تھے۔ آپ دن کو روزہ رکھتے تھے اور رات نوافل میں گزار دیتے تھے۔ تلاوت قرآن کے دوران آپ پر رقت طاری ہو جاتی۔ خشوع و خضوع کی حالت میں اس قدر آنسو بہاتے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ خوفِ خدا کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی کوئی معمولی بھول چوک بھی ہو جاتی تھی تو بعد میں سخت پشیماں ہوتے اور اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک اس کی تلافی نہ کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا: "کاش میں ایک چڑیا ہوتا کہ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ آہ کاش میں ایک سرِ رہ گزر عام ایک درخت ہوتا۔"

ایک مرتبہ اپنے کسی غلام سے کسی بات پر خفا ہو کر اس کو لعن طعن کر دیا۔ حضورؐ نے اسے ناپسند فرمایا تو بہت نادم ہوئے اور بطور کفارہ چند غلام آزاد کر دیئے اور عرض کیا: "حضورؐ! اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔"

۵۔ عشق رسولؐ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اصل سرمایۂ فخر عشق رسولؐ تھا۔ یہ جذبۂ عشق آپ کے رگ و پے میں رچا بسا ہوا تھا۔ یہ عشق ہی درحقیقت وہ سرچشمہ تھا جس سے دوسرے کمالات پیدا ہوئے تھے۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں ایک دن کے لیے بھی آپ حضورؐ سے جدا نہ ہوئے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزانہ صبح و شام ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں بھی اکثر اہم امور حضرت ابوبکرؓ کی شرکت سے طے پاتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کو اکثر رات کے وقت دیر تک کاشانۂ اقدس پر حاضر رہنا پڑتا تھا۔ حضرت عمرؓ بھی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات رات بھر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مسلمانوں کے امور میں مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ نیز ان کی رازداری و خلوص پر اعتماد اس قدر تھا کہ پوشیدہ سے پوشیدہ بات کہہ دیتے تھے۔

حضرت عروہؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے وصالِ نبویؐ کے دوسرے سال ایک روز خطبہ دیا اس میں یہ الفاظ زبان سے نکلے "میں نے تمہارے نبیؐ سے پار سال سُنا ہے۔" اس پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے تاب ہو گئے اور بمشکل خطبہ ادا کر سکے۔ مؤرخین کے نزدیک حضورؐ کی وفات نے حضرت ابوبکر کی جان گھلا دی۔ جدائی کا غم برداشت نہ ہو سکا۔ وہ سوزِ دروں سے اندر ہی اندر پگھلتے رہے اور آخر اپنے محبوب سے جا ملے۔ مکی دور میں کفارِ مکہ نے ایک مرتبہ حضور اکرمؐ

پر بہت سختی کی۔ حضرت ابوبکرؓ چھڑانے آئے تو کفار نے انہیں اس قدر پیٹا کہ بے ہوش ہو گئے اور لوگ انہیں اسی حالت میں اٹھا کر ان کے گھر لے گئے۔ ہوش میں آئے تو پہلا سوال حضورؐ کی خیریت کے بارے میں تھا۔ اور انہیں اس وقت تک چین نہ آیا جب تک خود حضورؐ کا دیدار نہ کر لیا۔

۶۔ شجاعت و مردانگی

آپ شجاعت و مردانگی کا مجسمہ و پیکر تھے۔ بڑے سے بڑے خطرے کو اسلام کی بدولت خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہجرت کے دوران آپ ہی حضورؐ کے ہمسفر تھے، حالانکہ یہ جان جوکھوں کا کام تھا۔ غارِ ثور میں حضورؐ کی رفاقت میں رہے اور یارِ غار کہلائے۔ اکثر غزوات میں آپ حضورِ اکرمؐ کی حفاظت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ حضرت علی المرتضیٰؓ بیان فرماتے ہیں کہ "غزوہ بدر کے موقع پر ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک کیمپ بنا دیا تھا، جس میں آپ قیام فرمائیں۔ پھر ہم نے پوچھا کہ اس کیمپ میں حضورؐ کی چوکیداری کی خدمت کون انجام دے گا تو کسی نے پیش رفت نہ کی، البتہ ابوبکرؓ نے سبقت فرمائی اور شمشیر بدست حضورؐ کی خدمت میں اس مستعدی اور آمادگی کے ساتھ پہرہ دیتے رہے کہ جہاں کسی نابکار نے ادھر کا رُخ کیا اور آپؓ اس پر جھپٹ پڑے۔" آپ کی شجاعت، استقامت اور عزیمت کا ہی نتیجہ تھا کہ آپؓ عہدِ خلافت میں فتنہ ارتداد، منکرینِ زکوٰۃ، جھوٹے مدعیانِ نبوت اور بیرونی خطرات کے خلاف چٹان بن کر ڈٹ گئے اور مردانگی اور قوتِ ایمانی سے ان سب کی بیخ کنی کی۔

بقول ایچ جی ویلز: "آنحضرتؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں اس عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا جس کے سامنے پہاڑ بھی ٹل جاتے ہیں۔"

جب آپؓ نے عنانِ خلافت سنبھالی تو تمام مسلمانوں کے دلوں پر خوف و مایوسی طاری تھی، لیکن آپ نے حیرت انگیز شجاعت اور عزیمت سے تمام فتنوں اور شورشوں کا قلع قمع کر ڈالا جس سے قافلۂ اسلام پھر سے شان و شوکت سے اپنے راستے پر گامزن ہو گیا۔

۷۔ علم و فضل

حضرت ابوبکر صدیقؓ علم و فضل میں بھی اپنی مثال آپ تھے اور تمام صحابہؓ میں ممتاز و منفرد تھے۔ آپ کا کلام فصاحت و بلاغت کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ اسرارِ نبوت اور فہمِ قرآن میں آپ کو اعلیٰ درجے کی مہارت و بصیرت حاصل تھی۔

رموزِ دین کے محرم اور روحِ اسلام کے دانائے راز تھے۔ فقہ، تاریخ، علم الانساب اور دیگر علوم میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ آپؓ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت و معیت میں آغازِ بعثت سے لے کر آخری لمحۂ حیات تک جلوت اور خلوت میں، سفر اور حضر میں، رزم اور بزم میں ہر جگہ اور ہر موقع پر برابر ساتھ رہے تھے، اس بنا پر آپ کا سینہ درحقیقت علوم و کمالاتِ نبوتیہ کا گنجینہ بن گیا تھا۔

قرآن فہمی میں آپ کو جو مقام رفیع حاصل تھا، اس کی وجہ سے آپ اگر قرآن کے کسی ایک لفظ کی مراد متعین کر دیتے تھے تو پھر اکابر صحابہؓ تک کو اس کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ آپ خطابت کا اعلیٰ جوہر رکھتے تھے اور شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ آپ تعبیر رویا (خوابوں کی تعبیر) کے فن کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔

۸۔ فہم و فراست اور حسنِ تدبر اللہ تعالیٰ نے آپ کو فہم و فراست کا اعلیٰ ملکہ عطا کر رکھا تھا۔ بہت دانا بینا، زیرک اور معاملہ فہم انسان تھے۔ اپنے اسی وصف کی وجہ سے قبل اسلام بھی مشہور و معروف تھے اور لوگوں کے معاملات و تنازعات کا عمدہ فیصلہ کیا کرتے تھے۔ قبول اسلام کے بعد یہ جوہر اور بھی نکھرتا گیا۔ اسی وصف کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر آپ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے اور آپ کی رائے کو بڑی وقعت دیتے تھے۔ وصالِ نبویؐ کے اندوہناک اور نازک موقع پر اکثر صحابہ کرامؓ کے اوسان اور حواس بجا نہیں رہے تھے، لیکن آپ نے اس موقع پر بھی اپنے ہوش و حواس کو بجا رکھا اور بے مثال فہم و فراست اور حسنِ تدبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے امت کی بہترین رہنمائی فرمائی۔ اسی طرح سقیفہ بنی ساعدہ میں جب خلافت کا تنازعہ پیدا ہوا تو آپ نے بے مثال حسن تدبر اور فہم و فراست کا مظاہرہ کیا اور خلافت کے اہم اور نازک مسئلے کو نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔ الغرض آپ کا یہ وصف آپ کے ہر مرحلۂ حیات پر نمایاں نظر آتا ہے۔

۹۔ خدمتِ خلق آپ صحیح معنوں میں خادم خلق تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگوں کے کام آتے تھے۔ اسلام لاتے سے یہ جذبہ اور بھی بڑھ گیا۔ دوسروں کی امداد و معاونت کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔ اہل محلہ کے بیشتر کام آپ نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے۔ آپؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو محلہ کی لڑکیوں نے عرض کی: "اب ہماری بکریاں کون دوہا کرے گا؟" فرمایا: "خلافت خدمتِ خلق میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ مدینہ کے اطراف میں ایک نابینا اور ضعیف عورت رہتی تھی۔ حضرت عمرؓ علی الصبح جا کر اس کی ضروری خدمات سرانجام دیتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص ان سے بھی پہلے آ کر اس ضعیفہ کے کام کر جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ حیران تھے کہ وہ کون شخص ہو سکتا ہے؟ ایک دن تحقیق کے لیے چھپ کر بیٹھ رہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اس کے کام کر جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ پکار اٹھے "کوئی شخص ابوبکرؓ سے نیکی میں نہیں بڑھ سکتا۔"

الغرض خلق اللہ کی نفع رسانی اور خدمت گزاری میں ان کو خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر محلہ والوں کا کام کر دیتے، بیماروں کی تیمارداری فرماتے اور اپنے ہاتھ سے ضعیف و ناتواں افراد کی خدمت انجام

دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ گویا آپؓ اس ارشادِ نبویؐ کے صحیح معنوں میں مصداق تھے:

سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ

یعنی "قوم کا سردار قوم کا خادم ہے۔"

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں   کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں (حالی)

حاصلِ کلام

مختصر یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام کی تعلیمات کا زندہ پیکر اور اخلاقِ نبویؐ کی مجسم تصویر تھے۔ آپ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ آپ محبوبِ محبوبِ خدا تھے، رفیقِ غارِ ثور، ثانی اثنین اور رفیقِ رسالت تھے، مزاج شناس و عاشقِ رسولؐ تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنے دورِ خلافت میں فرمایا کرتے تھے:

"ابوبکرؓ نے ہجرت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو خدمت کی خاص طور پر غارِ ثور میں ساتھ رہنے کا شرف اور مرتدین سے جہاد و قتال کا کارنامہ، وہ اگر مجھے دے دیں اور مجھ سے ساری عمر کے اعمال مجھ سے لے لیں تو میں سمجھوں گا کہ فائدے میں رہا۔"

فضائل

حدیث کی روشنی میں:-

۱۔ "اگر میں کسی شخص کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا۔" (مسلم)

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور کسی معاملہ میں گفتگو کی۔ آپؐ نے اس سے فرمایا، پھر کسی وقت آنا۔ اس عورت نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! یہ بتا دیجئے، اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں (یعنی آپ انتقال فرما جائیں) تو کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا، اگر تو مجھ کو نہ پائے تو ابوبکرؓ کے پاس چلی جانا۔" (بخاری و مسلم)

۳۔ محمد بن حنفیہؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد حضرت علیؓ سے دریافت کیا، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کون شخص سب سے بہتر ہے؟ تو انہوں نے فرمایا، "ابوبکرؓ۔" (بخاری و مسلم)

۴۔ جنت کے اندر اگلے پچھلے جس قدر ادھیڑ عمر کے لوگ ہوں گے، ان سب کے سردار ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔ سوائے نبیوں اور رسولوں کے۔" (ترمذی۔ ابن ماجہ)

۵۔ بہشت کے اندر جنتی علیین (بلند مرتبہ کی جگہ) کو اس طرح دیکھیں گے، جس طرح تم آسمان کے کنارے میں روشن ستارہ کو دیکھتے ہو اور ابوبکرؓ و عمرؓ علیین میں سے ہیں۔" (شرح السنۃ)

۶۔ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرہ شریف سے نکل کر مسجد میں اس طرح تشریف لائے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ آپ کے دائیں بائیں تھے اور حضورؐ دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے اور فرمایا، قیامت کے روز ہم اسی طرح اٹھائے جائیں گے۔" (ترمذی)

۷۔ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روز ابوبکرؓ سے فرمایا "تم میرے یارِ غار (یعنی غار کے ساتھی) اور حوضِ کوثر پر میرے ساتھی ہو۔" (ترمذی)

۸۔ "اللہ نے جو کچھ میرے سینے میں ڈالا تھا وہ میں نے ابوبکرؓ کے سینہ میں ڈال دیا۔"

لامعُ النور، ساطِعُ الآثار — ثانیَ اثنین اِذ ھُما فِی الغار
ایک صادق تھا، دوسرا صدیق — ماہِ نوار و کوکبِ زہّار
آفتاب ایک دوسرا مہتاب — دونوں بے حصر و بے قیاس و شمار

(عبدالعزیز خالد)

صدیق اکبرؓ، بعد از پیمبر — بزرگ توئی قصہ مختصر

خلیفہ دوم

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ تَرٰىہُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا (الفتح : ۲۹)

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں، اور آپس میں رحمدل۔ (اے دیکھنے والے) توان کو دیکھتا ہے کہ (خدا کے آگے) جھکے ہوئے سر بسجود ہیں اور خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔

"اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔" (ارشادِ نبویؐ)

؎ جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

(اقبالؒ)

ابتدائی حالات و انتخاب خلافت

سوال: حضرت عمر فاروقؓ کے ابتدائی حالات اور انتخابِ خلافت کا حال بیان کیجئے۔

جواب:

حضرت عمر فاروقؓ کے ابتدائی حالات

آپ کا نام عمرؓ، کنیت حفص اور فاروق لقب تھا۔ آپ قبیلۂ قریش کی مشہور شاخ بنو عدی میں سے تھے اور آپ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ آپ کا خاندان زمانۂ جاہلیت سے ہی ممتاز تھا۔ آپ کی ولادت ۵۸۳ء میں ہوئی۔ سن رشد کو پہنچے تو ان کے باپ خطاب نے اونٹ چرانے کی خدمت ان کے سپرد کی۔ یہ شغل اگرچہ عرب میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ قومی شعار تھا۔ لیکن خطاب نہایت بے رحمی کے ساتھ ان سے سلوک کرتے۔ تمام تمام دن اونٹ چرانے کا کام لیتے اور جب کبھی تھک کر دم لینا چاہتے تو سزا دیتے۔ خلافت کے زمانہ میں ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا گزر اس میدان سے ہوا تو ان کو نہایت عبرت ہوئی۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا: اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا کہ میں نمدہ کا کرتہ پہنے ہوئے اونٹ چرایا کرتا تھا اور تھک کر بیٹھ جاتا تو باپ کے ہاتھ

سے مارکھاتا۔ آج یہ دن ہے کہ خدا کے سوا میرے اوپر اور کوئی حاکم نہیں ؛؛
انہی سختیوں نے ان کو بہت جفاکش اور محنت طلب بنا دیا تھا۔

شباب کا آغاز ہوا تو حضرت عمرؓ ان شریفانہ مشاغل میں مشغول ہوئے، جو شرفائے عرب میں رائج تھے یعنی نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی اور مقرری۔ نسب دانی کا فن حضرت عمرؓ کے خاندان میں موروثی چلا آتا تھا۔ آپ نے انساب کا فن اپنے باپ سے سیکھا۔ آپ جسمانی اعتبار سے بہت مضبوط، بارعب اور دراز قامت تھے۔ پیدل چلتے ہوئے بھی سوار معلوم ہوتے تھے۔ شہسواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور پہلوانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ لوگ ان کا دنگل دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے تھے۔ عرب کے مشہور میلہ عکاظ کے دنگل میں معرکے کی کشتیاں لڑتے تھے۔ شہسواری میں اس قدر تاک تھے کہ گھوڑے پر اچھل کر سوار ہوتے تھے اور یوں جم کر بیٹھتے تھے کہ جلد بدن ہو جاتے تھے۔ اسلام لانے سے پہلے قریش نے ان کو سفارت کا منصب دے دیا تھا اور یہ منصب صرف اس شخص کو مل سکتا تھا جو وقت تقریر اور معاملہ فہمی میں کمال رکھتا تھا۔ آپ کو بچپن سے علم حاصل کرنے کا شوق تھا، چنانچہ انہوں نے اپنی محنت و کوشش سے کافی حد تک لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور وہ قریش کے ان سترہ آدمیوں میں سے ایک تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

ان فنون سے فارغ ہو کر وہ فکر معاش میں مصروف ہوئے۔ عرب میں معاش کا ذریعہ زیادہ تر تجارت تھا، اس لیے انہوں نے بھی یہی شغل اختیار کیا اور یہی شغل ان کی بہت بڑی ترقیوں کا سبب ہوا۔ وہ تجارت کی غرض سے دور دور کے ملکوں (عراق و شام وغیرہ) میں جاتے تھے اور بڑے بڑے لوگوں سے ملتے تھے خودداری، بلند حوصلگی، تجربہ کاری، معاملہ دانی، یہ تمام اوصاف جو ان میں اسلام لانے سے قبل پیدا ہو گئے تھے، سب انہی سفروں کی بدولت تھے۔ مختصر یہ کہ عکاظ کے معرکوں اور تجارت کے تجربوں نے ان کو تمام عرب میں روشناس کر دیا اور لوگوں پر ان کی قابلیت کے جوہر روز بروز کھلتے گئے، یہاں تک کہ قریش نے ان کو سفارت کے منصب پر مامور کر دیا، قبائل میں جب کوئی پرخطر معاملہ پیش آتا تو انہی کو سفیر بنا کر بھیجتے۔ (الفاروق۔ علامہ شبلی نعمانی)

۲۔ قبولِ اسلام

اس کا حال سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آ چکا ہے۔

۳۔ ہجرت مدینہ

حضرت عمرؓ نے ۶ نبوی میں اسلام قبول کیا اور چھ سال تک مکہ میں رہے اور قریش کے ظلم و ستم برداشت کرتے رہے۔ جب مسلمانوں کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اجازت ملی تو حضرت عمر فاروقؓ نے بیس مسلمانوں کے

ساتھ ہجرت کا قصد کیا مسلح ہو کر خانہ کعبہ پہنچے، اطمینان سے طواف کیا، پھر مشرکین سے یوں مخاطب ہوئے:

"لوگو! میں مکہ سے ہجرت کر رہا ہوں۔ اگر کسی کی خواہش ہو کہ اس کی ماں اس سے محروم ہو جائے اس کی بیوی بیوہ ہو جائے اور اس کے بچے یتیم ہو جائیں تو وہ اس وادی کے پار میرے مقابلہ کو آئے۔"

لیکن مشرکین میں سے کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ ان کا راستہ روک سکے۔

مدینہ منورہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے مابین مواخات کا رشتہ استوار فرما دیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کو جس کا بھائی قرار دیا، ان کا نام حضرت عتبانؓ بن مالک تھا جو قبیلہ بنو سالم کے سردار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے پر اکثر صحابہؓ نے قبا رہی میں قیام رکھا، حضرت عمرؓ بھی یہیں مقیم رہے، لیکن یہ معمول کر لیا کہ ایک دن ناغہ کر کے پابندی کے ساتھ آنحضرتؐ کے پاس جاتے اور دن بھر خدمت اقدس میں حاضر رہتے۔ ناغہ کے دن یہ بندوبست کیا تھا کہ ان کے برادر اسلامی حضرت عتبانؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جو کچھ حضورؐ سے سنتے، حضرت عمرؓ سے جا کر روایت کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں نماز باقاعدہ اہتمام سے قائم ہوئی اور اس کے لیے اذان کا طریقہ رائج ہوا۔ بقول مولانا شبلیؒ

"یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ اذان نماز کا دیباچہ اور اسلام کا بڑا شعار ہے۔ حضرت عمرؓ کے لیے اس سے زیادہ کیا فخر کی بات ہو سکتی ہے کہ یہ شعار اعظم انہی کی رائے کے موافق قائم ہوا۔ (الفاروق)

خلافت سے پہلے کی خدمات

بقول مولانا شبلیؒ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو لڑائیاں پیش آئیں۔ غیر قوموں سے جو معاہدات عمل میں آئے وقتاً فوقتاً جو انتظامات جاری کیے گئے۔ اشاعت اسلام کے لیے جو تدبیریں اختیار کی گئیں، ان میں سے ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو حضرت عمرؓ کی شرکت کے بغیر انجام پایا ہو۔"

مدینہ منورہ میں آپ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاون و مشیر رہے۔ اذان کا طریقہ آپؓ ہی کی تجویز پر رائج ہوا۔ کئی مرتبہ حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید میں وحی نازل ہوئی۔ تمام غزوات میں عمر فاروقؓ نے شرکت کی۔ غزوہ بدر میں قریش کے تمام قبائل اس معرکہ میں آئے، لیکن بنو عدی (یعنی حضرت عمرؓ کا قبیلہ) کا ایک شخص بھی اس جنگ میں شریک نہ ہوا۔ یہ حضرت عمرؓ کے رعب و داب کا اثر تھا۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ان کے قبیلے اور حلفاء کے ۱۲ آدمی شریک جنگ تھے۔ سب سے پہلے جو شخص اس معرکہ میں شہید ہوا وہ مہجع حضرت عمرؓ کا غلام تھا۔ عاصی بن ہاشم جو قریش کا ایک معزز سردار اور حضرت عمرؓ کا ماموں تھا، حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ بات حضرت عمرؓ کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہے کہ اسلام کے

معاملات میں قرابت اور محبت کا اثر ان پر کبھی غالب نہیں آسکتا تھا۔ غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے۔ وحی الٰہی میں بھی اس قسم کا حکم ہوا۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شانِ رحمت کے تقاضا سے حضرت ابو بکرؓ کی رائے پسند فرمائی اور قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔

غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو عارضی شکست سے دوچار ہونا پڑا اور انہیں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، پیشانی پر زخم آیا اور رخساروں میں مغفر کی کڑیاں چُبھ گئیں۔ اس کے ساتھ آپؐ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ اس نازک موقع پر کچھ صحابہ کرامؓ آپؐ کی حفاظت پر رہے۔ خالد ایک دستہ فوج کے ساتھ آنحضرتؐ کی طرف بڑھے۔ حضورؐ اس وقت تیس صحابہؓ کے ساتھ پہاڑ پر تشریف رکھتے تھے۔ خالد کو آتا دیکھ کر فرمایا کہ خدایا! یہ لوگ یہاں تک نہ آنے پائیں۔ حضرت عمرؓ نے چند مہاجرین و انصار کے ساتھ آگے بڑھ کر حملہ کیا اور ان لوگوں کو ہٹا دیا۔ ابو سفیان سالار قریش درہ کے قریب پہنچ کر پکارا کہ اس گروہ میں محمدؐ ہیں یا نہیں؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اشارہ کیا کہ کوئی جواب نہ دے۔ ابو سفیان نے پھر حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کا نام لے کر کہا کہ یہ دونوں اس مجمع میں ہیں یا نہیں؟" اور جب کسی نے کچھ جواب نہ دیا تو بولا کہ "ضرور یہ لوگ مارے گئے۔" حضرت عمرؓ سے رہا نہ گیا۔ پکار کر کہا "او دشمنِ خدا! ہم سب زندہ ہیں۔" ابو سفیان نے کہا، اعلُ ھبل (یعنی اے ہبل! بلند ہو)" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمانے پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلُّ (یعنی خدا بلند و برتر ہے۔)

غزوہ خندق میں بھی خندق کے ایک حصے پر حضرت عمرؓ متعین تھے، چنانچہ ان کے نام کی ایک مسجد آج بھی موجود ہے۔ ایک دن کفار نے حملہ کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت زبیرؓ کے ساتھ آگے بڑھ کر روکا اور ان کی جماعت درہم برہم کر دی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ بھی بیعت رضوان میں شامل تھے، بلکہ معاہدۂ صلح پر اکابر صحابہؓ کے علاوہ حضرت عمرؓ نے بھی دستخط ثبت کیے۔ معاہدہ سے پہلے حضرت عمرؓ بہت بے قرار تھے۔ وہ صلح کو مسلمانوں کی کمزوری سمجھتے تھے اور کفار سے جہاد پر آمادہ تھے۔ چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس گئے اور اس طرح گفتگو کی:۔

"یا رسول اللہؐ! کیا آپؐ رسولِ خدا نہیں ہیں؟"

رسول اللہؐ : بے شک ہوں۔

حضرت عمرؓ : کیا ہمارے دشمن مشرک نہیں ہیں؟

رسول اللہ ؐ : مزور ہیں ۔

حضرت عمرؓ : پھر ہم اپنے مذہب کو کیوں ذلیل کریں ؟

رسول اللہؐ : میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کے خلاف نہیں کرتا ۔

تاہم اس بے قراری کے باوجود حضرت عمرؓ نے معاہدہ پر دستخط کر دیئے ۔ اگرچہ بظاہر وقتی طور پر یہ صلح مسلمانوں کے خلاف جاتی تھی ، تاہم کچھ عرصہ بعد اس کے نتائج اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہت بہتر برآمد ہوئے اور قرآن مجید میں اسے فتح مبین قرار دیا گیا ۔ اس طرح دیگر صحابہؓ کے علاوہ حضرت عمرؓ پر حقیقت حال واضح ہو گئی اور وہ مطمئن ہو گئے ۔

غزوۂ خیبر میں بھی حضرت عمرؓ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور فتح کے بعد جو زمین حضرت عمرؓ کے حصہ میں آئی آپ نے اس کو راہِ خدا میں وقف کر دیا ۔ فتح مکہ کے موقع پر بھی آپ نے نمایاں کردار ادا کیا اور فتح کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقام صفا پر لوگوں سے بیعت لی تو حضورؐ کی اجازت سے حضرت عمرؓ نے عورتوں سے بیعت لی ۔ غزوہ حنین میں بھی مسلمانوں کو عارضی پسپائی سے دوچار ہونا پڑا ۔ اس وقت جو صحابہ کرامؓ حضورؐ کے ساتھ رہ گئے ان میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے ۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب حضورؐ نے جہاد کے لیے امداد کی اپیل کی تو حضرت عمرؓ نے اپنے تمام مال و اسباب میں سے آدھا لا کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا ۔

وصالِ نبویؐ کے موقع پر صحابہ کرامؓ نہایت مضطرب و بے چین تھے ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفات پائی اس کو قتل کر دوں گا ۔" چونکہ مدینے میں کثرت سے منافقین کا گروہ موجود تھا ، جو فتنہ پردازی کے لیے آنحضرتؐ کی وفات کا منتظر تھا ، اس لیے حضرت عمرؓ نے مصلحتاً اس خبر کے پھیلنے کو روکا ہوگا ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں حضرت عمرؓ حضورؐ کے قریبی ساتھی اور مشیر رہے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی تلوار منافقین اور دشمنانِ اسلام کے خلاف بے نیام ہو جاتی ۔ لیکن حضورؐ کی شانِ رحمت آڑے آجاتی اور آپؐ کو صبر و تحمل کی تلقین فرمائی جاتی ۔ مدینہ منورہ کے ایک منافق مسلمان کا ایک یہودی سے جھگڑا ہو گیا ۔ چونکہ یہودی حق پر تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں فیصلہ فرمایا ۔ منافق نے یہ فیصلہ تسلیم نہ کیا ، وہ دادرسی کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس آیا ۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس منافق کو قتل کر ڈالا کہ اس نے رسول اللہؐ کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا ۔ وحی الٰہی نے بھی اس بات کی تائید کی ۔ چنانچہ دربارِ رسالتؐ سے آپ کو فاروق کا لقب ملا (یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والا)

شاہ معین الدین احمد ندوی اپنی کتاب " تاریخ اسلام " میں لکھتے ہیں :-

"غرض قبولِ اسلام کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی طرح انہوں نے بھی اپنی جان اور اپنا مال اسلام پر نثار کر دیا۔ ان کی جرأت و شجاعت اور جاں نثاری سے اسلام کو بڑی تقویت پہنچی، ایثار و قربانی میں حضرت ابوبکرؓ کے بعد ان ہی کا درجہ تھا۔ ان کی جاں نثاری و فداکاری اور خدمات اسلامی کی بنا پر ان کو بارگاہِ نبوی میں جو تقرب و اختصاص حاصل تھا، وہ حضرت ابوبکرؓ کے سوا اور کسی صحابہؓ کو نہ تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کے فتنہ کو دبانے میں آپ کی کوشش کو بڑا دخل ہے، آپ ہی نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں پر بیعت کر کے اختلاف کا خاتمہ کیا۔ عہدِ صدیقی کے جملہ مہمات امور میں حضرت ابوبکرؓ کے خاص مشیر اور دستِ راست رہے۔ ان کے ان گوناگوں فضائل اور اوصاف کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ وفات کے وقت ان کو اپنا جانشین نامزد کر گئے۔

انتخابِ خلافت

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ بیمار ہو گئے اور بیماری کی شدت کے باعث مسجد میں بھی آنے جانے کے قابل نہ رہے تو اپنی رحلت کا احساس کر کے وہ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں اکثر سوچا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد کے واقعات آپ کے سامنے تھے۔ چنانچہ انتہائی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ملتِ اسلامیہ کی امارت و قیادت کے لیے حضرت عمر فاروقؓ ہی سب سے بڑھ کر موزوں شخص ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مزید احتیاط کے خیال سے اس معاملے میں ممتاز صحابہؓ سے بھی مشورہ لینا زیادہ مناسب سمجھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بلایا اور کہا؛

"عمرؓ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" وہ کہنے لگے: "میں آپ کے بعد ان کو افضل سمجھتا ہوں۔ لیکن ان کے مزاج میں کسی قدر سختی ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "وہ مجھے نرم دیکھ کر سختی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اگر وہ خلیفہ بن گئے تو یہ سختی خود بخود جاتی رہے گی۔"

پھر حضرت عثمان غنیؓ کو بلایا اور ان سے بھی یہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا: "آپ میرے مقابلے میں ان کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔" حضرت ابوبکرؓ نے اصرار کیا تو بولے: "جہاں تک میں جانتا ہوں، ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور ہم میں سے کوئی شخص ان کے برابر نہیں۔"

اسی طرح کچھ اور حضرات سے بھی مشورہ کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ ان حالات میں حضرت عمرؓ ہی خلافت کے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ اس کے بعد ایک روز صحابہؓ حضرت ابوبکرؓ کے مکان کے پاس جمع تھے۔ آپ بیماری میں ایک شخص کے سہارے سے اپنے بالاخانہ پر چڑھے اور ان لوگوں سے

مخاطب ہو کر فرمایا:

"کیا تم اس شخص کو پسند کرو گے، جسے میں تمہارے لیے مقرر کردوں؟ میں نے غور اور مشورے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر نہیں کیا۔ میں عمرؓ کو اپنا جانشین بنانا چاہتا ہوں کیا تم سب کو منظور ہے؟"

سب نے جواب دیا: "ہمیں منظور ہے۔" اس کے بعد آپ نے حضرت عثمان غنیؓ کو بلا کر یہ عہد نامہ لکھوایا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ عہد نامہ ابوبکرؓ بن قحافہ کی آخری زندگی کا ہے۔ جب وہ اس دنیا سے سفر کر رہا ہے اور آخرت کی منزل میں داخل ہو رہا ہے۔ میں نے تمہارے لیے عمرؓ کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔ تم اس کی بات مانو اور اس پر عمل کرو۔ میں نے اس سلسلے میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت اور تمہاری بہتری کی پوری کوشش کی ہے۔ اگر وہ انصاف کریں تو ان کے بارے میں میرا علم اور گمان یہی ہے اور اگر وہ اس کے خلاف کریں تو ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ میری نیت میں خیر خواہی ہے، لیکن مجھے غیب کا علم نہیں ہے۔"

پھر حضرت عمرؓ کو بلا کر انہیں دیر تک نصیحت کرتے رہے اور ان کے حق میں دعا فرمائی۔ یوں حضرت عمرؓ کی خلافت کی ابتدا ۲۲۔ جمادی الثانی ۱۳ھ مطابق ۲۳۔ اگست ۶۳۴ء سے ہوتی ہے۔

خطبہ خلافت

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد جب عام لوگ حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ خطبہ دیا:

"حمد و ثنا کے بعد، اے لوگو! میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نافرمانی کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہارا امیر اور حاکم بننا کبھی پسند نہ کرتا۔ لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے لیے آزمائش بنایا ہے۔ تم میں جو نیک کام کرے گا، میں اس سے نیک سلوک کروں گا اور جو برائی کا ارتکاب کرے گا اسے عبرت ناک سزا دوں گا۔ عرب کی مثال اس اونٹ کی ہے جو اپنے ساربان کا مطیع ہے۔ اس کے ساربان (رہنما) کا فرض ہے کہ وہ اسے کس طرف لے جا رہا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں سیدھے راستے پر لے چلوں گا۔"

بارگاہِ رب العزت میں دعا

اس کے بعد آپ نے بارگاہ رب العزت میں یہ عاجزانہ دعا کی:

"اے اللہ! میں بڑا سخت گیر ہوں، مجھے ان لوگوں کے لیے نرم کر دے جو حق و صداقت کی موافقت میں تیری رضا جوئی اور آخرت کے خیال سے تیری اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں۔ نیز مجھے اپنے دشمنوں

کے مقابلے پر سختی اور شدت عطا فرما۔

اے اللہ! میں بخیل ہوں، نیکی کے کاموں میں مجھے ایسا سخت بنا دے کہ دامن اعتدال ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ نہ تو اسراف و فضول خرچی ہو اور نہ شہرت و ریاکاری کا کوئی دخل ہو۔ مجھے توفیق دے کہ یہ سارے کام تیری رضا اور آخرت کی خاطر کروں۔ مجھے توفیق دے کہ میں اپنا محاسبہ کرتا رہوں۔ اپنے اعمال کی اصلاح کرتا رہوں اور شکوک و شبہات سے بچتا رہوں۔

اے اللہ! مجھے توفیق دے کہ جو کچھ میں قرآن مجید سے پڑھوں، اس میں تدبر و تفکر کر سکوں۔ اس کے معانی و مطالب کو جان سکوں۔ اس کے عجائبات پر غور کروں اور جب تک زندہ رہوں اس پر عمل پیرا رہوں۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن (اقبال)

عہد فاروقی کی فتوحات

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرۃ: ۲۴۹)

ترجمہ: بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے — پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی، تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے (اقبالؒ)

جب عمرؓ کا نعرۂ مستانہ ہوتا تھا بلند — نشہ ہو جاتا تھا روما کا اور ایراں کا ہرن
(مولانا ظفر علی خان)

سوال: حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں اسلامی فتوحات کا حال بیان کیجئے۔

جواب: **عہد فاروقی کی فتوحات** حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں مرتدین عرب اور مدعیان نبوت کا خاتمہ ہو کر فتوحات ملکی کا آغاز

ہو چکا تھا۔ خلافت کے دوسرے ہی برس یعنی ۱۲ھ میں عراق پر لشکر کشی ہوئی اور حیرہ کے تمام اضلاع فتح ہو گئے۔ ۱۳ھ میں شام پر حملہ ہوا اور اسلامی افواج تمام اضلاع میں پھیل گئیں۔ ان مہمات کا ابھی آغاز ہی تھا کہ حضرت ابو بکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے عنانِ خلافت اپنے ہاتھ میں لی تو سب سے ضروری کام انہی مہمات کا انجام دینا تھا۔ یہ فتوحات اسلام پھیلانے میں بہت مددگار ثابت ہوئیں، کیونکہ مسلمان جہاں بھی گئے، انہوں نے اپنے نیک اطوار، حسنِ سلوک، مساوات اور انصاف پسندی سے دوسری قوموں کو بہت متاثر کیا، چنانچہ اس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ حلقۂ اسلام میں شامل ہو گئے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ آیا تو اشاعت اسلام کے اس کام میں اور بھی ترقی ہوئی۔ اس زمانے میں مسلمان مجاہدوں نے عراق و شام کے مزید علاقوں کے علاوہ مصر فلسطین وغیرہ میں بھی اسلام کے پرچم لہرا دیئے، جس سے اسلام روز بروز اور بھی تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔

۱۔ فتوحِ عراق

جب حضرت عمر فاروقؓ نے عنانِ خلافت سنبھالی تو اسلامی فوجیں عراق و شام میں دشمنوں سے برسرِ پیکار تھیں۔ حضرت خالدؓ کے شام کی طرف چلے جانے سے عراقی مقبوضات میں بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی نازک صورت حال کے پیش نظر لوگوں کو جہاد کی دعوت دی۔ اس پر سب سے پہلے بنو ثقیف کے ایک سردار ابو عبیدہؓ نے اس خدمت کے لیے اپنا نام پیش کیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے انہی کی سرکردگی میں چند ہزار کا لشکر دے کر عراق کی طرف بھیج دیا۔ اس وقت تک اہلِ ایران اپنی گزشتہ شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے از سرِ نو منظم ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک نامور بہادر سپاہی رستم کو سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ رستم نے مذہب کے نام پر لوگوں کے جذبات بھڑکائے اور ایرانی سپاہیوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں لڑنے مرنے پر تیار کر لیا۔

ادھر مسلمان بھی بے پناہ جذبۂ جہاد سے سرشار تھے۔ جب ایرانیوں سے جنگ ہوئی تو مسلمانوں نے ایک دو معرکوں میں دشمن کو خوب دبایا۔ انہی جھڑپوں میں ایک مقام پر ابو عبیدہؓ کا سامنا ایران کے ایک تجربہ کار سالار جابان سے ہو گیا۔ جس میں جابان گرفتار کر لیا گیا۔ ایک اور معرکے میں ایران کا ایک اور سالار نرسی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور مسلمانوں کے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت آیا۔ کچھ دیر بعد ایران کی تازہ دم فوج نئے حملے کے لیے میدان میں پہنچ گئی۔ مسلمان فوج مقابلے کے لیے دریائے فرات کے اس پار پہنچ گئی۔ ایرانی لشکر کے ساتھ بڑے بڑے ہاتھی تھے۔ مسلمانوں کے گھوڑے ان کو دیکھ دیکھ کر بدک گئے۔ پھر بھی مسلمان نہایت بہادری سے لڑے۔ ابو عبیدہؓ ایک ہاتھی سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس موقع پر اور بھی بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔

حضرت عمرؓ کو اس نقصان کی اطلاع ملی تو انہوں نے مدد کے لیے اور لشکر بھیجے۔ اب مثنیٰ نے ایرانی

لشکروں کو بویب کے مقام پر سخت شکست دی اور مشہور ایرانی سپہ سالار مہران کو قتل کر دیا۔ اس موقع پر مثنیٰ دریائے فرات کے پل کو روک کر کھڑے ہو گئے اور جو ایرانی پل پار کرنے آئے، ان سب کو تہ تیغ کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے۔

جنگ قادسیہ ۱۴ھ

دُنیا کی فیصلہ کن جنگوں میں سے ایک

۱۔ ایرانیوں کا جوش وخروش

مہران کے قتل، شکست اور ایرانی فوجوں کی بربادی کی خبر پایہ تخت پہنچی تو ایرانیوں میں بڑا جوش پھیل گیا۔ انہوں نے بوران کو تخت سے اتار کر سترہ سالہ یزدگرد کو تخت نشین کیا اور از سر نو فوجی انتظامات کر کے چند دنوں میں تمام قلعوں اور چھاؤنیوں کو جنگی سازو سامان سے بھر دیا۔ ان انتظامات کے ساتھ ہی سازش کر کے تمام مفتوحہ علاقوں میں بغاوت پھیلا دی۔ اس بغاوت میں بہت سے علاقے مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گئے اور مثنیٰ مجبور ہو کر عرب کی سرحد پر ہٹ آئے اور فوراً حضرت عمرؓ کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔

۲۔ حضرت عمرؓ کی تیاری جہاد

حضرت عمرؓ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو آپ نے تمام عرب کے نامور بہادروں، رئیسوں، خطیبوں اور اہل الرائے اشخاص کو مدینہ منورہ طلب کیا۔ آپ کی دعوت پر سارا عرب اُمڈ آیا۔ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ وہ خود ایرانیوں کے مقابلے پر نکلیں، لیکن حضرت علیؓ اور دیگر اکابر صحابہؓ نے مخالفت کی کہ آپ کا دارالخلافہ چھوڑنا مناسب نہیں۔ اس لیے آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ماموں تھے اور عہد نبویؐ میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے سپہ سالار اعظم مقرر کر کے بیس ہزار فوج کے ساتھ ایران روانہ کیا اور چلتے وقت بڑی کار آمد نصیحتیں کیں۔ اس فوج میں ستر بدری صحابہؓ، تین سَو بیعت رضوان کے جان نثار، اسی قدر فتح مکہ میں شریک اصحاب اور اتنے ہی صحابہ زادے تھے حضرت عمرؓ تجارت کے سلسلہ میں سارے عراق کا سفر کر چکے تھے اور یہاں کے چپہ چپہ سے واقف تھے اس لیے فوج کی نقل وحرکت اس کی تنظیم وتربیت اور مورچہ بندی سب اپنے ہاتھ میں رکھی۔ آپ نے حضرت سعدؓ کو ہدایت کی کہ وہ ہر منزل اور ہر مرحلہ کا مفصل نقشہ بھیجتے رہیں۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلی منزل شراف کا نقشہ بھیجا اور حضرت عمرؓ نے اسے دیکھ کر فوج کی تنظیم اور پیش قدمی کے متعلق مفید ہدایات ارسال کیں۔

شراف کے بعد حضرت سعدؓ نے قادسیہ کا پورا نقشہ بھیجا اور حضرت عمرؓ نے اسے دیکھ کر آئندہ پیش قدمی کے متعلق ہدایات بھیجیں کہ قادسیہ میں مقام کرو اور اس طرح مورچے جماؤ کہ سامنے عجم کی زمین اور پشت پر عرب کے پہاڑ ہوں، تاکہ فتح ہو تو جہاں تک چاہو بڑھتے چلے جاؤ اور خدانخواستہ دوسری صورت پیش آئے تو ہٹ کر پہاڑوں کی پناہ میں آسکو۔

اسلامی سفارت

حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ جنگ سے پہلے اسلامی سفیروں کو تبلیغ اسلام کے لیے دربار ایران بھیجا جائے۔ چنانچہ حضرت سعدؓ نے نعمان بن مقرن عاصم بن عمر، مغیرہ بن شعبہ اور حارث بن حساب وغیرہ حضرات کو سفارت کے لیے منتخب کیا۔ یہ لوگ یزدگرد کے دربار میں پہنچے جو بڑے کروفر سے تخت پر متمکن تھا۔ ایرانی عربوں کو حقیر جانتے تھے۔ ان سفیروں نے نہایت بے باکانہ انداز میں پہلے تو دربار ایران میں اسلام کی تبلیغ کی اور پھر تین شرائط پیش کیں۔ اولاً اسلام قبول کر تو تم ہمارے بھائی ہو اور تمہارے ہمارے حقوق برابر ہوں گے۔ ثانیاً جزیہ ادا کر کے ہماری اطاعت و حمایت میں آجاؤ۔ ثالثاً تلوار کے ذریعے فیصلہ کر لیا جائے۔" یہ سن کر یزدگرد غصے سے بے تاب ہو گیا اور کہا کہ اگر قاصدوں کا قتل جائز ہوتا تو تم میں سے کوئی زندہ بچ کر نہ جاتا۔ اپنے سردار سے کہہ دینا، رستم آرہا ہے وہ تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا"۔ یہ کہہ کر مٹی کا ٹوکرا منگوایا اور کہا: تم میں سب سے معزز کون ہے؟ عاصم بن عمر نے بڑھ کر کہا: "میں" ملازموں نے ٹوکرا ان کے سر پر رکھ دیا وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے حضرت سعدؓ کے پاس پہنچے کہ فتح مبارک ہو۔ دشمن نے اپنی زمین خود ہم کو دے دی۔

(الفاروق۔ علامہ شبلی)

رستم میدانِ جنگ میں

رستم ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ قادسیہ کے میدان میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ اسے مسلمانوں کا پورا تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے وہ جنگ سے بچنے کے لیے حیلے ڈھونڈتا تھا۔ چنانچہ یزدگرد کے تاکیدی احکام کے باوجود جنگ کو ٹالتا رہا اور قادسیہ پہنچنے کے بعد اس نے پھر گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا اور حضرت سعدؓ کو لکھا کہ وہ گفتگو کے لیے اپنے آدمی بھیجیں۔ انہوں نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو چند آدمیوں کے ساتھ بھیجا۔ رستم نے انہیں مرعوب کرنے کے لیے بڑے ٹھاٹھ کا دربار آراستہ کیا۔ جس قدر ندیم اور افسر تھے تاج پہن کر کرسیوں پر بیٹھے۔ خیمے میں دیبا و سنجاب کا فرش بچھایا گیا اور خدام اور منصب دار قرینے سے دو رویہ پرے جما کر کھڑے ہوئے۔ حضرت مغیرہؓ گھوڑے سے اتر کر سیدھے صدر کی طرف بڑھے اور رستم سے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ اس گستاخی پر تمام دربار برہم ہو گیا۔ یہاں تک کہ چوبداروں نے بازو پکڑ کر ان کو تخت سے اتار دیا۔ حضرت مغیرہؓ نے افسران دربار کی طرف خطاب کر کے کہا:

"میں خود نہیں آیا بلکہ تم نے بلایا تھا۔ اس لیے مہمان کے ساتھ یہ سلوک زیبا نہ تھا۔ تمہاری طرح ہم لوگوں میں یہ دستور نہیں کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھے اور تمام لوگ اس کے آگے بندہ ہو کر گردن جھکائیں۔"

اس تقریر سے سارا دربار متاثر ہوا اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ رستم بھی شرمسار ہوا اور پھر حضرت مغیرہؓ کو اپنے ساتھ بٹھا کر بات چیت شروع کی۔ رستم نے بے تکلفی کے طور پر حضرت مغیرہؓ کے ترکش سے تیر نکالے اور ہاتھ میں لے کر کہا کہ "ان تکلوں سے کیا ہوگا؟" حضرت مغیرہؓ نے کہا کہ "آگ کی لو گو چھوٹی ہے پھر بھی آگ ہے۔" رستم نے ان کی تلوار کا نیام دیکھ کر کہا "کس قدر بوسیدہ ہے۔" انہوں نے کہا "ہاں، لیکن تلوار پر باڑھ ابھی رکھی گئی ہے۔"

اس نوک جھونک کے بعد معاملے کی بات شروع ہوئی۔ رستم نے ایرانی سلطنت کی شان و شوکت کا ذکر کر کے اظہارِ احسان کے طور پر کہا کہ اب بھی واپس چلے جاؤ تو ہم کو کچھ ملال نہیں بلکہ بہت کچھ انعام دلا دیا جائے گا۔ حضرت مغیرہؓ نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "اگر اسلام و جزیہ منظور نہیں تو اس سے فیصلہ ہوگا۔" رستم غصہ سے بھڑک اٹھا اور کہا کہ آفتاب کی قسم، کل تمام عرب کو برباد کر دوں گا۔" حضرت مغیرہؓ یہ سن کر، لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے ہوئے لوٹ آئے اور صلح و آشتی کی تمام امیدوں کا خاتمہ ہو گیا ؎

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

(اقبال)

گھمسان کی جنگ اور مسلمانوں کی فتح

رستم اب تک لڑائی کو برابر ٹالتا جاتا تھا لیکن حضرت مغیرہؓ کی بیباکانہ گفتگو نے اس کو اس قدر غیرت دلائی کہ اسی وقت کمر بندی کا حکم دیا۔ اس کے حکم سے راتوں رات نہر پاٹ کر سڑک بنا دی گئی۔ اور دوپہر سے پہلے پہلے فوج نہر کے اس پار آگئی۔ خود سامانِ جنگ سے آراستہ ہوا دوہری زرہیں پہنیں، سر پر خود رکھا، ہتھیار لگائے۔ پھر خاص گھوڑا طلب کیا اور سوار ہو کر جوش میں کہا: "کل عرب کو چکنا چور کر دوں گا۔" کسی سپاہی نے کہا: "ہاں اگر خدا نے چاہا۔" بولا کہ: خدا نے نہ بھی چاہا تب بھی۔"

محرم ۱۴ھ میں دونوں لشکر میدانِ جنگ میں صف آرا ہو گئے۔ ایرانیوں کے پیچھے کی طرف نہر عتیق اور مسلمانوں کے پیچھے خندق تھی۔ بیچ میں میدانِ جنگ تھا۔ حضرت سعدؓ جو ایک بیماری کے باعث حرکت سے معذور تھے، وہ میدانِ جنگ کے پاس ایک پرانے محل پر بیٹھ کر فوجوں کو لڑا

رہے تھے۔ وہ کوئی ہدایت دینا چاہتے تو کاغذ پر لکھ کر گولے میں لپیٹ کر نیچے پھینک دیتے اور ایک ماتحت سالار ان کی ہدایات فوجوں تک پہنچاتے تھے۔ بقول مولانا شبلیؒ:

"تمدن کے ابتدائی زمانے میں فنِ جنگ کا اس قدر ترقی کرنا تعجب کے قابل اور عرب کی تیزی طبع اور لیاقت جنگ کی دلیل ہے۔" (الفاروق)

پہلا روز

فوجیں آراستہ ہو چکیں تو عرب کے مشہور شعراء اور خطباء نے اپنی شعلہ بیانی سے تمام فوج میں آگ لگا دی۔ اس کے ساتھ قاریوں نے نہایت خوش الحانی سے سورۂ جہاد کی آیات پڑھنی شروع کیں، جس کی تاثیر سے دل ہل گئے اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ حضرت سعدؓ نے قاعدے کے مطابق تین نعرے مارے اور چوتھے پر لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے انفرادی مقابلہ ہوا جس میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ پھر عام جنگ شروع ہو گئی۔

جنگ شروع ہونے کے بعد مسلمانوں کو جو دشواری پیش آئی، وہ یہ تھی کہ عربی گھوڑے ایرانی ہاتھیوں سے بھاگتے تھے۔ حضرت سعدؓ کے حکم سے کچھ سپاہیوں کو صرف ہاتھیوں پر تیر برسانے پر مقرر کر دیا گیا۔ مسلمان جان توڑ کر لڑتے رہے، لیکن پھر بھی اس روز ایرانی غالب نظر آ رہے تھے۔ جنگ ظہر کی نماز سے لے کر کسی قدر رات تک جاری رہی۔ اس میں پانچ سو مسلمان شہید ہو گئے۔ دشمن کا بھی کافی جانی نقصان ہوا۔

دوسرا روز

دوسرے روز پھر جنگ شروع ہوئی۔ اس دوران میں حضرت عمرؓ کے فرمان کے مطابق شام سے وہ چھ ہزار فوج بھی آ گئی، جسے حضرت خالدؓ عراق سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ چنانچہ عین وقت پر یہ فوج پہنچی اور تائید غیبی سمجھی گئی۔ اس کی بدولت مسلمانوں کو اور قوت حاصل ہو گئی۔ اس کے علاوہ عین ہنگامۂ جنگ میں حضرت عمرؓ کے قاصد پہنچے جن کے ساتھ نہایت بیش قیمت عربی گھوڑے اور تلواریں تھیں۔ ان لوگوں نے فوج کے سامنے پکار کر کہا کہ:

'امیر المومنین نے یہ انعام ان لوگوں کو بھیجا ہے جو اس کا حق ادا کر سکیں۔' چنانچہ اس سے مسلمانوں کا جوش اور بھی بڑھا۔

اس روز عربوں نے اونٹ کو جھول اور برقعے پہنا کر اس قدر خوفناک بنا دیا کہ انہیں دیکھ کر ایرانیوں کے گھوڑے بھاگ جاتے تھے۔ اس سے اس روز ایرانیوں کو وہی مصیبت پڑی جو پہلے دن مسلمانوں کو ہاتھیوں کے باعث پیش آئی تھی۔ جنگ آدھی رات تک جاری رہی اور آج مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ اس معرکے میں ایرانیوں کے دو سالار اور ایک شہزادہ مارے گئے۔ دس ہزار ایرانی سپاہی کام آئے اور دو ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

ابومحجن ثقفی کا کارنامہ

جب وقت لڑائی کا ہنگامہ گرم تھا ابومحجن ثقفی ایک مشہور بہادر اور شاعر تھے اور جن کو شراب نوشی کے جرم پر حضرت سعدؓ نے قید کر دیا تھا، قید خانے کے دریچے سے لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کی بیوی سلمیٰ سے گزارش کی کہ مجھے جہاد پر جانے دیں، جیتا بچا تو خود آکر بیڑیاں پہن لوں گا۔“ انہوں نے اجازت دے دی اور ابومحجن حضرت سعدؓ کے گھوڑے پر سوار شریک جہاد ہوتے او میدان جنگ میں شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ اپنے اور بیگانے عش عش کر اٹھے۔ شام ہوئی تو ابومحجن نے آکر خود بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعدؓ کو معلوم ہوا تو اسی وقت ان کو رہا کر دیا اور کہا ”خدا کی قسم! مسلمانوں پر جو شخص یوں نثار ہو میں اس کو سزا نہیں دے سکتا۔“ ابومحجن نے کہا ”بخدا میں بھی آج سے پھر کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔“

تیسرا روز

تیسرے دن جب لڑائی کا آغاز ہوا تو پھر وہی ہاتھیوں کی مصیبت سامنے تھی۔ ہاتھی جس طرف رُخ کرتے، دَل کا دل پھٹ جاتا۔ آخر یہ تدبیر کی گئی کہ ہاتھیوں کی سونڈیں اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر تھے، گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ چند مجاہدین نے پہلے تو ہاتھیوں کو نرغہ میں لیا اور پھر دو مجاہدین قعقاع اور عاصم نے بیک وقت سفید ہاتھی پر حملہ کر کے اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں اور سونڈ کاٹ ڈالی۔ دو اور مجاہدین نے دوسرے ہاتھی کو بھی زخمی کر دیا۔ یہ دونوں بڑے ہاتھی زخمی ہو کر بھاگے تو تمام ہاتھی ان کے پیچھے ہو لیے اور اس طرح یہ دیوارِ آہن ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو کھل کر قوت آزمائی کا موقع ملا اور انہوں نے پوری قوت کے ساتھ حملہ کر دیا اور اس گھمسان کا رن پڑا کہ تلواروں کی جھنکار، نعروں کی گونج اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ دن بھر ہنگامہ کارزار گرم رہا، رات کو بھی اسی شدت کی جنگ جاری رہی۔ دوسرے دن دوپہر کو لڑائی کا فیصلہ ہوا۔ مجاہدین بے جگری سے لڑتے ہوئے ایرانی سپہ سالار رستم کے قریب پہنچ گئے۔ رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ وار لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چور ہو گیا تو بھاگ نکلا۔ ہلال نامی ایک مجاہد نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آگئی۔ رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے۔ ساتھ ہی ہلال بھی کود پڑے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔ ہلال تخت پر چڑھ کر پکارنے:

”ربِ کعبہ کی قسم! رستم کا میں نے خاتمہ کر دیا۔“

ایرانیوں نے دیکھا تو تخت سپہ سالار سے خالی تھا۔ تمام فوج میں بھاگڑ مچ گئی۔ مسلمانوں نے

دور تک تعاقب کیا۔ اس معرکہ میں بیس ہزار ایرانی مقتول ہوئے اور ان کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ گو اس کے بعد عرصہ تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، لیکن ایرانیوں کی اصل قوت قادسیہ کی جنگ میں ٹوٹ گئی تھی۔ اس معرکے میں چھ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ ایرانیوں کا جھنڈا درفش کاویانی چھین لیا گیا۔
اس معرکے میں مسلمان عورتوں نے بھی بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔

مال غنیمت میں سے ہر شہسوار کو چھ ہزار، ہر پیادے کو دو ہزار اور بہادری کے جوہر دکھانے والوں کو مزید پانچ پانچ سو درہم دیئے گئے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی سادگی و شان خلافت

اس عظیم الشان فتح کے بعد حضرت سعدؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو فتح کی خوشخبری سنائی۔ جس دن سے قادسیہ کی جنگ چھڑی تھی، حضرت عمرؓ کو نہایت بے چینی کے ساتھ خبروں کا انتظار رہتا تھا۔ اور آپ قاصد کے انتظار میں روزانہ مدینہ سے باہر نکل جاتے تھے۔ ایک دن معمول کے موافق نکلے، ادھر سے ایک شتر سوار آرہا تھا، بڑھ کر پوچھا کہ کدھر سے آتے ہو؟ وہ حضرت سعدؓ کا قاصد تھا اور مژدہ فتح لے کر آیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ سعدؓ کا قاصد ہے تو اس سے حالات پوچھنے شروع کئے۔ اس نے کہا "خدا نے مسلمانوں کو کامیاب کیا" حضرت عمرؓ رکاب کے برابر دوڑتے جاتے تھے اور حالات پوچھتے جاتے تھے۔ شتر سوار شہر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ جو شخص سامنے آتا ہے ان کو امیر المومنین کے لقب سے پکارتا ہے۔ وہ ڈر سے کانپ اٹھا اور کہا "حضرت نے مجھ کو اپنا نام کیوں نہ بتایا کہ میں اس گستاخی کا مرتکب نہ ہوتا" فرمایا "نہیں کچھ حرج نہیں تم سلسلہ کلام کو نہ توڑو" چنانچہ اسی طرح اس کے ہم رکاب گھر تک آئے۔ مدینے پہنچ کر مجمع عام میں فتح کی خوشخبری سنائی اور یوں خطاب کیا:

"مسلمانو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ میں خود خدا کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا بار میرے سر پر رکھا گیا ہے۔ اگر میں اسی طرح تمہارا کام کروں کہ تم چین سے گھروں میں سوؤ تو میری سعادت ہے اور اگر یہ میری خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو تو میری بدبختی ہے۔ میں تم کو تعلیم دینا چاہتا ہوں، لیکن باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے۔" (الفاروق)

فتح قادسیہ کی اہمیت

فتح ایران کے ضمن میں جنگ قادسیہ ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے ساسانی حکومت کی تقدیر کا فیصلہ ہو گیا۔ ایرانی حکومت کی کمر ٹوٹ گئی اور ان پر مسلمانوں کا ایسا رعب طاری ہوا کہ کہیں ان کے قدم نہ جم سکے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی ایرانیوں سے کئی معرکے ہوئے، لیکن فی الواقع ایرانیوں میں اب وہ

سکست باقی نہیں رہی تھی ۔ جنگ قادسیہ ملک ایران اور ایشیائے کوچک کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ۔ بلاشبہ اس جنگ کو دنیا کی اہم فیصلہ کن جنگوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔

اس فتح سے مسلمانوں کے حوصلے بلند سے بلند تر ہو گئے اور غیر مسلم لوگ جو دریائے فرات کے کناروں پر آباد تھے ۔ جوق درجوق اسلام میں داخل ہونے لگے ۔ عراق میں عربیوں کی آبادکاری کے باعث یہ زرخیز زمین عرب تمدن اور عربی علوم و فنون کا گہوارہ بن گئی اور اکثر علوم اسلامی کا آغاز و ارتقاء اسی سرزمین سے ہوا ۔ عربی اور ایرانی تمدن کے امتزاج نے بہت خوشگوار اثرات مرتب ہوئے علاوہ ازیں مسلمانوں کی مالی و اقتصادی حالت بہت بہتر ہو گئی ۔ اس فتح نے انہیں دنیا کی دولت مندی اور متمدن سلطنت کے خزانوں کا مالک بنا دیا ۔

ایران کے پایۂ تخت مدائن پر قبضہ

قادسیہ کی شکست کے بعد ایرانیوں نے بابل میں اجتماع کیا تھا اس لیے قادسیہ میں دو ماہ قیام کے بعد حضرت سعدؓ بابل روانہ ہو گئے ، لیکن قادسیہ کی جنگ نے ایرانیوں کی کمر (ہمت) توڑ دی تھی ، اس لیے وہ مسلمانوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور وہ ان کو شکست دے کر بابل ، کوثی اور بہرہ شیر وغیرہ پر قبضہ کرتے ہوئے ایران کے پایۂ تخت مدائن کے قریب پہنچ گئے ۔ بہرہ شیر ایک مقام تھا ، یہاں ایک شاہی رسالہ رہتا تھا ، جو ہر روز ایک بار قسم کھا کر کہتا تھا کہ

"جب تک ہم ہیں سلطنت فارس پر کبھی زوال نہیں آ سکتا ۔"

یہاں ایک شیر پلا ہوا تھا جو کسریٰ سے بہت ہلا ہوا تھا اور اسی لیے اس کو بہرۂ شیر کہتے تھے ۔ حضرت سعدؓ کا لشکر قریب پہنچا تو شیر تڑپ کر نکلا ، لیکن ہاشم نے جو ہراول دستہ کے افسر تھے ، اس صفائی سے تلوار ماری کہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا ۔ حضرت سعدؓ نے اس بہادری پر ان کی پیشانی چوم لی ۔

(الفاروق ۔ علامہ شبلی نعمانی)

اسی واقعہ کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے ۔

ع پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

بہرۂ شیر اور مدائن کے درمیان دریائے دجلہ حائل تھا ۔ ایرانیوں نے مسلمانوں کو مدائن پر حملہ سے روکنے کے لیے دجلہ کا پل توڑ کر کشتیاں روک دی تھیں ، اس لیے جب مسلمان دجلہ کے ساحل پر پہنچے تو اسے عبور کرنے کا سامان نہ تھا ۔ حضرت سعدؓ نے خدا کا نام لے کر دجلہ میں گھوڑا ڈال دیا ۔ انہیں دیکھ کر پوری فوج دجلہ میں اتر گئی اور نہایت اطمینان سے باتیں کرتی ہوئی پار پہنچ گئی ۔ ایرانی دور سے یہ حیرت انگیز منظر دیکھتے تھے اور متحیر تھے ۔ جب مسلمان کنارہ پر پہنچ گئے تو متحیر ایرانی "دیواں آمدند دیواں

آمدند" (دیو آگئے، دیو آگئے) کہہ کر بھاگ نکلے۔

ع دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے (اقبالؔ)

یزدگرد پایہ تخت چھوڑ کر بھاگ گیا اور حضرت سعدؓ صفر ۱۶ھ میں مدائن میں داخل ہو گئے۔ جمعہ کا وقت قریب تھا۔ ایوان کسریٰ میں تختِ شاہی کی جگہ منبر نصب کر کے مسلمانوں نے نماز جمعہ ادا کی۔ یہ پہلا جمعہ تھا جو سرزمین عراق میں پڑھا گیا۔

شاہی خزانہ و عجائبات

مدائن کے خزانہ میں صدیوں کی دولت اور زر و جواہر کے علاوہ سلاطین عجم کے نادرۂ روزگار عجائبات اور نایاب یادگاریں جمع تھیں۔ یہ تمام تاریخی نوادر حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کے حکم سے یہ ملبوس ایک شخص محلم کو پہنایا گیا۔ جس وقت اس نے اسے پہنا، جواہرات کی جگمگاہٹ سے لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور انقلابِ دہر کا عجیب عبرت ناک منظر سامنے آ گیا۔ فرشِ بہار سلاطین عجم کا قدیم تاریخی فرش تھا۔ اس پر وہ بہار کے موسم میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے۔ اس میں اس عہد کی ساری صناعیاں صرف کر دی گئی تھیں۔ بہار کی مناسبت سے جواہرات کے گل بوٹے اور پھل پھول تھے۔ سب کی رائے تھی کہ اسے یونہی محفوظ رہنے دیا یا اسے مسجد نبویؐ میں بچھا دیا جائے، لیکن حضرت علیؓ کے اصرار سے حکومت ایران کی طرح اس فرش بہار پر بھی خزاں آ گئی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دیا گیا۔ گویا یہ اس گستاخی کا جواب تھا جس کا ارتکاب خسرو پرویز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نامۂ مبارک پھاڑ کر کیا تھا۔

فتح جلولاء

مدائن میں شکست کھا کر ایرانی فوج جب جلولاء میں پہنچی تو امیروں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس بار عربوں کے ساتھ جم کر مقابلہ کیا جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے مورچے بنا لیے اور ارد گرد خندق کھود کر اس کے چاروں طرف کانٹے بچھا دیئے۔ حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق ان کے مقابلے کے لیے ہاشم بن عتبہ کو بھیجا۔ وہ بارہ ہزار کا لشکر لے کر جلولاء پہنچ گئے اور ایرانیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ ایرانی کسی وقت مورچوں سے باہر آ کر لڑتے اور پھر ان میں جا گھستے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس کافی سامانِ رسد جمع کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ یزدگرد حلوان سے برابر فوجی امداد بھیج رہا تھا۔

یہ محاصرہ طویل ہو گیا اور کئی ماہ جاری رہا۔ ایک دن مسلمانوں نے تنگ آ کر ایرانیوں کے مورچوں پر زبردست حملہ کر دیا اور ان کی خندقوں میں گھس گئے۔ حملہ آوروں میں سب سے آگے قعقاع تھے۔ ایرانیوں نے جب مسلمانوں کی یہ جرأت دیکھی تو بھاگ نکلے اور مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ طبری کی روایت کے مطابق لاکھ آدمی جان سے مارے گئے اور تین کروڑ غنیمت ہاتھ آئی۔

یزدگرد اس شکست کی خبر سن کر حلوان سے بھی بھاگا اور رے کی طرف چلا گیا۔ اسلامی لشکر نے حلوان پہنچ کر اس پر بھی قبضہ کر لیا اور سرحد کی حفاظت کے لیے وہاں کا ایک دستہ مقرر کر دیا۔

بے پناہ مالِ غنیمت

ان فتوحات سے اس قدر مالِ غنیمت حاصل ہوا کہ مدینہ منورہ میں ڈھیر لگ گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ کچھ دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا "جس قوم میں دولت آتی ہے وہاں رشک و حسد بھی ساتھ چلے آتے ہیں۔"

ایک اور موقع پر فرمایا "کاش ہمارے اور دشمنوں کے درمیان ایک دیوار ہوتی، نہ ہم ان کی طرف جاتے اور نہ وہ ہماری طرف آ سکتے۔ کیونکہ مجھے مسلمانوں کی جانیں مالِ غنیمت سے زیادہ عزیز ہیں۔"

؎ یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند بتانِ وہم و گماں، لا اِلٰہ اِلّا اللہ

(اقبال)

کوفے اور بصرے کی آبادی

جو لوگ مدینے سے عراق آتے تھے، انہیں یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر حکم دیا کہ دریائے فرات کے مغرب میں مناسب جگہ تلاش کرو۔ چنانچہ حضرت سعدؓ کی فوجوں نے وہاں خیمے نصب کر لیے۔ اور رفتہ رفتہ آبادی ہو گئی۔ یہ جگہ بعد میں کوفہ کے نام سے مشہور ہوئی جس کا سالِ آبادی ۱۷ھ ہے۔ یہاں ایک جامع مسجد بنائی گئی جس میں چالیس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔

بصرے میں مسلمان اگرچہ ۱۴ھ میں آ گئے تھے، لیکن اس کی آبادی بھی کوفے کے ساتھ اور اسی طرز پر ہوئی۔ اس وقت سے یہ دونوں مقام فوجی چھاؤنیوں کا کام دینے لگے، جہاں سے مشرقی مہمات کے لیے لشکر روانہ کیے جاتے ہیں۔ بعد میں یہی شہر تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے مرکز بن گئے۔

جزیرہ کی فتح

عراق ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ایرانی بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے ہتھیار اٹھا لیے اور تکریت (جزیرہ) کے مقام پر فوج جمع کی۔ حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کو نئی صورتِ حال سے مطلع کیا۔ حضرت عمرؓ عراق سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے، مگر ایرانی جزیرہ میں شورشیں برپا کرنا چاہتے تھے اس لیے ادھر توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ عیاض بن غنم کو پانچ ہزار مجاہدین کے ساتھ اس مہم پر روانہ کیا گیا۔ تکریت کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر قلعہ بند فوج نے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کر لی۔ اہلِ تکریت ذمی بن گئے۔ بعد میں جزیرہ کے دیگر شہروں پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور یوں جزیرہ کا پورا علاقہ زیرنگین ہو گیا۔

فتح خوزستان: عراق کی فتح کے بعد اس پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے یہاں ایک

اسلامی شہر بصرہ آباد ہو چکا تھا۔ اس کا سرحدی علاقہ خوزستان اب تک ایرانیوں کے قبضہ میں تھا، اس لیے بصرہ کی حفاظت کے لیے خوزستان پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ۱۶ھ میں بصرہ کے والی مغیرہ بن شعبہ نے اہواز پر حملہ کرکے یہاں کے والی ہرمزان کو مطیع بنایا، مگر چند دنوں کے بعد وہ پھر باغی ہو گیا۔ اس وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بصرہ کے والی تھے۔ انہوں نے ہرمزان کو شکست دے کر اہواز پر مستقل قبضہ کر لیا۔ اہواز کے سوس فتح کیا۔ سوس کے بعد رامہرمز کا محاصرہ کیا۔ اس کے حاکم نے آٹھ لاکھ درہم سالانہ پر صلح کر لی۔

حضرت ابوموسیٰؓ کی فتوحات کو دیکھ کر ہرمزان نے یزدگرد کی خدمت میں جاکر درخواست کی اگر اہواز اور فارس کی حکومت میرے حوالے کر دی جائے تو عربوں کے سیلاب کو روک دوں گا۔ یزدگرد نے منظور کر لی اور اس کو اہواز اور فارس کی حکومت کا پروانہ دے کر ایک فوج بھی اس کے ساتھ کر دی۔ یہ پروانہ لے کر ہرمزان شوستر آیا اور ایک عظیم الشان فوج تیار کر لی۔

حضرت ابوموسیٰؓ کو اس کی تیاریوں کی خبر ہوئی تو انہوں نے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دے کر مزید مدد مانگی۔ آپ نے فوراً حضرت عمار بن یاسرؓ والی کوفہ کو حکم بھیجا کہ وہ کوفہ کی فوجیں لے کر ابوموسیٰؓ کی مدد کو پہنچیں۔ جریرؓ بن عبداللہ بجلی بھی کچھ فوج لے کر آ گئے۔ ابوموسیٰؓ ان دونوں کو ساتھ لے کر شوستر پہنچے۔ ہرمزان نے مقابلے کے بعد شکست کھائی اور بھاگ کر تستر کے علاقے میں چلا گیا۔ اسلامی لشکر نے اس علاقے کا بھی محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے اس محاصرے کے دوران میں اسّی حملے کیے، جن میں کبھی ایرانی اور کبھی مسلمان غالب آتے تھے۔ آخر کار مسلمانوں نے ایک رات کو شہر میں جانے والی نہر کے راستے اندر جاکر فصیل کے دروازے کھول دیئے اور شہر میں داخل ہو گئے۔

ہرمزان ایک برج پر چڑھ کر لڑ رہا تھا۔ وہ اوپر سے پکارا: میں اس شرط پر اترنے کو تیار ہوں کہ تم مجھے اپنے خلیفہ کے پاس بھیج دو۔ وہ میرے بارے میں جو حکم دیں گے، مجھے منظور ہو گا۔ چنانچہ ابوسبرہؓ نے اسے ایک وفد کے ساتھ مدینے میں بھیج دیا۔

ہرمزان کا قبول اسلام

جب ہرمزان مدینے میں پہنچا تو حضرت عمرؓ اس وقت اکیلے مسجد میں سوئے ہوئے تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ وہ شخصیت ہے جس سے روم و ایران لرزتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "یہ بتاؤ کہ تم معاہدے کر کے توڑتے کیوں رہے ہو؟" ہرمزان نے جواب دینے سے پہلے پانی مانگا۔ جب پانی دیا گیا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "بے فکر رہو، جب تک تم پانی نہ پی لو تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔"

اس پر ہرمزان نے پانی زمین پر پھینک دیا اور کہنے لگا: "اب آپ مجھے حسب وعدہ قتل نہیں کر سکتے۔"

حضرت عمرؓ نے کہا "یہ فریب ہے"۔ لیکن حضرت انسؓ بن مالک اور دیگر صحابہؓ نے کہا "کچھ ہو، اب آپ اسے امان دے چکے ہیں"۔ حضرت عمرؓ کہنے لگے "افسوس! کہ اس نے دھوکے سے امان حاصل کر لی"۔ اس کے بعد ہرمزان مسلمان ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں نے یہ چال اس لیے چلی تھی کہ لوگ مجھے یہ نہ کہیں کہ جان کے خوف سے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمرؓ ہرمزان کے اسلام لانے سے خوش ہو گئے، اور آئندہ ایران کے معاملات میں اس سے مشورے بھی لیا کرتے تھے۔

فتح نہاوند ــــــ ایک اور فیصلہ کُن معرکہ

ایرانیوں کی زبردست تیاری

یزدگرد اس وقت مرو میں تھا۔ یہیں اُسے خبر ملی کہ خوزستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور اس کا قوتِ بازو ہرمزان بھی گرفتار ہو گیا۔ اب تک ایرانی سمجھتے تھے کہ عربوں کا سیلاب سرحد پر آ کر رک جائے گا، لیکن خوزستان پر قبضہ کے بعد ان کو نظر آیا کہ یہ سیلاب پورے ایران کو بہا لے جائے گا۔ اس لیے انہوں نے یزدگرد کو آمادہ کیا۔ اس نے ایران کے تمام چھوٹے چھوٹے ماتحت فرمانرواؤں کو مدد کے لیے لکھا۔ وہ سب اپنی اپنی افواج لے کر پہنچ گئے اور ڈیڑھ لاکھ فوج مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے جمع ہو گئی۔ یزدگرد نے ایران کے مشہور بہادر مردان شاہ کو سپہ سالار بنا کر نہاوند روانہ کیا اور ایران کا تاریخی علم درفش کاویانی جو فتح و ظفر کا نشان سمجھا جاتا تھا، ساتھ کر دیا۔

ایرانی شورش کا اصل سبب

ہرمزان کے ساتھ جو وفد مدینہ منورہ آیا تھا حضرت عمرؓ نے اس سے بھی پوچھا کہ اہلِ ایران عہد کرنے کے بعد اسے توڑ کیوں دیتے ہیں۔ کیا مسلمان ذمیوں کے ساتھ بہتر سلوک نہیں کرتے؟ اہلِ وفد نے کہا: "یہ بات نہیں، بلکہ دراصل معاملہ یہ ہے کہ ایران کا بادشاہ یزدگرد ابھی تک موجود ہے۔ وہ اہلِ عجم کو مسلمانوں کے خلاف اکساتا رہتا ہے۔ اگر کسی طرح اسے وہاں سے نکال دیا جائے تو ان کو بھڑکانے والا کوئی نہیں رہے گا"۔

اسلامی لشکر کی روانگی

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اب اصلی سبب میری سمجھ میں آ گیا ہے"۔ کوفہ کے گورنر حضرت عمار بن یاسرؓ نے جب ایران کے اس زبردست لشکر کی اطلاع دی تو آپ نے اکابر صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت عثمانؓ نے مشورہ دیا کہ آپ خود اہلِ حرم کو لے کر مقابلہ کے لیے نکلیے۔ لیکن حضرت علیؓ نے مخالفت کی اور بھرپور تیاری کر کے کسی اور سپہ سالار کو بھیجا جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مختلف علاقوں سے فوجیں جمع کر کے حضرت نعمانؓ بن مقرن کو سپہ سالار بنا

کر نہاوند روانہ کیا۔ وہاں پہنچ کر پہلے صلح کی بات چیت ہوئی۔

ناکام سفارت

مردان شاہ نہایت ٹھاٹھ سے سر پر زرنگار تاج رکھے طلائی تخت پر بیٹھا تھا اور دربار کا شاہانہ ٹھاٹھ تھا مسلمانوں کی طرف سے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سفیر بن کر گئے۔ انہوں نے بڑی بے باکی کے ساتھ مردان شاہ سے بات کی مردان شاہ متکبرانہ انداز سے بولا "تم ایک ذلیل وحقیر قوم ہو۔ اب بھی اگر تم واپس چلے جاؤ تو معاف کر دیا جائے گا ورنہ تمہاری لاشیں خاک وخون میں تڑپتی نظر آئیں گی" حضرت مغیرہؓ نے کہا "واقعی ہم ایک ذلیل وحقیر قوم تھے، لیکن ہمارے رسولؐ نے ہماری کایا پلٹ دی۔ اس نے ہم سے دنیا میں فتح ونصرت اور آخرت میں جنت کا وعدہ کیا اور اس وقت سے برابر فتح ونصرت ہمارے ساتھ ہے۔ اس لیے اب ہم اس وقت تک واپس نہیں جا سکتے۔ جب تک تمہارے ملک فتح نہ کرلیں یا ہماری لاشیں نہ تڑپیں"

گھمسان کی جنگ اور مسلمانوں کی فتح

غرض مردان شاہ کے تکبر وغرور کے باعث یہ سفارت ناکام رہی اور اس کی واپسی کے بعد جب جنگ چھڑ گئی اور ایسا خونریز معرکہ ہوا کہ عجم کی لڑائیوں کے سلسلہ میں قادسیہ کے سوا ایسی جنگ نہ ہوئی تھی۔ مسلمان نہایت ثبات وپامردی سے لڑے، ہزاروں لاشیں خاک وخون میں نہا گئیں۔ نعمانؓ زخمی ہو کر گرے، زخم مہلک تھا، لیکن انہوں نے منع کیا کہ جب تک لڑائی کا فیصلہ نہ ہو جائے، کوئی ان کی جانب متوجہ نہ ہو۔ چنانچہ ان کے گرنے کے بعد ان کے بھائی نعیم نے علم سنبھال لیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔ اور اسی زور شور کے ساتھ جنگ جاری رہی۔ رات ہوتے ہوتے ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے، مسلمانوں نے ہمدان تک ان کا تعاقب کر کے ہزاروں ایرانیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس جنگ میں تیس ہزار ایرانی سپاہ کام آئی اور ان کی قوت ایسی تباہ ہوئی کہ پھر اس سروسامان کے ساتھ کبھی مسلمانوں کے مقابلہ میں نہ آسکے۔ عرب مؤرخین اس فتح کو "فتح الفتوح" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اختتام جنگ کے بعد معقل حضرت نعمانؓ بن مقرن کے نیم جان لاشہ کے پاس پہنچے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی۔ اس حالت میں بھی زبان سے نکلا "مسلمانوں کا کیا انجام ہوا؟" جواب ملا "خدا نے فتح دی" فرمایا "الحمدللہ! عمرؓ کو اطلاع دو"۔ یہ مژدہ سن کر جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا (غالبؔ)

حضرت عمرؓ کو مہینوں سے بے قراری کے ساتھ جنگ کے نتیجہ کا انتظار تھا۔ عین اس حالت میں قاصد کسریٰ پرویز کے جواہرات کے ڈھیر لیے ہوئے پہنچا۔ فتح کا مژدہ سن کر آپ کو بڑی مسرت ہوئی۔ لیکن جب حضرت نعمانؓ کی شہادت کی خبر سنی تو بے اختیار سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگے اور جواہرات فروخت

کرکے فوج میں تقسیم کرا دیئے۔

ایران پر عام لشکر کشی

گزشتہ وفد کی گفتگو کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کو یقین ہو چکا تھا کہ جب تک ایران کے تخت کا وارث یزدگرد ملک میں موجود ہے، مفتوحہ علاقوں میں فتنہ و فساد بند نہ ہوگا۔ اس لیے آپ نے ایران کے باقی حصوں پر بھرپور حملے کا منصوبہ بنایا اور سات سرداروں کو الگ الگ لشکر دے کر مختلف اطراف کی طرف بھیجا۔ ان سرداروں کے نام یہ ہیں :-

احنف بن قیس، مجاشع بن مسعود، عثمان بن ابی العاص، ساریہ بن زہیم، سہیل بن عدی، عاصم بن عمرو اور حکیم بن عمیر۔

ان سات سرداروں کے ماتحت لشکر ۱۸ھ میں روانہ ہوئے اور کچھ عرصے کی کوششوں کے بعد انہوں نے ایران کے تمام حصوں میں شاندار فتوحات حاصل کرلیں، جن میں اصفہان، آذربائیجان، خراسان کرمان، مکران، سیستان، رے، آرمینیہ، طبرستان وغیرہ کے علاقے شامل تھے۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ ایران کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر طرف اسلام کے پرچم لہرانے لگے۔

یزدگرد کا انجام

خراسان کی فتح کے بعد یزدگرد دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا چین پہنچا۔ خاقان چین نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن اُسے مسلمانوں کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یزدگرد نے مایوس ہو کر خاندان کیانی کا خزانہ اور کل موروثی دولت چین کے حوالے کرنی چاہی، لیکن ایرانیوں نے یہ دولت زبردستی یزدگرد سے چھین لی اور وہ ناکام و نامراد ترکستان چلا گیا یزدگرد کے ملک بدر ہونے کے بعد ایرانیوں نے احنف کے پاس جا کر ان سے صلح کرکے کل خزانے حوالے کر دیا۔ مسلمانوں نے بھی اس کے صلہ میں ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ وہ اپنی بادشاہت بھول گئے اور مسلمانوں سے مصالحت کے بعد ان کو جو راحت اور فارغ البالی نصیب ہوئی وہ کسریٰ کے زمانہ میں بھی میسر نہ آئی تھی۔ (تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین احمد ندوی)

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟ — اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہوئی!
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاندار ہوئی؛ — کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے (اقبال)

فتوح شام

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں شام کے محاذ پر یرموک کی فیصلہ کن جنگ لڑی جارہی تھی کہ آپ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کی

خلافت کی خبر آگئی۔ اس وقت تک حضرت خالدؓ بن ولید بے شمار فتوحات حاصل کر چکے تھے اور اب بعض مسلمان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جہاں خالدؓ ہو، وہاں شکست نہیں ہو سکتی۔ خدا کو چھوڑ کر اس کے ایک بندے پر اس قدر اعتماد حضرت عمرؓ کو پسند نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے خلیفہ بنتے ہی حضرت خالدؓ کی جگہ حضرت ابو عبیدہؓ کو سپہ سالار مقرر کر دیا۔ حضرت ابو عبیدہؓ جنگ یرموک کی فتح کے بعد شام کے علاقوں کی طرف بڑھے اور تھوڑے ہی عرصہ میں کئی اور فتوحات حاصل کر لیں۔

نوٹ:۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے مفصل حالات آگے آئیں گے۔)

فتح دمشق

یہ شہر قدیم زمانے سے مرکز تجارت تھا۔ اس کے ارد گرد مضبوط فصیل تھی مسلمان نے چاروں طرف سے اس کو محاصرے میں لے لیا اور ہر سردار اپنا اپنا لشکر لے کر ایک ایک دروازے پر جم گیا۔ حضرت خالدؓ بھی ایک دروازے پر متعین تھے۔ ایک رات ان کو خبر ملی کہ دمشق کے بطریق (پادری) کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے اور لوگ اس خوشی میں جشن منا رہے ہیں۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مشکوں کے ذریعہ شہر پناہ کی خندق کو پار کیا اور رسّی کا زینہ بنا کر فصیل پر چڑھ گئے۔ ان کے کچھ ساتھی بھی اسی طرح فصیل کے اوپر پہنچ گئے اور اندر جا کر دربانوں کو قتل کر دیا۔ پھر دروازہ توڑ دیا اور مسلمان شہر میں داخل ہو گئے۔

رومیوں نے جب یہ کچھ دیکھا تو دوسری طرف سے حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس جا کر صلح کر لی اور شہر کے باقی دروازے کھول دیئے۔ ایک طرف سے حضرت خالدؓ فتح کے بعد شہر میں داخل ہو رہے تھے اور دوسری طرف سے حضرت ابو عبیدہؓ صلح کے ذریعے اندر چلے گئے اور شہر کے وسط میں دونوں آپس میں ملے۔ پہلے دونوں ایک دوسرے کی کارروائی سے بے خبر تھے۔ اس وجہ سے بعد میں مفتوحہ علاقہ بھی صلح کے رقبے میں شامل کر دیا گیا۔ مالِ غنیمت واپس کر دیا گیا اور قیدی چھوڑ دیئے گئے۔ اہلِ دمشق مسلمانوں کی اس فراخدلی سے بہت متاثر ہوئے

فتح مرج روم

اسلامی لشکر دمشق میں تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ کو معلوم ہوا کہ رومیوں کے دو سپہ سالار مرجِ روم میں اپنے اپنے لشکر لیے پڑے ہیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ حضرت خالدؓ کو ساتھ لے کر فوراً اس طرف بڑھے۔ صبح کو جب مقابلے کا وقت آیا تو خبر ملی کہ ان میں سے ایک سپہ سالار اپنا لشکر لے کر دمشق کی طرف بڑھا رہا ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے فوراً حضرت خالدؓ کو ایک دستہ دے کر پیچھے بھیج دیا۔ دمشق میں اس وقت یزید بن ابی سفیانؓ موجود تھے، وہ مقابلے کے لیے نکل آئے اسی دوران حضرت خالدؓ بھی پہنچ گئے۔ دونوں لشکروں نے دشمن کو گھیرے میں لے لیا اور دشمن کا ایک سپاہی بھی بچ کر نہ جانے دیا۔

فتح حمص:۔ ان معرکوں کے بعد رومی افواج نے حمص میں جمع ہونا شروع کر دیا۔

مسلمانوں نے وہاں پہنچ کر ان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ موسم سخت سردی کا تھا۔ رومیوں نے سوچا مسلمان محاصرہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ لیکن اسلامی لشکر نے اس حال میں بھی ہمت نہ ہاری اور سردیوں کے پورے موسم میں محاصرے پر جمے رہے۔ آخر مجبور ہو کر اہل حمص نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔

فتح قنسرین

حضرت خالدؓ حمص سے قنسرین آ گئے۔ راستے میں رومی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ حضرت خالدؓ نے ان کو شکست دی۔ رومیوں کا سردار مناس مارا گیا، جسے اہل روم قیصر کا ہم مرتبہ قرار دیتے تھے۔ کئی رومی سپاہی گرفتار ہوئے، جنہیں بعد میں چھوڑ دیا گیا یہاں سے اسلامی لشکر قنسرین پہنچا۔ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے محاصرہ کر لیا اور کہلا بھیجا:

"تم لوگ اگر آسمان پر بھی چڑھ جاؤ تو خدا ہم کو بھی وہاں تک پہنچا دے گا یا تم کو ہمارے پاس اتار دے گا۔"

وہ لوگ خوفزدہ ہو گئے اور کچھ عرصہ محصور رہنے کے بعد انہوں نے صلح کر لی۔

فتح اجنادین

حضرت عمروؓ بن العاص فلسطین پر مامور تھے۔ وہ اپنا لشکر لیکر اجنادین کی طرف بڑھے۔ وہاں رومیوں کا سب سے زیادہ چالاک سردار ارطبون تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر فرمایا:

"رومی ارطبون کے مقابلے میں ہمارا عربی ارطبون پہنچا ہے۔ دیکھئے کون بازی لے جاتا ہے۔"

حضرت عمروؓ بن العاص ایک عرصے تک اجنادین کا محاصرہ کئے رہے۔ اسی دوران میں کئی سفیر آتے جاتے رہے۔ لیکن صلح نہ ہو سکی اور نہ ہی فتح کی کوئی صورت نکلی۔ ایک بار حضرت عمروؓ بن العاص خود سفیر بن کر چلے گئے۔ ارطبون نے انہیں دھوکے سے قتل کرانا چاہا لیکن وہ اپنی حکمت عملی اور تدبیر سے وہاں سے بچ نکلے۔ اس کے بعد اسلامی لشکر نے فصیل کے چاروں طرف سے جنگ شروع کر دی۔ آخر مسلمان غالب آ گئے اور رومی شکست کھا کر بیت المقدس کی طرف چلے گئے۔

فتح بیت المقدس

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب شام پر چڑھائی کی تو ہر صوبہ پر الگ الگ افسر بھیجے۔ چنانچہ فلسطین حضرت عمروؓ بن العاص کے حصے میں آیا۔ انہوں نے بعض مقامات حضرت ابوبکرؓ ہی کے عہد میں فتح کر لیے تھے اور فاروقی عہد تک تو نابلس، لد، عمواس، بیت جبرین تمام بڑے بڑے شہروں پر قبضہ ہو چکا تھا۔ جب کوئی عام معرکہ پیش آ جاتا تھا تو وہ فلسطین چھوڑ کر حضرت ابو عبیدہؓ سے جا ملتے تھے اور ان کو مدد دیتے تھے۔ لیکن فارغ ہونے کے بعد فوراً واپس آ جاتے اور اپنے کام میں مشغول ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ آس پاس کے شہروں کو فتح کر کے خاص بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔

عیسائی قلعہ بند ہو کر لڑتے رہے ۔ اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ شام کے انتہائی اضلاع قنسرین وغیرہ فتح کر چکے تھے، چنانچہ ادھر سے فرصت پا کر بیت المقدس کا رخ کیا ۔ عیسائیوں نے ہمت ہار کر صلح کی درخواست کی اور مزید اطمینان کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مسلمانوں کے خلیفہ خود آئیں اور معاہدۂ صلح ان کے ہاتھ سے لکھا جائے ۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع کر دی ۔ آپ نے صحابہ سے مشورے کے بعد سفر کی تیاری کی ۔ حضرت علیؓ کو نائب مقرر کر کے رجب ۱۶ھ میں مدینے سے روانہ ہوئے

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں ؛ " ناظرین کو انتظار ہوگا کہ فاروق اعظم کا سفر اور سفر بھی وہ جس سے دشمنوں پر اسلامی جلال کا رعب بٹھانا مقصود تھا ، کس ساز و سامان سے ہوا ہوگا ؟ لیکن یہاں نقارہ و نوبت ، خدم و حشم ، لاؤ لشکر ایک طرف ، معمولی ڈیرہ اور خیمہ تک نہ تھا ۔ سواری میں گھوڑا تھا اور چند مہاجر و انصار ساتھ تھے ، تاہم جہاں یہ آواز پہنچتی تھی کہ فاروق اعظم نے مدینہ سے شام کا ارادہ کیا ہے ، زمین دہل جاتی تھی ۔"

(الفاروق)

سرداروں کو اطلاع دی جا چکی تھی کہ جابیہ میں آ کر ان سے ملیں ۔ اطلاع کے مطابق یزید بن ابی سفیانؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید وغیرہ نے یہیں استقبال کیا ۔ جابیہ میں دیر تک قیام رہا ۔ بیت المقدس کے عیسائی بھی وہاں آ گئے تھے ، چنانچہ یہیں معاہدہ لکھا گیا اور اس پر تمام معزز صحابہؓ کے دستخط ہو گئے ۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا ارادہ کیا ۔ گھوڑا جو سواری میں تھا ، اس کے سم گھس کر بیکار ہو گئے تھے اور رک رک کر قدم رکھتا تھا ۔ حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر اتر پڑے ۔ لوگوں نے ترکی نسل کا ایک عمدہ گھوڑا حاضر کیا ۔ گھوڑا شوخ اور چالاک تھا ۔ حضرت عمرؓ سوار ہوئے تو کلیل کرنے لگا ۔ فرمایا : " کم بخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سے سیکھی ؟" ۔ یہ کہہ کر اتر پڑے اور پیادہ پا چلے ۔ بیت المقدس قریب آیا تو حضرت ابو عبیدہؓ اور سرداران فوج استقبال کو آئے ۔ حضرت عمرؓ کا لباس اور ساز و سامان جس معمولی حیثیت کا تھا ، اس کو دیکھ کر مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی اپنے دل میں کیا کہیں گے ۔ چنانچہ لوگوں نے ترکی گھوڑا اور قیمتی پوشاک حاضر کی ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا :

" خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لیے یہی بس ہے ۔"

ایک روایت کے مطابق : سفر شام میں شہر کے قریب پہنچ کر قضائے حاجت کے لیے سواری سے اترے اسلمؓ ان کا غلام بھی ساتھ تھا ۔ فارغ ہو کر آئے تو اسلم کے اونٹ پر سوار ہو گئے ۔ ادھر اہل شام استقبال کو آ رہے تھے ، جو آتا تھا پہلے اسلم کی طرف متوجہ ہوتا تھا ۔ وہ حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کرتا تھا ۔ اس بات پر وہ لوگ حیران رہ گئے ۔

غرض اسی حال سے بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ سب پہلے جد میں گئے۔ محراب داؤد کے پاس پہنچ کر سجدہ داؤد کی آیت پڑھی اور سجدہ کیا۔ پھر عیسائیوں کے گرجا کی سیر کی حضرت عمرؓ بیت المقدس سے واپسی میں مفتوحہ علاقوں کا دورہ کر کے سرحدوں کی حفاظت کا انتظام کرتے ہوئے مدینہ واپس تشریف لے گئے۔

معاہدہ بیت المقدس

معاہدہ کا حاصل یوں ہے:

"ان لوگوں کا مال، جانیں اور دین محفوظ رہے گا۔ ان کے گرجے توڑے جائیں گے اور نہ ان میں مسلمان مقیم ہوں گے۔ یہ لوگ بھی دوسرے اہل شہر کی طرح جزیہ دیں گے اور یہودیوں کو اس میں نہ رہنے دیں گے۔ جو رومی یہاں ہیں وہ چلے جائیں تو انہیں ان کے گھروں تک امان ہے۔ اس تحریر پر خدا، رسول، خلفاء اور مسلمانوں کا ذمہ ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ مقرر جزیہ ادا کرتے رہیں۔"

~ ایک بار اور بھی یثرب سے فلسطین میں آ   راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا

(احمد ندیم قاسمی)

فتح مصر ۲۰ھ

مصر کی فتح اگرچہ فاروقی کارناموں میں داخل ہے، لیکن اس کے بانی مبانی حضرت عمروؓ بن العاص تھے۔ وہ اسلام سے پہلے تجارت کے سلسلہ میں اکثر یہاں آیا کرتے تھے اور مصر کی زرخیزی و شادابی کی تصویر ہمیشہ ان کی نظر میں پھرتی رہتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے شام کا جو اخیر سفر کیا، اس میں یہ ان سے ملے اور مصر کی نسبت گفتگو کی۔ حضرت عمرؓ نے پہلے احتیاط کے لحاظ سے انکار کیا، لیکن آخر ان کے اصرار پر راضی ہو گئے اور چار ہزار فوج ساتھ کر دی۔

اس کے علاوہ مصر پر فوج کشی کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مصر کی قبطی حکومت قیصر روم کے ماتحت تھی اور رومیوں پر اس پر پورا اثر تھا اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ قبطیوں کے ذریعہ شام میں شورش برپا کرا سکتے تھے، اس لیے شام کی حفاظت کے لیے مصر کی فتح ضروری تھی۔

اسلامی لشکر مصر کی طرف روانہ ہوا۔ پہلے فرما کے علاقے میں جنگ ہوئی، جو ایک مہینے تک جاری رہی، آخر رومی شکست کھا گئے۔ مسلمان یہاں سے دریائے نیل کے کنارے کنارے مصر کی طرف پہنچ گئے اور وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ مقوقس مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جب مسلمان قریب پہنچ گئے تو وہ قلعہ بند ہو گیا۔ مسلمانوں نے گھیرے میں لے لیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کے ساتھ دس ہزار فوج اور بھیج دی۔ پھر یہ محاصرہ سات مہینے تک طول پکڑ گیا۔ آخر

ایک دن حضرت زبیرؓ نے تنگ آکر کہا کہ "آج میں مسلمانوں پر فدا ہوتا ہوں" یہ کہہ کر ننگی تلوار ہاتھ میں لی اور سیڑھی لگا کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ چند اور صحابہؓ نے ان کا ساتھ دیا فصیل پر پہنچ کر سب نے ایک ساتھ تکبیر کے نعرے بلند کئے۔ ساتھ ہی تمام فوج نے نعرہ مارا کہ قلعہ کی زمین دہل اٹھی، عیسائی یہ سمجھ کر کہ مسلمان قلعہ کے اندر گھس آئے ہیں۔ بدحواس ہو کر بھاگے۔ ادھر حضرت زبیرؓ نے فصیل سے اُتر کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور تمام فوج اندر گھس گئی۔ مقوقس نے یہ دیکھ کر صلح کی درخواست کی اور اسی وقت سب کو امان دے دی گئی اور ایک معاہدہ طے پا گیا۔

متفرق فتوحات

یہ عہدنامہ تمام ملک مصر کے لیے تھا، لیکن قیصر روم نے اسے نہ مانا اور اس نے سمندر کے راستے ایک گراں لشکر اسکندریہ میں اُتار دیا۔ یہاں رومیوں سے کئی معرکے ہوئے، جن میں رومی شکست کھاتے رہے اور مسلمانوں کو کئی علاقے اور مل گئے اور اس طرح چند دنوں میں پورا مصر زیرنگین ہو گیا۔

مصر کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے شمالی افریقہ کا رخ کیا اور سب سے اول برقہ کا محاصرہ کیا۔ یہاں کے باشندوں نے جزیہ دے کر صلح کر لی۔ برقہ کے بعد عقبہ بن نافع کو زدیلہ بھیجا، یہاں کے باشندوں نے بھی صلح کر لی۔ بعد میں حضرت عمروؓ بن العاص نے طرابلس الغرب پر فوج کشی کی اور ایک معمولی جنگ کے بعد وہ بھی فتح ہو گیا۔

فاروقی فتوحات پر تبصرہ

حضرت عمر فاروقؓ کے دس سالہ عہدِ خلافت میں ایران و روم کی عظیم الشان سلطنتوں کے پرخچے اڑ گئے اور ہندوستان سے لے کر شمالی افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا اور اس احتیاط کے ساتھ کہ ان تمام فتوحات میں ظلم و جور کا ایک واقعہ بھی نہیں پیش آیا۔ فاروقی فتوحات کے مقابلے میں سکندری، چنگیزی اور تیموری فتوحات کی اہمیت گھٹانا کہ اس زمانہ میں ایران و روم کی سلطنتیں کمزور پڑ چکی تھیں کس قدر غلط ہے۔

بلاشبہ سکندر، چنگیز اور تیمور نے ایک عالم کو زیرنگین کیا، لیکن اسی کے ساتھ زیر و زبر کر ڈالا۔ وہ صرف جہانگیر تھے، جہاندار نہ تھے۔ اس کے برعکس حضرت عمرؓ کے عہد میں جس احتیاط اور جن قوانین کی پابندی کے ساتھ ایران و روم فتح ہوئے، اس احتیاط کے ساتھ دنیا کا کوئی حکمران زمین کا ایک چپہ بھی فتح نہیں کر سکتا۔ سکندر، چنگیز و تیمور وغیرہ طوفان کی طرح ایک عالم پر چھا گئے، لیکن جب یہ طوفان تھما تو انسانی لاشوں کے انبار اور تباہ شدہ کھنڈروں کے علاوہ اور کوئی شے نظر نہ آتی تھی، وہ جن جن ملکوں سے گزرے انہیں ویرانہ بنا دیا۔

اس کے برخلاف عہدِ فاروقی میں خونِ ناحق کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پایا، ملکوں کو تباہ کرنا تو

بڑی بات ہے، ہری بھری کھیتوں اور شاداب درختوں تک کو نہ کاٹتے تھے۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر تلوار اٹھانے کی سخت ممانعت تھی، پھر مسلمانوں نے جس ملک میں قدم رکھا، اپنے عدل وانصاف اور حسنِ اخلاق سے اس کے باشندوں کو ایسا گرویدہ بنا لیا کہ وہ اپنی قوم کے مقابلہ میں ان کے معاون و مددگار بن گئے۔ انہوں نے قوموں کے دل ودماغ کو مسخر کر لیا اور بہت سی مفتوح قوموں نے ان کا مذہب بھی قبول کر لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ملک فتح ہوئے، وہ سب کے سب مسلمان اور آج تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں میں ایسا جوش، عزم، استقلال، ہمت، حوصلہ مندی، دلیری، اخلاق، حمیت، عدل وانصاف، دیانت وراستبازی پیدا کر دی تھی اور حضرت عمرؓ نے اس میں ایسی جلا دے دی تھی کہ دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

(تاریخ اسلام — شاہ معین الدین احمد ندوی)

"جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے، آج تک کوئی شخص فاروق اعظمؓ کے برابر فاتح اور کشورستاں نہیں گذرا جو کہ فتوحات اور عدل دونوں کا جامع ہو"

(الفاروق — علامہ شبلی نعمانی)

روشن انقلاب

"عرب کے صحرانشین لات وہبل کو توڑ کر اٹھے اور دنیا پر رحمت کی گھٹا بن کر چھا گئے۔ ان کے لوہے نے ہر لوہے کو کاٹا، ان کی تہذیب، تمدن اور اخلاق نے ہر تہذیب، ہر تمدن اور ہر اخلاق پر فتح حاصل کی۔ انہوں نے دنیا سے فساد کے درخت کی جڑیں کاٹیں اور باغِ آدم میں اپنے خون سے صلح اور امن کے درخت کی آبیاری کی۔

چودہ سو برس کے بعد آج بھی ایک مؤرخ حیران ہو کر یہ سوال کرتا ہے کہ عربوں کے گھوڑوں کی رفتار غیر معمولی تھی یا قدرت نے ان کے سامنے زمین کو سمٹنا سکھا دیا تھا۔

یہ ایک انقلاب تھا۔ ایک روشن انقلاب۔ قدرت نے عرب کی ریت کے ذروں کو تاروں کی چمک عطا کی اور انہیں دنیا کے تاریک ترین گوشوں میں بکھیر دیا"

(نسیم حجازی)

نظامِ حکومت

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ---- فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ---- فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (المائدہ: ۴۴، ۴۷)

ترجمہ: جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں ..... وہی ظالم ہیں ...... وہی فاسق ہیں۔

سوال: حضرت عمر فاروقؓ کے نظامِ حکومت کی تفصیلات تحریر کیجیے۔

جواب:

حضرت عمر فاروق کا نظامِ حکومت

جمہوری اندازِ حکومت

بقول علامہ شبلیؒ: "اسلام میں خلافت یا حکومت کی بنیاد اگرچہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں پڑی، لیکن نظامِ حکومت کا دور حضرت عمرؓ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی دو سالہ خلافت میں اگرچہ بڑی بڑی مہمات کا فیصلہ ہوا، یعنی عرب کے مرتدوں کا خاتمہ ہو گیا اور بیرونی فتوحات شروع ہوئیں، تاہم حکومت کا کوئی خاص نظام نہیں قائم ہوا اور نہ اتنا مختصر زمانہ اس کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک طرف تو فتوحات کو وسعت دی کہ قیصر و کسریٰ کی وسیع سلطنتیں ٹوٹ کر عرب میں مل گئیں۔ دوسری طرف حکومت و سلطنت کا نظام قائم کیا اور اس کو اس قدر ترقی دی کہ ان کی وفات تک حکومت کے جس قدر مختلف شعبے ہیں سب وجود میں آ چکے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس حکومت کی ترکیب اور ساخت کیا تھی؛ یعنی شخصی تھی یا جمہوری؟ اگرچہ اس وقت عرب کا تمدن جس حد تک پہنچا تھا۔ اس کے لحاظ سے حضرت عمرؓ کی خلافت پر جمہوری یا شخصی دونوں میں سے کسی ایک کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا، تاہم حکومت کا جو اندازہ تھا وہ جمہوریت سے ملتا تھا کہ شخصیت سے، یعنی سلطنت کا میلان ذاتی اختیارات کی بجائے رائے عامہ پر تھا۔ حضرت عمرؓ کے گرد و پیش جو سلطنتیں تھیں، وہ بھی جمہوری نہ تھیں۔ ایران میں تو سرے سے کبھی یہ ذوق پیدا نہیں ہوا، روم البتہ کسی زمانے میں اس شرف سے ممتاز تھا، لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے سے پہلے وہاں شخصی حکومت قائم ہو چکی تھی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تو وہ بالکل ایک جابرانہ خود مختار سلطنت رہ گئی تھی ——— غرض حضرت عمرؓ نے بغیر کسی مثال اور نمونے کے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی اور اگرچہ وقت کے تقاضے سے اس کے تمام اصول و قوانین مرتب نہ ہو سکے، تاہم جو چیزیں حکومت جمہوری کی روح ہیں سب وجود میں آ گئیں۔

نظامِ حکومت کی تفصیلات

۱۔ مجلس شوریٰ

حضرت عمرؓ کے نظامِ حکومت میں مجلس شوریٰ کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ جب کوئی انتظام پیش آتا تھا تو ہمیشہ اربابِ شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورہ اور کثرتِ رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ تمام جماعت اسلام میں اس وقت دو گروہ تھے جو کل قوم کے پیشوا تھے اور جن کو تمام عرب نے گویا اپنا قائم مقام تسلیم کر لیا تھا، یعنی مہاجرین و انصار مجلسِ شوریٰ میں ہمیشہ لازمی طور پر ان دونوں گروہ کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زید ثابتؓ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مجلس کے انعقاد کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا تھا کہ الصلوٰۃ جامعۃ یعنی سب لوگ نماز کے لیے جمع ہوجائیں۔ جب لوگ جمع ہوجاتے تو حضرت عمرؓ مسجد نبویؐ میں جاکر دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے تھے اور بحث طلب امر پیش کیا جاتا تھا۔ معمولی اور روزمرہ کے کاروبار میں اس مجلس کے فیصلے کافی سمجھے جاتے تھے، لیکن جب کوئی امرِ اہم پیش آتا تھا تو مہاجرین اور انصار کا اجلاس عام ہوتا تھا اور سب کے اتفاق سے وہ امر طے پاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے:

"لاخلافۃ الا عن مشورۃ"

مجلس شوریٰ کا اجلاس اکثر خاص خاص ضرورتوں کے پیش آنے پر ہوتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور مجلس تھی جہاں روزانہ انتظامات اور ضروریات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ مجلس ہمیشہ مسجدِ نبویؐ میں منعقد ہوتی تھی اور صرف مہاجرین صحابہؓ اس میں شریک ہوتے تھے۔

۲۔ عام رعایا کی مداخلت و شرکت

مجلس شوریٰ کے علاوہ عام رعایا کو انتظامی امور میں مداخلت کا حق حاصل تھا۔ صوبجات اور اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کیے جاتے تھے، بلکہ بعض اوقات بالکل انتخاب کا طریقہ عمل میں آتا تھا۔ کوفہ، بصرہ اور شام میں جب عمال خراج مقرر کیے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند سے ایک ایک شخص کا انتخاب کرکے بھیجیں جو ان کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانت دار اور قابل ہوں۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بڑے رتبے کے صحابی اور فاتح ایران تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا، لیکن جب لوگوں نے ان کی شکایت کی تو معزول کردیا۔ یوں حضرت عمرؓ کی حکومت میں ہر شخص نہایت آزادی کے ساتھ اپنے حقوق و اعراض کا اظہار کرکے دادرسی حاصل کرسکتا تھا اور اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

۳۔ خلیفہ اور رعایا کے مساوی حقوق

حکومت جمہوری کا اصل زیور یہ ہے کہ حکمران ہر قسم کے حقوق میں عام آدمیوں کے ساتھ برابر رکھتا ہو، یعنی وہ کسی قانون سے بالاتر نہ ہو۔ ملک کی آمدنی میں سے ضروریاتِ زندگی سے زیادہ نہ لے سکے۔ عام معاشرت میں اس کی کمان حیثیت نمایاں و منفرد نہ ہو۔ اس کے اختیارات محدود ہوں اور ہر شخص کو اس پر نکتہ چینی اور تنقید و محاسبہ کا حق حاصل ہو۔ یہ تمام امور حضرت عمرؓ کی خلافت میں اس درجے تک پہنچے تھے کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھے اور جو کچھ ہوا تھا، خود حضرت عمرؓ کے طریق عمل کی بدولت ہوا تھا۔ اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

ایک موقع پر ایک شخص نے کئی بار حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ اِتَّقِ اللّٰہَ یَا عُمَرُ یعنی: "اے عمرؓ! خدا سے ڈر"۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کو روکا اور کہا کہ بس ہوا"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "نہیں کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں تو یہ بے مصرف ہیں اور ہم لوگ نہ مانیں تو ہم"۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے خطبہ کے دوران لوگوں سے پوچھا: "اگر میں صحیح راہ پر نہ چلوں تو تم لوگ کیا کرو گے"؟ ایک بدو اٹھا اور تلوار نکال کر کہنے لگا: "عمرؓ! یاد رکھو، تمہیں اس تلوار سے سیدھا کر دوں گا"۔ حضرت عمرؓ نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا کہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو مجھے غلط راہ پر چلنے سے روک سکتے ہیں"۔

ایک مرتبہ بھری مجلس میں ایک شخص نے اعتراض کیا کہ آپ نے جو قمیض پہن رکھی ہے، اس میں خیانت کی ہے، کیونکہ یمن سے جو چادریں آئی تھیں، ان میں سے ہر شخص کو ایک چادر ملی تھی لیکن آپ کا قد چونکہ لمبا ہے، اس لیے ایک چادر میں یہ قمیض نہیں بن سکتی۔ اس لیے لازماً آپ نے اور چادر لی ہو گی"۔ اس پر حضرت عمرؓ نے قطعاً برا نہ منایا اور فرمایا، اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہؓ دے گا"۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے اپنے حصے کی چادر والد صاحب کو دی تھی، جس سے یہ قمیض تیار ہوئی"۔ اس پر معترض شخص مطمئن ہو گیا۔ الغرض ایک عام آدمی بھی برملا خلیفۂ وقت کا محاسبہ کر سکتا تھا۔

۴۔ صوبوں کی تقسیم اور عاملوں (گورنروں) کا تقرر و محاسبہ

حضرت عمرؓ نے دس سال کے عہدِ خلافت میں نہایت وسیع نظامِ حکومت قائم کر دیا۔ انتظامی سہولت کے پیشِ نظر ملک کو آٹھ صوبوں میں بانٹ دیا: مدینہ، مکہ، مصر، شام، کوفہ، بصرہ، جزیرہ اور فلسطین۔ اس کے علاوہ مشرق میں فارس، خراسان اور آذربائیجان کے تین صوبے الگ تھے۔ ہر صوبے میں حسبِ ذیل عہدیدار ہوتے تھے: ۱۔ والی (گورنر) ۲۔ کاتب (سیکرٹری) ۳۔ کاتبِ دیوان (اکاؤنٹنٹ جنرل) ۴۔ صاحب الخراج (ناظم مالیات) ۵۔ صاحب الاحداث (پولیس افسر) ۶۔ قاضی۔

ہر عامل سے عہد لیا جاتا تھا کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا، باریک کپڑے نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، دروازے پر دربان نہ رکھے گا۔ اہلِ حاجت کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا۔

جس وقت کوئی عامل مقرر ہوتا تھا، اس کے پاس جس قدر مال اور اسباب ہوتا تھا، اس کی مفصل فہرست تیار کرا کر محفوظ رکھی جاتی تھی اور اگر عامل کی مالی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تھی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔

ہر سال حج کے موقع پر گورنروں کے لیے مکہ حاضر ہونا لازمی تھا۔ جہاں ان کا محاسبہ کیا جاتا اور ان کے خلاف شکایات سنی جاتی تھیں اور ظلم و زیادتی پر قرار واقعی سزا دی جاتی تھی۔ نیز شکایات کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن بھی بنا رکھا تھا، اس طرح آپ کے محاسبہ سے صوبوں کے گورنر خوفزدہ رہتے تھے۔ آپ کی سخت باز پرس سے کوئی عامل نہیں بچ سکتا تھا۔ عیاض بن غنم کو باریک کپڑا پہننے پر سزا دی۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے مکان کی ڈیوڑھی گرا دی، والیٔ مصر حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے نے ایک غریب مسلمان کو کوڑا مارا تو اسے اپنے سامنے یہی سزا دی اور یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

"ان کی ماؤں نے تو اپنے بیٹوں کو آزاد جنا تھا تم نے کب سے انہیں اپنا غلام بنا لیا ہے۔"

۵۔ صیغۂ عدالت

ابتدا میں بعض انتظامی دشواریوں کے باعث کچھ عرصہ تک انتظامی اور عدالتی صیغے ایک رہے۔ لیکن جب پورا نظام قائم ہو گیا تو قضا و عدالت کا محکمہ مستقل کر دیا۔ تمام اضلاع میں عدالتیں قائم کیں، قاضی مقرر کئے اور قضا کے اصول و آئین پر ایک فرمان لکھا۔ قاضیوں کو ہدایت تھی کہ:

"مقدمات میں اول تو قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث کی جانب رجوع کرو۔ اگر اس میں بھی نہ ہو تو اجماع سے، ورنہ اجتہاد سے کام لو۔"

قضا کی خدمت بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اس لیے حضرت عمرؓ قاضیوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس کے لیے انہی بزرگوں کا انتخاب کرتے تھے جن کا علم، تقویٰ، ذہانت اور قوت فیصلہ مسلم تھی۔ کبھی مزید احتیاط کے خیال سے امتحان بھی لیتے تھے۔ قاضیوں کی نہایت معقول تنخواہیں مقرر کی گئیں تاکہ رشوت کا انسداد ہو سکے۔ چنانچہ سلمان بن ربیعہ اور قاضی شریح کی تنخواہ پانچ پانچ سو درہم تھی۔ یہ قاعدہ مقرر کیا کہ دولت مند اور معزز شخص کے علاوہ معمولی آدمی قاضی نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ یہ ظاہر کی کہ دولت مند رشوت کی طرف مائل نہ ہوگا اور معزز شخص فیصلہ کرنے میں کسی کے رعب سے متاثر نہ ہوگا۔

آپ کے ایوانِ عدالت میں ادنیٰ و اعلیٰ اور اپنے بیگانے سب برابر تھے۔ ان میں سے کوئی بھی قانون

کی سزا سے نہ بچ سکتا تھا۔ قاضیوں کو عدل و مساوات کا سبق دینے کے لیے خود فریق مقدمہ بن کر عدالت میں جاتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ بن کعب سے کوئی تنازعہ ہوا۔ انہوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوئے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے تعظیم کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا؛ یہ تمہارا پہلا ظلم ہے۔ جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمر رضی اللہ عنہ دونوں برابر نہ ہوں، اس وقت تک تم منصبِ قضا کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (کنز العمال)

بیت المال

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب خلافت کا باقاعدہ نظام قائم کیا تو دوسرے شعبوں کے ساتھ بیت المال کو بھی وسعت دی اور تمام صوبوں اور مرکزی مقامات پر بیت المال قائم کئے اور ان کے لیے وسیع عمارتیں بنوائیں اور ان پر نہایت لائق اور دیانت دار افسر مقرر کیے۔ دارالخلافہ کے بیت المال کے افسر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ارقم تھے، کوفہ کے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود اصفہان کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن حرث۔ کوفہ کے بیت المال کی عمارت نہایت وسیع اور شاندار تھی۔ بیت المال کے آمد و خرچ کا یہ انتظام تھا کہ ہر صوبہ کی آمدنی وہاں کے بیت المال میں آتی تھی اور وہاں کی حکومت کے اخراجات سے جو رقم بچتی تھی، وہ صدر خزانہ یعنی مدینہ منورہ کے بیت المال میں بھیج دی جاتی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المال کی حفاظت اور نگرانی کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ ایک دفعہ بیت المال کا اونٹ گم ہوا تو خود بھاگ دوڑ کر کے تلاش کیا۔ ایک دفعہ بیمار ہوئے تو حکیم نے شہد تجویز کیا۔ مسجدِ نبوی میں آئے اور عام لوگوں سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں۔ چنانچہ اجازت پر شہد لیا۔

بیت المال کے ذرائع آمدنی یہ تھے:۔

۱۔ خمس (مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ) ۲۔ جزیہ (ذمیوں کا ٹیکس)۔ ۳۔ خراج (غیر مسلم کاشتکاروں سے مالیہ) ۴۔ زکوٰۃ ۵۔ عشر (پیداوار کا دسواں حصہ)۔ ۶۔ فے (وقف کے ذرائع آمدنی) ۷۔ عشور (تجارتی ٹیکس)

بیت المال کی رقم ان مدوں پر خرچ کی جاتی تھی:۔

۱۔ ملازمین کی تنخواہیں ۲۔ وظائف (برائے محتاج و نادار افراد) ۳۔ رفاہِ عامہ کے کام ۴۔ قیدیوں کی کفالت۔ ۵۔ متفرق دینی اور ملکی ضروریات۔

۷۔ ٹکسال

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پہلی مرتبہ غیر ملکی سکے بند کر کے اپنی ٹکسالوں میں چاندی کے سکے ڈھلوانے شروع کئے اور ان پر عربی کی عبارات کندہ کروائیں۔

۸۔ محکمہ پولیس

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرب میں پہلی مرتبہ یہ محکمہ قائم کیا۔ پولیس کے افسر کو صاحب الاحداث کہا جاتا تھا۔ ان کے فرائض میں شامل تھا کہ لوگوں کو کم تولنے سے روکیں، شراب نہ بکنے دیں، سڑک پر مکان نہ بنانے دیں، جانوروں پر ظلم نہ ہونے دیں۔ اس محکمے کو شرطہ

کا نام دیا گیا۔

۹۔ جیل خانے فاروقی عہد سے پہلے جیل خانہ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آپ نے پہلی مرتبہ جیل خانے تعمیر کروائے، اضلاع میں بھی جیل خانے بنائے گئے اور عادی مجرموں کو قید رکھا جانے لگا۔

۱۰۔ محکمہ ڈاک اسے برید کہا جاتا ہے۔ سرکاری مراسلات لانے لے جانے کے لیے تیز رفتار اونٹ اور گھوڑے مہیا کیے گئے۔

۱۱۔ محکمہ افتاء ہر شخص قانون نہیں جان سکتا۔ اس مقصد کے لیے ایک ایسا شعبہ ضروری ہے جو عوام الناس کو مسائل کا حل بتلائے اور قوانین میں ان کی رہنمائی کرے چنانچہ فاروقی عہد میں باقاعدہ محکمہ افتاء قائم کیا گیا۔ اس کا یہ طریقہ تھا کہ نہایت لائق قانون دان یعنی فقہاء ہر جگہ موجود رہتے تھے اور جو شخص کوئی مسئلہ دریافت کرنا چاہتا تھا ان سے دریافت کر سکتا تھا اور اس لیے کوئی شخص یہ عذر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ قانون کے مسئلے سے ناواقف تھا۔

۱۲۔ مردم شماری حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ملک کی باقاعدہ مردم شماری کرائی گئی۔

۱۳۔ محکمہ رفاہِ عامہ (پبلک ورکس) فاروقی عہد میں یہ ایک نہایت عظیم الشان اور وسیع محکمہ تھا۔ لاکھوں افراد اس میں کام کرتے تھے۔ یہ محکمہ مسافر خانے تعمیر کرانا، سڑکیں بنوانا، دریاؤں پر پل باندھنا، شاہراہوں پر چوکیاں، سرائیں، پانی کے حوض اور تالاب کرانا، آب پاشی کے لیے نہریں کھدوانا۔ اس محکمہ کے تحت یہ چار مشہور نہریں کھودی گئیں۔

۱۔ نہر ابو موسیٰ دجلہ سے نکالی گئی۔ اس کی نگرانی بصرہ کے حاکم حضرت ابو موسیٰؓ نے کی تھی۔ یہ ۹ میل لمبی تھی۔

۲۔ نہر معقل بھی دریائے دجلہ سے نکالی گئی، جس کی نگرانی حضرت معقلؓ صحابی نے کی تھی۔

۳۔ نہر سعد، حضرت سعدؓ وقاص (گورنر کوفہ) نے انبار کے لوگوں کی درخواست پر کھدوانے کی کوشش کی، جو پہاڑ حائل ہونے کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکی۔ بعد میں ولید بن عبدالملک کے عہد میں مکمل ہوئی۔

۴۔ نہر امیر المومنین: ۱۸ھ میں جہازوں کی آمد و رفت کے لیے دریائے نیل اور بحیرۂ قلزم کو ملانے کے لیے یہ نہر کھودی گئی۔ یہ ۶۹ میل لمبی تھی۔

۱۴۔ صیغۂ فوج حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں فوج کا کوئی باقاعدہ محکمہ نہ تھا۔ بس بوقت ضرورت جہاد عام کی دعوت دی جاتی تھی۔

حضرت عمرؓ نے ۱۵ھ میں ولید بن ہشام کے مشورہ سے نہایت وسیع اور منظم صیغۂ فوج قائم کیا اور قریش و

انصار کے نام درج رجسٹر کرا کے مدارج کے لحاظ سے ان کی تنخواہیں مقرر کیں، جن کی مقدار دو سو درہم سالانہ سے لے کر دس ہزار سالانہ تھی۔ تنخواہ داروں کی بیویوں اور ان کے بچوں کو بھی وظائف ملتے تھے۔ جن لوگوں کی جتنی تنخواہ مقرر ہوتی تھی، ان کے غلاموں کو بھی اتنی ہی ملتی تھی۔ ان میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جو ہر وقت جنگی مہمات میں مصروف رہتے تھے، یہ گویا باقاعدہ فوج تھی، دوسرے وہ جو اپنے گھروں پر رہتے تھے اور ضرورت کے اوقات میں طلب کیے جاتے ہیں۔ ہم انہیں آج کی اصطلاح میں رضا کار کہہ سکتے ہیں، لیکن تنخواہیں دونوں کو ملتی تھیں۔ تنخواہ کے علاوہ راشن بھی ملتا تھا۔

فوجی بھرتی کو اتنی وسعت دی کہ مہاجرین وانصار سے بڑھتے بڑھتے سارا عرب اس میں شامل ہوگیا تقریباً دس لاکھ ہتھیار بند فوج ہر وقت تیار رہتی تھی اور اس میں ہر سال تیس ہزار فوج کا اضافہ ہوتا تھا۔ فوج کے دروازے تمام مفتوحہ اقوام کے لیے کھلے ہوئے تھے، اس میں عجمی، رومی، یہودی اور ہندوستانی سب شامل تھے۔

فوجی اصلاحات

۱۔ فوجوں کے لیے چھاؤنیاں تھیں اور بڑے بڑے اصطبل تھے، جن میں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت ساز وسامان سے تیار رہتے تھے، تاکہ بوقت ضرورت فوراً سوار دستہ تیار ہو جائے۔ مدینہ، کوفہ، بصرہ موصل، فسطاط مصر، دمشق، حمص اور اردن وغیرہ بڑے بڑے فوجی مرکز تھے، بلکہ کوفہ، بصرہ اور فسطاط فوجی ضرورت ہی کے لیے آباد کیے گئے تھے۔

۲۔ ہر اصطبل کے متعلق چراگاہیں تھیں۔ مدینہ کی چراگاہ کا انتظام حضرت عمرؓ نے اپنے اہتمام میں رکھا تھا۔ عمدہ نسل کے گھوڑوں کی پرورش کا خاص اہتمام تھا۔ گھوڑوں کی رانوں پر داغ کے ذریعے یہ الفاظ لکھے جاتے تھے:

"جَيْشٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

۳۔ فوج کے متعلق جملہ کاغذات اور دفتر انہی مقامات میں رہتے تھے۔

۴۔ رسد کے ذخیرے یہیں تھے، جہاں سامانِ رسد جمع کیا جاتا تھا اور یہیں سے مختلف مقامات پر بھیجا جاتا تھا۔

۵۔ سرحدی علاقوں اور ساحلی مقامات کی حفاظت کے لیے مستقل اور جداگانہ انتظام کیا۔ ضروری مقامات پر جابجا قلعے تعمیر کروائے۔

۶۔ فوج کی صحت وتندرستی اور آرام وآسائش کا خاص اہتمام تھا۔ فوجیں موسم بہار میں سرسبز وشاداب مقام پر چلی جایا کرتی تھیں۔

۷۔ چھاؤنی کے انتخاب میں آب و ہوا کی خوبی کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا، بارکیں وسیع تعمیر کی جاتی تھیں اور ان کے لیے کھلے میدان چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ گرم ملکوں پر سردیوں اور سرد ملکوں پر گرمیوں میں فوج کشی ہوتی تھی۔

۸۔ فوجوں کے لیے شہسواری، تیر اندازی، تیراکی اور ننگے پاؤں دوڑنے کی مشق ضروری تھی۔

۹۔ ہفتہ میں ایک دن جمعہ کا آرام کے لیے ملتا تھا، ہر چار ماہ میں رخصت ملتی تھی۔

۱۰۔ فوج کا عملہ افسر خزانہ، محاسب، قاضی، مترجم اور طبیب و جراح پر مشتمل تھا۔

۱۱۔ سفر مینا یعنی راستہ صاف کرنے، سڑک بنانے اور پل تعمیر کرنے کا کام مفتوحہ قوموں سے لیا جاتا تھا۔

۱۲۔ خبر رسانی اور پرچہ نویسی کا نہایت مکمل انتظام تھا۔ ہر فوج کے ساتھ پرچہ نویس ہوتے تھے، جو ایک ایک بات کی خبر حضرت عمرؓ کو پہنچاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی فوجیں جس حصہ میں بھی ہوتی تھیں، ان کی باگ ڈور حضرت عمرؓ کے ہاتھوں میں رہتی تھی اور ان کے بغیر ان کا قدم نہ اٹھ سکتا تھا۔

۱۳۔ جاسوسی کا بھی باقاعدہ شعبہ قائم تھا اور منجنیق جیسے قلعہ شکن آلات بھی استعمال ہوتے تھے۔

۱۵۔ سن ہجری کی ابتداء

اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ ۲۱ھ میں حضرت عمرؓ کے سامنے ایک تحریر پیش ہوئی، جس پر صرف شعبان کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ کیونکر معلوم ہو کہ گذشتہ شعبان کا مہینہ مراد ہے یا موجودہ۔ اسی وقت مجلس شوریٰ منعقد کی، تمام اکابر صحابہؓ جمع ہوئے اور یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ اکثر نے رائے دی کہ فارسیوں کی تقلید کی جائے جو ماہ و روز کا حساب رکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بحث پیدا ہوئی کہ سنہ کی ابتداء کب سے قرار دی جائے۔ حضرت علیؓ نے ہجرت نبویؐ کی رائے دی اور اسی پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ چنانچہ ماہِ محرم سے ہجری سال کی ابتداء کی گئی۔

۱۶۔ ذمیوں (غیر مسلموں) سے سلوک

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ذمیوں یعنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا جاتا تھا، جو لوگ ان میں سے اسلام لے آتے، ان میں اور عام مسلمانوں میں مساوات کا درجہ پیدا ہو جاتا اور جو جزیہ ادا کر کے ذمیوں میں شامل ہو جاتے، حکومت ان کے مال، جان اور آبرو کی نگرانی ہوتی تھی۔ ان لوگوں کو ہر قسم کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ ان کے عقائد پر کوئی پابندی نہ ہوتی اور ان کے عبادت خانے بالکل محفوظ ہوتے تھے۔ ذمیوں کے باہمی مقدموں کا فیصلہ ان کے مذہبی رہنما کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ ذمیوں کی زمینوں پر مالیہ اور لگان مقرر کرتے وقت ان لوگوں سے بھی مشورہ کر لیا کرتے تھے، پھر اپنے کارندوں کو ہدایت کر دیتے کہ ان لوگوں سے محصول وصول کرتے وقت ناجائز طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ جب کوئی ذمی مفلس و نادار ہو جاتا تو اس کا جزیہ نہ صرف معاف کر دیا جاتا بلکہ اسلامی بیت المال سے اس کے گزارے کے لیے وظیفہ مقرر

کر دیا جاتا تھا۔ الغرض حضرت عمر فاروقؓ کو غیر مسلم رعایا کا اس قدر خیال تھا کہ آپ نے اپنی آخری وصیت میں ان کو فراموش نہیں کیا تھا۔

"میں آنے والے خلیفہ کو ان لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں، جن کو خدا اور رسولؐ کا ذمہ دیا گیا ہے، ان سے کیا ہوا عہد پورا کیا جائے۔ ان کی جان و مال کی حفاظت میں لڑا جائے اور ان کی استطاعت سے زیادہ ان کو تکلیف نہ دی جائے۔"

۱۷۔ شعبہ تعلیم واشاعتِ اسلام

حضرت عمرؓ نے وسیع پیمانے پر تعلیم کی اشاعت کی۔ دینِ اسلام کی بنیاد کلام اللہ پر ہے، اس لیے اس کی حفاظت تعلیم اور اشاعت کا بڑا اہتمام کیا۔ عہد صدیقی میں آپ ہی کے اصرار سے قرآن مجید کی تدوین ہوئی۔ اپنے زمانہ میں تمام مفتوحہ ملکوں میں قرآن کی تعلیم کے مکتب قائم کئے۔ ان مکتبوں میں کتابت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ حفاظ قرآن صحابہؓ کو مختلف مقامات پر قرآن کا درس دینے کے لیے بھیجا۔ بدوؤں کے لیے قرآن کی تعلیم لازمی تھی۔ قرآن کے طلبہ کے وظائف مقرر کیے۔ ان تدابیر سے ہزاروں حفاظ قرآن پیدا ہو گئے۔ قرآن مجید کے بعد حدیث نبویؐ کا درجہ ہے۔ چنانچہ اس کی تلاش، حفاظت اور اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ عملی زندگی میں زیادہ تر فقہ سے کام پڑتا ہے۔ خصوصاً فاروقی عہد میں اسلامی تمدن کی ترقی سے صدہا نئے مسائل پیدا ہوئے۔ اس لیے اس زمانہ میں علم فقہ کی بڑی ترقی واشاعت ہوئی، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ فقہ کی تکمیل حضرت عمرؓ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔

بحیثیت خلیفہ رسولؐ کے سب سے مقدم فرض اسلام کی تبلیغ تھا۔ آپ نے اس کے لیے مختلف ذرائع اختیار کئے اور آپ کے زمانہ میں اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی۔ لیکن جبر سے نہیں بلکہ اسلام کے محاسن کی تبلیغ کے ذریعہ۔ آپ جبری اسلام کے خلاف تھے۔ ایک مرتبہ اپنے غلام کے سامنے اسلام پیش کیا، اس نے انکار کیا تو آپ نے لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کہہ کر چھوڑ دیا۔

آپ نے تبلیغ واشاعتِ اسلام کی مختلف شکلیں اختیار کیں: جب کسی ملک پر فوج کشی ہوتی تھی تو افسر فوج کو تاکید تھی کہ وہ پہلے اسلام پیش کرے۔ تبلیغ اسلام کی سب سے بڑی تدبیر یہ ہے کہ غیر مذاہب والوں کے سامنے اسلام کا ایسا عملی نمونہ پیش کیا جائے، جسے دیکھ کر وہ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کا اس سلسلہ میں اصلی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی تعلیم وارشاد اور احتساب سے مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تصویر بنا دیا تھا، جسے دیکھ کر غیر قومیں خود بخود اسلام کی طرف راغب ہوتی تھیں۔ دین کی عملی خدمت کے سلسلہ میں بکثرت مسجدیں تعمیر کرائیں۔ شام کے عمال کو حکم بھیجا کہ ہر شہر میں ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ کوفہ میں ہر ہر قبیلہ کی مسجد علیحدہ تعمیر کرائی۔ اس طرح آپ نے چار ہزار مساجد تعمیر کرائیں اور

تنخواہ دار امام اور مؤذن مقرر کئے۔ علاوہ ازیں حرم پاک اور مسجد نبویؐ کی توسیع کی۔

۱۸۔ رعایا کی خبر گیری

حضرت عمر فاروقؓ خود کو حکمران نہیں بلکہ عوام کا خادم تصور کرتے تھے جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے: **سید القوم خادمھم** یعنی قوم کا سردار قوم کا خادم ہے۔ نیز آپؓ اس فرمانِ نبویؐ پر عمل پیرا تھے۔ **کلکم راع و کلکم مسعول عن رعیتہ**، یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور وہ اپنے رعیت کے لیے جواب دہ ہے اگرچہ حضرت عمرؓ نے ایسا نظامِ حکومت وضع کر دیا تھا کہ ہر شخص کو اس کا حق ملے اور کسی پر ظلم و زیادتی نہ ہو تاہم ان تمام باتوں کے باوجود آپ کو تسلی نہ تھی، چنانچہ آپ اکثر ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے لوگوں کی شکایات براہِ راست سنتے اور ان کا ازالہ کرتے تھے۔ شام کے سفر میں ایک غریب بڑھیا نے شکایت کی تو بہت متاثر ہوئے اور اس کی داد رسی کی۔ اس مقصد کے لیے آپ اکثر رات کے وقت گشت فرمایا کرتے تھے اور براہِ راست رعایا کا حال معلوم کر کے ان کے دکھوں کا مداوا کرتے تھے۔

ایک دفعہ گشت کے دوران دیکھا کہ ایک شیر خوار بچہ ماں کی گود میں رو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ بچہ اس لیے رو رہا ہے کہ ماں اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے، کیونکہ خلیفہ کا حکم تھا کہ بچے جب تک دودھ نہ چھوڑیں بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے اس پر حضرت عمرؓ لرز گئے اور نیا حکم جاری کر دیا کہ بچے جس دن پیدا ہوں، اسی تاریخ سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

ایک رات گشت کے دوران دیکھا کہ ایک عورت جھوٹ موٹ ہنڈیا میں کچھ پکا رہی ہے اور بچے رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ اسی وقت اٹھے اور بیت المال سے راشن لیا۔ غلام اسلم نے اسے اٹھانا چاہا تو فرمایا کہ قیامت کے روز تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ چنانچہ خود راشن اٹھا کر لائے اور کھانا تیار کر کے بچوں کو کھلایا۔ عورت بولی: خلیفہ تو تمہیں ہونا چاہیئے نہ کہ عمرؓ کو، کہا کہ کل خلیفہ کے پاس جانا، وہ تمہارا وظیفہ لگا دیں گے۔ چنانچہ وہ عورت وہاں گئی تو حیران رہ گئی کہ یہی شخص تو ہماری خدمت کر رہا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

ایک رات گشت کر رہے تھے۔ ایک بدو اپنے خیمہ سے باہر بیٹھا تھا کہ اچانک خیمہ سے رونے کی آواز آئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا تو بتایا کہ میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ حضرت عمرؓ گھر گئے اور اپنی بیوی حضرت امِ کلثوم کو ساتھ لائے اور خیمے میں بھیجا۔ تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا۔ حضرت امِ کلثوم نے پکارا کہ امیر المومنین اپنے دوستوں کو مبارک باد دیجیے۔ اس پر بدو چونک پڑا اور مؤدب ہو بیٹھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نہیں کچھ خیال نہ کرو۔ کل میرے پاس آنا۔ میں اس بچہ کی تنخواہ مقرر کر دوں گا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت و جانشینی

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن ۔۔۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

(اقبال)

سوال: حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت اور جانشینی پر نوٹ لکھیے۔

جواب: **حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت** :-

فیروز پارسی

مدینہ منورہ میں فیروز نامی ایک پارسی غلام تھا، جس کی کنیت ابولولو تھی، وہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا غلام تھا۔ مذہباً مجوسی تھا۔ رومیوں کے پاس اسیر ہو کر گیا۔ وہاں سے مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اس نے ایک دن حضرت عمرؓ سے آکر شکایت کی کہ میرے آقا نے مجھ پر بہت بھاری محصول مقرر کیا ہے، آپ کم کرا دیجیے۔ حضرت عمرؓ نے مقدار پوچھی۔ اس نے کہا روزانہ دو درہم (قریباً سات آنے) آپ نے پوچھا، "تو کون سا پیشہ کرتا ہے؟" بولا کہ نجاری، نقاشی، آہنگری۔ فرمایا کہ "ان صنعتوں کے مقابلہ میں رقم کچھ بہت نہیں ہے۔" فیروز دل میں سخت ناراض ہوا۔ وہ جانے لگا تو آپ نے فرمایا: "سنا ہے تم ہوا سے چلنے والی چکی بہت اچھی بنالیتے ہو۔ ایک میرے لیے تیار کرو۔" اس نے کہا، "بہتر، میں ایسی چکی بنادوں گا جس کا ذکر شرق و غرب تک ہوگا۔" آپ سمجھ گئے کہ یہ قتل کی دھمکی ہے لیکن محض شبہ کی بنا پر کوئی اقدام نہ کیا۔

قاتلانہ حملہ

۲۸۔ ذی الحجہ ۲۳ھ کو حسب معمول آپؓ مسجد میں نماز پڑھانے آتے، صفیں درست کرائیں۔ حضرت عمرؓ نے ابھی نیت باندھی ہی تھی کہ فیروز نے جو اندھیرے میں مسجد کے ایک گوشہ میں چھپا ہوا تھا، یکایک جھپٹ کر دو دھاری خنجر سے آپ پر چھے کاری وار کئے جس سے آپ کا معدہ اور آنتیں کٹ گئیں۔ گرتے گرتے آپ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا اور انہوں نے چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر جلدی سے نماز ختم کر دی۔ لوگوں نے فیروز کو پکڑنا چاہا مگر اس نے دائیں بائیں خنجر کے وار کر کے کئی اور مسلمانوں کو زخمی کر دیا، جن میں سے ایک شہید ہو گیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر ایک صحابی نے فیروز پر پیچھے سے چادر ڈال کر گرا دیا۔ جب اسے فرار کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر لی۔

جب لوگ نماز پڑھ چکے تو حضرت عمرؓ نے پوچھا، میرا قاتل کون ہے؟ بتایا گیا کہ مغیرہؓ کا غلام فیروز۔

فرمایا، الحمدللہ کہ میری موت کسی مدعی اسلام کے ہاتھ سے نہیں ہوئی۔" اس کے بعد آپ تین دن تک جیا کیے۔

سازش

عصر حاضر کے مستند اور معروف مؤرخین عباس محمود العقاد اور محمد حسین ہیکل اس دو درہم والی روایت سے متفق نہیں ہیں۔ ان کی رائے میں حضرت عمرؓ کی شہادت ایک سازش کا نتیجہ تھی۔ ایران میں اسلامی اقتدار کے خلاف سازش کا جال بنا گیا، جس میں ہرمزان، ابولولو فیروز اور کعب بن احبار یہودی بھی شامل تھے۔ زخمی ہونے کے تیسرے دن یکم محرم ۲۴ھ کو انتقال فرمایا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی۔

ادائیگی قرض

آپؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ سے دریافت کیا کہ مجھ پر کس قدر قرض ہے معلوم ہوا کہ ۸۶ ہزار درہم ہے۔ یہ رقم قرض لے کر آپ نے مسلمانوں پر خرچ کی تھی۔ چنانچہ آپ کا مسکونہ مکان بیچ کر یہ قرض ادا کر دیا گیا۔ (الفاروق)

سب سے بڑی آرزو

وفات سے پہلے اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ سے کہا: ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ، ان سے کہو، عمرؓ سلام عرض کرتا ہے اور روضۂ رسولؐ میں دفن ہونے کی استدعا کرتا ہے، اجازت عطا کر دیں۔ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ انہوں نے درخواست پیش کی۔ حضرت عائشہ نے فرمایا" خدا گواہ ہے کہ یہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی، لیکن آج میں عمرؓ کو اپنے اوپر ترجیح دیتی ہوں"۔ حضرت عمرؓ بے چینی سے جواب کے منتظر تھے جب آپ کے بیٹے نے اجازت کے بارے میں بتایا تو فرمایا" الحمدللہ، مجھے اس سے زیادہ اور کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ یہی سب سے بڑی آرزو تھی۔" پھر آپ کے دل میں خیال گذرا کہ شاید حضرت عائشہؓ نے میرے خلیفہ ہونے یا میری زندگی میں مروت کی وجہ سے اتنا بڑا ایثار کیا ہو، اس لیے فرمایا" دیکھو عبداللہ جب میں فوت ہو جاؤں تو میرا جنازہ لے کر جانا اور ام المؤمنینؓ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہنا" عمرؓ بن خطاب داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔" اگر وہ اجازت دے دیں تو جنازہ اندر لے جانا ورنہ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔" چنانچہ آپ کو وصال کے بعد روضۂ رسولؐ میں دفن کیا گیا۔

جانشین

اس وقت سب سے اہم مسئلہ آپ کی جانشینی کا تھا۔ اس میں مختلف قسم کی مشکلات پیدا ہو چکی تھیں۔ اس لیے آپ کی وفات سے پہلے صحابہ کرامؓ نے آپ سے جانشین نامزد کرنے کے لیے درخواست کی۔ آپ کے لیے یہ مسئلہ ہمیشہ سب سے اہم تھا اور اکثر آپ زندگی میں اس پر غور کیا کرتے تھے، لیکن کسی پر نظر نہ جمتی تھی۔ بعض لوگوں نے آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کا نام پیش کیا، لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا۔ آخر کار لوگوں کے اصرار پر حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف چھے حضرات کو جن کی اسلام میں بڑی خدمات تھیں

اور جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی، نامزد کر کے فرمایا کہ ان میں جس پر کثرت رائے ہو جائے اسے امیر بنانا اور تاکید کر دی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے ہو جائے اور حضرت صہیبؓ کو حکم دیا کہ میرے دفن سے فراغت کے بعد ان چھ افراد کو ایک مکان کے اندر بند کر دینا اور جب تک ان میں سے کسی کا انتخاب نہ ہو جائے اس وقت تک دروازہ نہ کھولنا عبداللہؓ مشورہ میں شریک رہے گا، لیکن امارت سے اسے کوئی تعلق نہ ہوگا۔"

آخری وصیتیں

نامزدگی کے مرحلہ سے فارغ ہو کر لوگوں سے فرمایا کہ جو شخص خلیفہ منتخب ہو، وہ مہاجرین انصار، اعراب، اہل عرب اور ذمیوں کے حقوق کا پورا خیال رکھے، اور ان میں سے ہر ایک کے حقوق کی تشریح فرما کر تاکید فرمائی کہ ذمیوں سے جو اقرار ہے، اسے پورا کیا جائے، ان کے دشمنوں سے لڑا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان کو تکلیف نہ دی جائے۔

سیرت و کردار، دینی خدمات اور فضائل

" اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق جاری کر دیا ہے " (الحدیث)

" بلاشبہ تم سے پہلے کی امتوں میں کچھ لوگ محدث تھے اور میری امت میں اگر کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہے " (الحدیث)

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

(اقبال)

سوال: حضرت عمر فاروقؓ کے سیرت و کردار دینی خدمات اور فضائل پر روشنی ڈالیے۔

جواب:

حضرت عمرؓ سیرت و کردار کے آئینہ میں

حضرت عمر فاروقؓ اسلام کی شوکت و عظمت کا نشان تھے، بڑے بہادر، جری اور نڈر مسلمان تھے، اسلام کے تحفظ اور حق کی خاطر اکثر آپ کی تلوار بے نیام رہتی۔ ایک طرف سادگی کا یہ عالم کہ لباس پر سترہ سترہ پیوند لگتے ہیں، لیکن دوسری طرف رعب و دبدبہ یہ تھا کہ قیصر و کسریٰ آپ کے نام سے لرزتے تھے۔ آپ اپنے آپ کو ایک عام مسلمان کی سطح پر رکھتے تھے۔ ہر شخص کو ان پر تنقید کا حق حاصل تھا۔ آپ کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر تھے۔ دروازہ پر کبھی دربان نہ بٹھایا۔ زہد و قناعت اور سادگی میں آپ تمام صحابہؓ میں ممتاز تھے بڑے صائب الرائے تھے، اکثر معاملات میں آپ کی رائے پر عمل کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید کی کئی آیات آپ کی خواہش پر نازل ہوئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے قبول اسلام کے لیے خدا سے خصوصی دعا مانگی تھی چنانچہ آپ حضورؐ کی مراد تھے۔ اور آپؓ اسلامی تعلیمات کی مجسم تصویر تھے۔ ایک غیر مسلم مؤرخ کی رائے ہے کہ:

" اگر مسلمانوں میں ایک اور عمرؓ پیدا ہو جاتا تو روئے زمین پر مسلمانوں کے علاوہ اور کوئی قوم نظر نہ آتی "

۱ حلیہ مبارک و رعب و جلال

آپ کا رنگ سرخ و سفید تھا جس پر سرخی غالب تھی۔ قد اس قدر دراز تھا کہ پیدل بھی سوار معلوم ہوتے تھے۔ سینکڑوں، ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں کھڑے ہوتے تھے ان کا قد سب سے لمبا تھا۔ رخسارے کم گوشت، داڑھی گھنی، مونچھیں بڑی بڑی، سر کے بال سامنے سے اڑ گئے تھے۔ بقول امیر علی: "آپؓ کشیدہ قامت

اور مضبوط تھے۔ آپ کی شخصیت بڑی وجیہہ، بارعب اور پرجلال تھی۔ آپ کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بولنے سے قوت و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ آپ سراپا رعب و جلال تھے، جو آپ کی انتہائی حق پرستی کا نتیجہ تھا۔ لوگوں پر آپ کی ہیبت چھائی رہتی تھی۔ آپ ہر اس شخص سے سخت رویہ اختیار کرتے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادتی کرتا، دین کے معاملہ میں احتیاط نہ برتتا اور اسلام کا مخالف ہوتا۔ بے جا سختی سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ آپ کی سختی کی اصل وجہ حق گوئی اور حق پرستی تھی۔ آپ خود فرماتے ہیں:

"واللہ! میرا دل اللہ تعالیٰ کے بارے میں جب نرم ہوتا ہے تو جھاگ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتا ہے اور جب سخت ہوتا ہے تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔"

۲۔ سادگی

آپؓ کی پوری زندگی سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ وسیع و عریض سلطنت کے حکمران ہونے کے باوجود مدینہ کی گلیوں میں پیوند لگے لباس میں گھومتے پھرتے تھے، صحن مسجد میں یا کسی چٹیل میدان میں سرہانے اینٹ رکھ کر بلا تکلف سو جاتے۔ خود بھی سادگی پسند تھے اور اپنے حکام کو بھی سادگی کی تلقین کرتے تھے۔ ایک جوڑا سردیوں کا اور ایک جوڑا گرمیوں کا رکھتے، بعض اوقات صرف ایک لباس ہوتا جسے دھو کر پہن لیتے۔ آپ گزارہ کے لیے صرف دو درہم روزانہ بطور وظیفہ لیتے۔ آپ کا قول ہے:

"مسلمانوں کے مال میں میرا اتنا ہی حق ہے جتنا ایک یتیم کے مال میں متولی کا ہوتا ہے۔"

عیش و عشرت اور آرام و راحت سے آپ بیزار تھے۔ عظیم حکمران ہونے کے باوجود جَو کی نمکین روٹی ستو، کھجور اور سادہ پانی آپ کی غذا تھی۔ ایک دفعہ آپ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ نے کھانے میں زیتون کا تیل ملا دیا تو اسے تناول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ سادگی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کا نمونہ تھے۔

۳۔ زہد و قناعت

آپ کی کتاب اخلاق کا سب سے روشن باب زہد و قناعت اور سادگی و تواضع ہے۔ آپ کا زہد اکابر صحابہؓ میں مسلم تھا۔ حضرت طلحہؓ فرماتے تھے کہ قدامت اور ہجرت کے لحاظ سے بہت سے لوگوں کو حضرت عمرؓ پر فضیلت حاصل ہے لیکن زہد و قناعت میں آپ سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ حکومت کے تخت جلال پر بیٹھ کر جس زہد و قناعت کا نمونہ آپ نے دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ آپ کی زندگی کا ایک رُخ یہ ہے کہ ایران و روم پر فوجیں بھیج رہے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے معاملہ درپیش ہے۔ حضرت خالدؓ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص سے باز پرس ہو رہی ہے۔ فاتح ایران و مصر کے نام فرامین جاری ہو رہے ہیں، دوسرا رخ یہ ہے کہ بدن پر پیوند لگا ہوا کُرتا، سر پر پھٹا ہوا عمامہ، پاؤں میں بوسیدہ

چپل، اسی حالت میں بیوہ عورتوں کے گھروں میں پانی بھرنے کے لیے کاندھے پر مشک ہے، یا کسی وقت مسجد کے گوشہ میں کام سے تھک کر فرشِ خاک پر نیند آگئی ہے۔

۴۔ خشیتِ الٰہی (خوفِ خدا) تمام محاسنِ اخلاق کا سرچشمہ خشیتِ الٰہی ہے۔ خدا کا خوف آپ کے رگ وپے میں جاری وساری تھا اس کے مواخذہ کے خوف سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر آسمان سے صدا آئے کہ ایک آدمی کے سوا تمام دنیا جنتی ہے، اب بھی مواخذہ کا خوف رہے گا کہ شاید وہ ایک بدقسمت انسان میں ہی ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی رحمت پروردگار کے طلب گار بھی رہتے تھے کہ اگر یہ اعلان کیا جائے کہ صرف ایک آدمی جنت میں جائے گا، تو میں امید رکھوں گا کہ شاید وہ خوش قسمت انسان میں ہی ہوں۔ ایک مرتبہ راہ سے تنکا اٹھا کر فرمایا: "کاش میں بھی خس وخاشاک ہوتا، کاش میں پیدا ہی نہ کیا جاتا، کاش میری ماں مجھے نہ جنتی"۔ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے پوچھا، کیوں ابوموسیٰؓ! اس پر راضی ہو کہ ہم لوگ اسلام، ہجرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت کے طفیل میں برابر سرابر چھوٹ جائیں، نہ عذاب ملے، نہ ثواب "۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا: "میں تو اس پر راضی نہیں ہوں، ہم لوگوں نے نیکیاں کی ہیں، ان کے صلہ کی امید رکھتے ہیں"۔ فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ عمرؓ کی جان ہے، میں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ بے مواخذہ چھوٹ جاؤں"۔ آپؓ نماز میں بالعموم ایسی سورتیں پڑھتے تھے جن میں قیامت کی ہولناکی اور خدا کی عظمت وجلال کا ذکر ہوتا، ان کو پڑھ کر زار زار روتے تھے۔

۵۔ حُبّ رسولؐ آپ کو ذاتِ نبویؐ سے والہانہ لگاؤ، شیفتگی اور محبت تھی۔ جان، مال، اولاد ہر محبوب چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فدا تھی۔ گویا یہ کیفیت تھی ؎

محمدؐ ہے متاعِ عالمِ ایجاد سے پیارا | پدر، مادر، برادر، جان، مال، اولاد سے پیارا

(حفیظ جالندھری)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواجِ مطہرات سے ناراض ہو کر چند دنوں کے لیے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی تو حضرت عمرؓ کاشانۂ نبویؐ پر حاضر ہوئے، لیکن بار بار اذن طلب کرنے پر بھی جب باریابی کی اجازت نہ ملی تو پکار کر عرض کیا، خدا کی قسم! میں حفصہؓ (ام المومنین حضرت عمرؓ کی صاحبزادی) کی سفارش کے لیے نہیں آیا ہوں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں تو اس کا سر قلم کر دوں"۔ وصالِ نبویؐ کے موقع پر آپؓ پر غلبہ محبت میں اس قدر وارفتگی طاری ہوئی کہ تلوار لے کر کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ حضورؐ وفات پا گئے، میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد جب

عہد مبارک یاد آجاتا تو روتے روتے بے تاب ہو جاتے تھے۔ شام کے سفر میں جب حضرت بلالؓ نے مسجد اقصیٰ میں اذان دی تو حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد تازہ ہو گئی اور اس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ وصالِ نبویؐ کے بعد گو عرب کی سرزمین میں سونے چاندی کے انبار لگ گئے تھے لیکن حضرت عمرؓ حضور اکرمؐ کی پُر عسرت زندگی کی یاد میں اچھا کھانا نہ کھاتے تھے۔ اسی طرح جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام متعلقین کا پاس و لحاظ اپنی اولاد سے زیادہ کرتے تھے۔

۶۔ پابندیٔ سُنّت رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے اس محبت شیفتگی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپؓ کسی کام میں سنت رسولؐ سے تجاوز نہ کرتے تھے۔ عبادات و معاملات کا ذکر نہیں، روزمرہ زندگی میں بھی اتباعِ سنت کا پورا اہتمام تھا عمال کو پابندیٔ سنت کے تاکیدی احکام بھیجتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ یزید بن ابی سفیانؓ کے ساتھ کھانا کھایا۔ معمولی کھانوں کے بعد جب عمدہ قسم کے کھانے لائے گئے تو ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں عمرؓ کی جان ہے، اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روش سے ہٹ جاؤ گے تو خدا تم کو جادہ مستقیم سے ہٹا دے گا۔"

وسعت کے باوجود اتباعِ سنت کے خیال سے بڑی تنگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ نے عرض کیا کہ اب خدا نے خوش حالی عطا فرمائی ہے۔ اس لیے آپ کو نرم کپڑوں اور اچھی غذا سے پرہیز نہ کرنا چاہیئے۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا، جانِ پدر! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عسرت کی زندگی بھول گئیں۔ خدا کی قسم! میں اپنے آقا کے نقشِ قدم پر چلوں گا کہ آخرت کی فراغت اور خوشحالی نصیب ہو۔

محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی ۔۔۔ خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

۷۔ احتساب نفس

حضرت عمرؓ سختی سے اپنا احتساب نفس کرتے تھے۔ جب کبھی دل میں فخر و غرور کا شائبہ پیدا ہوتا تھا تو فوراً اس کا تدارک کرتے تھے۔

ایک دفعہ خطبہ میں کہا کہ "صاحبو! ایک زمانہ تھا کہ میں اس قدر نادار تھا کہ لوگوں کو پانی بھر کر لا دیا کرتا تھا، وہ اس کے صلے میں مجھ کو چھوہارے دیتے تھے، وہی کھا کر بسر کرتا تھا۔" یہ کہہ کر منبر سے اتر آئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ منبر پر کہنے کی کیا بات تھی؟ فرمایا: "کہ میری طبیعت میں ذرا غرور آگیا تھا، یہ اس کی دوا تھی۔"

۸۔ شجاعت

حضرت عمرؓ شجاعت اور بہادری میں بھی بے مثال تھے۔ اسلام سے پہلے بھی آپ قریش مکہ میں شجاعت و بہادری کے اعتبار سے مشہور تھے اور مسلمان ہونے کے بعد تو حقیقتاً اسلام کو بڑی تقویت ملی۔ خود حضور اکرمؐ فرماتے تھے کہ عمرؓ کی وجہ سے اسلام کو مدد ملی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ جب مسلمان ہوئے، ہم لوگوں کو برابر غلبہ حاصل ہوا۔

آپ کی ساری زندگی شجاعت اور مردانگی سے بھری پڑی ہے۔ غزوہ احد اور غزوہ حنین میں جب مسلمانوں کو شکست ہوتی نظر آنے لگی اور بہت سے مسلمان بھاگ گئے تو اس وقت حضرت عمرؓ ان چند ثابت قدم صحابہؓ میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لیے اکیلے میدان جنگ میں رہ گئے تھے۔

۹۔ انکساری و خدمت

حضرت عمرؓ میں رعب و جلال کے باوجود نہایت انکساری اور عاجزی پائی جاتی تھی۔ تواضع اور خاکساری کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی کام کو خود کر لینا حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے لیے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی کام کرنا اور ان کا ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ جب آپ بیت المال کے اونٹوں پر تیل مل رہے تھے تو ایک شخص نے کہا: کہ امیر المؤمنین کسی غلام سے خدمت لی ہوتی۔ فرمایا "مجھ سے بڑھ کر غلام کون ہے"؟ دوران جنگ جب مجاہدین کے خطوط مدینہ پہنچتے تو آپؓ خود لوگوں کے گھر جاتے اور ان کے دروازے پر بیٹھ کر ان کے خطوط لکھتے۔ بیوہ عورتوں کا خاص خیال رکھتے، ان کے لیے پانی بھر لاتے اور بازار سے سودا لا دیتے۔

رات کو اکثر گشت کرتے تاکہ معلوم ہو کہ رعایا کس حال میں ہے اور کوئی مصیبت زدہ یا ضرورت مند ہو تو اس کی مدد کی جائے (اس قسم کے چند واقعات اس سے پہلے رعایا کی خبر گیری کے تحت بیان ہو چکے ہیں)

عدل و مساوات

عدل و مساوات سیرت فاروقی کا امتیازی پہلو ہے۔ آپؓ نے امور خلافت نہایت عدل و انصاف اور دیانت و امانت سے انجام دیئے۔ تاریخ عالم میں پہلی دفعہ آپؓ نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کیا تاکہ بے لاگ فیصلہ ہو سکے آپ کے عہد میں شاہ و گدا، امیر و غریب سب ہم پلہ اور ہم مرتبہ نظر آتے تھے۔ عمال کو تاکیدی حکم تھا کہ اس ضمن میں کسی طرح کا امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ آپؓ نے کسی رشتہ اور تعلق کی بنا پر کبھی کوئی منصب یا عہدہ نہ دیا۔ جبلہ بن ایہم شاہ غسان قبول اسلام کے بعد مکہ آیا تو خانہ کعبہ کے طواف کے دوران اس کی چادر پر بدو کا پاؤں آ گیا۔ اس نے بدو کو تھپڑ رسید کر دیا۔ بدو فریاد لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپؓ نے فیصلہ دیا کہ یا تو بدو کو راضی کر لو ورنہ وہ تمہیں تھپڑ مارے گا۔ جبلہ نے مہلت مانگی اور راتوں رات واپس بھاگ گیا اور یہ کہہ کر اسلام سے پھر گیا کہ یہ کیسا دین ہے جس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔

حضرت عمرؓ کو اس پر افسوس ہوا لیکن اس کی خاطر مساوات کا اصول نہ چھوڑا۔ اسی طرح ایک دفعہ گورنر مصر حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے نے ایک مصری کو بلاوجہ کوڑے مارے۔ مظلوم نے دربار فاروقی میں فریاد کی۔ آپ نے دونوں باپ بیٹے کو طلب فرمایا اور مصری کو حکم دیا کہ اس گورنر زادے کو کوڑے لگاؤ اور اس موقع پر تاریخی جملہ فرمایا: "ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔ تم نے کب سے انہیں غلام بنا لیا ہے"؟

ایک دفعہ آپ قاضی مدینہ کی عدالت میں مدعا علیہ کی حیثیت سے گئے تو انہوں نے تعظیم کے لیے جگہ

خالی کر دی۔ حضرت عمرؓ نے کہا، "تم نے اس مقدمے میں پہلی ناانصافی کی"۔ یہ کہہ کر اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے۔

(ب) دینی خدمات و کارنامے

۱۔ حضرت عمرؓ کا حقیقی کارنامہ

فتوحات کی کثرت، محاصل کی فراوانی، انتظامات کی خوبی، جور و ظلم کے انسداد، عدل و انصاف امن و امان کے قیام، ملک کی خوشحالی اور رعایا کی فارغ البالی وغیرہ تمام اوصاف و کمال کے لحاظ سے جو کسی حکومت یا فرمانروا کے لیے طغرائے امتیاز ہو سکتے ہیں، دنیا کا کوئی حکمران فاروق اعظمؓ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ فتوحات سے بڑھ کر حضرت عمرؓ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مذہبی بنیادوں پر ایسے آئین حکومت مرتب کر دیئے، ایسا عادلانہ نظام قائم کر دیا جو مسلمانوں کی جملہ سعادتوں اور ترقیوں کا ضامن تھا اور جس سے بڑھ کر عادلانہ نظام اس دور ترقی میں بھی نہیں پیش کیا جا سکتا۔

(شاہ معین الدین احمد ندوی)

۲۔ دنیا میں جس قدر مشہور فرمانروا اور ارباب کمال گزرے ہیں سب پر حضرت عمر فاروقؓ کو ترجیح

علامہ شبلی نعمانی اپنی مشہور و معروف تصنیف "الفاروق" میں لکھتے ہیں:

جامع اوصاف

"قانونِ فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ فضائل انسانی کی مختلف انواع ہیں اور ہر فضیلت کا جدا راستہ ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک فضیلت کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا لیکن دیگر فضائل سے اس کو بہت کم حصہ ملا تھا۔ سکندر سب سے بڑا فاتح تھا، لیکن حکیم نہ تھا۔ ارسطو حکیم تھا لیکن کشورستان نہ تھا۔ بڑے بڑے کمالات ایک طرف چھوٹی چھوٹی فضیلتیں بھی ایک شخص میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ بہت سے نامور گزرے ہیں جو بہادر تھے، لیکن پاکیزہ اخلاق نہ تھے۔ بہت سے پاکیزہ اخلاق تھے، لیکن صاحب تدبیر نہ تھے بہت سے دونوں کے جامع تھے لیکن علم و فضل سے بے بہرہ تھے۔

اب حضرت عمرؓ کے حالات اور مختلف حیثیتوں پر نظر ڈالو تو صاف نظر آئے گا کہ وہ سکندر بھی تھے، ور ارسطو بھی، مسیحؑ بھی تھے اور سلیمانؑ بھی، تیمور بھی تھے اور نوشیرواں بھی، امام ابوحنیفہؒ بھی تھے اور

ابراہیم ادہمؒ بھی۔

مثالی حکمران

سب سے پہلے حکمرانی اور کشورستانی کی حیثیت کرلو۔ دنیا میں جس قدر حکمران گزرے ہیں، ہر ایک کی حکومت کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا۔ یہاں تک کہ اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار نہ رہا تو دفعتہً فتوحات بھی رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا۔

سکندر ہر موقع پر ارسطو کی ہدایتوں کا سہارا لے کر چلتا تھا۔ اکبر کے پردے میں ابوالفضل اور ٹوڈر مل کام کرتے تھے۔ عباسیہ کی عظمت برامکہ کے دم سے تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو صرف اپنے دست و بازو کا بل تھا، خالدؓ کی عجیب و غریب معرکہ آرائیوں کو دیکھ کر لوگوں کو خیال پیدا ہو گیا کہ فتح و ظفر کی کلید انہی کے ہاتھ میں ہے، لیکن جب حضرت عمرؓ نے ان کو معزول کر دیا تو کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ کل سے کون سا پرزہ نکل گیا ہے۔ سعدؓ بن وقاص فاتح ایران کی نسبت بھی لوگوں کو ایسا وہم ہو چلا تھا، وہ بھی الگ کر دیئے گئے اور کسی کے کان پر جوں تک نہ چلی۔ یہ سچ ہے کہ حضرت عمرؓ خود سارا کام نہیں کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے، لیکن جن لوگوں سے کام لیتے تھے، ان میں سے کسی کے پابند نہ تھے۔ وہ حکومت کی کل کو اس طرح چلاتے تھے کہ جس پرزے کو جہاں سے چاہا نکال لیا اور جہاں چاہا لگا دیا، مصلحت ہوئی تو کسی پرزے کو سرے سے نکال دیا اور ضرورت ہوئی تو نئے پرزے تیار کر لیے۔

دنیا میں کوئی حکمران ایسا نہیں گزرا، جس کو ملکی ضرورتوں کی وجہ سے عدل و انصاف کی حد سے تجاوز کرنا پڑا ہو۔ نوشیرواں کو زمانہ عدل و انصاف کا پیغمبر تسلیم کرتا ہے، لیکن اس کا دامن بھی اس داغ سے پاک نہیں، بخلاف اس کے حضرت عمرؓ کے تمام واقعات کو چھان ڈالو، اس قسم کی ایک نظیر بھی نہیں مل سکتی۔

دنیا کے اور مشہور سلاطین جن ممالک میں پیدا ہوئے، وہاں مدت سے حکومت کے قواعد اور آئین قائم تھے اور اس لیے ان سلاطین کو کوئی نئی بنیاد نہیں قائم کرنی پڑتی تھی۔ قدیم انتظامات یا خود کافی ہوتے تھے یا کچھ اضافہ کرنا پڑتا تھا۔ بخلاف اس کے حضرت عمرؓ جس خاک سے پیدا ہوئے، وہ ان چیزوں کے نام سے ناآشنا تھی۔ خود حضرت عمرؓ نے ۴۰ برس تک حکومت و سلطنت کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا اور آغاز شباب تو اونٹوں کے چرانے میں گزرا تھا، ان حالات کے ساتھ ایک وسیع مملکت قائم کرنی اور ہر قسم کے ملکی انتظامات مثلاً تقسیم صوبجات و اضلاع، انتظام محاصل، صیغۂ عدالت، فوجداری اور پولیس، پبلک ورکس، تعلیمات، صیغۂ فوج کو اس قدر ترقی دینی اور ان کے اصول اور ضابطے مقرر کرنے، حضرت عمرؓ کے سوا اور کس کا کام ہو سکتا تھا؟

سادگی و عظمت و جلالت

تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمران دکھا سکتے ہو جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیض میں دس دس پیوند لگے ہوں کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے ہاں پانی بھر آتا ہو، فرش خاک پر پڑ رہتا ہو، بازاروں میں پڑا پھرتا ہو، جہاں جاتا ہو جریدہ و تنہا چلا جاتا ہو، اونٹوں کے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملتا ہو، درو دربار نقیب و چاؤش، حشم و خدم کے نام سے آشنا نہ ہو اور پھر یہ رعب داب ہو کہ عرب و عجم اس کے نام سے لرزتے ہوں اور جس طرف رخ کرتا ہو زمین دہل جاتی ہو۔ سکندر و تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے، جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا۔ عمر فاروقؓ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا، لیکن چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آ گیا ہے۔

علمی کمالات

اب علمی حیثیت پر نظر ڈالو۔ صحابہؓ میں سے جن لوگوں نے خاص اس کام کو کیا تھا اور رات دن اسی شغل میں بسر کرتے تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے مسائل اور اجتہادات کا حضرت عمرؓ کے مسائل اور اجتہادات سے موازنہ کرو، صاف مجتہد و مقلد کا فرق نظر آئے گا۔ زمانۂ مابعد میں اسلامی علوم نے بے انتہا ترقی کی اور بڑے بڑے مجتہدین اور آئمہ فن پیدا ہوئے۔ مثلاً امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ، امام بخاریؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ۔ لیکن انصاف سے دیکھو حضرت عمرؓ نے جس باب میں جو کچھ ارشاد کیا، اس پر کچھ اضافہ ہو سکا۔ حضرت عمرؓ نے ان علمی و فقہی مسائل کو جس طرح حل کیا تھا، تحقیق کا ایک قدم بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

اخلاقیات

اخلاق کے لحاظ سے دیکھو تو انبیاءؑ کے بعد اور کون شخص ان کا ہم پایہ مل سکتا ہے؛ زہد و قناعت، تواضع و انکسار، خاکساری و سادگی، راستی و حق پرستی صبر و رضا، شکر و توکل۔ یہ اوصاف ان میں جس کمال کے ساتھ پائے جاتے تھے، کیا لقمانؒ، ابراہیم ادہمؒ، ابوبکر شبلیؒ معروف کرخیؒ میں سے بڑھ کر پائے جا سکتے ہیں؟"

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کی جامعیت کمالات کو ایک تشبیہ کے ذریعہ نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "حضرت فاروقِ اعظمؓ کا سینہ گویا ایک مکان ہے جس کے مختلف دروازے ہیں اور ہر دروازے پر ایک صاحبِ کمال بیٹھا ہے۔ مثلاً سکندر ذوالقرنین ملک گیری کے ساتھ، نوشیرواں رعایا پروری و عدل کے ساتھ، امام ابو حنیفہؒ یا امام مالکؒ علم فتویٰ کے ساتھ، سید عبدالقادر جیلانیؒ یا حضرت بہاؤالدین زکریاؒ زہد و تقویٰ کے ساتھ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ بطور محدث، مولانا جلال الدین رومیؒ یا شیخ فریدالدین عطارؒ بطور حکیم، اور یوں ہر حاجت مند کی حاجت پوری ہوتی ہے۔

فضل و کمال

ذاتی حیثیت سے حضرت عمرؓ نہایت ذہین، طباع، بالغ نظر، مدبر اور صاحب الرائے تھے۔ جاہلی اور اسلامی دونوں علوم میں آپ کو یکساں کمال حاصل تھا فصاحت و بلاغت، انشا و خطابت، شاعری و لسانی، سپہ گری اور بہادری وغیرہ ان تمام اوصاف و کمالات میں جو عرب میں لازمۂ شرافت سمجھے جاتے تھے، آپ کو وافر حصہ ملا تھا۔ آپ کی بہت سی تقریریں اور تحریریں کتابوں میں محفوظ ہیں، جن سے آپ کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ شاعری کا نہایت بلند اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے، مگر بہت کم۔ لیکن نقاد اور سخن سنج بڑے اعلیٰ درجہ کے تھے۔ ابن رشیق کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے زمانہ کے شعر کے سب سے بڑے نقاد اور ادا شناس تھے۔

مشہور ادیب جاحظ لکھتا ہے کہ "حضرت عمرؓ اپنے عہد کے سب سے بڑے سخن سنج تھے" عرب کے تمام بڑے بڑے شعراء کا کلام حفظ تھا اور اس پر ناقدانہ رائے رکھتے تھے۔ امراء القیس، نابغہ اور زہیر کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

آپؓ کے والد خطاب قریش کے بڑے مشہور نساب تھے، یہ فن آپ نے انہی سے سیکھا تھا۔ چنانچہ نسب کے متعلق تمام معلومات اپنے والد ہی کے حوالہ سے بیان کرتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق آپ کو ابتدا سے تھا اور آپ اس زمانہ سے لکھنا پڑھنا جانتے تھے، جب قریش کے صرف سترہ آدمی لکھے پڑھے تھے آپ عبرانی زبان بھی جانتے تھے۔

ذہانت، طباعی اور اصابت رائے کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ آپ کی بہت سے آرا ئیں مذہبی احکام بن گئیں۔ اذان کا طریقہ آپ ہی کی تجویز سے قائم ہوا۔ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا۔ نماز تراویح جماعت سے قائم کی۔ نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا وغیرہ۔ متعدد امور میں وحی الٰہی نے آپ کی رائے کی تاکید کی۔ مثلاً اسیران بدر کے ساتھ طرز عمل، ازواج مطہرات کا پردہ، شراب کی حرمت، مقام ابراہیمؑ کو مصلیٰ بنانا، منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھنا وغیرہ۔

ذہانت اور طباعی نے حضرت عمرؓ کو نہایت نکتہ رس اور دقیقہ سنج بنا دیا تھا۔ آپ کی نگاہ احکام شریعت کے ایسے باریک نکتوں تک پہنچتی تھی، جن پر عام صحابہؓ کی نظر مشکل سے پہنچ سکتی تھی۔ علم اسرار دین کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی۔

اس غور و فکر اور تلاش و جستجو نے آپ میں کلام اللہ کی تفسیر و تاویل اور آیات قرآنی سے احکام اخذ کرنا اور استدلال کا فطری ملکہ پیدا کر دیا تھا۔

فقہ میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ بلکہ اصول فقہ کا فن آپ ہی کی ایجاد ہے۔ آپ نے فقہ

کے اصول مرتب کر کے اجتہاد و فکر کی ایک وسیع شاہراہ قائم کر دی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو فقہ میں کمال رکھتے تھے، آپ ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ آپ کے زمانہ میں ہزاروں نئے مسائل پیش آئے۔ آپ نے انہیں اپنی قوت اجتہاد سے حل کیا۔ آپ کے فقہی مسائل کی تعداد کئی ہزار ہے، جن میں ایک ہزار مہمات مسائل ہیں۔ الغرض اپنی فطرت ذہانت اور دینی بصیرت سے فقہ کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ (شاہ معین الدین احمد ندوی)

فضائل ۔۔۔ حدیث کی روشنی میں

مختلف احادیث مبارکہ میں حضرت عمر فاروقؓ کے فضائل بکثرت بیان ہوئے ہیں۔ ذیل میں کچھ احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ پہلی امتوں میں محدث تھے، اگر میری امت میں کوئی محدث ہوا تو وہ عمرؓ ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔ (ترمذی)

۳۔ اللہ تعالیٰ نے حق کو عمرؓ کی زبان پر جاری کیا اور دل میں پیدا ہے۔ (ترمذی)

۴۔ جس راستہ پر عمرؓ چلتا ہے، شیطان وہ راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

۵۔ میں نے جب شب معراج میں جنت میں عمرؓ بن خطاب کا محل دیکھا اور اس کی سیر کی۔ (بخاری و مسلم)

۶۔ میں سو رہا تھا کہ میں نے خود کو ایک کنویں پر دیکھا، جس پر ڈول پڑا تھا۔ میں نے اس ڈول سے جس قدر خدا نے چاہا پانی کھینچا۔ پھر ابوبکرؓ نے ڈول لیا اور کنویں سے ایک یا دو ڈول پانی کھینچا اور ابوبکرؓ کے ڈول کھینچنے میں سستی و کمزوری پائی جاتی تھی، خدا اس کو معاف فرمائے۔ پھر وہ ڈول چرس بن گیا اور عمرؓ بن خطاب نے اس کو لے لیا اور میں نے کسی جوان اور قوی و مضبوط شخص کو ایسا نہ پایا جو عمرؓ کی طرح اس چرس کو کھینچتا ہو، یہاں تک کہ لوگوں نے اپنے اونٹوں کو سیراب کر لیا اور کافی پانی ہو گیا۔ (بخاری و مسلم)

۷۔ میں سو رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ میرے سامنے لوگوں کو لایا جا رہا ہے اور مجھ کو دکھایا جا رہا ہے۔ یہ سب لوگ کرتے پہنے ہوئے تھے۔ جن میں سے بعض کے کرتے اتنے تھے جو سینے تک پہنچتے تھے اور بعض کے اس سے نیچے۔ پھر میرے سامنے عمرؓ بن خطاب کو لایا گیا جو اتنا لمبا کرتا پہنے ہوئے تھے کہ زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس خواب کی تعبیر آپؐ نے کیا قرار دی؟ فرمایا: دین۔ (بخاری و مسلم)

۸۔ بہشت کے اندر جنتی اعلیٰ درجے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم آسمان کے کنارے میں روشن ستارہ کو دیکھتے ہو اور ابوبکرؓ و عمرؓ اعلیٰ درجے والوں میں سے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ (شرح السنۃ)

۹۔ جنت کے اندر اگلے پچھلے جس قدر ادھیڑ عمر کے لوگ ہوں گے، ان سب کے سردار ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں سوائے نبیوں اور رسولوں کے۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

۱۰۔ میں سو رہا تھا کہ خواب میں میرے پاس دودھ کا پیالہ لایا گیا۔ میں نے اس دودھ کو پی لیا، پھر میں نے اس دودھ کی سیرابی کی حالت کو دیکھا کہ اس کا اثر میرے ناخنوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر میں نے پیالے کا بچا ہوا دودھ عمرؓ بن خطاب کو دے دیا۔ لوگوں نے پوچھا، اس خواب کی تعبیر آپ نے کیا قرار دی، فرمایا: علم۔ (بخاری و مسلم)

۱۱۔ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا، جس کے دو وزیر آسمان کے اور دو وزیر زمین کے نہ ہوں، میرے دو وزیر آسمان کے جبریلؑ اور میکائیلؑ ہیں اور زمین کے دو وزیر ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔ (ترمذی)

۱۲۔ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرہ شریف سے نکل کر مسجد میں اس طرح تشریف لائے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ آپؐ کے دائیں بائیں تھے اور حضورؐ دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے اور فرمایا: "قیامت کے روز ہم اسی طرح اٹھائے جائیں گے۔ (ترمذی)

۱۳۔ ابوبکرؓ و عمرؓ مسلمانوں کے لیے بمنزلہ کان اور آنکھ کے ہیں۔ (ترمذی)

۱۴۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک چاندنی رات میں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر مبارک میری گود میں تھا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کیا کسی کی اتنی نیکیاں بھی ہیں جتنے آسمان پر ستارے۔ آپؐ نے فرمایا: "ہاں، عمرؓ کی نیکیاں اتنی ہی ہیں۔ پھر میں نے پوچھا: اور ابوبکرؓ کی نیکیوں کا کیا حال ہے؟ آپؐ نے فرمایا: عمرؓ کی ساری عمر کی نیکیاں ابوبکرؓ کی ایک نیکی کے برابر ہیں۔ (رزین)

حضرت خالدؓ بن ولید ـــــ سیف اللہ

"یا الٰہی! خالد تیری تلوار ہے، تو ہمیشہ اس کو فتح مند رکھیو۔" (ارشادِ نبویؐ)

"خوش قسمت ہے وہ ماں، جس کے بطن سے خالدؓ جیسا فرزند پیدا ہوا۔" (حضرت عمر فاروقؓ)

سوال: حضرت خالدؓ بن ولید کے مختصر حالات زندگی، دینی و مجاہدانہ خدمات اور سیرت و کردار پر روشنی ڈالیے نیز ثابت کیجیے کہ آپ دنیا کے عظیم ترین جرنیل تھے۔

جواب:

حضرت خالدؓ بن ولید ـــــ سیف اللہ

ابتدائی حالات

خاندان

آپ کا نام خالدؓ، پورا نام ابوسلیمان خالد ہے۔ والد کا نام ولید بن مغیرہ مخزومی تھا آپ کا تعلق قریش کے مشہور قبیلے بنو مخزوم سے ہے۔ ساتویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کی والدہ حضرت لبابہ صغریٰ بنت الحارث اُم المؤمنین حضرت میمونہؓ کی حقیقی ہمشیرہ تھیں، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ کے حقیقی خالو تھے اور خاندانِ نبوت سے آپ کا یہ دوسرا قریبی رشتہ تھا۔

جنگجویانہ اوصاف، علم و فضل، اصابت رائے اور لائق افراد کی کثرت کے باعث بنو مخزوم قریش میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ اور بنو ہاشم کے بعد اسی قبیلہ کو اہمیت دی جاتی تھی۔ بنو مخزوم کے سپرد یہ خدمت تھی کہ لڑائی کے دنوں میں فوجوں کے لیے گھوڑے مہیا کریں اور سپاہیوں کے آرام اور سامانِ جنگ اکٹھا کرنے کے خیمے نصب کریں۔

آپ کے والد مکہ کے نہایت متمول اور ذی اثر شخص سمجھے جاتے تھے۔ مکہ سے طائف تک ان کے باغات پھیلے ہوئے تھے، ان کی دولت مندی کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال وہ تنہا خانہ کعبہ کا غلاف بنواتے تھے اور دوسرے سال تمام قریش مل کر بنواتے تھے۔ حج کے ایام میں منیٰ کے مقام پر حاجیوں کو ایک وقت کا کھانا بھی کھلایا کرتے تھے۔ حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت کے متعلق بات اٹھی تو ولید ان تین اشخاص میں سے ایک تھے جو یہ اعزاز حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ولید اسلام کی مخالفت میں بڑے سخت تھے اور آخری سانس تک مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ مفسرین کے مطابق سورۃ المدثر میں جس شخص کو عذاب کی سخت وعید سنائی گئی ہے وہ یہی ولید تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"مجھ کو اور اس شخص کو رہنے دو، جس کو میں نے تنہا پیدا کیا اور اس کو کثرت سے مال دیا اور پاس رہنے والے بیٹے دیئے اور سب طرح کا سامان اس کے لیے مہیا کر دیا۔ پھر طمع رکھتا ہے کہ اور زیادہ دیں۔"

ولید نے ہجرت کے تین ماہ بعد ۹۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ حضرت خالدؓ کی دو بہنیں اور چھ بھائی تھے بھائیوں میں ہشام اور ولید اسلام لے آتے تھے اور باقی چار کا خاتمہ حالتِ کفر میں ہوا۔ حضرت خالدؓ، حضرت عمرؓ کے ہم عمر تھے اور ظہورِ اسلام کے وقت آپ کی عمر تقریباً ۱۷ سال تھی۔

بچپن و شباب

آپ کا بچپن دیہات کی آزاد فضاؤں میں کسی دایہ کے زیرِ سایہ گزرا، جہاں ان کی جسمانی اور دماغی قوتوں کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع ملا۔ آپ نے ایسے ماحول میں ہوش سنبھالا جہاں شہسواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور جنگی داؤ گھات کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ آپ بچپن ہی سے نہایت پھرتیلے، نڈر اور صاحبِ تدبیر تھے۔ جوان ہو کر آپ کی شجاعت کا رنگ نکھرا اور آپ قریش کے منتخب جوانوں میں شمار ہونے لگے۔ بچپن میں ایک دفعہ حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ نے کشتی لڑی اور حضرت خالدؓ نے حضرت عمرؓ کی پنڈلی کی ہڈی توڑ ڈالی، جو کافی عرصہ علاج کے بعد ٹھیک ہوئی۔ اس سے آپ کی جسمانی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ کے چہرے پر چیچک کے نشان تھے اور جسم مضبوط اور گٹھا ہوا اور سینہ بہت کشادہ تھا۔

قبولِ اسلام سے پہلے

اپنے والد ولید کی طرح اسلام قبول کرنے سے پہلے حضرت خالدؓ بھی اسلام کے شدید ترین دشمن تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زبانی صلاح مشوروں سے لے کر عملی کارروائیوں تک ہر موقع پر ان کی شمولیت ضروری تھی بلکہ عملی کارروائیوں میں ان کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ غزوہ احد میں مسلمانوں نے جو نقصان اٹھایا، اس کی بڑی وجہ حضرت خالدؓ کی جنگی فراست اور بہادری تھی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں نے جبلِ اُحد کو لپشت کی طرف رکھ کر صف آرائی کی تھی۔ اس پہاڑ میں ایک درّہ تھا، جسے عبور کر کے دشمن نہایت آسانی سے مسلمانوں کے عقب پر حملہ کر سکتا تھا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو پچاس تیر اندازوں کے ساتھ وہاں متعین کر دیا تھا اور تاکید فرمائی تھی کہ لڑائی کا خواہ کچھ بھی انجام ہو، تم لوگ اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔ جب مشرکین کے پاؤں اکھڑ گئے اور مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے تو درے کے محافظوں میں سے بھی اکثر نے اپنی جگہ چھوڑ دی، باوجود اس بات کے کہ مکہ کے نامور بہادر اور آزمودہ کار جرنیل میدان چھوڑ چکے تھے تو عمر خالدؓ نے جبلِ اُحد کے درّے کو غیر محفوظ پاتے ہی چکر کاٹ کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں تک کہ حضور اکرم کی ذاتِ اقدس بھی خطرات میں گھر گئی۔ اگرچہ خالدؓ کی یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی اور مسلمانوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں سنبھل کر کفار کو مار بھگایا، لیکن جہاں تک خالدؓ کی دور اندیشی، فوجی تدبّر اور دلیری

کا تعلق ہے۔ ان کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ شکست خوردہ فوج کے سپاہیوں کو اکٹھا کر کے فاتح مسلمان پر عقب سے حملہ کر دینا ایک بہت بڑا فوجی کارنامہ ہے۔ چنانچہ جنگ احد کی اس عارضی کامیابی کے بعد ان کا شمار قریش کے چوٹی کے بہادروں میں ہونے لگا اور ان کی اسلام دشمنی اور بھی بڑھ گئی۔

جنگ اُحد سے صلح حدیبیہ تک وہ ہر وقت مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہے۔ عکرمہؓ بن ابو جہل اور عمروؓ بن العاص آپ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش نے خالدؓ کو دو سو سواروں کے ساتھ مسلمانوں کی نقل و حرکت دیکھنے کے لیے بھیجا۔ خالدؓ اور ان کے ساتھیوں نے ہر چند کوشش کی کہ کسی طرح مسلمانوں سے اُلجھ پڑیں، لیکن حضورؐ کا تدبر اور امن پسندی ان کے ارادوں پر غالب آئی اور کفار کے ساتھ مسلمانوں کی صلح طے پا گئی۔

قبولِ اسلام

قدرت نے خالدؓ کو جہاں بے مثال بہادری اور شہ زوری بخشی تھی، وہاں سچائی قبول کرنے کی بے پایاں صلاحیت بھی عطا کی تھی۔ صلح حدیبیہ کے وقت خالدؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آپ حضورؐ کی اعلیٰ صفات، پاکیزہ زندگی، بزرگی، حسنِ سلوک، رعب و جلال اور مسلمانوں کی عقیدت و محبت دیکھ کر بہت متأثر ہوئے اور بے اختیار اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔ حضرت خالدؓ کے بھائی ولیدؓ ان سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ نے ولیدؓ سے فرمایا: "خالدؓ پر اسلام کی سچائی ظاہر ہو چکی ہے، پھر وہ اسلام کیوں نہیں لے آتا؟" ولیدؓ نے اس بات کا تذکرہ خالدؓ سے کیا۔ وہ بہت متأثر ہوئے اور اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ ایک مرتبہ خالدؓ قریش کے مجمع میں کہنے لگے: "ہر ذی عقل اور صاحبِ شعور کے لیے اب یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نہ ساحر ہیں نہ شاعر، ان کا کلام آیۂ رب العلمین ہے۔ پس ہر اہلِ خرد پر اُن کا اتباع واجب ہے۔"

اس پر ابو سفیان اور دیگر قریش بہت بیچ پا ہوئے اور ان پر ہاتھ اٹھانا چاہا، لیکن اب حق ان پر واضح ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ مدینہ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں عمروؓ بن العاص سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا انہیں بھی اسلام کی محبت مدینے کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے۔ حضورؐ کی یہ خبر مل چکی تھی، چنانچہ فرمایا: "مکہ نے اپنے جگر گوشوں کو ہماری طرف پھینک دیا ہے۔"

خالدؓ اپنے بھائی ولیدؓ کے ہمراہ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ خالدؓ نے عرض کی، "یا رسول اللہؐ! میرے گناہ کیونکر بخشے جائیں گے؟ میں نے آج تک حق کا مقابلہ کیا ہے اور ہمیشہ آپؐ کو اور آپؐ کے اصحاب کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہا ہوں۔" حضورؐ نے فرمایا: "اے خالدؓ! غم نہ کر، اسلام لانے سے تیرے پچھلے گناہ ختم ہو گئے۔" پھر حضورؐ نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

خالدؓ۔ عہدِ رسالتؐ میں: حضرت خالدؓ نے قبولِ اسلام کے بعد اسلام کی حمایت

بھی اس تندہی اور سرگرمی سے کی کہ بہت کم لوگوں کو ان کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہے۔ اسلام کی عزت مسلمانوں کی حفاظت اور دعوت و تبلیغ کے لیے خالدؓ کے بازوؤں نے جتنی حرکت کی، جلیل القدر صحابہؓ کو چھوڑ کر شاید کسی نے بھی نہ کی ہو گی۔ یہ صرف انہی کے تہور و تدبر کا کرشمہ تھا کہ قیصر کا ٹڈی دل لشکر اور کسریٰ کا جاہ و جلال دنوں کے اندر دھول میں مل گیا اور ان بستیوں پر جہاں مسلمانوں کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی، اسلامی قانون کا آفتاب ضیا باریاں کرنے لگا۔

جنگ موتہ (۸ھ) میں پہلی مرتبہ آپ کی جنگی مہارت اور شجاعت و تدبر کا مظاہرہ ہوا۔ بنو غسان کے حاکم شرجیل نے جو قیصر روم کا باجگذار تھا، مسلمانوں کے سفیر کو قتل کر دیا۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین ہزار کا لشکر بھیجا۔ رومی ایک لاکھ تھے، مسلمان بڑی بہادری سے لڑے۔ پہلے حضرت زیدؓ بن حارثؓ اور پھر یکے بعد دیگرے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ شہید ہوئے۔ آخر مسلمانوں کے مشورے سے حضرت خالدؓ نے کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنے قلیل لشکر کو اس انداز سے ترتیب دیا، جس سے دشمن کو گمان ہوا کہ مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی۔ اس جنگ میں آپ کے ہاتھ سے آٹھ تلواریں ٹوٹیں اور اسلامی لشکر کو بحفاظت مدینے واپس لے آئے۔ اس کامیاب مہم کے نتیجہ ہی میں آپ کو دربارِ رسالتؐ سے سیف اللہ کا لقب عطا ہوا۔

فتح مکہ کے موقع پر ایک دستے کی کمان حضرت خالدؓ کے ہاتھ میں تھی۔ جس راستے سے آپ کا لشکر آ رہا تھا اسے کفار نے روکنے کی کوشش کی۔ حضرت خالدؓ کو چار و ناچار تلوار میان سے نکالنی پڑی اور کفار سے مقابلے میں کچھ آدمی مارے گئے اور دو مسلمان شہید ہوئے۔ چونکہ پہل کفار نے کی تھی، اس لیے حضورؐ نے حضرت خالدؓ سے باز پرس نہ فرمائی۔ حضورؐ کے حکم پر حضرت خالدؓ نے کفار کے مشہور بت عزیٰ کو پیوند زمین کر دیا اور مختلف تبلیغی مہموں میں مصروف رہے۔

غزوہ حنین میں بھی حضرت خالدؓ بڑی بہادری سے لڑے اور کئی زخم کھائے۔ حضورؐ کی دعا اور برکت سے آپ جلد شفایاب ہو گئے۔ اسی طرح طائف کے محاصرے، غزوۂ تبوک اور دیگر مختلف معرکوں میں آپ نے بھرپور حصہ لیا اور بڑے کارنامے دکھائے۔

خالدؓ — عہدِ صدیقی میں

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں بہت سے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے، جن کا دبانا بہت مشکل نظر آتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فوراً حضرت خالدؓ کو اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ آپ سب سے پہلے جھوٹے نبیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ پہلے طلحہ کی سرکوبی کی، پھر اسود عنسی کا خاتمہ کیا۔ جھوٹے نبیوں میں مسلمہ کذاب زبردست حریف ثابت ہوا۔ اس نے چالیس ہزار کا لشکر جرار اکٹھا کر لیا تھا۔ پہلے حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل مقابلے پر گئے اور شکست

کھائی۔ پھر حضرت خالدؓ میدان جہاد میں اترے۔ زبردست مقابلہ ہوا۔ دشمن کے بیس ہزار آدمی مارے گئے اور مسیلمہ بھی قتل ہوا۔ اس طرح یہ عظیم فتنہ ختم ہوا۔ سجاح بنت الحارث بھی شکست کھا کر مفرور ہوگئی۔ اسی طرح جو قبائل اسلام سے پھر کر مرتد ہو گئے تھے۔ ان کے خلاف بھی فوج کشی کر کے فتنۂ ارتداد کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

فتح عراق

عراق اس زمانہ میں ایران کا ایک صوبہ تھا۔ مثنیٰ بن حارثہ نے حضرت ابو بکرؓ کی اجازت سے تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ حیرہ اور رابلہ پر حملہ کیا مگر ناکام رہے تو خلیفۂ وقت سے مدد مانگی۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ حضرت خالدؓ کو عراق پر لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ آپ عراق میں ایک سال اور دو مہینے رہے۔ ان کے ساتھ کل دس ہزار فوج تھی اور تقریباً اتنے ہی سپاہی دیگر اسلامی سپہ سالاروں کے ساتھ تھے لیکن اس قلیل فوج نے اس مختصر مدت میں جو شاندار کارنامے انجام دیئے وہ تاریخ میں بے مثال ہیں۔ فتح عراق آپ ہی کے ہاتھوں مکمل ہوئی اور آپ نے ... کے ساتھ اس قدر نیک ... کیا کہ لوگ حیران رہ گئے۔

فتح عراق کے لیے آپ کو کئی جنگیں لڑنی پڑیں مثلاً جنگ ...سل (یا جنگ کاظمہ) جنگ مذار، جنگ دلجہ جنگ الیس، جنگ حیرہ، جنگ عین التمر، جنگ دومۃ الجندل۔ جنگ فراض وغیرہ۔ ان جنگوں میں آپ نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ آپ دشمنوں کے حق میں بجلی تھے اور دشمن کو سامنے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتے تھے فوراً کوند کر ان کے سر پر جا پڑتے تھے۔ بلاشبہ آپ خدا کی تلوار تھے اور فتح عراق میں آپ کی ذات مسلمانوں کے حق میں خدا کی ایک بہت بڑی امداد تھی۔

فتح شام

شام اس زمانہ میں روم کے ماتحت تھا۔ مدینہ پر شامیوں کے حملہ کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ اس بناء پر حضرت ابو بکرؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ الگ الگ علاقوں میں علیحدہ علیحدہ فوجیں روانہ کیں۔ دمشق کی مہم پر یزید بن ابی سفیانؓ مامور ہوئے حمص پر حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح، اردن پر شرجیلؓ بن حسنہ اور فلسطین پر حضرت عمروؓ بن العاص مقرر ہوئے۔ ان فوجوں کی کل تعداد ۲۶ ہزار تھی۔ ان تمام فوجوں کے سپہ سالار اعظم حضرت ابو عبیدہؓ تھے۔

ادھر قیصر روم کو مسلمان فوجوں کی آمد کا پتہ چلا تو اس نے دو لاکھ چالیس ہزار کا زبردست لشکر مقابلے کے لیے بھیجا۔ رومیوں کی اس کثرت کا اندازہ کر کے مسلمانوں نے حضرت ابو بکرؓ کو خط لکھا اور مزید فوجی امداد طلب کی۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالدؓ کو جو اس وقت عراق میں تھے، فوری طور پر شام چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے شام پہنچنے کے لیے ایسا مختصر راستہ اختیار کیا جو ایک انتہائی خطرناک دشوار گزار صحرا سے ہو کر جاتا تھا، جہاں پانچ دن کی منزل میں پانی کا ایک قطرہ بھی دستیاب نہ تھا۔ لیکن آپ نے عزم راسخ اور حکمت عملی سے یہ راستہ طے کیا اور شام کے اسلامی لشکر سے جا ملے۔ یرموک کے مقام پر دونوں فوجیں مقابل میں آئیں۔ حضرت خالدؓ نے اس موقع پر بہترین جنگی

حکمت عملی سے کام لیا سب سے پہلے تمام افواج کو ایک متحدہ کمان میں جمع کیا اور پھر فوج کو اس طرح مرتب کیا جیسے پہلے کبھی عربی فوج مرتب نہیں کی گئی تھی۔ زبردست جنگ ہوئی جو سارا دن اور ساری رات جاری رہی اور جب صبح ہوئی تو حضرت خالدؓ رومی سپہ سالار کے خیمے میں بیٹھے تھے اور میدان جنگ رومیوں سے بالکل صاف تھا۔ ایک لاکھ پچیس ہزار رومی صرف دریا میں غرق ہو کر مر گئے جبکہ تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی یہ فتح ایک شاندار فتح تھی۔ ابھی یہ جنگ ہو رہی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ وفات پا گئے اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا اور حضرت ابو عبیدہؓ کو سپہ سالار عام مقرر کیا۔

خالدؓ عہدِ فاروقی میں

حضرت خالدؓ کی معزولی

شام کی فتوحات اور ۱۷ھ کے واقعات میں سب سے اہم واقعہ حضرت خالدؓ کی معزولی کا ہے۔ عام طور پر مورخین کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے زمام خلافت سنبھالتے ہی خالدؓ کو معزول کر دیا تھا لیکن صحیح روایت کے مطابق یہ واقعہ ۱۷ھ کا ہے۔ چنانچہ جن مورخین نے اسے عام روایت کے مطابق ۱۳ھ میں لکھا ہے، وہ بھی ۱۷ھ ہی صحیح سمجھتے ہیں۔

یہ واقعہ اس حیثیت سے نہایت اہم ہے کہ جس جانباز کی تلوار نے عراق و شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے عین محاذ جنگ میں اسے معزول کر دیا۔ اس کے علاوہ اور حیثیتوں سے بھی سبق آموز ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت خالدؓ اپنے شجاعانہ کارناموں کے ساتھ بعض معاملات میں لاپروائی برتتے تھے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ سے وہ کبھی فوجی مصارف کا حساب و کتاب نہیں بھیجتے تھے۔ انہوں نے ان کو فہمائش بھی کی، لیکن حضرت خالدؓ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہ ان کی خود اعتمادی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی خدمات کی بنا پر چشم پوشی سے کام لیا۔ حضرت عمرؓ کو اسی زمانہ سے ان کی یہ روش پسند نہ تھی۔ ان کے زمانہ میں بھی یہی روش قائم رہی۔ آپ نے ان کو تاکید کی کہ وہ آئندہ سے ان کی اجازت کے بغیر کسی کو ایک بکری بھی نہ دیں۔ حضرت خالدؓ نے جواب دیا کہ میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں۔ اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔" حضرت عمرؓ نے دوبارہ لکھا کہ تم سپہ سالار اسی شرط پر رہ سکتے ہو کہ فوجی مصارف کا حساب باضابطہ بھیجتے رہو، لیکن اس وقت سے بھی حضرت خالدؓ اپنی ضد پر قائم رہے۔ اس پر بھی حضرت عمرؓ نے ان کو معزول نہیں کیا، بلکہ حضرت ابو عبیدہؓ کے ماتحت کر دیا۔ اس کے ۱۷ھ میں انہوں نے ایک شاعر کو دس ہزار کی خطیر رقم دے ڈالی۔ حضرت عمرؓ نے ان سے باز پرس کی اور حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ اگر خالدؓ نے یہ رقم اپنی جیب سے دی ہے تو اسراف کیا اور اگر بیت المال سے دی ہے تو خیانت کی، دونوں حالتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔

بقول علامہ شبلی: "حضرت خالدؓ جس کیفیت سے معزول کئے گئے وہ سننے کے قابل ہے۔ قاصد نے جو معزولی

کا خط لے کر آیا تھا، مجمع عام میں ان سے پوچھا کہ "یہ انعام تم نے کہاں سے دیا؟" حضرت خالدؓ اگر اپنی خطا کا اقرار کر لیتے تو حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ ان سے درگذر کی جائے لیکن وہ خطا کے اقرار کرنے پر راضی نہ تھے۔ مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر ان کے سر سے ٹوپی اتار لی اور ان کی سرتابی کی سزا کے لیے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی۔ یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایک ایسا سپہ سالار جس کا نظیر تمام اسلام میں کوئی شخص موجود نہ تھا اور جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا، اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور مطلق دم نہیں ہوتا۔ اس واقعہ سے ایک طرف تو حضرت خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہے اور دوسری طرف حضرت عمرؓ کی سطوت و جلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت خالدؓ نے حمص پہنچ کر اپنی معزولی کے متعلق تقریر کی اور کہا "امیر المؤمنین عمرؓ نے مجھ کو شام کا افسر مقرر کیا اور جب میں نے تمام شام کو زیر کر لیا تو مجھ کو معزول کر دیا۔" اس جملے پر ایک مجاہد اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ "اے سردار! چپ رہ! ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔" حضرت عمرؓ نے کہا "ہاں، لیکن عمرؓ کے ہوتے ہوئے فتنہ کا کیا احتمال ہے؟"

حضرت خالدؓ مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ "عمرؓ! خدا کی قسم، تم میرے معاملہ میں ناانصافی کرتے ہو۔" حضرت عمرؓ نے کہا کہ "تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟" حضرت خالدؓ نے کہا: "مالِ غنیمت سے" اور یہ کہہ کر کہا کہ "ساٹھ ہزار سے جس قدر زیادہ رقم نکلے وہ میں آپ کے حوالہ کرتا ہوں۔" چنانچہ بیس ہزار درہم زیادہ نکلے اور وہ بیت المال میں جمع کر دیئے گئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ: "خالدؓ! واللہ، تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر تمام عمالانِ ملکی کو لکھ بھیجا کہ میں نے خالدؓ کو ناراضی سے یا خیانت کی بناء پر موقوف نہیں کیا۔ لیکن چونکہ میں دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں اس لیے میں نے ان کا معزول کرنا مناسب سمجھا تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔"

اسبابِ معزولی

۱۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ ہی سے حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ کی بعض بے اعتدالیاں ناپسند تھیں۔ مثلاً آپ انہیں مالک بن نویرہ کے قتل سے بالکل بری الذمہ نہ سمجھتے تھے۔ میدانِ جنگ میں ان کی سخت گیری بھی آپ کو پسند نہ تھی۔

۲۔ حضرت خالدؓ فوجی حسابات دربارِ خلافت میں نہ بھیجتے تھے۔ حضرت عمرؓ اسے پسند نہ کرتے تھے۔

۳۔ حضرت خالدؓ نے ایک شاعر کو دس ہزار درہم انعام میں دیئے۔ یہ اسراف یا خیانت کے زمرے میں آتا تھا۔

۴۔ چونکہ بے شمار اسلامی فتوحات کا سہرا اب تک حضرت خالدؓ سیف اللہ کے سر تھا اور عوام فتح کو صرف انہی کے ذریعہ لازم سمجھنے کے فتنہ میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کی نصرت کا راز یہ تھا کہ وہ اپنی قوتِ بازو کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر تمام باتوں سے زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔

۵۔ اس وقت شام کا صدر مقام فتح ہو چکا تھا، وہاں کے باشندوں کا دل مٹھی میں لینے کے لیے حضرت خالدؓ جیسے گرم مزاج سپاہی کی بجائے حضرت ابو عبیدہؓ جیسے نرم دل مدبر کی ضرورت تھی، نیز تبلیغ اسلام کے لیے حضرت ابو عبیدہؓ زیادہ موزوں تھے۔ اور پھر دربارِ رسالت سے حضرت ابو عبیدہؓ کو امین الامت کا خطاب عطا ہوا تھا۔

۶۔ حضرت خالدؓ کی جنگی مہمات میں برق رفتاری کا انداز تھا، جبکہ عام سپاہی اس برق رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتے اور انہیں ان مہمات میں کچھ آرام و سہولت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت ابو عبیدہؓ کی ماتحتی میں حضرت خالدؓ کے کارنامے

حضرت خالدؓ کا سوانح نگار یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا کہ معزولی کے بعد بھی ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہی تلوار جو سپہ سالاری کے نشان کے طور پر مجاہدین کی رہنمائی کرتی تھی، ایک عام سپاہی کے حربے کے طور پر اسلام کی سربلندی اور حق و انصاف کی حمایت کے لیے رومی شہنشاہیت کے سر پر بجلی کی طرح کوندتی رہتی ہے اور اس وقت تک میان میں نہیں جاتی جب تک اس غیر منصفانہ، غیر مساویانہ اور ظالمانہ حکومت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ حضرت خالدؓ کے کردار کی یہی سربلندی ہے جو انہیں ایک عام دنیاوی فاتح کی حیثیت سے اونچا کر کے مجاہد فی سبیل اللہ کے خلعت فاخرہ سے آراستہ کرتی ہے اور ان کا رتبہ عام فاتحین سے بدرجہا بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ آپ سپہ سالاری سے معزول ہوئے تھے، لیکن لقب سیف اللہ سے تو معزول نہ ہوئے تھے، جو آپ کو دربار رسالت سے عطا ہوا تھا۔ اسی لقب کی لاج رکھتے ہوئے آپ نے عملاً یہ بات ثابت کر دی کہ آپ کا جہاد عمرؓ کیلئے نہیں بلکہ محض رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا تھا کہ:

"اگر حضرت عمرؓ میرے اوپر کسی حبشی کو بھی سردار بنا دیتے تو میں اس کے زیر کمان بھی اسی جوش سے جہاد کرتا، جیسے کہ اب تک کرتا رہا ہوں۔"

حضرت خالدؓ بطور مشیر خاص اور دستِ راست مسلسل حضرت ابو عبیدہؓ کے ساتھ مصروفِ جہاد رہے حضرت ابو عبیدہؓ انہیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جب بھی کوئی اہم اور مشکل مہم درپیش ہوتی، اسے سر کرنے کے لیے حضرت خالدؓ ہی کا انتخاب کیا جاتا اور وہ ہمیشہ سرخرو کامیاب ہو کر لوٹتے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ اکیلے دشمنوں کے نرغے میں آ گئے اور دشمن نے انہیں دھوکے سے قتل کرنا چاہا لیکن وہ بے پناہ شجاعت و جانثاری اور بیدار مغزی سے کام لے کر بچ نکلتے اور دشمن کو رسوا ہونا پڑتا۔

اس سے پہلے جنگ یرموک میں آپ کا کارنامہ بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح آپ نے حمص، قنسرین، رستن

شیرز، اردن، حلب، فلسطین اور انطاکیہ وغیرہ کے معرکوں میں بھی بے مثال کارنامے سرانجام دیئے اور ہر اہم مہم اور مرحلے میں پیش پیش رہے۔

محیّر العقول واقعہ

جبلہ بن ایہم غسان کا بادشاہ تھا جو قبول اسلام کے بعد مرتد ہو گیا تھا۔ وہ ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلے پر آیا۔ حضرت خالدؓ حضرت ابو عبیدہؓ کی اجازت سے صرف ساٹھ منتخب مجاہدین کے ساتھ مقابلے پر نکلے۔ دشمن سمجھا کہ صلح کی بات چیت کے لیے آئے ہیں۔ لیکن دشمن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ تو جنگ کے لیے آئے ہیں۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی۔ حضرت خالدؓ اور ساتھیوں نے پہلے ایک دائرے کی صورت میں اور پھر الگ الگ ٹولیوں کی صورت میں شجاعت کے کارنامے دکھائے۔ اور سارا دن جنگ جاری رہی۔ شام ہوئی تو دشمن میدان سے بھاگ چکا تھا اور مسلمان فاتح بن کر لوٹے۔ دس مجاہد شہید ہوئے اور پانچ گرفتار ہوئے۔ دشمن کا نقصان بے اندازہ تھا۔ یہ مجاہد رومی سردار باہان کی قید میں تھے۔ حضرت خالدؓ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ باہان کے شاہانہ دربار میں بے باکانہ پہنچ گئے۔ باہان نے دھوکے سے حضرت خالدؓ کو قتل کرنا چاہا، لیکن آپ ایک ہی جست میں باہان کے تخت پر جا چڑھے اور اپنی تلوار کی نوک باہان کے سینے پر رکھ دی اور آپ کے ساتھیوں نے باہان کے تخت کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حضرت خالدؓ نے للکار کر کہا کہ اگر کسی نے ہلنے کی جرأت کی تو نوکِ شمشیر سینے میں اتر جائے گی۔ اس پر باہان نے مجبوراً مسلمان قیدی رہا کر دیئے اور حضرت خالدؓ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فتح یاب لوٹے۔

حضرت خالدؓ کی وفات

ملک شام کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ کو قنسرین کا گورنر مقرر کیا گیا، لیکن آپ کچھ عرصہ بعد مستعفی ہو کر مدینہ منورہ چلے گئے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے پانچویں یا چھٹے سال حضرت خالدؓ نے وفات پائی۔ آپ مرض الموت میں فرماتے تھے: میں نے عرصہ تک کفار و مشرکین کے خلاف جہاد کیا اور بیسیوں جنگوں میں جام شہادت کی طلب میں جان توڑ کر لڑائی کی۔ لیکن افسوس شہادت کی آرزو پوری نہ ہوئی اور مجھے موت نے بستر پر آ دبوچا۔" دراصل اس کا سبب یہ تھا کہ آپ کو دربارِ رسالت سے سیف اللہ کا خطاب ملا تھا اور ظاہر ہے کہ اللہ کی تلوار کو اللہ کے سوا اور کون توڑ سکتا ہے؟ آپ کی وفات کے بعد آپ کے اثاثے کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے ایک غلام، ایک گھوڑے اور چند ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑا۔

جب حضرت عمرؓ کو آپ کی وفات کی اطلاع ملی تو بے حد غمگین ہوئے اور فرمایا:

"مسلمانوں کو ایک ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ خالدؓ ایسے جرنیل کی اب شاید ہی کوئی ان کی جگہ لے سکے۔ وہ دشمن کے لیے مصیبت تھے، خوش قسمت ہے وہ ماں جس کے بطن سے خالدؓ جیسا فرزند پیدا ہوا۔"

دنیا کا سب سے بڑا جرنیل

حضرت خالدؓ بن ولید کے حالات پڑھنے کے بعد ہر انصاف پسند اور صاف ذہن رکھنے والا انسان محسوس کرتا ہے کہ بلاشبہ آپ دُنیا کے سب سے بڑے جرنیل تھے۔ آپ کے محیّر العقول کارنامے دلیل بن کر قدم قدم پر مطالبہ کرتے ہیں کہ نہ صرف اسلام کی بلکہ دنیا کی تاریخ میں آپ کو وہ مقام دیا جانا چاہیئے، جس کا مستحق دنیا کے کسی فاتح، کسی جرنیل اور کسی سپاہی کو نہیں سمجھا گیا۔

بخت نصر، جولیس، سکندر، نپولین اور دنیا کے دوسرے فاتحین کی داستانوں کا تجزیہ کرنے کے بعد صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ طاقت نے کمزوری کو، کثرت نے قلت کو اور ظلم نے مظلومی کو فتح کیا۔ ان فاتحین کی داستانوں میں حضرت خالدؓ بن ولید کی داستان۔ ایسا رنگ کہاں کہ ہمیشہ مظلومی نے ظلم کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا ہو، قلت نے کثرت کو چیلنج کیا ہو، بے سروسامانی نے سازوسامان والوں سے ٹکر لی ہو۔ یا پیادہ غازیوں نے آہن پوش سواروں کو نیچا دکھایا ہو۔

حضرت خالدؓ کی یہ کتنی بڑی خصوصیت ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں کم و بیش سوا سو لڑائیاں لڑیں، جن میں آپ کی فوجی طاقت دشمن کے مقابلے میں پاسنگ کے برابر ہوتی تھی، لیکن کسی ایک لڑائی میں شکست نہیں کھائی۔ پھر آپ کے ہمراہی صحرائے عرب کے غیر تربیت یافتہ مٹھی بھر افراد تھے، خود آپ نے بھی کسی فوجی کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی تھی، پھر مقابلہ کس کے ساتھ تھا؟ قیصر و کسریٰ کے آہن پوش منظم اور تربیت یافتہ لشکروں کے ساتھ، جن کے وسائل اور سامانِ حرب کا کوئی اندازہ نہ تھا، ادھر مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں! آپ نے یہ فتوحات تائیدِ ایزدی اور حسنِ تدبیر اور شجاعت کے بل بوتے پر حاصل کیں۔ آپ نے موقع و محل کی مناسبت سے نئے نئے اسلوبِ جنگ اختیار کئے اور جدید قاعدے وضع کئے، کبھی آپ نے محض صفوں کی ترتیب بدل کر دشمن کو خوفزدہ کر دیا، کبھی اپنے لشکر کو چند قدم پیچھے ہٹا کر فتح حاصل کی۔ بعض اوقات عام فوجی اصولوں کے برخلاف بالکل معمولی طاقت کے ساتھ دشمن کی بڑی بڑی جماعتوں پر ٹوٹ پڑے۔ کبھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہفتوں اور مہینوں کی راہ دنوں میں طے کر کے دشمن کی توقع اور اندازے کے بالکل خلاف اسے منزلوں آگے جا لیا۔ آپ دشمن پر بجلی بن کر گرتے تھے اور اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ آپ کا نام سنتے ہی دشمن پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی اور بڑے بڑے بہادر سالار آپ سے جنگ کرنے سے کتراتے تھے۔

پھر یہ بھی نہیں کہ اس مشہور مقولے کے مطابق "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے" آپ نے ہر چالاکی اور مکاری کو جائز سمجھا ہو۔ صلح اور جنگ دونوں صورتوں میں باہمی معاہدوں اور وعدوں کا جس قدر لحاظ حضرت خالدؓ کرتے تھے، شاید ہی کسی اور قوم کے ہیرو نے کیا ہو۔ آپ میدانِ جنگ میں بھی عدل و انصاف اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ آپ کو اسلام کی صداقت اور اپنی مہم کی کامیابی کا اسی طرح یقین تھا جس طرح

دوسرے دن طلوع آفتاب کا ۔۔۔ یہی وہ خوبیاں ہیں، جن کی بنا پر آج ایک مخالف کو بھی کہنا پڑتا ہے کہ: "خالدؓ دنیا کا سب سے بڑا جرنیل تھا۔"

منظوم نذرانہ عقیدت

تُو نے اسلامی حمیت کا دیا رنگیں ثبوت
خون کے بہتے ہوئے دریا میں گھوڑا ڈال کر

کفر کی شہ رگ سے تھمتا ہی نہیں اب تک لہو
اللہ اللہ! تیری تیغ حق پرستی کا اثر!

تو نے تنہا کفر کی فوجوں میں ہلچل ڈال دی
تیرا جوشِ عزم تھا بیگانۂ خوف و خطر

تیرے دل کے حوصلے ناخوردۂ زخم شکست
تو جہاں پہنچا وہیں موجود تھی فتح و ظفر

آج بھی افسانۂ یرموک کی تازہ ہے یاد
سر کٹا دیتے ہیں اب بھی لوگ حق کے نام پر

(ماہر القادری)

حضرت خالدؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سے خاص محبت تھی۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے اپنے سر مبارک کے بال کٹوائے تو حضرت خالدؓ نے انہیں اٹھا لیا اور اپنی ٹوپی میں سی لیا۔ یہی ٹوپی وہ جہاد کے وقت بھی اپنے سر پر اوڑھے رکھتے تھے۔

خلیفہ راشد سوم

امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

۲۴ھ تا ۳۵ھ ــــ بمطابق ــــ ۶۴۵ء تا ۶۵۶ء

"ہر نبی کے لیے ایک رفیق ہے اور میرے رفیق جنت میں عثمان ہیں۔" (الحدیث ترمذی)

"کیا میں اس شخص سے حیاء نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں یعنی حدیث سے۔" (الحدیث مسلم)

ابتدائی حالات و انتخاب خلافت

سوال:۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات اور انتخاب خلافت پر روشنی ڈالیے۔

جواب:۔ **خاندان:** آپ رضی اللہ عنہ کا نام عثمان رضی اللہ عنہ، کنیت ابو عبداللہ اور ابو عمر ہے۔ لقب ذوالنورین (دو نوروں والا) ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا یکے بعد دیگرے آپ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ والد کا نام عفان بن ابی العاص اور والدہ کا اروی تھا۔ آپ قریش کی مشہور شاخ بنو امیہ سے تھے۔ پانچویں پشت پر آپ رضی اللہ عنہ کا نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ بنو امیہ کا خاندان زمانہ جاہلیت سے نہایت معزز و مقتدر چلا آتا تھا۔ قریش کے خاندانوں میں بنی ہاشم کے سوا کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ قریش کا مشہور عہدہ "عقاب" یعنی فوجی نشان کی علمداری اسی میں تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مورث اعلیٰ امیہ بن عبدالشمس قریش کے بڑے دبدبہ و شکوہ کے رئیس تھے۔ ماں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رشتہ اور بھی قریب ہے۔ اروی، حضور اقدس کی پھوپھی ام حکیم البیضا (بنت عبدالمطلب) کی بیٹی تھیں یوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور اقدس کے پھوپھی زاد بہن کے لڑکے اور آپ کے داماد تھے۔

پیشۂ تجارت: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہجرت نبوی کے ۴۷ سال قبل پیدا ہوئے۔ بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے والد عفان اور بنی امیہ کا پورا خاندان ابتداء ہی سے تجارت پیشہ تھا ان کے تجارتی قافلے شام جایا کرتے تھے۔ عفان ایک تجارتی سفر کے دوران انتقال کر گئے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے ترکہ میں مال و دولت چھوڑ گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے

اپنی خاندانی روایت کے مطابق تجارتی کاروبار سنبھالا اور اس میں اپنی دیانت اور راستبازی سے اتنی ترقی حاصل کرلی تھی کہ قریش کے امیر ترین لوگوں میں شمار تھا۔ اپنی ثروت کی وجہ سے "غنی" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ اسلام سے پہلے بھی آپ اپنی صداقت، دیانت اور خوش معاملگی کے لیے مشہور تھے۔

قابلِ قدر اوصاف آپؓ کی ذات میں ابتدائے عمر سے بعض نہایت قابلِ قدر اوصاف موجود تھے۔ آپ نہایت باحیا اور نیک اطوار کے مالک تھے جب ذرا ہوش سنبھالا تو پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ ہو گئے، چنانچہ وہ اپنے زمانے کے چند پڑھے لکھوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور اس کی بدولت آپؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتبِ وحی ہونے کا شرف و فخر بھی نصیب تھا۔

قبولِ اسلام حضرت عثمانؓ جب سفرِ شام سے واپس آئے تو اسلام کا کچھ چرچا سنا اور آپؓ کی خالہ سعدی نے جو کاہنہ تھیں، آپؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثنا و صفت بیان کی۔

ایک اور روایت کے مطابق اسی دوران بیداری اور خواب کی درمیانی کیفیت میں آپؓ نے ایک ندا کرنے والے کی یہ آواز سنی کہ مکہ میں احمد کا ظہور ہوا۔ وہ روایت جو متفق علیہ ہے، یہ ہے کہ آپؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تبلیغ و ترغیب سے ایمان لائے۔ ایک مرتبہ آپؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے۔ یہ دونوں بزرگ آپس میں بچپن کے ساتھی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اس وقت ایمان لا چکے تھے۔ اس روز اتفاق سے دونوں میں توحید کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ حضرت عثمانؓ کی طبیعت میں ہدایت یابی کی صلاحیت موجود تھی۔ چنانچہ اٹھنے سے پہلے اسلام قبول کر لینے پر آمادہ ہو گئے۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ حسنِ اتفاق سے حضورؐ وہیں تشریف لے آئے اور حضرت عثمانؓ نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔

خاندانی مظالم حضرت عثمانؓ کا خاندان (بنو امیہ) اسلام اور مسلمانوں کے نہایت سخت دشمن تھے۔ ان کا غصہ غریب مسلمانوں پر ٹوٹتا تھا۔ اسلام لانے کی پاداش میں آپؓ کے چچا حکم بن العاص نے آپؓ کو سخت اذیتیں دیں۔ رسّی سے جکڑ کر گھر میں قید کر دیا۔ کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر دھونی دی۔ اس کے علاوہ آپؓ سے اپنی بیٹی کا جو رشتہ طے کیا تھا، وہ توڑ ڈالا اور کہا کہ میں دیکھوں گا کہ اب تجھے کسی معزز خاندان میں کیسے رشتہ ملتا ہے؟ لیکن آپؓ کی خوش بختی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؓ کو اپنا داماد بنا لیا۔ ماں نے بھی سخت بیزاری اور ناراضگی کا اظہار کیا، مگر ایمان جو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکا تھا، اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ چنانچہ آپؓ کے عزم و استقلال سے زچ ہو کر بالآخر چچا اور ماں نے معاملہ آپؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

شادی و ہجرت

آپؓ جو فطرتِ سلیم لے کر پیدا ہوئے تھے اور آپؓ میں اخلاص اور ایمان کا جو جوہر تھا، اس کے باعث بارگاہِ رسالتؐ میں آپؓ کو شروع ہی سے بڑا قرب حاصل ہو گیا تھا۔ پھر حضورؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے آپؓ کا عقد کر دیا۔ جب مسلمانوں پر ابتلاء و آزمائش حد سے بڑھ گئی تو حضورؐ نے ان کو ہجرتِ حبشہ کی اجازت فرمائی، سب سے پہلے قافلہ کے ساتھ حضرت عثمانؓ مع اپنی اہلیہ محترمہ کے حبشہ کو ہجرت کر گئے۔ چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے:۔

"عثمانؓ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کے بعد اپنے اہلِ بیت کے ساتھ ہجرت کی ہے۔"

کچھ عرصہ بعد جب اہلِ مکہ کے اسلام قبول کرنے کی افواہ سنی تو واپس آ گئے۔ بعدازیں اہل و عیال کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی۔

خلافت سے پہلے کی اسلامی خدمات

اسلام لانے کے بعد سے آپؓ کی تمام دولت اور ساری زندگی اسلام کی اعانت، مسلمانوں کی خدمت اور اللہ کے دین کی تبلیغ و حمایت میں صرف ہوئی۔ آپؓ کی دولت و ثروت سے اسلام اور مسلمانوں کو بیشمار فائدے پہنچے۔ آپؓ سراپا ایثار و قربانی تھے۔

بیئر رومہ کا وقف کرنا

آپؓ نے ہر موقع پر انتہائی سخاوت اور دریا دلی سے کام لیا۔ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو میٹھے پانی کی سخت دشواری پیش آئی۔ میٹھے پانی کا صرف ایک کنواں تھا، جو بیئر رومہ کہلاتا تھا۔ وہ بھی ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ وہ قیمتاً پانی دیتا تھا۔ عام طور پر مسلمانوں کی اتنی حیثیت نہ تھی کہ وہ قیمت دے کر پانی پی سکتے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ کنواں آٹھ ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ آپؓ کے اس ایثار سے حضورؐ بہت خوش ہوئے اور دعا دی۔

مسجدِ نبویؐ میں توسیع

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک چھوٹی سی مسجد بنوائی جو مسجدِ نبویؐ کہلائی، جو کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے باعث نماز کے لیے ناکافی ہو گئی۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے جمعہ کے روز خطبہ میں فرمایا:۔

"جو شخص مسجد سے ملے ہوئے فلاں فلاں مکان خرید کر مسجد میں شامل کرے گا، خدا اسے جنت میں مکان عطا کرے گا اور اس کی تمام خطائیں معاف کر دے گا۔"

حضرت عثمانؓ نے بیس ہزار اشرفیوں سے کئی مکان خرید کر مسجدِ نبویؐ میں شامل کر دیئے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت عثمانؓ نے مسجدِ نبویؐ کی چھت، صحن اور دیواروں کو پختہ کرا دیا۔

قحط میں مسلمانوں کی مدد غزوۂ تبوک کے موقع پر عرب خشک سالی کی لپیٹ میں تھا۔ قحط اور افلاس کے سائے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ مجاہدین کو کھانے پینے کے سامان کی اتنی تکلیف ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ آپؓ نے غلّے اور دوسری اشیاء خوردنی کے اتنے اونٹ روانہ کئے کہ خوراک کی قلت دور ہو گئی۔ حضورؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "اے اللہ! ابن عثمانؓ سے خوش ہو گیا تو بھی خوش ہو جا۔"

غزوات میں شرکت حضرت عثمانؓ غزوۂ بدر کو چھوڑ کر تقریباً باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ غزوۂ بدر میں شامل نہ ہونے کی وجہ حضرت رقیہؓ کی شدید بیماری تھی اور حضورؐ خود آپؓ کو پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو بدری صحابہؓ میں شمار فرمایا۔ غزوات میں آپؓ شرکت کے علاوہ تقریباً پورے پورے لشکر کا خرچ برداشت کر لیتے۔ غزوۂ تبوک میں آپؓ کا ایثار قابلِ دید تھا۔ حضورؐ نے چندہ کی اپیل کی تو حضرت عثمانؓ نے ایک ہزار اونٹ، ستّر گھوڑے اور ایک ہزار دینار نقد پیش کیے۔ حضورؐ نے اس بڑی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ آپؐ مسرت سے ان اشرفیوں کو ہاتھ میں اچھالتے تھے اور فرمایا:۔

"آج کے بعد عثمانؓ کو اس کا کوئی عمل نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

ذوالنورین غزوۂ بدر کے بعد حضرت رقیہؓ وفات پا گئیں تو حضرت عثمانؓ مغموم رہنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت اُمِ کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ جس کی وجہ سے آپ ذوالنورین (دو نور والے) کہلائے۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

"حضرت عثمانؓ ذوالنورین کے سوا دُنیا میں کوئی شخص نہیں گزرا، جس کے نکاح میں ایک نبی کی دو بیٹیاں آئی ہوں۔"

حضرت اُمِ کلثومؓ بھی زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "اگر میری اور بیٹیاں ہوتیں تو میں یکے بعد دیگرے ان کا بھی نکاح عثمانؓ سے کر دیتا۔"

حضرت اُمِ کلثومؓ سے آپؓ کے ایک صاحبزادے عبداللہ پیدا ہوئے جو چھے برس کی عمر میں وفات پا گئے۔

بیعتِ رضوان صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو قریش کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ قریش نے آپؓ کو روک لیا، جس کی وجہ سے یہ افواہ پھیل گئی کہ آپؓ شہید کر دیئے گئے۔ جب حضورؐ کو معلوم ہوا کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ دغا کی ہے تو آپؐ نے جہاد و نصرت کے لیے مسلمانوں سے بیعت لی،

جو بیعتِ رضوان کہلاتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے۔ اس موقع پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بائیں ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ کہہ کر اپنے وائیں ہاتھ پر مارا اور اس طرح حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت لی۔ یہ شرف کسی اور صحابی کو نصیب نہ ہوا۔ اس منظر کو دیکھ کر ایک صحابی بول اٹھے:۔ "عثمانؓ کے لیے نبیؐ کا ہاتھ خود ان کے ہاتھ سے بہتر ہے"

اسی بیعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: "اللہ ان بیعت کرنے والوں سے راضی ہوگیا"

حضرتِ عثمانؓ اور دورِ شیخین

وصالِ نبویؐ کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لیے بیعت ہوئی تو حضرت عثمانؓ نے فوراً اور بلا تردد آگے بڑھ کر بیعت کی اور زندگی بھر حضرت ابوبکرؓ کے مخلص رفیق، محرمِ راز اور مشیر رہے۔ حضرت ابوبکرؓ تمام اہم معاملات میں آپ کو مشورہ میں شامل رکھتے تھے۔ آخر وقت میں جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کرنے کے متعلق سوچا تو چند اکابر صحابہؓ سے آپؓ نے اس سلسلے میں نجی طور پر مشورہ کیا تھا، ان میں حضرت عثمانؓ بھی شامل تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وصیت نامہ جانشینی آپ ہی نے تحریر کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جب حضرت عمرؓ کے لیے بیعت ہوئی تو حضرت عثمانؓ نے فوراً بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا اور عہدِ فاروقی میں آپؓ مملکت کے بہی خواہ اور حضرت عمرؓ کے رفیق و مشیر ہمدرد اور معتمد علیہ رہے۔

انتخابِ خلافت

مجلسِ انتخاب

حضرت عمرؓ نے آخر وقت میں خلافت کے لیے چھے اکابر صحابہؓ کی ایک مجلس قائم کر دی تھی، جو آپؓ کے خیال میں امت کے بہترین اور افضل ترین انسان تھے۔ جو سب عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال تک خوشنود و رضامند رہے۔ ان حضرات کے نام یہ تھے:۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس سے مشورہ لے لیا جائے، لیکن خلافت کے لیے نام پیش نہ کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ حکم دیا تھا کہ "یہ چھے صحابہؓ ایک جگہ جمع ہو جائیں اور تین دن کے اندر اندر اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں۔"

فیصلے کا اختیار

حضرت عمرؓ کی تجہیز و تکفین کے بعد مجلسِ شوریٰ کا اجتماع ہوا دو دن تک بحث ہوتی رہی۔ لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نہایت معاملہ فہم، مدبر اور زیرک انسان تھے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ:

"جو اپنے خیال میں جس کو بہتر سمجھتا ہے، اس کے حق میں دستبردار ہو جائے۔" اس پر حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ کے حق میں، حضرت سعدؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے حق میں اور حضرت طلحہؓ حضرت عثمانؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ لعدازیں حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا: "میں اپنا حق چھوڑتا ہوں۔" اب معاملہ صرف حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان ہے۔ ان دونوں میں سے جو کتاب اللہ، سُنّتِ رسول اور سنتِ شیخین کی پابندی کا وعدہ کرے گا، اس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔" پھر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے دونوں امیدواروں سے کہا کہ "آپ دونوں فیصلہ میرے ہاتھ میں دے دیں۔" چنانچہ آخری انتخاب کا اختیار انھیں سونپ دیا گیا۔

بھاری ذمہ داری اور عام صلاح مشورہ

حضرت عبدالرحمٰنؓ کو پوری طرح احساس تھا کہ ان پر کتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ، امرائے لشکر اور رؤساء قوم سے ملاقاتیں کیں جو حج کے بعد مدینہ آئے ہوئے تھے۔ اہلِ مدینہ سے ملے، ازواجِ مطہرات سے مشورہ کیا۔ حتیٰ کہ دروازوں پر جا کر پردہ نشین خواتین سے پوچھا۔ خود بھی غور و فکر، دعا اور استخارہ میں مصروف رہے۔

انتخاب و بیعت

حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ میعاد کی آخری رات گذرنے کے بعد صبح کو مسجد میں لوگوں کا اجتماع ہوا۔ نمازِ فجر کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ منبر پر بیٹھے اور ایک طویل دعا کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے یہ بھی پوچھا کہ "وہ خلافت کو کس طرز پر چلائیں گے؟" حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا کہ میں اپنی علمی استعداد اور صلاحیت کے مطابق چلوں گا اور شیخین کے مسلک کا پابند نہیں ہوں گا۔" لیکن حضرت عثمانؓ نے شیخین کے اتباع کو اپنے اوپر لازم کرنے کا وعدہ کیا۔ اس پر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑ لیا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دعا کی: "اے خدا! سُن اور گواہ رہ۔ میں نے اپنی گردن کا بوجھ عثمانؓ پر ڈال دیا ہے۔" ان کے بعد حضرت علیؓ نے بیعت کی اور پھر تمام حاضرین بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔

ذی الحجہ ۲۳ھ کا آخری دن تھا، جب آپؓ کے حق میں خلافت کا فیصلہ ہوا۔ اور یکم محرم ۲۴ھ کو بیعتِ عام ہوئی۔

خطبۂ خلافت

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت عثمانؓ نے حسبِ ذیل پہلا خطبہ دیا:۔

> "حمد و ثنا کے بعد! میرے ناتواں کندھوں پر خلافت کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔ توجہ سے سن لیں کہ میں اسلام کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔ نئی نئی باتیں ایجاد کرنے والا نہیں ہوں۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے بعد مجھ پر تمھارے

تین حقوق ہیں: اول سلف صالحین کا اتباع، دوم متقی علیہ امور پر عمل اور سوم یہ کہ نیک لوگوں کی پیروی۔ توجہ سے سن لیں، دُنیا دلفریب اور دلکش ہے۔ اس نے لوگوں کو فریب دیا اور اکثر اس کے دام فریب میں پھنس گئے۔ تم نہ تو دُنیا کی طرف مائل ہو، نہ ہی اس پہ بھروسہ کرو۔ یہ دنیا اعتبار کے قابل نہیں۔ یاد رکھو دنیا صرف اسی کو چھوڑتی ہے جو دُنیا کو چھوڑ دے۔"

پہلا مقدمہ حضرت عثمانؓ کے انتخاب خلافت کے بعد آپؓ کے سامنے سب سے پہلا مقدمہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبیداللہؓ کے قصاص کا پیش ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے قاتل فیروز ابولولوء نے آپؓ کو شہید کرنے کے بعد فوراً خودکشی کرلی تھی، لیکن بعض واقعات کی بناء پر حضرت عبیداللہؓ کو شک تھا کہ ابولولوء کے ساتھ دو آدمی اور جفینہ اور ہرمزان قتل کی سازش میں شریک تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے کہا تھا:۔

"میں چند روز پہلے ایک جگہ سے گزر رہا تھا تو میں نے ابولولوء۔ فیروز، ہرمزان اور جفینہ کو آپس میں سرگوشیاں کرتے پایا۔ جب میں ان کے نزدیک پہنچا تو وہ تینوں گھبرا کر اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں سے کسی ایک کے پاس سے ایک دو دھاری خنجر گرا۔" حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد خنجر دیکھا گیا تو وہی تھا۔ اس سے سازش کی تصدیق ہوگئی۔ حضرت عبیداللہؓ نے جوش غضب میں ہرمزان اور جفینہ کو قتل کر دیا۔ یہ مقدمہ حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا۔ کسی نے رائے دی کہ قصاص میں قتل کرنا چاہیے، لیکن اکثر صحابہؓ نے مخالفت کی کہ یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ کل حضرت عمرؓ قتل ہو چکے ہیں اور آج ان کے بیٹے کو تلوار کے حوالے کیا جائے۔ اس اختلاف رائے پر حضرت عثمانؓ نے قصاص کی سزا کو دیت سے بدل دیا اور مقتولوں کے ورثاء کو اپنی جیب خاص سے خون بہا ادا کر کے رضامند کر لیا اور یوں یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

عہدِ عثمانیؓ کی فتوحات

جہاں کو ہے یاد ان کی رفتار اب تک ∴ کہ نقشِ قدم ہیں نمودار اب تک
ملایا میں ہیں ان کے آثار اب تک ∴ انہیں رو رہا ہے ملیبار اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات اُن کے ازبر
نشاں اُن کے باقی ہیں جبل الطارق پر
(مولانا الطاف حسین حالی)

سوال: حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت میں اسلامی فتوحات کا حال بیان کیجیے؟

جواب:- **عہدِ عثمانی کی فتوحات**

حضرت عثمانؓ کے خلیفہ مقرر ہونے کے بعد کوئی چھ ماہ تک تو ہر طرف امن و سکون رہا۔ اس زمانے میں ایران کے کئی علاقے فتح ہو چکے تھے اور بادشاہ یزدگرد مختلف علاقوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ لیکن چھ ماہ کے بعد ایران کے کچھ علاقوں میں اچانک شورش برپا ہو گئی۔ اور مختلف صوبوں میں ان عناصر نے سر اٹھایا جو حضرت عمر فاروقؓ کے رعب و جلال کے سامنے دب کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد اسلامی اقتدار کے خلاف سازشیں کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ ان مفتوحہ علاقوں کے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یزدگرد خفیہ طور پر فوج جمع کر کے پھر میدان میں آئے گا اس سلسلے میں آرمینیا اور آذربائیجان کے علاقے پیش پیش تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اس شورش اور گڑبڑ کا بڑی کامیابی سے قلع قمع کیا۔

۱۔ آرمینیا اور آذربائیجان کی بغاوت

ان دنوں کوفے میں چالیس ہزار فوج رہتی تھی جو آذربائیجان کی حفاظت کی ذمہ دار تھی چھ ہزار سپاہی آذربائیجان اور چار ہزار رے کی حدود پر متعین رہتے تھے، جو کوفے سے باری باری بھیجے جاتے تھے۔ اس وقت کوفے کے عامل ولید بن عُقبہ تھے۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ کے حکم سے اس شورش کو دبانے کے لیے لشکر بھیجا اور وہاں کے باشندے پھر اپنی پہلی شرائط پوری کرنے پر رضامند ہو گئے۔

آذربائیجان والوں کی دیکھا دیکھی آرمینیا کے لوگ بھی سرکش ہو گئے تھے۔ ان کی شورش دبانے کے لیے دوسردار عبدالرحمٰن بن ربیعہ اور حبیب بن مثنیٰ بھیجے گئے۔ ان دونوں نے مل کر یہ بغاوت فرو کر دی۔ اس طرح یہ دونوں علاقے پھر اسلامی حکومت میں شامل کر لیے گئے۔

۲۔ اسکندریہ کی بغاوت

مصر کا علاقہ اپنی زرخیزی کی وجہ سے رومی حکومت کا نہایت اہم حصہ تھا، اس لیے قیصر کو برابر اس کی واپسی کی فکر لگی ہوئی تھی۔ سکندریہ مصر کی ایک بڑی اہم بندرگاہ تھی۔ یہاں کافی تعداد میں رومی آباد تھے۔ ۲۵ھ میں حضرت عمروؓ بن العاص کی معزولی کے بعد قیصر روم کی شہ پر اہلِ سکندریہ نے بغاوت کر دی۔ قیصر نے ان کی امداد کے لیے قسطنطنیہ سے ایک جنگی بیڑہ بھی روانہ کیا۔ رومیوں نے ایک ہزار فوج پر مشتمل مجاہدین کے ایک دستے کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ چنانچہ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مصریوں کے مشورے کے مطابق حضرت عمروؓ بن العاص ہی کو مقرر کیا گیا۔ انھوں نے کمال تدبر و فراست سے رومیوں کو شکستِ فاش دی اور شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس معرکے میں مصر کے قدیم قبطی قوم نے رومیوں کا

سر گرم ساتھ نہ دیا چنانچہ رومیوں نے شکست کے بعد فرار ہوتے ہوئے انہیں خوب لوٹا۔ حضرت عمرو نے ان قبطیوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی دلجوئی کے لیے بیت المال سے ان کے نقصان کی تلافی کر دی

مشرقی ممالک میں بغاوت

بصرہ کے حاکم حضرت ابو موسیٰ اشعری کے خلاف کچھ شکایات موصول ہونے پر حضرت عثمانؓ نے انہیں معزول کر دیا اور ان کی جگہ عبداللہ بن عامر کو گورنر مقرر کر دیا گیا۔ عین اسی دوران ترکستان کے قریب خاقان کے مقام پر پناہ گزین یزدگرد نے ایران میں بغاوت پھیلانے کی سازشیں اور منصوبے شروع کر رکھے تھے۔ ابو موسیٰؓ کی معزولی نے حالات کچھ اور بھی اس کے موافق بنا دیئے۔ ۲۹ھ میں مشرقی ایران یعنی طبرستان، فارستان، خراسان سجستان، کرمان وغیرہ کے علاقوں میں بغاوت کی آگ پھیل گئی۔ چنانچہ عبداللہ بن عامر فوراً اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے روانہ ہوئے، اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ یزدگرد جو دوبارہ ایران پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا، مفرور ہو گیا، لیکن راستے میں ایک دہقان کے ہاتھوں مارا گیا اور اس طرح ساسانی خاندان اور اس کی سازشوں کا خاتمہ ہو گیا۔

طبرستان کی فتح

اہل طبرستان نے عہد فاروقی میں صلح کر لی تھی، الجم کی بغاوت کے سلسلہ میں انھوں نے بھی صلح توڑ دی تھی۔ اس لیے ۳۰ھ میں سعید بن العاص نے طبرستان پر فوج کشی کی۔ حضرت امام حسنؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ متعدد صحابہؓ اس مہم میں شریک تھے، سعید بن عامر سیدھے جرجان پہنچے، یہاں کے باشندوں نے دو لاکھ درہم سالانہ پر صلح کر لی۔ جرجان کے بعد پورے طبرستان کو فتح کیا۔

فتح طخارستان و ماوراء النہر

اس کے بعد عبداللہ بن عامر نے اپنے ایک سالار لشکر احنف بن قیس کو طخارستان کی طرف بھیجا۔ مرورود کے علاقے میں دشمنوں نے قلعہ نشین ہو کر اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا۔ ان کی مدد کے لیے کئی اور علاقوں کے باشندے بھی میدان میں نکل آئے، لیکن احنف نے کئی مقامات پر انھیں شکست دی۔ اس موقع پر جوزجان بھی فتح ہو گیا اور اہل بلخ نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔ اس کے بعد احنف دریائے جیحوں پار کر کے ماوراء النہر میں داخل ہو گئے۔ یہاں کے لوگوں نے بھی صلح کر لی۔ احنف نے قیس بن ہیثم کو اپنا جانشین مقرر کر لیا اور مدینے کو چل دیئے۔ قیس نے اس دوران میں یکے بعد دیگرے آس پاس کے کئی علاقے فتح کر لیے۔ اس طرح حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ایک طرف فاروقی عہد کے مفتوحہ علاقوں میں امن بحال ہو گیا اور دوسری طرف اسلامی سلطنت کی حدود مشرق اور شمال کی طرف اور پھیل گئی۔

فتح قبرص

حضرت امیر معاویہؓ عہد فاروقی سے صوبہ دمشق کے والی تھے۔ حضرت عثمانؓ

نے انھیں پورے شام کا والی بنا دیا تھا۔ انھوں نے طرابلس، الشام، عموریہ اور فلطیہ وغیرہ فتح کیے۔ قبرص پر جو ساحل شام کے قریب ہی نہایت زرخیز اور شاداب جزیرہ ہے، فاروقی عہد سے حضرت امیر معاویہؓ کی نظر تھی، چنانچہ انھوں نے آپ سے اس پر فوج کشی کی اجازت مانگی تھی، لیکن حضرت عمرؓ بحری جنگ کے خلاف تھے، حضرت عثمانؓ نے بھی شروع میں احتیاط برتی، لیکن پھر ضرورت کے تحت اجازت دے دی اور اس طرح اسلامی بحری بیڑے کی بنیاد پڑی۔ اور حضرت امیر معاویہؓ نے قبرص پر پہلا سمندری حملہ ۲۸ھ میں کیا۔ اس حملے میں کئی صحابہؓ بھی شریک تھے۔ اہلِ قبرص حملے کی تاب نہ لا کر صلح پر مجبور ہو گئے۔ عبداللہ بن سعد نے بھی بحر ابیض پر رومی بیڑے کا خوب مقابلہ کیا۔ رومیوں کو بُری طرح شکست ہوئی اور بہت سے رومی جہاز مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ اس طرح مسلمانوں کا بحری بیڑہ بہت طاقتور اور مضبوط ہو گیا۔

فتح افریقہ

عبداللہ بن سعد ۲۵ھ میں افریقہ کے سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ حضرت عثمانؓ نے ان سے کہا کہ "اگر تم وہاں رومیوں کو مغلوب کر سکو تو خمسِ غنیمت کا پانچواں حصہ تم کو انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ ۲۶ھ میں لشکر لے کر چل دیئے۔ ان کے ساتھ صحابہؓ میں سے حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بھی شامل تھے۔

جب یہ لشکر برقہ سے آگے بڑھا تو قیصر کی طرف سے شہر یعقوبہ کا گورنر جرجیر ایک لاکھ بیس ہزار فوج لے کر مقابلے کے لیے بڑھا اور جنگ شروع ہو گئی۔ ایک دن حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حضرت عبداللہ بن سعد کو میدان میں نہ دیکھا تو وجہ پوچھی۔ کہا گیا جرجیر نے اعلان کرایا ہے کہ جو شخص عبداللہ بن سعدؓ کا سر کاٹ کر لائے گا، اس کو وہ ایک لاکھ دینار اور بیٹی کا رشتہ دے گا۔

اس کے مقابلے میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے یہ اعلان کرایا کہ جو شخص جرجیر کو قتل کرے گا، ہم اس کو ایک لاکھ دینار اور جرجیر کی بیٹی کا رشتہ دیں گے اور یہ کہ اسے یعقوبہ کا والی بنا دیں گے۔

چند روز جنگ ہوتی رہی۔ آخر مسلمانوں نے زور کا حملہ کیا اور غالب آ گئے۔ جرجیر خود حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کی بیٹی بھی انھی کو مل گئی۔ اس فتح سے بہت سامانِ غنیمت حاصل ہوا۔ عبداللہ بن سعدؓ کو جو خمسِ غنیمت کا پانچواں حصہ دیا گیا، وہ ایک لاکھ دینار کے برابر تھا۔

یہاں سے فوجوں کے دستے مختلف اطراف میں بھیجے گئے، جنھوں نے مزید فتوحات حاصل کر کے تیونس، مراکش، الجزائر وغیرہ کے تمام علاقے بآسانی اسلامی سلطنت میں شامل کر لیے اور افریقہ کی تسخیر مکمل ہوئی۔ ان فتوحات نے دشمنوں پر اسلامی حکومت کا سکہ بٹھا دیا اور اس طرح فتوحات کا جو سلسلہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانوں میں شروع ہوا تھا، وہ خلافتِ عثمانی میں بھی بہت حد تک جاری رہا اور کئی علاقے

فتح ہو کر اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے۔

کش، دوار اور غزنہ کی فتوحات

حضرت عبدالرحمٰنؓ بڑے حوصلہ مند شخص تھے۔ سجستان کو قابو میں لانے کے بعد کابل کی طرف فوجیں بڑھا دیں اور رخج سے لے کر دوار کے علاقے تک قبضہ کر لیا۔ دوار کے باشندے کوہ رونز میں جمع ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے انہیں گھیر لیا۔ ان لوگوں میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی اس لیے صلح کر لی۔ اس پہاڑ پر ٹھوس سونے کا ایک بت تھا۔ اس کی آنکھیں یاقوت کی تھیں۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان کے ہاتھ کاٹ کر آنکھیں نکال لیں۔ پھر مرزبان کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ "مجھے اس کی ضرورت نہ تھی۔ صرف یہ دکھانا تھا کہ بت کچھ نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" اب زابلستان یعنی غزنہ کا علاقہ تھا، کوہِ رونز کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اِدھر کا رخ کیا اور غزنہ سے لے کر قابل تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ یہ تمام فتوحات ابنِ عامر کی امارت کے زمانہ میں ہوئی تھیں، ان کی تکمیل کے بعد وہ ان کے شکرانہ میں حج کو روانہ ہو گئے۔

سواحلِ شام پر رومیوں کا حملہ

اگرچہ مسلمانوں نے رومیوں کو مسلسل شکستیں دے کر ان کی قوت بہت کمزور کر دی تھی لیکن ہاتھوں سے نکلے ہوئے ملک کا غم ان کے دل سے نہ بھولتا تھا۔ چنانچہ آخری آزمائش کے لیے ۳۱ھ میں قیصرِ روم نے چھ سو جہازوں کے بیڑے کے ساتھ سواحلِ شام پر حملہ کر دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن ابی سرح نے نہایت کامیاب مدافعت کی اور رومیوں کو نہایت فاش شکست دی اور تباہ حال قسطنطنیہ لوٹ گئے۔

متفرق فتوحات

ان اہم معرکوں اور فتوحات کے علاوہ عہدِ عثمانی میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں اور فتوحات بھی حاصل ہوئیں۔ ۳۲ھ میں حضرت امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور ۳۳ھ میں اناطولیہ کے قلعہ حصن المراۃ پر قبضہ کر لیا۔ ۳۴ھ میں افریقہ میں بڑی زبردست بغاوت ہوئی لیکن عبداللہ نے پوری مستعدی سے فرو کر دی۔

الغرض دس سال کے عرصہ میں اسلامی حکومت کی حدود ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحل اور یورپ کے صدر دروازہ تک وسیع ہو گئیں ؎

مسلمانوں کی یلغاریں کہاں روکے سے رکتی ہیں
سمندر بھی جو رستے میں پڑے پایاب ہو جائے۔

(مولانا ظفر علی خان)

نظامِ حکومت و اصلاحات

سوال:- حضرت عثمان غنی رضؓ کے دورِ خلافت کے نظامِ حکومت و اصلاحات پر تفصیل سے بحث کیجئے۔

جواب:- **عہدِ عثمانی میں نظامِ حکومت و اصلاحات** حضرت عثمانؓ کو اگرچہ اطمینان و سکون کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع صرف پانچ سال ملا، لیکن اس قلیل مدت میں آپؓ نے امتِ اسلامیہ کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دیں اور بہت سے ممالک زیرِ نگیں ہوئے۔ نظامِ خلافت حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ میں اتنا مکمل ہو چکا تھا کہ اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی بہت کم گنجائش تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اس کو بدستور اسی انداز میں قائم رکھا۔ البتہ انتظامی ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں بعض تبدیلیاں کیں اور جن شعبوں میں ترقی کی گنجائش تھی ان کو ترقی دی۔ اور رفاہِ عامہ کے بہت سے کام سرانجام پائے۔

بقول علامہ ابنِ خلدون "حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو سیاسی امور میں خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ لیکن چونکہ زمانۂ ابتلاء میں مخالفوں کی نکتہ چینی عام ہو گئی تھی، اس لیے ان کا حسنِ انتظام اور مصالحِ سلطنت نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے۔ حالانکہ آپؓ نے سیاستِ ملی میں ایسے ایسے امور اختراع کیے کہ جس کی نظیر کہیں اور نہ ملے گی۔"

ذیل میں آپؓ کے نظامِ حکومت و اصلاحات کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے:-

۱۔ **مجلسِ شوریٰ** گو عثمانی دور میں عہدِ فاروقی کی طرح شوریٰ کا اہتمام نہ رہ گیا تھا، تاہم مہماتِ امور میں حضرت عثمانؓ، اکابرِ صحابہؓ اور عمالِ حکومت سے مشورہ فرماتے تھے۔ مجلسِ شوریٰ کے باقاعدہ اجلاس دارالخلافہ میں ہوتے تھے۔ ارکانِ مجلس سے عموماً تحریری رائے لی جاتی تھی۔ چنانچہ شورشوں کے زمانہ میں آپؓ نے مدینہ میں گورنروں کا ایک اجلاس بلایا اور سب سے کہا:- "فاشیروا علیّ۔" یعنی "مجھے مشورہ دو" (طبری)

۲۔ **بعض تبدیلیاں** صوبوں کی تقسیم تقریباً وہی رہی جو عہدِ فاروقی میں تھی، البتہ شام کے ملک کو جو کئی صوبوں میں تقسیم تھا، ایک صوبہ بنا دیا اور حضرت امیر معاویہؓ پورے صوبے کے والی مقرر ہوئے۔ جس سے فتوحات کو بڑا فائدہ پہنچا۔ نئے مفتوحہ ملکوں کے نئے صوبے بنائے گئے۔

۳۔ **عمال کا احتساب و نگرانی** حضرت عثمانؓ فطرۃً نہایت حلیم الطبع، نرم خو اور

خطاپوش تھے۔ آپؓ میں عفو و درگذر کا پہلو غالب تھا، اس لیے آپؓ میں مواخذہ و احتساب کی وہ سختی نہ تھی، جو حضرت عمرؓ کا امتیازی وصف تھی۔ آپؓ بعض ایسے امور سے چشم پوشی فرما جاتے تھے، جس پر حضرت عمرؓ بڑے سے بڑے عہدہ دار کا سختی سے محاسبہ کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ عمال کی شان و شوکت کو سخت ناپسند کرتے تھے، لیکن حضرت عثمانؓ ان چیزوں سے تعرض نہیں کرتے تھے، اس طبعی فرق کی وجہ سے گو عہدِ عثمانی میں عہدِ فاروقی جیسا سخت احتساب نہ رہ گیا تھا، پھر بھی

آپ کسی ایسی بدعنوانی کو نظرانداز نہ کرتے تھے، جس سے اصولِ اسلام، اخلاقِ عامہ یا حکومت کے نظام پر کوئی اثر پڑتا ہو۔ جب کبھی کسی والی کے خلاف اس قسم کی کوئی شکایت ہوتی تھی، تو آپؓ فوراً اس کو معزول کر دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو بیت المال کا قرض ادا نہ کرنے کے الزام میں معزول کر دیا، ولید کو شراب نوشی کے جرم میں عہدہ سے برطرف کر کے حد جاری کر دی، سعدؓ بن العاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو رعایا کی شکایت پر علیحدہ کیا۔ حج کے موقع پر تمام عمال طلب کیے جاتے تھے اور اعلان ہوتا تھا کہ جس شخص کو کسی عہدہ دار کے خلاف کوئی شکایت ہو، پیش کرے۔ چنانچہ شکایات سُن کر آپؓ ان کا تدارک فرماتے تھے۔

۴۔ بیت المال کے محاصل و مصارف

عہدِ عثمانی میں بہت سے نئے ملک فتح ہوئے اور خراج کی آمدنی بہت بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ آپؓ کے عمال کے حسنِ انتظام سے پرانے محاصل میں کافی اضافہ ہوا چنانچہ مصر کے خراج کی مقدار پوری دوگنی ہو گئی۔ آمدنی میں اضافہ کے ساتھ آپؓ نے لوگوں کے وظائف میں بھی اضافہ فرمایا۔ جن لوگوں کو رمضان المبارک کے مصارف کے لیے نقد ملتا تھا، ان کا کھانا بھی مقرر فرمایا۔ ان کے علاوہ قومی مصارف اور رفاہ عامہ کے کاموں میں صرف کیا۔

۵۔ صیغۂ فوج

صیغۂ فوج میں بعض تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئیں، بعض صوبوں میں انتظامی اور فوجی شعبے جو اب تک ایک چلے آتے تھے، الگ کر دیئے۔ سپاہیوں کی تنخواہوں میں سو سو درہم کا اضافہ ہوا۔ نئے مفتوحہ علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم ہوئیں، حضرت امیر معاویہؓ نے شام میں بحرِ روم کے ساحل پر انطاکیہ سے لے کر طرطوس تک فوجی نو آبادیاں بسا دیں۔ فاروقی عہد میں جہاد کے گھوڑوں اور دوسرے متعدد مویشیوں کے لیے متعدد چراگاہیں بنائی گئی تھیں، حضرت عثمانؓ نے ان میں اور اضافہ کیا اور ان کے لیے چشمے جاری کرائے۔ یہ چراگاہیں اتنی وسیع تھیں کہ صرف ایک ضریہ کی چراگاہ میں چالیس ہزار اونٹ پرورش پاتے تھے۔ بنی امیہ تلوار کے بڑے دھنی اور شجاع تھے، اس لیے عہدِ عثمانی میں قدرتاً فوجی صیغہ کو بڑی ترقی ہوئی۔

۶۔ بحری فوج اور اسلامی بیڑہ

اس سلسلہ میں سب سے نمایاں اور اہم ترقی بحری فوج کا قیام ہے۔ عہدِ فاروقی میں فارس کی بحری جنگ میں مسلمانوں کو سخت جانی و مالی نقصان ہوا تھا اس لیے حضرت عمرؓ بحری جنگ کے خلاف ہو گئے تھے اور حضرت امیر معاویہؓ کو اس کی اجازت نہ دی۔ حضرت عثمانؓ بھی پہلے انکار کرتے رہے لیکن پھر اس شرط پر اجازت دے دی کہ بحری جنگ میں شرکت کے لیے کسی کو مجبور نہ کیا جائے، چنانچہ حصولِ اجازت کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے بحر روم کے جزیرہ قبرص پر قبضہ کیا اور حضرت عبداللہؓ بن ابی سرح والی افریقہ کے تعاون سے اسلامی بیڑے کو اتنی ترقی دی کہ وہ اس عہد کے سب سے بڑے طاقتور رومی بیڑے سے بڑھ گیا۔ چنانچہ ۳۱ھ میں جب قیصر روم نے چھ سو جہازوں کے ساتھ سواحلِ شام پر حملہ کیا تو امیر البحر عبداللہؓ بن ابی سرح نے رومی بیڑے کو نہایت فاش شکست دی۔ بحری بیڑے کے قیام کے بعد بحر روم مسلمانوں کی آماجگاہ بن گیا۔

۷۔ رفاہِ عام کے کام

عثمانی عہد میں رفاہِ عام کے بھی بہت سے کام انجام پائے۔ خصوصاً تعمیرات میں بڑا اضافہ ہوا۔ دفاتر کے لیے وسیع عمارتیں تعمیر ہوئیں، رعایا کی آسائش کے لیے سڑکیں، پل اور مسافر خانے بنوائے۔ کوفہ میں ایک وسیع مہمان خانہ بنوایا۔ مدینہ نجد کی راہ میں ایک سرائے تعمیر کرائی اور اس کے متعلق ایک بازار بسایا اور شیریں پانی کا ایک کنواں کھدوایا۔ اس کے علاوہ اور بھی کنوئیں کھدوائے۔

۸۔ بند مہزور

مدینہ منورہ، خیبر کی طرف سے نشیب میں ہے، اس لیے یہاں کبھی کبھی سیلاب آجاتا تھا، جس سے شہر کو بڑا نقصان پہنچتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے مدینہ سے تھوڑے فاصلہ پر مدری کے مقام پر بند بنوایا اور نہر کھدوا کر سیلاب کا رُخ دوسری طرف پھیر دیا، اس سے مدینہ کی آبادی بالکل محفوظ ہو گئی۔

۹۔ مؤذنوں کی تنخواہیں

آپؓ نے اسلام کی اشاعت اور نماز باجماعت کے اہتمام کے لیے پوری مملکت میں مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

۱۰۔ زرعی ترقی

آپؓ کے زمانے میں بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا گیا، باغات لگوائے گئے اور نہریں تعمیر ہوئیں جس سے ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔

۱۱۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر و توسیع

تعمیرات میں مذہبی خدمات کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ کا سب سے روشن کارنامہ مسجد نبویؐ کی تعمیر و توسیع ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق اس کی توسیع کرائی تھی، مگر

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب یہ بھی ناکافی ثابت ہوئی تو آپؓ نے ۲۹ھ میں اس کی دوبارہ تعمیر و توسیع کرائی۔ عمارت کے لیے چونا اور پتھر بطن نخل سے منگایا۔ ساری عمارت میں منقش پتھر استعمال کیے۔ ستونوں کو سیسہ سے مضبوط کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی تعمیر میں مسجد کا طول ایک سو چالیس گز اور عرض ایک سو بیس گز تھا۔ حضرت عثمانؓ نے طول میں بیس گز اور عرض میں تیس گز کا اضافہ کیا۔

۱۲۔ کبوتر بازی اور غلیل بازی کا خاتمہ

دولت کی فراوانی اور فارغ البالی کے باعث اہلِ مدینہ میں لہو و لعب کے مشاغل پیدا ہو چکے تھے، چنانچہ کبوتر بازی اور غلیل بازی خوشحال لوگوں کا دلچسپ مشغلہ بن چکا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ان دونوں مشاغل کو روک دیا۔

۱۳۔ رائے عامہ کا احترام اور رعایا کی خبر گیری

حضرت عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں جمہوریت کی روح کو زندہ رکھا اور رائے عامہ کا پورا پورا احترام کیا۔ ہر شخص کو اظہارِ خیال کی مکمل آزادی تھی۔ عوام کو حکام پر نکتہ چینی کا پورا حق اور عوام کے شخصی حقوق کی کامل آزادی دی گئی تھی۔ عوامی شکایات پر گورنروں کو برطرف کر دیا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن سعد فاتح افریقہ کو خمس کا پانچواں حصہ بطورِ انعام دیا گیا تھا، لیکن جب عوام نے اسے ناپسند کیا تو آپؓ نے رقم واپس لے لی۔

اسی طرح حضرت عثمانؓ رعایا کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ آپؓ منبر پر جمعہ کو مؤذن کے اذان دینے کے بعد تشریف لاتے تو لوگوں کے احوال دریافت کرتے۔ ان سے ان کی خبریں اور ان کے سفر کے حالات پوچھتے۔ نیز آپؓ کا اعلان تھا کہ :-

"لوگ معروف پر عمل کریں۔ منکرات سے بچیں اور کوئی مسلمان اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔ میری حمایت کمزور اور مظلوم کے ساتھ ہے۔"

۱۴۔ عدالتی نظام

عدالتی نظام کم و بیش عہدِ فاروقی کی طرز پر رہا اور اس میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی۔

انقلاب اور حضرت عثمانؓ کی شہادت

"عنقریب ایک ایسا فتنہ پیدا ہو گا کہ اس میں بیٹھے رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو گا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہو گا اور چلنے والا دوڑنے والے سے

بہتر ہوگا۔" (الحدیث)

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے (اقبالؒ)

سوال:۔ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا پس منظر، واقعات اور اثرات بیان کیجیے۔ نیز آپؓ کے خلاف اعتراضات کا تجزیہ کیجیے۔

جواب:۔

عہدِ عثمانی میں انقلاب اور فتنہ انگیزی

عہدِ عثمانیؓ کے ابتدائی پانچ چھے سال نہایت امن و سکون سے گذرے۔ فتوحات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، محاصل و خراج کی زیادتی، وظائف کی کثرت اور زراعت و تجارت کی ترقی نے ملک کو فارغ البالی اور عیش و عشرت کے سامانوں سے معمور کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے لوازمات و نتائج بغض و حسد اور رشک و رقابت کا قدم بھی آیا اور ان اندرونی تغیرات اور بیرونی اسباب نے مل کر حضرت عثمانؓ کے خلاف ایسا انقلاب برپا کیا جس نے نظامِ خلافت کو درہم برہم کر دیا اور ملت کے شیرازہ کو پارہ پارہ کر دیا۔

انقلاب اور فتنہ انگیزی کے اسباب

اس انقلاب اور فتنہ انگیزی کے خارجی اسباب حسبِ ذیل تھے:۔

۱۔ اکابر صحابہ کی کمی

اکابر صحابہؓ جو اسلام کے سچے خدمت گار اور بے لوث شیدائی تھے، اٹھتے جاتے تھے اور ان کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی تھی۔ بہت سے بزرگ ضعفِ پیری کے باعث عملی کاموں میں حصہ لینے کے قابل نہ رہ گئے تھے۔ ان کی جگہ نئی نسل لے رہی تھی، جن میں ان کے اسلاف جیسا خلوص و ولولہ نہ تھا، مال و دولت کی فراوانی نے ان میں رشک و حسد کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔ جذبۂ جہاد سرد پڑ گیا تھا۔ دینی دلچسپیاں گھٹ گئی تھیں اور ذاتی اور گروہی مفادات کو قومی اور ملی مفادات پر ترجیح دی جانے لگی۔ اسی بگاڑ کی نشاندہی اس ارشادِ نبویؐ سے ہوتی ہے:۔

"دولت و اقتدار کی ہوس تمہارے دین میں فساد پیدا کر دے گی۔"

۲۔ اکابرِ قریش پر پابندی کا خاتمہ

حضرت عمر فاروقؓ نہایت عاقبت اندیش تھے۔ آپ نے اپنے زمانہ میں اکابر قریش کو جن کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو سکتا تھا، مدینہ منورہ سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ

نے یہ پابندی اٹھادی۔ یہ لوگ مدینہ منورہ سے باہر نکلے تو خاندانِ رسالت کے تعلق سے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور وہ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بن گئے اور ان کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بھی اپنی جلالتِ شان اور عز و شرف کا احساس پیدا ہو گیا اور مفتوحہ اقوام نے ان میں خلافت کے جذبات ابھار دیئے۔

۳۔ مفتوحہ اقوام کا جذبۂ انتقام

مفتوحہ اقوام میں اپنے اقتدار کے چھن جانے کا شدید احساس تھا۔ گو مسلمانوں نے ان کے ساتھ بڑا فیاضانہ اور عادلانہ سلوک کیا تھا، لیکن ان کے دلوں میں حسد اور انتقام کے جذبات پرورش پاتے رہے۔ وہ براہِ راست تو اسلام کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے لیکن مکر و فریب اور سازش سے اسلام کے خلاف مصروفِ عمل ہو گئے۔ یہودی اور مجوسی ان میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے خلافت کو درہم برہم کرنے کے لیے سازش کا نہایت وسیع جال پھیلا دیا۔

۴۔ قریش کا جذبۂ تفاخر

قریش کے اپنے خاندانی اعزاء و تفاخر کے باعث خود کو عام عربوں سے اعلیٰ و ارفع سمجھتے تھے۔ انھیں بڑی بڑی جاگیریں ملی تھیں۔ وہ ہر معاملے میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ ان کے اس غرور و امتیاز کو وہ قومیں جن کی تلواریں ملکوں کے فتح کرنے میں برابر کی شریک تھیں، ناپسند کرتی تھیں۔ انھیں اپنے حقوق کی محرومی کا احساس تھا۔

۵۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت

زمانۂ جاہلیت میں بنو ہاشم اور بنو امیہ میں باہمی رقابت تھی، جسے اسلام نے دبا دیا تھا لیکن عہدِ عثمانی میں یہ دیرینہ رقابت دوبارہ اُبھر آئی۔ بنو ہاشم خلافت کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ حکومت کے کلیدی عہدوں پر اکثریت بنو امیہ کی قابض ہو گئی ہے تو انھیں یہ بات ناگوار گزری

۶۔ حضرتِ عثمانؓ کی صلہ رحمی یا اقربا پروری

حضرت عثمانؓ بڑے نرم خو اور کنبہ پرور تھے۔ آپ صلہ رحمی کا خاص خیال رکھتے تھے اور اپنی جیبِ خاص سے بنو امیہ کی بڑی مدد کرتے تھے۔ گو آپؓ کی عطا اپنے اور پرائے کا امتیاز نہیں کرتی تھی، پھر بھی مخالفین اس صلہ رحمی کو اقربا پروری کا غلط رنگ دے دیا۔ اور یہ پراپیگنڈا کیا کہ حضرت عثمانؓ بیت المال سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس سے انھیں فتنہ انگیزی کا جواز مل گیا۔

۷۔ حضرتِ عثمانؓ کی نرم مزاجی

حضرت عثمان طبعاً نرم مزاج اور حلیم الطبع تھے۔

آپؓ معمولی بدعنوانیوں پر چشم پوشی کرتے تھے جس کے نتیجہ میں مفاد پرست لوگ دلیر ہو گئے اور وہ حدود سے تجاوز کرنے لگے۔ امام طبری کا بیان ہے کہ "جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے رعایا کے حقوق کا خیال رکھا، اس لیے شرفاء ان سے محبت کرنے لگے اور ذلیل لوگوں نے ان کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں شہید کر دیا۔"

حضرت عثمانؓ نے خود ایک خطبہ میں فرمایا:

"واللہ! تم لوگوں نے جو باتیں کل عمرؓ کے لیے پسندیدہ قرار دی تھیں، آج انھی باتوں پر مجھ پر نکتہ چینی کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے تم پر سختی کی، تم نے برداشت کی، میں نے نرمی کی اپنے شانے تمھاری مدد کو جھکائے تو تم مجھ پر دلیر ہو گئے ہو۔"

۸۔ معزول شدہ گورنر

حضرت عثمانؓ نے بعض گورنروں کو مختلف اسباب کی بناء پر معزول کر دیا تھا۔ یہ گورنر آپؓ سے ناراض تھے۔ وہ آپؓ کے خلاف سرگرمیوں کی یا تو حوصلہ افزائی کرتے تھے یا اغماض برتتے تھے۔

عبداللہ بن سبا ــــ فتنہ انگیزی کا سرغنہ

مخالفین میں سب سے بڑا فتنہ انگیز بلکہ دشمنِ اسلام ایک بظاہر نو مسلم لیکن منافق یہودی عبداللہ بن سباء تھا، اسلام نے سب سے زیادہ صدمہ یہودیوں کے مذہبی وقار کو پہنچایا تھا، اس لیے وہ اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے اور عہدِ نبویؐ ہی سے اس کی بیخ کنی کے درپے تھے، لیکن عہدِ فاروقی تک ان کو اسمیں کامیابی نہ ہوئی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب نظام خلافت میں وہ استواری باقی نہ رہ گئی تو مختلف اسباب کی بناء پر آپؓ کے خلاف نکتہ چینی شروع ہوئی، اس وقت عبداللہ بن سباء کو یہودیوں کی پرانی عداوت نکالنے کا موقع مل گیا۔ یہ شخص بڑا ذہین طباع اور سازشی ذہن رکھتا تھا۔ اس نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر حضرت عثمانؓ بلکہ درحقیقت اسلام کے خلاف ایک وسیع سازش شروع کر دی۔

بنی امیہ اور بنو ہاشم میں پرانی رقابت چلی آرہی تھی، گو اسلام نے اس کو دبا دیا تھا، لیکن وہ دلوں سے مٹی نہ تھی ــــ ابن سباء نے سب سے پہلے اسے ابھارا اور محبِ اہلِ بیت کے لباس میں ان کی حمایت کے ساتھ ساتھ خلفائے ثلاثہ حضرت عثمان غنیؓ اور بنی امیہ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو پھنسانے اور ان میں تفریق پیدا کرنے کے لیے ان کے صاف و سادہ عقائد میں خرافات شامل کر دیئے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیح علیہ السلام

کی طرح ایک دن اس دنیا میں دوبارہ آئیں گے اور ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ہیں۔ رسولؐ کی وصیت کو پورا نہ کرنے والے ظالم ہیں حضرت عثمانؓ نے ظلم سے خلافت حاصل کی ہے وغیرہ (معاذ اللہ)

اس گمراہ کن پروپیگنڈے کے ساتھ وہ عثمانی عمال کی بدانیوں کی فرضی داستانیں بھی لوگوں میں پھیلاتا۔ خفیہ خط وکتابت کے ذریعے اس مہم کو منظم کرتا جو آہستہ آہستہ تمام اسلامی مراکز میں پھیل گئی۔ اور پورے ملک میں اضطراب وہیجان پیدا کر دیا۔ ابنِ سبا نے اپنی تحریک کا آغاز بصرے سے کیا، جہاں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن والیٔ بصرہ نے اسے نکال دیا تو وہ کوفہ پہنچا، وہاں بھی اس کے مشن کو پذیرائی ہوتی مگر وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ پھر اس نے شام کا رُخ کیا، لیکن وہاں اس کی کوئی تدبیر امیر معاویہؓ کی سیاسی بصیرت کے سامنے نہ چلی تو اس نے مصر کا رُخ کیا۔ وہاں سبائی تحریک کو بہت فروغ ملا۔

الغرض ہر جگہ ابنِ سبا کی تحریک کے اثرات پھیل گئے۔ خصوصاً عراق جو کئی اقوام کی مخلوط آبادی پر مشتمل تھا اور فتنہ فساد کے لیے سازگار خطہ تھا، سبائی فتنہ کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ کوفہ اور بصرہ میں حضرت عثمانؓ کی اعلانیہ مخالفت کا آغاز ہوا۔ ان فتنہ انگیزوں نے صورت حال کو بگاڑنے کے لیے کئی حربے استعمال کیے۔ اہم ترین مؤثر حربہ جعلی خطوط تھے جو مختلف شہروں میں عثمانی عمال کو بدنام کرنے کے لیے لکھے جاتے تھے اور لوگوں کو خلیفۂ اسلام کے خلاف بھڑکاتے۔ صحابہ کرامؓ پر ان کے اس حربے کا کوئی اثر نہ ہوا، لیکن سادہ لوح عوام ان کے دامِ فریب میں آگئے۔

تحقیقاتی کمیشن

مفسدین کی فتنہ انگیزیوں کے پیشِ نظر حضرت عثمانؓ نے مختلف عمال اور اکابر صحابہ کرامؓ سے صلاح مشورے کیے اور عام مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ۳۵ھ میں اہلِ مدینہ کے مشورہ سے حضرت عثمانؓ نے اکابر صحابہؓ کا ایک کمیشن مقرر کیا کہ وہ ملک کا دورہ اور موجودہ حالات کی تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے، چنانچہ حضرت محمد بن مسلمہؓ کو کوفہ، حضرت اسامہ بن زیدؓ کو بصرہ، حضرت عمار بن یاسرؓ کو مصر اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو شام کی طرف روانہ کیا گیا۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کے علاوہ تمام حضرات نے رپورٹ دی کہ عمال کے خلاف شکایات بے بنیاد اور من گھڑت ہیں، تمام گورنر بے قصور ہیں۔ مفسدین اور فتنہ انگیزوں نے محض طے شدہ منصوبے اور گھناؤنی سازش کے تحت ان کے خلاف الزام تراشی کی مہم چلا رکھی ہے۔

عمال کی کانفرنس

حضرت عثمانؓ نے اس تحقیقاتی کمیشن کے علاوہ تمام صوبوں میں فرمان بھیجا کہ آئندہ حج پر تمام عمال جمع ہوں، تاکہ ان کی موجودگی

میں عوام کو شکایات پیش کرنے کا موقع دیا جاسکے، چنانچہ حج کے موقع پر عمال جمع ہوئے لیکن کوئی شکایت سامنے نہ آئی۔ حضرت عثمانؓ نے فتنہ انگیزی کے متعلق گورنروں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ یہ ایک خفیہ سازش کا نتیجہ ہے اس کا علاج صرف یہ ہے کہ سازش کرنے والوں کو پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔"

یہ مشورہ سن کر پیکرِ حلم و عفو نے جواب دیا کہ:۔

"ہر ہونے والے واقعہ کا ایک دروازہ ہوتا ہے، جس سے وہ آتا ہے۔ اس اُمت کے لیے جس حادثہ کا خوف ہے، وہ آکر رہے گا، اگر اس کا دروازہ بند بھی کر دیا جائے تو وہ بزور کھول دیا جائے گا، لیکن میں اس کو نرمی سے بند کروں گا، البتہ حدود اللہ میں نرمی نہ برتوں گا۔"

غرض آپؓ نے فتنہ رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن یہ تباہ کن فتنہ شمعِ خلافت کو بجھا کر رہا۔

مخالفین کے اعتراضات اور ان کی حقیقت:

باغیوں اور شر پسندوں کی طرف سے جو اعتراضات حضرت عثمانؓ کے خلاف کیے جاتے تھے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ **اکابر صحابہ کی معزولی** اکابرِ صحابہؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے خاندان کے ناتجربہ کار نوجوانوں کو مقرر کیا، مثلاً مغیرہؓ بن شعبہ، ابوموسیٰ اشعریؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، عبداللہؓ بن مسعودؓ، عبداللہؓ بن ارقم اور عمروؓ بن العاص کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا گیا۔

۲۔ **اکابرِ صحابہؓ سے ناروا سلوک** بعض اکابرِ صحابہؓ مثلاً حضرت ابوذر غفاریؓ، عمار بن یاسرؓ اور عبداللہؓ بن مسعودؓ کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔

۳۔ **بیت المال کا بے جا مصرف اور اقرباء پروری** بیت المال کا روپیہ بے جا طور پر صرف کیا اور اپنے اعزہ کو بڑی بڑی رقوم دیں، مثلاً مروان کو طرابلس کے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ دے دیا۔ عبداللہ بن ابی سرح کو خمس کا پانچواں حصہ عطا کیا۔ عبداللہ بن خالد کو پچاس ہزار دیئے۔

۴۔ **بقیع کی چراگاہ** بقیع کی چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص کر لیا اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے سے روک دیا۔

۵۔ اموی عمّال کی بدعنوانیاں

اموی عمّال کی بدعنوانیوں کا کوئی تدارک نہیں کیا

۶۔ حدود کے اجرا میں تغافل

شرعی حدود کے اجراء میں غفلت برتی۔

۷۔ قرآنی نسخے جلانا

ایک مصحف (قرآنی نسخہ) کے علاوہ باقی تمام مصاحف جلا ڈالے۔

۸۔ بدعات کی ترویج

بعض نئی بدعتیں جاری کیں۔ مثلاً سنّتِ رسول اور سنّتِ شیخین رض کے خلاف منیٰ میں دو کی بجائے چار رکعت نماز پڑھی۔

۹۔ غیر مستند روایات پر عمل

فرائض میں تمام امت کے خلاف روایاتِ شاذہ (غیر مستند) پر عمل کیا، حالانکہ شیخین رض پوری توثیق اور تصدیق کے بغیر روایتوں کو قبول کرتے تھے۔

۱۰۔ حکم بن العاص کی واپسی

حکم بن العاص کو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جلا وطن کر دیا تھا، دوبارہ مدینہ بلا لیا۔

۱۱۔ مصری وفد کے ساتھ بدعہدی

مصری وفد کے ساتھ بدعہدی کی گئی۔

اعتراضات کا تجزیہ

اب ان اعتراضات کا تجزیہ بیان کر کے اصل حقیقت بیان کی جاتی ہے:۔

۱۔ اکابرِ صحابہ رض کی معزولی

اس اعتراض کے دو حصے ہیں:۔
ایک یہ کہ اکابرِ صحابہ رض کو معزول کیا، دوسرے یہ کہ ان کی جگہ اپنے خاندان کے ناتجربہ کار نوجوانوں کو مقرر کیا۔ لیکن ان میں سے ایک بات بھی قابلِ اعتراض نہیں۔ حضرت مغیرہ رض بن شعبہ کی معزولی کے متعلق حضرت عمر رض کی وصیت تھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رض کی معزولی کا سبب یہ تھا کہ بصرہ کی رعایا ان کے خلاف ہو گئی تھی اور حضرت عثمان رض سے ان کی معزولی کا مطالبہ کیا تھا۔ پھر بصرہ سے معزول کر کے چند برسوں کے بعد ان کو کوفہ کا والی بنا دیا۔ حضرت سعد رض بن ابی وقاص کی معزولی کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے بیت المال سے ایک رقم قرض لی تھی، جس کو ادا نہ کر سکے۔ حضرت عبداللہ رض بن مسعود کو ضعفِ پیری کی وجہ سے معزول کیا تھا

پھران کی جگہ ایک صحابی ہی حضرت زیدؓ بن ثابت کو مقرر کیا۔ حضرت عمروؓ بن العاص کی معزولی کا سبب یہ تھا کہ مصر جیسے زرخیز ملک کے اخراج کی آمدنی برابر گھٹتی جاتی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے حکم پر بھی انہوں نے اضافہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی، حالانکہ اس کی گنجائش موجود تھی، چنانچہ ان کے جانشین عبداللہؓ بن ابی سرح نے چند دنوں میں بڑھا کر دوگنا کر دیا۔ دوسرا الزام حضرت عمروؓ بن العاص پر یہ تھا کہ انہوں نے اسکندریہ کی بغاوت فرو کرنے میں ذمیوں پر بعض نادار زیادتیاں کی تھیں اور ان کو لونڈی غلام بنا لیا تھا، حضرت عثمانؓ نے ان کو آزاد کر کے پھر واپس کر دیا۔

اس اعتراض کا دوسرا حصہ کہ صحابہ کی بجائے اپنے نوجوان اور ناتجربہ کار اعزہ کو مقرر کیا، محض ایک بے معنی مغالطہ ہے۔ حکمرانی کا اصل معیار صلاحیت ہے۔ اس لحاظ سے حضرت عثمانؓ نے جن لوگوں کا انتخاب کیا وہ ان عہدوں کے لیے موزوں ترین تھے۔ ان کی اولوالعزمی اور شجاعت نے اسلامی حکومت کے ڈانڈے اسپین، چین اور ہندوستان سے ملا دیئے۔ یہ درست ہے کہ شرفِ صحابیت بھی ایک بڑا معیار ہے، لیکن مذہبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ شرط ضروری نہیں تھی۔ پھر حضرت عثمانؓ کے عہد میں اکثر اکابرِ صحابہؓ عمر کے اس حصے کو پہنچ چکے تھے، جبکہ ضعفِ پیری کے باعث وہ کسی بڑی خدمت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لائق نہ رہ گئے تھے۔ پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ صحابہؓ کو معزول کر کے تمام تر نوجوانوں کو مقرر کیا، اس کے خلاف مثالیں بھی ہیں، مثلاً کوفے سے سعیدؓ بن العاص کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو مقرر کیا۔

۲۔ اکابرِ صحابہؓ سے ناروا سلوک

اکابرِ صحابہؓ سے بدسلوکی کے سلسلہ میں شہرت ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو جلاوطن کر دیا۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کے ساتھ سختی کی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا وظیفہ بند کر دیا۔

پہلا واقعہ بالکل غلط ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو حضرت عثمانؓ نے جلاوطن نہیں کیا تھا، بلکہ وہ خود ایک ویرانہ میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ ایک بے نیاز اور دنیا سے بیگانہ بزرگ تھے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کے ساتھ بھی کوئی سختی نہیں ہوئی بلکہ وہ چونکہ سبائی جماعت سے متاثر ہو گئے تھے، اس لیے حضرت عثمانؓ نے ان کی فہمائش ضرور کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا وظیفہ ضرور بند کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت عثمان نے امت کو ایک قرآن پر متحد رکھنے کے لیے عہدِ صدیقیؓ کے مصحف کے سوا باقی تمام مصاحف ضائع کرا دیئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علیحدہ ایک مصحف تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت عثمانؓ نے ان کا مصحف بھی طلب کیا، لیکن وہ دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سختی سے کام لینا پڑا۔

۳۔ بیت المال میں تصرف اور اقربا پروری

بیت المال میں تصرف کرنے کا الزام بالکل غلط بلکہ مہمل ہے

جس فیاض غنی نے اسلام کے عہدِ غربت میں اس کی خدمت کے لیے اپنی دولت بے دریغ لٹائی ہو، وہ بیت المال پر کیا نگاہ ڈالتا۔ حضرت عثمانؓ اپنے عہدِ خلافت میں بھی بڑے ایمان دار اور صاحبِ ثروت تھے اس لیے انھیں بیت المال سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بلکہ خلفاء میں وہی ایک ایسے بزرگ تھے جو اپنے واجبی مصارف واخراجات کے لیے بھی بیت المال سے کچھ نہ لیتے تھے۔ آپؓ نے خدا کے مال میں ایک پیسے کا تصرف نہیں کیا، حتیٰ کہ آپؓ کھانا بھی اپنے ذاتی مال سے کھاتے تھے۔

بیت المال میں تصرف کے سلسلہ میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مثلاً مروان کو طرابلس کے مالِ غنیمت کا کوئی حصہ آپؓ نے عطا نہیں کیا تھا، بلکہ اس نے پانچ لاکھ میں خریدا تھا۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو خمس کا پانچواں حصہ طرابلس کی فتح کے صلہ میں ضرور دیا گیا تھا، لیکن جب مسلمانوں نے اعتراض کیا تو آپؓ نے واپس کر دیا۔ عبداللہ بن خالدؓ کو بھی ان کی خدمات کے صلہ میں پچاس ہزار دیے تھے، لیکن جب مسلمانوں نے اعتراض کیا تو اسے بھی واپس کرا دیا۔

۴۔ بقیع کی چراگاہ

بقیع کی چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص کرنے کا اصل واقعہ یہ ہے کہ بعض چراگاہیں عہدِ فاروقی سے بیت المال کے مویشیوں کیلیے مخصوص تھیں اس کی وضاحت خود حضرت عثمانؓ نے فرمائی ہے:۔

"میں نے انھی چراگاہوں کو مخصوص کر دیا ہے جو مجھ سے پہلے مخصوص ہو چکی تھیں۔ میرے پاس اس وقت دو اونٹوں کے سوا کوئی مویشی نہیں ہیں حالانکہ خلافت سے پہلے میں عرب میں سب سے زیادہ بکریوں اور اونٹوں کا مالک تھا اور آج دو اونٹوں کے سوا جو حج کے سفر کے لیے رکھ چھوڑے ہیں، میرے پاس ایک اونٹ اور ایک بکری تک نہیں ہے۔"

۵۔ اموی عمال کی بدعنوانیاں

یہ بھی درست نہیں کہ اموی عمال کی بدعنوانیوں کا تدارک نہیں کیا۔ اس کے برعکس آپؓ کے علم میں جو بدعنوانی آتی تھی، اس کا تدارک فرماتے تھے۔ آپؓ نے تمام صوبوں میں اعلان فرما دیا کہ "میں ہر سال حج کے موقع پر اپنے تمام عمال کے کاموں کا محاسبہ کیا کروں گا۔"

چنانچہ جب کسی عہدہ دار کے خلاف لوگوں کو کوئی شکایت ہوئی اور انھوں نے اس کی معزولی کا مطالبہ کیا تو آپؓ نے فوراً معزول کر دیا۔ چنانچہ اہلِ کوفہ کی شکایت پر سعید بن العاصؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ صحابی کو مقرر کیا۔

۶۔ اجرائے حدود میں غفلت

اجرائے حدود میں غفلت کے دو واقعات ایسے ہیں جو پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبید اللہؓ سے ہرمزان اور جفنیہ کے قتل کا قصاص نہیں لیا، دوسرے ولید بن عقبہ پر شراب نوشی کی حد میں تاخیر کی گئی۔

جب حضرت عثمانؓ کے سامنے حضرت عبید اللہؓ کا مقدمہ پیش ہوا تو آپؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے قصاص لینے کی رائے دی، لیکن دوسرے صحابہؓ نے اختلاف کیا اور کہا:

"یہ مناسب نہیں ہے کہ کل عمرؓ قتل ہو چکے ہیں اور آج ان کے بیٹے کو قتل کر دیا جائے۔"

حضرت عمروؓ بن العاص نے عرض کیا: "امیر المومنین! اگر آپؓ عبید اللہؓ کو معاف کر دیں گے تو امید ہے کہ خدا آپؓ سے اس کا مواخذہ کرے گا۔"

اس اختلاف رائے پر آپؓ نے فرمایا کہ "چونکہ مقتول کا کوئی وارث نہیں ہے، اس لیے میں بحیثیت ولی قصاص کو دیت (خون بہا) سے بدلے دیتا ہوں" اور اپنی جیب خاص سے دیت ادا فرمائی۔

ظاہر ہے اس مخصوص صورت میں سب سے زیادہ دانشمندانہ فیصلہ یہی ہو سکتا تھا، جو آپؓ نے کیا۔

باقی ولید بن عقبہ کی حد میں تاخیر ضرور ہوئی، لیکن غفلت نہیں برتی گئی۔ اس تاخیر کا سبب یہ تھا کہ پوری شہادت مہیا نہیں ہوئی تھی، شہادت ملنے کے بعد فوراً حد جاری کی گئی۔

۷۔ قرآنی نسخے جلانا

یہ اعتراض کہ آپؓ نے مصحف صدیقیؓ کے سوا تمام مصاحف ضائع کر دیے، نہایت لغو اور مہمل ہے۔ یہ تو حضرت عثمانؓ کی سب سے بڑی دینی خدمت اور ملت اسلامیہ پر سب سے بڑا احسان ہے کہ آپؓ نے پوری امت کو ایک قرآن پر متحد کر دیا، ورنہ دوسرے اہل کتاب کی طرح ان کا بھی حشر ہوتا۔

۸۔ بدعات کی ترویج

بدعات میں صرف یہ بدعت بیان کی جاتی ہے کہ منیٰ میں خلاف سنت دو رکعت نماز پڑھنے کی بجائے چار رکعتیں پڑھیں۔ اس کی وجہ خود حضرت عثمانؓ نے بیان فرما دی کہ "جب میں مکہ پہنچا تو یہاں قیام کی نیت کر لی تھی۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ "جو شخص کسی مقام پر اقامت کی نیت کرے تو اس کو مقیم کی طرح نماز پڑھنی چاہیئے۔"

۹۔ غیر مستند روایات پر عمل

اس الزام کے ثبوت میں کوئی واقعہ پیش نہیں کیا جاتا۔ آپؓ نے کسی مسئلہ میں متواتر روایات کو چھوڑ کر روایات شاذہ پر عمل نہیں کیا۔ ممکن ہے کسی اجتہادی مسئلہ میں آپؓ کی رائے عام رائے سے مختلف رہی ہو اور یہ کوئی قابل اعتراض امر نہیں ہے۔

۱۰۔ حکم بن العاص کی واپسی حکم بن العاص کو ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جلاوطن کر دیا تھا۔ لیکن آخر زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضورؐ سے اس کے واپس بلانے کی اجازت لے لی تھی، جس کا علم عام طور پر لوگوں کو نہ تھا۔

۱۱۔ مصری وفد کے ساتھ بدعہدی یہ الزام بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصری وفد کے ساتھ بدعہدی کی۔ درحقیقت مفسدین آپؓ کو شہید کرنا چاہتے تھے۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ایک فرضی فرمان تیار کر کے اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منسوب کر دیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مصر کے باغیوں نے مدینہ پر یورش کر دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر وقت فتنہ و فساد کو روکنے کے لیے ہر اصلاحی صورت کو قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ:

"آپؓ جو کچھ مشورہ دیں میں اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپؓ باغیوں کو واپس کر دیجیے۔"

چنانچہ تیس مہاجرین و انصار صحابہؓ نے انھیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے عام مسلمانوں کے سامنے تقریر کر کے اور آیندہ کے لیے اپنا طرزِ عمل بتایا۔ یہ تقریر اتنی مؤثر تھی کہ تمام سامعین رو دیئے۔ باغیوں نے مطالبہ کیا کہ مصر کے گورنر عبداللہ بن ابی سرح کو معزول کر کے ان کی جگہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جائے۔ صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ فرمان لکھ دیا اور باغی بظاہر واپس چلے گئے۔ لیکن ابھی اس خوش آیند خواب کی تعبیر نکلی تھی کہ ایک دن دفعتہً مصر کے باغیوں کا گروہ پہنچ گیا۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے جا کر ان سے واپسی کا سبب پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو راستہ میں ایک سرکاری قاصد مصر کی طرف جاتے ہوئے ملا۔ ہم کو شک ہوا۔ تلاشی لی تو اس کے پاس والیٔ مصر کے نام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فرمان ملا جس میں ہم لوگوں کو قتل کرنے اور مختلف سزائیں دینے کا حکم تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؓ نے بالکل لاعلمی ظاہر کی کہ "نہ ایسا حکم میں نے لکھا ہے، نہ کسی سے لکھوایا ہے اور نہ اس کے متعلق مجھے کوئی علم ہے۔" سب نے اس بیان کی تصدیق کی۔ باغیوں کو یقین ہو گیا کہ یہ مروان بن حکم کی شرارت ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی

باغیوں کی شورشیں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ معزول ہو جائیں۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے خلافت قبول کرنے کی درخواست کی، لیکن تینوں نے ڈانٹ دیا۔ انھوں نے مسجد نبویؐ پر بھی قبضہ کر لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر پتھر برسا کر انھیں زخمی کر دیا۔ باغی آپؓ کو کسی بہانے شہید کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نازک موقع پر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

نے حضرت عثمانؓ کو اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے مشورے دیے اور باغیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے اجازت طلب کی لیکن آپؓ نے اس کی اجازت نہ دی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے عرض کیا کہ "آپؓ میرے ساتھ شام چلے چلیے، وہاں آپؓ کا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ "خواہ میرا سر تن سے جدا ہو جائے، لیکن میں جوارِ رسولؐ کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

انھوں نے کہا کہ "پھر آپؓ کی حفاظت کے لیے وہاں سے فوجیں بھیج دوں۔"

فرمایا: "میں ہمسایگانِ رسولؐ کو فوج کے مصائب میں مبتلا نہ کروں گا۔"

حضرت زیدؓ بن ثابت انصار کی جماعت کو لے کر پہنچے اور عرض کیا کہ "انصار حاضر ہیں اور اجازت کے منتظر ہیں کہ دوبارہ "انصار اللہ" ہونے کا ثبوت دیں۔" حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ: "اگر جنگ مقصود ہے تو اس کی اجازت نہ دوں گا۔" حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے عرض کیا: "قصرِ خلافت میں ہم لوگوں کی خاصی تعداد ہے۔ اجازت ہو تو میں جانبازی کے جوہر دکھاؤں۔"

فرمایا: "خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ میرے لیے خونریزی نہ کی جائے۔" حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے مشورہ دیا کہ ہم لوگوں کو ساتھ لے کر نکلیے اور مقابلہ کیجیے یا مکہ و شام کی طرف چلے جائیے۔"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"میں مقابلہ نہ کروں گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خلیفہ بننا نہیں چاہتا، جس کے ہاتھوں آپؐ کی امت کی خونریزی کا آغاز ہو، مکہ بھی نہ جاؤں گا کہ یہ سرکش وہاں بھی خونریزی سے باز نہ آئیں گے اور میں حضورؐ کی اس پیشین گوئی کا مصداق بننا نہیں چاہتا کہ ایک شخص مکہ کی حرمت اٹھائے گا اور اس پر ساری دنیا کا آدھا عذاب ہو گا۔ شام کے لوگ ضرور وفادار ہیں اور معاویہؓ بھی وہاں موجود ہیں لیکن دارالہجرت اور جوارِ رسولؐ کو نہ چھوڑوں گا۔"

الغرض یہی خواہ امت نے کسی درجہ پر بھی اپنے بچاؤ کے لیے مسلمانوں کی خونریزی پسند نہ کی، بلکہ فرمایا کہ "اس وقت میرا سب سے بڑا مددگار وہ ہے جو اپنے ہاتھ اور اسلحہ کو روکے رکھے۔"

سانحۂ شہادت

باغی شرارت پر تلے ہوئے تھے۔ حضرت علیؓ اور دیگر صحابہؓ کی کوششیں بارآور نہ ہوئیں۔ اب باغیوں کے سروں پر خون سوار ہو چکا تھا۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور اتنی سختی کی کہ باہر سے کوئی شے اندر نہ جانے پاتی تھی۔ اس وقت بھی جاں نثاروں کی ایک جماعت آپؓ کی حفاظت میں سینہ سپر تھی۔ لیکن آپؓ نے اصرار کر کے سب کو واپس کر دیا صرف چند نوجوان حضرت امام حسینؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت محمدؓ بن طلحہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر وغیرہ واپس نہ گئے۔ آخر میں باغیوں نے

پانی تک بند کر دیا۔ حضرت علیؓ اور ام المؤمنین حضرت ام حبیبہؓ کو معلوم ہوا تو یہ دونوں باغیوں کو سمجھانے کے لیے گئے۔ لیکن انہوں نے حرمِ نبویؐ کا بھی ادب و احترام نہ کیا اور آپؓ کی سواری کے خچر کو زخمی کر کے گرا دیا۔

اس وقت مدینہ کی حالت نہایت خطرناک ہو رہی تھی، باغیوں پر کسی کا قابو نہ رہ گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ اتمامِ حجت کے طور پر انھیں وعظ و تلقین کے ذریعے سمجھاتے رہے، لیکن انھوں نے ایک نہ مانی بلکہ خلافت سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے صاف جواب دیا:۔

"یہ ممکن نہیں کہ میں خلافت سے دستبردار ہو جاؤں۔ میں اس قمیض (خلافت) کو اتارنے والا نہیں ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہنائی ہے۔"

یاد رہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:۔

"اے عثمانؓ! بے شک تمھیں اللہ تعالیٰ خلافت کی قمیض پہنائے گا، پس اگر لوگ تم سے وہ قمیض اتارنا چاہیں تو ہرگز نہ اتارنا۔" (ترمذی)

ایک دن آپؓ نے قصرِ خلافت کے اوپر سے تقریر فرمائی:۔

"لوگو! تم میرے قتل کے کیوں درپے ہو، میں تمھارا والی اور مسلمان بھائی ہوں۔ خدا کی قسم! جہاں تک میرے بس میں تھا، میں نے ہمیشہ اصلاح کی کوشش کی، لیکن بہر حال میں انسان ہوں، اس لیے اصابت رائے کے ساتھ لغزشیں بھی ہوئیں۔ یاد رکھو! بخدا اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر تا قیامت ایک ساتھ نہ نماز پڑھو گے اور نہ ایک ساتھ جہاد کرو گے۔"

حضرت عثمانؓ کی ان اپیلوں اور نصیحتوں کا باغیوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ محاصرہ کو تقریباً چالیس روز ہو چکے تھے۔ جتنا وقت گذرتا جاتا تھا، حاجیوں کی واپسی کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔ بعض مقامات سے فوجوں کے آنے کی بھی خبر تھی، اس لیے باغیوں نے جلد سے جلد حضرت عثمانؓ کی شمعِ حیات بجھانے کا فیصلہ کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشن گوئی کے مطابق حضرت عثمانؓ کو اپنی شہادت کا پورا یقین تھا اور حضورؐ نے ان سے عہد لیا تھا کہ صابر رہیں۔

جس دن آپؓ کی شہادت ہوئی جمعہ کا دن تھا، تاریخ ۱۸۔ ذی الحجہ ۳۵ھ تھی اس دن آپؓ روزے سے تھے۔ صبح کو بیدار ہو کر فرمایا: "میری شہادت کا وقت آ پہنچا، میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، حضورؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ بھی تھے۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

"عثمانؓ! آج روزہ رات کو تم ہمارے یہاں افطار کرنا۔"

آپؓ نے ایک پائجامہ جسے پہلے کبھی نہ پہنا تھا، زیب تن کیا۔ بیس غلام آزاد کیے اور قرآن مجید کھول کر تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت تک قصرِ خلافت کے پھاٹک پر حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہؓ بن زبیر، حضرت محمد بن مسلمہ اور دیگر صحابہ زادے باغیوں کو روکے ہوئے تھے۔ جب انھیں اندر داخل ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے پھاٹک میں آگ لگا دی اور کچھ لوگ قصرِ خلافت کے متصل دوسرے مکانوں کے ذریعے اوپر چڑھ کر اندر داخل ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ تلاوت میں مصروف تھے، لیکن ہمت نہ پا کر لوٹ آئے۔ اس کے بعد محمد بن ابی بکر نے جو حضرت عثمانؓ کے دشمنوں میں تھے، بڑھ کر ریشِ مبارک پکڑ لی اور گستاخانہ کلمات زبان پر لائے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"بھتیجے اس کو چھوڑ دو۔ تمھارے والد کبھی ایسا نہ کرتے۔ اگر وہ دیکھتے تو انھیں تمھارا یہ فعل کبھی پسند نہ آتا۔" چنانچہ وہ شرمندہ ہو کر لوٹ گئے۔

اس کے بعد ایک شقی بڑھ کر حملہ آور ہوا اور قرآن مجید کو پاؤں سے ٹھکرایا۔ ایک دوسرے شخص کنانہ بن بشیر نے اس زور سے پیشانی پر لوہے کی لاٹ ماری کہ حضرت عثمانؓ تیورا کر پہلو کے بل گر پڑے زبان مبارک سے بسم اللہ توکلت علی اللہ نکلا اور خون کا فوارہ کلام پاک کے اوراق پر جاری ہو گیا۔ اس کے بعد عمرو بن الحمق نے سینہ پر چڑھ کر مسلسل کئی وار کیے۔ آپؓ کی زوجۂ محترمہ حضرت نائلہؓ سے نہ دیکھا گیا، وہ بے تابانہ بچانے کیلیے دوڑیں۔ ان کی تین انگلیاں ہاتھ سے کٹ کر اڑ گئیں اور سودان بن حمران نے لپک کر شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت آپؓ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے:

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (البقرۃ: ۱۳۷)

ترجمہ: اور تمہیں ان کے مقابلے کے لیے خدا کافی ہے اور وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

شہادت کے وقت آپؓ کی عمر مبارک ۸۲ سال تھی۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

تجہیز و تکفین مدینہ منورہ پر باغیوں کا قبضہ تھا۔ بدامنی کی وجہ سے کسی کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ دو دن تک لاش مبارک بے گور و کفن پڑی رہی۔ دوسرے دن یعنی سنیچر کی شام کو چند آدمیوں نے جان پر کھیل کر تجہیز و تکفین کی ہمت کی، شہادت کی طہارت غسل سے بے نیاز تھی۔ چنانچہ انھیں خون آلود کپڑوں میں چار آدمیوں نے جنازہ اٹھایا اور نمازِ جنازہ پڑھائی اور کابل سے ملکش تک

کے فرمانزوا کو سترہ آدمیوں کی مختصر جماعت نے خفیہ جنت البقیع میں سپرد خاک کیا اور باغیوں کے خوف سے قبر کا نشان چھپا دیا۔

شہادت کے اثرات

بقول شاہ معین الدین احمد ندوی: "حضرت عثمانؓ کی شہادت درحقیقت تنہا آپؓ کی شہادت کا واقعہ نہ تھا، بلکہ وحدتِ اسلامی کی شکست اور مسلمانوں کے شیرازہ کی برہمی کا حادثہ تھا۔ اس حادثے سے مسلمانوں میں جو تفرقہ پیدا ہوئی وہ تا قیامت نہ مٹے گی اور اس وقت جو تلوار بے نیام ہوئی تھی، وہ ہمیشہ بے نیام رہے گی۔ مسلمان، شیعہ، سنی، خارجی اور عثمانی فرقوں میں بٹ گئے اور جو متحدہ قوت غیر مسلموں اور اسلام کے دشمنوں کے مقابلہ میں صرف ہوتی تھی، وہ ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگی اور عہد صحابہؓ سے جس خانہ جنگی کا آغاز ہوا اس کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔"

ذیل میں ان اثرات و نتائج کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ صحابہ کرامؓ کا اضطراب اور شدید رنج و غم

فوری طور پر اس شہادت کی خبر سے ہر طرف اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ وہ صحابہ کرامؓ بھی جو حضرت عثمانؓ سے اختلاف کیا کرتے تھے، سخت پریشان ہوئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شر پسند امیر المؤمنین کے قتلِ ناحق کی اس طرح جسارت کریں گے۔ جب یہ المناک خبر اہلِ مدینہ نے سنی تو سب پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور عالمِ اسلام پر سناٹا چھا گیا۔ حضرت علیؓ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپؓ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا:۔

"یا الٰہی تو خوب جانتا ہے کہ میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں۔"

نیز فرمایا کرتے تھے کہ: "عثمانؓ کے قتل کے دن میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔"

حضرت سعیدؓ بن زید نے کہا: "اگر تمہارے اس معاملہ سے جو تم نے عثمانؓ کے ساتھ کیا ہے، خدا کا عرش اپنی جگہ سے ہل جاتا تو بعید نہیں تھا۔"

حضرت عبداللہؓ بن سلام کہا کرتے تھے: "لوگوں نے عثمانؓ کو قتل کر کے اپنے اوپر ایسے فتنے کا دروازہ کھول لیا ہے جو قیامت تک بند نہ ہو گا۔ اب جو تلواریں کھنچ گئی ہیں وہ قیامت تک میان میں بند نہ ہوں گی۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں: "باغیوں نے عثمانؓ کو شہید کر دیا، حالانکہ وہ سب سے زیادہ صلہ رحم کرنے والے اور خدا سے ڈرنے والے تھے۔"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہا کرتے تھے : "اگر سب لوگ قتلِ عثمانؓ پر متفق ہو جاتے تو اُن پر مثلِ قومِ لوطؑ پتھر برستے ۔"

۲۔ مسلمانوں کے اتحاد کا خاتمہ

اس عظیم سانحہ نے مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور حضرت عثمانؓ کی وہ پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی کہ "اگر آج تم نے مجھے قتل کر دیا تو تم قیامت تک نہ اکٹھے نماز پڑھ سکو گے نہ جہاد اکٹھے کر سکو گے ۔"

اس سانحہ نے ایک طبقہ جنم دیا جو حضرت عثمانؓ کے خون کے دعوے دار تھے ۔ یہ لوگ عثمانی کہلائے ۔ حضرت علیؓ کے حامی لوگ شیعانِ علیؓ کہلائے ۔ ایک تیسرا گروہ جو سرحدوں پر جہاد میں مصروف تھا غیر جانبدار ہو گیا ۔ یوں باہمی الزامات کا وہ طویل سلسلہ شروع ہوا جس نے مسلمانوں کے اتحاد کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ۔

۳۔ قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ

شہادتِ عثمانؓ کی خبر سن کر حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا تھا کہ : "اگر عثمانؓ کے خون کے قصاص کا مطالبہ نہ کیا گیا تو لوگوں پر آسمان سے پتھر برسیں گے ۔"

یہ ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی ، چنانچہ ہر طرف سے قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ شروع ہو گیا ۔ حضرت عائشہؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ نے اسے عملی شکل دی ۔ جس کا نتیجہ جنگِ جمل نکلا ۔ دوسری طرف حضرت عثمانؓ کا خون آلود کرتا اور حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں دمشق میں حضرت امیر معاویہؓ کے پاس پہنچ گئیں ۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کی قیادت میں ایک گروہ قصاصِ عثمانؓ کی دعوت لے کر اُٹھا جس کا نتیجہ جنگِ صفین تھی ۔

۴۔ اسلامی جمہوریت کا خاتمہ

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے اسلامی جمہوریت کی روح بُری طرح پامال ہوئی اور حضرت علیؓ کی شہادت سے بالکل ختم ہو گئی ۔ پہلے تین خلفاء کا انتخاب متفقہ رائے عامہ سے ہوا تھا لیکن حضرت علیؓ کا انتخاب گو جمہوری تھا ، لیکن ایک فریق نے ان کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی ، جس سے عوام کی رائے کی بجائے طاقت کی راہ اختیار کی گئی اور جمہوریت کی جگہ خاندانی وراثت قائم کی گئی ۔

۵۔ غیر اقوام پر اثرات

خلافتِ عثمانؓ تک اُمتِ مسلمہ ایک عظیم ملت کی طرح متحد تھا ۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر عزم و استقلال کا قلعہ تھی ۔ دشمنانِ اسلام اس کے رعب و دبدبہ سے لرزتے تھے ۔ لیکن باہمی نفاق ، انتشار اور خانہ

جنگی سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی۔ ان کی تلواریں غیروں کی بجائے اپنوں کا خون چاٹنے لگیں، جس سے غیر اقوام مسلمانوں پر دلیر ہوگئیں اور اسلامی فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔

۶۔ برکاتِ نبوت کا اٹھ جانا

اب تک مسلمان برکاتِ نبوت سے بہرہ مند ہو رہے تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت سے یہ برکات اٹھالی گئیں۔ اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ جب حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تنگ دستی کا ذکر کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کھجوروں کا ایک تھیلا دیا اور فرمایا کہ اس تھیلے کو اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔ تمھیں جب بھی ضرورت پڑے اس سے کھجوریں نکال سکتے ہو۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ اس تھیلے سے حضرت عثمانؓ کے عہد تک فائدہ اٹھاتے رہے، لیکن جب حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تو وہ تھیلا غائب ہو گیا، کیونکہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "یہ تھیلا اس وقت تک تمھارے پاس موجود رہے گا جب تک برکات نبوت اٹھا نہیں لی جاتیں۔"

۷۔ حضرت حسنؓ کا خواب

حضرت حسنؓ نے ایک خطبہ میں فرمایا: "لوگو! میں نے کل رات ایک عجیب و غریب خواب دیکھا، میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت لگی ہوئی ہے، پروردگار کائنات اپنے عرش پہ متمکن ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور عرش کا ایک پایہ پکڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں پھر حضرت عمرؓ آتے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر اچانک حضرت عثمانؓ اس حالت میں عدالت میں آتے ہیں کہ ان کا کٹا ہوا سر ان کے ہاتھ میں رکھا ہوتا ہے اور وہ اللہ عزّ و جلّ کی بارگاہ میں فریاد کناں ہوتے ہیں کہ "اے پروردگار! اپنے ان بندوں سے جو تیرے آخری نبی جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں اور جو خود کو مسلمان کہتے ہیں، پوچھا جائے کہ مجھے کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا، شہید کیا گیا۔ (بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَ) میرا آخر کیا گناہ تھا، کون سا جرم تھا جس کے بدلے میں میرا سر کاٹا گیا۔" اس کے بعد حضرت حسنؓ بیان فرماتے ہیں کہ "عثمانؓ کی اس فریاد پر میں نے دیکھا کہ عرش الٰہی تھرا یا اور آسمان سے خون کے دو پرنالے جاری کر دیئے گئے جو زمین پر خون برسانے لگے۔"

(یہ خون کے دو پرنالے درحقیقت جنگ جمل اور جنگ صفین تھیں)۔ (شہید مظلوم۔ از ڈاکٹر اسرار احمد)

حضرت عثمانؓ کا بیمثال حلم اور صبر واستقامت

حضرت عثمانؓ نے اپنی شہادت کے عظیم سانحہ

کے موقع پر جس حلم اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا، اس کی مثال ملنی مشکل ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپؓ کو جو اقتدار و اختیار حاصل تھا، اگر اسے بروئے کار لاتے ہوئے ذرا سا بھی حکم یا اجازت صادر کر دیتے تو باغیوں اور شر پسندوں کا مکمل صفایا ہو سکتا تھا، لیکن آپؓ نے یہ بات پسند نہ کی کہ اُن کی وجہ سے مسلمانوں میں باہمی خونریزی ہو۔ اسی لیے اس عظیم مقصد کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عثمانؓ کا کردار بحیثیت خلیفہ ایک مثالی کردار تھا، جس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آپؓ خود اس امر میں مانع تھے کہ اُن کے اقتدار کو بچانے کے لیے مدینۃ الرسولؐ میں مسلمان ایک دوسرے سے لڑیں۔ وہ تمام صوبوں سے فوجیں بلا کر محاصرین کی تکہ بوٹی کرا سکتے تھے، مگر انھوں نے اس سے پرہیز کیا ______ حقیقت یہ ہے کہ انتہائی نازک موقع پر حضرت عثمانؓ نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا، جو ایک خلیفہ اور ایک بادشاہ کے فرق کو صاف صاف کر کے رکھ دیتا ہے۔ ان کی جگہ کوئی بادشاہ ہوتا تو اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کوئی بازی کھیل جانے میں بھی اسے باک نہ ہوتا۔ اس کی طرف سے اگر مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، انصار و مہاجرین کا قتل عام ہو جاتا، ازواج مطہرات کی توہین ہوتی اور مسجد نبویؐ بھی مسمار ہو جاتی تو وہ کوئی پرواہ نہ کرتا، مگر وہ خلیفۂ راشد تھے۔ انھوں نے سخت سے سخت لمحوں میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا کہ ایک خدا ترس فرمانروا اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے کہاں تک جا سکتا ہے اور کس حد پر پہنچ کر اسے رُک جانا چاہیے۔ وہ اپنی جان دے دینے کو اس سے ہلکی چیز سمجھتے تھے کہ ان کی بدولت وہ حُرمتیں پامال ہوں جو ایک مسلمان کو ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہونی چاہئیں۔"

ڈاکٹر اسرار احمد اپنے کتابچہ "شہیدِ مظلوم" میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عثمانؓ اپنے وقت کی عظیم ترین سلطنت کے فرمانروا تھے۔ ان کی حدودِ مملکت ذوالقرنین جیسے عظیم شہنشاہ سے بھی سرچند تھیں۔ وہ اگر ذرا اشارہ کر دیتے تو اتنی فوجیں جمع ہو سکتی تھیں کہ جن کا شمار ممکن نہیں۔ مصر، شمالی افریقہ، شام و فلسطین، یمن، نجد، حجاز، عراق اور ایران کے جاں نثار گورنر، سب ان کے ایک حکم پر لشکرِ جرار کے ساتھ حاضر ہو سکتے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ انتہائی اصرار کرتے رہے کہ ہم کو اجازت دیجیے، ہم ان بلوائیوں، شورش پسندوں، فتنہ گروں اور باغیوں سے نمٹ لیں۔ لیکن عثمانؓ کی زبان پر ایک حکم تھا۔ "نہیں" اگر اس پیکرِ صبر و رضا کی زبان سے ایک لفظ بھی اجازت کا نکل جاتا تو میں سمجھ

کہتا ہوں کہ بلوائیوں اور باغیوں کی تکہ بوٹی ہو جاتی اور ان کا نام و نشان ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا ــــ لیکن عثمان رضی اللہ عنہ اس آزمائش میں صبر و ثبات اور حلم و تحمل اور قوتِ برداشت کے کوہِ ہمالیہ کی طرح جمے اور کھڑے نظر آتے تھے ــــ انھیں اپنی جان دینا قبول ــــ اپنی بے حرمتی منظور ــــ لیکن یہ بات کسی حال منظور نہیں کہ ان کی وجہ سے کسی بھی کلمہ گو کے خون کی ایک بوند گرے۔"

قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ کا عبرت ناک انجام

ابو قلابہ سے مروی ہے کہ "میں نے شام کے بازار میں ایک آدمی کی آواز سنی جو "آگ آگ" چیخ رہا تھا۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر ٹخنوں سے کٹے ہوئے ہیں اور دونوں آنکھوں سے اندھا منہ کے بل پڑا گھسٹ رہا ہے اور "آگ آگ" چیخ رہا ہے۔ میں نے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ "میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر گھسے تھے۔ جب میں ان کے قریب گیا تو ان کی اہلیہ چیخنے لگیں۔ میں نے ان کے طمانچہ مارا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: "تجھے کیا ہو گیا ہے؟ عورت پر ناحق ہاتھ اٹھاتا ہے۔ خدا تیرے ہاتھ پاؤں کاٹے، تیری دونوں آنکھوں کو اندھا کر دے اور تجھے آگ میں ڈالے۔" مجھے بہت خوف معلوم ہوا اور میں نکل بھاگا۔ اب میری یہ حالت ہے جو تم دیکھ رہے ہو، صرف آگ کی بددعا باقی رہ گئی ہے۔"

نافع سے مروی ہے کہ "ایک بلوائی نے شہادت کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عصا لے کر اپنے گھٹنے سے توڑ ڈالا تھا ــــ اس کی پوری ٹانگ گل گئی۔"

یزید بن حبیب سے مروی ہے کہ "جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر چڑھائی کر کے گئے تھے، ان میں سے اکثر پاگل ہو کر مرے ــــ"

واقفِ اسرارِ نبوی یعنی حضرت حذیفہ بن یمان کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ "جب بلوائی حضرت عثمان کے گھر کی طرف چلے تو لوگ ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" انھوں نے کہا: "بخدا! یہ لوگ ان کو شہید کر دیں گے۔" لوگوں نے پوچھا: "شہید ہونے کے بعد کیا ہوگا؟" انھوں نے کہا: "بخدا! عثمان رضی اللہ عنہ جنت میں جائیں گے اور ان کے قاتلین کے لیے خدا کی قسم دوزخ ہے۔ جس سے کسی طور ان کو چھٹکارا نہیں ملے گا۔"

(شہیدِ مظلوم رضی اللہ عنہ)

سیرت و کردار، دینی خدمات و فضائل

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان ؛ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
(اقبالؔ)

سوال: حضرت عثمان غنیؓ کی سیرت و کردار، دینی خدمات اور فضائل پر روشنی ڈالیئے۔

جواب: **حضرت عثمان غنیؓ سیرت و کردار کے آئینہ میں** حضرت عثمان غنیؓ اپنے کردار و سیرت کے اعتبار سے ایک مثالی شخصیت کے حامل تھے۔ قدرت کے اعتبار سے انہیں بہت سے اعلیٰ اخلاق اور اوصافِ حمیدہ ودلیعت ہوئے تھے، جن کی بدولت آپ اپنوں اور غیروں میں منفرد اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی صحبت اور تعلیم و تربیت نے ان اوصاف کو اور بھی جلا بخشی۔ آپؓ کی جو خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں وہ نرم خوئی اور شفقت، جود و سخا اور بخشش، عفو و درگزر، صبر و تحمّل، شرم و حیا، مستقل مزاجی، حلم و بردباری، ایمان کا کمال اور حُبّ و اطاعتِ خداؐ و رسولؐ ہیں۔ آپؓ نہایت دولت مند مگر نہایت منکسر المزاج تھے اور فیاضی و سخاوت کا ایک بہتا ہوا دریا تھے، جس سے اپنے اور پرائے سب سیراب ہوتے تھے۔ آپ مسلمانوں کے سچے غم خوار اور ہمدرد تھے۔ صلۂ رحمی آپؓ کی ایک خاص صفت تھی۔ جو خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد یکساں جاری رہی۔

ذیل میں آپؓ کی سیرت و کردار کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:۔

۱۔ **حُلیہ مُبارک** آپؓ کا رنگ گندمی، قد درمیانہ، ناک بلند اور رخسار پُرگوشت تھے۔ داڑھی لمبی اور گھنی تھی، بالوں میں خضاب لگاتے تھے، دانت پیوستہ اور چمک دار تھے۔ مجموعی لحاظ سے شخصیت بارُعب اور خوبصورت تھی۔

۲۔ **شرم و حیاء** آپؓ کا نمایاں ترین وصف شرم و حیا تھا چنانچہ آپؓ کی حیاداری ضرب المثل تھی حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی حیا کی پاسداری فرماتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ چند صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے اور زانوئے مبارک سے کپڑا اٹھا ہوا تھا، اُسی حالت میں حضرت عثمانؓ کی آمد کی خبر ملی تو آپؐ نے کپڑا برابر کیا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ صحابہؓ نے اس اہتمام کا سبب پوچھا تو فرمایا:۔

"عثمانؓ کی حیا سے فرشتے بھی شرماتے ہیں۔" (بخاری)

۳۔ فیاضی

آپؓ طبعاً فیاض و کریم تھے۔ سیکڑوں بیواؤں، یتیموں اور اپنے غریب اعزہ و اقربا کی پرورش کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے تھے۔ آپؓ جود و سخا کا ایک بہتا ہوا دریا تھے۔ عہدِ رسالتؐ میں بھی آپؓ کی دولت اسلام اور مسلمانوں کے لیے وقف تھی اور عہدِ خلافت میں بھی یہ سلسلہ جاری و ساری رہا۔ عہدِ فاروقیؓ میں مدینہ منورہ میں شدید قحط پڑا۔ انہی دنوں اونٹوں کا ایک قافلہ حضرت عثمانؓ کا غلّہ لے کر آیا۔ حضرت عمرؓ نے تمام غلّہ مناسب قیمت پر غرباء کے لیے خریدنا چاہا، لیکن حضرت عثمانؓ نے انکار کر دیا اور عام اعلان کر دیا کہ جسے غلّہ کی ضرورت ہو آ کر مفت لے جائے۔ بعد میں حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا کہ "میں نے غلّہ اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ قیمت پر بیچا ہے۔" دو لاکھ اشرفی مالیت کی مستقل جائداد راہِ خدا میں وقف کی تھی۔

۴۔ ایثار

حضرت عثمانؓ جذبۂ ایثار سے سرشار تھے۔ آپؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں ذاتی اخراجات کے لیے بیت المال سے کوئی تنخواہ نہ لیتے تھے، بلکہ اپنا مقررہ وظیفہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے چھوڑ دیا۔ حضرت عمرؓ پانچ ہزار درہم سالانہ لیتے تھے۔ اس حساب سے حضرت عثمانؓ نے ساٹھ ہزار درہم (۱۲ سال) کی خطیر رقم بیت المال میں رہنے دی اور یہ آپؓ کے جذبۂ ایثار کی زرّیں مثال ہے۔

۵۔ صبر و تحمل

آپؓ کا ایک منفرد وصف صبر و تحمل اور عفو و درگذر ہے۔ آپؓ حلم و عفو کا پیکر تھے۔ آپؓ میں اس وصف کا اتنا غلبہ تھا کہ لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ اموی عمّال کی بدعنوانیاں آپؓ کے اسی وصف کا نتیجہ تھیں۔ کسی حالت میں صبر و حلم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ آپؓ کیخلاف کتنا طوفان برپا ہوا، مخالفین نے رُو در رُو گستاخیاں کیں، لیکن اس پیکرِ حلم نے سوائے صبر و تحمل کے کوئی جواب نہ دیا۔ اگر آپؓ چاہتے تو باغیوں کے خون کی ندیاں بہہ جاتیں، لیکن آپؓ نے جان دے دی مگر صبر و حلم کے جادۂ مستقیم سے نہ ہٹے۔

۶۔ تواضع

آپؓ کی طبیعت میں بہت تواضع وانکساری تھی۔ آپؓ کے پاس لونڈی غلاموں کی کمی نہ تھی، لیکن اپنے کاموں کے لیے ان کی راحت میں خلل نہ ڈالتے تھے۔ شب کو تہجد کے وقت کسی غلام کو نہ جگاتے، بلکہ خود ہی پانی لے کر وضو کر لیتے، عرض کیا گیا، آپؓ کیوں زحمت فرماتے ہیں؟ کسی غلام کو جگا لیا کیجیے۔ فرمایا:- "رات کا وقت ان کے آرام کے لیے ہے۔ انسان کو اپنا کام حتی الوسع خود کرنا چاہیے۔"

۷۔ خشیتِ الٰہی اور رقتِ قلب آپؓ نہایت رقیق القلب تھے۔ آپؓ کا دل ہمیشہ خوفِ الٰہی سے معمور رہتا تھا۔ جب کسی قبر کے پاس سے گذرتے تو اتنی رقت طاری ہوتی کہ روتے روتے داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ آخرت کے مواخذہ کا اتنا خوف غالب تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر مجھ کو یہ علم ہو کہ مجھے جنت ملے گی یا دوزخ تو میں اس کا فیصلہ ہونے کے مقابلہ میں خاک ہو جانا پسند کروں گا۔" اس خوف کا اثر آپؓ کے ہر عمل میں نمایاں تھا۔ رات کا اکثر حصہ ریاضت و عبادت میں گذارتے اور اکثر روزہ رکھتے تھے۔

۸۔ حُبِّ رسولؐ حضرت عثمانؓ کو ذاتِ رسالتؐ کے ساتھ والہانہ شیفتگی تھی۔ آپؐ کی رضا جوئیؐ کے لیے کل کائنات نثار کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ آنحضرتؐ کی ادنیٰ تکلیف کو دیکھ کر تڑپ جاتے تھے۔ ایک دفعہ اہلِ بیتِ نبویؐ پر کئی دن فقر و فاقہ سے گذر گئے، حضرت عثمانؓ کو معلوم ہوا تو وہ بے چین ہو کر رونے لگے اور اسی وقت کئی بورے گندم، آٹا، کھجور، بکری کا گوشت اور تین سو نقد لے جا کر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ جب اس قسم کی ضرورت پیش آئے تو عثمانؓ کو یاد فرمایا جائے۔ ذاتِ نبویؐ کا اتنا احترام تھا کہ جس ہاتھ سے حضورؐ کے دستِ مبارک پہ بیعت کی تھی، اسے تا عمر محلِ نجاست سے مس نہیں کیا۔ اس محبت و احترام کا یہ فطری نتیجہ تھا کہ آپؓ کی زندگی سرتا پا اتباعِ سنت میں ڈوبی ہوئی تھی اور حضورؐ کا فرمان ہر دم ہر لحظہ پیشِ نظر رہتا تھا۔ اسی حُبِّ رسولؐ کا نتیجہ تھا کہ حضورِ اکرمؐ کو بھی حضرت عثمانؓ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ حضورؐ نے یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیاں ان کے نکاح میں دیں بلکہ فرمایا کہ "اگر میری سو بیٹیاں ہوتیں اور وہ مرتی جاتیں تو میں برابر یکے بعد دیگرے عثمانؓ کے ساتھ بیاہتا جاتا۔"

۹۔ علم و فضل حضرت عثمانؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے خصوصی ہم نشینی کا شرف حاصل تھا۔ اس لیے شیخین کی طرح آپؓ کی ذات بھی علم و عمل کا نمونہ تھی۔ آپؓ کو ابتدا سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق و ذوق تھا۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت سے آپؓ نوشت و خواند سے واقف تھے۔ چنانچہ آپؓ کاتبِ وحی بھی تھے۔ تقریر و خطابت کی بجائے آپؓ کی تحریر دلکش ہوتی تھی۔ مذہبی علوم میں آپؓ کا پایہ بلند تھا۔ کلام اللہ کے ساتھ خاص شغف تھا۔ اس کی تعلیم آپؓ نے خاص زبانِ نبوتؐ سے حاصل کی تھی۔ آپؓ نے خود بھی کلام اللہ کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا۔ احادیثِ نبویؐ کے بھی ممتاز حافظ تھے۔ لیکن روایت

بہت کم کرتے تھے۔ یہ احتیاط کا تقاضا تھا۔ فقہ میں اگرچہ آپؓ کا پایہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے برابر نہ تھا، لیکن آپؓ بھی مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے اور دوسرے صحابہؓ آپؓ کے اجتہاد سے استفادہ کرتے تھے۔ آپؓ وسائل وراثت میں خاص مہارت رکھتے تھے۔

۱۰۔ ذریعۂ معاش، تجارت

حضرت عثمانؓ قریش بلکہ عرب کے دولتمند ترین لوگوں میں تھے۔ لاکھوں روپے کا آپؓ کا تجارتی کاروبار تھا۔ اپنی غیر معمولی ثروت کی وجہ سے غنی کہلاتے تھے۔ نقدی دولت کے علاوہ متعدد علاقے بھی تھے۔ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جاگیر عطا فرمائی تھی۔ اس کے علاوہ آپؓ نے بعض زمینیں بھی خریدی تھیں۔ آپؓ کی دولت و ثروت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ زندگی میں لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی شہادت کے وقت علاوہ جائداد کے ۳۵ لاکھ درہم اور ڈیڑھ لاکھ دینار نقد چھوڑے۔

۱۱۔ غذا و لباس

آپؓ شروع سے لے کر آخر تک دولت و ثروت کے گہوارہ میں رہے۔ زندگی کے کسی دور میں عسرت و تنگ دستی سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ اس لیے سخت اور پر مشقت زندگی کے عادی نہ تھے، آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، خوش خوراک و خوش لباس تھے۔ دستر خوان وسیع تھا، لیکن اس میں زیادہ تکلف نہ تھا۔ اچھے لباس کے ساتھ معمولی کپڑے بھی پہنتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ چار پانچ درہم کے تہمد میں مسجد آتے تھے۔

دینی خدمات

حضرت عثمانؓ نے کثیر دینی خدمات انجام دیں بقول ابن خلدون "آپؓ نے علامات ہم کی تجدید کی، اُمت محمدیہ کو ایک مصحف پر متفق اور جمع کیا۔ مسجد نبویؐ کو پختہ بنوایا، اس کی دوبارہ تعمیر اپنی نگرانی میں کی، دس ماہ کی مسلسل محنت کے بعد اینٹ، چونے اور پتھر کی ایک نہایت خوشنما اور مستحکم مسجد تیار ہو گئی، جس کے طول میں پچاس گز کا اضافہ کیا گیا۔ مدینہ منورہ میں بیر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے پانی کا بندوبست کیا۔ غزوات میں شرکت کے علاوہ بڑھ بڑھ کر مالی ایثار کا مظاہرہ کیا اور عہد خلافت میں رفاہِ عامہ کے مختلف کام کیے اور اصلاحات جاری کیں۔

مصحفِ صدیقی کی اشاعت

دینی خدمات کے سلسلہ میں آپؓ کا سب سے اہم کارنامہ مسلمانوں کو ایک قرأت اور ایک مصحف پر متحد کرنا ہے۔ کتابی صورت میں کلام اللہ کی تدوین حضرت ابو بکرؓ ہی کے زمانہ میں

ہو چکی تھی، لیکن اس کی باقاعدہ اشاعت نہ ہوئی تھی۔ قرآن مجید کے بعض الفاظ کا املاء اور ان کا تلفظ مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے مثلاً ملك الناس کو دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ مالكَ الناس اور ملكِ الناس۔ پہلے کا مطلب ہے لوگوں کا مالک اور دوسرے کے معنی ہیں لوگوں کا بادشاہ ــــــ چنانچہ مختلف صحابہؓ املاء اور تلفظ مختلف طریقوں سے کرتے تھے۔ لیکن اس سے معنی پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ اس لیے صحابہؓ میں اس خفیف اختلاف کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ لیکن نومسلم عجمیوں میں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ اس کی بڑی اہمیت ہو گئی۔ ہر مقام کے لوگ اپنی قرأت کو صحیح اور دوسرے کی قرأت کو غلط سمجھنے لگے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ جو ان دنوں آرمینیہ کی فتح میں اہلِ شام کے ساتھ آذربائیجان کی فتح میں اہلِ عراق کے ساتھ جہاد میں شریک رہے تھے، وہاں ان دونوں علاقوں (شام اور عراق) کے مسلمانوں میں قرأتِ قرآن میں اختلاف دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ پس جب وہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے تو کہا:۔

"اے امیر المومنین! اس اُمت کی خبر لیجیے۔ قبل اس کے کہ وہ کتاب اللہ میں اسی طرح اختلاف کرنے لگیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے اختلاف کیا۔"

چنانچہ حضرت حذیفہؓ کے مشورہ سے حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس حضرت ابوبکرؓ والے جمع کردہ مصحف بھیج دیں تاکہ ہم اس کی مزید نقلیں کر لیں۔ حضرت حفصہؓ نے مصحفِ صدیقی کو حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعد بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارثؓ کو مصحف نقل کرنے کا حکم دیا۔ نیز حضرت عثمانؓ نے (حضرت زید بن حارثؓ کے سوا بقیہ) تینوں قریشی اصحاب سے کہا تھا کہ جب تم لوگ اور زید بن ثابتؓ قرآن کے کسی امر میں اختلاف کرو تو اس کو لغتِ قریش پر لکھنا کیونکہ وہ انہی کی زبان میں نازل ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ جب اصل مسودات مصاحف میں نقل کر لیے گئے تو حضرت عثمانؓ نے اصل مصحف کو حضرت حفصہؓ کے پاس واپس بھیج دیا اور جو مصاحف نقل کرائے تھے، ان میں سے ایک ایک نسخہ اطرافِ مملکت کے ہر علاقے میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جس صحیفہ اور مصحف میں قرآن لکھا ہوا ہو اُسے جلا دیا جائے یا حکومت کے حوالے کر دیے جائیں تاکہ ان کو ضائع کر دیا جائے بلاشبہ حضرت عثمانؓ کی یہ سب سے بڑی دینی خدمت ہے اور ملتِ اسلامیہ پر احسانِ عظیم ہے کہ آپؓ نے قرآن میں وحدت کا رنگ پیدا کر کے مسلمانوں کو ایک مصحف پر متفق و متحد کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کے بعد تدوینِ قرآن کی نوبت نہیں آئی اور اسی تدوین شدہ قرآن کی اشاعتِ عام ہو گئی، جس میں آج تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ گویا یوں صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں اس وعدہ ربانی کی تکمیل ہو گئی کہ

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (الحجر ۹)

ترجمہ:۔ بے شک (یہ کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

فضائل عثمانؓ ـــــ حدیث کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں حضرت عثمان غنیؓ کے بکثرت فضائل بیان کیے گئے ہیں، ذیل میں کچھ احادیث پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ کیا میں اس شخص (عثمانؓ) سے حیا نہ کروں، جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں۔ (مسلم)

۲۔ ہر نبی کا ایک رفیق ہوتا ہے اور میرا رفیق (جنت میں) عثمانؓ ہے۔ (ترمذی)

۳۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت عثمانؓ ایک ہزار دینار اپنے کرتے کی آستین میں بھر کر لائے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ڈال دیا۔ حضورؐ ان دیناروں کو آپس میں الٹ پلٹ کر دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ آج کے بعد عثمانؓ کو اس کا کوئی عمل ضرر نہ پہنچائے گا۔ (احمد)

۴۔ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ہمراہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ کوہِ احد پر چڑھے، اُحد حرکت کرنے لگا۔ آپؐ نے اُحد پر ایک ٹھوکر لگائی اور فرمایا: "احد! ٹھہر جا، تیرے اوپر ایک نبیؐ، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔ (بخاری)

۵۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریب کے فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ شخص (عثمانؓ) ان فتنوں میں راہِ راست پر ہوگا۔" (ترمذی۔ ابن ماجہ)

۶۔ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ کہا کرتے تھے کہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو (یعنی جب ان حضرات کا ہم لوگ ذکر کیا کرتے تھے تو اس ترتیب سے ذکر کیا کرتے تھے۔ (ترمذی)

۷۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آج رات ایک مردِ صالح (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کو خواب میں یہ دکھایا گیا کہ گویا ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے اور عمرؓ کو ابوبکرؓ کے ساتھ پیوستہ کر دیا ہے اور عثمانؓ کو عمرؓ سے لاحق کر دیا گیا ہے (مراد ولایت وخلافت، ابوداؤد)

۸۔ حضرت عثمانؓ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ (بخاری ومسلم)

۹۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوا کہ:۔

"میں نے اللہ تعالیٰ سے عثمانؓ کا حساب معاف کرا لیا ہے، چنانچہ وہ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے۔"

چوتھے خلیفہ راشد

امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

۳۵ھ تا ۴۰ھ بمطابق ۶۵۶ء تا ۶۶۱ء

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔" (الحدیث)

"جو مجھے دوست رکھتا ہے، وہ علیؓ کو بھی دوست رکھتا ہے۔" (الحدیث)

؎ تڑپنے، پھڑکنے کی توفیق دے ... دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے (اقبال)

ابتدائی حالات و انتخابِ خلافت

سوال:۔ حضرت علی مرتضیٰ کے ابتدائی حالات اور انتخابِ خلافت پر روشنی ڈالیے۔

جواب: **حضرت علی مرتضیٰ کے ابتدائی حالات**

۱۔ **خاندان** آپؓ کا نام علی، کنیت ابوالحسن اور ابوتراب اور لقب حیدر (شیر) ہے۔ آپؓ مکی ہیں، قریشی ہیں، ہاشمی ہیں۔ والد کا نام ابوطالب تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا تھے۔ آپ کے خاندان بنی ہاشم کو خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے سارے عرب میں مذہبی سیادت حاصل تھی۔ حضورؐ کے کئی چچا تھے لیکن آپؐ کو جو تعلقِ خاطر حضرت علیؓ کے والد ابوطالب کے ساتھ تھا، وہ کسی کے ساتھ نہ تھا۔ ابوطالب سردارِ مکہ تھے۔ جب عبدالمطلب فوت ہوئے تو ابوطالب ہی حضورؐ کی پرورش کے کفیل رہے اور اعلانِ نبوت کے بعد تمام تر مشکلات کے باوجود حضورؐ کی مکمل حمایت اور پشت پناہی کی۔ آپؓ رشتے میں حضورؐ کے چچازاد بھائی ہوتے تھے اور داماد بھی۔ آپؓ کی والدہ کا نام فاطمہؓ تھا جو ہاشم الاصل تھیں اور حضرت عبدالمطلب کے بھائی اسد کی صلبزادی

تھیں۔ رسول اللہؐ ان سے اپنی حقیقی ماں کی طرح محبت کرتے تھے۔ حضرت علیؓ بعثتِ نبویؐ سے دس برس قبل ۱۷ رمضان المبارک مکے میں پیدا ہوئے۔ آپؓ کی پیدائش بعض روایات کے مطابق خانہ کعبہ میں ہوئی۔ ابوطالب عیال دار شخص تھے اور ان کی مالی حالت کمزور تھی۔ رسولِ خداؐ نے حضرت علیؓ کو تین سال کی عمر میں اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ان کی پرورش کے خود کفیل ہو گئے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے انھیں اپنی اولاد کی طرح پالا۔ گویا حضرت علیؓ بچپن ہی سے رسولِ خداؐ سے متعلق ہو گئے۔ آپؓ نے آغوشِ نبوت میں پرورش پائی اور جاہلیت کی تمام برائیوں سے آپؓ کا دامن پاک رہا، حتیٰ کہ آپؓ نے بچپن میں بھی بُت پرستی نہیں کی۔

قبولِ اسلام

چونکہ حضرت علیؓ نے ابتدا ہی سے آغوشِ نبوت میں پرورش پائی تھی، اسی کا یہ اثر تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اوّل اوّل اسلام کی دعوت دی تو نوعمر افراد میں سب سے پہلے آپ نے ہی لبیک کہا۔ اور ہر موقع پر حضورؐ کا ساتھ دیا۔ قبولِ اسلام کے بعد حضرت علیؓ وعظ و پند کے جلسوں اور تبلیغِ اسلام کے مجمعوں میں ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ بعثت کے ساتھ چوتھے سال جب حضورؐ کو اپنے قریبی اعزہ کو عذابِ الٰہی سے ڈرانے کا حکم نازل ہوا تو حضورؐ نے اپنے رشتہ داروں کو جو کم و بیش چالیس تھے، ضیافت پر مدعو کیا۔ ان میں حضورؐ کے سگے چچا جناب حمزہ، جناب ابوطالب، جناب عباس اور ابولہب بھی شامل تھے۔ ضیافت کے بعد حضورؐ نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور فرمایا:۔

"اے بنی عبدالمطلب! میں تمھارے سامنے دنیا اور آخرت کی بہترین نعمت پیش کرتا ہوں تم میں سے کون میرا ساتھ دیتا ہے اور کون میرا معاون و مددگار بنتا ہے؟"

تو اس کے جواب میں صرف ایک آواز آئی کہ "گو میں عمر میں چھوٹا ہوں اور میری ٹانگیں کمزور ہیں، تاہم میں آپؐ کا معاون و مددگار اور قوتِ بازو بنوں گا" یہ آواز حضرت علیؓ کی تھی۔ حضورؐ نے تین مرتبہ اس سوال کو دہرایا۔ اس کے جواب میں ہر مرتبہ حضرت علیؓ ہی کی آواز آئی۔ اس وقت حاضرینِ مجلس نے اگرچہ اس دعوے کو کوئی وقعت نہ دی، لیکن زمانہ شاہد ہے کہ حضرت علیؓ نے کس طرح اپنے دعوے کو سچ کر دکھایا۔

ہجرت میں جاں نثاری

حضرت علیؓ نے تمام عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین خدمت کی اور دین کی تبلیغ فرمائی۔

کفارِ مکہ حضورؐ کو صادق و امین کہتے تھے اور سخت دشمنی کے باوجود اپنی امانتیں حضورؐ کے سپرد کرتے تھے۔ حضورؐ نے ہجرت کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رفاقت میں روانہ ہونے سے

پیشتر کفار کی امانتیں حضرت علیؓ کے حوالے کیں اور فرمایا کہ یہ امانتیں جن کی ہیں ان کو دے دیں اور خود میرے بستر پر سو جائیں۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اس رات حضورؐ کے بستر پر سونا موت کو دعوت دینا تھا، کیونکہ کفار کی ننگی تلواریں باہر منتظر تھیں، لیکن "شیرِ خدا" بے خطر بسترِ رسولؐ پر سو گئے۔ صبح ہوئی تو کفار کو صورتحال کا پتہ چلا، آپ کو زدوکوب کیا۔ ارشادِ نبویؐ کی تعمیل میں آپؓ تین دن تک مکہ میں ٹھہرے۔ امانتیں لوگوں کو پہنچائیں اور پا پیادہ مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ لاریب یہ بہادری اور فداکاری کا عظیم کارنامہ ہے۔ مدینہ منورہ میں مہاجرین کی انصار سے مؤاخات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنا بھائی قرار دیتے ہوئے فرمایا:-

"تم دُنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہو۔" (ترمذی)

حضرت فاطمہؓ سے شادی

ہجرت مدینہ کے دوسرے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے اپنی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے نکاح کر دیا۔ یہ نکاح سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھے حکم دیا کہ اپنی ذرہ بیچ دو اور جو قیمت ملے وہ میرے پاس لاؤ۔ حضرت علیؓ ذرہ لے کر چلے۔ حضرت عثمانؓ نے چار سو درہم میں ذرہ خرید کر اپنے قبضہ میں کر لی اور پھر فرمایا کہ اب یہ دام تمھارے اور ذرہ میری ملکیت ہے اور پھر ذرہ حضرت علیؓ کو دیتے ہوئے کہا اب یہ ذرہ میری طرف سے تمھارے لیے ہدیہ ہے۔ حضرت علیؓ نے دام اور ذرہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کر کے واقعہ سنایا تو حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں دعا فرمائی۔ اسی رقم سے شادی اور ولیمہ کا انتظام کیا گیا۔ آنحضورؐ نے نکاح پڑھایا اور میاں بیوی کے لیے خیر و برکت کی دعا کی۔ کل جہیز ایک بان کی چارپائی، ایک مشکیزہ، مٹی کے دو گھڑے، ایک گدے اور دو چکیوں پر مشتمل تھا۔ حضرات حسن و حسین رضوان اللہ علیہم آپؓ کے صاحبزادے تھے۔ جن سے حضورؐ بیحد محبت فرماتے تھے۔ حضورؐ اکثر حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور دونوں میاں بیوی کی بہجوئی فرماتے اور ان کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔

غزوات میں شرکت اور کارنامے

حضرت علیؓ نے تمام غزوات میں کمال جانبازی سے حصّہ لیا اور متعدد سرایا آپؓ کی ماتحتی میں بھیجے گئے، جنھیں آپؓ نے کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا۔ غزوہ بدر میں علمِ اسلام آپؓ کے ہاتھ میں تھا۔ اس جنگ میں آپؓ نے سالارِ قریش عُتبہ کے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کو جہنم رسید کیا۔ غزوۂ اُحد میں بھی آپؓ برابر شریک تھے۔ غزوۂ خندق میں عرب کے نامی گرامی پہلوان عمرو بن عبدود کو تلوار کے ایک ہی وار سے دو ٹکڑے کر دیا۔ غزوۂ حنین میں

بھی آپؓ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آپؓ فاتح خیبر ہیں۔ اس غزوہ میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "میں کل اسلام کا پرچم اس شخص کو دوں گا جو خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔ اور خدا اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ اس کے ہاتھوں فتح عنایت فرمائے گا"۔ اس وقت حضرت علیؓ کو آشوب چشم کی تکلیف تھی جو حضورؐ کے لعابِ دہن لگانے سے رفع ہو گئی۔ حضورؐ نے پرچم حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا، جن کے ہاتھوں پر خیبر فتح ہوا اور وہاں کا سردار مرحب آپؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔

آپ قلعہ خیبر کے نہایت بھاری اور وزنی دروازے کو بطور ڈھال استعمال کرتے رہے یہ خدائی طاقت تھی۔ فتح خیبر کے صلہ میں آپؓ کو "شیرِ خدا" کا لقب ملا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپؓ کو نیابت رسول کا شرف حاصل ہوا اور حضورؐ نے فرمایا تھا:۔

"جس طرح حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ کو اپنا نائب بنا کر گئے تھے، ایسے ہی میں تمھیں اپنا نائب بنا کر غزوۂ تبوک پر جا رہا ہوں۔ (لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں)"۔

وصالِ نبویؐ کا غم

وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر دیگر صحابہ کی طرح حضرت علیؓ بھی شدید غم اور صدمے سے دوچار ہوئے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری خدمت یعنی حضورؐ کے غسل اور تجہیز و تکفین وغیرہ کی سعادت بھی آپؓ ہی کے حصہ میں آئی۔ حضرت علیؓ نے یہ فریضہ حضرت عباسؓ، حضرت اسامہؓ بن زیدؓ، حضرت فضل بن عباسؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے ساتھ مل کر انجام دیا۔ حضرت علیؓ حضورؐ کو غسل دیتے وقت یہ فرماتے جاتے تھے:۔

"میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان۔ آپؐ کی موت سے وہ چیز جاتی رہی جو کسی دوسرے کی موت سے نہ گئی، یعنی نبوّت، غیب کی خبریں اور آسمانی وحی ختم ہو گئی۔ آپؐ کی وفات ایسا صدمہ ہے کہ اب سب مصیبتیں ہیچ نظر آتی ہیں اور ایسا ہمہ گیر حادثہ ہے کہ لوگ اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اس غم کا علاج نہیں اور مصیبت جانے والی نہیں۔ پروردگار کے حضور ہمارا ذکر فرمائیں۔ اپنے دل سے بھول نہ جائیں"۔

خلفاءِ ثلاثہ کے عہد میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضورؐ کے ساتھ گوناگوں تعلقات اور خصوصیات کی بناء پر حضرت علیؓ قدرتاً خلافتِ نبویؐ کے متوقع تھے، اس لیے جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب عمل میں آیا تو آپؓ نے بیعت میں کچھ توقف فرمایا، لیکن بعد میں باقاعدہ بیعت کر لی اور خلیفہ اوّل کے مخلص دوست اور مشیر مددگار اور معتمد علیہ رہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ

سے آپؓ کو جو عقیدت تھی، اس کی بناء پر ان کی وفات کے بعد آپؓ نے ان کی بیوہ حضرت اسماءؓ سے نکاح کیا۔ منکرینِ زکوٰۃ کے ضمن میں صدیق اکبرؓ نے آپؓ کی رائے سے اقدام کیا تھا۔ اسی طرح آپؓ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے بھی مشیر و مددگار رہے۔ حضرت عمرؓ نے اسلامی کیلنڈر کا اجراء سن ہجری سے آپؓ کے مشورے سے کیا۔ ایک موقع پر آپؓ ہی کے مشورہ کے مطابق فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر آج علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔"

حضرت عمرؓ سے آپؓ کی باہمی محبت اور قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بیٹی حضرت اُمِ کلثومؓ کا عقد حضرت عمرؓ سے کیا تھا اور آپؓ کی شہادت پر یہ آرزو کی کہ "کاش! میں بھی ان ہی جیسے اعمال لے کر خدا کے حضور میں جاؤں۔"

حضرت عثمان غنیؓ سے بھی آپؓ کی محبت اور رفاقت کا یہی عالم تھا اور ہر معاملہ میں آپؓ ان کے مشیر و مددگار رہے۔ باہمی محبت و یگانگت کا یہ عالم تھا کہ حضرت علیؓ نے اپنے بیٹوں میں ایک کا نام ابوبکرؓ، ایک کا عمرؓ اور ایک کا عثمانؓ رکھا تھا۔ یہ باہمی شفقت اور قدر دانی کا زندہ ثبوت ہے۔ جب حضرت عثمانؓ کے خلاف باغیوں کی فتنہ انگیزیاں حد سے بڑھ گئیں تو حضرت علیؓ کا جب تک بس چلا، برابر باغیوں کو سمجھاتے رہے، آخر وہ بھی مجبور ہو گئے اور جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرت علیؓ نے اپنے فرزندوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو آپؓ کی حفاظت کے لیے بھیجا۔

بیعت خلافت

حضرت عثمانؓ کی اندوہناک شہادت کے بعد تین دن تک مسندِ خلافت خالی رہی۔ مدینہ منورہ میں شور قیامت برپا تھا، ہر طرف باغی چھائے ہوئے تھے، لیکن خلافت کا انتظام بہرحال ضروری تھا۔ اس وقت اکابر صحابہؓ میں ایک حضرت علیؓ ہی کی ذات ایسی تھی، جس پر سب کا اتفاق ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مہاجرینؓ و انصار جن میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے۔ آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خلیفہ کا انتخاب ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے یہ اشارہ سمجھ کر جواب دیا کہ مجھ کو اس کی حاجت نہیں، جسے تم منتخب کرو گے، میں بھی اسے قبول کر لوں گا۔" ان لوگوں نے عرض کیا آپؓ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا اس منصب کا حق دار مستحق نہیں ہے۔ اس لیے آپؓ کے علاوہ ہم کسی دوسرے کو منتخب ہی نہیں کر سکتے۔ حضرت علیؓ نے پھر عذر کیا کہ امیر ہونے کے مقابلہ میں مجھے وزیر ہونا زیادہ پسند ہے۔" آخر میں لوگوں نے پھر عرض کیا کہ "ہم لوگ آپؓ ہی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔" غرض مسلمانوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اور ملت اسلامیہ کے مفاد

کی خاطر آپؓ نے قبول فرمایا اور مجمع عام میں مسلمانوں نے آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت میں مدینہ منورہ کے تمام ممتاز صحابہ شریک تھے۔ صحابہؓ میں سے ۱۷ یا ۲۰ ایسے بزرگ تھے جنھوں نے بیعت نہیں کی۔ بیعت کے بعد ذی الحجہ ۳۵ھ میں آپؓ نے مسندِ خلافت پر قدم رکھا۔

خطبۂ خلافت بیعتِ خلافت کے بعد آپؓ نے خطبہ دیا، جس میں حالات کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ آپؓ نے فرمایا:-

"اللہ بزرگ و برتر نے ہماری رہنمائی کے لیے ایک کتاب نازل کی ہے، جس میں خیر و شر کی تفصیل ہے۔ تم پر اللہ تعالیٰ نے جو فرائض عائد کیے ہیں، وہ ادا کرو، تمھیں جنت ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے حرم پاک کو محترم ٹھہرایا ہے۔ مسلمانوں کی جان ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔ اہلِ اسلام کو خلوص اور اتحاد کی تلقین کی ہے۔ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ سوائے اس کے کہ کسی پر کوئی شرعی حد واجب ہو۔ مسلمانوں کو دکھ دینا جائز نہیں۔ ماسوا کہ اس کو از روئے قانون کوئی سزا دی جائے خدا تعالیٰ کے بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ سے ڈرو۔ قیامت کے روز زمینوں اور مویشیوں کے متعلق تم سے باز پرس کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ اور اس کی نافرمانی سے بچو۔ خیر کو قبول کرو اور شر سے اجتناب کرو۔"

انتشارِ اُمت کا آغاز اور حضرت علیؓ کی مشکلات

(جنگِ جمل۔ جنگ صفین۔ خارجی فتنہ)

سوال:۔ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں انتشارِ امت کا آغاز کیسے ہوا؟ آپؓ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟ اور آپؓ نے ان پر کیسے قابو پایا؟ (ہیا)

مندرجہ ذیل پر مفصل نوٹ لکھیے:۔ جنگِ جمل، جنگِ صفین، خارجی فتنہ (جنگ نہروان)۔

جواب:۔ **حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں انتشارِ اُمت کا آغاز** جب حضرت علیؓ منصبِ خلافت پر فائز ہوئے تو اس وقت حالات نہایت نازک تھے، ہر طرف فتنے فساد سر اٹھا رہے تھے۔

طرح طرح کی گروہ بندیاں پیدا ہو گئی تھیں اور سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ مدینہ میں شورش پسندوں اور باغیوں کا زور تھا، عبداللہ بن سبا کی جماعت برابر فتنوں کی آگ بھڑکا رہی تھی اور مسلمانوں کو مسلمانوں کی خونریزی پر اکسا رہی تھی۔ حضرت علیؓ کا پورا دورِ خلافت انہی ہنگاموں کی نذر ہو گیا اور آپؓ کو ایک دن بھی اطمینان اور سکون سے بڑھ کر حکومت کرنے کا موقع نہ مل سکا اور بالآخر انہی فتنوں کی آندھیوں نے آپؓ کی شمعِ حیات کو گل کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ

بیعتِ خلافت کے بعد حضرت علیؓ کے لیے سب سے اہم مرحلہ اور آپؓ کا سب سے مقدم فرض، حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا پتہ چلانا اور ان سے قصاص لینا تھا۔ لیکن چند اسباب کی بناء پر اس میں ناکامی ہوئی۔ حضرت علیؓ کی جانب سے اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی گئی۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ متعین طور پر کسی شخص کے خلاف شہادت موجود نہ تھی۔ حادثۂ شہادت کے وقت گھر میں صرف حضرت عثمانؓ کی بیوی حضرت نائلہؓ تھیں جو کہ ایک پردہ نشین خاتون تھیں۔ گھر میں گھسنے والوں میں وہ صرف محمد بن ابی بکرؓ کو پہچانتی تھیں، لیکن وہ حضرت عثمانؓ کے تنبیہ کرنے سے شرمندہ ہو کر لوٹ گئے تھے اور قتل میں شریک نہ تھے۔ ان کے علاوہ حضرت نائلہؓ اور کسی کو نہ پہچانتی تھیں۔ پھر قاتل جس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، حضرت علیؓ کا اس پر کوئی قابو نہ تھا۔ اس لیے حضرت علیؓ مجبور ہو گئے۔

لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کا دلوں پر اتنا گہرا اثر تھا کہ عوام تو عوام بہت سے اکابر صحابہؓ تک صرف قصاص چاہتے تھے اور حضرت علیؓ کی مجبوریوں پر ان کی نظر نہ جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور چند اور صحابہؓ نے حضرت علیؓ سے جا کر کہا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں جو جماعت شریک ہے، اس سے قصاص لینا ضروری ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ "آپ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں میں اس سے غافل نہیں ہوں۔ لیکن ایسی جماعت کے ساتھ کیا کروں جس پر کوئی میرا کوئی قابو نہیں ہے۔"

بدقسمتی سے قاتل جس جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اس نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی، اس لیے آگے چل کر صحابہؓ کو خود اپنے طور پر اس سے قصاص لینے کا خیال پیدا ہو گیا، جس کے نتیجہ میں جنگِ جمل ہوئی۔

حضرت علیؓ کا موقف یہ تھا کہ بلاشبہ حضرت عثمانؓ کا قصاص لینا ضروری ہے۔ لیکن اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ پہلے نظامِ خلافت مستحکم و مضبوط ہو جائے، پھر قاتلانِ عثمانؓ پر ہاتھ ڈالا جائے۔ جیسا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی "خلافت و ملوکیت" میں لکھتے ہیں:۔

"عملاً یہ قانونی طریقِ کار اس کے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حضرت علیؓ کے ساتھ سب لوگ تعاون کرتے اور ان کو پُرامن حالات میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا۔ جیسا کہ تاریخی واقعات سے ثابت ہے یہ لوگ سازش کرکے مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی۔

خود مدینہ میں بھی ایک تعداد ان کے حامیوں کی موجود تھی اور مصر، بصرہ، اور کوفہ میں بھی ان کی پشت پر ایک ایک جتھا پایا جاتا تھا۔ اگر تمام اہلِ حق حضرت علیؓ کے گرد جمع ہو جاتے اور ان سے تعاون کرتے وہ ان جتھوں کو منتشر کرنے کے بعد ان پر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔

دورِ عثمانیؓ کے گورنروں کی برطرفی

حضرت علیؓ کے لیے یہ ایک دشوار مرحلہ تو تھا ہی کہ آپؓ کی بعض سیاسی فروگذاشتوں کے باعث ایک دوسری نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ عثمانی عہد کے اکثر عمال خصوصاً حضرت امیر معاویہؓ والیٔ شام کے سخت خلاف تھے، اس لیے منصبِ خلافت سنبھالتے ہی آپؓ نے ان سب کو معزول کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ آپؓ کے عاقبت اندیش خیر خواہوں نے اس کی مخالفت کی۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے جو سیاست و تدبر میں امیر معاویہؓ کے ہم پایہ تھے۔ حضرت علیؓ سے کہا کہ ابھی آپؓ معاویہؓ اور دوسرے عثمانی عمال کو ان کے عہدوں سے نہ ہٹائیے، جب وہ بیعت کر کے آپؓ کی خلافت تسلیم کر لیں اس وقت جو دل میں آئے کیجیے گا۔" لیکن حضرت علیؓ نے نہایت سختی سے انکار کیا۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ "ابھی معاویہؓ کو معزول نہ کیجیے۔ اگر وہ اپنے عہدہ پر قائم رہیں گے تو پھر انھیں اس کی پروا نہ ہو گی کہ کون خلیفہ ہے؟ لیکن اگر وہ معزول کر دیے گئے تو عثمانؓ کے قصاص کی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور سارے شام و عراق کو آپؓ کے خلاف کر دیں گے۔"

لیکن حضرت علیؓ نے ان کا مشورہ بھی قبول نہ فرمایا اور ۳۶ھ میں تمام عثمانی عمال کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے عمال مقرر کر دیے۔ اس پر آپؓ کی مخالفت میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔

باغیوں کی حکم عدولی

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مدینہ منورہ میں باغی اور شر پسند دندناتے پھرتے تھے، سارا نظام درہم برہم تھا۔ حضرت علیؓ اس نازک صورتحال سے باخبر تھے۔ لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ ان باغیوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کر لینے کے باوجود آپؓ کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ بیعتِ عامہ کے بعد تیسرے روز جب آپؓ نے مختلف علاقوں سے آ کر مدینہ میں جمع ہونے والے لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو جانے کا حکم دیا تو انھوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور اس انکار میں عبداللہ بن سبا پیش پیش تھا، کیونکہ ان باغیوں کو معلوم تھا کہ وہ منتشر ہو گئے تو پھر ان کے خلاف تادیبی کارروائی آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

امیر معاویہؓ کا انکارِ بیعت

امیر معاویہؓ بڑے مدبر اور سیاستدان تھے۔ پھر بیس بائیس سال سے شام کے والی چلے آ رہے تھے۔ یہاں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ انھیں معزول کرنا آسان کام نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے انھیں معزول کر کے سہیل بن حنیف کو والیٔ شام مقرر کیا تھا۔ لیکن امیر معاویہؓ نے سہیل بن حنیف کو شام کی حدود میں داخل نہ ہونے دیا۔ اور شام کی سرحد تبوک ہی سے واپس کر دیا۔

امیر معاویہؓ کو معزول کرنے کے ساتھ ہی حضرت علیؓ نے ان کے پاس بیعت کے لیے الگ ایک خط لکھا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے صحابہؓ حضرت عثمانؓ کی شہادت خصوصاً آپؓ کے قاتلوں کا پتہ نہ چلنے سے سخت متاثر تھے، امیر معاویہؓ نے اس سے فائدہ اٹھایا اور مدینہ سے حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیراہن اور حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں منگا کر دمشق کی جامع مسجد کے منبر پہ آویزاں کرا دیں۔ اس سے شام کے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے، لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اس منظر کو دیکھ کر زار و زار روتے تھے۔

امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے قاصد کو روک لیا تھا۔ یہ منظر دکھانے کے بعد واپس کر دیا۔ اور اس کے ہمراہ اپنا ایک قاصد ایک کورا سادہ لفافہ دے کر حضرت علیؓ کے پاس بھیجا۔ آپؓ نے اسے کھولا تو کچھ نہ تھا۔ آپؓ کو حالات کا کچھ اندازہ ہو چلا تھا، یعنی آپؓ کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا۔ قاصد سے پوچھا: "شام میں کیا حال ہے؟" اس نے کہا: "وہاں کے ساٹھ ہزار شیوخ عثمانؓ کے پیراہن پر رو رہے ہیں اور قصاص لینے کا عہد کر چکے ہیں۔"

اس وقت حضرت علیؓ کے سامنے حقیقت واضح ہوئی۔ آپؓ نے فرمایا: "خدایا! میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں۔"

امیر معاویہؓ کے مقابلہ کی تیاریاں

جب حضرت علیؓ کو واقعات کا پورا اندازہ ہو گیا تو آپؓ نے امیر معاویہؓ کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

یہ پہلا اندوہناک موقع تھا کہ مسلمانوں کی تلواریں آپس ہی میں بے نیام ہونے والی تھیں۔ اس لیے اکثر صحابہؓ اس کی شرکت کے بارے میں کشمکش و پیچ میں تھے۔ بہتروں نے اس کی مخالفت کی یا کم از کم غیر جانبدار رہے۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت محمد بن مسلمہؓ وغیرہ نے کسی کا ساتھ نہ دیا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا: "مجھے تم لوگوں کی جانب سے ناپسندہ خبریں ملی ہیں، کیا واقعہ ہے؟" حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے فرمایا:

"اگر اس جنگ میں آپؓ میری شرکت چاہتے ہیں تو ایسی تلوار عنایت کیجیے جو کافر و مسلم میں تمیز کرے۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ: "آپؓ ایسی چیز میں شرکت کے لیے مجبور نہ کیجیے جس کے حق و باطل ہونے کا فیصلہ میں نہیں کر سکا۔"

حضرت محمد بن مسلمہؓ نے فرمایا کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اپنی تلوار کو مشرکوں کے مقابلہ میں استعمال کروں اور جب مسلمانوں سے جنگ کا وقت آئے تو اسے پتھر پر ٹپک کر توڑ دوں، چنانچہ کل میں نے اس کو توڑ دیا۔"

حضرت اسامہؓ بن زیدؓ نے فرمایا کہ: "مجھے اس میں شرکت سے باز رکھا جائے، میں نے عہد کیا ہے کہ [illegible] پڑھنے والوں سے جنگ نہ کروں گا۔"

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ سے اجازت لے کر مکہ چلے گئے بہت سے محتاط صحابہؓ نے اس میں شرکت سے گریز کیا۔ تاہم بعضوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔

جنگ جمل ۳۶ھ

قصاص عثمانؓ کے لیے حضرت عائشہؓ کا خروج

ابھی حضرت علیؓ امیر معاویہؓ سے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دوسری طرف اس سے بھی زیادہ اور سخت صورتحال پیدا ہو گئی۔ یعنی اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ قصاص عثمانؓ کے لیے میدان عمل میں آگئیں۔ حضرت عائشہؓ ہر سال حج کے لیے تشریف لے جاتی تھیں، چنانچہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے زمانہ میں آپؓ مکہ ہی میں تھیں، یہیں آپؓ کو واقعۂ شہادت اور مدینہ میں بدامنی کی خبریں ملیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ مکہ پہنچے اور حضرت عائشہؓ کو مدینہ میں زبردست فتنہ و فساد کی رُلا دینے والی داستان سنائی اور انھوں نے حضرت عائشہؓ کو قصاص عثمانؓ اور فتنہ و فساد کی اصلاح کی دعوت دی۔ چنانچہ اُم المومنین کی زبان سے خلیفۂ مظلوم کے قصاص کی دعوت پر ہزاروں مسلمان سرفروشی کے لیے تیار ہو گئے، اس طرح تین ہزار آدمیوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ اُم المومنین حضرت حفصہؓ نے بھی حضرت عائشہؓ کا ساتھ دینا چاہا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے انھیں منع کر دیا۔ اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ نے بھی آپؓ کو بذریعہ خط سمجھایا کہ اس قسم کے جھمیلوں میں نہ پڑنا آپؓ کی شان کے خلاف ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے اپنے اس اقدام کو حق بجانب سمجھا۔

بصرہ کو روانگی

اس تیاری کے بعد حضرت عائشہؓ کی رائے تھی کہ اصل مقصد مدینہ کے حالات کی اصلاح ہے اور سبائی جماعت اور قاتلین عثمانؓ کا گروہ بھی وہیں ہے، اس لیے سیدھے مدینہ چلنا چاہیے۔ کچھ لوگوں کا مشورہ شام چلنے کا تھا۔ لیکن آخر میں بصرہ جانے کی رائے قرار پائی۔ غرض صفر ۳۵ھ میں حضرت عائشہؓ مدینہ سے روانہ ہو گئیں۔ رخصت ہوتے وقت مسلمانِ اسلام اس نازک گھڑی پر زار زار روتے تھے۔ جس وقت حضرت عائشہؓ مدینہ سے نکلی ہیں، دائیں بائیں مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں مخلص مسلمانوں کے ساتھ بہت سے مفسد بھی شامل ہو گئے تھے، جن کا کام جنگ کی آگ کو بھڑکانا تھا۔

حواب کے کُتے بھونکے

راستہ میں حواب کے چشمہ پر قافلہ پہنچا تو حضرت عائشہؓ نے کُتوں کے بھونکنے کی آوازیں سُنیں۔ پوچھا: "یہ کون سا چشمہ ہے؟"

معلوم ہوا "حواب"۔ یہ سُن کر فرمایا: "مجھے یہیں سے واپس کر دو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "تم ان میں سے نہ ہونا جن پر حواب کے کُتے بھونکیں گے۔" لیکن چالیس آدمیوں

نے قسم کھا کر شہادت دی کہ یہ حواب کا چشمہ نہیں ہے، اس وقت حضرت عائشہؓ آگے بڑھیں۔

حاکم بصرہ کا مقابلہ اور شکست

حضرت عائشہؓ بصرہ کے قریب پہنچیں تو عثمان بن حنیف نے جو حضرت علیؓ کی جانب سے بصرہ کا حاکم تھا، اس نے اپنا قاصد حضرت عائشہؓ کے پاس تحقیق حال کے لیے بھیجا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنا اصل مقصد بتایا۔ قاصد نے تو علیحدگی اختیار کر لی اور لوگوں نے عثمان بن حنیف کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن اس نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور مقابلہ کے لیے نکلا۔ عثمانؓ کی فوج کا ایک حصّہ حضرت عائشہؓ کی دعوت سے متاثر ہو کر الگ ہو گیا لیکن عثمان اپنے ارادے سے باز نہ آیا اور حضرت علیؓ کے آنے سے پہلے ہی جنگ ہو گئی۔ عثمان شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ پھر حضرت عائشہؓ کے حکم سے رہا کر دیا گیا۔ عثمان کے شکست کھانے کے بعد اس کی جماعت کے بہت سے سبائی اور قاتلین عثمانؓ کی جماعت کے آدمی پکڑ کر قتل کر دیے گئے۔ اس سے بصرہ میں ایک جماعت حضرت عائشہؓ کے خلاف ہو گئی۔

حضرت علیؓ کی حکمتِ عملی

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ کے مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے کہ آپؓ کو حضرت عائشہؓ کے قصاص عثمانؓ کی دعوت اور آپؓ کے بصرہ جانے کی خبر ملی۔ یہ اطلاع پا کر آپؓ نے امیر معاویہؓ کے مقابلہ کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا۔

حضرت علیؓ کے لیے یہ بڑا نازک موقع تھا اگر آپؓ خاموش رہتے تو نظام خلافت پر اثر پڑتا۔ اور نکلتے تو ام المومنین کا مقابلہ تھا لیکن قیام نظم کے لیے نکلنا ناگزیر تھا پھر آپؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ مفسد بھی خیر خواہی کے پردہ میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان کے شر کو دبانے کے لیے چار و ناچار مقابلہ کا عزم کرنا پڑا۔ لیکن یہ بات افسوس ناک ہے کہ آخر تک آپؓ صلح و آشتی اور اصلاح کے خواہاں رہے اور حضرت عائشہؓ کی بھی یہی کوشش تھی، مگر فتنہ پرستوں نے کامیاب نہ ہونے دیا۔

محتاط صحابہؓ کی روش

حضرت عائشہؓ کی طرح حضرت علیؓ کے لیے بھی یہ دشواری تھی کہ اکثر محتاط اہل مدینہ اور اکابر صحابہ اس خانہ جنگی کے خلاف تھے اور کم از کم خود اس میں شرکت کرنا ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ جس وقت آپؓ نے بصرہ جانے کا عزم کیا تو اہلِ مدینہ نے اس میں شرکت سے اپنا دامن بچایا۔ حضرت علیؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کو بلا کر ان سے فرمایا کہ میرا ساتھ دو، انھوں نے آپؓ کو بھی وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ کو دے چکے تھے۔

حضرت علیؓ کی مدینہ سے روانگی

تاہم کچھ انصار اور چند بدری صحابہؓ نے آپؓ کا ساتھ دیا اور حضرت علیؓ ربیع الاول ۳۶ھ میں مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت آپؓ کے ساتھ سات سو آدمی تھے، جن میں زیادہ

تعداد اہل کوفہ و بصرہ کی تھی۔ لیکن راستہ میں برابر لوگ ساتھ ہوتے گئے۔ حضرت امام حسینؓ، عمار بن یاسرؓ اور ہاشم بن عتبہ وغیرہ کوفہ پہنچے تو دیکھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ وعظ و پند کے ذریعہ لوگوں کو جنگ میں شرکت کرنے سے روک رہے تھے لیکن حضرت حسنؓ نے خود تقریر کر کے لوگوں کو حضرت علیؓ کی امداد پر آمادہ کیا، چنانچہ دس ہزار آدمی ساتھ مل گئے۔ حضرت علیؓ نے اعلان کیا کہ ہمارا مقصد اصلاح ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس امت میں پھر قوت و وحدت پیدا ہو جائے۔

مصالحت کی کوشش

کوفہ کے رؤسا میں ایک بزرگ حضرت قعقاع بن عمروؓ صحابی اور خیر خواہِ امت تھے۔ حضرت علیؓ نے انھیں مفاہمت کی گفتگو کے لیے حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا۔ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے بصرہ جا کر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں عرض کیا: "اماں! آپؓ کس غرض سے یہاں تشریف لائی ہیں؟"

حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "بیٹا! لوگوں میں اصلاح کے لیے۔"

حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے قصاصِ عثمانؓ کا مسئلہ اٹھایا تو حضرت قعقاعؓ نے کہا کہ "ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے حالات کا پُر سکون ہونا ضروری ہے۔ اس وقت اتحادِ امت کی ضرورت ہے۔ حضرت قعقاع کی مؤثر و معقول تجویز کو حضرت عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ تینوں نے پسند کیا اور اس کی تائید کی۔ حضرت قعقاعؓ نے واپس ہو کر حضرت علیؓ کو یہ خوشخبری سنائی۔ آپؓ سن کر بہت مسرور ہوئے اور مخلص مسلمانوں کی بڑی جماعت مصالحت کے لیے تیار ہو گئی۔ اب حضرت علیؓ ذی قار سے بصرہ پہنچ چکے تھے، آپؓ کے آنے کے بعد آپؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ میں صلح کی آخری گفتگو ہوئی اور مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ ہونے کے بعد بالاتفاق طے پایا کہ امت کی اصلاح صلح ہی میں ہے۔ مصالحت کی تکمیل کے بعد فریقین اپنے اپنے لشکر گاہوں میں مسرور و مطمئن واپس آ گئے۔ اور اطمینان و سکون کے ساتھ سوئے۔

سبائیوں کی فتنہ انگیزی

سبائیوں کے لیے یہ صلح بڑی شاق تھی اور وہ برابر اندر اندر فتنہ انگیزی میں مصروف تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ اگر یہ شب بخیر گئی تو صبح کو صلح کا عام اعلان ہو جائے گا اور لوگ اپنا اپنا راستہ لیں گے۔ اس لیے انھوں نے طے کیا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی اندھیرے میں دونوں فوجوں پر حملہ کر دیا جائے۔ دونوں فریق کے ساتھ قریب قریب ہر قبیلہ کے آدمی تھے۔ چنانچہ یہ لوگ راتوں رات پھیل گئے اور اندھیرے میں دونوں فوجوں پر حملہ کر دیا اور صبح ہوتے ہوتے ہنگامہ برپا ہو گیا۔

خونریز جنگ

اس غیر متوقع حملہ نے دونوں کو گھبرا دیا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ واقع کیا ہے؟ تاہم حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ

نے اس وقت بھی اسے روکنے کی کوشش کی حضرت علیؓ پکار پکار کر کہتے تھے کہ "لوگو رک جاؤ"۔ حضرت عائشہؓ فوراً اونٹ پر بیٹھ کر روکنے کے لیے پہنچیں لیکن اس ہنگامہ میں کون کسی کی سنتا ہے۔ اصل حقیقت کی کسی کو خبر نہ تھی، ہر فریق نے یہی گمان کیا کہ دوسرے نے بد عہدی کی ہے غرض صبح ہوتے ہوتے صلح کا خواب پریشان ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے خونریز جنگ شروع ہو گئی۔

حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کی علیحدگی اور شہادت

عین ہنگامۂ کارزار میں حضرت علیؓ کی نظر حضرت زبیرؓ پر پڑی۔ آپؓ نے انھیں یاد دلایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک دن تم ان سے ناحق لڑو گے"۔ حضرت زبیرؓ نے فرمایا: "ہاں مجھے یاد آ گیا۔ چنانچہ حضرت زبیرؓ ہنگامۂ جنگ سے الگ ہو گئے اور واپس لوٹ گئے۔ واپسی میں ایک سبائی نے آپؓ کو عین حالتِ نماز میں شہید کر دیا اور اپنی کارگذاری دکھانے کے لیے آپؓ کا سر، گھوڑا، تلوار اور زرہ کو لے کر خوش خوش حضرت علیؓ کے پاس پہنچا، آپؓ نے فرمایا: "ابن صفیہ کے قاتل تجھے دوزخ کی بشارت ہو۔" سبائی بولا: "کیا میری جانثاری کا یہی صلہ ہے کہ میں تو آپؓ کے دشمنوں کا خاتمہ کروں اور آپؓ مجھے دوزخ کی بشارت دیں۔"

حضرت زبیرؓ کو واپس جاتے دیکھ کر حضرت طلحہؓ نے بھی واپسی کا قصد کر لیا تھا۔ مروان بن حکم نے دیکھا کہ اگر یہ بھی چلے گئے تو لڑائی کا رنگ ہی بدل جائے گا، چنانچہ اس نے ایسا تیر مارا کہ ایک ہی تیر میں آپؓ کا کام تمام ہو گیا۔

ام المومنینؓ کے اونٹ کے گرد جاں نثاروں کی جانبازی

لیکن ان دونوں بزرگوں کے بعد بھی لڑائی کا زور ختم نہ ہوا۔ فریقین نے نہایت پامردی کے ساتھ ایک دوسرے کا مقابلہ کیا۔ حضرت عائشہؓ فوج کے درمیان اونٹ پر بیٹھی ہوئی جاں نثاروں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں اور ہر طرف سے محمل پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ جاں نثار کٹ کٹ کر گرتے تھے، لیکن پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اس طرح گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔

جنگ کا خاتمہ

حضرت علیؓ نے دیکھا کہ جب تک اونٹ اپنی جگہ پر قائم رہے گا، اس وقت تک یہ خونریزی بند نہیں ہو سکتی۔ اس لیے آپؓ نے حکم دیا کہ اونٹ کے پاؤں زخمی کر کے اسے گرا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اونٹ زخمی ہو کر بلبلا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی لڑائی کا رنگ بدل گیا اور حضرت عائشہؓ کی فوج کی ہمت چھوٹ گئی۔ حضرت علیؓ نے اعلان کرا دیا کہ "نہ بھاگنے والے کا تعاقب کیا جائے، نہ کسی کا مال لوٹا جائے، جو شخص ہتھیار ڈال دے یا گھر کا دروازہ بند کر لے وہ مامون ہے۔" یہ اعلان ہوتے ہی آپؓ کی فوج نے ہتھیار روک لیے۔

حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حضرت علیؓ کی حاضری

جنگ کے خاتمے پر حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھیں ایک محل میں ٹھہرایا اور ان کی مزاج پرسی کی۔ پوچھا: "اماں! مزاج کیسا ہے؟" حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "خدا ہم دونوں کو معاف فرمائے۔" اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے بھی یہی کلمات ارشاد فرمائے۔ چند روز بعد حضرت عائشہؓ کے آرام کرنے کے بعد حضرت علیؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کو حکم دیا کہ وہ عزت و احترام کے ساتھ آپؓ کو مکہ پہنچا دیں۔ اور سواری، زادِ راہ، نقد و جنس وغیرہ جملہ ضروری سامان آپؓ کی خدمت میں پیش کیا۔

رخصت ہوتے وقت حضرت عائشہؓ نے لوگوں سے فرمایا: "میرے بچو! یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ اس لیے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی سے کام نہ لینا چاہیے۔ میرے اور علیؓ کے درمیان جو ساس داماد میں کبھی کبھی ہو جایا کرتی ہے، اس کے علاوہ کوئی رنجش نہیں تھی، وہ ان واقعات میں بھی میرے نزدیک اخیار میں ہیں۔"

ام المومنینؓ کے اس ارشاد پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: "ام المومنین سچ فرماتی ہیں۔ خدا کی قسم! میرے اور ان کے درمیان اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں تمھارے نبیؐ کی حرم ہیں۔"

اس خوش آئند گفتگو اور صاف دلی سے دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ حضرت علیؓ نے چند میل تک خود مشایعت کی۔ اس کے بعد حضرت حسنؓ و حسینؓ کو بھیجا اور حضرت عائشہؓ مکہ سے ہوتی ہوئی مدینہ تشریف لے گئیں۔

نتیجہ یہ اندوہناک تاریخی سانحہ اسلامی تاریخ میں جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت عائشہؓ اس جنگ میں ایک اونٹ پر سوار تھیں اور لڑائی اس کے اردگرد ہو رہی تھی، اس لیے اسے جنگِ جمل کہتے ہیں۔

بقول شاہ معین احمد ندوی:

"اس جنگ کی تمہید غلط اطلاعات اور غلط فہمی سے ہوئی، آغاز سبائیوں کی فتنہ انگیزیوں سے ہوا اور خاتمہ فریقین کی صفائی قلب پر ہوا۔ دونوں بزرگوں کی نیت نیک تھی۔ حضرت عائشہؓ کو تمام عمر اس کی ندامت رہی۔ جب اس کا تذکرہ آتا تھا تو زار زار رونے لگتی تھیں اور فرماتی تھیں:

"کاش! میں آج سے بیس برس پہلے دنیا سے اٹھ گئی ہوتی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ اسلام میں جنگِ جمل ایک انتہائی افسوسناک و المناک سانحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد پہلی خانہ جنگی تھی جس میں ایک مسلمان کی تلوار دوسرے مسلمان کے لیے بے نیام ہوئی۔ یہ ایک سانحہ تھا جسے فریقین میں سے کوئی بھی پسند نہ کرتا تھا، لیکن تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے؟ افسوس! ایک خون کا بدلہ لینے کے لیے دس ہزار خون ہوئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے دلوں میں خونِ مسلم کا وہ احترام باقی نہ رہا جو اسلام کی بنیادی تعلیم ہے

کوفہ کا دار الخلافہ قرار پانا

جنگِ جمل کے خاتمہ پر رجب ۳۶ھ میں حضرت علیؓ کوفہ واپس تشریف لائے، اور مدینہ کی بجائے اس کو مرکزِ خلافت قرار دیا۔ اس تبدیلی کا سبب یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حرمِ نبویؐ کی بڑی توہین ہوئی اس لیے آئندہ اس کو فتنہ و شر سے بچانے کے لیے آپؓ نے سیاسی مرکز کو یہاں سے ہٹا دینا مناسب سمجھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے حامیوں کی بڑی تعداد عراق میں تھی، اس لیے سیاسی حیثیت سے کوفہ آپؓ کے لیے زیادہ اہم تھا۔

اس تبدیلی سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ مدینہ منورہ سیاسی انقلابات کے شر انگیز نتائج و اثرات سے محفوظ ہو گیا۔ اور اس کے بعد جو سیاسی ہنگامے ہوئے، ان کا مرکز عراق رہا، لیکن اس سے مدینہ منورہ کی سیاسی اہمیت اور مرکزیت جاتی رہی اور حضرت علیؓ مسلمانوں کے حقیقی یا بابرکت مرکز سے دور چلے گئے، جس کے نتائج ان کے لیے بھی کچھ مفید ثابت نہ ہوئے۔ چنانچہ یہی اہلِ کوفہ ان کے لیے بعد میں سب بے وفا نکلے۔

جنگِ صفین ۳۷ھ

حضرت علیؓ کی طرف سے امیر معاویہؓ کو بیعت کی دعوت

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم نہیں کی تھی۔ حضرت علیؓ نے ان کی جگہ سہیل بن حنیف کو والیٔ شام مقرر کیا تھا لیکن امیر معاویہؓ نے اس حکم کی تعمیل نہ کی۔ وہ قصاصِ عثمانؓ کے نام پر آپؓ سے مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ درمیان میں جنگِ جمل پیش آجانے کے باعث حضرت علیؓ ان کی طرف توجہ نہ کر سکے تھے۔ اس سے فراغت کے بعد آپؓ نے قاصد کے ذریعے امیر معاویہؓ کو یہ دعوت دی۔

"جن لوگوں نے ابوبکرؓ و عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، انھوں نے میری بیعت کر لی ہے۔ اس کے بعد کسی کے لیے چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے، مہاجرین و انصار کی طرح تم بھی بیعت کر لو، عافیت و سلامتی اسی میں ہے ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، قاتلینِ عثمانؓ کو کانی آڑ بنا چکے، بیعت کے بعد باقاعدہ مقدمہ پیش کرو، میں کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے مطابق اس کا فیصلہ کروں گا۔"

اس پر امیر معاویہؓ نے جواباً خط لکھا:

"حضرت عثمانؓ تمھاری موجودگی میں قتل کیے گئے اور تم نے اپنے قول و فعل سے اسے نہ روکا۔ اس کے بعد تم نے قاتلینِ عثمانؓ کو پناہ دی اور وہی لوگ اس وقت تمھارے قریب ملازم و مشیر بنے ہوئے ہیں۔ اگر ان کو ہمارے حوالے کر دو تو ہم سب بیعت کے لیے تیار ہیں۔"

اُدھر حضرت علیؓ کو یہ مشکل درپیش تھی کہ قاتلین عثمانؓ کی نشاندہی ممکن نہ تھی اور یہ بھی وہ ان کے قبضے میں تھے، اس لیے تصادم ناگزیر ہو گیا۔

امیر معاویہؓ کا عمروؓ بن العاص کو ساتھ ملانا

اس وقت امیر معاویہؓ چند در چند مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے حضرت عمروؓ بن العاص کو بلا کر ان سے مشورہ کیا اور انھیں ساتھ دینے کی دعوت دی۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے انھیں کچھ مشورے دیے، لیکن اپنے بارے میں کہا:۔

"تم کو علیؓ کے مقابلے میں سبقتِ اسلام اور قرابتِ نبویؐ کا شرف حاصل نہیں ہے اور میں خواہ مخواہ تمھاری کامیابی میں کیوں مدد کروں؟"

امیر معاویہؓ نے کہا، "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

عمروؓ بن العاص بولے:۔ "مصر کی حکومت۔"

عمروؓ بن العاص سارے عرب میں تدبّر و سیاست میں یکتا تھے، اس لیے امیر معاویہؓ ہر قیمت پر اُن کے تدبّر سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، چنانچہ بڑے غور و فکر کے بعد ان سے مصر کی حکومت دینے کا وعدہ تحریری وعدہ کر لیا اور انھیں اپنے ساتھ ملا لیا۔

شام میں حضرت علیؓ کے خلاف پروپیگنڈا

اس معاہدہ کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے مشورہ دیا کہ بغیر کسی معقول سبب اور بنیاد کے علیؓ جیسے شخص کی مخالفت میں بڑے خطرات ہیں۔ اس لیے پہلے عمائدِ شام کو اس کا یقین دلاؤ کہ عثمانؓ کے قتل میں علیؓ کی شرکت تھی۔ شام کے سب سے بااثر آدمی شرجیل بن سمط کندی تھے۔ سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے انھیں اپنا ہمنوا بنایا۔ انھوں نے شام کے مختلف شہروں کا دورہ کر کے خوب پراپیگنڈا کیا، یہاں تک کہ شام کا پورا ملک حضرت علیؓ کے مقابلہ کے لیے امیر معاویہؓ کے ساتھ ہو گیا۔
دوسری طرف حضرت عثمانؓ کے خون آلود پیراہن اور آپؓ کی بیوی حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی جن کو امیر معاویہؓ نے جامع دمشق میں آویزاں کرا دیا تھا۔ نمائش برابر جاری تھی۔ حضرت علیؓ کے خلاف شامی فوجوں کے جذبات بھڑکانے کے لیے انھیں دمشق طلب کیا۔ یہ منظر ایسا دردناک تھا کہ اسے دیکھ کر کوئی مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اس منظر کو دیکھ کر زار زار روتے تھے۔ چنانچہ فوج سے لے کر امراء و عوام تک سب کے جذبات بھڑک اٹھے اور اہلِ شام نے قسم کھائی کہ جب تک خلیفۂ مظلوم کے خون کا بدلہ نہ لے لیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

مصالحت کی کوشش ناکام

حضرت علیؓ نے جب یہ صورتحال دیکھی تو مجبوراً آپؓ نے بھی مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر کہ ابھی جنگِ جمل کا بہا خون بھی خشک نہ ہونے پایا تھا کہ پھر مسلمانوں کی تلواریں آپس میں بے نیام ہونے والی ہیں، بعض مخلص اور خیر خواہِ امت مسلمانوں نے اسے روکنے کی تدبیریں کیں اور شام کے ایک عابد و زاہد بزرگ ابو مسلم خولانی چند آدمیوں کو ساتھ لے کر امیر معاویہؓ کے پاس گئے اور

ان سے کہا:-

"تم علیؓ سے لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہو، تم کو سبقتِ اسلام کا شرف حاصل نہیں ہے۔ پھر کس بنیاد پر تم کو ان کی برابری کا دعویٰ ہے؟"

امیر معاویہؓ نے جواب دیا کہ: "میں فضیلت میں ان کی برابری کا مدعی نہیں ہوتا ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ قاتلینِ عثمانؓ کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ پھر ہم ان کی خلافت تسلیم کریں گے۔"

اس مطالبہ کا حضرت علیؓ نے یہ جواب دیا کہ: "قاتلوں کا حوالہ کرنا میرے امکان ہی میں نہیں ہے۔ عثمانؓ کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے کسی کو ان کے خلاف نہیں بھڑکایا، البتہ جب زیادہ ہنگامہ برپا ہوا تو میں خانہ نشین ہو گیا۔ تم اس مطالبہ کو حصولِ مقصد کا ذریعہ بنانا چاہتے ہو۔ اگر تم باز نہ آؤ گے تو تم سے باغیوں سا سلوک کیا جائے گا۔"

چنانچہ مصالحت کی کوشش ناکام ہو گئی۔ امیر معاویہؓ اپنی ضد پر اڑے رہے، اس لیے حضرت علیؓ کو چار و ناچار مقابلہ کے لیے نکلنا پڑا۔

عراقی اور شامی میدان میں

حضرت علیؓ ذی الحجہ ۳۶ھ میں حضرت ابو مسعود انصاریؓ کو کوفہ میں اپنا نائب بنا کر اسّی ہزار فوج کے ساتھ شام کی طرف بڑھے۔ اس فوج میں عام مسلمانوں کے علاوہ ستر بدری صحابہؓ، سات سو بیعتِ رضوان کے جاں نثار اور چار سو عام مہاجرین و انصار صحابیؓ تھے۔ امیر معاویہؓ نے آگے بڑھ کر صفین کے میدان میں فرات کے ساحل پر فوجیں اتار دیں اور تمام اہم مقامات پر قبضہ کر کے مورچہ قائم کر دیا اور چشمہ فرات پر قبضہ کر لیا۔ ان کے ساتھ ساٹھ ہزار شامی تھے۔

اس دوران میں حضرت علیؓ بھی پہنچ گئے اور شامی فوجوں کے قریب ہی فوجیں اتار دیں۔ حضرت علیؓ کی فوج کو پانی کے لیے بڑی دشواری پیش آئی۔ شامی پانی دینے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً حضرت علیؓ نے ایک دستہ بھیج کر چشمہ پر بزور قبضہ کر لیا اور شامیوں کا پانی بند نہیں کیا۔ اس واقعہ کے بعد فریقین میں معمول کا میل جول رہا اور معلوم ہوتا تھا کہ صلح ہو جائے گی۔

میدانِ جنگ میں مصالحت کی کوشش اور ناکامی

دونوں فوجوں میں ہنگامہ پسند عوام کے علاوہ بہت سے مخلص، خیر خواہِ امت علماء، صلحاء، اور حفاظِ قرآن بھی تھے۔ ان کی کوششوں سے تین مہینہ تک جنگ رکی رہی۔ اس دوران بارہا فریقین نے جنگ چھیڑنے کا ارادہ کیا، لیکن یہ بزرگ روک دیتے تھے۔ التوائے جنگ کے ساتھ مصالحت کی کوشش بھی ہوتی رہی، لیکن بے سود۔ جمادی الاول ۳۷ھ میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی، لیکن رجب کا مہینہ شروع ہوتے ہی حرمت کے باعث جنگ روک دی گئی، مصالحت کے لیے پھر سے کوشش ہوئی۔ چنانچہ کچھ بزرگ [redacted] کے پاس گئے اور انھیں نازک صورتحال سے آگاہ کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔

"قاتلینِ عثمانؓ ہمارے حوالے کیے جائیں تو میں سب سے پہلے علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا۔"

ان بزرگوں نے واپس جا کر حضرت علیؓ کو امیر معاویہؓ کا مطالبہ سنایا۔ اسے سن کر حضرت علیؓ کی فوج سے بیس ہزار آدمی نکل پڑے اور نعرہ لگایا کہ "ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں۔" یہ رنگ دیکھ کر وہ بزرگ ساحلی علاقہ کی طرف نکل گئے اور اس جنگ میں حصہ نہ لیا۔ یوں مصالحت کی آخری کوشش بھی ناکام ہوگئی۔

خونریز جنگ

مصالحت کی جتنی کوششیں ہوئیں وہ سب ناکام رہیں اور شہر حرام کے ختم ہوتے ہی فریقین پوری قوت کے ساتھ میدان میں اُتر آئے اور خونریز جنگ شروع ہوگئی، جس کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ فریقین کے درمیان نوّے معرکے ہوئے۔ ان میں ۴۵ ہزار شامی اور ۲۵ ہزار عراقی کام آئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہوگئے۔ درمیان درمیان میں مُردوں کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک ایک دو دو دن جنگ ملتوی ہوتی رہتی تھی۔ ان تمام لڑائیوں میں فریقین نے نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا دونوں کا پلہ قریب قریب برابر تھا۔ لیلۃ الحریر کا آخری معرکہ بڑا خونریز تھا، اس میں شامی کمزور پڑ گئے تھے اور عراقی بھی مسلسل جنگ سے گھبرا گئے تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر یہ خونریز جنگ جاری رہی تو مسلمانوں کی قوت تباہ ہو جائے گی اور ان میں غیر مسلموں کے مقابلہ کی طاقت باقی نہ رہے گی۔ چنانچہ امیر معاویہؓ نے کہا کہ :-

"اگر یہ جنگ قائم رہی تو رومی شام سے ہمارے اہل و عیال کو قید کرلیں گے اور فارس کے دہقان عراقیوں کے بال بچوں کو پکڑ لے جائیں گے۔"

علوی فوج کے مدبّروں نے بھی یہی خطرہ محسوس کیا۔ لیکن حضرت علیؓ کو اس کا پورا اندازہ ہوگیا تھا کہ اب شامی کوئی دم میں میدان چھوڑنا چاہتے ہیں اور آخری فتح قریب ہے۔

عمروؓ بن العاص کی ایک تدبیر اور علوی فوج میں اختلاف

امیر معاویہؓ کو بھی اپنی فوج کی حالت کا اندازہ ہوچکا تھا۔ انھوں نے عمروؓ بن العاص سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا :- "ایسے وقت میں میں نے پہلے سے یہ تدبیر سوچ رکھی تھی کہ ہم لوگ قرآن کو حکم بنانے کی دعوت دیں، اس کے قبول اور انکار دونوں صورتوں میں علیؓ کی فوج میں پھوٹ پڑ جائے گی۔"

چنانچہ دوسرے دن ہزاروں شامی قرآن نیزوں پر بلند کیے میدان میں آگئے۔ حضرت علیؓ اور ان کی فوج کے بعض دوسرے عاقبت اندیش افسروں نے مخالفت کی، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ :

"یہ مصحف فریب ہے"

لیکن ایک بڑی جماعت پر یہ جادو چل گیا۔ اس نے کہا:۔ شامیوں کو اسی کتاب کا پابند بنانے کے لیے تو ہم ان سے لڑ رہے ہیں۔ اگر آپؓ نے قرآن کو حکم ماننے سے انکار کیا تو ہم آپؓ سے لڑیں گے اور آپؓ کو بھی عثمانؓ کے پاس پہنچا دیں گے۔"

حضرت علیؓ نے دیکھا کہ انکار کی صورت میں خود ان کی فوج میں پھوٹ پڑ رہی ہے تو چار و ناچار تحکیم کے لیے آمادہ ہو گئے اور جنگ روک دی۔

ثالثوں کا تقرر اور فیصلہ التوائے جنگ کے بعد طے پایا کہ دونوں فریق کی جانب سے ایک ایک حکم (ثالث) مقرر کیا جائے۔

یہ دونوں کتاب اللہ کی رُو سے جو فیصلہ کر دیں وہ فریقین کے لیے واجب التسلیم ہو اور جو فریق اس فیصلہ کو نہ مانے حکم اس کے خلاف دوسرے کو مدد دیں۔

اس قرارداد کے مطابق شامیوں نے حضرت عمروؓ بن العاص کو اپنا حکم بنایا، حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا نام لیا گیا، حضرت علیؓ کو اس سے اختلاف تھا۔ آپؓ نے حضرت ابنِ عباسؓ اور اشترؒ نخعی کا نام پیش کیا، لیکن اسے تسلیم نہ کیا گیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کو مجبوراً ابوموسیٰ اشعریؓ پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ دونوں ثالثوں نے تحکیم کا عہد نامہ تیار کیا، جس کی اہم دفعات یہ تھیں:۔

۱۔ حکم کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے مطابق جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لیے واجب التسلیم ہو گا۔

۲۔ جو فریق اس کے ماننے سے انکار کرے گا، حکم اور عام مسلمان اس کے خلاف دوسرے فریق کو مدد دیں گے۔

۳۔ اگر یہ فیصلہ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے خلاف ہو یا کسی فریق کی جانبداری پائی جائے تو اس کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

۴۔ فیصلہ کے اعلان تک جنگ بالکل ملتوی رہے گی اور امن و امان قائم رکھا جائے گا۔

اس عہد نامہ پر فریقین کے تمام ممتاز لوگوں کے دستخط ہو گئے اور شام و عراق کی سرحد پر دومۃ الجندل کا مقام فیصلہ کے اعلان کے لیے مقرر ہوا۔ دونوں ثالثوں کے مزاجوں میں بڑا فرق نمایاں تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نہایت سادہ دل اور صوفی منش بزرگ تھے، جبکہ حضرت عمروؓ بن العاص ہوشمندی اور تدبر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ جب فیصلے کا وقت آیا تو ہزاروں مسلمان اور بہت سے اکابر صحابہؓ اسے سننے کے لیے آئے، کیونکہ یہ فیصلہ امت کی قسمت کا فیصلہ تھا۔

غرض مقررہ تاریخ پر دونوں حکموں نے جامع مسجد میں اپنا فیصلہ سنایا۔ پہلے حضرت ابوموسیٰؓ نے اس فیصلہ کا اعلان کیا:۔

"میں علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کرتا ہوں، آئندہ تم جسے پسند کرو اپنا

خلیفہ بنا لو"

ان کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ابوموسیٰؓ نے اپنے آدمی علیؓ کو معزول کر دیا، میں بھی اس کو معزول کرتا ہوں، لیکن اپنے آدمی معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔"

یہ فیصلہ سُن کر ابوموسیٰؓ نے سخت احتجاج کیا، لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ تھی۔ حضرت علیؓ نے اس فیصلے کو قرآن کے خلاف قرار دے کر اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ امیر معاویہؓ کے حامیوں نے اسے اپنے حق میں قرار دیا اور ان کے ہاتھ پر باقاعدہ خلافت کی بیعت کر لی۔

نتیجہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ثالثی کے غلط فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے شام کے خلاف نئے سرے سے تیاری شروع کر دی۔

اس کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان کئی معرکے ہوئے۔ اس مسلسل خانہ جنگی، خونریزی اور بدامنی سے گھبرا کر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ نے ۴۰ھ میں صلح کر لی۔ اس صلح کی رُو سے حجاز، عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علیؓ کے پاس رہا اور شام اور مصر و مغرب کا حصہ امیر معاویہؓ کے حق میں آیا۔

صحابہ کرامؓ کے اختلاف کے بارے میں صحیح مسلک

ارشاد ربانی :۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

یعنی ؛ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور آپ کے ساتھی کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔

ارشاد نبویؐ :

"میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں۔ تم جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول

"علمائے سلف کی غالب اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علی مرتضیٰؓ حق پر تھے اور ان کے مخالفین سے اجتہادی لغزش ہوئی۔ لیکن ان پر ہرگز طعن یا ملامت نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے جنگ صفین کے بارے میں لوگوں سے استفسار پر فرمایا تھا کہ ہمارے مخالفین نہ کافر ہیں نہ فاسق، بلکہ ان کا اختلاف تاویل پر مبنی ہے۔"

حضرت امام شافعیؒ یہ وہ خون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا ہے، کیونکہ ہم اس وقت موجود نہ تھے، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنی زبانوں کو بھی اس خون سے آلودہ نہ کریں۔"

خواجہ حسن بصریؒ یہ ایک ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب! وہ پورے حالات کو جانتے تھے، ہم نہیں جانتے جس معاملے پر تمام صحابہؓ کا اتفاق ہے، ہم اس میں ان کی پیروی کرتے ہیں اور جس معاملے میں ان کے درمیان اختلاف ہے، اس میں ہم سکوت اختیار کرتے ہیں۔"

امام ابن تیمیہؒ صحابہ کرامؓ چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم نہیں، بلکہ ان سے فی الجملہ گناہوں کا صدور ممکن ہے لیکن ان کے فضائل ومناقب اتنے زیادہ ہیں کہ اگر کوئی گناہ ان سے صادر ہو جائے تو یہ فضائل ان کے مغفرت کے موجب ہیں یہاں تک کہ ان کی مغفرت کے مواقع اتنے ہیں کہ ان کے بعد کسی کو حاصل نہیں۔"

مفتی محمد شفیعؒ "حضرات صحابہ کرامؓ کے درمیان جو اختلافات پیش آئے اور کھلی جنگوں تک نوبت پہنچ گئی، علمائے امت نے ان کی باہمی حروب اور اختلافات کو جنگ وجدل سے تعبیر نہیں کیا بلکہ از روئے ادب مشاجرہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ درخت کی شاخوں کا ایک دوسرے میں گھسنا اور ٹکرانا مجموعی حیثیت سے کوئی عیب نہیں، بلکہ درخت کی زینت وکمال ہے۔"

(بحوالہ "دوامی تہذیب ————

———— پروفیسر سعید اختر)

خارجی فتنہ جنگ صفین میں جب حضرت علیؓ کو فتح کے آثار نمایاں ہو گئے اور شامی فوج شکست کے دہانے پر پہنچ گئی تو شامیوں نے یہ چال چلی کہ قرآن نیزوں پر اٹھا کر میدان میں آ گئے۔ جس کے نتیجے میں حضرت علیؓ کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی اور حضرت علیؓ کو مجبوراً جنگ روکنی پڑی۔ شروع میں حضرت علیؓ نے تحکیم کی تجویز کی مخالفت کی تھی لیکن پھر اپنی ہی فوج کے آدمیوں کی ضد سے اس کے قبول کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، مگر پھر تحکیم کی تجویز طے ہو جانے کے بعد آپ ہی کے حامیوں میں سے ایک جماعت اس کے خلاف ہو گئی تھی اور تحکیم کو کفر قرار دیا یہی جماعت بعد میں خوارج کے نام سے موسوم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ شرعی معاملات میں فیصلہ کا حق صرف خدا کو ہے۔ اس کے خلاف عمل کرنے والا اور انسان کو حکم بنانے والا کافر ہے۔ یہ خارجی فرقہ کہلاتا ہے۔ انہوں نے لا حکم الا اللہ کا نعرہ لگا کر حضرت علیؓ و حضرت امیر معاویہؓ دونوں سے بیزاری کا اعلان کیا۔ اور ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوٹ مار شروع کر کے ملک میں سخت بدامنی پیدا کر دی۔ اسی گروہ کے بارے میں حدیث رسول ﷺ ہے کہ، یہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے۔"

حضرت علیؓ دوبارہ امیر معاویہؓ کے مقابلے کے لیے تیاری کر رہے تھے کہ ... کی اطلاع ملی

آپ نے انہیں راہ راست پر لانے کی بڑی کوشش کی، لیکن وہ کہتے تھے کہ "خدا کے علاوہ کسی انسان کو حکم نہیں بنایا جا سکتا، آپ اس غلطی سے توبہ کیجئے اور ہمارے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیجیے، ورنہ ہم آپؓ سے جنگ کریں گے۔"

خارجیوں نے اپنے گمراہ کن عقائد کی اشاعت کر کے کوفہ، بصرہ، مدائن اور عراق کے دوسرے شہروں میں کافی لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور کوفہ کے خارجی خفیہ نہروان روانہ ہو گئے اور دوسرے شہروں کے خوارج کو اس کی اطلاع دی دی۔ خارجیوں کی فتنہ انگیزی حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی، کسی مسلمان کی جان ان کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھی، جو شخص ان کے خیالات کی تائید نہ کرتا اسے بے دریغ قتل کر دیتے چنانچہ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن خبابؓ کو اسی جرم میں شہید کر دیا اور ان کی حاملہ بیوی کا پیٹ چاک کر کے بے دردی سے قتل کر دیا، قبیلہ طے کی کئی عورتوں کو مار ڈالا۔ ان کی یہ فتنہ انگیزی دیکھ کر لوگوں نے حضرت علیؓ سے فریاد کی کہ ان کی سرکوبی کی جائے۔

چنانچہ حضرت علیؓ نے ان کے خلاف عملی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ پہلے اتمام حجت کے طور پر انہیں حقیقت حال بتاتے ہوئے راہ راست پر آنے کی دعوت دی، لیکن وہ کوئی بات ماننے پر تیار نہ تھے۔ مجبوراً حضرت علیؓ لشکر لے کر نہروان پہنچ گئے تاکہ فیصلہ کن کارروائی کی جا سکے۔ جنگ چھیڑنے سے پہلے آپ نے خارجیوں کے پاس پیغام بھیجا کہ:۔

"تمہارے جن آدمیوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا ہے، ان کو قصاص کے لیے ہمارے حوالہ کر دو تو ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ شاید خدا تم کو راہ راست پر لے آئے۔"

ان لوگوں نے جواب دیا کہ:

"ہم سب نے قتل کیا ہے اور ہم تمہارا اور ان کا دونوں کا خون مباح سمجھتے ہیں۔"

اس پر حضرت علیؓ کو مجبور ہو کر مقابلہ میں آنا پڑا تاہم آغاز جنگ سے پہلے ایک مرتبہ پھر حضرت ابو ایوبؓ انصاری کو امان کا علم دے کر اعلان کرا دیا کہ جو شخص اس علم کے نیچے آ جائے یا لوٹ جائے اسے امان ہے چنانچہ پانچ سو خارجی الگ ہو گئے ایک اور جماعت کوفہ واپس چلی گئی۔ ایک ہزار حضرت علیؓ کے جھنڈے کے نیچے آ گئے اور عبداللہ بن وہب راسبی کے ساتھ بہت تھوڑی تعداد رہ گئی۔ اس وقت بھی حضرت علیؓ نے اپنے آدمیوں کو جنگ کی ابتداء کرنے سے روکے رکھا، تا آنکہ خود خارجیوں نے **لا حکم الا اللہ** کا نعرہ لگا کر اس زور سے حملہ کر دیا کہ پہلے ہی حملہ میں حضرت علیؓ کا پیدل دستہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور خارجی علوی فوج کے میمنہ اور میسرہ پر ٹوٹ پڑے اور اس شجاعت اور پامردی سے لڑے کہ ان کے اعضاء کٹ کر الگ ہو جاتے تھے لیکن خونریز جنگ کے بعد خوارج کو نہایت شکست فاش ہوئی اور وہ ایک ایک کر کے مارے گئے۔

یہ خونی اور فتنہ پرور گروہ تھا جس نے بنو امیہ اور بنو عباس کو ہمیشہ بے چین رکھا۔ بعض اوقات تو انہوں نے مضبوط سے مضبوط حکومتوں کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ یہ لوگ اپنے عقائد میں بڑے متشدد تھے

اپنے سوا کسی اور گروہ کو مسلمان نہیں سمجھتے تھے اور غیر خارجی کو قتل کرنا ثواب سمجھتے تھے۔ انہوں نے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو قتل کیا۔ جتنا نقصان مسلمانوں کو اس گروہ سے پہنچا اتنا کسی اور سیاسی اور مذہبی گروہ نے نہیں پہنچایا۔ مسلمانوں کی اکثر خانہ جنگیوں کا سبب یہی گروہ تھا۔

شہادت

جنگ نہروان کے بعد خوارج نے سازش کی راہ اختیار کی۔ حج کے موقع پر خوارج نے مسائل حاضرہ پر گفتگو کی اور طے پایا کہ جب تک تین اشخاص حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص زندہ ہیں، عالم اسلام کو خانہ جنگیوں سے نجات نہیں مل سکتی۔ چنانچہ ابن ملجم نے حضرت علیؓ، برک بن عبداللہ نے امیر معاویہؓ اور عمرو بن بکر نے عمروؓ بن العاص کو قتل کرنے کا ذمہ لیا اور اس کے لیے ۱۷ رمضان تاریخ مقرر ہوگئی۔ امیر معاویہؓ کو معمولی زخم آیا جو چند روز بعد ختم ہوگیا، عمروؓ بن العاص اس روز علالت کے باعث مسجد میں نہ آئے اور ان کی جگہ ایک اور شخص قتل ہوگیا، البتہ ابن ملجم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

عبدالرحمٰن بن ملجم حضرت علیؓ کے قتل کے ارادے سے کوفہ روانہ ہوا۔ وہاں اس کی ملاقات قطامہ نامی ایک حسین عورت سے ہوئی۔ یہ عورت خارجی عقائد رکھتی تھی۔ اس کا باپ اور بھائی نہروان کی جنگ میں مارے گئے۔ ابن ملجم نے قطامہ کو شادی کا پیغام دیا تو اس نے مہر میں حضرت علیؓ کا سر بھی مانگا۔ چنانچہ ابن ملجم حضرت علیؓ کی گذرگاہ پر چھپ رہا، حضرت علیؓ فجر کی نماز کے لیے الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہتے ہوئے لوگوں کو نماز کے لیے اٹھاتے ہوئے مسجد کی طرف روانہ ہوئے کہ مسجد کے دروازے پر ابن ملجم نے زہر آلود تلوار سے وار کیا جو دماغ تک اتر گئی۔ زخم کھاتے ہی آپ پکارا ٹھے "رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا۔" ابن ملجم کو پکڑ لیا گیا۔ چونکہ تلوار زہر آلود تھی زہر تمام جسم میں سرایت کرگیا۔ جب بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو حضرت حسنؓ سے فرمایا "قاتل سے قصاص لیتے وقت ایک ہی ضرب لگانا کیونکہ اس نے مجھ پر ایک ہی وار کیا ہے۔ اس کا مثلہ نہ کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔"

وفات سے قبل حضرت امام حسنؓ و حسینؓ اور محمد بن حنیفہ کو بلا کر باہم اتحاد و اتفاق اور دین و دنیا میں خیر و برکت کی وصیتیں فرمائیں۔ کسی نے پوچھا کہ "آپ کے بعد ہم حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں؟" فرمایا: "میں تم کو نہ اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں، تم لوگ اس کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو۔"

آپ نے زخمی ہونے کے تیسرے دن ۲۰ رمضان شب یک شنبہ ۴۰ھ کو انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرات حسنؓ و حسینؓ نے غسل دیا۔ حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور رشد و ہدایت کے اس آفتاب عالم تاب کو کوفہ کے غزی نامی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ انتقال کے وقت ۶۳ سال کی عمر تھی اور مدت خلافت ۴ سال ۹ ماہ۔

ازواج واولاد

حضرت علیؓ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے انتقال کے بعد متعدد شادیاں کیں اور ان سے بکثرت اولادیں ہوئیں۔ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے حضرت حسنؓ، حسینؓ و محسنؓ تھے۔ محسنؓ کا انتقال بچپن میں ہوگیا تھا اور صاحبزادیوں میں حضرت زینبؓ اور

حضرت ام کلثومؓ تھیں۔ حضرت ام کلثومؓ کا عقد حضرت عمرؓ کے ساتھ ہوا تھا۔ حضرت خولہؓ کے بطن سے حضرت محمد بن علیؓ تھے جو بعد میں محمد بن حنیفہؒ کے نام سے مشہور رہیں۔ حضرات حسنؓ و حسینؓ کے بعد یہ بڑے نامور فرزند تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی اولادیں تھیں۔

(شاہ معین الدین احمد ندویؒ)

سیرت و کردار ــــ دینی خدمات و فضائل

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

(اقبال)

سوال: حضرت علی المرتضیٰؓ کی سیرت و کردار، دینی خدمات اور فضائل بیان کیجیے؟

جواب:

حضرت علیؓ سیرت و کردار کے آئینہ میں

حضرت علی المرتضیٰؓ فطرت سلیم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آغوش میں تربیت پائی تھی، اس لیے آپ کی ذات خلقِ نبویؐ کا پیکر اور تعلیمات اسلامی کی تصویر تھی۔ آپ کے فضائلِ اخلاق میں سب سے نمایاں زہد و تقویٰ ہے۔ آپ شجاعت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ آپ کی قوت ارادی نہایت مضبوط اور زبردست تھی۔ آپ انتہائی خطرناک حالات میں بھی کبھی ہمت نہیں ہارتے تھے۔ مردِ میدان ہونے کے علاوہ علم و فضیلت کے میدان میں بھی آپ کا بہت حصہ ہے۔ فقہ میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ فصاحت و بلاغت میں بے مثل تھے۔ بہت بلند حوصلہ اور نہایت قوی تھے۔ فیصلہ کن بات کہتے تھے۔ عادلانہ فیصلہ کرتے تھے۔ آپ کے ہر سمت سے علم پھوٹتا تھا اور حکمت ٹپکتی تھی۔ دنیا اور اس کی دلفریبیوں سے دحشت کرتے تھے۔ آپ کی زندگی سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آپ شاہی میں فقیری کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔

ذیل میں آپ کی سیرت و کردار کے مختلف پہلو پیش کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ حلیہ مبارک

آپ کا قد میانہ، سینہ چوڑا اور کلائیاں نہایت مضبوط تھیں۔ رنگ گندمی، آنکھیں بڑی بڑی، ریش مبارک طویل اور چوڑی تھی۔ چہرہ بارونق اور حسین تھا۔ جسم کے طاقتور اور دل کے مضبوط تھے۔

۲۔ عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ

عبادت و ریاضت آپ کی زندگی کا مشغلہ تھا۔ زبیر بن سعید قریشی کا بیان ہے کہ بنی ہاشم میں آپ سے زیادہ کوئی عبادت گذار نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ آپ قائم اللیل و صائم النہار تھے (یعنی رات کو قیام کرنے والے اور دن کو روزہ رکھنے والے) آپ کی زندگی عبادت اور ریاضت سے عبارت تھی۔ آپ کا دن امورِ مملکت میں اور رات عبادت میں گزرتی۔ شب کی تنہائی میں دنیا کو یوں مخاطب

فرماتے "کیا تو میرے سامنے بن سنور کر آتی ہے، دور ہو جا، تیری عمر تھوڑی ہے، تیری مجلس حقیر ہے، تیری ہلاکت آسان ہے۔ آہ زادِ راہ کم ہے اور سفر طویل ہے۔"

آپ کی شخصیت زہد و تقویٰ کا مجسمہ تھی، بلکہ آپ کی ذات پر زہد کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ حضرت عمر بن العزیزؒ سے کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ متقی کون تھا؟ آپ نے جواب دیا "حضرت علیؓ زہد و تقویٰ میں سب سے فائق تھے، نہ صرف وہ خود خدا ترس تھے، بلکہ انہوں نے اپنے احباب اور متعلقین کی تہذیب و اصلاح کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔" آپ کا مشہور قول ہے:

"دنیا مردار ہے اور جو اس کو حاصل کرنا چاہے اسے کتوں کی صحبت کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔"

۳۔ سادگی

آپ کی زندگی سادگی کا نمونہ تھی، جاہ و حشم کا کیا ذکر، تکلف کا معمولی شائبہ تک نہ تھا اپنا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، حتیٰ کہ جوتا تک خود ہی گانٹھ لیتے تھے۔ زمانہ خلافت میں تنہا بازاروں میں گھومتے پھرتے، بھولے بھٹکوں کو راستہ بتلاتے، کمزوروں اور ناتوانوں کی مدد کرتے۔ غذا، لباس اور رہن سہن سادہ تھا، کپڑا وہ مرغوب تھا جو سادہ اور عز بہا نہ ہو۔ آپ کو عالی شان محلات سے نفرت تھی، بطور خلیفہ کوفہ تشریف لائے تو شاہی محل کی بجائے ایک میدان میں قیام کیا، روکھی سوکھی کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے تھے۔ آپ کی نانِ شعیر ضرب المثل ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے — اسے پھر بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

۴۔ شجاعت

شجاعت و بہادری آپ کا خاص وصف تھا۔ آپ کی زندگی شروع سے آخر تک شجاعانہ کارناموں سے معمور ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

"لَا فَتیٰ اِلَّا عَلیؓ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَار"

یعنی جوانمردوں میں جوانمرد علیؓ ہیں اور تلوار صرف ذوالفقار ہے۔"

یاد رہے کہ یہ تلوار حضورؐ نے خاص آپ کو عنایت فرمائی تھی۔ شجاعت و بہادری آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ جس میں کوئی اور آپ کا حریف نہ تھا۔ آپ نے تمام غزوات میں دادِ شجاعت دی۔ غزوۂ بدر میں آپ نے ولید اور شیبہ کو جہنم واصل کیا، غزوہ احد میں کفار کے علم بردار طلحہ کو دو ٹکڑے کر دیا، غزوۂ خندق میں عرب کے مشہور پہلوان عمرو بن عبدود کو جہنم واصل کیا۔ غزوۂ خیبر کے فاتح اور ہیرو آپ ہی تھے، اسی میں یہود کے نامی گرامی پہلوان مرحب کا خاتمہ کیا۔ غرض آپ نے بڑوں بڑوں کو نیچا دکھایا اور کسی معرکہ میں آپ کے قدم پیچھے نہ ہٹے۔ "شیرِ خدا" اور "حیدر کرار" کے القاب آپ ہی کے شایانِ شان ہیں۔ پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "نشانِ حیدر" آپ ہی سے منسوب ہے۔

۵۔ امانت و دیانت

آپ امینِ امت اور سراپا امانت و دیانت تھے۔ بیت المال سے معمولی روزینہ لیتے تھے، ہر طرح کی تکلیفیں اٹھاتے تھے لیکن اپنے حق سے [illegible] بیت المال سے لینا حرام سمجھتے تھے، ایک مرتبہ تیز سردی میں ایک پرانی چادر

اوڑھے تھے، بدن کانپ رہا تھا۔ ایک شخص نے عرض کیا "امیر المؤمنین بیت المال میں آپ کا اور آپ کے اہل و عیال کا بھی حق ہے۔" فرمایا "میں تمہارے حصہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" آپ کی تکلیفیں دیکھ کر ایک مرتبہ آپ کے غلام قنبر نے بیت المال سے آپ کے لیے سونے چاندی کے کچھ برتن الگ کر لیے۔ آپ کو پتہ چلا تو فرمایا: تیری ماں تجھ کو روئے تو میرے گھر کو اتنی بڑی آگ میں دھکیلنا چاہتا ہے۔" اور اسی وقت کل برتن تول تول کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے۔ اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں۔

۶۔ عدل و مساوات

آپ کے ایوانِ عدالت میں بلا امتیاز مذہب و ملت، خویش و بیگانہ امیر و غریب سب برابر تھے۔ اگر خود آپ کسی مقدمہ میں فریق ہوتے تھے تو قاضی کے سامنے حاضر ہونا پڑتا تھا اور اگر ثبوت نہ ہوتا تو مقدمہ آپ کے خلاف فیصل ہوتا۔ ایک مرتبہ آپ کی زرہ گر پڑی اور ایک یہودی کے ہاتھ لگی۔ حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچانا اور قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا۔ یہودی کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کی زرہ ہے۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے پوچھا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟ آپ نے اپنے بیٹے حسنؓ اور غلام قنبر کو بطور گواہ پیش کیا۔ قاضی نے کہا کہ امیر المؤمنین آپ بھی خوب جانتے ہیں کہ شرعاً بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں اور غلام کی گواہی آقا کے حق میں قابل قبول نہیں ہے۔ کوئی اور گواہ لائیے۔ لیکن آپ ایسا نہ کر سکے۔ چنانچہ قاضی نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس فیصلہ کا یہودی پر اتنا اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا اور کہا کہ یہ تو انبیاء جیسا انصاف ہے۔" یہودی نے وہ زرہ حضرت علیؓ کو واپس کرنی چاہی لیکن آپ نے فرمایا "اب یہ زرہ میں تجھے تحفے کے طور پر دیتا ہوں۔"

۷۔ قضا

قضا یعنی فصلِ مقدمات میں جماعتِ صحابہؓ میں آپ کا کوئی مقابل نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آپ کو "اقضاھم علیؓ" یعنی صحابہؓ میں سب سے بڑے قاضی ہیں" کی سند عطا فرمائی تھی اور قضا کی خدمت آپ کے سپرد فرماتے تھے۔ چنانچہ اہلِ یمن کے قبولِ اسلام کے بعد آپ کو وہاں کا قاضی بنا کر بھیجا اور رخصت کرتے وقت فصلِ مقدمات کے متعلق اصول تلقین فرمائے۔ فرائض یعنی تقسیم میراث کے فن میں آپ مدینہ کے ممتاز علماء میں تھے۔ شیخین کے زمانہ میں اہم مقدمات میں آپ کا مشورہ شامل ہوتا تھا۔ ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔"

۸۔ انفاق فی سبیل اللہ

انفاق فی سبیل اللہ آپ کا امتیازی وصف تھا۔ چالیس ہزار سالانہ زکوٰۃ کے بقدر آمدنی رکھنے کے باوجود پر عسرت اور غریبانہ زندگی آپ کے انفاق ہی کا نتیجہ تھی۔ آپ کے در سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ وہ کھانا بھی سائلوں کو دے دیتے جو محض آپ کی ضرورت کے لیے کافی ہوتا اور خود فاقہ سے سو رہتے تھے۔ چنانچہ روایات کے مطابق قرآن مجید کی یہ آیت آپ ہی کے بارے میں نازل ہوئی:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝

(الدھر: ۸)

ترجمہ: اور باوجود یکہ ان کو خود طعام کی خواہش (او حاجت) ہے فقیروں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔

۹۔ تقریر و خطابت

حضرت علیؓ تقریر و خطابت میں خاص مہارت رکھتے تھے اور فصاحت و بلاغت میں یکتا تھے۔ آپ ایسی پر اثر تقریر کرتے کہ لوگوں کے ذہن بدل دیتے اور انہیں اپنی رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور کر دیتے۔ آپ کے خطبات اور تقریریں اس قدر مشہور ہوئیں کہ انہیں "نہج البلاغۃ" کے نام سے چار جلدوں میں مدون کر لیا گیا ہے۔ اس کتاب نے لاکھوں انسانوں کو فصیح و بلیغ بنا دیا۔

۱۰۔ دشمنوں سے حسن سلوک

ارشادِ نبویؐ ہے: "پہلوان وہ نہیں ہے جو اپنے حریف کو پچھاڑ دے بلکہ اصل پہلوان وہ ہے جو اپنے نفس (غصے) پر قابو پالے۔" حضرت علیؓ اس صفت سے متصف تھے۔ آپ دشمنوں سے بھی حسن سلوک کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک لڑائی میں اپنے مخالف حریف پر قابو پالیا اور اس کے سینے پر چڑھ گئے۔ قریب تھا کہ اسے قتل کر دیتے لیکن عین اس وقت اس نے آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ فوراً اسے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ اس نے حیران ہو کر سبب پوچھا تو فرمایا: "جب تم نے میرے منہ پر تھوکا تو میرے نفس کو غصہ آگیا تھا، اگر اس حالت میں میں تم کو قتل کرتا تو عنداللہ کوئی اجر نہ ہوتا۔" آپ کا حریف فوراً مسلمان ہو گیا۔ ایک لڑائی میں آپ کا حریف برہنہ ہو گیا تو آپؓ اس کو چھوڑ کر الگ ہو گئے تاکہ اسے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ اپنے قاتل ابن ملجم کے بارے میں وصیت کر دی کہ اسے ایک ضرب کے بدلہ میں ایک ہی ضرب لگانا اور اس کا مثلہ نہ کرنا، نیز اسے اچھا کھانا کھلانے کی تلقین فرمائی۔

۱۱۔ علم و فضل

حضرت علیؓ نے بچپن سے دامنِ نبوت میں پرورش اور تعلیم و تربیت پائی۔ جوانی میں شرفِ صحبت سے سرفراز ہوئے اور وصالِ نبویؐ تک دامنِ رسالت سے وابستہ رہے۔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ آپ میں تحصیل علم و کسب کمال کی فطری صلاحیت اور اس کا ذوق تھا، اس لیے مکتبِ نبوت سے جو فیض آپ کو پہنچا وہ کم اور صحابہ کے حصہ میں آیا۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، جملہ دینی علوم کا دریا تھے۔ آپ کی جلالتِ علمی پر سب کا اتفاق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو خود علم و فضل میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں فرماتے تھے کہ "علم کے دس حصوں میں سے خدا نے علیؓ کو نو حصے عطا فرمائے تھے۔" زبانِ نبوت سے آپ کو سند ملی کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔"

کلام الٰہی سے آپ کو خاص شغف تھا، اس کے حافظ تھے اور اس کی تعلیم آپ نے زبانِ وحی الہام سے حاصل کی تھی۔ کلام اللہ پر آپ کی نظر اتنی وسیع تھی کہ کسی آیت کا کوئی پہلو آپ کی نظر سے مخفی نہ تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ:

"قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے متعلق میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کس بارہ میں، کہاں اور کس کے متعلق نازل ہوئی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ نے آیتوں اور سورتوں کی نزولی ترتیب پر

کلام اللہ کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا۔ فہم قرآن اور اس سے احکام و مسائل کے استنباط کا ملکہ تھا۔ آپ کو ذاتِ نبویؐ کے ساتھ گوناگوں خصوصیات کی بنا پر سماعِ حدیث کا سب سے زیادہ موقع ملا۔ پھر وصالِ نبویؐ کے بعد تیس سال تک تعلیم و ارشاد کی مسند پر فائز رہے، اس لیے حفظِ حدیث اور روایتِ حدیث دونوں لحاظ سے آپ جماعتِ صحابہؓ میں نہایت ممتاز تھے۔ آپ نے فقہی احکام کی احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جس کا نام صحیفہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذہانت، طباعی، دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کی اعلیٰ صفات سے نوازا تھا۔ آپ کی ذہانت کے بہت سے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔ فقہ میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا اور جماعتِ صحابہؓ میں آپ کو امامت واجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ اکابر صحابہؓ فقہی مشکلات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ تصوف کا سرچشمہ آپ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ صوفیائے کرامؒ کے تمام بڑے بڑے سلسلے حضرت حسن بصریؒ کے واسطہ سے آپ ہی پر ختم ہوتے ہیں۔

آپ تحریر میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ جو صحابہ حضور اکرمؐ کے فرامین لکھتے تھے یا کتابتِ وحی کرتے تھے، ان میں ایک آپ بھی تھے۔ آپ کے خطوط تحریری ادب و انشا کا دلکش نمونہ ہیں۔ شاعری کا نہایت ستھرا اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور ایک پورا دیوان آپ کی جانب منسوب ہے۔ مثلاً علم کے بارے میں آپ کے اشعار ہیں:۔

رضینا قسمۃ الجبارِ فینا — لنا علم وللجھال مالُ
فان المال یفنیٰ عن قریب — وان العلم لیس لہ زوالُ

یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے علم دیا اور جاہلوں کو دولت۔
کیونکہ مال تو عنقریب فنا ہو جائے گا اور علم کے لیے زوال نہیں ہے۔

آپ علم ریاضی میں خاص مہارت رکھتے تھے اور مشکل ترین مسائل بھی چند لمحوں میں حل کر دیتے۔ فنِ نحو کی بنیاد آپ ہی نے رکھی۔ الغرض آپ کو مذہبی علوم اور اس عہد کے تمام مروجہ فنون میں کمال حاصل تھا۔

سیاسی و دینی کارنامے

حضرت علیؓ کا پورا زمانۂ خلافت خانہ جنگیوں میں گذرا تختِ خلافت پر قدم رکھنے کے بعد آپ کو ایک دن کے لیے اندرونی جھگڑوں اور بحران و انتشار سے فرصت نہ ملی، اس لیے بیرونی فتوحات کی جانب توجہ کرنے کا آپ کو موقع ہی نہ ملا۔ اور نہ ہی نظمِ خلافت کی طرف پوری توجہ دی جا سکی۔ تاہم آپ نے سب سے بڑا کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ جن مشکل حالات میں خلیفہ منتخب کیے گئے تھے اور جو رکاوٹیں آپ کی راہ میں حائل ہوئیں، ان کے باوجود آپؓ نے اسلامی نظامِ حکومت کو پوری طرح اپنی عملداری میں رائج رکھا اور خلافت علیٰ منہاج النبوت سے ذرہ بھر انحراف نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جمہورِ اسلام آپ کو صحیح معنوں میں خلیفہ راشد مانتے ہیں۔ کیسے ہی کٹھن اور پُرآشوب حالات کیوں نہ ہوں آپؓ کا شخصی کردار ہمیشہ مثالی رہا اور ہر فیصلہ و اقدام اسلامی تعلیمات

کے عین مطابق کیا۔ ذیل میں آپ کے سیاسی و دینی کارناموں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ بغاوتوں کا خاتمہ اور فتوحات

مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر سرزمین عجم میں جا بجا بغاوتیں برپا ہو گئی تھیں۔ کرمان اور فارس کے صوبے باغی ہو گئے تھے۔ بعض اور علاقوں میں بھی بغاوت کے آثار تھے۔ حضرت علیؓ نے اندرونی دشواریوں کے باوجود زیاد بن ابیہ کو مامور کیا، اس نے بغاوت فرو کر کے باغی علاقوں کو قابو میں کیا۔ بلازری کے قول کے مطابق سیستان اور کابل میں بعض فتوحات حاصل ہوئیں۔ ۳۸ھ میں مسلم بحری افواج نے کوکن کے علاقے پر بھرپور حملہ کر کے نمایاں کامیابی حاصل کی۔

(ب) نظامِ خلافت کی اصلاح

حضرت علیؓ نے حتی الامکان نظامِ خلافت کی بھرپور اصلاح کی۔ حضرت عثمان غنیؓ کے آخری دور میں اموی نوجوانوں کے غلبہ سے خلافت کا نظام خلافت راشدہ کی شاہراہ سے ہٹ چلا تھا، حضرت علیؓ نے دوبارہ اسے صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کی۔ گو مخالف حالات نے آپ کو اس کا پورا موقع نہ دیا، تاہم جہاں تک آپ کے بس میں تھا آپ نے دوبارہ شیخین کے دور کی روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ عثمانی دور میں جو بدعنوانیاں پیدا ہو گئی تھیں، انہیں دور کر کے عہدِ فاروقی کے نظم و نسق کو حسب دستورِ سابق قائم رکھا اور اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی۔ نجران کے یہودیوں نے جنہیں حضرت عمرؓ نے حجاز سے نجران جلاوطن کر دیا تھا، دوبارہ حجاز میں بسنے کی درخواست کی۔ آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا: "عمرؓ سے زیادہ صائب الرائے کون ہو سکتا ہے؟" صوبوں کی تقسیم وہی رہی۔ البتہ عمال سب بدل دیئے تھے۔ اور دارالخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کر دیا تھا۔

ا۔ فوجی اصلاحات

حضرت علیؓ فطرۃً سپاہی اور میدانِ جنگ کے مرد تھے اس لیے فوج کی طرف خاص طور پر آپ کی توجہ رہی۔ جنگ صفین میں اسی ہزار فوج آپ کے ہمراہ تھی۔ گو مسلسل لڑائیوں کے باعث آپ کو فوجی نظام کو ترقی دینے کا موقع نہ ملا۔ تاہم آپ نے حسبِ ضرورت چھاؤنیاں قائم کیں اور قلعے تعمیر کرائے۔ اسطخر کا قلعہ (حصن زیاد) آپ ہی کے دور میں تعمیر ہوا تھا۔ آپ نے مجاہدین کے لیے سخت اسلامی قوانین اور اصول و ضوابط مقرر کیے۔

۲۔ صیغۂ مال

آپ نے صیغۂ مال میں بعض ایسی اصلاحات کیں جن سے اس کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ آپ کے دور سے پہلے جنگلات سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا تھا آپ نے انہیں قابلِ محصول قرار دیا۔ چنانچہ صحرائے برس سے چار ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی جنگل تھے۔ بعض اشیاء پر سے محصول اٹھا دیا۔ عہد رسالت میں گھوڑے زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب اس کی باقاعدہ تجارت ہونے لگی تو آپ نے اس پر بھی زکوٰۃ مقرر کر دی، لیکن حضرت علیؓ نے اسے منسوخ کر دیا۔

۳۔ عمال کی اخلاقی نگرانی

حضرت عمرؓ کی طرح آپ بھی عمال کی اخلاقی نگرانی میں بڑا اہتمام کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان کو قیام عدل اور رعایا کے ساتھ لطف و شفقت کے احکام بھیجتے رہتے تھے ان کے اعمال و افعال کا احتساب فرماتے تھے۔ ان کے طرز حکومت کی تحقیقات کراتے تھے اور ان کی غلط روی کا تدارک فرماتے تھے۔ والیٔ اصطخر، منذر بن جارود کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ اپنا زیادہ وقت سیر و شکار میں صرف کرتے ہیں اور فرائض منصبی میں غفلت برتتے ہیں تو انہیں لکھا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے فرائض چھوڑ کر سیر و شکار میں نکل جاتے ہو، اور کتوں سے کھیلتے ہو اگر یہ صحیح ہے تو میں تم کو اس کا بدلہ دوں گا، تمہارے گھر کا جاہل بھی تم سے بہتر ہے۔" ——— چنانچہ انہیں طلب کر کے معزول کر دیا۔

۴۔ خراج کی آمدنی کا احتساب

آپ عمال سے محاصل و خراج کی آمدنی کا نہایت سختی کے ساتھ احتساب کرتے تھے۔ اگر مقررہ وقت سے ذرہ تاخیر ہو جاتی تو فہمائشی احکام جاری کرتے اور اس سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی اور ادنیٰ خیانت کو برداشت نہ کرتے تھے۔ آپ خود بھی اس ضابطے کی سخت پابندی کرتے اور دوسروں سے بھی کرواتے تھے

۵۔ ذمیوں کے ساتھ نرمی

ذمیوں کے حقوق کا خاص خیال رکھتے تھے اور عمال کو ان کے ساتھ نرمی اور حسنِ سلوک کی ہدایت فرماتے تھے۔ ذمیوں کو ایک عامل عمرو بن مسلمہؓ کی درشت مزاجی کی شکایت تھی، انہیں لکھا کہ "تم کو سختی اور نرمی دونوں سے کام لینا چاہیئے، لیکن سختی ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے اور نرمی نقصان کی حد تک"۔ ——— ذمیوں کی آبپاشی کی ایک نہر پٹ گئی تھی، آپ نے اسے فوری طور پر درست کرا کے آباد کرانے کا حکم دیا ——— اہلِ عجم کے ساتھ اس لطف و کرم کا برتاؤ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اس عربی نے نوشیرواں کی یاد تازہ کر دی۔

۶۔ بازار کی نگرانی:۔

آپؓ بازار کی نگرانی اور نرخ اور ناپ تول کی دیکھ بھال خود کرتے تھے۔ درّہ لے کر بازار نکل جاتے اور بیچنے والوں کو حسنِ معاملت اور ناپ تول میں ایمانداری کی ہدایت فرماتے۔

۷۔ عدل و مساوات

پہلے بیان ہو چکا ہے۔

۸۔ بیت المال کی حفاظت

بیت المال کی حفاظت میں حضرت عمرؓ ہی کی طرح اہتمام تھا ایک دفعہ آپ کے چچیرے بھائی حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بصرہ کے بیت المال سے دس ہزار کی رقم لی، حضرت علیؓ کو معلوم ہوا تو واپس کرنے کے لیے لکھا، انہوں نے انکار کیا، ان کے انکار پر آپ نے فہمائش کر کے واپس کر دیا اور اس کے متعلق مفید نصیحتیں فرمائیں۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی ذات پر بیت المال کی معمولی چیز بھی صرف نہ ہونے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ عمرو بن سلمہ اصفہان کا

خراج لائے۔ اس میں شہد اور چربی بھی تھی۔ حضرت علیؓ کی صاحبزادی ام کلثومؓ نے مانگ بھیجا۔ عمرو بن سلمہ نے ایک پیپا شہد اور ایک پیپا چربی بھیج دی، دوسرے دن حضرت علیؓ نے شمار کیا تو دو پیپے کم تھے، عمرو بن سلمہ سے سختی کے ساتھ پوچھا۔ انہوں نے بتا دیا۔ آپؓ نے اسی وقت دونوں پیپے منگا لیے اور اس میں سے جو کچھ خرچ ہو چکا تھا، اس کا اندازہ لگا کر اس کی قیمت ادا کر دی۔

۹۔ رعایا پروری

آپ کا دورِ رعایا کے لیے باعث رحمت تھا۔ بیت المال کے دروازے عزبا ردمساکین کے لیے کھلے رہتے تھے اور اس کی تمام آمدنی مستحق افراد میں بانٹ دیتے تھے منصب خلافت پر فائز ہونے سے پہلے آپ کی ملکیت میں قطعۂ زمین تھا، جس کی معقول آمدنی تھی۔ آپؓ نے اسے صدقہ کر دیا اور دنیا سے اس طرح رخصت ہوئے کہ چند درہم کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔

حضرت علیؓ ــــ خلیفۂ راشد

حضرت علیؓ کی خلافت قطعی طور پر ٹھیک ٹھیک انہی اصولوں کے مطابق منعقد ہوئی تھی جن پر خلافت راشدہ کا انعقاد ہو سکتا تھا۔ وہ زبردستی اقتدار پر قابض نہیں ہوئے۔ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لیے برائے نام بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ لوگوں نے خود آزادانہ مشاورت سے ان کو خلیفہ منتخب کیا۔ صحابہؓ کی اکثریت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور بعد میں شام کے سوا تمام بلادِ اسلامیہ نے ان کو خلیفہ تسلیم کیا۔۔۔ علمائے اہل السنت میں آج تک کوئی ایک عالم بھی ایسا نہیں گزرا ہے، جس نے حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کو چوتھا خلیفۂ راشد تسلیم نہ کیا ہو یا ان کی بیعت کے صحیح ہونے میں شک ظاہر کیا ہو۔ بلکہ علمائے احناف نے تو ان کی خلافت کے اقرار و اعتراف کو عقائدِ اہل سنت میں سے ایک عقیدہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے:

"خلافت میرے بعد ۳۰ سال رہے گی اور اس کے بعد کاٹنے والی بادشاہت آجائے گی"۔ یاد رہے کہ حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد تیسویں سال کے سر پر شہید ہوئے۔ (خلافت و ملوکیت۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

حضرت علیؓ کے فضائل حدیث کی روشنی میں

متعدد احادیث مبارکہ میں حضرت علیؓ کے فضائل بیان ہوئے ہیں، ذیل میں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ علیؓ میرے لیے ایسا ہی ہے جیسا کہ موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ تھے، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ علیؓ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے ہوں اور علیؓ ہر مومن کا دوست اور مددگار ہے۔ (ترمذی)

۳۔ علیؓ دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے۔ (ترمذی)

۴۔ میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔ (ترمذی)

۵۔ علیؓ سے منافق محبت نہیں رکھتا اور مومن علیؓ سے بغض و عداوت نہیں رکھتا۔ (ترمذی)

۶۔ جس شخص نے علیؓ کو برا کہا گویا مجھ کو برا کہا۔ (احمد)

۷۔ جس شخص کا میں مولا (دوست) ہوں، علیؓ اس کا مولا (دوست) ہے۔ (احمد)

۸۔ علیؓ کے معاملہ میں دو شخص ہلاک ہوں گے، ایک تو حد سے محبت رکھنے والا جو ان میں وہ خوبیاں بتائے گا جو ان میں نہ ہوں گی، اور دوسرا دشمنی کے باعث ان پر بہتان باندھنے والا۔ (احمد)

۹۔ ارشادِ نبویؐ کے مطابق حضرت علیؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

خلافت راشدہ کی خصوصیات

اس میں بوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا ہوں عثمانؓ و علیؓ — سب کی خوشبو سے مہکتا ہے خلافت کا چمن

(مولانا ظفر علی خاں)

سوال:۔ خلافت راشدہ کی نمایاں خصوصیات بیان کیجئے۔

جواب: **خلافتِ راشدہ کی خصوصیات**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد خلفائے راشدین کی حکومت انہی اصولوں پر قائم ہوئی تھی جو حضورؐ طے فرمائے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی براہِ راست تعلیم و تربیت اور عملی رہنمائی سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی روح کے مطابق کسی قسم کا نظامِ حکومت بننا چاہیئے۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوروی خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنا ڈالی گئی، نہ کوئی طاقت استعمال کرکے برسرِ اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لیے کوئی دوڑ دھوپ یا برائے نام بھی کوئی کوشش کی، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب (حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ) کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت امت نے خلافت راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔

ارشاد نبویؐ ہے کہ "بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر میرے صحابہؓ کا" نیز فرمایا کہ "میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی۔ جو علیٰ منہاج النبوت (یعنی نبوت کی طرز پر) ہو گی" ذیل میں اس خلافت راشدہ کی نمایاں خصوصیات بیان کی جاتی ہیں:۔

۱۔ **قانونِ خداوندی کی بالاتری**

خلافت راشدہ کی اولین خصوصیت یہ تھی کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اہلِ ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کو لازماً اس قانونِ خداوندی

کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیئے جس کا مآخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:۔

"میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں، جنہیں اگر تم تھامے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے کتاب اللہ اور اس کے رسولؐ کی سُنّت۔" (مشکوٰۃ بحوالہ مؤطا)

چنانچہ خلفائے راشدین کا یہ طریقِ عمل تھا کہ وہ ہر معاملے میں براہِ راست قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور اس سے سرمو تجاوز وانحراف نہیں کرتے تھے۔ خلافت راشدہ ذاتی اور شخصی حکومت نہ تھی جو کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو، بلکہ خلیفہ اور اس کے اعمال خود کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے اور کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق حکومت کے معاملات چلاتے تھے۔ خلیفہ اور عوام کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا اطاعت صرف معروف میں کی جاتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ خلیفہ اور اس کے عمال نے خود کو قرآن و سنت کے قوانین میں جکڑ رکھا ہے اور کوئی اس پابندی اور ضابطے سے ذرہ بھر سرتابی نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کی اصلی کامیابی اسی نکتے میں مضمر تھی۔

۲۔ جمہوری شورائی نظام

دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جن کے علم، تقویٰ اور اصابتِ رائے پر عام لوگوں کو اعتماد ہو۔ خلفائے راشدینؓ کے عہد میں جو لوگ شوریٰ کے رکن بنائے گئے تھے، اگرچہ ان کو انتخابِ عامہ کے ذریعے منتخب نہیں کرایا گیا تھا، جدید زمانے کے تصور کے لحاظ سے وہ نامزد کردہ لوگ ہی تھے لیکن خلفاء نے یہ دیکھ کر ان کو مشیر نہیں بنایا تھا کہ یہ ہماری ہاں میں ہاں ملانے اور ہمارے مفاد کی خدمت کرنے کے لیے موزوں ترین لوگ ہیں، بلکہ انہوں نے پورے خلوص اور بے غرضی کے ساتھ قوم کے بہترین عناصر کو چنا تھا، جن سے وہ حق گوئی کے سوا کسی چیز کی توقع نہ رکھتے تھے، جن سے یہ امید تھی کہ وہ ہر معاملے میں اپنے علم و ضمیر کے مطابق بالکل صحیح ایماندارانہ رائے دیں گے۔ جن سے کوئی شخص بھی یہ اندیشہ نہ رکھتا تھا کہ وہ حکومت کے کسی غلط راہ پر جانے دیں گے۔ اگر اس وقت ملک میں آج کل کے طریقے کے مطابق انتخابات بھی ہوتے تو عام مسلمان انہی لوگوں کو اپنے اعتماد کا مستحق قرار دیتے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے،

لَا خِلَافَةَ اِلَّا عَنْ مَشْوَرَةٍ   یعنی: خلافت مشورہ کے بغیر کچھ نہیں ہے۔

۳۔ اظہارِ رائے کی آزادی

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ لوگوں کو اظہارِ رائے کی پوری آزادی ہو۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اسلام نے ہر مسلمان کا حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا۔ اسلامی معاشرے اور ریاست کے صحیح راستہ پر چلنے کا انحصار اس بات پر تھا کہ لوگوں کے ضمیر اور ان کی زبانیں آزاد ہوں، وہ ہر غلط کام پر بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں۔ خلافت راشدہ میں صرف یہی نہیں کہ لوگوں کا یہ حق پوری طرح محفوظ تھا، بلکہ خلفائے راشدینؓ اسے ان کا فرض سمجھتے تھے اور اس فرض کے ادا کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کی مجلس شوریٰ کے ممبروں ہی کو نہیں

قوم کے ہر شخص کو بولنے، ٹوکنے اور خود خلیفہ سے باز پرس کرنے کی مکمل آزادی تھی جس کے لیے میں حضرت عمرؓ کی قمیص والا واقعہ بہترین مثال ہے۔

اس حق کے استعمال پر لوگ ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی سے نہیں بلکہ داد اور تعریف سے نوازے جاتے تھے یہ آزادی ان کی طرف سے کوئی عطیہ اور بخشش نہ تھی، جس کے لیے وہ قوم پر اپنا احسان جتاتے، بلکہ یہ اسلام کا عطا کردہ ایک دستوری حق تھا جس کا احترام کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے اور اسے بھلائی کے لیے استعمال کرنا ہر مسلمان پر خدا اور رسولؐ کا عائد کردہ ایک فریضہ تھا جس کی ادائیگی کے لیے معاشرے اور ریاست کی فضا کو ہر وقت سازگار رکھنا ان کی نگاہ میں فرائض خلافت کا ایک اہم جز تھا۔

۴۔ خدا اور خلق کے سامنے جوابدہی

چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ خلیفہ اور اس کی حکومت خدا اور خلق دونوں کے سامنے جوابدہ ہے۔ جہاں تک خدا کے سامنے جوابدہی کا تعلق ہے اس کے شدید احساس سے خلفائے راشدینؓ پر دن کا چین اور رات کا آرام حرام ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے: "اگر فرات کے کنارے بکری کا بچہ بھی بھوکا مر گیا تو عمرؓ خدا کے سامنے جوابدہ ہو گا"۔ اور جہاں تک خلق کے سامنے جوابدہی کا تعلق ہے، وہ ہر وقت، ہر جگہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے۔ ان کی حکومت کا یہ اصول نہ تھا کہ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) میں نوٹس دے کر ہی ان سے سوال کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہر روز پانچ مرتبہ نماز کی جماعت میں عوام کا سامنا کرتے تھے۔ وہ ہر ہفتے جمعہ کی جماعت میں عوام کے سامنے اپنی بات کہتے اور ان کی سنتے تھے۔ وہ حج کے موقع پر کھلے بندوں عوام کی شکایات سنتے اور ان کا ازالہ کرتے تھے۔ وہ شب و روز بازاروں میں کسی باڈی گارڈ کے بغیر، کسی ہٹو بچو کی آواز کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ ان کے گورنمنٹ ہاؤس (یعنی ان کے کچے مکان) کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا اور ہر ایک ان سے براہ راست بغیر کسی دربان کے مل سکتا تھا۔ اب سب مواقع پر ہر شخص ان سے سوال کر سکتا تھا اور جواب طلب کر سکتا تھا۔ یہ محدود جوابدہی نہ تھی بلکہ کھلی اور ہمہ وقتی جوابدہی تھی۔ یہ نمائندوں کے واسطہ سے نہ تھی بلکہ پوری قوم کے سامنے براہ راست تھی۔ وہ عوام کی مرضی سے برسر اقتدار آئے تھے اور عوام کی مرضی انہیں ہٹا کر دوسرا خلیفہ ہر وقت لا سکتی تھی۔ اس لیے نہ تو انہیں عوام کا سامنا کرنے میں کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا اور نہ اقتدار سے محرومی ہونا ان کی نگاہ میں کوئی خطرہ تھا کہ وہ اس سے بچنے کی کبھی فکر کرتے۔

۵۔ بیت المال ایک امانت

پانچویں خصوصیت یہ تھی کہ بیت المال خدا کا مال اور مسلمانوں کی امانت ہے، جس میں کوئی چیز حق کی راہ کے سوا کسی دوسری راہ سے آنی نہ چاہیئے اور جس میں سے کوئی چیز حق کے سوا کسی دوسری راہ میں جانی چاہیئے۔ خلیفہ کا حق اس مال میں اتنا ہی ہے جتنا قرآن مجید کی رو سے مال یتیم میں اس کے ولی کا ہوتا ہے کہ:

مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ

(جو اپنے ذاتی ذرائع آمدنی اپنی ضرورت بھر رکھتا ہو، وہ اس مال سے تنخواہ لیتے ہوئے شرم کرے اور جو واقعی حاجت مند ہو وہ اتنی تنخواہ لے جسے ہر معقول آدمی مبنی بر انصاف مانے ۔)

خلیفہ اس کی ایک ایک پائی کے آمد و خرچ پر حساب دینے کا ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کو اس سے حساب مانگنے کا پورا حق ہے۔ خلفائے راشدینؓ نے اس اصول کو بھی کمال درجہ دیانت اور حق شناسی کے ساتھ برت کر دکھایا ان کے خزانے میں جو کچھ بھی آتا تھا ٹھیک ٹھیک اسلامی قانون کے مطابق آتا تھا اور اس میں سے جو کچھ خرچ ہوتا تھا، بالکل جائز راستوں میں ہوتا تھا۔ ان میں سے جو غنی تھے (یعنی حضرت عثمان غنیؓ) انہوں نے ایک حبہ اپنی ذات کے لیے تنخواہ کے طور پر وصول کیے بغیر مفت خدمت انجام دی، بلکہ اپنی گرہ سے قوم کے لیے خرچ کرنے میں بھی دریغ نہ کیا اور جو تنخواہ کے طور پر وقتی خدمت گار بن سکتے تھے، انہوں نے اپنی ضروریات زندگی کے لیے اتنی کم تنخواہ لی کہ ہر معقول آدمی اسے انصاف سے کم ہی مانے گا، زیادہ کہنے کی جرأت ان کا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔ پھر اس خزانے کی آمد و خرچ کا حساب ہر وقت ہر شخص مانگ سکتا تھا اور وہ ہر وقت ہر شخص کے سامنے حساب دینے کے لیے تیار تھے۔ ان سے ایک عام آدمی بھرے مجمع میں پوچھ سکتا تھا کہ خزانے میں یمن سے جو چادریں آئی ہیں، ان کا طول و عرض تو اتنا نہ تھا کہ جناب کا یہ لمبا کرتا بن سکتے، یہ زائد کپڑا آپ کہاں سے لائے ہیں؟ اور اس کی وضاحت ان کا فرزند یوں کرتا ہے کہ میں نے اپنے حصّے کا کپڑا والد محترم کو دیا ہے۔

۶۔ **قانون کی حکومت** :۔ چھٹی خصوصیت یہ تھی کہ ملک میں قانون (یعنی خدا اور رسول کے قانون) کی حکومت ہونی چاہیئے، کسی کو قانون سے بالاتر نہ ہونا چاہیئے، کسی کو قانون کی حدود سے باہر جا کر کام کرنے کا حق نہ ہونا چاہیئے۔ ایک ایک عامی سے لے کر سربراہِ مملکت تک سب کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیئے اور عدالتوں کو انصاف کرنے کے لیے ہر دباؤ سے بالکل آزاد ہونا چاہیئے۔ خلفائے راشدینؓ نے اس اصول کی پیروی کا بھی بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ بادشاہوں سے بڑھ کر اقتدار رکھنے کے باوجود قانونِ الٰہی کی بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ نہ ان کی دوستی رشتہ داری قانون کی حد سے نکل کر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکتی تھی اور نہ ان کی ناراضگی کسی کو قانون کے خلاف کوئی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ کوئی ان کے اپنے حق پر بھی دست درازی کرتا تو وہ ایک عام آدمی کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے اور کسی کو ان کے خلاف شکایت ہوتی تو وہ استغاثہ کر کے انہیں عدالت میں کھینچ لا سکتا تھا۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ خود قاضی کی عدالت میں فریقِ مقدمہ کی حیثیت سے پیش ہوئے اور اپنے خلاف فیصلہ بھی قبول کیا۔

اسی طرح انہوں نے اپنی حکومت کے گورنروں اور سپہ سالاروں کو بھی قانون کی گرفت میں کس رکھا تھا کسی کی مجال نہ تھی کہ عدالت کے کام میں کسی قاضی پر اثر انداز ہونے کا خیال بھی کرتا۔ کسی کا یہ مرتبہ نہ تھا کہ قانون کی حد سے قدم باہر نکال کر مواخذے سے بچ جاتا۔

۷۔ کامل مساوات

ساتویں خصوصیت یہ تھی کہ مسلمانوں میں حقوق اور مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کے درمیان نسل، وطن، زبان وغیرہ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ قبیلے خاندان اور حسب و نسب کے لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت نہ تھی۔ خدا اور رسول کے ماننے والے سب لوگوں کے حقوق یکساں تھے اور سب کی حیثیت برابر تھی۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح اگر تھی تو سیرت و اخلاق اور اہلیت و صلاحیت اور خدمات کے لحاظ سے تھی۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

؎ غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے خطبۂ خلافت میں فرمایا تھا کہ:

"تم میں جو کمزور ہے وہ میرے لیے قوی ہے، جب تک میں اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے جو قوی ہے وہ میری نظر میں کمزور ہے، جب تک میں اس سے دوسروں کا حق نہ دلا دوں۔"

اسی طرح حضرت عمرؓ کے نزدیک غسان کا بادشاہ جبلہ بن ایہم اور ایک عام مسلمان قانون کی نظر میں برابر ٹھہرے۔

۸۔ خدمتِ خلق

خلافت راشدہ کی ایک اہم خصوصیت خدمتِ خلق ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد خدمتِ خلق پر بہت زور دیا گیا ہے، حقوق دو طرح کے ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ ایک بندۂ مومن کے لیے ان دونوں حقوق کی بجا آوری لازم ہے۔ مولانا احمد علی مرحوم نے قرآنی تعلیمات کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ "خدا کو عبادت سے، رسولؐ کو اطاعت سے اور لوگوں کو خدمت سے راضی کرو۔" خلفائے راشدینؓ اس خصوصیت سے بدرجۂ کمال متصف تھے۔ ان کا نظریۂ حکومت شان و شوکت نہیں بلکہ خدمتِ خلق تھا۔ وہ خدمت، شفقت اور رحم کا عملی نمونہ تھے۔ مریضوں کو پوچھنے اور تسلی دینے ان کے گھروں پر جاتے، ناداروں کی حاجت روائی کرتے، خود قرض لیکر مصیبت زدوں کی مدد کرتے، آفت زدوں کو تسلی دیتے اور ان کا غم بٹاتے میں پیش پیش رہتے۔ مہمانوں کی خدمت و تواضع کرتے بوڑھوں پر شفقت فرماتے۔ بچوں سے محبت سے پیش آتے، بیواؤں اور یتیموں کی دادرسی کرتے۔ وہ گھر گھر گھوم کر خدمت خلق کیا کرتے تھے، بازار سے بوڑھی عورتوں کو سودا لا دیتے، ان کی بکریوں کا دودھ نکال دیتے حتیٰ کہ ان کے گھروں میں صفائی بھی کر دیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ایک معذور بڑھیا کی خود خدمت کرتے۔ حضرت عمرؓ اپنے کندھوں پر راشن لاد کر بیواؤں اور یتیموں کو کھلاتے۔ حضرت عثمان غنیؓ کی دولت اپنے اور بیگانے ضرورت مندوں کے لیے وقف تھی۔ حضرت علیؓ خود فاقہ کر کے مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے تھے۔

۹۔ ذمیوں کے حقوق کا تحفظ

خلفائے راشدینؓ کا ذمیوں کے ساتھ سلوک نہایت مشفقانہ تھا۔ ان کے حقوق بھی عام مسلمانوں کی طرح تھے۔ ان کے جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب کی پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ ان کو مذہبی معاملات میں مکمل آزادی حاصل تھی۔ ان کی عبادت گاہوں

کا پورا احترام کیا جاتا تھا۔ اقلیتی فرقے کے ساتھ جو سلوک خلفائے راشدین نے کرکے دکھایا، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ خلافت راشدہ کے اس سنہری دور میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ بڑی فیاضی، رواداری اور وسعت قلبی کا برتاؤ کیا گیا۔ انہیں تمام بنیادی حقوق حاصل تھے۔ ذمیوں سے حسنِ سلوک، منصفانہ اور عادلانہ رویہ کا ہی نتیجہ تھا کہ اسلامی مملکت کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں اور رعایا کے مختلف طبقوں میں خیرسگالی اور صلح و آشتی کے جذبات پروان چڑھے اور امن و امان کی فضا قائم ہوگئی۔

۱۰۔ وسیع فتوحات اور مثالی نظامِ حکومت

خلافت راشدہ کا دور اسلامی فتوحات کے لحاظ سے بھی منفرد و ممتاز رہا ہے۔

اس زمانے میں مسلمان مجاہدین صحرائے عرب سے نکلے اور چند برسوں میں اپنے وقت کی دو عظیم الشان سلطنتوں روم و ایران کو بیک وقت شکست دی اور عراق، ایران، شام، مصر اور افریقہ وغیرہ وسیع و عریض علاقوں پر قابض ہوگئے۔ مؤرخین کی رائے میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بارہ برس بعد (فاروقی خلافت) مسلمان ۲۲ لاکھ مربع میل کے مالک تھے۔ انہوں نے اس قلیل مدت میں ۳۶ ہزار شہر اور قلعے فتح کیے۔ اور پھر اس خصوصیت کے ساتھ کہ ان ساری فتوحات میں ظلم و جور کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ بقول علامہ اقبالؒ

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

فتوحات سے بڑھ کر خلفائے راشدینؓ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی بنیادوں پر ایسے آئینِ حکومت مرتب کر دیئے، ایسا عادلانہ نظام قائم کر دیا جو مسلمانوں کی جملہ سعادتوں اور ترقیوں کا ضامن تھا اور جس سے بڑھ کر عادلانہ نظام اس دورِ ترقی میں بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی عادلانہ و مساویانہ نظام کے نتیجہ میں غیر اقوام جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں اور یوں دنیا میں عظیم ترین اسلامی سلطنت وجود میں آئی جس کی برکتوں اور سعادتوں سے پوری دنیا فیض یاب ہوئی۔ خلافت راشدہ کا یہ نظام ایک روشنی کا مینار تھا، جس کی طرف بعد کے تمام ادوار میں فقہاء و محدثین اور عام دیندار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اسی کو اسلام کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملہ میں معیار سمجھتے رہے۔ یہ دور آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

۱۱۔ اشاعتِ اسلام

خلافت راشدہ کی بنیاد اقامتِ دین پر تھی، جس کے لیے تبلیغ و اشاعت دین ضروری ہے۔ خلافت کا مقصد انسانیت کو رشد و ہدایت خداوندی پہنچانا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید برملا اعلان کرتا ہے کہ ہم نے اپنے رسولؐ کو ہدایت و دینِ حق سے سرفراز فرما کر اس لیے مبعوث کیا ہے کہ دینِ اسلام کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے۔ چنانچہ خلفائے راشدین نے اقامتِ حق، دعوتِ دین اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا فریضہ بطریق احسن سرانجام دیا۔ یہ صرف حکومت ہی کا فریضہ نہ تھا بلکہ ہر مسلمان اس کے لیے مکلف کیا گیا ہے۔ خلافتِ راشدہ میں انفرادی و اجتماعی طور پر اس روح کو جاری و ساری کر دیا گیا۔ خلفائے راشدینؓ کے نزدیک اشاعت اسلام توسیع مملکت سے زیادہ اہم تھی۔ اس خیر و برکت کے دور

میں مسلمان اسلامی تعلیمات کی عملی تصویر تھے۔ ان کا کردار و گفتار، قول و فعل اسلام کا ترجمان تھا۔ صحابہ کرام چلتے پھرتے پیکرِ اسلام تھے وہ جہاں پہنچے انہوں نے اپنے حسنِ کردار اور اعلیٰ اخلاق سے عوام الناس کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ مسلمانوں کی رعایا پروری عدل گستری اور عدل و مساوات سے غیر مسلم جوق در جوق برضا و رغبت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور آج تک اسلام پر قائم ہیں۔ اس طرح نورِ اسلام نے پورے کرۂ ارضی کو منور کر دیا۔

مسجد کی مرکزیت

خلافت راشدہ میں مسجد اسلامی معاشرہ کی دینی، اخلاقی، ثقافتی، سیاسی اور علمی مرکز تھی۔ یہاں تک کہ جہاد کے منصوبے بھی یہیں بنتے اور یہیں عدالت لگتی تھی۔ اس کی حیثیت قومی و ملی اجتماع گاہ کی تھی، جہاں مسلمانوں کے جملہ امور و معاملات طے پاتے تھے۔ خلفاء نماز کے امام بھی ہوتے تھے اور مسلمانوں کے دینی قائد اور سیاسی رہنما و حکمران بھی۔ ہر آبادی میں مسجد لازمًا تعمیر کی جاتی تھی جو اسلام کا اولین شعار تھا۔ مسجد نبویؐ اور دیگر مرکزی و علاقائی مساجد کی تعمیر و توسیع کی گئی۔

علومِ اسلامیہ کا فروغ

خلافت راشدہ میں حکام و عمال کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ علومِ اسلامیہ کو فروغ دیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں معلم مقرر تھے جو عوام کو قرآن و سنت کی تعلیم دیتے تھے۔ قرآن کی تعلیم لازمی تھی۔ علم طب کو طلبِ دنیا کے لیے حاصل نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حصولِ علم کا مقصد فقط دینِ اسلام کی خدمت تھی۔ مساجد میں مکاتب قائم تھے، جہاں لوگوں کو قرآن حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

قرآن

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کو کتابی شکل میں جمع کیا۔ حضرت عثمانؓ نے تمام مسلمانوں کو ایک قرأت پر جمع کیا اور حضرت علیؓ قرآن مجید کی صحیح قرأت کے قواعد مرتب کیے۔ امثال عرب، عربی اشعار اور لغت فہم قرآن کے لیے پڑھائے جاتے تھے۔

حدیث و فقہ

اس دور میں احادیث کو یاد کرنے اور محفوظ رکھنے کے لیے خاص اقدامات کیے گئے۔ حدیث کے کئی مجموعے صحیفوں کی صورت میں محفوظ کیے گئے۔ بڑے بڑے شہروں میں حلقہ ہائے درس حدیث قائم تھے۔ خلفائے راشدینؓ خود بلند پایہ فقیہہ تھے۔ بالخصوص حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ گہری فقہی بصیرت رکھتے تھے۔ نئے نئے پیش آمدہ مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کیا جاتا۔ فقہ کی تعلیم کے لیے مختلف شہروں میں باصلاحیت صحابہ کرامؓ کو مقرر کیا گیا تھا۔

